

فکرِ انقلاب

FIKR-E-INQLAB

اشاعتِ خصوصی بیاد

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسینؒ احمد مدنیؒ



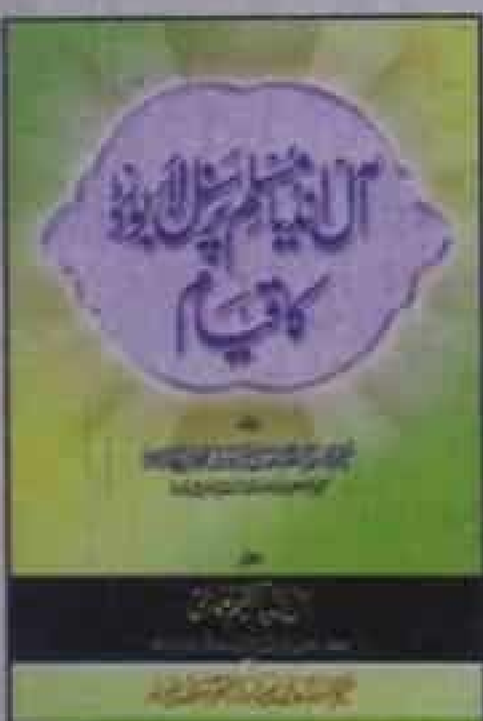
ایڈیٹر

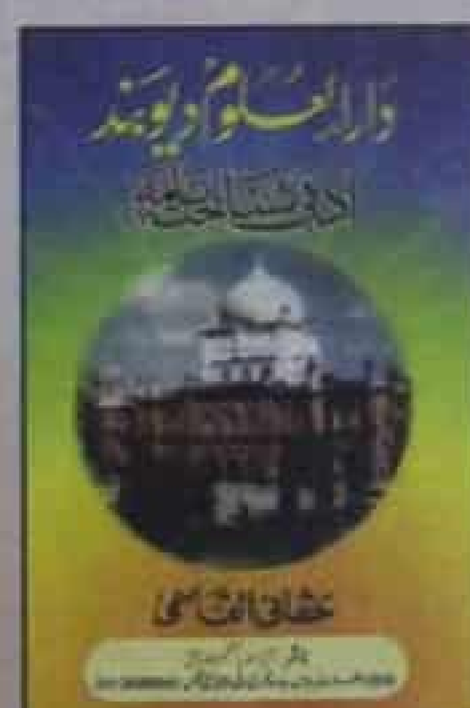
احسن مہتاب

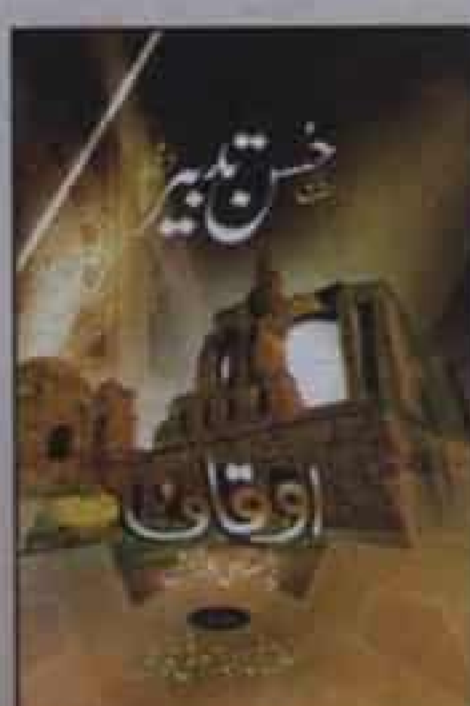
آل انڈیا تنظیم علماء حق کی دیدہ زیب علمی، ادبی اور اصلاحی مطبوعات



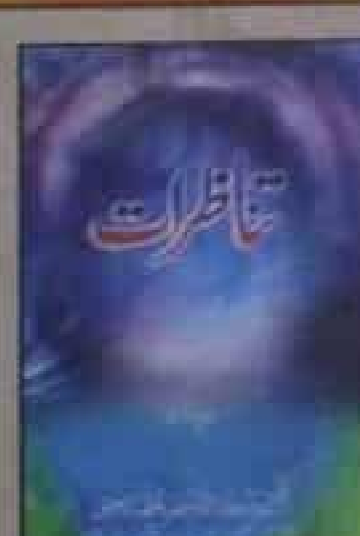


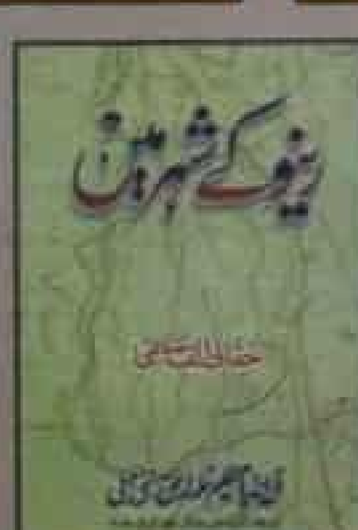




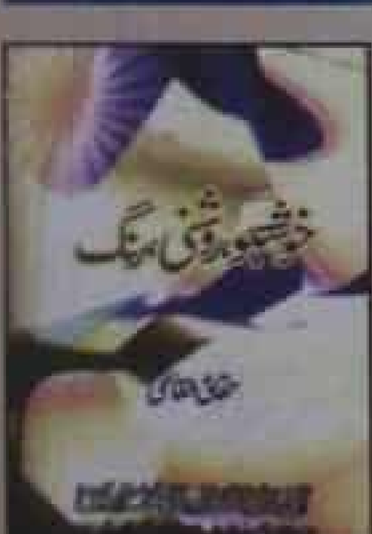












قومی، ملی، دینی اور تعلیمی اصلاح وفلاح کی کل ہند تحریک

آل انڈیا تنظیم علماءِ حق کا ترجمان

فکرِ انقلاب

FIKR-E-INQLAB

اشاعت خصوصی

بیاد: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

جلد 1 فروری 16 تا 28-2013 شمارہ 18

سرپرست

حضرت مولانا غلام محمد وستانوی

مہتمم جامعہ اشاعت العلوم اکل کنواں، مہاراشٹر

نگراں

حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی

صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق، دہلی

ایڈیٹر

احسن مہتاب

معاون ایڈیٹر

اسعد مختار

مجلس مشاورت

- مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی، دیوبند • مولانا علاء الدین ندوی، لکھنؤ • مفتی ابرار احمد اجراوی، جے این یو، دہلی
- جناب ساجد عتیق قریشی، دہلی • مولانا ارشد میر، سورت • مولانا یوسف قاسمی، گودھرا • مولانا امجد قاسمی، احمد آباد
- فیض احمد فیضی، دہلی • تنویر احمد خان ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی

25/Q الصمد روڈ بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ٹیلی فیکس: (011)26985943

Rs.300/-

کسی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالت میں ہوگی۔

[illegible]

حسن تفکر

کیا تقدیر نے اس لیے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ہندوستان کی آزادی کے بعد کی صورت حال دیکھتے ہوئے اکثر حساس لوگوں کے ذہن میں یہ شعر گونجنے لگتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگیں لڑی جان ومال کی قربانی دی اور اپنا سب کچھ وطن اور ملک کی مٹی کے حوالے کر دیا مگر جب آزادی کا سورج طلوع ہوا اور ملک برطانوی استعمار سے آزاد ہوا تو سارے حقیقی کردار فراموش کردئے گئے ان کی خدمات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا اور جو تاریخ آزادی کی لکھی گئی تو اس میں بھی ان لوگوں کو حاشیہ میں جگہ ملی اور بعض کو تو وہ حاشیہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ عجب المیہ ہے ہندوستان کی تاریخ کا کہ جب بھی آزادی کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو ان علماء کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے لہو سے اس چمن ہندوستان کو سینچا اور سنوارا اور اس چمن کی رعنائی میں جن کا سب سے زیادہ حصہ ہے علماء دیوبند بھی انہیں بدنصیب مجاہدین آزادی میں ہیں جن کی مکمل خدمات کا اعتراف اس ملک کی طرف سے نہیں ہوا جس ملک کو آزاد کرانے کے لیے انہوں نے ہر طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ اب یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ دیوبند ہی ایسا ادارہ تھا جس نے انگریزی استعمار کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی تھی اور اوران سے جہاد کے جذبہ کو لوگوں میں جگایا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی یہ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی

میں اہم کردار ادا کیا اور صرف ملک کو آزاد ہی نہیں کرایا؛ بلکہ اس کو متحد رکھنے کے لیے بھی کوششیں کی۔ علماء دیوبند کا یہ بہت بڑا امتیاز ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر مذہبیت کے باوجود قومیت اور وطنیت کے احساس کو ترک نہیں کیا وہ وطنیت جس میں تمام مذاہب شریک ہیں خاص طور پر شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کا تصور تو اس سلسلہ میں وسعت نظری اور وسیع القلبی کا مظہر ہے کہ انہوں نے اس خاص قوم اور مذہب سے مکمل وابستگی کے باوجود دوسری قوموں کے تئیں حقارت، نفرت کا جذبہ نہیں رکھا؛ بلکہ یہ محسوس کیا کہ اتحاد سے ہی یہ ملک آزاد ہوسکتا ہے اور ارتقاء کے راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک خطبہ صدارت میں صاف صاف کہا:

''ہندستان کی آزادی کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان میں سب سے زیادہ اہم اور ارفع اور مفید تر ہندو مسلم اتحاد یعنی ہندستانی آبادی کا اشتراک عمل ہے چونکہ اس امر میں بہت سی بے چینیاں رونما ہو رہی ہیں؛ اس لیے باوجود قلت وقت قدرے روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ عرائض سے معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی فرائض میں سے ہے کہ ہندستان کی آزادی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور گورنمنٹ کا جب تک کہ وہ اپنے مقاصد نہ منوالیں مقابلہ کرتے رہیں۔ یہ فرض ان پر ہر حال میں ہے خواہ وہ تنہا ہوں یا ان کے ساتھ کوئی دوسرا فریق بھی ہو۔ البتہ ہر دو حالت میں طریق کار میں فرق ہوسکتا ہے کیونکہ ایک کام کو اگر دس آدمی مل کر انجام دیں گے تو اس کی اور صورت ہوسکتی ہے اور اگر ایک آدمی انجام دے گا تو اس کا طریق دوسرا ہوگا۔ ساڑھے تینتیس کروڑ کا طریق مقابلہ دوسرا ہوسکتا ہے اور سات کروڑ کا دوسرا۔

چونکہ ہندستان مختلف المذاہب قوموں کا مسکن ہے، اس لیے یہاں کے باشندوں کے لیے خواہ وہ ترقی کے میدان میں گامزن ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ وہ آزادی اور سوراج کے لیے کوشاں ہوں یا نہ ہوں محض بود و باش اور امن و امان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسن معاشرت اور اخلاق حسنہ کو کام میں لائیں۔ عالی ظرفی اور رواداری کے قانون کو پوری طرح ملحوظ رکھیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آیات قرآنی اس امر کے نہایت تاکیدی احکام بتلا رہی ہیں جن میں تمام دنیائے انسان کے ساتھ بلا تمیز مذاہب حسنِ اخلاق اور مکارم اعمال کی تاکید فرمائی گئی ہے۔''

شیخ الاسلام کا یہ بیان موجودہ تناظر میں بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ صورت حال یہ ہے کہ مدارس اور اس سے جڑے ہوئے ارباب بصیرت کو نہ صرف ملک مخالف سمجھا جاتا ہے، بلکہ ان پر غداری اور دہشت گردی جیسے الزامات لگتے رہے ہیں اور ان کے وجود کو ملک کی سلامتی کے لیے ایک خطرہ تصور کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت حال

اس کے برعکس ہے کہ علمائے دیوبند اور ارباب مدارس ہمیشہ ہی اتحاد اور متحدہ قومیت ہی کی بات کرتے رہے ہیں۔ اس معاملے میں شیخ الاسلام کا جو نظریہ تھا وہ بہتوں کے نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا حتیٰ کہ علامہ اقبال نے بھی ان کے نظریہ متحدہ قومیت کے خلاف لکھا لیکن شیخ الاسلام ہمیشہ متحدہ قومیت کے حامی اور دو قومی نظریہ کے مخالف رہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے متحدہ قومیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''ہماری مراد قومیتِ متحدہ سے اس جگہ وہی قومیتِ متحدہ ہے جس کی بنیاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ میں ڈالی تھی، یعنی ہندستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندستانی ایک قوم ہو جائیں اور اس پر ایسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتے ہوئے سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں، اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ تمام ہندستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد رہیں، اپنے مذہبی رسم و رواج، مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے اپنے پرسنل لاء اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں، نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کر لے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اعلان کانگریس ہمیشہ کر رہی ہے۔''

(متحدہ قومیت اور اسلام، بہ عنوان متحدہ قومیت کے مجوزہ معنی، ص ۳۷-۳۸)

اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسِ عام (منعقدہ جون پور، ۷-۸-۹ رجون ۱۹۴۰ء) کے خطبۂ صدارت کے ایک اقتباس سے بھی متحدہ قومیت سے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ کی مراد و منشا ظاہر ہو جاتی ہے۔ خطبۂ صدارت میں کہا گیا ہے:

''ہم باشندگانِ ہندستان بحیثیت قوم ہونے کے، ایک اشتراک رکھتے ہیں جو کہ اختلاف مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلاف، ذاتوں اور صفتوں کے تبائن، رنگوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترک انسانیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات، ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندستانی ہیں، اور وطنی منافع کے

حصول اور مضرات کے ازالہ کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دیگر ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا، اس لیے سب کو مل کر پوری کوشش کرنی از بس ضروری ہے، اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے، تو گاؤں برباد ہو جائے گا، اور سب ہی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی۔ اسی طرح ملک کے ایک ایک باشندے کا فرض ہے کہ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ سب پر جب کوئی عام مصیبت گھر جائے تو مشترک قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں۔ اس اشتراکِ وطنی کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رُکاوٹ یا کمزوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر ایسے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں، اس کے دوسرے معانی جو لوگ سمجھ رہے ہیں، وہ غلط ہیں اور ناجائز ہیں۔ اس معنی میں فنڈامینٹل میں ہر مذہب اور ہر تہذیب اور ہر زبان اور رسم و رواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے۔ دھوکہ نہ کھانا چاہیے، اور بیوقوفوں کی بات پر نہ جانا چاہیے۔ اس کے خلاف یورپین لوگ متحدہ قومیت کے جو معنی مراد لیتے ہیں اور جو کانگریسی اشخاص، انفرادی طور پر کانگریس کے فنڈامینٹل (رائٹس) کے مفہوم کے مخالف معانی بیان کرتے ہیں، ان سے جمعیۃ علماء بیزار اور تبریٰ کرتی ہے۔"

دیوبند کی ایک اہم ترین شخصیت جسے دنیائے اسلام شیخ الاسلام اور شیخ العرب والعجم جیسے القاب سے یاد کرتی ہے اگر انہوں نے اس طرح کے بیانات دیئے ہیں تو یہ صرف شخصی نہیں ہے بلکہ پورے دیوبند کی فکر بلکہ پورے طبقۂ علماء کے آئینہ دار ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ علمائے کرام کے ان افکار و خیالات کے حوالے سے ہندوستان کے علمی و ادبی حلقہ میں گفتگو نہیں ہوتی اور نہ ہی قومی میڈیا اس طرح کے افکار کی تشہیر کرتا ہے جبکہ آج کے دور میں ہندوستان میں فرقہ واریت اور فسطائی طاقت سر اٹھا رہی ہے اور ایک خاص طبقہ کو نشانہ بنا رہی ہے تو ملک کی یکجہتی اور سالمیت کے لیے اس طرح کے خیالات کی تشہیر زیادہ منظم اور مربوط انداز میں کی جانی چاہیے۔

فکر انقلاب نے اسی مقصد کے تحت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی پر ایک خصوصی شمارہ نکالنے کا بیڑہ اٹھایا تاکہ ملک کو منافرت، تنگ نظری، قومی عصبیت سے نجات ملے اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی

ہوئی خلیج کو پاٹا جاسکے۔ شیخ الاسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لیے ہی یہ خصوصی شمارہ نکالا جارہا ہے مگر شیخ الاسلام کا دائرہ صرف وہیں تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ ان کا دائرہ کار بہت وسیع رہا ہے علوم وفنون کے میدان میں بھی ان کی خدمات بہت وسیع ہیں ان کی تصانیف کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ بیشتر کتابوں میں انہوں نے پوری قوم اور پورے ملک کو ایک مثبت اور تعمیری پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان نے بہت سی عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں مگر مولانا سید حسین احمد کا ثانی نہیں ہے کہ خدا نے انہیں عظمت کے ساتھ ساتھ محبوبیت اور مقبولیت بھی عطا کی تھی۔ وہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں حتی کہ اس پاکستان میں بھی مولانا حسین احمد مدنی کی بڑی قدر ومنزلت ہے جس کی بنیاد میں دوقومی نظریہ کا حصہ رہا ہے جس کی مولانا نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ ایسی محبوبیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے پاکستان میں حسین احمد مدنی کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو مولانا کے متحدہ قومیت کے نظریہ پر یقین رکھتی ہی اور پاکستان میں رہتے ہوئے دوقومی نظریہ کی مخالفت کرتی ہے۔

فکر انقلاب کا یہ خصوصی شمارہ مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت اور افکار کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے پھر بھی ان کی شخصیت کے کچھ گوشے اجاگر نہیں ہو پائے اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ برصغیر کے مسلمانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے برادران وطن کے ذہن وفکر کو تبدیل کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ ■

Ph (01336) 222429
Fax (01336) 222768

بسم اللہ الرحمن الرحیم

E-mail: darululoom-deoband@yahoo.com
E-mail: mohtamim@darululoom-deoband.com

دار العلوم دیوبند

Darul-Uloom, Deoband. U.P. India

حوالہ 3 .... التاریخ ....

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترم جناب مولانا محسن مہتاب صاحب ایڈیٹر "فکر انقلاب" دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معلوم ہوکر مسرت ہوئی کہ متعدد اکابر و مشائخ کے اسمائے گرامی سے منسوب فکر انقلاب کے خصوصی نمبرات شائع کرنے کے بعد اب آپ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اور خدمات سے نسل نو کو متعارف کرانے کے لیے خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک مستحسن اور قابل مبارکباد اقدام ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ صدر جمعیۃ علماء ہند و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی ہمہ جہت نابغۂ روزگار شخصیت، علم و تفقہ، زہد و تقویٰ، عزم و ہمت، اخلاص و للہیت، عمل پیہم اور جہد مسلسل کی ایسی پیکر جمیل تھی کہ جس کا ہر پہلو اس شعر کا مصداق تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

خدا کرے مجوزہ شیخ الاسلام نمبر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو۔ اور موجودہ نسل اس کو اپنے جادۂ حیات میں مشعل راہ بنائے۔

والسلام

(مولانا مفتی) ابوالقاسم نعمانی
مہتمم دار العلوم دیوبند
۶/۱/۱۴۳۴ھ

المکتب الرئیسی:
جامعہ اشرفیہ، شارع فیروز پور روڈ
ٹیلیفون: ۳۷۵۷۷۹۷۲
۳۷۵۸۸۱۲۲
۳۷۵۶۹۷۵۸
فیکس: ۹۲-۴۲-۳۷۵۰-۳۳۳۹

الجامعة الأشرفية

شارع فیروز پور روڈ ○ لاہور ○ پاکستان

الفروع: جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد
ٹیلیفون: ۳۷۲۴۳۷۶۱
مدرسۃ الفیصل للبنات ماڈل ٹاؤن
ٹیلیفون: ۳۵۸۸۰۵۰۳
معہد ام القری
ٹیلیفون: ۳۷۵۵۲۷۷۲
القبۃ للمساکین جوہر ٹاؤن
ٹیلیفون: ۳۵۱۷۱۹۸۳

مورخہ: ۹ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

حوالہ: ....

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد!

میرے لیے یہ امر انتہائی خوشی اور سعادت کا باعث ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ سے شرف تلمذ سے نوازا ہے۔ نہ صرف یہ کہ حضرت سے شرف تلمذ حاصل ہے بلکہ مجھے سند بھی حضرت نے اپنے دست شفقت سے لکھ کر عنایت فرمائی ہے۔ جس کو میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔

حضرت مدنی بجا طور پر شیخ العرب والعجم اور شیخ الاسلام تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے آثار علمیہ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین

دعاؤں کا طالب

(حضرت مولانا) محمد عبید اللہ (صاحب دامت برکاتہم)
مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

Jamia Ashrafia Ferozepur Road, Lhr. Ph: 0092-42-37577972, 37569758 Fax: 0092-42-37503339 Nila Gumbad Ph: 37243761 Madrisa-tul-Faisal-Lil-Banaat Model Town, Ph: 35880503, Mahad Ummul Qura Ph: 042-37552772 Fax: 042-37552966 Ql-Qubs Lil-Masakeen-Johar Town, Ph: 042-35171983, 36132003
E-mail: accounts_ashrafia@yahoo.com, Web Page: http://jamiaashrafia.org, http://www.al-islam.edu.pk

پیغام مسرت

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی زید مجدہ تشریف لائے اور انہوں نے بتلایا کہ ایک خصوصی نمبر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر نکالا جارہا ہے، یہ اطلاع باعث مسرت بھی ہے اور ایک اپنے دور کے شیخ الاسلام والمسلمین امام وقت صاحب جلال و جمال شخصیت کے حالات رفیعہ شائع ہونے کے اعتبار سے سعادت و خوش بختی بھی ہے۔

میرے والد ماجد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ کو جو شدید قلبی تعلق عقیدت و محبت کے التزام کے ساتھ تھا وہ آج بھی کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے، اور جن لوگوں کے علم میں یہ حالات نہیں ہیں وہ والد ماجد کی ''آپ بیتی'' پڑھ کر اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اور شیخ الاسلام مولانا مدنی کا جو تعلق میرے والد ماجد سے تھا وہ الحمدللہ آج بھی نسل در نسل خانوادۂ مدنی سے قائم اور باقی ہے، اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کو قائم رکھے بلکہ اس میں برکت بھی عطا فرمائے۔

بندہ دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس خصوصی نمبر کو قبول فرمائے، مبارک فرمائے اور پڑھنے والوں کے قلوب میں اپنے اکابر سے محبت اور احترام پیدا ہونے کا ذریعہ فرمائے۔

فقط والسلام

بندہ محمد طلحہ کاندھلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ لاہور

33 اے، کوئنز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

RAHIMIA INSTITUTE OF QURANIC SCIENCES (TRUST REGD.) LAHORE

RAHIMIA HOUSE 33-A, Queen's Road, Lahore Tel:6307714 , 6369089 Fax:7539656

Ref: Rahimia/07/12

Date: 01/07/12

محترم جناب مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی

صدر آل انڈیا تنظیم علمائے حق، دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے!

معلوم ہوا ہے کہ آپ "آل انڈیا تنظیم علمائے حق" کی جانب سے اپنے مجلّے "فکر انقلاب" کا ایک شمارہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی حیات وخدمات کو محور بنا کر شائع کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی نسل نو کے سامنے اکابرین امت کے حیات بخش افکار و تعلیمات رکھی جائیں اور ان کے سیرت و کردار سے انھیں آگاہ کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ ایک عالم ربانی اور آزادی و حریت کے عظیم مجاہد تھے۔ آپ اپنے دور میں ایک عظیم انقلابی مفکر اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے عظیم رہنما تھے۔ انھوں نے انتہائی نازک اور مشکل حالات میں برعظیم ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حوالے سے درست سمت کی طرف رہنمائی کی۔ اپنوں اور غیروں کی تمام مخالفت کے باوجود آپ عزم و ہمت کے پہاڑ بن کر سرفروشانہ جدوجہد کرتے رہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ اس جماعت حقہ کے فرد فرید تھے، جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ، قطب عالم حضرت عالی شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور قطب الارشاد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہ کے زیر نگرانی تیار ہوئی۔ آپ کے رفقا میں قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی قدس اللہ اسرارہم ہیں۔ ان حضرات کی اجتماعیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دینی زوال سے نکالنے، غلامی کے بندھنوں کو توڑنے، حریت و آزادی سے ہمکنار کرنے اور دین اسلام کی جامع تعلیمات، یعنی شریعت، طریقت اور سیاست کے فروغ کے لیے انتھک جدوجہد اور کوشش کی ہے۔

یہ وہ اکابرین امت ہیں کہ ان کے افکار و تعلیمات، سیاسی جدوجہد اور کوشش اور ان کے جامع فکر و عمل کو نوجوان نسل کے سامنے رکھنا، اس دور کی بڑی اہم ضرورت ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ موجودہ دور میں دین کا نام لے کر جو "اسلامی جماعتیں" بنائی جا رہی ہیں، انھوں نے دین کو خود ساختہ افکار کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ "اسلامی جماعت" نام رکھ کر برطانوی سامراج کی خدمت کرنے اور دین الٰہی سلسلے کے علمائے حق کی سیاسی اور دینی جدوجہد کو مسخ کرنے کا کام کیا ہے۔ دوسرے ان اکابرین نے ایسے مسخ شدہ

Page: 1

تصورات وخیالات رکھنے والی نام نہاد اسلامی جماعتوں کے خلاف بڑی جدوجہد کی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔

آخر زمانے میں جب حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ حج کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کو رائے پور میں اس کی اطلاع ہوئی۔ تو حضرت رائے پوریؒ نے اپنے خدام سے فرمایا: ''حضرت مولانا مدنی سے ملاقات کے لیے دیوبند جانا چاہیے۔'' چناں چہ حضرت رائے پوریؒ، حضرت مدنیؒ سے ملنے کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن رائے پوریؒ اور ہم خدام بھی ساتھ تھے۔ حضرت مدنیؒ کو اپنے مکان پر حضرت رائے پوریؒ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپؒ دارالحدیث سے سیدھے مکان پر تشریف لائے اور مولانا اسعد مدنی سے فرمایا کہ: ''حضرت کے لیے دسترخوان بچھاؤ۔'' اور گھر سے کھجوریں منگوا کر مہمانوں کے سامنے رکھیں۔ اور اپنے ہاتھ سے کھجوروں کی گٹھلیاں نکال نکال کر حضرت رائے پوریؒ کو کھلاتے جاتے تھے۔ اس دوران مزاحاً فرمایا کہ: ''آپ کو ابھی سے ہم کھجوریں اس لیے کھلا رہے ہیں، تاکہ حج سے واپسی پر آپ مطالبہ نہ فرمائیں۔'' اس طرح مزاح کا سلسلہ جاری رہا۔

اسی دوران حضرت مدنیؒ نے حضرت رائے پوریؒ سے فرمایا: ''معلوم ہوا ہے کہ آپ پاکستان جاتے رہتے ہیں۔'' حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا: ''جی ہاں! چوں کہ مشرقی پنجاب، جالندھر، لدھیانہ کے متعلقین وہاں چلے گئے ہیں، ان کے اصرار پر پاکستان جانا پڑتا ہے۔'' حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ: ''جس طرح آپ نے بنگال کا سفر فرما کر وہاں شرارت پسند لیگیوں کا خاتمہ فرمایا تھا، اسی طرح آپ پاکستان جاتے ہیں تو وہاں سے مودودی فتنے کی جڑیں بھی کاٹ کر آئیں۔ یہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کو نقصان پہنچانے والا فتنہ ہے۔'' حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا: ''جی ہاں جی ہاں! ایسا ضروری ہے۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نام پر فتنہ پرور عناصر کے خلاف کام کرنے کی ہمارے ان اکابرین کو کتنی فکر تھی۔ قومیں اپنی اصل تعلیمات کی اساس پر ترقی کرتی ہیں۔ دینِ اسلام کے حیات بخش افکار مسلمان جماعت، بلکہ کل انسانیت کے لیے ترقی اور امن اور معاشی اطمینان کا باعث ہیں۔ ہزارہ دوم میں دینی تعلیمات کی تجدید حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ نے کی ہے۔ اور پھر ان کے بعد حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے سلسلے کے علمائے ربانیین نے تجدیدی کردار ادا کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ اسی ولی اللّٰہی فکر کے ایسے سرخیل تھے کہ انھوں نے آخر دم تک ان حضرات کے تجدیدی کام کی روشنی میں دین کے انقلابی پیغام کے فروغ کے لیے بڑی کاوشیں کی ہیں۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ کا ہمارے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ حضرت مدنیؒ اکثر رائے پور تشریف لے جاتے یا حضرت رائے پوریؒ دیوبند تشریف لے جاتے رہتے تھے۔ اور سہارن پور میں حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ کے ہاں ان حضرات کی آمد ورفت کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی طرح ان حضرات کا باہمی تعلق امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ بھی تھا۔ یہ وہ

Page: 2

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

33 اے، کوئنز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

RAHIMIA INSTITUTE OF QURANIC SCIENCES (TRUST REGD.) LAHORE

RAHIMIA HOUSE 33-A, Queen's Road, Lahore Tel 6307714 , 6369089 Fax 7539656

Ref: Date

اکابر است ہیں کہ ان کے افکار و تعلیمات سے آگہی حاصل کرنا بڑا ضروری ہے۔

الحمد للہ! حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ کے مشن کے مطابق اس جماعت حقہ کے افکار و کردار سے پاکستان کی نوجوان نسل کو متعارف کرانے کے لیے حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے حکم پر ہم نے بھی کام شروع کیا ہوا ہے۔ الحمد للہ! اپنے ان اکابر کی توجہات کی وجہ سے یہاں کے نوجوانوں میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرات مشائخ رائے پور قدس اللہ اسرارہم کے افکار و تعلیمات سے نوجوان نسل کو آگاہ کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں "آل انڈیا تنظیم علمائے حق" نے حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہ پر ایک نمبر نکالنے کا عزم کیا ہے۔ یہ بڑی مبارک بات ہے۔ اکابر کے افکار و تعلیمات سے نوجوان نسل کو آگاہ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اس تنظیم کا کارنامہ ضرور محمود الفاظ سے لکھا جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت مدنیؒ کے فکر اور مشن کو زندہ کیا جائے۔ خاص طور پر حضرتؒ نے جس سیاسی سوچ اور قومی فکر کے ساتھ کام کیا، اسے سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کو تنگ نظری، جمود اور فرقہ واریت کے زہر سے بچایا جائے۔ اور قومی شعور کے ساتھ امن، عدل، انصاف اور قومی خوش حالی کے لیے کردار ادا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین!

فقط سعید احمد رائے پوری

سعید احمد رائے پوری عفی عنہ

یکے از خدام حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ

10/ شعبان المعظم 1437ھ / یکم جولائی 2012ء

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور، پاکستان

Page: 3

JAMIA ISLAMIA
ANWAR-UL-ULOOM
FEDERAL 'B' AREA, BLOCK 10, KARACHI-PAKISTAN.

جامعہ اسلامیہ انوار العلوم
فیڈرل بی ایریا بلاک ۱۰ کراچی، پاکستان

جناب احسن مہتاب، مدیر "فکر انقلاب" نئی دہلی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ ادارہ فکر انقلاب مجاہد آزادی اور اسیر مالٹا شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی حیات وخدمات اور ان کے سیاسی اور اصلاحی کارناموں کے مربوط تذکرے پرمبنی ایک خصوصی شمارہ شائع ترتیب دے رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو معلوم ہوتے ہی بلا ساختہ دل سے دعائیں نکلیں اور رشک آمیز جذبات کے ساتھ میں نے دل میں یہ کہا کہ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ آپ اپنی تنظیم آل انڈیا علمائے حق کے پلیٹ فارم سے اکابر واسلاف کے کارناموں پر مبنی گرد کو جھاڑنے کے لیے خصوصی شماروں کی جو سیریز پچھلے کئی سالوں سے چھاپ رہے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ موجودہ نسل کی اصلاح وتربیت اور دینوی ترقی کے لیے خضر راہ ثابت ہوگا، بلکہ برصغیر ہند وپاک کی اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار پر ریسرچ وتحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے بھی قاموسی حیثیت کا حامل ہوگا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ آج کے مادی دور میں وسائل کی فراوانی نے ساری مسائل کی خلیج پاٹ دی ہے اور رسائل واخبار کی اشاعت کوئی غیر معمولی کام نہیں رہ گیا ہے، لیکن ایک مشن اور جذبے کے ساتھ اور تمام مادی منفعت سے بے نیاز ہوکر اخبار یا رسالہ نکالنا آج بھی دل گردے کا کام ہے۔

یہ خصوصی شمارہ جلد چھاپیے، ان شاء اللہ یہ شمارہ بھی ماقبل کے شماروں کی طرح علمی اور مذہبی حلقوں پر مسلط جمود کو توڑے گا اور آپ کا اسلاف کے ذکر خیر پرمبنی کتابی سلسلہ اگر صرف مدرسی حلقوں کے جمود اور فکری پس روی پر بھی بند باندھنے میں کامیاب رہا تو یہ یقیناً اہل کاروان ادارہ فکر انقلاب کے لیے فال نیک ثابت ہوگا۔ عوام الناس کی بھیڑ تو ہر طرف مل جاتی ہے، ایک ڈھونڈو ہزار مل جاتے ہیں، لیکن کام کرنے والے لوگ انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں، آپ بھی انھیں معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جو کسی صلے اور ستائش کی تمنا کیے بغیر اکابر واسلاف کے روشن کارناموں سے اردو داں طبقے کو متعارف کرنے میں لگے ہیں۔ اس میدان میں لوگ بہت جلد حوصلہ ہار جاتے ہیں، مجھے امید ہے کہ اس راہ پر آپ کے قدم مضبوطی کے ساتھ بڑھتے رہیں گے اور علامہ اقبال کے اس مصرع کی تصویر پیش کریں گے کہ

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

فقط والسلام

مولانا اسعد زکریا قاسمی

مہتمم جامعہ اسلامیہ انوار العلوم کراچی

فون: 6360080-6368037 فیکس: 92-21-6343199 ای میل: qasmi1@yahoo.com ویب سائٹ: www.jamiaanwar-ul-uloom.com

Jamia Islamiyyah Talim ul Qur'an
Jamia Masjid Al-Falah, P.E.C.H.S.
Karachi, Pakistan.
Ph : 4547201

جامعۂ اسلامیۂ تعلیم القرآن
جامع مسجد الفلاح بی ای سی ایچ ایس ۔ کراچی ۔ پاکستان

باسمہ تعالیٰ

Ref ____________

Date ۱۱ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔ اما بعد!

"حسنِ تدبیر" کی خصوصی اشاعتوں اور خاص نمبروں کی اشاعت کا مبارک سلسلہ سال بہ سال جاری ہے۔ ان میں اکابر علمائے دیوبند و جہاں نور پر خصوصی شمارے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ برس برکۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی حیاتِ مبارکہ اور خدماتِ جلیلہ سے متعلق ضخیم نمبر شائع ہوا۔ حضرت مولانا اعجاز احمد عرفی قاسمی زید مجدہم جنہوں نے اس عظیم الشان خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور ہر برس ایک شاہکار منظرِ عام پر لا رہے ہیں انتہائی قابلِ مبارکباد ہیں، بندہ بارگاہ میں ان کی یہ کوشش و کاوش [illegible] جاری ہے۔ دادِ او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرطِ قابلیت دادِ اوست۔

سال ۱۴۳۴ھ / ۲۰۱۳ء کے لئے "حسنِ تدبیر" کا خصوصی نمبر حضرت شیخ الاسلام شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ و برد مضجعہٗ کی حیاتِ مبارکہ و خدماتِ جلیلہ کے تذکرہ پر مشتمل ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز یہ شمارہ بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کی عبقری شخصیت اور ان کی ہمہ گیر اور جامع الصفات والکمالات ہستی کے تفصیلی بیان اور تعارف پر مشتمل ہوگا۔ جس میں آپ کی علمی و عملی خدمات کی حیثیت سے دار العلوم دیوبند کے آفتاب و ماہتاب ہونے اور سیاسی حیثیت سے ایک صاحبِ بصیرت ہستی اور مرجعِ خلائق ہونے کے اعتبار سے معرفت و سلوک کا بحرِ ذخار، غرض کہ ہر حیثیت سے ہر موضوع پر اہلِ علم و دانش و اربابِ قلم خامہ فرسائی فرمائیں گے۔ درحقیقت ایسے باکمال افراد امت میں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کے نقوشِ سیرت رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں، جن کے مناقب اہلِ علم و بصیرت و اہلِ معرفت کے لئے رہبری و رہنمائی کا کام دیتے ہیں جن کے درسِ حدیث کا فیضان تاحال پاک و ہند و بنگلہ دیش اور عالمِ عرب و عجم میں جاری ہے۔
اللہ تعالیٰ "حسنِ تدبیر" کے اس خصوصی شمارے کی برکات و فیوض کو عام و تام فرمائے۔ آمین۔

احقر العباد

مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

MADRASA MAZAHIR ULOOM (WAQF) SAHARANPUR 247001 (U.P) INDIA PH. 0132-2653018

نمبر ــــــــ تاریخ ۱۱ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید الاولین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔ امابعد

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر اسلام کے تحفظ اور خدمت کے بہت سے راستے پیدا فرمائے ہیں چنانچہ دعوت الی اللہ، درس وتدریس، ذکر وفکر کی خانقاہیں، اسلام کے دفاع اور حفاظت کے نبوی طریقے، فرق باطلہ کا دندان شکن جواب دینے کے لئے مناظرے، خیر کے کاموں کی طرف بلانے اور برائیوں سے بچانے کے لئے اکابر اہل اللہ کی خدمات کے جلی نقوش، تصنیفات وتالیفات، تحریری وتقریری خدمات اور اخبارات ومجلات کے ذریعہ اسلام کی آواز اور تعلیمات کو دور دور تک پہنچانے کے لئے عملی کوششیں اسی توفیق الٰہی کا ثمرہ ونتیجہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بھی ہم سے یہی چاہتے ہیں کہ دین کی طرف بلانے، خیر کے کاموں کا حکم دینے اور برائیوں سے بچانے کے لئے الگ الگ جماعتیں ہونی چاہئیں، خانقاہوں میں بیٹھنے والے حضرات ذکر الٰہی سے قلوب انسانی کو صیقل کریں، مدارس اسلامیہ کے ذریعہ تدریسی خدمات انجام دینے والے حضرات طالبان علوم دینیہ اور تشنگان علوم قرآنیہ کو تعلیمات اسلامیہ سے واقف وروشناس کرائیں۔ صاحبان تقریر وتحریر کا مظاہرہ کریں اور تمام امور کی انجام دہی کے دوران اللہ وحدہ لاشریک لہ سے کامیابی کی امید اور لو لگائے رہیں۔

اکابر اور بزرگوں کی باتیں، ان کے ملفوظ وتذکرے، ان کی تجربہ کار باتوں پر عمل اور ان کی مخلصانہ تعلیمات وہدایات فکر انسانی کو آب حیات بخشتی ہیں اور ان کے تذکروں پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ عند ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ

جناب مولانا محمد اعجاز عرفی صاحب نے اس سے پہلے بھی کئی خصوصی شمارے اکابر اہل اللہ کی حیات اور شخصیت پر شائع کئے ہیں اور اب جریدہ "فکر انقلاب" کے ذریعہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی حیات پر خصوصی شمارہ شائع کر رہے ہیں۔

امید ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت اور سوانح پر مشتمل اس شمارے سے عوام وخواص کو فائدہ پہنچے گا اور قارئین کی اسلامی زندگیوں میں صالح انقلاب پیدا ہوگا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

العبد

(مولانا) محمد سعدی

ناظم وِمتولی مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

المکتب الرئیسی
جامعہ اشرفیہ شارع فیروز پور لاہور
ٹیلیفون ۳۷۵۷۷۹۷۲
۳۷۵۸۸۱۲۲
۳۷۵۶۹۷۵۸
فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۵۰-۳۳۳۹

الجامعة الاشرفیة

شارع فیروز پور ○ لاہور ○ پاکستان

الفروع: جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد
ٹیلیفون ۳۷۲۴۳۳۶۱
مدرسۃ الفیصل للبنات ماڈل ٹاؤن
ٹیلیفون ۳۵۸۸۵۵۹۰
معہد ام القریٰ
ٹیلیفون ۳۷۵۵۲۷۷۲
القبۃ للمساکین جوہر ٹاؤن
ٹیلیفون ۳۵۱۷۱۹۸۳

مورخہ ۹۔ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

حوالہ ....

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد

مسلک اہل السنۃ والجماعت کے ترجمان دیوبندی مکتب فکر کے اکابر علماء کرام جن پر صرف برصغیر ہندو پاک کے ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ممتاز شخصیات خصوصاً ارباب علم و دانش کو بجا طور پر ناز ہے ان میں ایک چوٹی کی شخصیت حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کی بھی ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہ جنہیں بجا طور پر شیخ الاسلام کہا جاتا ہے کو اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز سے بھی نوازا ہے کہ آپ نے روضہ اقدس کے پہلو اور ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر سالہا سال حدیث مبارکہ کا درس دیا جہاں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا کرتے تھے قال صاحب ھذا القبر صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ وہ شرف ہے جو اس برصغیر سے جس شخصیت کے مقدر میں آیا وہ یہی ہمارے حضرت مدنی تھے۔ حضرت کا زہد، تقویٰ، ورع، للہیت اور خوف خدا ایسا تھا جس کی بنا پر قسم کھائی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد حنیف قدس سرہ جو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے شاگرد اور حضرت ہی کے تربیت یافتہ تھے فرمایا کرتے تھے:

جب تحریک پاکستان زور و شور سے چل رہی تھی کچھ لوگ ہمارے اکابرین کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ شیخ الاسلام حضرت مدنی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ کے درمیان بھی پیش آیا۔ شیخ الاسلام حضرت عثمانی نے فرمایا کہ حضرت مدنی جو چاہیں فرما سکتے ہیں انہیں اس کا حق ہے تاہم میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے حضرت مدنی کے تقویٰ میں بھی شک نہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ دیوبندی مکتب فکر اور اس کے اکابرین کو جن شخصیات پر ناز ہے وہ یہ کہ جو اس مکتب فکر کی اساس ہیں وہ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لیے اہل سنت والجماعت کے بڑے مکتب فکر کی آبیاری ان ہی کے علوم و معارف کی مرہون منت ہے۔ مولانا اعجاز عرفی مدظلہ اس لحاظ سے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اکابر علماء دیوبند پر خصوصی نمبرز شائع کرنے کی توفیق سے نوازا ہے۔ حضرت مدنی کے حوالے سے موجودہ خصوصی اشاعت ان کے اسی سلسلۃ الذھب کی ایک اور کڑی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

دعاگو
محمد اکرم کاشمیری عفی اللہ عنہ
خادم طلبہ و مدیر
ماہنامہ الحسن جامعہ اشرفیہ لاہور
۹۔ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

Jamia Ashrafia Ferozepur Road, Lhr. Ph: 0092-42-37577972, 37569758 Fax: 0092-42-37503339 Nila Gumbad Ph: 37243781 Madrisa-tul-Faisal-Lil-Banaat Model Town, Ph: 35885590, Mahad Ummul Qura Ph: 042-37552773 Fax: 042-37552996 Al-Quba Lil-Masakeen-Johar Town, Ph: 042-35171983, 35152003
E-mail: accounts_ashrafia@yahoo.com, Web Page: http://jamiaashrafia.org, http://www.al-islam.edu.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Mohammad Kaleem Siddiqui

Chairman : Jamiat Imam Waliullah Trust
President : World Peace Organisation (New Delhi)
Patron : ARMUGHAN, Urdu Monthly Magazine
Patron : Sarva Shanti (Hindi Magazine)
Rector : Jamia Imam Waliullah (Phulat)

محمد کلیم صدیقی
پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی)

Ref.....................   Dated.....................

پیغام

برصغیر کی جن عظیم شخصیات پر پورے عالم میں یہاں کے لوگ بجا طور پر فخر کرنے کا حق رکھتے ہیں، ان میں ایک ممتاز ترین نام نامی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کا ہے، جن کے علمی، روحانی، اصلاحی، دعوتی اور سیاسی فیوض و برکات کی تاریخ اگر مرتب کی جائے تو اس کے لئے کتب خانے درکار ہوں گے، ملت اسلامیہ پر حضرت مدنیؒ کی صرف سیاسی خدمات کے احسانات و برکات اتنی ہیں کہ ملت ان احسانات کا شکر ادا نہیں کر سکتی، اپنی ٹوٹی پھوٹی دینی و دعوتی خدمات کے میدان میں جب بھی کسی دینی اور علمی لحاظ سے پس ماندہ علاقہ میں حاضری ہوئی تو بار بار یہ احساس ہوا کہ اس سے کہیں زیادہ اجتماعی اور قومی لحاظ سے پس ماندہ اور تقریباً ارتداد زدہ کتنے سارے علاقے اور برادریاں ایسی ہیں جہاں حضرت مدنیؒ کے قدموں کی برکت سے حالات تبدیل ہوئے، اور وہ قومیں اور برادریاں جن کی اسلامی شناخت تک ختم ہو گئی تھی، حضرت مولاناؒ کے ایک مرتبہ اس علاقہ میں گذرنے، اور آپ کے قدموں کی برکت سے ان کی کایا پلٹ گئی اور ان بستیوں اور برادریوں میں علمی، تعلیمی، دعوتی اور اسلامی قیادت کرنے والوں کی بھیڑ پیدا ہو گئی۔

ملت کے اس عظیم محسن، جس کی احسان مندی سے ملت کے ہر فرد کا رُواں رُواں زیر بار ہے، ان کی یاد میں کسی دینی رسالہ کا خصوصی نمبر شائع کرنا ملت کے لئے بڑا فال نیک ہے، حضرت مدنیؒ کی شخصیت اور ملت پر ان کے احسانات کا حق ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر نمبر نکالے جائیں، اور آئندہ نسلوں کو ان کی عبقری شخصیت اور ان کے کرشماتی کارناموں سے واقف کرایا جائے۔ عزیز گرامی مولانا محمد اعجاز عرفی صاحب اس سے پہلے اپنے رسالہ حسن تدبیر کے متعدد ضخیم اور خوبصورت شمارے شائع کر چکے ہیں، اور وہ اس راہ کے ایک تجربہ کار شہ سوار ہیں، توقع ہے کہ وہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق ''فکر انقلاب'' کا یہ خاص شمارہ بھی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کریں گے، اور ایسے خوب صورت، ضخیم، جان دار اور شان دار نمبر شائع کرنے کی تاریخ رقم کریں گے۔ میں ان کے اس اقدام پر انہیں مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

والسلام

خاک پائے خدام دین

[محمد کلیم صدیقی]

پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی)

۲۲ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

PHULAT, DISTT. MUZAFFAR NAGAR 251201 (U.P.) INDIA
Mob. 09313303149, 9412411876[Armughan] Email: arm313@gmail.com

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ (REGD.)
آل انڈیا تنظیم علماءِ حق

Ref. No. .... Date. ....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

ماہنامہ حسن تدبیر دہلی کے مدیر شہیر مولانا محمد اعجاز عرفان قاسمی حفظہ اللہ تعالیٰ سے کراچی میں گذشتہ قریب میں ملاقات ہوئی تھی موصوف ذی استعداد ہیں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مولانا موصوف [illegible] درس و تدریس، علم و تحقیق کا مشغلہ جاری رکھے ہوئے ہیں "حسن تدبیر" نے اکابر دیوبند پر ضخیم نمبر شائع کئے اور اب حضرت شیخ الاسلام شیخ العالم مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ پر ایک ضخیم گلدستہ علم و معرفت کی تیاری میں مصروف ہیں حضرت شیخ الاسلام سے والد ماجد شیخ الحدیث مولانا عبد الحق قدس سرہ سابق مدرس دار العلوم دیوبند [illegible] تلمیذ رشید شیخ و استاذ تھے اس نسبت سے ہمارا [illegible] حقانیہ میں ہر سال ذکر ہوتا اور بے شمار فضلاء کی بالواسطہ حضرت مدنی سے [illegible] نسبت قائم ہے [illegible] شخصیت کے ہر پہلو پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ [illegible] نوجوان طلبہ و علماء اس سے روشنی حاصل کر سکیں اس لحاظ سے "حسن تدبیر" کا یہ انتخاب [illegible] اسم با مسمّٰی [illegible] کر رہا ہے اللہ تعالیٰ مولانا اعجاز قاسمی کو [illegible] توفیق عطا فرمائے [illegible] آنکھیں حضرت مدنی پر شائع [illegible] سے مستفید ہو سکیں

سمیع الحق

خادم دار العلوم حقانیہ
اکوڑہ خٹک
[illegible] ۱۴۳۳ھ
2012

Q-25, Al-Samad Road, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Tel./Fax : 011-26985943 Mob.: 08130271786, 08447290934
E-mail: aitulemachaq@gmail.com Web.: www.aitulamachaq.org

الجامعة البنورية العالمية
BINORIA UNIVERSITY INTERNATIONAL

Ref: 786/Mics/12

Date: 30/06/2012

جناب احسن مہتاب ایڈیٹر "فکر انقلاب" دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام نے درس وتدریس اور تصوف وسلوک کی محفل سجانے کے ساتھ سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی اپنی خدمات کے نمایاں نقوش ثبت کیے ہیں۔ انہوں نے دارالعلوم کی مسند تدریس کے ذریعے تشنگان علوم نبویہ کی پیاس بھی بجھائی اور برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کی دینی اور ملی قیادت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ان کی حیات مستعار کا ہر لمحہ قوم وملت کی ہمہ جہت خدمت اور جدوجہد آزادی میں مردانہ وار شرکت کے لیے وقف تھا۔ اگر حضرت شیخ الاسلام نے بروقت مسلمانوں کے قافلہ حریت کی قیادت کی زمام کار نہ سنبھالی ہوتی تو مسلمانوں کے دینی اور ملی وجود کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا۔ حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت صرف برصغیر ہندو پاک میں ہی نہیں، بلکہ عالمی پیمانے پر جانی جاتی ہے۔ لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ نسل نو ان کے روشن کارناموں سے ناواقف ہے۔

آپ نے "فکر انقلاب" کا خصوصی شمارہ حضرت شیخ الاسلام کی حیات وخدمات پر شائع کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے یہ آپ کا انتہائی قابل صد تبریک کارنامہ ہے جس کے لیے [illegible] آپ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ مستقبل میں بھی اللہ تعالیٰ آپ سے علمی مذہبی اور دینی کام لیتا رہے آمین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مفتی محمد نعیم

مہتمم [illegible]

Post Box No: 10698, Near S.I.T.E Police Station, Karachi - Pakistan
Ph: +92 (21) 32560300 - +92 (21) 32560400 Fax: +92 (21) 32564586
Websites ; www.binoria.org - www.jamiabinoria.net Email: binoria@binoria.org

K. Rahman Khan, FCA
Minister of Minority Affairs
Government of India

सत्यमेव जयते

کے۔ رحمن خان، ایف سی اے
مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور
حکومت ہند

"پیغام"

مجھے یہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی کہ آل انڈیا تنظیم علماء حق کے سکریٹری جناب احسن مہتاب صاحب مولانا اعجاز عرفی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والا پندرہ روزہ "فکر انقلاب" شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے خصوصی نمبر شائع کررہا ہے۔ ایک مستحسن قدم ہے۔ بلاشبہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ کا شمار ایشیا کے نہیں بر صغیر کے ممتاز، محترم اور برگزیدہ علما میں کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت والا نے شیخ الحدیث کی حیثیت سے طویل عرصہ تک عالمی شہرت کی حامل علمی اور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں رہ کر درس حدیث کے ذریعہ دین حنیف کی مثالی خدمت کی۔ آپ کے شاگرد، مرید اور عقیدتمند نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں علم دین کا پرچم لہرا رہے ہیں۔ آپ کی زندگی اللہ اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ سے والہانہ عشق کا مثالی نمونہ تھی۔ تقوی پرہیزگاری آپ کی پاکیزہ زندگی کا وصف تھا۔ آپکی زندگی کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ وطن عزیز ہندوستان سے ان کو بےحد محبت تھی انگریز سامراج کے تسلط کے بعد انھوں نے جب یہ محسوس کیا کی انگریزی حکمرانی اب ناقابل قبول ہے تو وہ باضابطہ طور پر آزادی کی تحریک میں شامل ہوکر اپنے پیر و مرشد اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ اپنی زندگی کو وقف کیا نتیجے کے طور پر حضرت کی گرانقدر کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمارے علمائے کرام کی قربانیاں رنگ لائیں اور آزادی ہندوستان کا مقدر بنی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت جمعیۃ علماء ہند آپ ہی کی سرپرستی میں قائم ہوئی۔ یہ وہ نمائندہ جماعت ہے جس نے ملک کی سلامتی، قومی یکجہتی اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہمیشہ صدائے حق بلند کی، یہ وہ تنظیم ہے کہ جس کی خدمات تاریخ کے سنہرے اوراق میں محفوظ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوصی اشاعت کے ذریعہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی بابرکت ذات گرامی سے ہماری نوجوان نسل متعارف ہوسکے گی نیز ان کی علمی، دینی اور دعوتی خدمات کو "فکر انقلاب" کا خصوصی نمبر حضرت والا کی ذات گرامی کو عوام و خواص اور بالخصوص نئی نسل کو متعارف کرانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس عظیم الشان اشاعتی خدمت کے لئے مولانا اعجاز عرفی قاسمی صاحب اور محترم احسن مہتاب صاحب قابل مبارکباد ہیں جن کی کوششوں سے یہ خصوصی نمبر شائع ہورہا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ شمارہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی خدمات کو عوامی سطح پر مقبول کرنے میں مددگار ہوگا۔ اس خصوصی اشاعت کی کامیابی کے لئے میں خصوصی طور پر دعا گو ہوں۔ شکریہ۔

(کے۔ رحمن خان)
مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور، حکومت ہند۔

مورخہ: ۱۳ دسمبر ۲۰۱۲

Office: 11th Floor, B-1 Wing, Paryavaran Bhawan, CGO Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Tel/fax: 011-24304273-76
Residence: 28, Akbar Road, New Delhi-110 011 Telephone No: 011-23795782/23795021

OSCAR FERNANDES, MP

Resi : 8 Pt. Pant Marg
New Delhi-110 001
Tel. No. 23359177
23359178
(O) : 23015947

Message

I am happy to know that the All India Tanzeem Ulama-e-Haq has already published a fortnightly magazine FIKRE-E-INQLAB in May, 2012, to spread the message of National Integration and brotherhood. Indeed, it is commendable and will go a long way to inspire the young generation to propagate the message of peace and National Integration.

Now, the FIKRE-E-INQLAB is again coming out with its next publication on Hussain Ahmad Madni very soon and his quality of plurality and tolerance remains to be propagated at every level and it is for this reason that I support the launch of next publication of "FIKRE-E-INQLAB". I wish the publication every success.

(Oscar Fernandes)
18th December, 2012

Shri Ahsan Mehtab,
Chief Editor,
Fikr-E-Inqlab (Fornightly),
Delhi

बेनी प्रसाद वर्मा
BENI PRASAD VERMA

इस्पात मंत्री
भारत सरकार
उद्योग भवन,
नई दिल्ली-110107
MINISTER OF STEEL
GOVERNMENT OF INDIA
UDYOG BHAWAN
NEW DELHI-110107

MESSAGE

I am happy to know that Fikr-e-Inqlab is bringing out a special issue to commemorate the contribution of the renowned Alim and great freedom-fighter, former Shaikhul Hadith Shaikhul Islam Hazrat Maulana Husain Ahmad Madni to the mankind in variety of fields.

It is a historic fact that Husain Ahmad Madni dedicated all his might to political and social liberation of the country. He had continuously served the people of his motherland with dedication and commitment and played a pivotal role in the freedom struggle and unification of our country. His life is a source of courage and inspiration to all. In my opinion, it is the opportune time to recognize his selfless contribution to the nation.

I take this opportunity to convey my best wishes to the organizers in their endeavour.

(Beni Prasad Verma)

10 JAN 2013

ISMAIL HUSSAIN

MEMBER OF PARLIAMENT
(LOK SABHA)

3-5, North Avenue
New Delhi-110001
Ph-: 011- 23093905
Mobile-: 09013180351

Date-: 24-11-2012

Janab Ahsan Mehtab **Sb.**

I hope you will be fine, I am glad to know that All India Tanzeem Ulama-e-Haq is publishing a fortnightly Urdu News Paper FIKR-E-INQLAB and planning to publish about Shaikhul Hadith Shaikhul Islam Hazrat Maulana Hussain Ahmad Madni.

I hope Islamic Knowledge will spread by this News Paper. I wish all success.

(Ismail Hussain)

Janab Ahsan Mehtab,
Chief Editor,
Fikr-E-Inqlab,
Q-25, Al-Samad Road,
Batla House, Jamia Nagar,
New Delhi-25

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
ISO 9001 : 2008 Certified Organisation

Tel. No. : 011-49539000
Fax No. : 011-49539099
Farogh-e-Urdu Bhawan
FC-33/9, Institutional Area
Jasola
New Delhi-110 025

Dated:

صدر محترم مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

نئی نسل کے لیے تابندہ ماضی کے جن آفتاب و ماہتاب کے سوانحی بیانیہ کو رسالہ 'فکر انقلاب' زینت بخش رہا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ اس بات سے بڑی مسرت ہے کہ آپ نے مجوزہ اگلا شمارہ قوم و ملت کے لیے سرمایہ افتخار شخصیت، مجاہد آزادی اور اسیر مالٹا شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی ذات گرامی کے لیے مختص کیا ہے۔ آج کی تیز رفتار زندگی کے تقاضوں میں نئی نسل کے اذہان سے جس طرح ماضی کے روشن نقوش مٹتے جا رہے ہیں، ایسے میں آپ کا یہ فیصلہ بجا طور پر قوم و ملک کے لیے نیک فال ہے۔ آپ کی اس نیک نیتی میں ہم برابر کے شریک ہیں۔

والسلام

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

پیغام

عالی جناب سراج الدین قریشی صدر انڈیا اسلامک کلچر سینٹر، دہلی

بلاشبہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا اسلامیان ہند پر بڑا احسان ہے، اگر آپ نے اپنی مہم کو دو دھاری تلوار کے طور پر استعمال نہ کیا ہوتا تو آج نہ تو ہمیں آزادی نصیب ہوتی اور نہ ہی ہندوستان میں اسلام اس شان و عظمت کے ساتھ پھولتا بڑھتا۔ حضرت شیخ الاسلام نے جدوجہد آزادی کے لیے جو قربانیاں دیں وہ اظہر من الشمس ہیں؛ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان قربانیوں کا کوئی صلہ صاحبان اقتدار سے کبھی طلب نہ کیا۔ طلب کرنا تو بہت دور خود حکومت کی پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا۔ حصول آزادی کے بعد جب حکومت نے مجاہدین آزادی کو عطیات اور اعزازات سے نوازنا شروع کیا تو حضرت شیخ الاسلام کو بھی پیشکش کی؛ لیکن آپ نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ہم نے جدوجہد آزادی میں قربانیاں اسلام کی سربلندی اور وطن عزیز کی بقا کے لیے دی تھیں، ان اعزازات کے لیے نہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ آل انڈیا تنظیم علماء حق کے تحت "**فکر انقلاب**" کا خصوصی شمارہ، 'حضرت شیخ الاسلام نمبر' کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اپنے ان اکابر کی قربانیوں اور ان کی حیات و خدمات سے نئی نسل کو روشناس کرایا جانا بے حد ضروری ہے۔ اس مبارک کوشش کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا آپ کی اس عظیم خدمت کو قبول فرمائے۔ (آمین)

خادم

سراج الدین قریشی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفتی احمد خانپوری
جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین
ڈابھیل، ضلع نوساری، گجرات، الہند

MUFTI AHMED KHANPURI
Jamiah Islamiah Talimuddin,
Dabhel, Dist. Navsari, Gujarat - India

Date

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محب مکرم ومحترم جناب مولانا محمد اعجاز احمد عرفی صاحب زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی آپ کے فون سے یہ معلوم ہوکر دلی مسرت ہوئی کہ
"آل انڈیا تنظیم علمائے حق" کا ترجمان سہ ماہی مجلہ "محسن تربیت"
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب قدس سرہ العزیز
کی حیات وخدمات کے تعارف پر مشتمل خصوصی شمارہ شائع کررہا
ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت اور آپ
کی علمی ودینی وملی خدمات تعارف کی محتاج نہیں لیکن مرور
ایام نے ہماری نئی نسل کو ہمارے ان محسنین کے کارناموں کی طرف
سے غافل کرنا شروع کردیا ہے، جس کا نتیجہ یہ اکابر دیوبند کی دینی
وملی خدمات کی طرف سے بے خبری کا سلسلہ نئی نسل میں عام
ہوتی جارہی ہے، جس کا خمیازہ مختلف صورتوں میں ہم بھگت رہے ہیں
ضرورت تھی کہ پرانی یادوں کو تازہ کیا جائے، جو موجودہ نسل
کی فکری وذہنی تربیت میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے،
اللہ تعالیٰ "محسن تربیت" کی اس خصوصی اشاعت کو اپنی سابقہ
روایت کے مطابق ہر پہلو سے عمدہ اور معیاری بناکر پیش
کرنے کی توفیق نصیب فرمائے فقط

والسلام
احمد خانپوری
مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
یوم چہارشنبہ

Abul Hasan Azmi
Ustaz Tajweed -O-Qira'at Darul Uloom Deoband

ابوالحسن اعظمی
خادم التجوید و القراءۃ دارالعلوم دیوبند الہند

Ref ....

Dated ....

ہمارے اکابر کے شئون الگ الگ ہیں اور ہر ایک نیا رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔ دین کے جتنے بھی اہم شعبے ہیں کسی نہ کسی شعبے کے ساتھ بزرگوں کے تخصصات تھے، اپنی دینی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی حضرات نے دین کی عظیم خدمات انجام دیں۔

آپ نے حضرت تھانویؒ، حضرت بڑے شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت حکیم الاسلامؒ اور محدث عصر کشمیریؒ وغیرہ پر جتنے وقیع اور اہم دستاویزی نمبرات شائع کئے ہیں بلاشبہ یہ آپ کی اولوالعزمی کے واشگاف دلائل ہیں۔ آپ کی اعجازی ہمت کا ایک جہان قائل و معترف ہے۔ ہمارے اکابر میں حضرت مدنیؒ کی الگ ہی خصوصیات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "**فکر انقلاب**" کی یہ خصوصی اشاعت زعیم انقلاب کی ہمہ جہتی اور کثیر رخی حیات و خدمات پر خاطر خواہ روشنی ڈال کر ملک و ملت کی عظیم خدمت انجام دے گا۔

میں سویدائے قلبی سے مدیر مکرم و دیگر تمام رفقاء کرام کو ہدیہ تبریک کے ساتھ نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔

خدا کرے یہ خصوصی شمارہ متنوع معلومات کے ساتھ ملت کے بھی افراد کو انقلابی اور عملی جدوجہد کے لئے کمربستہ کرے۔

والسلام
ابوالحسن اعظمی

ابوالحسن اعظمی

۳۱/ دسمبر ۲۰۱۲ء

حسن منزل اشرف آباد، محلہ خانقاہ دیوبند۔ ۲۲۷۵۵۴ موبائل نمبر۔ ۹۳۱۲۶۵۱۰۲۷

Dr. Syed Afzal Hussain Qasmi
Unani Physician

ڈاکٹر و حکیم سید افضل حسین قاسمی
یونانی معالج

Rf. ______ Date ______

اکابر کی حیات و خدمات پر مبنی، آپ ہر سال حسن تدبیر کا ضخیم خصوصی شمارہ شائع کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور اس کے لیے مجھ سے کسی مجوزہ موضوع پر مضمون کی فرمائش بھی کرتے ہیں، یہ مجھ سے آپ کی محبت ہے اور اپنے مقصد میں انہماک کی بھی دلیل ہے کہ کہاں ہم لوگ سال میں ایک مضمون بھی لکھنے سے اپنے کو قاصر پاتے ہیں اور کہاں آپ ہیں کہ ہر سال علم و عمل کی مجلس میں کوئی نہ کوئی علمی گل دستہ لے کر ہماری فکری ضیافت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔

اس بار شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا انتخاب آپ کی دوررسی اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے ان کی شخصیت پر مختلف عنوانات سے جتنا کیچڑ اچھالا گیا کہ ان کی خدمات پردے میں چلی گئیں۔ ۶۵ رسال بعد ہی سہی، آپ نے ان کے علمی اور باطنی کمالات سے اردو والوں کو باخبر کرانے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ ورنہ آج کل کے لوگ بڑے زود فراموش واقع ہوئے ہیں، ادھر آنکھ بند ہوئی اور ادھر لوگ ان کے کارناموں کو نذر طاق نسیاں کر دیتے ہیں۔ آپ نے گاہے گاہے بازخواں کی روش کے تحت دوبارہ ان بزرگوں کے احوال و کوائف کو آواز دینے کی جد وجہد کی ہے کہ اسی میں ملت اسلامیہ کی بقاء کا راز پوشیدہ ہے۔ اس راہ میں قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی کہ علم و تحقیق کی دنیا بڑی بے حس واقع ہوئی ہے۔

اللہ آپ کی اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ اس کتابی سلسلے کو جاری رکھے۔ سچ جانیے تو یہ کتابی سلسلہ نہ صرف آپ، بلکہ آپ کے علمی اور ملی کارناموں کا شناخت نامہ بن گیا ہے۔

فقط والسلام
ڈاکٹر افضل حسین قاسمی
بنگلور

103/7, Surana Complex, P&T Colony Bus Stop, Venkateshpuram, Bangalore - 560 045
Ph: 25478397 Cell: 94483 44458

જામિઅહ ફયઝે સુબ્હાની

JAMIA FAIZ-E-SUBHANI

SAIYEDPURA, RAJAWADI, SURAT-395003, GUJARAT (INDIA)

(0261) 2453630

Ref. No. ______ Date ______

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی قومی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی

آپ سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ اکابر کی حیات و خدمات پر مبنی کتابی سیریز کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بار کا شمارہ عظیم مجاہد آزادی اور دار العلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث اور جمعیۃ علمائے ہند کے سابق صدر مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت سے منسوب ہے۔ ابھی کچھ روز قبل اخبارات میں آپ کی علالت کی افسوسناک خبر نظروں سے گزری تھی اور ابھی اس اشاعت کی ناقابل بیان مسرت۔ مجھے تو اس عمر میں بھی آپ کی تیز رفتار زندگی اور ہر وقت کام کرتے رہنے کی خو پر بڑا تعجب ہوتا ہے۔ ابھی بیمار تھے اور ڈاکٹر نے چھٹی کیا دی کہ بستر مرض سے اٹھتے ہی پھر آپ نے قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ قائم کر لیا ہے۔ ایک ہی وقت میں اتنے سارے کام کے لیے بڑی بڑی اکیڈمیاں قائم کی جاتی ہیں اور اس کے لیے بڑی طویل المیعاد منصوبہ بندی کی جاتی ہے، لیکن آپ کا معاملہ بالکل دوسروں سے الگ ہے۔ لگتا ہے کہ یہ کتابی سلسلہ آپ کے اندر حرکت و عمل کے خون کی ترسیل کرتا رہتا ہے کہ آپ ہر دم اپنے اشاعتی منصوبے کے بارے میں سوچتے اور مستقبل میں پیش آنے والی گرہوں کو کھولتے رہتے ہیں۔ بہر حال ایک ضخیم خصوصی شمارے کی اشاعت اپنے آپ میں بڑا غیر معمولی کام ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت صرف علمی اور سیاسی حلقوں میں ہی نہیں، بلکہ تصوف و سلوک کے میدان میں بھی مرجع خلائق کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے خلفاء کی فہرست پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انھیں خلق خدا کے باطنی تصفیہ اور تزکیہ کی فکر کتنی دامن گیر رہتی تھی۔ انھوں نے علم و عمل اور جہاد آزادی کی بساط بچھانے کے ساتھ معرفت و سلوک کی مجلس بھی آراستہ رکھی اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعد اپنے فیض یافتگان اور دست گرفتوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑی جو ان کے بعد بھی خلق خدا کی تربیت اور تزکیے کا کام سنبھالے رہی اور یہی مولانا کی عنداللہ مقبولیت اور عندالناس مرجعیت کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

فکر انقلاب کا یہ خصوصی شمارہ حضرت کے لیے بہترین خراج عقیدت ہوگا اور نئی نسل کے لیے تصوف و سلوک کی راہ کے لیے رہنما بھی۔ بے شک عقیدت کا اظہار کرنے والوں کی کمی نہیں، لیکن انھیں تاریخی کتابچوں [illegible] خراج پیش کرنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ آپ کا یہ اشاعتی پروگرام دوسرے ملی اداروں اور اسلامی تنظیموں کے لیے بھی محرک ثابت ہوگا۔

مولانا ارشد میر

مہتمم جامعہ فیض سبحانی، سورت، گجرات

Jamiat Ulama Gujarat

2001, Nr. Jamia Kashiful Uloom
... Kumbharwada, Sirkiwad
Shahpur, Ahmedabad-1
Ph: 079-25622500 Mo. 94277...

جمعیۃ علماء گجرات

જમીયતે ઉલમા ગુજરાત

مولانا اعجاز عرفی قاسمی صاحب، نگراں "فکر انقلاب" دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے سن ٹھیک سے یاد نہیں رہا، لیکن جب سے آپ کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا ہے، ہم لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا ایک منظم وسیلہ میسر آ گیا ہے۔ حلقۂ دیوبند کے افکار و خیالات کی جتنی بہتر ترجمانی حسن تدبیر کے خصوصی شماروں کے ذریعے آپ کے حصے میں آئی ہے، اس کا عشر عشیر بھی دوسرے لوگوں کو میسر نہیں ہوا ہوگا۔

اس سے پہلے [illegible] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نمبر، علامہ انور شاہ کشمیری نمبر، حکیم الاسلام قاری محمد طیب نمبر، اور مدارس نمبر وغیرہ سے میں بقدر ظرف پر [illegible] چکا ہوں اور ابھی ایک شمارے کے بالاستیعاب مطالعے سے فارغ بھی نہیں ہو پاتا کہ پوسٹ مین کے ہاتھوں دوسرا نمبر منتظر مطالعہ میری میز پر پہنچ جاتا ہے۔ دیوبندی حلقے کے اساطین علم و ادب کے علوم و فنون سے دنیا والوں کو کس فرد یا تنظیم نے متعارف کرانے کی فکر کی ہے۔ یہاں تو سبھی اپنے نفع و ضرر کے دام میں اسیر ہیں۔ خصوصی شماروں کی اشاعت و طباعت اور عصری انداز میں مضامین کی پیش کش کے توسط سے آپ نے جتنے بہتر انداز میں علمائے دیوبند کو ملک و بیرون ملک متعارف کرایا ہے اس سے بہت سے اذہان کی بہت سی خود تراشیدہ غلط فہمیاں دور ہو گئی ہوں گی اور ان شاء اللہ اپنی قبروں میں محو آرام ان اکابر کی روح کو بھی آپ کے اس حسن قدم سے بڑا سکون ملا ہوگا۔

مولانا حسین احمد مدنی سیاست کے پیچ و خم سے تو خیر اچھی طرح واقف تھے ہی، ان کا علمی قد بھی بڑا اونچا تھا۔ علامہ انور شاہ کشمیری کے بعد دیوبند کی مسند تدریس سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن مولانا نے اپنے وسعت مطالعہ اور شبانہ روز کی جد و جہد سے ثابت کر دیا کہ دیوبندی حلقہ میں محدث اور مفسر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں کئی علامہ کشمیری پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے علامہ کے ایجاد کردہ خالص علمی اور منطقی تدریسی انداز کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ برت کر دکھایا، بلکہ اپنی نکتہ رسی اور تبحر علمی سے کام لے کر اس کے نقش و نگار میں اور اضافہ کیا ہے۔ اگر مولانا نے صرف علمی مشغلے کو ہی اپنی زندگی کا واحد مشن باور کر لیا ہوتا تو ان کے پیچھے بھی علمی اور تحقیقی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا، مگر وہ تو درس و تدریس کے ساتھ، مسند تدریس سے اٹھتے ہی سیاست کی زلفیں بھی سنوارا کرتے تھے کہ دین اور سیاست میں تفریق سے بہت سی ایسی اجتماعی خرابیاں جنم لیتی ہیں جن سے پوری قوم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

بہر حال اس کتابی سلسلے پر میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ یہ آپ کی ٹیم کے لیے بھی ذریعہ نجات ثابت ہوگا اور ہم جیسوں کی آخرت کے سنوارنے کا بھی ذریعہ ثابت ہوگا۔

مولانا احمد قاسمی

نائب صدر جمعیۃ علماء گجرات

Vice President
Jamiat Ulama Gujarat

JAMIAT ULAMA GUJARAT
SHAHPUR, AHMEDABAD

Jamia Mutla-ul-Uloom (Regd.)

Pakistan

جامعہ مطلع العلوم

محترم جناب احسن مہتا صاحب ایڈیٹر فکر انقلاب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی علم و عمل اور سیاسی حکمت عملی۔ برصغیر کے حریت پسندوں کے لیے اپنے مرشد و مربی شیخ الہند کی نیابت وہ مینارہ نور ہیں۔ جس کی ضیاء پاشی سے آج ... آج عالمی حالات کا جبر برصغیر کے مسلمانوں اور ایشیا کے باسیوں کو شیخ الاسلام کی تحریک اور شیخ الاسلام حضرت مدنی کے فلسفے کی حقانیت کا قائل کر دیا ہے۔ آج امریکہ اور نیٹو کے استعمار پسند ... مسلمانوں کے وسائل لوٹنے کے ... رہے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن آج حضرت مدنی کے شاگردوں کے شاگردوں نے ماضی کے تناظر میں حال سے اپنے آپ کو منوا کر مستقبل کی ... نتائج کو نمایاں کر دیا ہے۔ ان حالات میں "فکر انقلاب" کا "شیخ الاسلام نمبر" ... کا اہتمام ایک انقلابی قدم ہے۔ حق تعالیٰ حضرت مدنی اور ان کی تحریک ... آپ کی کاوش کو قبولیت عام سے نوازے۔ آمین

سابق چیئرمین ... آف پاکستان

(مولانا) حسین احمد مہتمم جامعہ مطلع العلوم

باسمہٖ تعالیٰ

دارالعلوم حسینیہ مجید نگر اسلامپور ضلع اتر دیناجپور (مغربی بنگال)

بانی و مہتمم: حضرت الحاج مولانا محمد ادریس صاحب خلیفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی

DARUL ULOOM HUSSAINIA

MAJEED NAGAR ISLAMPUR ● Dist. U/Dinajpur, W/B.-733202

Ref No.......................... Date..........................

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے جو [illegible] اخلاص و خلوص کے

ساتھ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے خاص

شمارہ (خصوصی) [illegible] کیا ہے بہت بہتر [illegible] کی ضرورت ہے

تاکہ سلف صالحین کا [illegible] رہے [illegible]

دنیا اور آخرت کا [illegible]

فقط والدعاء / [illegible]

مجاز حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ

۱۱/۱۲/۲۰۱۲ء

دلی مبارکباد

مولانا محمد غیاث الدین صاحب قاسمی، بانی و مہتمم جامعہ حسینیہ مدنی نگر کشن گنج بہار

بطل جلیل، مجاہد آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز (۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء) کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ بیک وقت بلند پایہ محدث، عظیم مفکر، بے مثال مدبر اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے، آپ سے درس حدیث حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً ۳۸۲۶ ہے، نیز آپ کے وعظ وارشاد سے لاکھوں لوگوں کی اصلاح ہوئی، علاوہ ازیں آپ بہت سی ملی تحریکات کے بانی اور سرپرست بھی تھے، جن میں سرفہرست جمعیۃ علماء ہند ہے جو آپ کی سرپرستی وصدارت میں ترقی کے بام عروج تک پہنچی، اسی طرح آپ نے اس وطن عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تین سال تک اسارت مالٹا کی صعوبتوں کو برداشت کیا، فجزاھم اللہ خیرا واحسن ما یجزی بہ عبادہ الصالحین۔

یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی محترم جناب مولانا اعجاز عرفی صاحب قاسمی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی نے اپنے علمی وادبی رسالہ سہ ماہی "حسن تدبیر" کا خصوصی شمارہ "حضرت شیخ الاسلام نمبر" نکالنے کا عزم کیا ہے، جو بہت اہم اور بہت مبارک کام ہے، بالخصوص اس دور میں جب کہ نئی نسل اپنے اکابر واسلاف کی قربانیوں کو فراموش کرتی جارہی ہے، ایسے میں ان کو اپنے اکابر سے جوڑنا اور ان کی بے مثال اور انمنٹ خدمات سے انہیں روشناش کرانا از حد ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ رب العالمین موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے، اور پوری امت کو ان سے استفادہ کے لئے راہیں آسان اور ہموار فرمائے۔ آمین

محمد غیاث الدین قاسمی عفی عنہ

خادم جامعہ حسینیہ مدنی نگر کشن گنج بہار

OFFICE

MAHKAMA-E-SHARIA

ANJUMAN ISLAMIA FBD. REGD.-77

Markaz Masjid Eidgah, Baba Nagar, Old Faridabad (HR)-121002

دفتر

محکمۂ شرعیہ

انجمن اسلامیہ فرید آباد رجسٹرڈ۔ ۷۷

مرکز مسجد عیدگاہ، بابا نگر، اولڈ فرید آباد (ہریانہ)۔ ۱۲۱۰۰۲

Ref. No 56/MS/MCC/12

Dated 19/11/2012

پیغام

جناب حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی (قومی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی) و مدیر سہ ماہی مجلہ "حسن تدبیر" نے حضرات علماء و ماہرین کو اپنے رشحات قلم سے جو حیات جاودانی عطا فرمائی ہے وہ امت مسلمہ پر ایک عظیم احسان ہے، انھوں نے خامہ فرسائی کے سلسلہ کو رفعت کی بلندیوں کی طرف لے جاتے ہوئے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی (نمبر) کی اشاعت کا جو بیڑا اٹھایا ہے یہ عالم اسلام کے بسنے والے تمام امت مسلمہ پر ایک عظیم احسان ہے اسلئے کہ کلام و قلم کے تذکرے سے مرحوم شخصیت و حیات و زندگی ملتی ہے جن اخلاص سازی تاریخ زندہ ہے حقیقتاً وہ اشخاص بھی زندہ ہیں جن سے دنیا اکتساب فیض کرتی ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی وہ عظیم شخصیت ہے کہ ایک ہی وقت میں جہاں معدن علم و معارف ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کی مسند دارالحدیث پر جلوہ افروز ہو کر بخاری کا درس دیا وہیں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اس ملک میں رہنے والے تمام افراد اور خصوصاً مسلمانوں کی تشنگی کو سیرابی بخشی، ہندوستان کی تحریک آزادی کا تاریخی باب مکمل ہو نہیں سکتا جب تک کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کو قلمبند کر دیا جائے۔ حضرت شیخ الاسلام نے کراچی کی عدالت میں جج کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا کہ ہاں میں نے فتویٰ دیا ہے اور دوں گا اور سر پر دیوبند سے کفن باندھ کر آیا ہوں یہ جرأت مندانہ اور بیباکانہ جواب بارگاہ ایزدی میں ایسا مستجاب الدعوات ہوا کہ اسکے عوض میں ملک کو آزادی کا تحفہ ملا اور فرنگی کی چنگل سے ملک آزاد ہوا ایسے خدا ترس اور مجاہد آزادی کی تاریخ کا رقم ہونا امت مسلمہ کیلئے عظیم سرمایہ ثابت ہوگا ان شاء اللہ۔

اللہ رب العزت مجلہ حسن تدبیر کے مدیر محمد اعجاز عرفی قاسمی اور تمام معاونین مدیر کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

مستجاب الدین۔

محررہ العبد مفتی مستجاب الدین المظاہری الہ

(صدر، محکمہ شرعیہ اسلامک میڈیشن اینڈ کونسلیشن سینٹر فرید آباد)

رابطہ نمبر: ۹۸۱۱۹۳۹۳۶۴

Islamic Mediation and Conciliation Centre
MAHKAMA-E-SHARIA
President
Eidgah Masjid, Baba Nagar
Old Faridabad

Reg. No. A-535/ S.K.
Estd. [redacted]

JAMIAH AMINUL QUR'AN
Himatnagar - Vijapur Highway,
At&Po: Ranpur 383220 Ta-Himatnagar,
Dist. SK (Guj.) INDIA.
Ph.: (02772) 222886, 223886

جامعة أمين القرآن - فانفور
فانفور، همتنكر، رمز البريد: ٣٨٣٢٢٠
سابر كانثا، غجرات، الهند

Ref. No.
Date

الرقم :
التاریخ

آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی کے نمایاں کارنامے اور روشن خدمات محتاج تعارف نہیں۔ ہندوستان کے تمام اکابر علماء اس تنظیم کی کارگزاریوں پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی کی نگرانی اور صدارت میں یہ تنظیم سرگرم عمل ہے۔ مدارس و مکاتب کی سرپرستی اور قیام کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبہ میں تنظیم کی خدمت لائق تحسین و تحریک ہے۔ تنظیم نے اس سے پہلے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی کی حیات و خدمات پر خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔

اب تنظیم علماء دیوبند میں ایک نمایاں شخصیت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی کے مختلف گوشوں سے قوم وملت کو روشناس کرانے کے لئے "فکر انقلاب" کا خصوصی شمارہ حضرت "شیخ الاسلام نمبر" تنظیم شائع کررہی ہے۔ جو ایک مستحسن قدم ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے درس و تدریس، علم و عمل، فضل و کمال اور سیاست و قیادت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دئے ہیں۔ جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اور ہندوستان کی آزادی میں ان کی مخلصانہ جد وجہد اور آزادی کے بعد ان کی سماجی اور سیاسی خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے امید ہے۔ "فکر انقلاب" کا یہ خصوصی شمارہ ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوگا اور اپنے سابقہ شماروں کی طرح مقبولیت حاصل کرے گا۔

جس کے لئے ہم تمام وابستگان علماء دیوبند آل انڈیا تنظیم علماء حق کے ممنون ہیں اور "فکر انقلاب" کے جواں سال مدیر مولانا احسن مہتاب کے مشکور بھی۔

اللہ تعالیٰ آل انڈیا تنظیم علماء حق کی خدمات کو قبول فرمائے اور ملک کے تمام لوگوں کو اس تنظیم سے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کرے۔

فقط والسلام

(مولانا) اویس کیسر پوری
ناظم جامعہ امین القرآن - پانپور

(مولانا) ابوبکر کیسر پوری
مہتمم جامعہ امین القرآن - پانپور

જામિઆહ અમીનુલ કુરઆન પાણપુર-383220 તા. હિંમતનગર, જિ. સા.કાં. (ગુજ.) ઇન્ડિયા
ફોન : (02772) 222886, 223886 Website : www.aminulquran.com Email : info@aminulquran.com

SYED AHMAD KHIZAR SHAH MASOODI KASHMIRI
JAMIATUL IMAM MOHAMMAD
ANWAR SHAH KASHMIRI DEOBAND
For Islamic & Modern Education

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری
جامعۃ الامام محمد انور شاہ کشمیری دیوبند

Ref.............. Date..........

برادرم مکرم جناب مولانا محمد اعجاز عرفی صاحب قاسمی رصدر آل انڈیا تنظیم علمائے حق ، دہلی

السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی اتنی بلند و بالا اور عظیم ہے۔ میں ان کے بارے میں کیا تحریر کر سکتا ہوں ان کی خدمات جلیلہ اور کارہائے نمایاں خود اس کا ثبوت ہیں کہ اللہ رب العزت نے انھیں مثالی کردار و عمل اور قوت و توانائی سے نوازا تھا، ان کی پوری زندگی جد و جہد اور علم و عمل سے معمور ہے، ایسے اشخاص ہماری تاریخ اور تاریخ دار العلوم کا گراں قدر سرمایہ ہیں، ضرورت تھی کہ ان کے کاموں اور کارناموں کو زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک پہنچایا جائے، مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور توقع ہے کہ ماضی کی طرح آپ کا یہ کام بھی نمایاں اور امتیازی ہوگا، پندرہ روزہ **"فکر انقلاب"** کے اس خصوصی نمبر کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ جس طرح امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودی کشمیری نور اللہ مرقدہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ اور مدارس پر جو وقیع نمبرات شائع کئے یہ نمبر بھی اپنی معلومات اور مواد کے اعتبار سے نمونہ ہوگا، اور یہ یقین اس لیے بھی ہے کہ اس میدان میں آپ کو تجربہ بھی ہے اور ذوق خاص بھی۔

خدا کرے اور دیگر معروف دینی، علمی، مذہبی شخصیات پر بھی آپ کام کریں اور اپنی دینی و دنیاوی سعادتوں میں اضافہ کریں۔ دعاؤں کا طالب۔

والسلام

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

شیخ الحدیث و معتمد جامعہ امام محمد انور شاہ

دیوبند و شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند

MADRASA
MAZAHIR ULOOM
SAHARANPUR-247001
(U.P.) INDIA
Ph.: (0132) 2655542 Fax: 2659912

مدرسہ
مظاہر علوم
سہارنپور

Ref. No. .... Dated ....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لانبی بعدہ

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند تمام تر علمی وعملی وروحانی صفات سے متصف ہونے کے باوصف جنگ آزادئ ہند کے وہ عظیم الشان قائد تھے کہ جن کے ساتھ ہزاروں آزادی کے سپاہی سر سے کفن باندھ کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر چلتے تھے۔

تاریخ کا وہ عظیم الشان دور آج بھی یقیناً لوگوں کی نگاہوں میں محفوظ ہے، کہ تحریک آزادی کے یہ عظیم الشان راہبر ورہنما برطانیہ کی عظیم حکومت سے، اس کے جلال وجبروت سے اور اس کی طاقت وقوت سے اس وقت تک جہاد کرتے رہے کہ جب تک کہ اس ملک کو غلامی سے آزاد نہیں کرا لیا اور جب ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کا دوسرا عظیم معرکہ بپا ہوا اور یہاں کے مسلمان بے سہارا اور بے آسرا بن کر رہ گئے تب شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے اپنی تمام تر محنتوں اور قربانیوں کا رخ اس ملک میں مسلمانوں کو جمانے اور بسانے کی طرف موڑ دیا، علماء کی ایک بڑی جماعت اور ملک سے تعلق ومحبت رکھنے والوں کی ایک بڑی موثر تعداد آپ کے ساتھ تھی، جو ایک ایک قریہ ایک ایک قصبہ اور ایک ایک شہر میں مسلمانوں کی حفاظت کا اہم اور نازک فریضہ انجام دے رہے تھے۔

اور تاریخ یقیناً ان نازک اور خطرناک لمحات کو ابھی تک فراموش نہیں کر پائی کہ جس میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ، شیخ طریقت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی سہارنپور میں سر جوڑ کر بیٹھے اور پورے ملک میں لگی ہوئی اور بھڑکی ہوئی آگ کے باوجود یہ مضبوط ومستحکم فیصلہ کیا کہ ہم تینوں اسی ملک میں رہیں گے اور آزادی کے نام پر راہ فرار نہیں اختیار کریں گے۔

مدرسہ
مظاہر علوم
سہارنپور

MADRASA
MAZAHIR ULOOM
SAHARANPUR-247001
(U.P.) INDIA
Ph.: (0132) 2655542 Fax : 2659912

Dated ....

Ref. No. ....

اور پھر اس فیصلہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس پورے علاقہ کے ہزاروں ہزار مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں جم گئے اور جو خاندان پاکستان جانے کے قصد و ارادہ سے اسٹیشنوں پر پہنچ چکے تھے وہ اس فیصلہ کو سن کر شاداں و فرحاں ہو کر پورے اطمینانِ قلب اور بشاشتِ طبیعت کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے، اس فیصلہ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ سہارنپور میں مظاہر علوم اور دیوبند میں دارالعلوم اور ان کے ماحول و اطراف میں بسنے والے لاکھوں مسلمان فرقہ پرستوں کی یورش سے بچ گئے اور بلا مبالغہ ہزاروں مساجد کے بام و در اور ان میں ہونے والی پنج وقتہ اذان و تکبیر بھی محفوظ ہو گئی۔

ہم ان اکابر کی عظمتوں اور ان کی قربانیوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی بے حد مستحق تحریک و تہنیت ہیں کہ انہوں نے ایسی عظیم الشان اور عظمت و رفعت پر مشتمل شخصیت کی یاد اور خدمات پر پندروزہ "فکر انقلاب" کا یہ خصوصی نمبر شائع کیا، اللہ جل شانہ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس خاص نمبر کو اپنی پاک بارگاہ کی قبولیت عطا فرمائے، اور مسلمانانِ ہند کو ان اکابر کی قربانیوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

سید محمد شاہد غفرلہ

بندہ محمد شاہد غفرلہ
امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
۱۲ صفر ۱۴۳۴ھ / ۲۶ دسمبر ۲۰۱۲ء

باب شیخ الاسلامؒ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی برصغیر ہندوپاک کی گذشتہ صدی کی عظیم شخصیات میں ممتاز مقام کی حیثیت رکھنے والی چند عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے، امت اسلامیہ ہندیہ کی انھوں نے جو عظیم ملی خدمت انجام دی وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں سنہرا باب سمجھی جائے گی، انھوں نے آزادی ہند کو ملت اسلامیہ کی آزادی اور سربلندی سمجھتے ہوئے اپنی دانشمندانہ مہارت سے سب کو فائدہ پہونچایا اس طرح ملک کو جو صدیوں اسلامی قیادت میں رہا تھا اور مغربی استعمار نے اس کو مسلمانوں سے چھین کر غلام بنایا تھا آزادی دلانے میں نمایاں حصہ لیا، حضرت مولانا کی اس حیثیت سے بڑی شہرت ہوئی اور سب اس کے معترف ہیں لیکن مولاناؒ کی تنہا یہی اہم خصوصیت نہیں تھی بلکہ باطنی سیرت وسلوک وتربیت میں بھی ان کا بڑا مقام رہا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اگر جنگ آزادی میں ان کی ہندو اکثریت کے ساتھ تعاون اور جدوجہد کے پس منظر سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو وہ برصغیر کے عظیم عالم دین اور مرشد رہے، وہ کے تزکیہ باطن اور تربیت اہل دین کی صفت کی وجہ سے سب اہل دین کے نزدیک مستند اور تسلیم شدہ تھے بلکہ دیگر علماء ومرشدین ان کو دیگر علماء مرشدین پر بھی بڑی حد تک فوقیت دیتے تھے اور اس میدان میں ان کی فکرمندی اور سرپرستی سے ہزاروں مسترشدین نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خاص طور پر مشرقی ہندوستان کے آسام کے علاقہ میں انہی کے ارشاد وتزکیہ کا اصل چرچا تھا، اور دارالعلوم دیوبند جو علوم دینیہ کی تعلیم کا ایشیا کا بڑا اور معتبر ترین ادارہ ہے وہاں شیخ الحدیث ہونے کے تعلق سے ان کا فن حدیث کی تعلیم میں بڑا پایہ سمجھا جاتا تھا

اوران کی شاگردی فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔

حضرت مولانا ہندوستان میں مقیم سادات خاندان کے ایک اہم ترین فرد تھے، وہ یوپی کے ضلع فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ کے رہنے والے تھے اور اپنی علمی وعملی عمر کے آغاز میں مدینہ منورہ میں علوم دینیہ کی تعلیم سے اشتغال رکھتے رہے، اور پھر اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور استاذ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے استفادہ ورفاقت کے لیے ہندوستان آگئے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے استاذ اور صدر مدرس کی حیثیت سے خدمت علم دین بھی کرنے لگے اور غیر ملکی طاقتوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں بھی اپنے مرشد وشیخ کی رہنمائی میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں بار بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور برطانوی سامراج کی زیادتیاں جھیلنے سے سابقہ پڑا لیکن ان کا پایہ ثبات اس مجاہدہ وخدمت دین وملت وآزادی وطن کی کوشش کی راہ سے نہیں ہٹ سکا، بالآخر برطانوی سامراج نے ملک کو آزادی دی لیکن ہندو مسلم ٹکراؤ اور کشت وخون اور ملک کو دو ٹکڑے کردینے کے ساتھ ملک کو چھوڑا، ہندوستان کا وسطی حصہ جو بڑے رقبہ پر مشتمل تھا، اور جہاں مسلمانوں کے اہم دینی مراکز اور خاصی آبادی بھی تھی لیکن اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کو غیر مسلم علاقہ قرار دیا گیا اور نقل آبادی کی مصیبت نے ملک کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان تباہی کا سلسلہ قائم کردیا، یہ سلسلہ ہندوستانی خطہ کے مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا، ہندوستان کے بڑے غیر معمولی اور سخت حالات کا دور وہ دور کہا جاسکتا ہے کہ جب جنگ عظیم جو ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئی تھی، اس کے نتیجے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو اثر ڈالنے کا موقع ملا اور برطانوی استعمار کی طرف سے ملک کو رعایتیں دینے کا آغاز ہوا، ملک میں مسلمانوں کے حالات زیادہ قابل فکر تھے، کیوں کہ ایک طرف تو انگریزوں کی تعلیم وتہذیب نے مسلمانوں کے شرفاء کو مرعوب کر رکھا تھا، اور اس کے نتیجہ میں متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے مسلمان انگریزی تہذیب وتعلیم کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، دوسری طرف آزادی کی تحریک کے سلسلے میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک حصہ جو برطانوی اثر وغلبہ سے متاثر اور مرعوب تھا، اس نے اپنا اصل حریف ہندوؤں کو سمجھا تھا اور برطانوی غلبہ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، یہ رنگ اور رجحان سارے جدید تعلیم والے طبقے میں تھا، اور دوسرا گروہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی فکر رکھنے والا تھا، اور اس میں علماء دین عام طور پر سربراہی کررہے تھے، ادھر برطانوی اقتدار کا رویہ وقتی طور پر مسلمانوں کو زیادہ موقع دینے کا نہیں تھا، اور وہ شاید مسلمانوں کو اپنا اصل حریف تصور کرتے تھے، لیکن مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی برطانوی تہذیب وتعلیم کے معاملہ میں نرم رویہ، ظاہر میں ایسے مسلمانوں کی ہمدردی کا تھا، اس طریقہ سے علماء اور اہل دین کو دو طرف سے ٹکراؤ کی صورت حال سے گزرنا پڑ رہا تھا، ایک تو انگریزی غلبہ

وسطوت کے مقابلہ میں اور دوسرے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مقابلے میں۔

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو تناؤ تھا اس میں ایک طرف مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے ہندو اکثریت سے علاحدہ رویہ اختیار کرنے کی تحریک تھی، جو علماء دین کی ہندو اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی کی کوشش کرنے کو مطعون کر رہا تھا، پھر اسی کے ساتھ ساتھ عامۃ المسلمین میں جو بے حسی اور دین کے تقاضوں سے غفلت پیدا ہوگئی تھی، اس کے ازالہ کی فکر علماء کو کرنی تھی، ایسی حالت میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور ایک ملک کے دو ملک ہندوستان اور پاکستان بن گئے، اور اقتدار کی تقسیم کے موقع پر ہندو مسلم کشمکش کو بہت قوی بنا دیا، اور کشت و خون کا ایک بازار گرم ہوگیا، جس کا رخ پاکستان سے ہندوؤں کے انخلا اور ہندوستان سے مسلمانوں کے انخلا کی طرف پورے طریقے سے ہوگیا، ہمارے علمائے کرام کے اصل مراکز اور ان کی کوششوں کا میدان سب سے زیادہ ہندوستانی حصے میں تھا، اس لحاظ سے ان کے لیے مشکلات بھی بہت پیش آرہی تھیں، اور ان کی ذمہ داری بھی بہت بڑھی ہوئی تھی، اس وقت مغربی یوپی کا یہ علاقہ جو مظفر نگر اور سہارن پور پر مشتمل ہے اور دہلی کے اطراف کی حیثیت رکھتا ہے دینی تعلیم اور دینی کوششوں کا بڑا اور بنیادی مرکز تھا اور وہاں کے شیوخ پر سب کی نظریں تھیں، خصوصیت سے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پور اور حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری جو رائے پور کے مرکز تزکیہ و احسان کے سربراہ تھے، خصوصی اہمیت اور اثر پذیری کے حامل تھے۔

ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اپنی بڑی سیاسی اہمیت بھی رکھتے تھے اور ان کی قائدانہ و مجاہدانہ خصوصیت کی بنا پر حکومت بھی انہیں اہمیت دیتی تھی، اور یہ حضرات بھی ان کی رائے اور مشورہ کو اہمیت دیتے تھے، ان حضرات نے اس وقت کے سنگین حالات اور نہایت پیچیدہ اور خطرناک اور اندیشہ ناک صورت حال کے تدارک کے لیے غیر معمولی توجہ کا ثبوت دیا۔ اور مغربی ہندوستان کے علاقے یکے بعد دیگرے مسلمانوں سے خالی ہوتے جا رہے تھے، اس سلسلے کو سہارن پور جو کہ یوپی کا مغربی سرحدی ضلع ہے کو ایک طریقہ سے دیوار بنا دیا، کہ مسلمانوں کا تخلیہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے، اس کے لیے حکومت وقت پر جو زور ڈال سکتے تھے اور مسلمانوں کو جو پرزور طریقے سے متوجہ کر سکتے تھے، اس کی پوری کوشش کی اور ان حضرات کے اثرات اور لوگوں پر ان کی بات کی اہمیت ایسی تھی کہ ان کی توجہ دہانی کو لوگوں نے مانا اور وہ سلسلۂ قتل و انخلا رک گیا۔ اور اس طریقہ سے مغربی یوپی سے ہندوستان کے تمام مشرقی حصوں میں مسلمانوں کے باقی رہنے کی صورت پیدا ہوگئی، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، جسے ہندوستانی تاریخ میں بھلایا نہیں جا سکتا، اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بقاء کے لیے ان علماء کی اکثریت کا جنھوں نے جنگ آزادی کے لیے ہندو مسلم مشترک

جدوجہد میں نمایاں بلکہ اولین اور بڑا حصہ لیا تھا، ان کا اخلاقی دباؤ بھی کارانداز ہوا اور انھوں نے ببانگ دہل اکثریت سے مطالبہ کیا کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کی طرف سے نمایاں شرکت کے بعد حصول آزادی کے ثمرات سے مسلمانوں کو کیسے محروم کیا جاسکتا ہے، اور پاکستانی حصہ میں ان کے نہ منتقل ہونے کو کس طرح جرم قرار دیا جاسکتا ہے، وہ سب جنگ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ نمایاں طریقہ سے شریک تھے، اور ان کے ساتھ مشترک ہندوستان کے حامی تھے، تو ہندوستان کو دونوں کے اشتراک سے کیسے الگ رکھا جاسکتا ہے اور الحمدللہ ان لوگوں کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کے بقاء کو اور وطنی طور پر برابری کو تقسیم کیا گیا، اس کے نتیجہ میں بار بار فرقہ پرستوں کی طرف سے اس اشتراک اور برابری کی پرتشدد مخالفت سے مسلمان اس ملک میں نہ صرف یہ کہ باقی رہے بلکہ باعزت طریقہ سے شریک وطن ہیں۔ اس میں ہمارے ان مجاہد علماء جن کے سرخیل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ہی تھے۔ اور ان کے ساتھ ان کے رفقاء جنگ آزادی میں خاص طور پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کا نام ہی نمایاں ہے۔

حضرت مولانا کی شہرت اور ان کی عظمت کا عمومی اعتراف ہونے کے باوجود مولانا میں تواضع اور زہد اور خدمت خلق کی بھی بڑی نمایاں صفت تھی، اور انھوں نے دین اور آزادی امت کی راہ میں بڑے مجاہدے کئے تھے، تحریک آزادی اور تزکیۂ باطن دونوں میں ان کے شیخ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی تھے، مولانا نے ان کی حیات میں ان کی پوری وفاداری کے ساتھ ان کی راہ پر چلنے پر پوری وفاشعاری کا ثبوت دیا تھا اور پھر ان کے طریقہ کو بعد میں جاری رکھا اور جس اخلاص کے ساتھ انھوں نے دین اور فلاح امت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی اس کا اعتراف ان کے سب واقف کار کرتے رہے۔ اور ان سے مل کر اور ان کو دیکھ کر ان کی اعلیٰ دینی صفات کا اظہار ہوتا تھا اور ان میں ایک کشش معلوم ہوتی تھی۔ ملت کے لیے ان کی قربانیوں اور دین کے لیے ان کے مجاہدوں کا سب نتیجہ معلوم دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کی برکت اس ملک میں تادیر قائم رکھے۔

حضرت مولانا کی بڑی خصوصیت اتباع سنت کی تھی وہ زندگی کے سارے پہلوؤں میں سنت کی پوری پیروی کرنے کی پابندی کرتے تھے، لوگوں سے معاملات میں خانگی زندگی میں مہمانوں کی خاطر تواضع میں اور حق بات کے لیے متحرک ہوجانے اور سینہ سپر ہوجانے میں اور اپنے کو مادی فوائد سے بے نیازی اختیار کرنے میں بڑے ممتاز نظر آتے تھے، انھوں نے آزادی کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور تکلیفیں اٹھائیں، لیکن آزادی کے بعد آزادی کے ثمرات سے کچھ بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی آزادی کی کوششوں کے اعزاز میں حکومت نے ان کو حوصلہ دینا چاہا اس سے بھی انھوں نے معذرت کردی اور آزادی کے

ثمرات سے کچھ بھی لینا گوارہ نہیں کیا اور تعلیم حدیث اور تزکیہ وتربیت کے اپنے کاموں کے لیے اپنے کو منقطع کرلیا۔ طہارت باطنی میں ان کا جو امتیاز تھا، ان سے ملنے والا غیر شعوری طور پر محسوس کرتا تھا اور ان کے علم اور ان کے ارشاد سے فائدہ اٹھانا عزت وشرف اور فخر کی بات سمجھی جاتی تھی جو ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مسترشدین اور ان کے تلامذہ کی زبانوں سے برابر ظاہر ہوتا رہا، حضرت مولانا اپنے سیاسی یا ملی کاموں کے مختلف شہروں میں جو دورے کرتے ان میں اس بات کی احتیاط رکھتے کہ پاکیزہ آمدنی والے اپنے اہل تعلق ہی کے یہاں ٹھہریں، ان میں لکھنؤ آمد کے موقع پر ہمارے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ جو ان کے مسترشد بھی تھے اور حضرت مولانا کی نظر میں معتبر بھی تھے مہمان ہوا کرتے تھے، اس بہانہ راقم الحروف کو بھی اپنی ابتدائی زندگی میں حضرت مولانا کو دیکھنے، سننے اور خدمت کرنے کی سعادت ملتی تھی اور جو باتیں اوپر عرض کی گئیں اسی تجربہ اور مشاہدوں کا ہی نتیجہ ہیں اور لکھنؤ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں بھی بحیثیت طالب علم کے ایک سال قیام کا موقع ملا تھا جس کی وجہ سے مولانا کو ان کے گھر پر اور ان کی جگہ پر دیکھنے اور جاننے کی سعادت ملی تھی اور ان کی شفقت کے حصول کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہمارے بڑوں کا بھی حضرت سے استفادہ، واسترشاد کا تعلق رہا ہے۔

خال مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی مستفیدین میں اور حدیث میں ان کے شاگرد تھے اور ان کے گھر کے متعدد حضرات کا بیعت واسترشاد کا بھی ان سے تعلق تھا جن میں خود ان کی والدہ خیر النساء بہتر صاحبہ جو پہلے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے بیعت تھیں پھر ان کی وفات کے بعد مولانا سید حسین احمد صاحب سے ہوئیں اور بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب ہمشیرہ اسیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ اور خاندان کے بعض دیگر افراد بھی یہ تعلق رکھتے تھے، اس لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا حادثہ وفات، ہم لوگوں کو ایک بڑے خاندانی حادثہ وفات سے کم محسوس نہ ہوا وہ دین، ملت اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے ایک رہنما زندگی کے نقوش چھوڑ گئے، اور یہ پیغام دے گئے کہ لوگوں کے سامنے دینی ترجیحات اور ملی مفادات کے علاوہ کوئی اور ترجیح اور مفاد نہ ہو، احاطہ دارالعلوم دیوبند میں واقع اپنے مکان پر ۵ ردسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۲ رجمادی الاولی ۱۳۷۷ھ میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی، ان کی اولاد واخلاف میں مولانا سید اسعد مدنی، مولانا سید ارشد مدنی اور مولانا سید اسجد مدنی اور صاحبزادیاں ہیں، اور یہ سب دینی وملی اور انسانی خدمت میں اپنی پہچان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے ساتھ وہ معاملہ فرمائے جو اس کا اپنے مخصوص اور مقرب بندوں کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کی برکات کو قائم دائم رکھے، آمین۔ ■

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ

کچھ یادیں، کچھ باتیں

(حضرت مولانا) محمد طلحہ کاندھلوی

میری ولادت مورخہ ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۴۱ء سہ شنبہ نظام الدین نئی دہلی میں ہوئی، چونکہ میرے گھر، میرے ننہال اور مرکز نظام الدین ہر جگہ تعلیم و تعلم اور خانقاہی ماحول تھا، دہلی میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا محمد یوسفؒ، حضرت مولانا عبید اللہ بلیاویؒ، حضرت مولانا اظہار الحسن کاندھلویؒ، حضرت مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ نیز خاندان کے دیگر اکابر اور مشائخ کو عموماً دیکھتا تھا کہ کبھی کسی کو ذکر و فکر کی تلقین کر رہے ہیں تو کبھی کسی کو اذکار مسنونہ بتا رہے ہیں، کبھی کسی کی تربیت میں مصروف ہیں تو کبھی کسی دینی مسئلہ اور معاملہ کی بات چل رہی ہے، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میں یہی دیکھتا رہتا تھا، لوگوں کا مجمع ہمہ تن گوش ہو کر ان بزرگوں کی باتیں سنتا، بیعت ہونے کے لئے پروانہ وار نثار ہوتا، اپنی ہدایت اور حضرات اکابر سے شرف تلمذ و ارادت کو باعث نجات سمجھتا۔ اس ماحول کو میں نے آنکھیں کھلنے کے بعد سے ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

میری حفظ کی تعلیم مدرسہ کاشف العلوم مرکز نظام الدین دہلی، مکتب ابوالمدارس سہارنپور دونوں جگہوں پر مکمل ہوئی، میرے والد ماجد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ خصوصی تعلیمی و تربیتی نگرانی فرماتے تھے، حضرت والد ماجد کے علاوہ مفتی سعید احمد اجراڑویؒ کے پاس چوتھے گھنٹہ میں والد ماجد ہی کے حکم سے دارالافتاء پڑھنے جاتا تھا۔ ۱۶ر رجب ۱۳۷۵ھ کو حفظ کلام اللہ کی تکمیل رائے پور حضرت مولانا عبد القادرؒ کی مجلس میں ہوئی

اور پہلی محراب مسجد شاہ جی دہلی میں سنانے کا موقع ملا۔

نظام الدین اور سہارنپور ہر جگہ دیگر حضرات اکابر کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ بھی بکثرت تشریف لایا کرتے تھے، حضرت والد ماجد کے جو تعلقات اور دیرینہ مراسم دیگر اکابر کے علاوہ حضرت مدنیؒ سے تھے وہ منظر آج بھی آنکھوں میں موجود و محفوظ ہے۔ ان واقعات کو حضرت شیخ کی آپ بیتی میں پڑھا جا سکتا ہے۔

میں یہ بتاتا چلوں کہ جس طرح میرے والد ماجد کی تعلیم و تربیت میرے دادا جان حضرت مولانا محمد یحیٰ کاندھلویؒ نے فرمائی تھی، میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ بھی اسی نقش قدم پر میری تعلیم و تربیت کا فکر رکھتے تھے، والد صاحب کے مقرر کردہ حضرات اساتذہ کے علاوہ میں کسی کے پاس نہ تو بیٹھ سکتا تھا نہ ہی بولنے کی ہمت تھی؛ چونکہ مدرسہ کاشف العلوم مرکز تبلیغ نظام الدین دہلی کا ماحول دعوت و تبلیغ کا تھا، اس لئے ماحول سے متاثر فطری بات ہے، اللہ غریق رحمت فرمائے حضرت مولانا محمد ہارونؒ کو موصوف مجھ سے دو سال عمر میں بڑے تھے، ہم لوگ جب تک نظام الدین میں رہتے تو وہاں تعلیم کے علاوہ اوقات میں اُن چیزوں کو دہرانے کی کوشش کرتے جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا، چنانچہ کبھی مولانا محمد ہارون منبر پر چڑھ کر تقریریں کرتے اور ہم تمام ساتھی بچے ان کی تقریر سنتے، اس عمل سے فارغ ہوتے تو ہم لوگ مشورہ کرتے اور بعد مشورہ بچوں کا گشت ہوتا، مسجد کے حجروں، احاطوں اور دوسرے کمروں میں چکر کاٹ کر اور اپنے ہی عزیزوں رشتہ داروں کے درمیان گشت لگاتے ہوئے بچوں کی یہ جماعت منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے حجرہ تک پہنچتی وہاں سے روانہ ہو کر نامور عالم دین اور داعی حضرت مولانا عبید اللہ بلیاویؒ کے یہاں پہنچتے، بچوں کی اس جماعت سے مل کر حضرتؒ بہت مسرور ہوتے، پوچھتے کہ آپ لوگ ناشتہ میں کیا لیں گے، جس کی جو فرمائش ہوتی بتا دیتا، چائے یا ٹھنڈا سے حضرت والا ضیافت فرماتے، مجھے چونکہ میٹھا سے زیادہ رغبت نہیں ہے اس لئے میں حضرت والا کے دیرینہ شفقت و مہربانیوں کے پیش نظر نمکین یا لسی کی فرمائش کر دیتا اور حضرت والا وہی چیزیں منگوا کر ضیافت فرماتے۔

نظام الدین جب سہارنپور والدین کے ہمراہ پہنچتا تو یہاں کا ماحول نظام الدین کے ماحول سے بالکل الگ ہو جاتا، یہاں ہر سو علم کی باتیں، درس کی باتیں، حدیث اور تفسیر کی باتیں، تحقیقی کام اور دیگر عالمانہ گفتگو دیکھتا، بڑے بڑے علماء کچا گھر تشریف لاتے، کوئی علمی سلسلہ میں، کوئی اصلاحی سلسلہ میں اور کوئی دعا وغیرہ کے لئے حاضر ہوتا۔ حضرت والد ماجد ہر کسی کو اس کی منشاء کے مطابق معلومات اور دعاؤں سے نوازتے رہتے۔ اس ماحول کو دیکھ دیکھ کر ہم بچوں نے اسی کو کھیل بنا لیا اور آپس میں بیعت کا سلسلہ شروع ہو جاتا، میں جس طرح والد محترم کو بیعت کرتے دیکھا کرتا تھا بالکل اسی انداز میں میں بھی بچوں کو بیعت کرتا، تمام بچے باری باری آگے بڑھتے رہتے اور میں بیعت کرتا رہتا، ہم سب کے یہی کھیل تھے، یہی تفریح تھی،

اور شاید ہمارے بڑے بھی یہی چاہتے تھے کہ دنیا کے کھیلوں میں پھنس کر اپنی زندگیاں برباد نہ کی جائیں، ہم لوگوں کے کھیل ایک طرف تو کھیل تھے لیکن اگر دیکھا جائے تو بہترین تربیت بھی تھی۔

پھر نماز پڑھتے، نماز کبھی میں پڑھاتا کبھی کوئی اور بچہ پڑھاتا، چونکہ حضرات اکابر مسلسل اور مستقل نظام الدین دہلی اور سہارنپور کچا گھر تشریف لایا کرتے تھے اور عموماً ان حضرات سے نماز پڑھانے کی فرمائش بھی کی جاتی جو منظور کی جاتی تھی، اس لئے مجھے خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور داعی کبیر حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نیز اپنے والد ماجد علیہ الرحمۃ کی نقل اتارنا بخوبی آ گیا تھا۔

حضرت مولانا عبدالمالک سہارنپوریؒ کبھی کبھی شفقت میں مجھ سے فرماتے کہ محمد طلحہ! نماز پڑھ کر دکھاؤ اور قرأت میں حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی نقل اتار کر دکھاؤ! میں فوراً نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور ایک ایک رکعت میں ان دونوں بزرگوں کی نقل اتارتا اور مولانا خوب محظوظ ہوتے، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی نقل بھی میں نے اسی زمانہ میں سیکھ لی تھی۔

بچپن کا یہ مختصر نقشہ اس لئے کھینچنا پڑا کہ اب ذیل کی سطور میں کچھ ایسے ہی واقعات پیش کرنے جا رہا ہوں جو میرے لئے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بکثرت والد ماجد کے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور جب بھی تشریف لاتے تو مجھ سے بے پناہ محبت اور شفقت فرماتے، حضرت جب تک یہاں رہتے کھانا میرے بغیر نہ کھاتے، بارہا ایسا ہوا کہ دسترخوان لگ گیا، سالن آ گیا، روٹیاں بھی موجود لیکن حضرت مدنیؒ نے کھانا شروع نہیں فرمایا، حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ نے عرض کیا کہ حضرت کھانا شروع فرمائیں؟ تو حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ جب تک پیر صاحب نہیں آ جاتے کھانا شروع نہیں کروں گا (اللہ تعالیٰ حضرت مدنیؒ کی قبر کو نور سے منور فرمائے، مجھے پیر صاحب ہی کہہ کر مخاطب فرماتے تھے جس کا واقعہ آگے آ رہا ہے) آج سوچتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ اللہ والوں کی زبان کو اللہ تعالیٰ کبھی رد نہیں فرماتے، شاید ایسے ہی لوگوں کیلئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ رب اشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لابرہ. بہت سے پراگندہ حال لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا کرے۔

فارسی زبان میں ایک کہاوت ہے "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" حضرت شیخ الاسلامؒ نے بچپن میں مجھے جو لقب دیا تھا آج جب کہ زندگی کی بہتر بہاریں دیکھ چکا ہوں، حضرت مدنیؒ کا خطاب ایسا میرے نام کے ساتھ چپک گیا ہے کہ بہتوں کو تو میرا اصل نام بھی معلوم نہیں ہے صرف "پیر صاحب" ہی سے جانتے ہیں۔

پورا واقعہ آپ بھی سنئے اور عارفین کاملین کی بصیرت اور فراست کا مشاہدہ کیجئے۔

میری عمر چند سال تھی، کھیل کود کا زمانہ تھا، گھر میں ہر وقت جو منظر نظروں میں تھا، اسی کو کئی بچے مل کر عملی جامہ پہنا رہے تھے، والد ماجد کو دیکھتا رہتا تھا کہ کس طرح بیعت فرماتے ہیں چنانچہ میں بھی اپنے کتب خانہ یحیوی میں بیٹھا بچوں کو بیعت کر رہا تھا کہ اچانک شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا تانگہ آ گیا، تانگہ والا حضرت کا خاص عقیدت مند تھا اور حضرت جب بھی سہارنپور تشریف لاتے تو اسٹیشن سے وہی تانگہ والا حضرت مدنیؒ کو کچا گھر لاتا، اس کا نام مسیتا تھا۔

یہاں ایک بات بتاتا چلوں حضرت مدنیؒ جب بھی سہارنپور تشریف لاتے تو اپنی گاڑی سے آنے کے بجائے ریل سے تشریف لاتے، سہارنپور اور اس کے نواح میں کہیں بھی کوئی پروگرام ہو مگر حضرت ہمیشہ ریل سے تشریف لاتے، وجہ یہ تھی کہ حضرت مدنیؒ یہ چاہتے تھے کہ مدرسہ والے زیر بار نہ ہوں، سہارنپور پہنچ کر یہاں سے جس مدرسہ جانا ہوتا تو گاڑی سے تشریف لے جاتے تاکہ مدرسہ کے مصارف کم سے کم ہو سکیں۔

بہر حال حضرت مدنیؒ تانگہ سے اترے اور مجھے دیکھا کہ میں بچوں کو کھیل کے طور پر بیعت کر رہا ہوں، حضرت نے ازراہ شفقت و مزاح فرمایا کہ مجھے بھی بیعت کر لیں، میں نے بلا تکلف کہدیا کہ آج کی بیعت تو ہو چکی ہے کل آیئے، حضرت مدنیؒ نے پھر فرمایا کہ مجھے سفر پر جانا ہے اس لئے آج ہی بیعت کر لو، میں نے عرض کیا کہ جلدی کیا ہے جب سفر سے واپسی ہو تب بیعت ہو جانا، حضرتؒ نے پھر سفر کی دلیل دی تو میں نے عرض کیا کہ پیر کو مجبور کر کے نہیں آنا چاہئے، خود کو مجبور ہو کر آنا چاہئے۔

بہر حال حضرت مدنیؒ کو اسی معصومیت کے زمانہ میں جب میں محض چند سال کا تھا بیعت کر لیا۔

پھر حضرت میرے والد ماجد کے پاس کچا گھر تشریف لے گئے تو والد صاحب نے پوچھا کہ آپ کی آمد کی اطلاع کچھ دیر پہلے ہو گئی تھی، کہاں رہ گئے تھے؟ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ محمد طلحہ باہر کتب خانہ میں بیٹھا بچوں کو بیعت کر رہا ہے میں نے سوچا کہ میں بھی بیعت ہو جاؤں اور پھر حضرت نے میری اور اپنی گفتگو مزے لے لے کر والد صاحب کو سنائی اور دونوں بزرگ میری اس معصومیت پر مسرور ہوئے۔ بیعت کے اس واقعہ کے بعد حضرت مدنیؒ مجھ کو پیر صاحب کہہ کر مخاطب کرنے لگے اور گویا یہی میرا لقب پڑ گیا۔

میرے گھرانے میں شدہ شدہ اس کی اطلاع تمام چھوٹوں اور بڑوں کو ہو گئی تو حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے مزاحاً فرمایا کہ ”طلحہ! تجھ سے چوک ہو گئی کم از کم تین چلے ہی حضرت مدنیؒ سے مانگ لیا ہوتا!“

کیا بتاؤں حضرت شیخ الاسلام کی شفقتیں جو اس ناکارہ پر تھیں اور جس طرح مجھ کو پیار فرماتے تھے افسوس کہ آج جب کہ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے انتقال کو ۵۷ سال ہو چکے ہیں مگر لگتا ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے، بار بار حضرت علیہ الرحمہ کا سراپا نظروں میں آتا ہے تو ایک ایک کر کے وہ شفقتیں بھی یاد آنے لگتی ہیں، پھر ایک

واقعہ یاد آ گیا ہے چلتے چلتے اسے بھی سناتا چلوں کیونکہ بزرگوں کے قصے اور ان کے تذکرے رحمت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عند ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ: خود میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ سے اگر کوئی مسترشد یا طالب علم پوچھتا کہ کون سی کتابوں کو مطالعہ میں رکھا جائے تو حضرت عموماً اپنے اکابر کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ عنایت فرمایا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر آپ بیتی ہی سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس میں سالک کو جن بزرگوں کی کتابوں اور مواعظ وملفوظات پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں ایک عظیم نام شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا بھی ہے۔

فرمایا کہ ": اپنے اکابر کی سوانح عمریاں، تذکرۃ الرشید، تذکرۃ الخلیل، حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ کی سوانح اور مکاتیب اور دوسرے اکابر کی سوانح حیات مفید ہیں، نیز اس ناکارہ کے تبلیغی رسائل کا بھی مطالعہ میں رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ ملاقات کا بدل ہے"۔

بہرحال بزرگوں کے بہت سے ایسے واقعات ذہن میں موجود اور محفوظ ہیں اگر ان کو یکجا کیا جائے تو مستقل رسالہ بن جائے گا۔ بس ان سطور کے لکھنے کا مقصد یہ ہے اور یہی میرا پیغام ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت ایسے کرو جیسے ہمارے اکابر کیا کرتے تھے، اپنے بچوں کو بری صحبتوں سے بچاؤ کیونکہ بری صحبت سے مضر اثرات بچے پر پڑتے ہیں، شیخ سعدی نے فرمایا تھا کہ

صحبت صالح ترا صالح کند　　　صحبت طالع ترا طالع کند

نیک لوگوں کی صحبت تجھے نیک بنادے گی اور برے لوگوں کی صحبت تجھے برا بنادے گی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ بروں کی ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے اور تنہائی سے نیک لوگوں کی صحبت بہتر ہے۔

صحبت کا اثر شخصیت پر ضرور پڑتا ہے، انسان کتنا ہی بچنا چاہے بری صحبت کے اثرات سے بچ نہیں سکتا، میرے والد ماجدؒ ہمیشہ اس سلسلہ میں اپنوں کو، طلبہ کو، عوام ۔ کو اور مختلف اصلاحی مجالس میں تاکیداً فرمایا کرتے تھے کہ بری صحبتوں سے خود بچو اور اپنے بچوں کو بھی بچاؤ۔

مولانا روم نے عجیب بات ارشاد فرمائی ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیاء اللہ کی صحبت کے چند لمحات، سو سال کی بے ریا عبادت سے بھی بہتر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بڑوں کے درجات بلند فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ و بالا مقام عطا فرمائے اور ان کے بعد آنے والی نسلوں کو بھی دین اسلام کی تعلیمات پر مکمل طور پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ ■

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
حالات، اوصاف اور کمالات

ترتیب: مولانا طارق محمود مدنی

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر پاک وہند کی اُن شخصیات میں سے تھے جن کی حیاتِ مبارکہ علم وعمل، تقویٰ وطہارت، علم وتدبر، عقل ودانش، فہم وفراست، دین وسیاست اور جہد مسلسل جیسی عظیم الشان امتیازی خصوصیات کی حامل تھی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دینی وسیاسی محاذوں پر بے مثال خدمات سرانجام دیں، ان کے مصفا کردار کی روشنی سے ہزاروں انسانوں نے رہنمائی حاصل کی وہ اس عہد بے مثال کی نشانیوں میں سے تھے، جب اہل علم کا بول بالا تھا اور جن کے عادات واطوار میں ان اکابر اسلاف علماء، فقہاء اور محدثین کا عکس جمیل جگمگاتا تھا، جنہیں تاریخ نے ہمیشہ کے لیے اپنے صفحات میں محفوظ کرلیا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بھرپور دینی وسیاسی زندگی گزاری اور اس حسین امتزاج کے ساتھ کہ ہر دو شعبہ جات میں علمی ثقاہت، سیاسی بصیرت اور دوراندیشی دیکھی جاسکتی تھی۔ حضرت مدنی کو ایک عرصہ تک سیاسی محاذ پر کج فہم وکورچشم متعصب عناصر کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا مگر مردِحق آگاہ کی بصیرت وبصارت اور مؤقف کی تائید بعد کے حالات وناقدین واقعات میں یوں رونما ہوئی کہ اب بے بصر کو مارے ندامت کے چھپنے کی جگہ نہیں ملتی اور وہ تاریخ کے ابواب میں اپنی بیہودہ گوئی کے لیے معذرت درج کرانے کی جگہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت وسوانح پر دستیاب تحریری مواد ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے اور ہم نے کوشش کی ہے کہ آپ کی شخصیت کے حوالہ

سے بہت تفصیل نہ سہی مگر مختصر تفصیل کے ساتھ ہی آپ کی سیرت وسوانح جامع صورت میں پیش کیا جائے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جہاں آپ کی شخصیت پر دیگر مصنف حضرات کی فراہم کردہ تفاصیل مجتمع کردیں وہیں ان حالات وواقعات کو ترجیحی بنیادوں پر پیش کیا جائے جو خود حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حوالے سے بطور خودنوشت رقم فرمادی ہیں۔ آیئے! ایک عظیم المرتبت شخصیت کی سیرت وسوانح سے اپنے دل ودماغ روشن کرتے ہیں:

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے والد گرامی کا مختصر تعارف

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی کتاب ''نقشِ حیات'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ والد صاحب مرحوم (حضرت سید حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) الہداد پور میں ۱۸۵۷ء (جنگ آزادی) سے چار پانچ برس پہلے پیدا ہوئے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کو ہوش وحواس تھا اور اس سے پہلے کی رفاہیت اور یہ کہ ان کے لئے مٹکے لڈوؤں وغیرہ سے بھرے رہتے تھے، یاد تھے۔ حضرت مدنی کے دادا ''سید پیر علی'' کل تین بھائی تھے، پیر علی، نوازش علی اور تیغ علی رحمہم اللہ تعالیٰ...... نوازش علی اور تیغ علی مرحومین لاولد تھے، صرف پیر علی مرحوم صاحب اولاد ہوئے۔ چونکہ حضرت مدنیؒ کے منجھلے دادا تیغ علی مرحوم اور ان کی اہلیہ مرحومہ کو اولاد کا بہت شوق تھا اس لیے جب دادا پیر علی مرحوم کے منجھلے بیٹے ''نجیب اللہ'' پیدا ہوئے تو انہوں نے ان کو متبنیٰ بنایا اور گود لے لیا مگر قضاء الٰہی سے ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے اس کا اثر سب پر بہت ہوا، اس کے بعد جب (حضرت مدنیؒ کے) والد صاحب (سید حبیب اللہؒ) مرحوم پیدا ہوئے تو دادا صاحب مرحوم (سید پیر علیؒ) نے اپنے بھائی پر زور دیا کہ اب اس بچہ کو لے لو، وہ تامل کرتے تھے مگر ان کو مجبور کیا گیا بالآخر انہوں (تیغ علی) نے والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہؒ) کو لے لیا اور دونوں میاں بیوی (مرحومین) نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا، تقدیر الٰہی نے ایسی پلٹی کھائی کہ ۱۸۵۷ء تک تینوں بھائی (دادا مرحومین...... پیر علی، تیغ علی اور نوازش علی) انتقال کر گئے، گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا، زمینداری اور ثروت چھن گئی، افلاس اور ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحومہ نے نہایت تنگدستی کی حالت میں والد صاحب (سید حبیب اللہؒ) کی پرورش کی، میں (یعنی حسین احمد مدنیؒ) نے ان کو بچپن میں دیکھا ہے، فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے چرخے کات کات کر حبیب اللہ (یعنی والد حضرت مدنی) کو پالا ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہؒ) اللہ

کے فضل و کرم سے ذہین تھے اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا۔ طبیعت نہایت تیز اور مستقیم تھی اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ''ٹانڈہ'' میں علمی درس گاہوں میں پہنچتے رہے اور قرآن شریف، فارسی اور اسکول اردو میں مڈل کلاس پاس کرلیا اور جوانی کے شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ہی پرائمری اسکول ''التفات گنج'' میں ۸ روپے ماہوار پر مدرس ہوئے، اس ملازمت کی بناء پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہوگئیں، کاش اگر اس زمانہ میں کوئی مربی تکفل کرنے والا (یعنی سرپرستی کرنے والا) ہوتا تو وہ اپنی تعلیم میں بہت بڑی ترقی کرسکتے۔ ''التفات گنج'' میں ان کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا، تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کیے نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے ان کو لکھنؤ جانا پڑا، اس زمانہ میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا، وہاں پہنچ کر طبعی ذکاوت کی بناء پر بہت جلد عمدہ طریقہ پر کامیاب ہوئے اور پاس ہوتے ہی ''قصبہ پور ضلع اناء'' میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے اور پھر ''بانگر مئو'' میں تبدیل کردیئے گئے اور وہاں متواتر کئی برس تک مقیم رہے، اسی تنگی اور افلاس اور فکر معاش کی وجہ سے علوم عربیہ حاصل نہیں کرسکے، اگرچہ لوگ ان کو مولوی کہتے تھے مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے۔ صرف فارسی، اردو، ہندی، ''بھاشا'' (زبان) سے واقف تھے اور اسکول میں تدریسی مشغلہ کرتے تھے، اس زمانہ میں ایسے (علمی قابلیت کے) لوگ مولوی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

نارمل پاس ہونے کے بعد انگریزی بعض احباب کی ترغیب سے شروع کی مگر شروع کرنے کے بعد پہلی شب میں خواب کو دیکھا کہ دونوں ہاتھ پائخانہ سے ملوث ہیں اس کی وجہ سے ان کو انگریزی سے نفرت ہوگئی اور ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہؒ) اٹھارویں سال میں تھے اور ''التفات گنج'' پرائمری اسکول میں ملازم تھے، منجھلی دادی صاحبہ مرحوم نے ضروری سمجھا کہ شادی کردی جائے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نانا ''اکبر علی صاحب مرحوم'' جائیداد کے متولی و متصرف تھے اور ۱۸۵۷ء میں ''دریائے گھاگھرا'' میں ڈوب گئے تھے، تین لڑکے نوعمر اور ایک لڑکی (والدہ صاحبہ حضرت مدنیؒ) چھوڑ گئے تھے۔ (والدہ صاحب) نانا کی وفات کے وقت چھ مہینے کی تھیں، ان سب بچوں کی تربیت یتیمانہ طریقہ پر نہایت تنگدستی سے ہوئی کیونکہ باقی ماندہ زمینداری کی آمدنی بہت کم تھی اور کوئی بڑی عمر والا نہیں تھا، نانی صاحبہ مرحومہ بہت منتظم اور تعلیم یافتہ تھیں۔ انہوں نے فارسی، اردو وغیرہ بچوں کو حسب رواج وقت پڑھائی۔ دادی صاحبہ مرحومہ نے کوشش کی کہ رشتہ (والد صاحب) کے خاندان ہی میں ہوجائے؛ چنانچہ وہ کامیاب ہوگئیں اور جب کہ والدہ مرحومہ کی عمر ۱۴ برس کی تھی، شادی ہوگئی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے خاندان کا ذریعۂ معاش

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے پاس ۱۳ یا ۱۴ گاؤں تھے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور رفاہیت سے گزر بسر کرتا تھا، مشہور ہے کہ تختِ دہلی سے کسی زمانہ میں ۷۲ دیہات کی جاگیریں اطراف میں تین خاندانوں پر تقسیم ہوئی تھیں جن میں سے ایک ''الہداد پور'' کا حضرت مدنی کا خاندان بھی تھا جس کو ۲۴ گاؤں دیئے گئے تھے چونکہ کاغذات ضائع ہو گئے اس لیے حضرت مدنی کے خاندان کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ عطیہ کس بادشاہ کے وقت میں ہوا تھا اور کس وجہ سے ہوا تھا؟ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی سید حبیب اللہ مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے یہاں سے بر گزرنے پر مصارف خانقاہ کے لیے یہ دیہات (گاؤں) دیئے گئے تھے۔ واللہ اعلم

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں خانقاہ وغیرہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے اور ان میں مالکانہ تصرفات اہل خاندان کے لیے جاری تھے اور اس سے پہلے ۱۱ گاؤں غیر معلوم انقلاب اور اسباب کی بناء پر قبضہ واقتدار سے نکل چکے تھے، انگریزی حکومت کے زمانہ میں جو قدر و منزلت زمینوں اور جائیدادوں کی بڑھ گئی ہے وہ بلکہ اس کا عشرِ عشیر بھی زمانہ سابق میں نہ تھا، معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا، رہن رکھ دینا بلکہ دوسروں کو بخش دینا معمولی خدمتوں کے صلہ میں گاؤں کے گاؤں ہبہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم رؤسا کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ غرضیکہ انہیں وجوہ کی بناء پر صرف ۱۳ گاؤں باقی رہ گئے تھے، الہداد پور، جڑاون پور، چاند پور، گوبھرون پور، مہری پور، فرید پور، رسول پور، بھکنا پور وغیرہ۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا دار العلوم دیوبند میں سلسلۂ تعلیم

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دار العلوم دیوبند میں تعلیم کے سلسلے میں حضرت مولانا سید احمد میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جب حضرت مدنیؒ کی عمر ۱۳ سال تھی آپ کو دیوبند شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں بھیج دیا گیا یعنی ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کی فراست کاملہ نے اس سعادت عظمیٰ کو پہنچان لیا جس کے آثار بشرہ مبارک سے نمایاں تھے، مخصوص شفقت کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح تربیت شروع فرمائی اپنی نگرانی میں رکھا اور باوجودیکہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی خارج اوقات میں کسی کتاب کے درس کو موقع نہ دیتے تھے مگر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو ابتدائی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں۔

(بحوالہ حیات شیخ الاسلام ص:۱)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اسی دارالعلوم دیوبند کی ابتدائی تعلیم کے متعلق مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مدنی کو اپنے وقت کے بہترین اور یگانہ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا، استاذ العلوم حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ علیہم اجمعین سے تعلیم کے دوران آپ ہمیشہ اعلیٰ نمبر سے پاس ہوتے رہے، عربی مدارس میں ابتدائی نمبر ۵۰ ہوتے ہیں مگر آپ اکثر وبیشتر کتابوں میں ۵۱، ۵۲، ۵۳ نمبر لیتے رہے اور ''صدرا'' جیسی مشکل اور ادق کتاب میں ۵۷ نمبر حاصل کیے۔

(بحوالہ: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سوانح وافکار صفحہ ۲۸)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کی تعلمات کے سلسلے میں خود اپنی تحریر کردہ کتاب نقشِ حیات میں تفصیل سے فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب مرحوم (سید احمد مرحوم) نے گلستان کے تو شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے مگر ''میزان منشب'' خوب توجہ سے پڑھائی، جب دونوں خوب یاد ہوگئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر، حضرت حکیم حسن صاحب مرحوم کے پاس یکے بعد دیگرے پڑھیں اور یہ اسباق مدرسہ کے اوقات کے علاوہ خارج میں ہوئے اور اسی طرح بہت سے اسباق خارج اوقات میں عصر کے بعد مغرب کے بعد عشاء کے بعد ہوتے رہے جن کی وجہ سے مجھ کو جلد ترقی کرنے کا موقعہ ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل ہوگیا اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذہ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں۔ خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

حضرت مدنیؒ نے کون سی کتابیں کن بزرگ اساتذہ سے پڑھیں؟

۱- حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز...... دستور المبتدی، زراوی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات، قطبی تصورات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، موطا امام مالکؒ، موطا امام محمدؒ۔

۲- مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ)...... فصول اکبری۔

۳- مولانا عبدالعلی صاحبؒ مدرس دوم دارالعلوم دیوبند...... مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ، سبعہ معلقہ حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ، توضیح تلویح، تصریح۔

۴- مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ مدرس دارالعلوم دیوبند...... تلخیص المفتاح۔

۵- مولانا حکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند...... پنج گنج، صرف میر، نحو میر، مختصر معانی، سلم العلوم، ملا حسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

۶- مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مدرس دارالعلوم دیوبند...... شرح جامی بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، شرح مائۃ عامل، اصول شاشی۔

۷- مولانا غلام رسول صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند...... نور الانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

۸- مولانا منفعت علی صاحب مرحوم...... میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

۹- مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم...... (شاید یہ حضرت نانوتوی کے فرزند اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے لیکن حضرت مدنیؒ نے نام پورا وضاحت کے ساتھ درج نہیں فرمایا) شرح ملا جامی بحث اسم۔

۱۰- مولانا حبیب الرحمٰن صاحب...... مقامات حریری، دیوان متنبی۔

۱۱- بڑے بھائی مرحوم (سید احمد) میزان الصرف، منشعب۔

غرضیکہ ان مختلف علوم وفنون کی ۶۷ کتابیں جو ۱۷ فنون سے متعلق ہیں، ساڑھے ۶ برس کی مدت میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، یہ کتابیں عموماً درس نظامی اور ''نصاب درس ولی اللہی'' سے تعلق رکھنے والی ہیں جو کہ ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں جاری ہیں، کچھ کتابیں ادب، ہیئۃ، عروض، طب وغیرہ کی جو کہ داخل نصاب تھیں، باقی رہ گئی تھیں، سفر حجاز کی وجہ سے ہو پوری نہ ہوسکیں۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند صاحبؒ اول مدرس تھے اور ان کے پاس طلبہ کی بڑی بڑی کتابیں ہوتی ھیں، ابتدائی کتابیں ان کے پاس نہ ہوتی تھیں اور نہ ہوسکتی تھیں مگر چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے ''منشی حبیب حسن'' صاحب مرحوم ہماری جماعت میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے بوجہ ان کی حقیقی والدہ کے فوت ہوجانے اور قرابت قریبہ کے بہت زیادہ انس تھا اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ہم تینوں بھائیوں پر بہت زیادہ شفقت تھی اور بڑے بھائی صاحب مرحوم خدمت میں غیر معمولی حاضری دیتے اور امور خدمت انجام دیتے رہتے تھے۔ اس لیے رعایت خاصہ فرماتے رہے اور مندرجہ بالا ابتدائی کتابیں بھی مجھ کو پڑھائیں، پڑھنے میں بدشوق میں ہمیشہ رہا ہوں، کتابوں کا پوری طرح مطالعہ کرنا اور سبق پڑھنے کے بعد کتاب کو دیکھنا یا تکرار کرنا بہت کم ہوا، البتہ اس کا ہمیشہ التزام کیا کہ

اسباق میں حاضری ضرور دیتا رہا اور حتی الوسع مقام درس میں سبق سمجھ لینے کی پوری جدوجہد کرتا تھا جب تک ابتدائی کتابیں ہوئیں جن کا تقریری امتحان ہوتا تھا امتحانوں میں عمدہ اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا رہا مگر جب تحریری کتابیں آئیں (یعنی درجہ وسطی اور اوپر کے درجہ کی وہ کتابیں جن میں تحریری امتحان ہوتا تھا) ان میں پہلے سال چھ کتابوں میں سے تین میں فیل ہوگیا چونکہ تحریری امتحانوں میں تمام کتاب میں سے صرف تین سوال دیئے جاتے تھے اور کوئی تعین بحث اور باب وفصل کی طالب علم کو بتلائی نہیں جاتی تھی اس لیے اگر پوری کتاب پر اچھی طرح عبور نہ ہوا اور مباحث اچھی طرح یاد نہ ہوں امتحان میں کامیاب ہونا سخت مشکل ہوتا تھا۔ نیز قاعدہ یہ بھی تھا کہ تینوں سوالوں کے انفرادی نمبروں کو تین پر تقسیم کر کے اوسط نمبر نکالا جاتا تھا اور اسی پر مدار کامیابی ہوتا تھا اس لیے اگر دو سوالوں کے جوابات عمدہ سے عمدہ بھی لکھے جائیں اور ایک کا جواب کچھ نہ ہو تو نمبر اوسط تین پر تقسیم ہونے کے بعد کامیابی کے نہیں ہو سکتے تھے اس لیے سخت محنت کرنا ضروری ہوتا تھا اور بغیر اس کے پاس ہونا انتہائی دشوار ہوتا تھا، اس بناء پر میں نے ایام امتحان میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو کتاب ابتداء سے اخیر تک مطالعہ کرتا تھا اور تمام رات میں صرف ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم سوتا تھا، نیند کے دور کرنے کے لیے ''نمکین چائے'' کا انتظام کرتا تھا، جب بھی نیند غالب آتی تھی اس چائے کو پیتا تھا جس سے گھنٹہ دو گھنٹہ کو نیند جاتی رہتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے نیند سے مجبور رہتا ہوں اور بالخصوص کتب بینی کے وقت تو نیند بہت ہی غالب آجاتی ہے، اس طریقہ پر عمل کرنے کی وجہ سے مجھ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہوگیا اس کے بعد بحمد اللہ کسی کتاب میں فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ اپنی جماعت میں اکثر امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔

(بحوالہ نقش حیات صفحہ ۵۵)

دارالعلوم دیوبند کا امتحان

دارالعلوم دیوبند کا امتحان ابتداء سے نہایت سخت رکھا گیا، خواہ تقریری ہو یا تحریری طالب علم کو تقریری امتحان میں کوئی جگہ بتائی نہیں جاتی، جہاں ممتحن چاہے فوری طور پر پوچھتا ہے، طالب علم کو موقع امتحان پر غور وفکر کا موقع اور وقت نہیں دیا جاتا البتہ داخلہ کے امتحان میں کچھ آسانیاں کی جاتی ہیں اور تحریری امتحان میں بھی کسی جگہ کو کتاب میں سے متعین نہیں کیا جاتا، صرف اس دن اور وقت کا اعلان کیا جاتا ہے جس میں امتحان ہونے والا ہے، پرچہ ہائے سوالات نہایت حفاظت سے چھپوائے جاتے ہیں جن کا پتہ لگنا طلبہ کو محال ہوتا ہے، تمام کتاب میں سے جس مقدار کو طلبہ نے پڑھا ہے صرف تین سوال دیئے جاتے ہیں، مفروضہ نمبر کچھ نہیں ہوتے اور نہ زائد سوالات دیئے جاتے ہیں تاکہ طالب علم ان دس بارہ سوالات میں سے انتخاب کر کے جو سوالات

پسند آئیں ان کو لکھے اور مفروضہ نمبروں سے ایک تہائی حاصل کر لینے پر کامیاب شمار کیا جاسکے۔ کاش اگر ایسا کیا جاسکتا (جیسا کہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں رائج ہے) تو شاید ناکام طلباء کا وہاں وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ امتحان گاہ میں حفاظت وغیرہ کا انتظام مکمل کیا جاتا ہے جس کی بناء پر طلبہ کو استبداد و استعانت کا موقعہ بالکل حاصل نہیں ہوتا (یعنی نقل وغیرہ کا موقع نہیں ملتا) مگر افسوس ہے کہ دوسرے مدارس عربیہ میں اس قدر نگہداشت اور سختی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عربی تعلیم میں بہت زیادہ خامیاں ہوتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ممتحنین بھی دوسرے مدارس کے امتحانات اور پرچہ ہائے امتحان اور جوابات میں مجبور کیے جاتے ہیں کہ وہ کہیں بھی ایسی سختی عمل میں نہ لائیں جس کے وہ عادی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم کا طالب علم کسی ادارہ میں (مولوی فاضل، مولوی عالم وغیرہ) کے لیے داخل ہو جاتا ہے یا انگریزی زبان کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے امتحان دیتا ہے تو وہ اپنی جماعتوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیتا ہے جس کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحریر میں فرماتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جب میں داخل ہوا تو اہتمام جناب حاجی عابد حسینؒ صاحب (مہتمم) کا تھا تھوڑے عرصہ کے بعد جناب منشی فضل حق صاحب مرحوم مہتمم مقرر کیے گئے اور حضرت حاجی عابد صاحبؒ مذکورۃ الصدر بمنزلہ صدر مہتمم رکن مجلس شوریٰ ان کے نگہبان ہو گئے پھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا محمد منیر نانوتویؒ مہتمم مقرر ہو گئے اور پھر بعض وقائع کی بناء پر غالباً ۱۳۱۳ھ میں مولانا الحافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (حضرت نانوتویؒ کے فرزند) مہتمم مقرر ہوئے اور تاحیات یعنی ۱۳۴۷ھ تک عہدۂ اہتمام پر رونق فروز رہے، ان کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم نے سب سے زیادہ ترقی کی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جس زمانہ میں میں داخل مدرسہ ہوا اس زمانہ میں بیشتر طلبہ کی امداد دیوبند (اہالیان دیوبند) کھانوں سے کیا کرتے تھے، اصحاب استطاعت ایک ایک یا دو دو یا اس سے زائد طلب علموں کا کھانا دو وقتہ اپنے یہاں مقرر فرما دیتے تھے اور یہی طریقہ ابتدائی قیام مدرسہ سے تھا وظائف خوراک نقدی صورت میں ابتداء میں بہت کم تھے مگر بعد میں ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عام طلبہ کو خوراک کے نقدی وظائف دارالعلوم کی طرف سے جاری کرنے ضروری معلوم ہوئے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دارالعلوم میں مطبخ کا انتظام ہو گیا جس کی بناء پر اہل شہر کی امداد و طعام اور نقدی وظیفہ تقریباً لغی کے حکم میں ہو گیا۔ ہم تینوں بھائیوں کا بھی اس زمانہ میں دارالعلوم کی طرف سے کھانا مقرر کیا گیا؛ چنانچہ میرا کھانا حضرت مولانا محمد حافظ احمد صاحب خلف الصدق مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہاں اور بڑے

بھائی صاحب کا حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں اور بھائی سید احمد صاحب کا دوسری جگہ مقرر ہوا جب تک میں دیو بند میں رہا تقریباً تمام مدت اقامت میں میرا کھانا حضرت حافظ احمد نانوتویؒ موصوف کے در دولت پر رہا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کھانوں کے تقرر کی وجہ سے طالب علم بالکل متفرغ ہوکر مشاغل علمیہ میں منہمک ہوسکتا تھا، نقدی وظائف یا اپنے پاس سے کھانے میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا، اگرچہ میں بدشوق اور محنت و جفاکشی سے جان چور ہمیشہ سے تھا مگر بحمد اللہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا علمی شغف اور طبعی تناسب بھی روز افزوں ہوتا گیا اور اسی وجہ سے لہو ولعب بھی غیر مرغوب ہوگیا۔ اگرچہ بعد میں قیود شدیدہ سے آزاد ہوگیا تھا مگر مجھ کو اس سے بہت کم دوچار ہونے کا موقع ملا۔ ابتداء ابتداء میں مجھ کو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا، پھر علم ادب سے شغف ہوگیا۔ مقامات حریری او دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کے قصائد کے قصائد اور عبارتیں از بریاد ہوگئی تھیں، پھر علم حدیث سے شغف ہوگیا اور پہلے دونوں شغفوں میں کمی آگئی اور علم حدیث کے انہماک ہی میں دور طالب علمی ختم ہوگیا۔ ابتداء سے نمبر پائے امتحانیہ ۱۸ تا ۱۹ تا ۲۰ مقرر تھے اول درجہ ۲۰ کا تھا اوسطہ ۱۹ اور ادنی ۱۸ کا اس سے کم نمبر پر طالب علم انعامی نمبروں سے گرا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کو فیل ہونے والا کہا جاتا تھا اگر کوئی طالب علم غیر معمولی استعداد والا ہوتا اس کو ممتحن ۲۰ سے زائد نمبر بھی دیتا تھا جو کہ درجہ اعلیٰ کے نمبروں میں سے سمجھا جاتا تھا، بحمد اللہ اس زمانہ میں اکیس اکیس اور بائیس بائیس بھی متعدد کتابوں میں نمبر آتے رہے، اس کے بعد اراکین مدرسہ نے امتحانی اور تعلیمی ضرورتوں کی بناء پر اس قاعدوں میں تبدیلی کی اور ادنیٰ درجہ کامیابی کا ۴۰ اور متوسط درجہ ۴۵ اور اول درجہ ۵۰ مقرر کیا اس تغیر کے بعد امتحانات میں، ۵۳، ۵۱، ۵۲ اور صدر میں ۵۷ نمبر تک حاصل ہوئے۔ واللہ الحمد۔ (حضرت مدنی تحریر نقش حیات صفحہ ۵۸)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قطب الاقطاب حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت

حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ بلند شہری مہاجر مدنی فرماتے ہیں، ۱۳۱۶ھ میں حضرت امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حضرت شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بیعت ہوکر اپنے والد ماجد مرحوم اور چاروں برادران کے ہمراہ جد امجد کے بلدہ طیبہ (مدینہ منورہ) میں اقامت اختیار کی، مکہ معظمہ پہنچ کر حسب اجازت امام ربانی قدس سرہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے رجوع کیا اور اذکار تعلیم فرمودہ قطب العالم پر بھی بہ ہمت تمام کاربند رہے اس زمانے میں جو کچھ واردات عجیبہ و کیفیات غریبہ ظاہر ہوئیں ان کی اطلاع گنگوہ میں آستانہ عالیہ پر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں حضرت

گنگوہیؒ کا والا نامہ پہنچا کہ چند روز کے واسطے گنگوہ آ کر مجھ سے مل جائے تو بہتر ہوتا اس فرمان والا شان پر مطلوب بن کر (حضرت مدنی نے) باوجود تنگدستی و بے سروسامانی کے مراجعت ہندوستان کا تہیہ کر لیا۔ حضرت مدنی کے والد گرامی سید حبیب اللہ مرحوم کا باقتضائے محبت جی چاہا کہ بھائیوں میں سے کوئی ایک رفیق سفر ہوتا تو اچھا تھا، چھوٹے بھائی مولوی سید احمد صاحب جوان کے دو چار مہینے آگے پیچھے سلسلہ خدام میں داخل ہوئے تھے، غلبہ شوق کے سبب فرضی ضروریات ذاتی و خانگی قائم کر کے باپ سے ہمراہی برادر کی اجازت بھی لے چکے تھے مگر قدرت کو منظور ہی کچھ اور تھا۔ حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیقؒ در پردہ خفیہ انتظام کے چھپ کر چند روز پہلے روانہ بھی ہو لیے جس کی اطلاع ۱۲ گھنٹے بعد قریب مغرب ہوئی، مجبوراً مولانا سید احمد صاحبؒ (حضرت مدنی کے بھائی) کو ارادہ فسخ کرنا پڑا حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تنہا وروانہ ہوئے، جدہ میں دونوں بھائی مل گئے اور حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر گنگوہ پہنچے، چند روز گزرے تھے کہ امام ربانی نے ایک جوڑا یعنی ملبوس کرتہ اور پائجامہ دونوں بھائیوں کو عطاء فرمایا چونکہ اس میں ٹوپی یا عمامہ نہ تھا اس لیے دونوں میں سے کسی صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ارشاد ہو تو ہم خدام اپنا اپنا (یعنی حضرت مدنی، حضرت سید احمد) عمامہ حاضر کریں۔ اپنے دست مبارک سے عطاء فرما دیا جائے، یہ سن کر قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے سکوت فرمایا اور بمقتضاء ادب دونوں بھائی عطیہ قطب العالم حضرت گنگوہی کو سر آنکھوں پر رکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں صاحبوں (حضرت مدنی، حضرت سید احمد) نے اپنے عمامے حاضر کیے تو حضرت امام ربانی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھ کر ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے، حضرت مدنی کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق نے دبی زبان سے عرض کیا کہ "دستار فضیلت" ارشاد ہوا، "دستار خلافت" امام ربانی قدس سرہ کی قولی و فعلی خلافت کے مجموعہ کی مثال میں آپ کے خلفاء کے اندر صرف یہی دو حضرات پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے کمالات علمیہ و عملیہ اسی سے ظاہر ہیں کہ مدنیؒ مہاجر اور بطحائی پیغمبر ﷺ کے پڑوسی ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا درس بحمد اللہ حرم نبوی ﷺ میں بہت عروج پر تھا اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطاء فرمایا کہ ہندی علماء کو کیا معنی یمنی اور شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

حضرت مدنیؒ سرتاپا خلق، مہمان نواز، غیور، باحیا اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے مختصر یہ کہ حضرت مدنی زائد سے زائد ۲۲ سال کی عمر ہے کہ چشمہ رشد و ہدایت خود سے ساقی کو بلا کر خلافت صادقہ کا خلعت عنایت فرما دیتا ہے۔ زہے قسمت (بحوالہ تذکرۃ الرشید، جلد دوئم صفحہ ۵۸، ۵۹)

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے لوگ خاندان کے بزرگوں سے ہی بیعت ہوتے تھے،

باہر بیعت ہونے کا رواج نہ تھا، خاندان سے باہر والدہ نے بیعت کی تو سب خاندان کے لوگ ناراض ہوگئے، میں حضرت شیخ الہند سے بیعت ہونا چاہتا تھا لیکن والد صاحب حضرت گنگوہیؒ سے محبت کرتے تھے، چنانچہ میں نے پھر حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

شیخ العرب والعجم حضرت مدنی اپنی بیعت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ خاندان کے اسلاف اہل معرفت وطریقت تھے صرف اخیر میں دو تین پشتیں دنیا دار زمینداروں کی ہوگئی تھیں، نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہانِ دہلی سے خاندان کو ۲۴ گاؤں دیئے گئے تھے، شاہ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے سجادۂ طریقت اور دوسرے بیٹے ''تراب علی مرحوم'' نے جائیداد کا انتظام سنبھالا اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہوگئیں مگر خاندان میں کوئی شخص باہر کسی دوسرے خاندان سے بیعت نہ ہوتا تھا، والد صاحب مرحوم سب سے پہلے باہر بیعت ہوئے جس کی صورت یہ پیش آئی کہ ان کی شادی نانا اکبر علی مرحوم کی دختر سے ہوئی (نانا صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں تمام جائیداد کے متصرف تھے اور ۱۸۵۸ء میں امن قائم ہونے پر ضلع بستی سے واپس آتے ہوئے دریائے گھاگرا میں کشتی الٹ جانے سے ڈوب گئے تھے) نانی صاحبہ مرحومہ ''تندرولی ضلع فیض آباد'' کی رہنے والی تھیں اور صاحب کشف ونسبت تھیں۔ انہوں نے اپنے ماموں سے میکہ ہی میں سلوک طے کیا تھا ان کے ماموں بہت بڑے صاحب نسبت تھے۔ والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہ) کو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ تمہارے گھرانے میں مرید کرنے کا طریقہ جاری ہے مگر یہ غلط ہے جب تک کسی کامل سے بیعت ہوکر منازل سلوک طے نہ کر لیے جائیں مرید کرنا جائز نہیں قیامت میں سخت وبال ہوگا، اس لیے والد صاحب مرحوم کو شیخ طریقت کی تلاش تھی، خاندان کے دوسرے لوگوں نے بغیر سفر سلوک طے کیے خاندانی نام پر یہ سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور ان خاندانوں میں جو کہ اضلاع بستی، گونڈہ، گورکھ پور وغیرہ میں سلسلۂ اسلاف میں داخل ہوتے جاتے تھے اور نذرانہ وغیرہ وصول کرتے تھے اور لوگوں کو مرید کرتے تھے، والد صاحب مرحوم (سید حبیب اللہؒ) جب صفی پور میں مدرس اور ماسٹر ہوئے تو چونکہ گنج مراد آباد شریف قریب تھا اور ان اطراف میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادؒ کا شہرہ تھا اُن کی کرامت اور بزرگی بہت زیادہ زبانِ زدِ عوام وخواص تھی اس لیے حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کی خدمت میں آمد ورفت شروع کی اور وہ کمالات جو اہل اللہ میں ہونے چاہئیں دیکھ کر گرویدہ ہوگئے اور انہیں سے بیعت ہوگئے اور حسب تعلیم وارشاد فرائضِ سلوک انجام دینے لگے جہاں تک (مجھے) معلوم ہے حضرت مولانا قدس اللہ سرہ العزیز نے طریقۂ قادریہ کا سلوک حضرت والد صاحب مرحوم کو تلقین فرمایا تھا اور پھر جب (ان کی) تبدیلی ''بانگرمو'' کی ہوگئی تو بہت زیادہ حاضری کا موقعہ مل گیا کیونکہ بانگرمو گنج مراد آباد سے بہت ہی زیادہ قریب ہے، غالباً دو یا تین ہی میل کا فاصلہ ہے

پھر والدہ مرحومہ کو بھی مولانا فضل الرحمٰنؒ ہی سے بیعت کرایا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خاندان کے لوگوں نے والد مرحوم (سید حبیب اللہؒ) پر باہر بیعت کرنے پر اعتراضات بھی کیے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، والدہ صاحبؒ کے ارشاد پر ہم تینوں بھائیوں مولانا صدیق صاحب مرحوم اور مولانا سید احمد صاحب مرحوم اور مجھے (یعنی حضرت مدنیؒ) کو بھی دیو بند سے بعض اوقات واپسی پر گنج مراد آباد بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق صاحبؒ) دیو بند میں فارغ التحصیل ہوئے تو انہوں نے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت والد صاحب مرحوم سے طلب کی، والد صاحب مرحوم کی منشا طبعی طور پر یہی تھی کہ وہ حضرت گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز ہی سے بیعت ہوں، دونوں میں عرصہ تک خط و کتابت رہی، بالآخر والد صاحب مرحوم نے ان کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت دے دی اور وہ ان سے بیعت ہو گئے، اس عرصہ میں بھائی صاحب مرحوم بلند شہر اور سہوارہ وغیرہ بصیغۂ تدریس ملازم رہے اور حسب تعلیم ذکر و شغل بھی برابر کرتے رہے۔ ۱۳۱۶ھ میں جب کہ والد صاحب مرحوم نے بعد وفات حضرت مولانا گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز ارادۂ ہجرت کیا (چونکہ والد صاحب مرحوم کو حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بہت گہرا تعلق تھا اور تقریباً ان میں فنا تھے، اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ہندوستان میں (زندگی) بسر کرنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا، اسی وقت سے اس فکر میں ہو گئے کہ کوئی انتظام کر کے مع جملہ متعلقین مدینہ منورہ میں گزر بسر کی جائے) اور ماہ شعبان میں بارادہ توجہ وطن بھائی صاحب جائے ملازمت سے دیو بند پہنچے تو حضرت شیخ الہندؒ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ ان دونوں (بھائی سید احمد صاحب اور حسین احمد) کو حضرت گنگوہی سے بیعت کرا دو، اللہ جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلے پڑ جائیں، کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں۔ بھائی صاحب مرحوم نے ہم سے فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوں گا، واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ گنگوہ میں ایام طالب علمی میں بارہا حاضری کی نوبت آچکی تھی مگر حسنِ عقیدت اور محبت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہی سے تھی، بچپن سے ان کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لے کر آخری کتابوں تک کا اکثر حصہ انہیں سے پڑھتا رہا تھا۔ مضامین علمیہ اور اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ ایسے الطاف و کرم فرماتے تھے جو کہ اولاد کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے پوری وابستگی انہی سے تھی۔

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کو بہت بڑا عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل سمجھ تھا، بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق) نے جواب دیا کہ حضرت شیخ الہند بیعت نہیں کرتے، میں نے خود بہت کوشش اپنے لیے کی تھی جب نہیں راضی ہوئے اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہو جانے کا ہی ارشاد فرمایا تب میں وہاں بیعت ہوا، تم دونوں کے لئے بھی ان کا یہی ارشاد ہے۔ بالآخر وہاں ہم دونوں حاضر ہوئے، اس زمانہ میں حضرت استاد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیو بندی وہاں ہی خانقاہ میں رہتے تھے اور مشاغل سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطب عالمؒ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق مرحوم) نے ان کو خط لکھ دیا تھا کہ ان دونوں کو حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کرا دیجئے جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صحب مرحوم نے دونوں کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ مولوی صدیق احمدؒ نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں مولوی سید احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لیے بھیجا ہے وہ حاضر ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ ردوقدح فرمایا کرتے تھے، بالخصوص لکھے پڑھے اور عربی تعلیم یافتہ لوگوں کے متعلق تو بہت زیادہ کنج وکاؤ اور گفت وشنید کی نوبتیں آئی تھیں، بعض حاضرین اور بے تکلف خدام مثل مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندھلویؒ کے دریافت کرنے پر یہ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کسی شخص کو مجھ سے قلبی مناسبت ہے اور کتنی مناسبت ہے؟ اگر مناسبت نہیں ہوتی تو میں انکار کر دیتا ہوں ورنہ بیعت کر لیتا ہوں۔ بہر حال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس وپیش نہیں فرمایا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش فرمایا اور حضرت نے بیعت فرما لیا مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں حضرت (حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز) موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرما دیں گے۔ پس اسی روز ہم دیو بند واپس آگئے اور پھر وطن کو روانہ ہو گئے۔ دیو بند سے رخصت ہوتے وقت حضرت شیخ الہندؒ پیدل اسٹیشن تک ساتھ ساتھ تشریف لائے اور راستہ میں 'صدر چوکی'' کے پاس وصیت فرمائی کہ پڑھانا نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی طالب علم پڑھنے والا ہو۔ (تحریر، مولانا سید حسین احمد مدنی، نقش حیات، صفحہ ۹۱، ۹۲)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مدینہ منورہ میں سلسلۂ درس وتدریس

حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں درس وتدریس کی تفصیل خود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب کہ ہم تینوں بھائی دیو بند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کو خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز ساتھ ساتھ

اسٹیشن دیو بند تک پیدل تشریف لائے تھے، راستہ میں پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ "پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا" چاہے ایک دو طالب علم ہی ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہو گیا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے اگر چہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی اس لیے اشکال کا سامنا ہوا مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہندؒ اوقات کتابت کے دوسرے اوقات میں اس کام کو شروع کر دیا (اس زمانہ میں بہت سے علماء اعزازی طریقہ پر حرم محترم نبوی ﷺ (مسجد نبوی علیہ السلام) میں پڑھایا کرتے تھے، اس سے مجھ کو ایک تو فائدہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو وفقہ وغیرہ کی محفوظ ہو گئیں اور دوسرے یہ کہ زبان صاف ہو گئی، اہل علم میں عموماً اور علماء حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے، اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں، علماء ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے بسا اوقات شکست کھا جاتے ہیں اگر چہ مدینہ منورہ میں پہلے سے علماء ہند کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ "حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندھیؒ" اور ان کے بعد "حضرت شاہ عبدالغنی نقشبندی دہلویؒ" اور ان کے بعد "حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رودلویؒ" اور "مولانا محمد اسحاق امرتسریؒ" بڑے بڑے پائے کے علماء گزرے تھے جن کے غیر معمولی علم اور اعلیٰ استعداد و قابلیت کا سب کو اقرار تھا، بہت سی تصانیف اور بہت سے شاگردان کے وہاں موجود تھے۔ آخر الذکر ہر دو حضرات اس زمانہ میں زندہ بھی تھے۔

اگر چہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کی جلالی اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو استفادہ ممکن نہ ہو سکا تھا مگر ان کی اعلیٰ استعداد اور انتہائی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ بہر حال ہمارے جیسے ٹٹ پونجیوں کے لیے ان عربی علماء کے میدان میں امتیاز و امتحان میں پیش قدمی یا اعتبار پیدا کرنا نہایت مشکل امر تھا اس لیے ہمارا گوشۂ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا اور ابتدائی "کتب نحو وصرف و فقہ" وغیرہ سے اشتغال رکھنا بہت مفید ہوا۔ ۱۳۱۸ھ شوال تک میں اسی طرح ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علموں کو پڑھاتا رہا۔ حلقات درس و تدریس میں امتیازی شان اس وقت پیدا نہیں ہوئی اس لیے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ ۱۳۱۸ھ ذیقعدہ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ ماہ محرم میں واپس مدینہ منورہ پہنچا اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا۔ (حضرت مدینہؒ، بحوالہ نقش حیات صفحہ ۶۹)

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ اپنی کتاب علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے میں حضرت

شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مسجد نبوی ﷺ میں درس حدیث وتفسیر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) کے مذکورہ بالا سفر ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) تک مسلسل جوار رسول اللہ ﷺ میں قیام رہا، حرم پاک میں حلقۂ درس روز افزوں ترقی کر رہا تھا اور آپ صحاح ستہ اور تفسیر وغیرہ کی بڑی بڑی کتابوں کے تقریباً ۱۵ سبق روزانہ پڑھاتے تھے۔ نماز صبح کے بعد سے سلسلہ درس شروع ہو کر عشاء بعد تک رہتا، آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی اور "شیخ الحرم" کے خطاب سے آپ معروف ہو گئے۔

۸ سال بعد ۱۳۲۶ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے، جمعیت الانصار کی مؤتمر اور دار العلوم دیوبند کا جلسۂ دستار بندی (حضرت مدنی کی جدوجہد کے رہین منت تھے) تین سال بعد آپ دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اگلے سال یعنی ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے اور چند ماہ قیام فرما کر واپس مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اس موقع پر تنبیہ کر دینی مناسب ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ انقلاب کی تجاویز ہندوستان میں شدومد سے جاری تھیں اور جنگ یورپ کا آغاز ہو رہا تھا۔

(بحوالہ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، صفحہ ۳۹۲)

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی مدینہ منورہ کی تعلیمی حالت اور دیوبند جانے کی اصلی ضرورت

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر مشغلۂ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے تمام مشاغل معاش وغیرہ سے دست بردار ہو کر حضرت مدنیؒ سفر گنگوہ سے واپس ہوتے ہی مسجد نبوی ﷺ میں تعلیمی مشاغل میں تدریجاً منہمک ہو گئے حتی کہ روزانہ ۱۳-۱۴ کتابیں مختلف فنون کی پڑھاتے تھے اور چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے تو ان کی تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس ۵-۴ ہوتے تھے۔ بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہندوستان میں پڑھایا نہیں جاتا ہے اور مدینہ منورہ، مصر، استنبول کے نصاب میں وہ داخل ہیں پڑھانی پڑیں، مثلاً اجرومیہ، وملان، کفرادی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الفیہ، ابن ہشام وغیرہ (نحو میں) شرح عقود الجمان، رسالہ استعارات، رسالہ وضعیہ، للقاضی عضد وغیرہ، معانی وبیان میں) بدلعیۃ ابن حجر (بدلیع میں) نور الایضاح ملتقی الابحر، درر وغیرہ، (فقہ میں) شرح جمع الجوامع للسبکی وشرح مصطفی الاصول، ورقات وشرح ختمی الاصول وغیرہ (اصول شافعیہ ومالکیہ میں) مسامرہ، شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ وغیرہ (عقائد میں) الفیۃ اصول الحدیث، بیقونیہ ودیگر رسائل اصول حدیث میں...... اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جن کو یہاں سنا

بھی نہ تھا پڑھانا پڑیں، حضرت مدنی فرماتے ہیں چونکہ نفس فن میں ان فنون سے مناسبت تھی اس لیے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں جن کتابوں کو یہاں پڑھاتا تھا، خواہ تفسیر کی یا حدیث، معانی کلام، فقہ یا اصول وغیرہ کی ان کی بھی بارہا نوبت آئی اور بحمد اللہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکابر اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور دعائیں اور فضل خداوندی شامل حال تھا اس سے علمی ترقی ہوتی گئی اور افاضہ اور استفاضہ کا حصہ روز افزوں ہوتا رہا اگر (میں) حافظہ جید اور عمدہ ہوتا تو یقینا بہت بڑی استعداد اور ذخیرۂ علمی حاصل ہو جاتا، اس امر کا التزام تھا کہ کوئی کتاب بلا مطالعہ اور بغیر شروح وحواشی پر پوری طرح نظر ڈالنے اور سمجھنے کے نہ پڑھائی جائے، اسی وجہ سے دن رات میں تقریباً ۳ ساڑھے ۳ گھنٹہ سونا (آرام) ملتا تھا، باقی اوقات مطالعہ یا تدریس یا ضرورت بشریہ وغیرہ میں صرف ہوتے تھے، البتہ کبھی کبھی تمام دروس کا ناغہ کر کے دن کو چھ سات گھنٹے سو جاتا تھا جس سے ہفتہ بھر کا تھکان رفع ہو جاتا تھا، اس زمانہ تعلیم میں جب کہ خوب سمجھ کر اور شروح وحواشی کا مطالعہ کر کے کتابیں پڑھانی پڑیں تو مضامین منحصر ہو گئے۔ کتب عالیہ حدیث وتفسیر وعقاید واصول وغیرہ میں اور بالخصوص حدیث وتفسیر میں بعض بعض شبہات اور مشکلات پیش آتی رہیں جن کو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اور طبعی طور پر زوردار خواہش ہوتی تھی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ تک رسائی ہو تو کتب حدیث پھر پڑھوں کیونکہ طالب علمی کے زمانہ میں اس طرح مضامین منحصر نہ تھے اس لیے مشکل مسائل کے حل کرنے کی صورت پوری طرح سے نہ ہو سکتی تھی اور عمر کا وہ حصہ لا اُبالی پن کا بھی تھا مگر اب اشد ضرورت ہے، پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد جب کہ والد صاحب مرحوم نے ہندوستان کے سر کا ارشاد فرمایا تو میں (حضرت مدنی) نہایت خوشی سے اس پر تیار ہو گیا اور سیدھا دیوبند پہنچا اور ترمذی شریف اور بخاری شریف میں شریک ہو گیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پھر پڑھا۔ مسائل پر پوری بحث کرتا تھا۔ حضرت شیخ الہند بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جوابات نہایت وضاحت سے دیتے تھے جس سے بہت فائدہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ پہلے بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے مگر اس مرتبہ بہت زیادہ عنایات فرمائیں اور علاوہ علمی افادات کے دنیاوی اور معاشی امور میں بھی مثل والد حقیقی بلکہ زیادہ توجہ فرماتے رہے میرا (حضرت مدنی کا) قیام بھی حضرت شیخ الہند کے یہاں رہا، دوسرے نکاح کے بعد بھی اہلیہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکان ہی پر رکھا، سفر وحضر میں ساتھ رہا، دارالعلوم دیوبند میں بسلسلۂ تدریس ملازم بھی ہو گیا۔ ایک مرتبہ ''ہدایہ اخیرین'' میں ایک مسئلہ ایسا آ گیا کہ بہت غور وفکر اور حواشی وشروح کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہو سکا، سخت عاجز ہو کر ''حجرۂ مطہرۂ نبویہ'' پر حاضر ہوا اور بعد سلام درود شریف عرض کیا تو تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آ گیا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی

تصانیف میں ایسے حکم اور علمی مضامین ملتے تھے کہ تمام مطولات وکتب قدیمہ میں ہاتھ نہیں آتے تھے ان سے طبیعت کو بہت زیادہ اطمینان اور شرح صدر ہوتا تھا اور یہی حالت اب تک ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر ارمان پیدا ہوتا تھا کہ کاش یہ علوم مجھ کو بھی حاصل اور محفوظ ہو جائیں کیونکہ حضرت نانوتویؒ کی تحقیقات نہایت ہی بلند پایہ اور مفید ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف میں بھی تحقیقات اور حکمتیں بھری ہوئی ہیں اور نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں مگر مجھ کو جو طمانیت اور بلند پائے کی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تصانیف میں ملتی تھی وہ وہاں نہ تھی (مدینہ میں) اگرچہ تحقیقات کے انتہائی بلند پایہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مضامین سمجھ میں آنے دشوار ہوتے تھے اور چند صفحوں کے مطالعہ کے بعد طبیعت تھک بھی جاتی تھی اور بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں تاہم ان سے بہت سکون اور شرح صدر ہو جاتا تھا افسوس کہ حافظہ کی کمزوری کی بناء پر بہت سے مضامین تھوڑے عرصہ میں ضائع ہو گئے اور ہوتے رہے ایک روز بہت غلبۂ شوق پیدا ہوا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی رغبت اس قدر زیادہ ہوئی کہ مواجہ شریفہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) میں حاضر ہو کر بہت رویا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی استدعا اور درخواست کرتا رہا اور اپنی بے بضاعتی اور جہالت کا شکوہ بھی کیا۔ دیر تک اسی حالت گریہ میں رہ کر واپس ہوا تو چند قدم ہی چلا تھا کہ یکایک قلب میں واقعہ ہوا۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ مگر افسوس کہ آج تک محرومی ہی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو جائے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علوم میں جد و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ اور علماء ومدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں اس کی مثال نہیں تھی، عوام کے اجتماع سے بعض بعض حلقے بڑے بڑے ہوتے تھے مگر پڑھنے والے اور جد وجہد علمی کرنے والے اوروں کے یہاں کم تھے اور میرے (حضرت مدنی) یہاں حال برعکس تھا۔ عوام کو اس وجہ سے دلچسپی نہ ہوتی تھی کہ علمی بحثیں ان کی سمجھ میں آنی دشوار ہوتی تھیں بعض بعض علماء ایسے بھی تھے کہ ان کے یہاں پہلے پہلے رجوع بہت زیادہ تھا مگر بعد میں کم ہو گیا اور ان کے یہاں کے طلبہ بھی میرے یہاں آنے لگے، یہ سب برکتیں ان ذوات مقدسہ کی تھیں جن کی جوتیاں اٹھانے کا شرف بہ عنایت ایزدی حاصل ہوا تھا ورنہ میں تو بالکل ہی ناکارہ اور خالی تھا اور آج تک خالی ہی ہوں۔

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں
عبید سود کا ان کے لقب ہے یوسف ثانی

کا منظر آتا تھا اس کی بناء پر جس طرح بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہو گئی۔ اسی طرح ایک جماعت حاسدین اور رقباء کی بھی پیدا ہوئی، اس میں غیر علمی ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جو محض اس بناء پر بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اس قدر قبولیت اور رفعت کیوں حاصل ہوتی جارہی ہے۔

اگرچہ میرے طرز عمل اور اکابر کے اتباع اخلاق واعمال اور تواضع کی وجہ سے ان کی کامیابی کی صورتیں منصہ ظہور پر نہیں آسکیں مگر پھر بھی ان کے دلوں میں حسد کے زخم ہرے ہوتے رہے۔ (بحوالہ نقش حیات صفحہ ۱۱۶)

حضرت مدنیؒ کی والدہ مرحومہ کا خواب

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ پہنچنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک تمام کاروبار خانہ داری مشترک تھا۔ حضرت مدنیؒ کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے اپنی تینوں بہوؤں میں کام کی باری مقرر کر رکھی تھی، کھانا سب کا ایک ہی جگہ پکتا تھا، والدہ صاحبہ کام تقسیم فرمادیا کرتی تھیں، باری والی عورت "پخت وپز" کے تمام کام اپنی باری پر انجام دیتی تھی اور زائد مشاغل میں سب شریک رہتی تھیں مگر طبعی طور پر ان نئی عورتوں میں کچھ تنافس اور تنافر کی نوبت آئی، بالخصوص اس بناء پر کہ حضرت مدنی کے بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ حضرت مدنیؒ کی والدہ ماجدہ کی حقیقی بھتیجی تھیں اور باقی ماندہ دو عورتیں اجنبی خاندانوں کی تھیں، اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ تمام نظام خانہ داری ہر ایک کا علاحدہ کر دیا جائے مگر سرمایہ کی کمی اس کی اجازت نہ دیتی تھی، ناگوار امور پر صبر کرنا اور کرانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ حضرت مدنیؒ اور ان کے بھائی (غالباً) سید احمد مرحوم) سفر گنگوہ شریف میں تھے، ایک روز حضرت مدنیؒ کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے خواب دیکھا کہ حجرہ مطہرہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) میں قبر شریف پر چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اس پر جناب رسول اللہ ﷺ لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں اور والدہ ماجدہ پیچھے بیٹھی ہوئی آپ ﷺ کی کمر دبا رہی ہیں یکایک سامنے سے حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ (وحید مرحوم کی والدہ) آئیں تو جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت مدنیؒ کی والدہ ماجدہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: "تم ان کو جدا کیوں نہیں کر دیتی ہو؟" یہ خواب حضرت مدنیؒ کی والدہ صاحبہ نے صبح حضرت مدنیؒ کے والد ماجد (یعنی اپنے شوہر سید حبیب اللہؒ) مرحوم سے ذکر کیا تو اسی روز والد صاحب نے سب کو جدا کر دیا مگر چونکہ سید احمد صاحب کی اہلیہ خواہشمند نہ تھیں اور قرابت قریبہ کی وجہ سے کوئی گرانی ان پر آتی تھی اس لیے وہ حضرت مدنی کی والدہ ماجدہ ہی کے ساتھ رہیں، جو جو جنسیں غلہ وغیرہ اور گوشت ترکاری اور دیگر ضروریات کی آتی تھیں خام تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ بعد اجراء وظائف بھی عرصہ تک یہ طریقہ جاری رہا مگر بعد میں حضرت مدنیؒ کے والد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو۔ (بحوالہ نقش حیات صفحہ ۸۳)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی دارالعلوم دیوبند میں تدریس اور دستار بندی

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ۱۳۲۷ھ تک دارالعلوم دیوبند میں

کتب دورہ میں سے ترمذی اور بخاری شریف کو جد وجہد کے ساتھ پڑھتا رہا۔ ۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم کیا، تمام اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہم اللہ تعالیٰ کی خواہش اور تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفضل بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان میں آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے۔ چنانچہ مجھ کو متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیئے گئے اس سے مجھ کو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوگئی اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ جب سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف خدمت گزاری سے بازیابی ہوتی۔ ۱۳۲۸ھ میں تجویز ہوا کہ دستار بندی کا جلسہ عرصہ دراز سے دارالعلوم دیوبند میں نہیں ہوا ہے اس کو عمل میں لانا چاہیے۔ زمانہ ہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لیے طالب علم کتب درسیہ پڑھ کر اور علوم وفنون فقہ وحدیث میں ماہر ہو کر اس درجہ میں پہنچ گیا ہے کہ اس کے فتویٰ قابل اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم وتدریس قابل اطمینان شمار ہو کر دو طریقے جاری کیے گئے تھے۔ ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقہ عطا کرنے کا ہوتا تھا۔ مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھ دیتے تھے یا اپنا جبہ وغیرہ خرقہائے علماء کو عطاء کرتے تھے۔ اس طریقہ ثانیہ سے عام خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلاف سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہل علم سے ہو سکتا تھا۔

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستاری بندی کا طریقہ جاری کیا گیا، دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی اور سند اور امتحان وتقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دارالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز تعلیم عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا۔ یہ طریقہ غالباً ۱۳۰۴ھ تک جاری رہا مگر بعد میں کچھ ایسے عوائق (حالات) پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہو سکی، طلبہ کو صرف سند دی جاتی تھی مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے جن کو ''لطائف حیل'' سے ارباب راہتمام ٹالتے رہتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند ۱۳۰۴ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مختلف مشکلات میں مبتلا ہوتا رہا۔ داخلی اور خارجی صدمات آئے دن پیش آتے رہے، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مدرس اول کا وصال، مولانا سید رفیع الدینؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ہجرت، مولانا سید احمد دہلویؒ مدرس اول کا مدرسہ سے بیزار ہو کر سفر بھوپال، ارباب اہتمام کی تبدیلی کبھی حضرت حاجی عابد حسینؒ، کبھی منشی فضل حق صاحب مرحوم، کبھی مولانا محمد منیر نانوتوی صاحب

مرحوم، بھی مولانا حافظ احمد صاحبؒ (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے ہیں) یکے بعد دیگرے مہتمم ہوتے رہے اس تغیر اور تبدل میں اندرونی انتظامات اور افکار میں بہت کچھ قلق اور شورشوں کا ظہور ہوتا رہا جس سے ارباب انتظام کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ وہ اس جلسۂ دستار بندی کا نظام قائم کریں۔ ۱۳۱۳ھ میں انہیں شورشوں کے دبانے کے لیے حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور نواب محمود علی خاں صاحب آف چھتاری مرحوم اور ملک کے دیگر اکابر جمع ہوئے اور مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے) کو مستقل مہتمم بنایا گیا۔ امید تھی کہ اب شورشوں کا قلع قمع ہوجائے گا مگر ۱۳۱۸ھ تک قلع قمع بالکل نہ ہوسکا، اس کے بعد مکمل سکون پیدا ہوا، اس وقت سے ترقیات دارالعلوم دیوبند کا دروازہ بڑے پیمانہ پر کھلنے لگا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحریر میں فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو فارغ التحصیل طلبہ کی مقدار بہت زیادہ ہوگئی تھی جن کا اندازہ ہزار سے زیادہ تھا، اس لیے صرف عماموں کی بہم رسانی کے لئے زر کثیر کی ضرورت تھی مگر اس سے بڑھ کر مصارف مہمانداری جو کہ ایسے اجتماع پر ضروری ہیں ان سے منتظم حضرات بہت گھبراتے تھے، اول تو خود علماء فارغ التحصیل ہی کا شمار اتنا تھا کہ ان کی مہمانداری کے لئے کافی مقدار کی ضرورت تھی۔ ثانیاً دارالعلوم دیوبند کی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ معمولی اعلان پر دس پندرہ ہزار مسلمان ضرور اطراف و جوانب سے جمع ہوجائیں گے چونکہ لوگوں کے مطالبے بہت زور کے اور زیادہ ہوئے اس لئے ہر دو حضرات مہتممین مرحومین نے حضرت شیخ الہندؒ پر اس کی انجام دہی کا زور دیا اور اس کے فوائد اور تقاضوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ حضرت شیخ الہند بھی موافق ہوگئے اور پھر تینوں حضرات نے مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظوری لی اور ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء جلسہ کا اعلان کردیا۔ ضروریاتِ جلسہ کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی اس لیے طلبہ کے وفود اطراف و جوانب میں تحصیل چندہ کے لئے روانہ کیے گئے۔ مسلمانوں نے ہر صوبہ اور ہر گوشہ سے لبیک کہا اور تقریباً ایک ماہ سے کم میں جب کہ وفود واپس آئے تو ۱۸-۲۰ ہزار روپے جمع ہوگئے تھے اور شہرہ بھی جلسہ کا اس کے ذریعہ سے بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ تمام انتظامات لازمہ بڑے پیمانہ پر انجام دیئے گئے اور بحمد اللہ اس حسن و خوبی سے تمام امور تکمیل پائے گئے کہ عوام تو درکنار خواص اور ماہرین کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان بوریا نشین غریب علماء نے اس قدر عظیم الشان شاہانہ کام کو کس طرح انجام دے دیا، مسلمان جوق در جوق اطراف اور جوانب سے نہایت شوق اور محبت سے آکر جمع ہوگئے۔ اہل شہر نے اپنے اپنے مکانات مہمانوں کے لئے خالی کردیئے، مہمانی کے لئے نہایت بڑے پیمانہ پر مطبخ (باورچی خانہ) بنایا گیا۔ دہلی سے مشہور باورچی بلائے گئے، ہر قسم کی ضروریات کا مکمل انتظام کیا گیا۔ جملہ امور متعلقہ کے لئے شعبے قائم

کئے گئے طلبہ اور ملازمین و مدرسین کی پارٹیاں تقسیم کار کے اصول پر بنائی گئیں، ہر ذمہ دار اپنے اپنے کام میں منہمک اور مشغول رہتا تھا مگر حضرت شیخ الہندؒ نہایت ساکت وصامت تفکر کے دریا میں غرق نظر آتے تھے، کبھی یہاں بیٹھ گئے، کبھی وہاں، ان تمام ایام میں حضرت شیخ الہندؒ مراقب پائے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی عظیم الشان بار آپ پر پڑا ہوا ہے جس کی فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے پروردگار سے عرض معروض کر رہے ہیں اور واقعہ بھی یہی تھا۔ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی تھیں جن امور کو "عدۃ لاینحل" اور معمولی طاقتوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا وہ چٹکیوں میں انجام پاتے تھے، لوکل حکام نے بھی مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی، مدرسے کے تالاب میں نہر سے پانی لایا گیا جس کی وجہ سے مجمع کے لئے وضو وغیرہ کی بہت آسانی ہو گئی۔ ٹیوب ویل جگہ جگہ گاڑے گئے، پنڈال نہایت وسیع بنایا گیا۔ علاوہ ظاہری انتظامات کی تکمیل کے باطنی تصرفات اور روحانی برکات کا ہر جگہ ظہور تھا، غیر معمولی بات یہ تھی کہ باوجود یہ کہ ہر وقت کئی کئی سو من غلہ اور گوشت پکتا تھا مگر کسی جگہ کتا نظر نہیں آتا تھا، باوجود یہ کہ گرمیوں کا زمانہ تھا مگر مکھیوں کا اجتماع کہیں نہ تھا، غلاظت اور گندگی جو کہ ایسے مجامع (اجتماعات) میں عموماً پائی جاتی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھی، اس قدر عظیم الشان مجمع میں کوئی شخص کھانے اور مہمانی کے فرائض سے محروم اور شاکی نہیں پایا گیا حالانکہ معمولی معمولی باتوں اور جامع میں اس قسم کے بے عنوانیاں سینکڑوں پائی جاتی ہیں اس زمانہ میں اخباروں نے جلسہ کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کئے۔

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ میرے ذمہ طلبہ کو عربی میں تقریر کرانے کی خدمت تعین کی گئی تھیں؛ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف عنوانات پر تقریباً ۱۲ یا ۱۵ طالب علم عربی تقریر کے ماہر ہو گئے تھے۔ ارباب انتظام کی خواہش تھی کہ ان سب کو مجمع میں عربی میں تقریر کرائی جائے۔

جلسہ میں اولاً جناب قاری عبدالوحید خان صاحب مرحوم مدرس تجوید اور ان کے شاگردوں بالخصوص مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ (یہ دونوں بھائی تھے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے تھے) نے باتجوید قرآن سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ احمد نانوتوی صاحبؒ نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ "دارالعلوم دیوبند کا زریں ماضی اور مستقبل" جو کہ نہایت مبسوط تھا اور اس میں دارالعلوم دیوبند کی ماضی کی خدمات دینیہ اور علمیہ کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔ سنایا اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی اس کے بعد سب سے پہلے عربی زبان میں محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ نے مبسوط تقریر فرمائی ان کے بعد میں نے (حضرت مدنیؒ نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے فضائل کے متعلق تھی پھر دو نوجوان طلبہ نے تقریر کی مگر طلبہ کی امنگیں (اس وقت) مایوسی

سے تبدیل ہوگئیں جب عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہئیں ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ارباب انتظام نے مجبور ہوکر تقریریں بند کرادیں اور اردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی ہوئی اس کے بعد میری (یعنی حضرت مدنی) دستار بندی کی گئی، مجھ کو ایک عمامہ سبز حسب اصول مدرسہ کے دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے از دست حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ بندھوایا گیا اور مجھ کو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت مولانا حمید مسعود احمد صاحب صاجزادہ حضرت قطب العالم گنگوہیؒ نے دوسری دستار عطاء فرمائی پھر جناب حکیم مولانا احمد صاحب رامپوری رکن مجلس شوریٰ نے تیسری دستار عطاء فرمائی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عربی تقریر کے بعد اردو میں بھی مجھ کو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ اور حضرت مولانا محمد علی تھانویؒ کی تقریروں اور مواعظ سے لوگوں نے بہت اثر لیا اور بہت زیادہ فوائد عام حاضرین کو حاصل ہوئے۔ افسوس کہ اتنے بڑے عظیم الشان مجمع کے لئے باوجود پنڈال کی وسعت کے مقرر کی آواز سب تک پہنچنا سخت مشکل ہوتا تھا اس وقت لاؤڈ اسپیکر جاری نہیں ہوا تھا، ورنہ یہ مشکل پیش نہ آتی، اس مجمع میں صاجزادہ آفتاب احمد خان صاحب مرحوم نے بھی تقریر فرمائی تھی۔ خلاصہ یہ کہ جلسہ اپنی معنوی اور مادی برکات اور عظمتوں کی بناء پر اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ دوسری جگہ اس کی مثال نہیں پائی گئی۔ پوری تفصیلات اس کی مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی تھیں جو کہ دارالعلوم دیوبند کے ریکارڈ میں محفظ ہے اس میں دارالعلوم دیوبند کو بعد منہائی مصارف (اخراجات کے بعد) بڑی مقدار چندہ کی بھی حاصل ہوئی اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند نے نمایاں شہرت اور قبولیت ملک میں پیدا کر کے ایسی ترقیاں کیں، جن کا وہم وگمان بھی پہلے نہ تھا۔ واللہ الحمد والمنہ (حضرت مدنیؒ بحوالہ نقش حیات صفحہ ۱۴۷)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خوابوں کی تفصیل

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے بعد ہی سے برکات کا سلسلہ اور فیضِ اکابر طریقت میں اپنے اندر محسوس کرنے لگے تھے، بالخصوص جب سے بالالتزام ذکر مدینہ منورہ میں کرنے لگے تھے، حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے تھے کہ اکابر نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ عرصہ سے (تقریباً ۱۰۰ برس یا اس سے زائد) ہندوستان میں برکات ذکر بڑھ گئی ہیں یا اٹھتی جارہی ہیں وہ فیض جو زمانہ قدیم میں حاصل ہوتا تھا اب نہیں ہوتا، تاہم حرمین شریفین میں یہ فیض بدرجۂ اتم موجود ہے۔ (او کما قال)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ زید شرفا میں سلسلہ رؤیا صالحہ وغیرہ بکثرت جاری رہا مگر اس وقت لکھنے اور ضبط کرنے کا خیال نہیں ہوا۔ حضرت مدنی فرماتے ہیں خواب میں جناب رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اولیاء عظام، ائمہ فخام اور جناب باری عز اسمہ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا چونکہ قلم بند کرنے کی نوبت نہیں آئی اس لیے بلا ترتیب زمانہ جس قدر یاد ہے تحریر کرتا ہوں۔

پہلا خواب

ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدار جناب رسول اللہ ﷺ مسجد شریف کے شمالی دروازہ "باب مجیدی" کے باہر بجانب شمال منہ کئے ہوئے (قبلہ مدینہ منورہ اور مسجد نبوی ﷺ کا بجانب جنوب ہے) مسجد سے نکل کر کھڑے ہیں اور آپ ﷺ کے میں (دونوں ہاتھوں کا مجموعہ) میٹھے کدو (جس کو کھبیڑا اور عرب میں دباء رومی کہتے ہیں) کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا جب میں قریب پہنچا تو آپ نے لپ کو نیچے سے کھول دیا (دونوں ہاتھوں کو نیچے سے کھول دیا) کچھ بیج نیچے گرے تو میں نے دامن میں لے لئے ان کی مقدار تقریباً ۳۰ عدد تھی۔

نوٹ: مسجد نبوی ﷺ کا شمالی دروازہ باب مجیدی کہلاتا ہے اور سور البلد کا دروازہ جو اس باب کے سامنے بجانب شمال واقع ہے اس کو بھی باب مجیدی کہتے ہیں، ہر دو دروازے سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے بنوائے ہوئے ہیں اس لئے ہر دو کو باب مجیدی کہتے ہیں۔

نوٹ:...... حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں میٹھے کدو کے بیج بکثرت پائے جاتے ہیں لوان کو بھاڑ (بھٹی) میں بھنوا کر دوکانوں پر فروخت کرتے ہیں اس کا مغز (گری) لوگ کھاتے ہیں مگر مجھ کو خواب میں یہ احساس نہیں تھا کہ یہ بیج بھنے ہوئے حسب عادت گری کھانے کے لئے ہیں یا کچے ہیں جو کہ بونے کے لئے ہوتے ہیں بلکہ یہی آخری امر غالب خیال تھا۔

دوسرا خواب

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مسجد شریف میں منبر شریف کے سامنے بجریہ کے نیچے (وہ اونچی چھت دار جگہ جس پر تکبیر کہنے والے چڑھ کر تکبیر کہتے ہیں اور اثناء نماز میں انتقالات پر بلند آواز سے مقتدیوں کو آگاہ کرتے ہیں یہ جگہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے چار یا پانچ گز بجانب شمال واقع ہے) لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تیرے قدم جناب رسول اللہ ﷺ کے قدم جیسے ہیں، اس کی تعبیر حضرت قطب العالم حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ نے اتباع سنت سے دی تھی۔

تیسرا خواب

حضرت مدنی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کھلی ہوئی ہے اور نبی کریم ﷺ کا جسم مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس باہر ہے، کفن کھلا ہوا ہے، چہرہ مبارک نہایت تروتازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تروتازہ ہے اور آنحضرت ﷺ سیدھے (چت) سو رہے ہیں مگر آپ ﷺ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں، میں نے قینچی سے آپ کی لبیں کتریں اور ناخنوں کو بھی کترا۔

نوٹ:..... حضرت مدنیؒ نے اس خواب کی تعبیر درج نہیں کی، میری ناقص عقل کے مطابق اس خواب کی تعبیر یہ بنتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت میں بعض لوگ غلط قسم کا اضافہ کرتے ہیں، بدعت وغیرہ کا اور حضرت مدنیؒ مسلمانوں کو نبی ﷺ کی صحیح اور سچی سیرت وسنت سے آگاہ کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

چوتھا خواب

روضہ مطہرہ (وہ حجرہ شریف جس میں قبر مبارک ہے) اس کے جنوبی دیوار اور مواجہ شریفہ کی جڑ میں ایک پختہ خندق تقریباً ڈیڑھ دو ہاتھ گہری اور کئی گز لمبی بنی ہوئی ہے جس کی لمبائی دیوار کی جڑ سے متصل سر مبارک کی طرف سے پاؤں کی طرف کو چلی گئی ہے اور کچھ لوگ کھڑے ہو کر لمبی جھاڑو لے کر پہنچا تو وہ سب ہٹ گئے، میں نے تمام خندق میں جھاڑو دی اور پانی ڈال کر پانی کو جھاڑو ہی سے صاف کیا، میں جھاڑو سے پانی کو صاف کرتا ہوں اور صاف کردہ جگہ میں پانی خشک ہوتا جاتا ہے، پھر دیکھتا ہوں کہ اس میں روی قالین خوش رنگ بچھ گئے ہیں، خندق کے آگے بجانب قبلہ شریف کی طرف چہرہ کئے ہوئے کچھ لوگ تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہیں۔

پانچواں خواب

حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میں باب السلام سے (مسجد نبوی کا سب سے بڑا دروازہ وجگہ بجانب مغرب واقع ہے) مسجد میں داخل ہوا اور حجرۂ مطہرہ کی طرف جارہا ہوں اور جناب رسول اللہ ﷺ قبر مبارک پر ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ قبلہ کی طرف آپ کا چہرہ مبارک ہے میں داہنی جانب سے حاضر ہوا (باب السلام مسجد نبوی ﷺ میں قبلہ رو ہونے والے کے لیے داہنی جانب پڑتا ہے) جب میں بالکل قریب پہنچا تو آپ ﷺ نے مجھ کو چار چیزیں عطاء فرمائیں ان میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیاء کو نہیں جانتا کیا تھیں۔ اس کے بعد میں کرسی کے پیچھے سے ہوتا ہوا ایک باغ میں (جو کہ بجانب قبلہ آنحضرت ﷺ کے

آگے تقریباً دس بارہ گز دوری پر واقع ہے) داخل ہوا اس میں میوہ دار درخت ہیں جن کی اونچائی قدآدم سے کچھ تھوڑی ہی زیادہ ہے ان درختوں کے پتے سیب کے پتوں جیسے ہیں اور ان میں پھل کالے کالے لگے ہوئے ہیں، میں نے بھی ان سیاہ پھلوں کو توڑ کر کھایا، مقدار میں یہ پھل چھوٹے انجیر کے برابر تھے مگر ان کا مزہ ان موجودہ پھلوں سب سے علاحدہ اور اس قدر لذیذ تھا کہ اس قدر لذیذ پھل میں نے کبھی نہیں کھائے اس کے بعد میں نے ایک درخت اسی باغ میں بڑے شہتوت کا دیکھا جس میں شہتوت لگے ہوئے ہیں جن میں پکے ہوئے پھل زرد رنگ کے ہیں، مس نے اس میں سے پکے ہوئے شہتوت توڑے اور میں سمجھ رہا ہوں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے، یہ شہتوت آپ کے واسطے لیے جا رہا ہوں۔

نوٹ:...... میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ حضرت معلوم نہیں کہ ان چار چیزوں میں سے جو کچھ مجھ کو عطا فرمائیں علاوہ علم کے باقی تین کیا تھیں تو حضرت نے (شیخ الہندؒ مراد) نے فرمایا کہ حضرت ﷺ سے جو کچھ بھی ملے وہ خیر ہی ہے)

چھٹا باب

حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ ایک کتاب اشعار کی دیکھ رہا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا ''ہاں اے جیب رخ سے ہٹا دو نقاب کو'' یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا، میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہہ شریف میں بعد ادائے آداب وکلمات مشروعہ انہیں الفاظ کو پڑھنا اور شوق دیدار میں رونا شروع کیا۔ دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ ﷺ میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ حائل نہیں ہے اور آپ کی کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، آپ کا چہرۂ مبارک سامنے ہے اور چمک رہا ہے۔

ساتواں خواب

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصد سے سفر کر رہا تھا اور گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں اور ہر دو صاحب کے ہاتھ ایک کے دوسرے تشبیک (یعنی ایک ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں اس طرح ہے کہ ایک کی انگلیاں بھی دوسرے کی انگلیوں میں جال کی طرح پھنسی ہوئی ہیں جیسا کہ بے تکلیف اور انتہائی دوستی میں ساتھ چلنے کے وقت دو دوست ہتھیلی میں ہتھیلی اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں) کیے ہوئے ہیں۔

آٹھواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو ان سے دونوں ہاتھ ملا کر بیعت کی اور یہ الفاظ کے ابایعک علی ما بایعت بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم"

نواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ ائمہ مذاہب اربعہ یا کہا کہ آئمہ طرق اربعہ تیرے لیے دعا کرتے ہیں کیونکہ تو اثناء درس میں جب کسی کا ذکر آتا ہے تو ان کے لیے رحمۃ اللہ علیہ عالی کہتا ہے یا دعا کرتا ہے اور میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ کچھ لوگ مختلف مقامات پر گردو پیش بیٹھے ہوئے ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے ہیں۔

نوٹ:...... حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی عادت ہمیشہ سے کر رکھی تھی کہ جب کسی پیغمبر کا اسم گرامی آئے تو علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام یا علیہ السلام کہوں اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آئے تو رضی اللہ عنہ کہوں اور اگر سند حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آئے تو رضی اللہ عنہم کہوں اور اگر ائمہ مذہب اور علماء واولیاء سلف کا نام آئے تو اگر تنہا ءایک کا نام آئے تو رحمۃ اللہ علیہ اور اگر چند کا نام آئے تو رحمہم اللہ تعالیٰ کہوں خواہ وہ اپنے مذہب کے ہوں یا شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہوں بشرطیکہ اہلسنت والجماعت ہوں۔

نوٹ:...... افسوس ہے کہ اہل درس وطلباء اس کا خیال نہیں کرتے حالانکہ یہ امر بہت مہتم بالشان ہے اور کتب اصول حدیث وغیرہ میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ملفوظات قطب عالم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ "مسمی بہ صراط مستقیم" میں حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید صفحہ نمبر ۱۳۸ میں فرماتے ہیں:

> "ونیز سالک ایں سلوک را باید کہ در ادائی حقوق انبیاء واولیاء بلکہ سایر مؤمنین وتعظیم ایشاں کوشش بلیغ کن کہ ہمہ ایشاں ساعی وشافعی دے شوند وسعی وشفاعت انبیاء اولیاء پر ظاہر است اما سعی ہر مؤمن پس دعائے خیر است پس تبوقع دعائے خیر کہ کار آمدنی دراں مقام است تفقد وخاطر داری ہر مسلمان کند وہمہ حقوق تعظیمات در اجاع عزائم شرع شریف مودی مے شود"۔

دسواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ

ایک کرسی پر رونق افروز ہیں میں حاضر ہوا تو ایک کھجور کا تہائی حصہ مجھ کو عطاء فرما کر کہا کہ باقی دو حصے اور مشائخ کے ذریعہ سے پہنچائے جائیں گے۔

گیارہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ گیارہ بارہ اولیاء اللہ ''کبار مشائخ'' میں سے تشریف لائے ہیں اور سب نے اجازت بیعت عطاء فرمائی ہے۔

بارہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور اس میں آسمان سے معلق ڈول لٹک رہے ہیں جن کے وہ تار جن سے آسمان تک ان کا علاقہ ہے میں دیکھ رہا ہوں اور وہ ڈول برابر یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور میں ڈولوں کو الٹتا ہوں تو مٹھائی زمین پر اقسام مختلفہ کی ڈھیر ہو جاتی ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت بڑا ڈھیر مٹھائی کا ہو گیا ہے اور لوگ اس کو وہاں کھا رہے ہیں۔

تیرہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس زمانہ میں التزام (اہتمام، پابندی) کرتا تھا کہ باوضو سویا کروں؛ چنانچہ باوضو شب کو چھت پر سویا تھا اور یہ مکان بقیع شریف اور حجرہ مطہرہ (نبی ﷺ کا حجرہ) کے تقریباً بیچ میں واقع تھا، نصف شب کے پہلے دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تجھ کو امام زماں اور افرج بنائیں گے، میں نے اس خواب کو شرم کی وجہ سے نہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیم اور نہ ہی حضرت شیخ الہندؒ سے ذکر کیا اور اسی طرح والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحب (مولانا محمد صدیق) بلکہ غالباً سوائے حکیم فرزند علی صاحب مرحوم دہلوی (مہاجر مدینہ منورہ) کے کسی سے بھی اب تک ذکر نہیں کیا، اپنی سیہ کاری اور بداعمالی اور اپنی نالائقی و دناءت ذاتی اس قدر اس کے خلاف ہر طرف سے حاوی ہے کہ ایسے امور کا خیال میں بھی لانا اجتماع نقیضین کو خیال میں لانا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے مگر عالم اسباب میں موجودہ اسباب کسی طرح بھی اس کے مساعد نہیں معلوم ہوتے۔

چودھواں خواب

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ افگن ہیں، اس درخت کے سب سے فوقانی سطح پر سمجھ رہا ہوں کہ جناب باری عز اسمہ، جلوہ فرما ہیں۔

ہیبت وجلال بے حد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ اوپر سے ارشاد ہو رہا ہے جس کی پوری تفصیل یاد نہیں رہی۔

پندرہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک روز مسجد نبوی ﷺ کے اگلے حصہ کی محراب میں (جس کو محراب عثمانی کہا جاتا ہے جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، نماز پڑھاتے وقت کھڑے ہوتے تھے) ذکر کر رہا تھا کہ نیند آ گئی دیکھتا ہوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں، ان کو بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ تم فنا ہو جاؤ، انہوں نے ایک برش پر جو کہ مثل الٹے طشت کے ہے اپنا سر فنا ہونے کے لئے رکھ دیا، اس خواب کو گنگوہ شریف لکھا تو جواب آیا کہ تیری نسبت عثمانی ہے اور اسی وجہ سے تو لوگوں کی حیاء کی بناء پر مسجد شریف چھوڑ کر جنگل میں ذکر کرنے کے لیے جاتا ہے۔

سولہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ میں مسجد شریف میں چار زانوں بیٹھا ہوا ہوں اور حضرت گنگوہیؒ بائیں جانب تشریف فرما ہیں جناب رسول اللہ ﷺ داہنی طرف سے تشریف لائے اور آپ ﷺ کے دست مبارک میں کوئی کتاب ہے۔

نوٹ:...... چونکہ عادت یہ تھی کہ اگر کوئی تکلیف یا مصیب آنے والی ہوتی تھی تو اس قسم کا کوئی خواب دیکھا تھا جس میں بجز معیت و امداد اور کوئی امر مفہوم نہیں ہوتا تھا تو مجھ کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ وہ کونسی صعوبت ہے جس کے دفعیہ کے لیے دو مقدس آقا تشریف ارزانی اور امداد فرما رہے ہیں دو ہی چار روز گزرے تھے کہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی آئے اور انہوں نے وہ عظیم الشان فتنہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اور ہم سب کے متعلق عظیم اٹھایا کہ ''الامان والحفیظ'' مگر بفضلہ تعالیٰ وہ اور ان کی جماعت اس فتنہ میں جو کہ ہم سب کے متعلق تھا کامیاب نہیں ہوئی اگرچہ اس کا اثر دیر تک کچھ نہ کچھ رہا۔ ان رویاء صالحہ (یعنی خواب) کے علاوہ اور بھی رویاء (خواب) واقع ہوئیں مگر مرور زمانہ کی بناء پر پوری پوری یاد نہیں رہیں جن میں سے متعدد میں دودھ یا چھاچھ وغیرہ کا بھی پینا ہے، اگرچہ حسب ارشاد نبوی (علیہ الصلوۃ والسلام) ذہبت النبوۃ وبقیت المبشرات قالوا وما المبشرات یا رسول اللہ؟ قال الرؤیا الصالحۃ یراہا المؤمن اوتری لہ اور حسب ارشاد علیہ السلام من رائی فی المنام فقد رائی فان الشیطان لا یتمثل بی (اوکما قال علیہ السلام) ان رویاء صالحہ سے بہت کچھ امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حسب ارشاد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ و دیگر اکابر بعض اشیاء عالم مثال میں متحقق ہوتی ہیں مگر ان کا وجود اس قدر ضعیف ہوتا ہے کہ عالمِ مثال میں متحقق ہوتی ہیں مگر ان کا وجود اس قدر

ضعیف ہوتا ہے کہ عالمِ شہادت تک پہنچتے پہنچتے وہ مضمحل ہو جاتی ہیں اس لیے اگر چہ رویاء صادقہ میں عالم مثال کی کوئی چیز دیکھی گئی ہے مگر بعض اوقات عالمِ شہادت میں وہ متحقق الوقوع نہیں ہوتی، نیز ہر رویاء کے (خواب) کے لیے شروط وموانع (شرطیں اور معانی) وغیرہ ہوتے ہیں جو بسا اوقات دیکھنے والے کے ذہن سے جاتے رہتے ہیں اس لیے ان کو متیقن الوقوع نہیں کہا جاسکتا۔ بنا بریں ان رویاء صالحہ وغیرہ پر کوئی یقین بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اولاً یہی امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ رویاء منجملہ رویاء صالحہ ہے بھی یا نہیں؟ کہیں خیالات متقرہ فی القلب (دن بھر جو خیالات آتے ہیں اس کا دل پر عکس تو نہیں) یا کسی خلط کے غلبہ کا شگوفہ یا "اضغاث احلام" وغیرہ میں سے تو نہیں ہے اور اگر رویاء صالحہ میں سے ہو تو بھی اس کا من کل الوجوہ محفوظ رہنا مشتبہ ہے پھر اگر محفوظ بھی مانا جائے تو تعبیر مشتبہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجز الہام قابل احتجاج ہے۔ ہاں امیدیں باندھنا اور جناب باری عز اسمہٗ کی رحمتوں پر نظر رکھنا ہمیشہ بندوں کا فریضہ ہے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ اور انا عند ظن عبدی بی جیسے ارشادات عالیہ بہت کچھ امیدیں دلانے والے ارشادات ہیں۔ اگر چہ نہایت افسوس کے ساتھ مجبوراً یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بداعمالی اور سوء احوالی اور آرام طلبی ونفس پروری وغیرہ ہر طرف سے مایوسی دکھلا رہی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اکابر واسلاف کی جوتیوں کے طفیل میں مستقبل میں کسی وقت فضل وکرم خداوندی دستگیری فرمائے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز۔

سترہواں خواب

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک خواب بہت مفصل دیکھی جس میں سے اس قدر یاد ہے کہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ حضرت بہت زیادہ الطاف (محبت) فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو اپنے ضمن میں لے لیجیے، غالباً حضرت شیخ الہندؒ نے قبول فرمایا اور پھر اسی خواب میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی شرف حاصل ہوتا دیکھا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ

حضرت مولانا نجم الدین اصلاحیؒ لکھتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے میری کسی سنت کو فساد امت کے وقت زندہ کیا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا، اس گئے گزرے ہوئے زمانے میں جب لوگ فرائض کو بھی فراموش کیے ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے نہ معلوم کتنی ایسی سنتوں کا احیاء کیا جن کو لوگ بالکل بھلا چکے تھے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف (یعنی مولانا نجم الدین اصلاحیؒ) ٹانڈہ حاضر تھا، حضرت مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کو دیوبند جانا تھا اس لیے رات ہی کو

اکبر پور اسٹیشن پر سارا قافلہ صبح صادق میں پہنچ گیا۔ امامت کے لیے حضرت مدنیؒ نے مجھ کو حکم دیا، میری حالت ایسی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، بادل نخواستہ لرزتے اور کانپتے ہوئے نماز شروع کر دی اور طوال مفصل ہی سے نماز کو ختم کیا بعد دعاء حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ آپ حافظ ہیں؟ میں خاموش رہا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مقصد کو نہیں سمجھا کہ آج جمعہ ہے آنحضرت ﷺ جمعہ کی نماز فجر میں سورۃ الم سجدہ پہلی رکعت میں اور دوسری رکعت میں سورۃ الدہر تلاوت فرمایا کرتے تھے، پھر آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان کے ائمہ مساجد نے اس سنت کو ترک ہی نہیں کیا بلکہ صاف بھلا دیا ہے، اس وجہ سے میں پڑھتا ہوں کہ ائمہ مساجد اس طرف توجہ کریں اور سنت کے مطابق پڑھیں اور پڑھایا کریں۔ حضرت مدنی قدس سرہ کی زندگی کا کوئی گوشہ اتباع سنت سے خالی نہیں پایا جاتا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، پینا گفتگو کرنا حتی کہ جسم شریف کے کسی عضو کی حرکت خلاف سنت نہیں ہوتی تھی اور یہ حقیقتاً بڑے کمال کی بات ہے کہ مجاہدہ و ریاضت ذکر و فکر سے تزکیۂ نفس کر کے انسان کا ہوا پر اڑنا اور پانی پر چلنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ دشوار اتباع سنت ہے اور یہی جہاد اکبر ہے کیونکہ اپنے نفس کے تقاضے اور اپنی مرضیا تکو تج کر محبوب اعظم حضور ﷺ کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھانا پڑتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دور میں شریعتِ محمدی اور سنت نبوی ﷺ کا بہترین نمونہ تھی اور ان کی ہر ادا سے انسانیت نمایاں تھی کیونکہ جو بھی انسان دنیا کے سب سے بڑے انسان کی جتنی اتباع کرے گا وہ اتنا ہی انسانیت سے قریب ہوگا چونکہ حضرت مدنیؒ متبع سنت تھے لہذا دیکھنے والا پہلی ہی نگاہ میں بھانپ لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپ سے ملتا تھا تو آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا تو وہ ہزاروں لاکھوں ارادت مند جو حضرت مدنیؒ سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے تھے اس کی شہادت دینے میں قطعاً تامل نہ کریں گے کہ جس مرشد عالم کے دامان رشد و ہدایت سے وہ وابستہ ہیں اس کے تعلقات کی خوشگواری کا معیار صرف یہی تھا کہ اتباع سنت کا عادی ہو، اس قطب عالم حضرت مدنیؒ کے یہاں رسومات قبیحہ کا تو مسئلہ ہی ختم تھا، مباح رسومات میں بھی شرکت کے لیے شرط ہوتی تھی کہ مباح کو سنت کا جامہ پہنچایا جائے مثلاً تقریبات نکاح میں شرکت کے لیے ضروری تھا کہ سادگی کا پورا لحاظ رکھا جائے پھر اگر حضرت مدنیؒ سے نکاح پڑھوانا ہے تو لازمی تھا کہ مہر فاطمی ہو، حضرت مدنیؒ بالعموم شادیوں پر جہاں تشریف لے جاتے اور نکاح پڑھاتے تو ترجیحاً فرماتے کہ بھئی اگر نکاح مجھ سے پڑھوانا ہے تو پھر مہر جو ہے وہ مہر فاطمی مقرر ہوگا، اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریا کاندھلویؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں کہ میرے چچا حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ ہر سال مظاہر العلوم کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے شنبہ کی شام کو تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ حسب معمول مورخہ ۲ محرم ۱۳۵۴ھ کو مغرب کے وقت تشریف لائے اور فرمایا کہ

ہمارے یہاں میوات میں جلسوں میں (یعنی بڑے اجتماعات میں) نکاحوں کا دستور بن گیا ہے تو مجھے خیال ہوا کہ کل کے جلسے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے یوسف اور انعام (مولانا یوسف کاندھلویؒ اور مولانا انعام الحسنؒ) کا نکاح پڑھوا دوں، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا..... شوق سے پڑھوا دیجئے، مجھ سے کیا پوچھنا؟۔

عشاء کی نماز کے کچھ دیر بعد میں نے اہلیہ مرحومہ اور دونوں بچوں کے کان میں ڈال دیا کہ چچا جان کا ارادہ یہ ہے کہ کل کے جلسے میں دونوں بچیوں کا نکاح پڑھوا دیں۔ مولانا محمد زکریاؒ فرماتے ہیں کہ میری اہلیہ مرحومہ نے اس کے لفظ مجھے خوب یاد ہیں کہ یہ کہا کہ تم دو چار دن پہلے کہتے تو میں ایک جوڑا تو ان کے لئے سلوا دیتی، مولانا محمد زکریاؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنا جواب بھی خوب یاد ہے اور میرے جواب پر مرحومہ کا سکوت بھی (ایک جوڑا سلوانے کی بات سن کر کہا) ''اچھا مجھے خبر نہیں تھی یہ ننگی پھر رہی ہیں، میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کپڑے پہنے پھرتی ہیں'' میرے جواب پر مرحومہ بالکل ہی ساکت ہو گئی، جامع مسجد آتے ہوئے حضرت مدنیؒ سے میں نے عرض کر دیا کہ یوسف و انعام کا نکاح پڑھنے کے لئے چچا جان فرما رہے ہیں۔ حضرت مدنی نے بہت ہی اظہار و مسرت فرمایا، کہا ضرور پڑھوں گا، ضرور پڑھوں گا اور جامع مسجد میں پہنچنے کے بعد بیٹھتے ہیں فرمایا کہ ''مہر کیا ہوگا؟'' میں نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں مہر مثل ڈھائی ہزار ہے، حضرت جی (یعنی حضرت مدنیؒ) کو غصہ آ گیا، فرمایا کہ میں مہر فاطمی سے زیادہ ہرگز نہیں پڑھوں گا، میں نے عرض کیا کہ یہ تو شرعی چیز ہے، فقہاء کے نزدیک مہر مثل سے کم پر سکوت کافی نہیں بالتصریح اجازت کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر میرا اور حضرت مدنیؒ کا جامع مسجد کے در میں بیٹھے بیٹھے مناظرہ ہوا میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ (یعنی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ) اندر سے تو میرے ساتھ مگر حضرت مدنیؒ کے غصے کی وجہ سے چپ تھے اور میں خوب ڈانٹیں سن رہا تھا، میری اہلیہ مرحومہ کے والد (یعنی حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے سسر) مولانا رؤف الحسن جو میرے قریب تھے انہوں نے مجھ سے فرمایا جیسے حضرت فرما رہے ہیں مان لو، میں نے کہا یہ تو شرعی چیز ہے، میرے چچا جان (یعنی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ) نے فرمایا بچیوں میں سے کون سی انکار کر دے گی اور یہ نکاح نکاح موقوف بن جائے گا؟ اور جب تم گھر جا کر اظہار کر دو گے تو تکمیل ہو جائے گی۔ (بحوالہ ماہنامہ الاحرار مولانا محمد یوسف کاندھلوی نمبر، جولائی ۲۰۱۱ء صفحہ ۲۵)

حضرت مدنیؒ ہمیشہ مہر فاطمی مقرر کرنے پر ہی اصرار فرماتے اس حوالہ سے علماء نے بہت کچھ بحثیں کیں مگر حضرت کے طرز عمل میں تبدیلی نہ کرا سکے کیونکہ یہ بحث خواہ کتنی ہی علمی ہو مگر اس محبوبیت سے محروم ہے جو مہر فاطمی کے مسنونیت کو حاصل ہے، ولیمہ مسنونہ کے لیے حضرت کا مطالبہ ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک بکری کے مقدار میں محدود رہے، گوشت کا شوربا کیجئے یا پلاؤ پکوا لئے مگر اس کی مقدار ایک بکری سے زیادہ نہ ہو اور اسی

کے بموجب عزیز واقارب کو دعوت دیجئے کیونکہ سنت مبارکہ کی تائید اسی کو حاصل ہے اس قسم کے معاملات میں فقیہانہ مبصرانہ لطافت یہ ہوتی تھی کہ نکیر اور زجر وتوبیخ غصہ اور خفگی مکروہات تک محدود رہتی تھی، مباح پر چشم پوشی ہوتی تھی اور جہاں نشاط وانبساط کا تعلق تھا وہ صرف مسنون کے لیے مخصوص تھا قریبی تعلق رکھنے والے کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ اگر رسموں میں احتیاط نہیں برتی جاسکتی تو حضرت کی شرکت نہیں ہوسکے گی۔ البتہ اگر تقریبات میں سنت مبارکہ کی پابندی کا عزم حاصل ہے تو دور دراز گاؤں کے باشندے کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ حضرت مدنی کو اپنے یہاں نکاح مسنون کی تقریب میں مدعو کرے، حضرت بڑے شوق سے اس کی دعوت منظور فرماتے اس کے پہنچنے کو پروگرام میں خاص اہمیت دیتے پھر اس پیرانہ سالی میں کچے راستوں اور بیل گاڑیوں کی زحمت برداشت کرتے ہوئے تشریف لے جاتے نہ بارش کی پرواہ ہوتی، نہ گرمی یا سردی کی۔ داہنی ہاتھ سے کھانا کھانا، اس طرح کھانا کہ برابر کے آدمی کو تکلیف نہ ہو، پلیٹ میں اپنے آگے سے کھانا، منہ اس طرح چلانا کہ آواز نہ ہو، بسم اللہ سے شروع کرنا اور دعا مسنونہ "الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین" پر ختم کرنا اور آخر میں ہاتھ دھونا کلی وغیرہ کرنا ہر سنت کا لحاظ تھا اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ فلاں کام یا فلاں وقت میں کون سی سنت ہے تو وہ اس وقت حضرت مدنیؒ کا طرز عمل دیکھ لے پس وہی سنت ہوگا۔ کھانا کھاتے وقت ساتھ ساتھ ذکر ہوتا رہتا تھا ہر لقمہ پر بسم اللہ کھاتے ہوئے سبحان اللہ، الحمد للہ یہ ہمیشہ کا معمول تھا، اسی طرح آپ ہمیشہ اپنے ساتھ والے کو اپنی پلیٹ میں شریک کر لیتے تھے، غرضیکہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالئے اتباع سنت اور عشق نبی ﷺ میں محو استغراق فی ذکر اللہ کی وہ روشنی نظر آئے گی جو آنکھوں کو خیرہ کردیتی تھی، زبان اس کی ترجمانی سے قاصر اور قلم اس کی نگارش سے عاجز ہے۔

میز کرسی پر کھانا کھانا یقیناً سنت کے خلاف ہے، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی وزارت کے ابتدائی زمانہ میں چند حضرات کی دعوت کی اور میز کرسی پر کھانا کھلایا، حضرت مدنیؒ کی طبیعت منقبض رہی، بشاشت نام کو نہ تھی اور آخر میں اشارہ بھی کردیا، اب مولانا ابوالکلام آزادؒ کا لطیف پاکیزہ احساس ملاحظہ ہو، چند دنوں بعد انہی حضرات کی دعوت کی اور فرش پر کھانا کھلایا، اس دن حضرت مدنیؒ کی طبیعت میں فرحت وبشاشت تھی اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت مدنیؒ سنن عادیہ واتفاقیہ تک کو کمال احتیاط واہتمام سے ادا فرمایا کرتے تھے اور سنت نبوی ﷺ کو کسی حالت میں ترک نہیں فرمایا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ کوئی سنت نہ چھوڑے اگر زندگی میں زیادہ موقع عمل کرنے کا نہ ملے تو کم از کم ایک بار تو کرے تاکہ اتباع سنت کے "لاتعد ولاتحصی فضائل وبرکات سے محروم نہ رہ جائے۔ حضرت مدنیؒ جمعہ کو نماز جمعہ میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الغاشیہ، سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون پڑھتے تھے اور وتر میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص

اکثر پڑھا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاڑھی منڈانے پر جو فی زمانہ فیشن بن چکا ہے، سخت نکیر (نفرت) فرماتے اور برہم ہو جایا کرتے تھے اور فرماتے تھے تمہیں رسول اللہ ﷺ کی صورت سے نفرت ہے تو حسین احمد کے پاس کیوں آتے ہو۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وتر کی نماز کے آخر میں سبحان الملک القدوس ایک بار بلند آواز سے کہتے تھے، یہ سنت بھی لوگوں نے ترک کر رکھی ہے غرضیکہ بقول حضرت گنگوہیؒ ''میاں کامل ۳۰ برس چکی پیسی وہ بات حاصل نہیں ہو سکی جو اتباع سنت میں پائی'' اور دین کا سارا راز اتباع کتاب وسنت ''ما انا علیہ واصحابی'' ہی میں مضمر ہے۔ جس کو آنحضرت ﷺ نے ''ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنتی'' کے ذریعہ واضح فرمادیا ہے اسی حقیقت کی جانب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانو! تم میں جو لوگ اسوہ اور نمونہ بننا چاہیں وہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اختیار کریں جو اس امت میں سب سے افضل و اشرف ہیں جن کے قلوب پاک اور جن کا علم بڑا گہرا ہے جو تکلف سے دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت اور دین کی تائید کے لیے منتخب فرمالیا ہے ان کی عظمت کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق و سیرت کو اختیار کرو کیونکہ یہ جماعت ہدایت و صراط مستقیم پر تھی۔

(ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مرادآباد انڈیا، سیرت شیخ الاسلام صفحہ ۲۳۴)

حضرت مدنیؒ کا باجماعت نمازوں کا اہتمام

حضرت مولانا منظور احمد صاحب استاذ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان لکھتے ہیں:

۱- سفر و حضر میں حضرت مدنیؒ کی نماز باجماعت کبھی بھی چھوٹنے نہیں پاتی تھی، ہمیشہ جب تک ممکن ہوتا مسجد میں تشریف لے جاتے تھے، اگر جاتے جاتے سن لیا کہ جماعت شروع ہو گئی ہے تو اس تمام ضعف پیری کے باوجود کوشش یہی کرتے کہ جس طرح ہو اس جماعت میں شریک ہوں، ایک مرتبہ سالانہ جلسہ کا ہجوم تھا، حضرت مدنیؒ مکان سے مسجد کے لئے روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ مسجد بھر گئی ہے تو آپؒ چھتہ کی مسجد میں تشریف لے گئے (سالانہ جلسہ کا ہجوم دارالعلوم دیوبند میں تھا اور چھتہ کی مسجد دارالعلوم کے قریب ہی ہے) اگر کسی روز کسی وجہ سے کہیں بھی جماعت ملنے کا امکان نہ رہتا تو مکان کے مہمان خانہ میں جماعت ہوتی، وہ بھی عموماً بہت بڑی جماعت ہو جاتی تھی۔

۲- اس مرض الوفات میں ۵۲ روز تک آنے جانے کی اجازت دی، ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مردان خانہ تشریف لائے، جماعت سے نماز شروع ہو گئی، یہاں اتنا ہجوم ہوا کہ صحت تک صفیں جا پہنچیں جس روز باہر تشریف لائے اسی روز مغرب کے وقت مسجد میں جانے کا ارادہ کرلیا مگر مولانا

اسعد مدنیؒ نے اصرار کیا تو ان کی بات مان لی۔

۳-۲۴ ربیع الثانی کو مجلس سے اٹھ کر سیدھے مسجد چلے گئے، پھر فجر میں بھی جاتے رہے جس سے تکلیف زیادہ ہوگئی، طبیبوں نے مسجد جانے سے سختی سے منع کردیا، ایک روز عصر کے بعد کی مجلس میں فرمانے لگے، آپ لوگ مجھے مسجد جانے سے بھی روکتے ہیں حالانکہ حضورت ﷺ شدت مرض میں بھی آدمیوں کے سہارے مسجد جاتے تھے، حضرت مدنی کے صاحبزادے حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے عرض کیا وہ مسجد قریب تھی، فرمایا، میری کونسی دور ہے؟ اسعد میاں صاحبؒ بے جھجک کہنے لگے، حضرت وہ تو حجرہ سے بالکل متصل تھی، آپ کی کافی دور ہے، چنانچہ باہر مہمان خانہ میں نماز ادا فرماتے رہے۔

۴-یہ ادائے فرض واتباع سنت کا ایک نمونہ ہے، باقی آپ پر ہر ایک حرکت وسکون میں اتباع سنت کے عادی تھے بلکہ اتباع سنت آپ کی فطرت بن چکی تھی۔ حضرت مدنیؒ کے عمل سے بہت سی حدیثوں کا مطلب حل ہو جاتا تھا۔ مثلاً مسجد میں جاتے ہوئے داہنا قدم پہلے رکھنا اور نکلتے ہوئے بایاں قدم پہلے نکالنا اور جوتا پہننے میں اس کے برعکس پہلے داہنے میں جوتا پہننا اور نکالتے وقت بائیں پاؤں سے نکالنا، مسجد میں جاتے ہوئے اور نکلتے ہوئے دونوں سنتوں پر عمل کرنا مشکل معلوم ہوتا مگر حضرت مدنیؒ کا عمل اس کی تفسیر کردیتا تھا، ہمیشہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالنا کر پیر جوتے پر رکھ لیتے پھر داہنے پیر سے جوتا نکال کر پہلے داہنا پاؤں میں مسجد میں رکھتے، مسجد سے نکلتے وقت اس کے برعکس کرتے، ''بعض کو خواب میں بھی اس امر کی تلقین فرمائی'' حضرت ﷺ فرط تعظیم ومدح سے روکتے تھے، آپ کسی کا کھڑا ہونا پسند نہیں فرماتے تھے، حضرت مدنیؒ یہاں تک برداشت نہیں کرتے تھے کہ آدمی بیٹھے سے اٹھ کر مصافحہ کرے اور اس مرض الموت میں بھی ایک مہمان کھڑے ہوگئے تو فرمایا کہ جب تک نہ بیٹھو نہ میں آگے بڑھوں گا نہ مصافحہ کروں گا۔

۵-کوئی شخص ہاتھ یا قدم بوسی نہیں کرسکتا تھا، مصافحہ کے فوراً بعد ہاتھ کھینچ لیتے، ایک مرتبہ ایک غیر مسلم شخص نے تعظیماً پیر چھونے چاہے تو حضرت مدنیؒ جیسے سانپ دیکھ کر تڑپ اٹھے اور اس کو منع کردیا، چارپائی پر آرام فرمانے کی حالت میں ایک شخص نے قدم بوسی کرنا چاہی تو حضرت مدنیؒ اس طرح چونکے کہ وہ پیچھے گر پڑا۔

۶-اگر کوئی شخص مصافحہ کے بعد الٹے پیر پیچھے ہٹتا تو آپ تنبیہ کردیتے، ایک دفعہ یہ بھی فرمایا آدمیوں (انسانوں) کی طرح چلو۔

۷-حضور ﷺ کی تعلیم کے مطابق ہمیشہ تکلیف پر ساکت وخاموش رہے، کبھی جزع فزع کا اظہار نہیں، اس شدید مرض الموت میں بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ دیکھو میں کیسا صحت مند ہوں؟ اپنے تیمارداروں سے فرماتے تم لوگوں نے مجھے زبردستی لاچار بنادیا۔ (بحوالہ خدام الدین ہفت روزہ لاہور ۱۲ ستمبر ۲۰۰۳ء)

حضرت مدنیؒ کا اہل خاندان کو اتباع سنت کی تاکید کرنا

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ گھر میں بھی شریعت اور اتباع سنت کی پابندی کا بے حد لحاظ رکھتے تھے اور سب ہی افراد خاندان کو تاکید بلکہ ضرورت کے وقت تنبیہ فرماتے رہتے، اس بات میں کسی کی ادنیٰ رعایت بھی ملحوظ نہ تھی، ایک خاص الخاص عزیز ''ضیاء الحسن'' صاحب فاروقی لیکچرار جامعہ ملیہ دہلی جو مانٹریال یونیورسٹی کینیڈا سے ڈاکٹر کی ڈگری لیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی مولانا صدیق صاحبؒ کے خاندان میں شادی کر کے داڑھی منڈادی رشتہ بڑا نازک تھا لیکن حضرت ناراض ہو گئے اور اس وقت تک راضی نہ ہوئے جب تک انہوں نے داڑھی رکھنے کا عہد نہ کر لیا اور پھر دعا کرنے کا وعدہ کیا۔

اعزاء واقارب میں جو لوگ مفلوک الحال ہوتے ان کی نہایت توجہ سے خبر گیری رکھتے، عید بقر عید کے موقعہ پر جب کبھی اپنا وطن ٹانڈہ جانا ہوتا تو نماز سے پہلے اعزاء کے ہر ہر گھر میں بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے اور ہر فرد کو عیدی تقسیم کرتے، اس دور میں نفسا نفسی میں کئی لوگ حقیقی پوتوں کے سر پر بھی شفقت کا ہاتھ نہیں پھیرتے لیکن حضرت اپنے بھائی کی اولاد اور ان کے پوتوں کی بھی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش و نگرانی کرتے، گھر کے افراد سے اپنے کام کے لیے بھی نہ فرماتے، بدن دبوانے، سر پر تیل لگوانے یا گرمیوں میں پنکھا کرنے یا سخت سے سخت گرمیوں میں بجلی کا پنکھا کھولنے کی کبھی فرمائش نہ کرتے اور جیسا باہر کے مریدوں سے کوئی کام نہ لیتے، ایسا ہی گھر کے افراد سے کام نہ لیتے بلکہ اپنا کام اور دوسروں کا خود کرتے اگر کوئی پنکھا لے کر کھڑا ہو گیا تو منع فرماتے ہوئے کہتے حضور ﷺ سے کبھی پنکھا کروانا ثابت ہے؟ اگر کوئی گھر کا فرد کوئی کام کرنے پر بہت زیادہ زور و اصرار کرتا تو اجازت فرما دیتے۔ ہر متوسل و متعلق سے بچوں کی شادی کے سلسلے میں حضرت مدنیؒ عجلت کی تاکید فرماتے تھے لیکن اپنے گھر کے بچوں کے سلسلے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیدائش کے دن ہی دن گننا شروع کر دیتے تھے، جونہی کوئی بچہ بلوغ کو پہنچا پھر کوئی حجت کام نہ دیتی تھی۔

صاحبزادہ مولانا اسعد میاں اور بڑے بھائی مولانا صدیق مرحوم کے پوتے سید فرید الوحید کی شادیوں کے لیے ۱۹۴۴ء کو ''نینی تال جیل'' سے قاری اصغر صاحب معتمد خاص کر تحریر فرمایا کہ میری رہائی کا ہرگز انتظار نہ کیا جائے اور ان کی شادیاں کر دی جائیں چنانچہ صاحب زادہ مولانا سید اسعد میاں کی شادی فوراً تعمیل ارشاد کے لئے کر دی گئی۔ مولانا فرید الوحیدی لکھتے ہیں کہ میرے متعلق جیل ہی سے میرے بڑے ماموں سید توکل حسین صاحب وکیل سہارنپور سے نسبت طے کر لی ہے اور اب صرف نکاح باقی ہے، چنانچہ رہا ہوتے ہی کہا کہ اس کا نکاح کر دیا جائے۔ میں نے گھر عرض کیا کہ ابھی زیر تعلیم ہوں تو فرمایا اس کو اس بارے میں بولنے کی

جرأت کیسے ہوئی اگر پھر میں (مدنیؒ) نے سنا تو سر توڑ دوں گا اور نکاح میں اتنی جلدی دراصل معاشرہ کی حد سے بڑھی ہوئی خرابی کی طرف دیکھ کر کی تھی کہ بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کر دی جائے اور لڑکیوں کی شادی کا تو نبی کریم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے اس لیے حضرت مدنیؒ اتباع سنت پر عمل کرتے تھے۔

(بحوالہ، واقعات وکرامات اکابر علماء دیوبند صفحہ ۲۱۵)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مہمان نوازی

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

من کان یؤمن باللہ و الیوم الاخر فلیکرم ضیفہ (مسلم شریف)

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے"۔

پس معلوم ہوا کہ مہمان کا اعزاز و اکرام ایمان کا خلاصہ ہے اور یہی انسانیت وشرافت کا اصلی تقاضا ہے کہ اپنے پاس آنے والے کا ہر طرح اعزاز و اکرام کیا جائے اور فیاضی وفراخ دلی برتی جائے۔

حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ ہی مثال تھی جس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جن کو کبھی حضرت کا آستانہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، روزانہ کم و بیش ۴۰ مہمان حضرت مدنیؒ کے دستر خوان پر ہوتے تھے جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے ہوتے تھے، حضرت ہر ایک کا پورا پورا اعزاز و اکرام فرماتے تھے اور نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرتے تھے، کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذیذ اور مزیدار ہوتا تھا۔ حضرت مدنی دونوں وقت کا کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے جو مہمانوں کو کھلاتے تھے، کھانے میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہوتی تھی جو ہوتا تھا سب کے لیے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز پکوائی جاتی تو سب کے لیے پکوائی جاتی تھی۔

رمضان المبارک میں چونکہ مہمانوں کی تعداد سینکڑوں ہوتی اور سب کے لیے دودھ کی کسی چیز کا انتظام نہ ہو سکتا تھا، اس لیے حضرت مدنیؒ خود بھی دودھ استعمال نہیں فرماتے تھے اور متعلقین کے اصرار پر فرما دیتے، اتنا کہاں ہے جو سب کے لیے دودھ کا بندوبست کیا جائے اگر مہمان بے وقت بھی پہنچ جاتے تھے تو اسی وقت ان کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا اور کبھی مہمانوں کی کثرت سے گھبراتے یا کتراتے نہیں تھے بلکہ کبھی کوئی واقف دوسری جگہ ٹھہر جاتا تھا تو گرانی ہوتی تھی اور اگر کوئی منافق بلکہ مخالف بھی دستر خوان پر بیٹھ جاتا تھا تو اس کے ساتھ بھی پوری بشاشت کا اظہار ہوتا تھا، خود کم کھاتے تھے اور دوسروں کو زیادہ کھلاتے تھے اور بعد میں بچے ہوئے سالن

کی پلیٹوں کو خود اپنی انگلیوں سے چاٹتے تھے اور دسترخوان پر گرے ہوئے ریزے اٹھا کر تناول فرما لیتے تھے خود آہستہ آہستہ کھاتے تھے تاکہ سب مہمان خوب پیٹ بھر کر کھالیں اور جب سب کھا چکتے تو فرماتے کہ میں ابھی تک کھا رہا ہوں اور تم پہلے ہی فارغ ہوگئے، یہ تو اچھا نہیں ہے باصرار اور کھلاتے تھے غرضیکہ اس بارے میں آپ اپنی مثال آپ تھے، آپ کے بارے میں ہندوستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر "ڈاکٹر محمد اشرف" کے تأثرات ملاحظہ ہوں:

بلالؓ و عمارؓ کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے

مسلمانان ہند کی زندگی میں اس سے زیادہ صبر آزما دن کم آئے ہوں گے جب عملاً (مسلم لیگ کے) بے دین اور اعلانیہ بدعقیدہ قائدین اکبر و اعظم علماء دین کے احتساب کے لیے متعین ہوگئے تھے اور مسلم لیگ کے دفتر سے اسلام کی سند تقسیم ہوا کرتی تھی؛ چنانچہ وہ بزرگ جو برطانوی اقتدار مٹانے کے لیے کانگریس میں شریک ہوئے تھے اب مسلم لیگی رہنماؤں کی نگاہ میں غدار اور مجرم قرار پائے۔ ہم جیسے نام نہاد مسلمانوں کو اس قسم کے طعن و تشنیع سے واسطہ ذرا کم پڑتا تھا۔ (گو کانگریس کے رابطہ عوام کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے اوپر بھی فرد جرم جناح صاحب کی سرکار سے قائم ہو چکی تھی) مگر حسین احمد کا جگر دیکھیے کہ آئے دن ان ابوجہلوں کے ہاتھوں اذیتیں اٹھاتے تھے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس آزمودہ کار مجاہد کے پائے ثبات میں لغزش آئے۔ مجھے حضرت مولانا کے ساتھ صوبوں کے ضمنی انتخابوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جب مسلم لیگی حضرات کی نگاہ میں ایمان سے زیادہ ووٹ کی قیمت تھی۔ اور ہمارے باہمی اختلافات مباحثہ مناظرہ یا مجادلہ سے بڑھ کر کبھی کبھی مقاتلہ کی منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات مسلم لیگی مجاہدوں کے حلقوں میں حضرت مولانا کے قتل کے منصوبے بھی بنائے گئے اور "حافظ ابراہیم" کے انتخاب میں مولانا کے ایک عزیز مسلم لیگ کے (بلوائیوں کے) ہاتھوں زخمی ہوگئے۔ مگر حسین احمد کی زبان سے کبھی اُف نہ نکلی اور اس لیے ان حضرات کے حق میں صرف ہدایت کے لیے خدا سے دعائیں مانگیں مجھے آزمائش کی ان گھڑیوں میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا عزم و استقلال، ان کا سکون و صبر، ان کا بے مثال تحمل، ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک ہم نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا حال صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ اب بلالؓ و عمارؓ کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق البتہ مجھے اب تک نصیب نہ ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں یہ خوش نصیبی بھی میسر ہوئی۔ ہوا یہ کہ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگایا اور مسلمان عوام کا عام رجحان مسلم لیگ کی طرف ہوگیا تو کمیونسٹ پارٹی کو اس سوال کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ

اس بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ اس مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں دیو بند بھی حاضر ہوا، بلکہ حضرت مولانا کی دعوت پر خود اُن کے مہمان خانہ میں فروکش ہو گیا۔ محراب و منبر کے جلوے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے "خلوت" کے مطالعہ کا موقعہ اب ملا۔

جنگ عظیم کے بعد اشیاء کی گرانی، مولانا مدنیؒ کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور مگر اس سے حضرت مولانا مدنیؒ کی مہمانی نوازی میں کیا فرق آسکتا تھا؟ اور جب مجھ جیسے نسبتاً انجان اور بے دین کو مولانا مدنیؒ نے باصرار اپنے مکان پر ٹھہرایا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست، رشتہ داری، دوستی اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا۔ جب میں مولانا مدنیؒ کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ۱۸ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا، دین داروں کے معمولات سے یوں بھی اوپر واقعی بڑے سخت گزرے، نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا مگر مولانا مدنیؒ کے یہاں تقریباً بھی "قائم اللیل" (راتوں کو جاگ کر عبادت کرنے والے لوگ) تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بہ مشکل گھنٹہ بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونے سے "ذکر بالجہر" بلند ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح و وظیفہ میں' تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لئے اٹھ بیٹھے، پھر فجر سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوئی تو میں نے حضرت مدنیؒ سے عرض کیا کہ "حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چلا ہے"۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن سے مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا۔ یعنی اب میں آزادی سے اپنے کمرہ میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر میں حاصل تھی۔ چنانچہ میں نے مواد کی فراہمی کا وہ کام جس کے لیے میں حاضر ہوا تھا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں مجھے دیو بند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیو بند کے قیام کی غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پر دراز تھا، رات کے ۱۰ بج چکے تھے، گھومنے پھرنے کی وجہ سے کچھ تھکن زیادہ تھی۔ چنانچہ لیمپ گل کیا اور سونے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا، مجھے غنودگی سی تھی کہ میں نے ایک ہاتھ اپنے ٹخنے پر محسوس کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔ میں چوکنا ہو گیا، دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بہ نفس نفیس اس گنہگار کے پاؤں دبانے میں مصروف ہیں میری بدحواسی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں، میں نے پاؤں جلد جلد سکوڑے اور بڑے ادب اور لجاجت سے حضرت کو روکا۔ مولانا نے اس پر حیرت سے فرمایا "آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں؟ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں"۔ مجھ پر اس ارشاد کے بعد جو گزری میرے لیے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ میں بارہ برس بعد آج

پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں اور اگر حضرت مدنی زندہ ہوتے تو اس راز کو فاش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ان کی فراخدلی اور ان کے اخلاق کا یہ ادنی نمونہ تھا۔ (بحوالہ، الرشید لاہور فروری ۲۰۰۳ء صفحہ ۶۷، ۶۸)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا عزم واستقلال، تواضع وانکساری، ایثار وقربانی اور خودداری کا تذکرہ

کوئی شخص سوائے انبیاء علیہم السلام کے ماں کے پیٹ سے بڑا بن کر نہیں آتا، البتہ بڑا بننے کی قابلیت وصلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے پھر جو اُن صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ سے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہے۔

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق

باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں جو کام بھی انجام دیا پورے عزم واستقلال اور انتہائی ہمت وحوصلہ کے ساتھ انجام دیا جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود ہمت وحوصلہ میں جوان مرد تھے جو تمام جوان مردوں سے سبقت لے گئے تھے، برطانوی استعمار کا جس شان سے مقابلہ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے، حصولِ آزادی کے لیے جس طرح جاں فشانی سے جدوجہد کی، اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا، پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ووقعت برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیئے وہ آپ ہی کا حصہ تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو بہت کچھ کرتے جو برطانوی حکومت کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہیں تھا وہ ہندوستانی حکومت سے کسی طرح مرعوب نہیں ہو سکتا تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد ایک ساتھی نے حضرت مدنیؒ سے عرض کیا کہ اب تو حکومت اپنی بن گئی، ہنس کر فرمایا، ہمارے لیے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا، اب بھی جیل خانہ ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنیؒ کے عزم واستقلال کا ایک ادنی کرشمہ ہے ورنہ مظلوم مسلمانوں کی تباہی، مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا ہو جاتا؟

۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامہ میں جب ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور مسلمان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی، حضرت مدنیؒ پورے حوصلہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کو ہند میں رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک آہنی دیوار بن کر سہارنپور کی سرحد پر جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی، آپ جہاں مسلمانوں کو ہمت واستقلال کا سبق پڑھا رہے تھے

وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور باز پرس فرمار ہے تھے، اسی دوران آپؒ نے ''پنڈت پنت'' وزیر اعلی یوپی سے سخت غضب ناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف ڈانٹ دی تو پنڈت نے کہا کہ دارالعلوم دیو بند کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو حضرت مدنیؒ نے سخت غصہ میں فرمایا کہ:

''دارالعلوم تو اللہ کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا، آپ سہارنپور کی خبر لیجئے، اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دیں، میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کرلیں''۔

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں''۔

یہی تواضع وانکساری اصل شان عبدیت ہے، جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہوگا وہ متواضع ہوگا اور کبرو غرور سے بالکل مبرا ہوگا جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ فرماتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر چھوڑتے تھے، واقعتاً حضرت مدنیؒ تواضع وانکساری کا ایک مجسمہ تھے کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور ہمیشہ کے لیے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے ہر ایک چھوٹے بڑے کو ''آپ'' کے لفظ سے مخاطب فرماتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے تھے کہ گویا ''چھوٹا اپنے بڑے'' سے گفتگو کر رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز ہ تھا، گویا ان کی نظروں میں سب بزرگ تھے اور یہ خورد ہر کام کے لیے خود سبقت کرتے اور ہر محنت ومشقت کے لیے اپنے کو آپ کو پیش کرتے۔ غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین ومعاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو برے لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے حتی کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کی عداوت ونفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی اسکو بھی ہمیشہ ''مہربان گورنمنٹ'' فرمایا کرتے تھے اگر چہ اس لفظ ''مہربان گورنمنٹ'' میں پورا طنز ہوتا تھا اور بعد کی تقریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔ حضرت مدنیؒ کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو آپ کا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا اور آپؒ ہر ایک کے سردار اور تاج بنے ہوئے تھے اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنیؒ وقار وتمکنت کا کوہ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا ہیبت وجلال چہرے پر عیاں تھا، باوجودیکہ حضرت مدنیؒ ہنس ہنس کر باتیں فرمایا کرتے تھے مگر مخاطب کا دل اندر سے لرزتا

رہتا تھا اور بمشکل بات کی جا سکتی تھی۔ مولانا احتشام الحق کاندھلویؒ فرماتے ہیں یہ میرا حال جو اپنی نالائقی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بات کرنے کا عادی تھا حتی کہ حضرت تھانوی کے ہاں بھی بے دھڑک جو جی میں آتا تھا کہہ دیتا تھا اور حضرت تھانویؒ کی جانب سے کبھی کسی گرانی یا ناگواری کا کبھی اظہار نہیں ہوا میں نے اکثر حضرت مدنیؒ کے ہم عصر بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ سنا ہے کہ ''حضرت مدنیؒ سے ڈر لگتا ہے'' بارہا ایسا ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کسی خاص مقصد اور بات کے لیے دیوبند گئے وہاں حضرت مدنیؒ سے بے تکلف ملاقات ہوئی اور ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں مگر مقصد کی بات زبان پر نہ آئی اور واپسی کے بعد فرمایا، حضرت مدنیؒ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حیاتِ امیر شریعت کے مصنف ''جانباز مرزا'' تحریر فرماتے ہیں کہ انتخابی موسم بھی عجیب موسم ہوتا ہے، ہر پارٹی سیاسی اکھاڑوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلتی ہے کہ آدمی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جو طریقے استعمال کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جمعیت علماء ہند سے بعض ایسے وعدے کیے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مذہبی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لوگ اس بساط پر مات کھا گئے، جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ نے باہمی اشتراک سے یوپی کے تمام اضلاع میں الیکشن لڑا۔ انہی دنوں ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ حافظ محمد ابراہیم کی حمایت میں ضلع بجنور کا دورہ کر رہے تھے کہ بجنور میں مولانا حسرت موہانی رحمۃ اللہ علیہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ مخالف سمت سے لوگوں کے ایک ہجوم کے ساتھ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت کے لیے جلسہ گاہ میں آن پہنچے۔ عوام امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے متاثر ہو چکے تھے، انہوں نے مولانا حسرت موہانی کی اس حرکت کو ناپسند کیا اور قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی رحمۃ اللہ علیہ پر ٹوٹ پڑتا۔ امیر شریعت نے مداخلت کر کے مولانا حسرت موہانیؒ کو بالاحترام سٹیج پر بٹھا لیا۔ تقریر جاری رہی۔ آخر جو لوگ مولانا حسرت موہانیؒ کے ساتھ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت کرنے آئے تھے اس قدر نادم ہوئے کہ ان کے لیے یہاں سے واپسی مشکل ہو گئی۔

بجنور سے الٰہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت شیخ اسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے امیر شریعت کی ملاقات ہوئی۔ عقیدت، محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات سے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ

نے آگے بڑھ کر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا۔لیکن حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ان دنوں مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے، امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

''چونکہ آپ کا (سیاسی) مسلک غلط ہے لہٰذا میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں''۔

اس پر امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو بہت دلی صدمہ اور رنج پہنچا اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا:

''حضرت! اگر آپ حکم کریں تو میں اپنا یہ دورہ ملتوی کر کے پنجاب چلا جاؤں۔ چونکہ آپ مسلم لیگ سے اشتراک کئے ہوئے ہیں اور اپنے خادموں سے ناراض ہیں، لیکن آنے والے کل کو آپ اپنے فیصلے پر خود نادم ہوں گے۔ مسلم لیگ سے آپ کا یہاں اشتراک عمل سمجھ میں نہیں آیا، جبکہ کل تک آپ خود ہمیں درس دیتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کی ٹولی ہے۔ امیر شریعت نے فرمایا! ''خیر'' آپ ناراض ہوں تب بھی میں (بخاریؒ) آپ کا نیاز مند ہوں''۔

اس گفتگو کے بعد امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

انتخاب ختم ہونے پر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا جو پہلا اجلاس ہوا اس میں تمام رجعت پسند ممبران شامل ہوئے۔ اس پر جمعیت علماء ہند نے اعتراض کیا کہ جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ اس بنیاد پر تھا کہ مسلم لیگ سے تمام رجعت پسند عناصر کو نکال دیا جائے گا تو آج انتخاب کی کامیابی کے بعد ایسے عناصر کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شامل کرنا اپنے وعدوں سے انحراف کرنا ہے۔ (جمعیت علماء ہند سے یہ وعدہ خود مسلم لیگ کے رہنما پاکستان کے بانی محمد علی جناح نے جمعیت علماء ہند کے پانچ سو علماء کے اجلاس میں کیا تھا جس پر حضرت مدنی نے ان کی الیکشن میں حمایت کی تھی۔ بعد میں محمد علی جناح اپنے کئے ہوئے وعدے سے منحرف ہو گئے اور کہا کہ ''یہ تو سیاسی وعدہ تھا'' اس سلسلے میں مولانا محمد میاں نے ''اسیران مالٹا'' میں پورا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے اسے پڑھئے)

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا دن ایکٹ ۱۹۳۹ء کے نفاذ کا تھا، کانگریس اور جمعیت علماء ہند کے درمیان اس ایکٹ کے خلاف ہڑتال کرنے کا فیصلہ تھا، لیکن محمد علی جناح بانی پاکستان نے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہڑتال میں حصہ نہ لیں، اس پر جمعیت علماء ہند نے محمد علی جناح سے دریافت کیا کہ جب تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے تو آپ نے اس سے علیحدگی کا کیوں اعلان کیا ہے؟ اس پر صدر مسلم لیگ نے اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ جمعیت علماء ہند الیکشن میں مسلم لیگ سے اشتراک کر چکی ہے تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے فیصلوں پر اعتراض کرے۔ اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ جمعیت علماء ہند نے مسلم لیگ کی عہد شکنی کی بناء پر علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پڑھ کر امیر شریعت رحمۃ اللہ

علیہ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو امرتسر سے مبارک باد کا برقی تار (ٹیلی گرام) بھیجا۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا بہت احترام کرتے رہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں بھی امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی عزت رہی۔ لیکن مسلم لیگ کے اتحاد کے بعد جو خفت جمعیت علماء ہند کو اٹھانا پڑی، جمعیت علماء ہند کے رہنماؤں کے طرز عمل کی بناء پر انہیں امری شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ہمیشہ افسوس رہا۔ (بحوالہ حیات امیر شریعت صفحہ ۲۰۷)

ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس میں اور اپنے بعض خطبات میں اور خصوصاً ۱۹۸۰ء میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ملک بھر سے بلائے گئے علماء کو "دیوبندی علماء اتحاد" کے حوالہ سے پر ہونے والے جلسہ عام میں بھی بیان کیا۔ اس کا بھی مختصراً ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ سامعین کو دونوں بزرگوں کے اختلاف اور محبت کا اندازہ ہو سکے۔

راقم نے یہ واقعہ خود بھی سید ابوذر بخاریؒ سے سنا۔ ابن امیر شریعت فرماتے ہیں کہ مجھے خود اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر صدارت ۱۹۳۷ء کو منعقد کیا گیا۔ جس میں میں بھی شریک تھا یہ اجلاس ۱۹۳۶ء کے الیکشن کے بعد رکھا گیا تھا۔ اباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ جب میں اجلاس میں شریک ہوا تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کرنے کی بجائے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور فرمایا کہ باہر ہمیں گالیاں دیتے ہو اور یہاں مصافحہ بھی کرتے ہو۔ (شرارتی حاسدین نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو غلط خبر پہنچائی تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ آپ کو گالیاں دیتا ہے) حضرت مدنی رحمۃ اللہ لعیہ نے اس بات پر اعتبار کر لیا اور یقین کر لیا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ مجھے واقعی گالیاں دیتا ہوگا اس لیے حضرت مدنی نے کہا کہ مصافحہ بھی کرتے ہو اور باہر گالیاں بھی نکالتے ہوئے) اباجی فرماتے ہیں کہ جب حضرت مدنی نے مجھے یہ جملہ کہا کہ باہر گالیاں دیتے ہو تو یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میری ماں کو گالی دے دی ہو۔ ہم اجلاس میں بیٹھ گئے۔ اباجی رحمۃ اللہ علیے نے بتایا کہ اجلاس کی صدارت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے۔ حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جانب میں بیٹھا ہوا تھا تو دوسری جانب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے تھے، اباجی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میرے تو تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی حضرت مدنی رحمۃ اللہ لعیہ کے جملے سے۔ میں نے مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت اجلاس بعد میں شروع ہوگا پہلے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتائیں کہ انہیں کس نے کہا تھا کہ اپنوں کو چھوڑ کر مسلم لیگ سے اتحاد کریں، پہلے یہ اس بات کا جواب دیں پھر بتاتا ہوں کہ گالی کون دیتا ہے کون نہیں دیتا۔ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غصہ سے بھرا ہوا اور دیانتدارانہ موقف سن کر حضرت مدنیؒ سر جھکائے نیچے دیکھتے رہے اور غالباً سمجھ گئے کہ امیر

شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے گالی والی روایت میرے تک غلط پہنچی ہے، اس موقع پر حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو کہ دونوں بزرگوں کے مزاج شناس تھے فوراً دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی مدنی ایک رائے آپ کی تھی آپ نے الیکشن میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ دوسری رائے کی تھی کہ مسلم لیگ کا الیکشن میں ساتھ نہیں دینا چاہیے نہ ان سے اتحاد کرنا چاہیے۔ یہ بیچ میں گالیوں کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ اب دونوں بزرگ یعنی حضرت مدنیؒ اور حضرت شاہ جیؒ خاموش بیٹھے مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات سنتے رہے۔ اجلاس ختم ہوا۔ ابا جی نے فرمایا کہ میں نیچے دوسرے کمرے میں آ گیا۔

کچھ لوگ مجھے مجبور کر رہے تھے کہ آپ فلاں فلاں تاریخ ہمارے علاقے میں وعظ کے لیے عنایت فرما دیں۔ میں نے کہا میری ڈائری میں پروگرام پہلے سے طے شدہ ہیں میں آپ کو وقت نہیں دے سکتا۔ انہوں نے کافی اصرار کیا اور میں نے کافی انکار کیا۔ بالآخر وہ لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سفارش کے لیے چلے گئے کہ آپ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کو ہماری سفارش کر دیں کہ ہمیں فلاں فلاں دن کی تاریخ دے دیں۔ (اب ان لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ اندر اجلاس میں کیا ہوا وہ تو میرے اور حضرت مدنیؒ کے درمیان ہونے والے واقعہ سے لاعلم تھے) تھوڑی دیر بعد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جبے میں جھولتے جھومتے میرے کمرے میں آ گئے، میں گھبرا گیا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ میں اجلاس میں بڑا سخت بولا ہوں اب حضرت مدنی میری کھینچائی کریں گے۔ ابا جی یہ کہہ کر زار و قطار رونے لگے اور کہنے لگے حافظ جی (سید ابوذر بخاری اپنے خاندان میں حافظ جی کے نام سے پکارے جاتے تھے) اگر آپ بھی ہوتے اور جو الفاظ جس انداز میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے کہے تھے اسی انداز میں اگر میں آپ کو کہتا حالانکہ تم میرے بیٹے ہو پھر بھی تم میرا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ وہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر قبل جن کو سخت جملے میں نے کہے وہ میرے پاس آ کر کہتے ہیں کہ بھئی شاہ جی یہ لوگ میرے پاس آئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ آپ شاہ جی سے ہماری سفارش کر دیں تا کہ وہ ہمیں اپنے علاقہ کے وعظ کے لیے وقت عنایت فرما دیں تو بھئی شاہ جی میں آپ کو سفارش کرتا ہوں ان لوگوں کو میں جانتا ہوں آپ انہیں وقت دے دیں۔ ابا جی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ڈائری حضرت مدنی کے آگے رکھ دی اور کہا کہ حضرت آپ جو چاہیے تاریخ دے دیں ڈائری آپ کے سامنے ہے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ قارئین محترم...... اب آپ اندازہ لگائیں کہ سیاسی اختلاف بعض چیزوں میں ہونے کے باوجود ہمارے بزرگ ایک دوسرے کا کتنا احترام کرتے تھے۔ آج ہم اور ہمارے علماء دیندار طبقے کی باتیں سن کر پریشانی ہوتی ہے کہ تھوڑی تھوڑی باتوں پر ایسے ناراض ہوتے ہیں کہ کئی کئی سال تک ایک دوسرے کی شکل تک نہیں دیکھتے۔ اور میں اس طرح کے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔ جو دین اسلام کے داعی بھی ہیں،

مدرسے کے مہتمم بھی ہیں، عالم بھی ہوتے ہیں۔ شیخ الحدیث بھی ہیں، غرض کہ ہر جگہ ہر طبقے کا حال یہی ہے کہ تھوڑی تھوڑی بات پر اتنے ناراض ہوتے ہیں کہ پوچھومت، بہر حال میں تو خود گناہ گار آدمی ہوں۔ اللہ مجھے بھی اور سب کو اتفاق اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین) ہمارے اسلاف کا طرز عمل ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

امیر شریعت کا ٹوپی اتارنے سے انکار اور آئی جی جیل خانہ کی پٹائی

سید امین گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ میں اور چند دیگر احباب بیٹھے تھے کہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ڈم ڈم جیل'' (بنگال) کا قصہ سنایا۔ فرمایا کہ انگریز کے خلاف تحریک کے سلسلے میں ڈم ڈم جیل میں بہت سے قومی رضا کار بھی قید تھے اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ لعیہ بھی تھے۔ میں بھی تھا مگر ہم اکٹھے نہ تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے احاطے میں بند تھے۔ ایک روز میں نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی کہ ''انسپکٹر جیل خانہ جات آرہا ہے اس کا نام ''سمن'' تھا (یہ انگریز آخر کار بنگالی انقلاب پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا) اور جن رضا کاروں کے سر پر گاندھی ٹوپی دیکھتا اسے وہ خود اتار کر پاؤں میں مسل دیتا ہے۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے اس خبر سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا اگر شرافت سے پیش آیا تو شرافت سے جواب دوں گا۔ ہمارے پاس ہتھیار تو کوئی ہے نہیں، نہتے ہیں لیکن اگر اس نے میری ٹوپی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں بھی اسے گرا کر شہ رگ پر اس طرح کاٹوں گا کہ بچ نہ سکے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آخر کار وہ وقت آگیا میں احاطہ میں ٹہل رہا تھا کہ احاطہ کا دروازہ کھلا ''انسپکٹر جیل خانہ جات'' داروغہ جیل جو ہندو تھا اور چند جیل وارڈنز نے دیکھا کہ وہ میری طرف آرہا ہے، اس انگریز نے آتے ہی کہا یہ ٹوپی اتاردو...... میں نے بے باکی سے جواب دیا نہیں اتاروں گا...... وہ غصے میں آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری ٹوپی اتارے میں نے پہلے ہی پینترا جمایا ہوا تھا۔ (اس موقع پر شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ کر وہ نقشہ عملاً ظاہر فرمایا) فوراً دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر ڈال کر ایسا جھٹکا دیا کہ اس کے حواس خطا ہو گئے اور یکدم نرمی اختیار کرلی۔ ادھر داروغہ جیل نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے اگر وہ اب بھی باز نہ آتا تو میرا پکا ارادہ یہی تھا کہ میرے پاس اور تو کچھ ہے ہی نہیں اس کی شہ رگ دانتوں سے کاٹ دوں گا، مگر وہ میرے تیور پہچان کر یکدم نرمی اختیار کر گیا اور کہنے لگا کہ آپ کو اس ٹوپی کا احترام کیوں ہے یہ تو گاندھی جو ایک ہندو ہے اس کی ٹوپی ہے۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا غلط ہے...... یہ اجمل کیپ ہے اسے حامد کیپ بھی کہتے ہیں۔ امروہہ، مراد آباد اور یوپی کے دیگر مقامات میں

اسے اکثر مسلمان شرفاء پہنتے ہیں، اس نے کہا بہر حال آپ یہ ٹوپی میرے کہنے پر اتار دیں۔ میں نے جیل میں سب ٹوپیاں اتروادی ہیں۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے ہیں نے کہا مگر یہ ٹوپی تمہارے کہنے سے نہیں اتاروں گا جب تک تن پر گردن موجود ہے ٹوپی سر سے نہیں اترے گی۔ اس نے کہا اگر میرے کہنے پر نہیں اتاریں گے تو اور کس کا حکم مانیں گے۔ میں نے کہا ہاں حکم دینے والا اس جیل میں ایک شخص ہے وہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اگر وہ حکم دیں کہ ٹوپی اتار دو تو فوراً اتار دوں گا۔ شاہ جی فرماتے ہیں کہ ادھر حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی تمام کیفیت کا پتہ چل چکا تھا۔ حضرت نے سر سے پگڑی اتار کر اس کے شملے کو پھاڑ کر جلدی جلدی دو چار ٹانکے بھرے اور ادھر سے یہ انگریز پہنچا ادھر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ٹوپی بنا کر سر اقدس پر رکھ لی۔ اس انگریز نے جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سوال کیا تو حضرت نے فرمایا میں نے ہمیشہ پگڑی ہی باندھی ہے مگر جب مجھے یہ پتہ چلا کہ تم نے جیل میں ٹوپیاں اتارنے کی مہم شروع کی ہوئی ہے تو پگڑی سے کپڑا کاٹ کر ٹوپی بنا کر سر پر رکھ لی ہے۔ یہ ٹوپی بے شک اسلام کا نشان نہیں لیکن جب تم اسے دیکھ کر چڑتے ہو اور جیل کے رضا کاروں سے تمہاری زیادتی کا علم ہوا تو میں نے تمہیں چڑانا اور رضا کاروں کے ساتھ ہمنوائی اور ہمدردی کرنا ضروری سمجھا۔ اب یہ ٹوپی نہیں اترے گی نہ کسی کو اتارنے کے لیے کہوں گا۔ بالآخر وہ انگریز افسر ناکام و نامراد بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ (بخاری کی باتیں، از سید امین گیلانی صفحہ ۳۵)

حضرت شیخ مدنی پر آنچ نہ آئے امیر شریعتؒ نے حضرت مدنی کی حفاظت کی

تقسیم سے قبل لاہور دہلی دروازہ کے باہر "جمعیت علماء ہند" کی عظیم الشان کانفرنس شروع تھی۔ تمام انتظامی امور احرار کارکنوں کے سپرد تھے۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے۔ سید امین گیلانیؒ کہتے ہیں کہ اس وقت میں اور مولانا انور صابری رحمۃ اللہ علیہ پنڈال سے باہر ایک کیمپ کے قریب کھڑے تھے۔ جب حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریر کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز ہی میں مخالفین (مسلم لیگی) با قاعدہ اسکیم طے کر کے آئے تھے کہ حضرت کی تقریر نہیں ہونے دیں گے اور اگر بس چلا تو گزند پہنچانے سے بھی نہ چوکیں گے، وہ ایک دم مخالفانہ نعرے لگاتے ہوئے اٹھے اور گروہ در گروہ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نقشہ دیکھا تو فوراً بپھر کر کھڑے ہو گئے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی حفاظت میں کبھی دائیں کبھی بائیں، کھڑے ہو کر مخالفین کی حرکات کا اندازہ کرتے رہے اور پکار پکار کر انہیں شرارت سے باز رہنے کی تلقین کی مگر فسادی تھے کہ جیسے فیصلہ کر کے آئے ہوئے تھے کہ کسی کی نہیں

سنیں گے اور اپنا کام کر کے جائیں گے۔ جب شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھا کہ یہ شرارت پسند حضرات اسٹیج کے قریب ہوتے جا رہے ہیں تو بڑھ کر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے آگے سینہ سپر ہوئے اور مائیک پر نہایت پر جوش انداز میں فرمایا احرار کے جانباز رضا کارو! میں جان گیا ہوں کہ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے میں نے تمہیں آج ہی کے دن کے لیے جمع کیا تھا۔ دیکھنا شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر آنچ نہ آنے پائے۔

احرار کے جانباز پہلے ہی اشارہ کے منتظر تھے۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پاتے ہی رضا کاروں نے دلیری اور چابکدستی کے وہ جوہر دکھائے کہ دس منٹ میں شر پسند عناصر سے پنڈال خالی ہو گیا اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مفصل بیان فرمایا۔ پھر کانفرنس کے اختتام تک کسی کو شرارت کی جرأت نہ ہوئی۔ (بخاری کی باتیں صفحہ ۴۳)

مندرجہ بالا واقعہ ابن امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ بخاریؒ کی غیر مطبوعہ ذاتی ڈائری میں بھی رقم ہے۔ سید عطاء المحسن بخاریؒ لکھتے ہیں کہ مجھے اس واقعہ کی روایت جلسہ میں شریک ایک احراری کارکن ''ملک محمد اقبال'' کے ذریعے پہنچی کہ:

۱۹۴۳ء میں جب مولانا داؤد غزنوی نے لاہور میں مولانا مدنیؒ کے خطاب کا پروگرام بنایا مولانا مدنی آئے، تقریر شروع کی تو مسلم لیگ کے کارکنوں نے عریاں بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ مولانا داؤد غزنوی بہت پریشان ہوئے، بار بار کے سمجھانے پر بھی جب لیگی آوارہ گرد نہ باز آئے تو حضرت امیر شریعت اٹھے انہوں نے مائیک پر آ کر کہا: ''میں مسلم لیگ کے کارکنوں سے کہتا ہوں کہ آرام سے بیٹھیں اور مولانا مدنی کی باتیں سنیں جو بات پسند نہ آئے نوٹ کر لیں اور کل جلسہ میں جواب دیں گے'' مگر وہ پھر بھی نہ مانے تو حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا!

(حضرت امیر شریعتؒ کا یہ فرمان سن کر) احرار کارکن لیگی غنڈوں پر پل پڑے اور وہ درگت بنائی کہ مطلع تھانے کا کوتوال'' محمد صادق جو لاہوری مرزائی تھا اس نے فٹ پاتھ پر پولیس کا پہرا جما دیا اور اسٹیج پر پیغام بھیجا کہ جلسہ بند کر دیا جائے چونکہ میں نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی ہے۔ حضرت امیر شریعت پھر اسٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا:

> ''مسٹر کوتوال ہم جلسہ کا انتظام کرنا بھی جانتے ہیں اور سنبھالنا بھی تم ایک گھنٹہ پہلے کہاں تھے جب لیگی ورکر ادھم مچا رہے تھے، جلسہ ہوگا اور میں دیکھوں گا اسے کون روکتا ہے؟ اس کے بعد کوئی گڑبڑ ہوئی تو تمام تر ذمہ داری اب تم پر ہوگی اور ہم تم سے بھی نمٹنے کی طاقت رکھتے ہیں، جاؤ اور اپنی فورس واپس لے جاؤ''۔

امیر شریعتؒ کا یہ انتباہ سن کر'' محمد صادق لاہوری مرزائی'' کوتوال واپس چلا گیا اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اپنی جولانی استدلال سے لیگ کے فارمولہ'' تقسیم ہند'' کی دھجیاں اڑاتے رہے۔ (بحوالہ: غیر مطبوعہ ذاتی ڈائری ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاریؒ)

جمعیت علماء ہند کے مخالفین شاہ جیؒ کے خطابِ سحر میں گرفتار ہو گئے اور اجلاس کامیاب ہو گیا

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی شاہ جی کی یاد میں لکھے گئے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ جمعیت علماء ہند یا ہندوستان کے علماء پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو انہوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہی آواز دی اور وہ ان کی مدد کو دیوانہ وار دوڑے۔ انہوں نے اپنی جماعت مجلس احرار اسلام کو علماء کی خدمت وحفاظت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ جمعیت علماء ہند اور مولانا محمد علی جوہر میں شدید اختلاف ہو گیا مولانا جوہر نے مقابلے میں علیحدہ سے ''جمعیت علماء'' بنائی، جمعیت علماء ہند نے امروہہ میں اجلاس رکھا تو مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی تاریخ کو اپنی ''جمعیت علماء'' کا اجلاس مقابلے میں رکھ دیا۔ حالات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔ آخر امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو تقریر کے لیے بلایا گیا اور انہوں نے اس صورت حال پر قابو پالیا۔ مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر اپنے مضمون میں لکھا کہ ''جمعیت علماء ہند کے مخالفین سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خطاب سے سحر میں گرفتار ہو گئے اور اجلاس کامیاب ہو گیا۔ (بحوالہ سیدی وابی صفحہ ۱۴۰)

ابن امیر شریعت حضرت سید عطاء المؤمن بخاری مدظلہ نے مدیر الاحرار سید محمد معاویہ بخاری کو یہ واقعہ سنایا کہ اباجی بعض اوقات کئی بڑی مذہبی شخصیات کے معاندانہ طرز عمل سے بہت رنجیدہ ہو جاتے، ایک دفعہ ایسی ہی صورت حال درپیش تھی بڑے دکھ سے فرمایا: بھائی میں تو ساری عمر علماء کا خادم رہا، ان کی جوتیاں اٹھائیں، انہیں مخالفوں کے حملوں سے بچاتا رہا، ایک سرد آہ بھر کر فرمایا، میں نے تو زندگی بھر ان کی ٹوپیاں اپنے ہاتھوں سے سنبھالی ہیں اور یہ حضرات میرے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں کہ میں ان کا مخالف یا حریف ہوں۔ استغفر اللہ۔۔۔۔ میں نے ایسا کبھی ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا، ہمیشہ ان کا سپاہی بن کر اگلے محاذ پر لڑتا رہا، گالیاں کھائیں، رسوائیاں سمیٹیں لیکن کبھی بھی اپنے علماء کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا، پھر فرمایا: اچھا بھائی! مجھے کسی سے کوئی سند نہیں لینی اور نہ ہی کسی صلہ کی تمنا ہے میرا اللہ تو جانتا ہے کہ میں کیا ہوں اور میرے دل میں کیا ہے؟۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس احرار کے جلسوں کی صدارت

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں احرار تبلیغ کانفرنس قادیان میں منعقد ہوئی تو ہندوستان بھر کے علماء اس میں شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس قادیانیت کے خلاف مجلس احرار اسلام کی جدوجہد میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ آخری اجلاس کی صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی اور امیر شریعت

رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب فرمایا۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قادیان پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر احرار کارکنوں نے پرجوش استقبال کیا۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ انہیں موٹر کار میں لے کر ایک بہت بڑے جلوس کے ساتھ جلسہ گاہ پہنچے۔ یہ تھا ان حضرات کا باہمی الفت بھرا تعلق جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں اردو پارک دہلی میں احرار کانفرنس کی صدارت بھی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے ''پاکستان'' کے عنوان پر تاریخی خطاب فرمایا جس کا ایک ایک لفظ سچ ہو کر رہا۔ اس وقت انہوں نے جو کچھ پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا آج پاکستان کے حالات ہو بہو اس کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کی بے نفسی، امیر شریعتؒ کے پاؤں دبا کر نماز کے لیے اٹھایا

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جلسہ میں رات گئے تک تقریر کر کے آیا اور سو گیا۔ نماز فجر کے وقت کوئی شخص میرے پاؤں دبا رہا تھا۔ ان کے دبانے سے نیند کیا آنی تھی وہ تو کافور ہو گئی۔ میں نے دیکھا تو وہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

ہڑ بڑا کر اٹھا اور عرض کیا:

''حضرت! ہم نے دوزخ میں جانے کے لئے پہلے کیا تھوڑا انتظام کر رکھا ہے جو آپ ہمیں اس طرح دھکیل رہے ہیں''۔

فرمانے لگے:

''بھائی شاہ جی نماز فجر کا وقت ہو گیا ہے میں نے سوچا آپ تھکے ہوئے ہیں آپ کو اٹھا دوں تاکہ نماز مل جائے''۔

کیا لوگ تھے وہ اور ان کی بے نفسی کا کیا عالم تھا۔ اخلاص وللّٰہیت اور محبت وشفقت کے پیکر تھے۔ آج ان کی مثال ملنا محال ہے۔ (بنت امیر شریعت سیدہ ام کفیل مدظلہا، بحوالہ سیدی وابی صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱)

حضرت مدنیؒ کا پسندیدہ لباس

حضرت مدنیؒ لباس کے معاملہ میں ''گاڑھا کھدر'' پہننے میں بہت متشدد تھے اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنا اور اس کے علاوہ اور بھی اشیاء استعمال دیسی استعمال کرتے تھے اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دیسی کپڑا پہنیں اور دیسی اشیاء استعمال کریں اس کی ایک وجہ تو یورپین ممالک سے درآمد اشیاء سے نفرت مقصود تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت کا منشاء تھا کہ ہمارے معاشرہ میں سادگی اور بے تکلفی آجائے تاکہ

زینت ولباس پر جو ہمارے ہاں بے اندازہ اخراجات اٹھ جاتے تھے وہ کم ہوں اور اسی دیسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اس کا جنازہ پڑھ تو لیتے تھے مگر پڑھاتے نہیں تھے۔ بعض جلیل القدر مشائخ طریقت محض اس لیے گاڑھا کھدر پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنی سے ملاقات ہوجائے اور ولائتی کپڑے سے ان کو گرانی اور ناگواری نہ ہو، ایثار وقربانی بھی ایک اعلیٰ انسانی جوہر ہے جس سے انسانیت پروان چڑھتی ہے اسی لیے قرآن پاک میں مومنین قانتین کا وصف بیان کیا گیا ہے۔

و یوثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة ''اور ایثار کرتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر اگرچہ خود ان کے لیے تنگی ہو''۔

حضرت مدنیؒ بھی ایثار وقربانی کا مجسمہ تھے ان طلباء کے اخراجات کی خود کفالت فرماتے تھے جن کا دار العلوم سے وظیفہ نہیں ہوسکتا تھا اور اپنے ملنے والوں کی ضرورتوں کو خفیہ طور پر پوری فرماتے تھے، بارہا یہ معلوم ہوا کہ اپنے رفقاء سفر کے تمام اخراجات وہ اپنے پاس سے پورے فرماتے تھے اور اپنی ضرورتوں کو اپنے پاس سے پورا فرماتے تھے اور اس معاملہ میں بہت سختی برتتے تھے اور جو ہدایات دوسروں کی طرف سے آتے تھے بے دریغ ان کو رفقاء پر خرچ کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند سے فراغت پاتے ہی اپنے والدین کے ساتھ مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے ہیں، وہاں پہلے سے نہ کوئی جائیداد اور نہ وہاں اپنا کوئی کاروبار چل رہا ہے اور نہ کوئی ذریعۂ معاش ہے، لوگ ہجرت کر جاتے ہیں تو حکومت سے وظیفہ پانے کے خواہش مند ہوتے ہیں، دوسروں کی خیرات وصدقات پر نگاہ رکھتے ہیں مگر مولانا مدنیؒ کے والد محترم اسے پسند نہیں کرتے۔ مولانا مدنیؒ ایک مدرسہ کی خدمت کرنے لگتے ہیں، کتابیں نقل کرتے ہیں اور مولانا مدنیؒ کے والد محترم ایک چھوٹی سی دکان کھول لیتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحق کا بیان ہے کہ حضرت مدنیؒ کے والد ماجدؒ سے ڈاکٹر رفاقت علی صاحب نے جو مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ حد درجہ اصرار کیا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبدالحق صاحب کو بطور ٹیوشن تعلیم دیں لیکن عین اس زمانہ میں جب کہ فاقہ کی یہ حالت تھی کہ گھر کے ۱۳ آدمی ''تین پاؤ مسور کی دال'' کے پانی پر قناعت کرتے تھے، ٹیوشن گوارا نہ کی، البتہ اس کے لیے آزادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبۃ اللہ جیسا کہ حرم اطہر میں اور طلبہ کو درس دیتے ہیں، مولانا عبدالحق کو بھی درس دیتے رہیں طرفین سے یہ اصرار عجیب تھا اور اس میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے، بالآخر ڈاکٹر صاحب کو سپر انداز ہونا پڑا اور کتنا عرصہ بغیر کسی معاوضہ کے پڑھاتے رہے، اتنی بے تکلفی اور یگانگت کے باوجود ان حضرات کو یہ علم نہ ہوسکا کہ گھر اکثر فاقے ہوتے ہیں اور یہ معلوم اس وقت ہوا کہ جب یہ تنگدستی خوشحالی میں بدل چکی تھی۔ رمضان المبارک کے مہینہ میں ۱۲ بجے تک خود تراویح پڑھاتے، اس کے

بعد آدھ گھنٹہ آرام فرماتے پھر تہجد میں مشغول ہو جاتے اور سارا دن تلاوت قرآن کریم میں بسر ہوتا۔

(بحوالہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سوانح وافکار، صفحہ ۶۶ تا ۱۷)

حضرت مدنیؒ خدمت خلق کا عشق اور مکارم اخلاق

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے اس سلسلہ میں آپؒ کے فضائل ومحاسن کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں، حضرت مدنی نے لمبی (طویل) عمر پائی اور اتنے لمبے (طویل) عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی، ہر شخص آپ کے حسن اخلاق کا مداح نظر آتا ہے اور ہر کوئی حضرت کی تواضع، انکساری اور حسن خلق کا نیا قصہ سناتا ہے اور اگر ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے جو مختلف لوگ بیان کرتے ہیں تو صرف ان کو قلم بند کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا تاثر ملاحظہ فرمائیں:

"شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل وکمال، مرتبہ ومقام پر تو وہ گفتگو کرے جو خود بھی کچھ ہو، مجھے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ تو مولانا مدنیؒ کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے نفسی، سادگی، تواضع اور انکساری اور خدمت خلق کا عشق ہے، کہتا ہوا اور گویا خانۂ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں، بہترین رفیق سفر ہیں۔ مہمان ہوں تو اپ کی میزبانی میں اپنے معمولات ترک کردیں گے، روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آئے تو خود قرضدار ہو جائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور کہیں سے پوری کردیں گے۔ خدانخواستہ بیمار پڑ جائیں تو تیمارداری میں دن رات ایک کردیں گے، نوکری کی ضرورت پیش آئے، کوئی مقدمہ کھڑا ہو، کسی امتحان میں بیٹھ جائے تو سفارشناموں میں اور عملی دوڑ دھوپ میں اپنے مرتبہ کا لحاظ نہ کریں گے، اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں اپنے خوردوں، شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ یہ روش رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں، حالی کے شعر کے معنی اب جا کر روشن ہوئے ہیں:

ہم نے ادنی کو اعلی کردیا
خاکساری اپنی کام آئی

بہت سنا ہے کہ یہ شان محمود حسن شیخ الہند دیوبندیؒ کی تھی اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد

(حضرت مدنیؒ سے) کسی کو نہیں پہنچتا، فرصت میسر آتی تو اس متن کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا اور پھر نوبت شرح پر حواشی کی آتی اور ایک مختصر المعانی پر کئی کئی مفصل اور طول تیار ہو جاتے۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

جو لوگ ''علم الاحسان'' یعنی تصوف و سلوک سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انسانی شرف و مجد اور کمالِ انسانیت کا مدار قوائے فکر و عملی کے اعتدال پر ہے اور فنِ سلوک میں جن اصولِ اخلاق سے بحث کی جاتی ہے وہ چار ہیں:

(۱) طہارت (۲) عجز و نیاز (۳) سماعت (۴) اور عدالت

آخر الذکر وہ ملکہ ہے جب انسان افراط و تفریط سے بچ کر فکر و عمل دونوں میں اعتدال پر قائم رہتا ہے اور یہ عطیۂ خداوندی خوش قسمتی سے نصیب ہوتا ہے، اس ملکہ کے پیدا ہو جانے کے بعد ایک انسان مجموعۂ اضداد بن جاتا ہے لیکن ہر جذبہ اور ہر فعل کا محل الگ الگ ہوتا ہے اور اس بناء پر اس میں موزونیت اور حسن تناسب پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت (حضرت مدنیؒ) کی شخصیت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کا یہی وصفِ جامعیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے اور اسی بناء پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ (حضرت مدنیؒ) اپنے زمانہ میں انسانی شرف و مجد کے ایک اعلیٰ پیکر ہیں اور ایسے لوگ روز روز نہیں پیدا ہوا کرتے بلکہ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور بقول مولانا سعید احمد ایم اکبر آبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہ:

> ''میں ہندوستان سے باہر عالم اسلام کے بہیترے (بہت سے) علماء اور مشائخ اور ان کے حالات و سوانح سے باخبر ہوں اور ان میں کتنے ہیں جن سے مجھ کو ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے اس کے باوجود موجودہ زمانہ میں جامعیت اوصاف و فضائل کے اعتبار سے اگر کوئی شخصیت پیر و مرشد بنانے کے قابل ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہی شخصیت ہے لیکن بایں ہمہ مجھ کو آج تک نہ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل ہوا ہے اور نہ صرف تلمذ، اس بناء پر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ محض اندھی عقیدت کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ امام العصر دامت برکاتہم (جب یہ تحریر لکھی جا رہی تھی اس وقت حضرت مدنی حیات تھے) ان افراد میں سے ہیں جو اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہیں، اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے پیچھے ہیں لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں''۔

(بحوالہ: الرشید لاہور، فروری ۲۰۰۳ء، صفحہ ۵۶)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سخاوت وشجاعت

حدیث پاک میں متعدد جگہ آتا ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس و اشجع الناس

رسول اللہ ﷺ انسانوں میں سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے، چنانچہ آپ ﷺ کی اتباع میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سخاوت بھی اس درجہ تھی کہ ہر کس وناکس جانتا ہے مختصراً اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ گویا انکار جانتے ہی نہ تھے، اپنے آپ قناعت سے رہنا پسند تھا اور دوسرے سائلین کے لیے سخاوت...... سخاوت ہی کی ایک قسم ہے عفوودرگزر اور وہ اس درجہ زیادہ تھا کہ جانی دشمنوں نے بھی جب معافی چاہی تو آپ نے معاف فرمادیا۔

۴۷-۱۹۴۶ء میں آپ کے ساتھ جگہ جگہ غنڈہ گردی اور توہین آمیز سلوک کیا گیا تھا جو لوگ پیش پیش تھے وہ طرح طرح کے آلام کا شکار ہوئے، موقع ہوا تو بطور عبرت انگیز واقعات دے دیں گے جو طبع ہو چکے ہیں اس وقت تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایک دفعہ ایک قسم کے شخص نے ہوائی اڈہ پر یہ تلاش شروع کی کہ کوئی شخص دہلی جانے والا ہے ایسا آدمی ملنے پر اس نے دریافت کیا کہ کیا وہ اس کا یہ پیغام حضرت مدنیؒ تک پہنچادے گا کہ میں وہ ہی شخص ہوں جس نے ایسا سلوک کیا تھا اور اسے اس کی پاداش میں یہ سزا مل چکی ہے اب معافی چاہتا ہوں وہ پیغام لانے والا شخص حضرت شیخ الفقہ والادب مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے ملا اور ایسے انداز میں حال سنایا کہ وہ بہت متاثر ہوئے۔ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں عشاء کے قریب حاضر ہوئے واقعہ اور پیام عرض کر کے سفارش کی کہ اسے معاف فرمادیا جائے۔ حضرت مدنیؒ خاموش رہے سب اہل مجلس بھی بالکل خاموش رہے، حضرت شیخ الادب نے کچھ وقفہ کے بعد مہر سکوت توڑی اور دوبارہ سفارش فرمائی کہ حضرت تو بڑے بڑے لوگوں کو معاف فرماتے ہیں اور معاف فرمانا جناب کی عادت ہے اس دفعہ حضرت مدنی نے جواباً فرمایا معاف کیا۔ (بحوالہ ماہنامہ انوار مدینہ لاہور محرم الحرام ۱۴۲۳ھ صفحہ ۳۹)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور تحریک مدح صحابہ لکھنؤ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ انگریزی اقتدار سے ہمیشہ نبرد آزما رہے اور اس راہ میں قید وبند وغیرہ کی بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں اور انتہائی جرأت اور استقامت کا مظاہرہ فرمایا، انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے غیر مسلموں سے بھی اشتراک کیا لیکن کسی موقع پر عظمت صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کوئی لچک پیدا نہیں کی اور ہمیشہ عظمت وناموس صحابہؓ کا تحفظ فرماتے رہے؛ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں جب

لکھنؤ میں اہل سنت والجماعت کی تحریک مدح صحابہ رضی اللہ عنہم پر پابندی لگائی گئی اور اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سنی مسلمانوں نے گرفتاریاں پیش کیں تو حضرت مدنیؒ نے مدح صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس تحریک میں پورا حصہ لیا۔ چنانچہ دار العلوم دیوبند سے طلباء کا ایک دستہ لے کر حضرت مدنیؒ خود گرفتاری کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے لیکن گورنمنٹ نے ہتھیار ڈال دیئے اور گرفتاری کی نوبت نہ آئی، مدح صحابہ رضی اللہ عنہم کے عنوان پر حضرت مدنیؒ کے مدلل مضامین بھی شائع ہوئے اس سلسلہ میں حضرت مدنیؒ نے ''سکریٹری مرکزی مجلس تحفظ ناموس صحابہ رضی اللہ عنہم لکھنؤ'' کے نام پر ایک مفصل مکتوب تحریر فرمایا جو مکتوبات شیخ الاسلام میں درج ہے اس میں فرماتے ہیں:

''حضرت خاتم النبیین سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوستوں اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریفیں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر، بہت سی آیتوں میں ذکر کی گئی ہیں حتیٰ کہ بعض جگہ یہ بھی بتایا گیا کہ ان کی پیدائش سے پہلے پہلی کتابوں میں (تورات وانجیل) میں ان کی ثنا وصفت ذکر کی گئی تھی۔ سورۃ الحشر میں ہاجرین وانصار کے بعض خصائل حمیدہ پر روشنی ڈالنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو ان کے بعد آئے یا آئیں گے''۔

(تابعین اور ان کے بعد والے لوگ) ان کی توصیف وتعریف میں ان کا یہ قول بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان و لا جعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم.

''اے ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو کہ ہم سے پہلے ایمان لائے تھے، مہاجرین اور انصار (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ان کی مغفرت فرما اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے متعلق کسی قسم کا کوئی کینہ نہ کر، ''اے پروردگار! تو بہت محبت اور مہربانی والا ہے''۔

ظاہر ہے کہ جب یہ قومی صفت بطور ثناء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد قیامت تک کے آنے والوں کے لئے ذکر کی گئی ہے اور اس نے نہ صرف اس قسم کی پسندیدگی ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا حکم بھی مکانی، زمانی، انفرادی اور اجتماعی وغیرہ سے بالاتر ہو کر ٹپکتا ہے تو بعد کے آنے والے مسلمانوں پر اس قول کا کہنا پبلک مقامات، عام مناسب مقامات پر بھی شرعاً مطلوب ہوگا۔

احادیث صحیحہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ثناء وصفت ان سے محبت رکھنے کی تاکید ان کی شان میں

گستاخی کی مذمت کی، ان کی تابداری کرنے کا حکم، ان کا ذکر بالخیر کرنے کا ارشاد وغیرہ نہایت کثرت سے مذکور ہے۔

اسی بناء پر مسلمانوں کے اجتماعات عامہ عیدین، حج، جمعہ وغیرہ میں لیکچر دیتے ہوئے خطبہ پڑھتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی ثناء وصفت کرنی نہ صرف مستحب قرار دی گئی ہے (دیکھو درمختار، شامی، عالمگیری وغیرہ) بلکہ حسب تصریح امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز، اس کو شعار اہلسنت والجماعت ہی قرار دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''ذکر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اگرچہ از شرائط خطبہ نیست ولیکن از شعار اہلسنت است (شکر اللہ تعالیٰ) ترک نہ کنم بعمد وتمرد امار اگر کسے کہ دلش مریض و باطنش خبیث، اگر فرض کنم کہ بہ تعصب عناد ترک نہ کردہ باشد وعید ''من تشبہ بقوم فہو منہم'' راچہ جواب خواہد گفت، ایں قسم گل بدبو از ابتدائے اسلام تا ایں وقت معلوم نیست کہ در ہندوستان شگفتہ باشد نزدیک است کہ ازیں معاملہ تمام شہر مہتم گردد، بلکہ از ہندوستان مرتفع شود، دریں طور واقعات تا فل ورزیدن متبدعان را دلیر ساختین است، ورخنہ در دین پیدا کردن (انتہی مختصراً)

ترجمہ:...... ''خلفائے راشدین کا ذکر اگرچہ خطبہ کی شراط میں سے نہیں ہے لیکن اہلسنت کے شعار میں سے ہے، کوئی اپنے ارادے اور سرکشی سے نہیں چھوڑتا مگر وہ شخص جس کا دل بیمار اور اس کا باطن خبیث ہو اور اگر فرض کریں کہ تعصب اور عناد سے ترک نہ کیا ہو تو وعید ''من تشبہ بقوم فہو منہم'' (جس نے کسی قسم کی شباہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہے) کا حکم قائم کیا جائے گا، اس قسم کا بدبودار پھول ابتدائے اسلام سے اس وقت ہندوستان میں کھانا معلوم نہیں ہوتا لیکن نزدیک ہے تمام شہر مہتم ہو جائے بلکہ ڈر ہے ہندوستان سے یہ امر اٹھ جائے، اس قسم کے واقعات سے تغافل برتنا متبدعین کو دلیر بنانا اور رخنہ دین میں پیدا کرنا ہے'' (بحوالہ مکتوبات امام ربانی جلد دوئم صفحہ ۱۵)

اور چونکہ شعار کا اظہار اور اعلان ہر زمانے اور ہر جگہ میں ضروری ہے بنابریں اس کا اعلان ہر جگہ ضروری ہوگا، منہاج السنۃ میں ہے۔ **ان المسلمین الکفار اذا کان لہؤلاءِ شعارٌ واجبٌ اظہار شعار الاسلام فی کل زمان و کل مکان.**

مسلمانوں اور کافروں کے جب علیحدہ علیحدہ شعار ہوں تو مسلمانوں کے شعار کا ہر زمانہ اور ہر مکان میں ظاہر کرنا واجب ہے۔

(ج) بہر حال اب ہم تمام اہلسنت والجماعت پر واجب ہے کہ اپنے اس مذہبی انسانی، شہری حق حاصل کرنے کیلئے پورے تحفظ کو کام میں لائیں اور مردانہ وار ہر قسم کی جائز سعی کو میدان عمل میں پیش کردیں اس سلسلہ میں چار پانچ مرتبہ قانون شکنی اور گرفتاریوں کی نوبتیں آچکی ہیں مگر اصل مقصد کے اعتبار سے وہ بالکل ہی بے فائدہ ثابت ہوئیں۔ بنابریں اس مرتبہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی زندگی اور ثابت قدمی کا ثبوت پیش

کریں اور یہ دکھلا دیں کہ مسلمان اپنے مذہبی امور میں حتی الوسع ذرہ بھر بھی۔ (مدینہ بجنور ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ان کی تصنیفات

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سوانح و افکار کے مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ دنیائے علم کے آفتاب تھے۔ جہاں آپ نے چمنستان روحانیت کو تازگی بخشی اور علم کے سبزہ زاروں کو سینچا۔ سیاسی دنیا کو بھی صبر و استقلال، متانت فکر، اصابت رائے، یقین محکم اور جہد مسلسل کا سبق دیا۔ سیاسیت کو ایک بلند کردار اور پاکیزگی دی۔ مذہب کو ایک نیا جوش اور امنگ دی۔ زندگی کو عظمت اور وقار عطا کیا۔ مولانا کی مقدس زندگی کے یہی وہ پہلو ہیں جن پر دنیا کی نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن آپ تبحر عالم، ممتاز سیاست دان، قومی راہنما اور روحانی دنیا کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ "صاحب قلم" بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے جو علمی، مذہبی، روحانی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب رہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بے پناہ سیاسی و مذہبی مشاغل اس بات کی اجازت ہی نہ دیتے تھے کہ وہ کوئی قلمی کام کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کی تصنیفات چند سے زیادہ نہیں اور یہ تصنیفات بھی اس لیے وجود میں نہیں آئیں کہ لوگ انہیں پڑھیں اور تعریف کریں بلکہ قلم اس وقت ہاتھ میں لیا گیا جب اس کی اشد ضرورت محسوس کی گئی اور لوگوں نے مسلسل اصرار اور بار بار تقاضے کئے۔ تصنیفات میں "اسیر مالٹا"، "متحدہ قومیت"، "نقش حیات"، "الشہاب الثاقب" ہیں اور ان کے علاوہ کچھ رسائل اور خطبات ہیں۔

اسیر مالٹا

"اسیر مالٹا" غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قلم اور آپؒ جوان تھے۔ اس میں آپؒ کا قلم ایک طرف شمع آزادی کے پروانوں کو جدوجہد کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف اس کی نوک سامراجیت کے قلب میں پیوست ہو رہی ہے۔ "اسیر مالٹا" میں مادر علمی دار العلوم دیوبند کے سابق صدر مدرس اور انقلابیوں کے امام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی فدا کارانہ زندگی کا ایک ایک گوشہ نمایاں کیا گیا ہے۔ "اسیر مالٹا" کے شروع کے چند اوراق میں بہت دل کش اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا گلدستہ اس قابل ہے کہ بار بار دیکھا جائے۔ اس کے لفظ لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ اس کے جملے جملے میں محبت و عقیدت کے پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہریں، جذبات کا گرجتا ہوا بادل اور انقلابات کی گونج ہے۔ اس کے نقطے نقطے میں احساسات کی دبی ہوئی چنگاریاں اور اس کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ غور و فکر کی دعوت، صبر و استقلال کا درس، یقین محکم اور عمل پیہم کی

تلقین۔ تشکیلِ سیرت اور تعمیرِ حیات کا ایمانی پہلو بھی ہے۔ مثلاً

اس نے بحرِ امدادی سے فیوض حاصل کئے؛ لیکن ڈکار نہ لی۔ اس نے قاسمی نہریں پی لیں مگر بے اختیار نہ ہوا۔ دعویٰ نہ کیا۔ شطحیات نہ سنائیں۔ استقامت سے نہ ہٹا۔ شریعت کو نہ چھوڑا۔ عشق میں گھل کر لکڑی ہو گیا مگر دم نہ مارا۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

نقشِ حیات

نقشِ حیات میں شروع کے چند اوراق کو نجی زندگی کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قلم حالات و کوائف اور تجربات و مشاہدات کی اتھاہ گہرائیوں میں بہت احتیاط کے ساتھ کیا ہے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی روانگی حجاز سے لے کر اسارت مالٹا اور ہندوستان کی واپسی تک تسلسل واقعات کی ایسی تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ہندوستان، عرب ممالک، ترکی کی مظلومیت اور اتحادیوں کے روباہی کرشمے اور ظالمانہ رویے کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ''نقشِ حیات'' یوں تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علہ کی خودنوشت سوانح ہے۔ لیکن اس میں تجربات کے علاوہ سیاسی معلومات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ آپ ؒ (حضرت مدنی) کا قلم بس وہیں تک چلتا ہے جتنا اسے چلنا چاہیے۔ نہ اتنی تفصیلات ضروری ہوتی ہے اسے پھیلا کر لکھتے ہیں اور جہاں اختصار ہونا چاہے وہاں مختصر ہی لکھتے ہیں:

> ''نقشِ حیات'' میں کثرت سے انگریزی اور اردو کی تاریخی کتابوں سے حوالہ جات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو حدیث، تفسیر، فقہ، معقولات کے علاوہ ''فنِ تاریخ'' پر بھی عبور ہے۔ جب کوئی بات لکھتے ہیں۔ مذہبی اور علمی مضامین ہوں تو ان میں جابجا آیات واحادیث پیش کی جاتی ہیں اور تاریخی حالات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے تو تاریخی کتابوں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں یقینی کیفیت پیدا ہو جائے اور نتیجہ پر پہنچ کر کسی قسم کا شک وتردد باقی نہ رہے۔ ان کے سامنے ایک متعین اور کشادہ راہ کھول دی جائے۔ ''نقشِ حیات'' میں زیادہ تر انگریزوں کی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا۔ اس کی دولت لوٹی اور پھر اپنے احسانات بھی

جتائے اور ہر طرح اپنے عیب و جرم چھپانے کی کوشش کی۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی کی تحریروں سے انہیں بے نقاب کر دیا اور ان کی تمام قلعی کھول دی ہے اور یہ بات ثابت کر دی کہ انگریز ظالم تھے۔ انہوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں پورا ثبوت دیا۔

''نقش حیات'' کوئی ناول نہیں۔ افسانوں کا مجموعہ نہیں۔ شعر و ادب کی کوئی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے انسان کو خود نوشت سوانح ہے۔ جو دار العلوم دیوبند جیسے دینی مدرسہ کا ''صدر مدرس و شیخ الحدیث'' ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کا بہادر سالار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت اور سنت نبویہ ﷺ کا محب صادق ہے اسلام کے دشمن نمبر ایک ''انگریز'' کا وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیاء بھر میں سب سے بڑا مخالف ہے۔ مصنف کی ان تمام صفات و خصوصیات سامنے رکھ کر کتاب پڑھیں تو آپ کتاب کو ایک قیمتی دستاویز خیال کریں گے۔ ایک شیخ طریقت اور عالم باعمل کس طرح اپنی سوانح لکھ سکتا ہے۔ نتیجہ کتاب کی دونوں جلدیں گزشتہ ڈیڑھ صدی کے حالات، تحریکات آزادی اور انگریزوں کی ہندوستان اور دنیا میں دسیسہ کاریوں کی ایک ایسی داستان ہے جس کو پڑھنے کے بعد بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے مثلاً۔ (نمونہ تحریر ملاحظہ ہو)

بسا اوقات میں مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلا رہے ہیں۔ طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے والا مزدور نہیں آیا تم اس کام کو انجام دو۔ بہ مجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا اور تمام اسباق معطل کرنا پڑتے۔ بسا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنے پڑتے۔ (نقش حیات صفحہ ۷۱، جلد نمبر ۱)

اتنی سی مختصر تحریر میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک نقشہ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن اخلاص و انکسار کے ساتھ زندگی کی یہی وہ کٹھن منزل ہوتی ہے جسے عبور کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ چند سطروں نے ہمیں بتا دیا کہ انہیں کتابوں سے فطری تعلق اور دلی رابطہ تھا۔ لیکن والد صاحب کا حکم پہنچا فوراً اس کی تعمیل کی۔ ایک طرف اطاعت والدین کی اور دوسری طرف سرکار دو عالم نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ادا کی۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں پاکیزگی ستھرائی کے علاوہ یقین و عزم کی کیفیت ہر جگہ ملتی ہے کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جہاں بزدلی، خوف اور تذبذب کا احساس ہو۔ ہر لفظ میں ٹھہراؤ ہے، ہر جملے میں وقار ہے، ہر سطر میں ایک تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صاحب طرز ادیب یا انشاپرداز ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریر میں ایک انفرادیت ضرور جھلکتی ہے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کی بجائے انہوں نے اپنے

مقصد اور موضوع پر ٹھوس باوزن اور اصل باتیں پیش کی ہیں جن سے ان کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والا فکر و عمل کا جذبہ لے کر اٹھے۔

مکتوبات شیخ الاسلام

"اسیر مالٹا"، "نقش حیات"۔ "متحدہ قومیت"، "الشہاب الثاقب" اور دیگر چھوٹے چھوٹے رسائل کے علاوہ آپؒ کے مکتوبات کو جمع کیا گیا ہے اور یہ خدمت ملک کے نامور عالم مولانا نجم الدین اصلاحی نے "مکتوبات شیخ الاسلام" کے نام سے انجام دی ہے یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت والا مختلف خطوط لکھنے والوں کے جواب میں تحریر فرماتے رہے۔ مکتوبات فقہی، علمی، تربیتی اور سیاسی ہیں یہ علم و معلومات کا ایک ذخیرہ ہیں۔ جن میں حضرت مدنیؒ کی مقدس شخصیت اور شخصیت کا بلند اور پاکیزہ کردار کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ مکتوبات رشد و ہدایت کا سر چشمہ ہیں۔ مکتوبات کا کون سا اسلوب پسندیدہ ہے یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا ہے تو کسی نے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط "غبار خاطر" کو بار بار اس وجہ سے پڑھا کہ ان میں ادب کی چاشنی، الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی خوب صورت ترتیب ہے اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معلومات کا دریا موجزن ہے۔ لیکن "مکتوبات شیخ الاسلام" کو اس لیے پسند کیا جاسکتا ہے کہ ان میں خالص علمی، اخلاقی اور روحانی باتیں ہیں ایسے خطوط جن میں صرف زبان و بیان کی خوبی ہو لیکن کوئی بنیادی فکری و عملی افادیت نہ ہو ان کے مطالعہ سے قاری حظ (لطف) تو اٹھا سکتا ہے مگر اپنے فکر و عمل کے لیے کوئی سرمایہ حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط پڑھ کر ہم بہت کچھ حاصل کر پاتے ہیں۔ خطوط کے متعلق حضرت مولانا قاری محمد طیب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے) کی تحریر سے جو بطور مقدمہ مکتوبات کے شروع میں ہے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ان مکاتیب اور ان کے مکنون علوم و احوال کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے اس کی جامعیت کا اندازہ لگا لینا مشکل نہیں رہتا جو حضرت ممدوح (حضرت مدنیؒ) کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے اور جو تمام ہی دینی طبقوں کے لئے یکساں شفا بخش ہے۔ حال و قال والے حضرات (نقشبندی و چشتی مراد ہیں) ہوں، یا براہین و استدلال والے ہوں۔ طالبانِ مسائل ہوں یا عاشقانِ دلائل۔ سب ہی کے لئے

اس مختصر مگر جامع ذخیرہ میں سامان سیرابی موجود ہے۔ ان جامع ہدایات سے اگر ایک طرف طریقت ومعرفت کے مسائل حل ہوتے ہیں تو دوسری طرف شریعت کے حکیمات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور جہاں شریعت وطریقت کے مقامات کھلتے ہیں وہیں سیاست وادارت اور قومی معاملات کے دقائق بھی واشگاف ہوتے ہیں۔ غرضیکہ بیک وقت شریعت وطریقت اور سیاست کے دقیق اور حیات بخش نکتے اس طرح زیب قرطاس ہوگئے ہیں کہ ایک جویائے حقیقت ومعرفت، ایک متلاشی احوال وطریقت اور طلب گار شریعت وسیاست کے لئے یکساں شفاء اور سکون روح کا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں''۔

کہا جاتا ہے کہ مکاتیب شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں جس کی شخصیت معلوم کرنا ہو۔ اس کے خطوط دیکھے جائیں۔ خطوط کے آئینہ میں شخصیت کی تصویر اپنے اصلی خدوخال میں صاف جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کے مطالعہ کے بعد ہر شخص حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے متعارف ہو جائے گا اور اسے مولانا مدنیؒ کی عظمت، پاکیزگی اور علو ہمتی کا قائل ہونا پڑے گا اور ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بہت بہت مصروف۔ نہایت مخلص اور بلند کردار کے حامل تھے مکتوبات، زبان کے اعتبار سے بوجھل ضرور ہیں اور ہونا بھی چاہئیں۔ کیونکہ جن مکاتیب سے تعلیم وادیات کا کام لیا جائے، علمی، فقہی، سیاسی اور باطنی مسائل کو سلجھایا جائے۔ ان میں عربی کے مخصوص الفاظ اور مصطلحات کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

مکتوبات کی دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے باوجود نہیں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مدنی کے تمام مکتوبات ان دو جلدوں میں آگئے۔ مرتب کو جو مکاتیب میسر آگئے انہی کو انہوں نے جمع کر دیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کی طرح ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کی حیثیت بھی بہت بلند ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ رشد وہدایت کے سلسلے میں ان دونوں حضرات نے مکتوبات کے ذریعہ جو کام سرانجام دیا ہے تاریخ میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو تیسری شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی ہے۔ چوتھی مثال شاید پوری تاریخ میں نہ ملے۔

(بحوالہ ماہنامہ الرشید لاہور، صفحہ نمبر ۳۲۷)

تدابیر صحت اور حضرت سید مولانا حسین احمد مدنیؒ

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ صحت اور حفظان صحت کے اصولوں کا

ہمیشہ خیال رکھتے تھے کیونکہ ایک تندرست جسم میں دل و دماغ اور اعصاب بھی تندرست ہوں گے تب ہی کوئی تندرست انسان اپنے متعلقہ کاموں کو حسن و خوبی اور چستی و چالاکی کے ساتھ سرانجام دے گا اور پھر ایک مسلمان کو تو ہمیشہ جہاد اور موت شہادت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ علمی اور عملی جہاد کے لئے جسمانی صحت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ تین شعبہ جاتِ تعلیم نئے کھلوائے اور ان کے لئے فوراً ہی معلمین کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ (۱) انگلش تعلیم کے لئے ایک معلم۔ (۲) ہندی تعلیم کے لئے ایک معلم۔ (۳) جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے لئے تیسرا معلم مقرر کیا گیا۔ جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے اس نگران کو اساتذ فن کہا جاتا تھا۔ اس شعبہ کے استاد محمد ظہیر مظفر نگری مقرر ہوئے۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں ورزش کے اوقات صبح بعد نماز فجر اور شام بعد نماز عصر مقرر ہوئے تھے۔

ایک خط میں حضرت مدنیؒ ایسی ہی چیزوں پر زور دیتے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے:

> ”میرے عنایت فرما بزرگو! ہم کمزور ہیں۔ ہم میں اتفاق نہیں۔ ہم ہتھیار نہیں رکھتے۔ ہم مال نہیں رکھتے۔ ہمارا دشمن قوی ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے۔ ہم کو اسے سیدھا کرنا ہے اور اس سے بدلہ لینا ہے۔ مگر ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ یہی طریقہ قرآن، حدیث اور آنحضرت ﷺ نے بتایا ہے۔ اس لیے ہمیں جب تک ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ یعنی خلافت کی آزادی، جزیرۃ العرب، ہندوستان کی آزادی۔ پنجاب کی تلافی، اس وقت تک ہمیں نہ چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں“۔

میں کہوں گا آپ پر شرعاً فرض ہے کہ اگر آپ ایک مری ہوئی چیونٹی کی طرح کاٹ سکتے ہیں تو ضرور کاٹ لیجئے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھئے کہ خلاف امن کوئی بات کریں۔ خونریزی کریں۔ نہیں۔ نہیں۔ صلح اور مشورہ کے ساتھ جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچائیں۔ دوسروں کو آزادہ کریں۔ دشمن کو کمزور کریں۔ ان کی تجارت کو گھٹائیں۔ ان کی محبت اور ان کے خوف کو دلوں سے دور کریں۔ لوگوں میں جرأت پیدا کریں۔ سچ کہنے سے نہ چھپیں۔ لوگوں کو نرمی اور حکمت سے سمجھائیں۔ (بحوالہ: مولانا سید حسین احمد مدنی۔ سوانح و افکار۔ صفحہ نمبر ۱۰۲)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے شیخ الہندؒ کا جانشین سمجھا

حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد دنیا نے حضرت شیخ العرب

والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح جانشین سمجھا۔ زمام قیادت آپ ہی کے حوالہ کی۔ مگر آپ کا اپنا یقین یہ تھا کہ آپ جانشین ہیں نہ قائد۔ نہ آپ اس قابل ہیں کہ آپ کے انتساب سے بزرگوں کا نام روشن ہو؛ بلکہ آپ کا انتساب بزرگوں کے لئے باعث عار ہے۔ اسی لئے آپ اپنے دستخط کے ساتھ ''ننگ اسلاف'' لکھتے تھے اور اس پابندی سے لکھتے تھے کہ ناممکن تھا کہ کوئی دستخط اس تمہید سے خالی ہو۔ اس کی وجہ آپ نے یہ تحریر فرمائی: حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''میں ابتداء سے نہایت نفس پرست ہوں، اعمال میں کاہل واقع ہوا ہوں، تمام عمر گناہوں، دنیا پرستی اور نفسانیت میں گزری ہے۔ اب عمر ستر برس سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر توشہ آخرت کچھ نہیں ہے۔ ذخیرہ ذنوب نہایت عظیم الشان ہے۔ ظاہری اسباب پر نظر کرتے ہوئے کوئی امید مغفرت کی نہیں۔ لا ان یتعمد نی اللہ بکرمہ وفضلہ۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں کچھ ہوں۔ اللہ اہل اللہ کے اوصافِ جمیلہ اور احوالِ جلیلہ سے بالکل عاری و خالی ہوں۔

سودہ گشت از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دیں مسلمانی نہم

یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرت قطب عالم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے آستانوں تک پہنچایا۔ ان مقدسین کے جوتے سیدھے کرنے کی نعمت نصیب ہوئی مگر اپنی نفس پرستی کجروی، بدنصیبی اور کسلمندی کی بناء پر کورا ہی رہا۔

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل
خضر از آب حیواں تشنہ می رود سکندر را

اسی بناء پر اپنے آپ کو ''ننگ اسلاف'' لکھتا ہوں تکلفاً نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میں اپنے اسلاف کرام (قدس اللہ اسرارہم) کے لئے ننگ و عاری ہی ہوں۔ اپنی جگہ پر شرمسار ہوں۔ اپنی حالت پر نفریں بھیجتا ہوں۔ لوگوں کا میری نسبت حسن ظن غیر واقعی ہے۔ (بحوالہ مکتوب نمبر ۵۶ بنام مولانا صفات اللہ مکتوب شیخ الاسلام جلد دوم صفحہ ۲۱۰)

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی۔ ''مدیر صدق'' نے لکھا۔ عرصہ سے اپنے اصلاح نفس کی غرض سے خدمت والا میں حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ان کے جواب میں (حضرت مدنیؒ نے) تحریر فرمایا۔

میرے محترم اصلاح نفس کے لئے کسی دنیادار، نفس پرست، ناکارہ و نالائق کے پاس جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ پیاسا دریا کا قصد بیشک کرتا ہے مگر آتش کا قصد نہیں کرتا، در و دیوار، سنگ و کہسار کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔

میں حلفیہ کہتا ہوں اور میں سچا ہوں کہ میں اپنی سیاہ روی اور سیاہ کاری سے خود شرمندہ اور نادم ہوں اور بسا اوقات رہتا ہوں۔ میری واقعی حالت اشخاص انسانیہ سے بدتر ہوتا تو درکنار ارذل حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

یظن الناس بی خیراً و انا لشر الناس ان لم یعف عنی

مولانا محترم! اگر اس کمال کے اعلام واکابر نہ بھی موجود ہوتے تب بھی مجھ جیسے سگِ دنیا و بدنام کنندہ نکویان کی طرف نظر اٹھانا جائز نہ ہوتا۔

کس انیاید بزیرِ سایہ بوم
ورہما از جہاں شود معدوم

بہر خیالِ اصلاح نفس، ایک نفس پرور سے؟ یاللعجب۔ (مکتوب نمبر ۴۲ جلد ۱ صفحہ ۱۱۸)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ "سابرمتی جیل احمد آباد" میں تھے۔ آپؒ کے پیچھے مولانا عزیز گلؒ اور مولانا مبین صاحبان نے اسیر مالٹا کا پیغام کے عنوان سے آپؒ کی تقریریں چھاپ دیں جو آپ نے دہلی اور سیوہارہ میں کی تھیں۔ ٹائٹل پر آپ کے اسم گرامی کے ساتھ جانشین شیخ الہند لکھ دیا۔ اس پر ایک مفصل خط ان دونوں صاحبان کے نام لکھا۔ جس میں اپنی نااہلیت (نعوذ باللہ) کے دلائل شد و مد سے پیش فرمائے۔ مکتوبات چار جلدوں کے تقریباً دو ہزار صفحات میں شائع ہو چکے ہیں جو تعلیمات کا بہترین ذخیرہ ہیں اور اس طرح کا مضمون ہر اس مکتوب میں دہرایا گیا ہے۔ جس کے لکھنے والے نے آپؒ سے عقیدت ظاہر کی ہے۔

بہر حال حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسن احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصور اپنے متعلق کچھ بھی ہو؛ لیکن آپ کی کتابِ زندگی کے کھلے ہوئے اوراق کی شہادت یہ ہے کہ آپ نہ صرف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین تھے۔ بلکہ تحریکِ آزادی کی انتہا تک اور آزادی کے بعد بھی یوم وفات تک یعنی اس دور میں جو تاریخ وطن کا حد درجہ پر آشوب دور تھا۔ شاہراہ اقدام اور جادۂ ارتقاء کے ہر ایک موڑ پر آپؒ نے وہ دانشمندانہ قیادت فرمائی اور مدبرانہ رہنمائی کے ہر ایک تقاضہ کو اس پامردی، بے باک استقلال اور اس بے خطر عزم و ہمت سے پورا کیا اور اس جرأت مندانہ حوصلہ سے انجام دیا کہ ان ہیبت انگیز وادیوں کے طے کرنے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کو اپنا شباب لانا پڑتا۔ اس کی کچھ تفصیل آگے درج کی جائے گی۔ (بحوالہ: اسیران مالٹا۔ صفحہ ۱۳۷ تا ۱۳۹)

حضرت مدنی کا تحریک خلافت میں شرکت کا مقصد

تحریک خلافت نے کم وبیش پانچ سال عمر پائی اس کے بعد اگرچہ مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر بمبئی میں عرصہ تک رہا مگر اس مرکز کا دائرہ مٹ چکا تھا۔ اس تحریک میں ۹۵ فیصدی مسلمان شریک ہوئے اور اپنی ہندی

نژاد جماعتی خاصیت کے بموجب انتہا پسندی کے ساتھ شریک ہوئے؛ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیشتر مسلمانوں کی سرگرمی کا محرک وہ جذبہ تھا جس کو مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی اور دولتِ عثمانیہ کی تباہی نے مشتعل کر دیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کو اس تحریک سے غیر معمولی قوت حاصل ہوئی اور غیر معمولی فائدہ پہنچا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کانگریس کو "انڈین نیشنل" اسی تحریک نے بنایا۔ مگر افسوس مسلمان اس تحریک کے ذریعہ کانگریس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کانگریس کے پیش نظر ہندوستان کی آزادی تھی اور ثانوی مرتبہ میں خلاف کی حمایت۔ اور عام مسلمانوں کا نظریہ اس کے برعکس تھا۔ بہت سے مسلمان وہ تھے ان کو یقین تھا کہ صبح و شام میں انگریز ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہے۔ تحریک کی ناکامی نے اُنپر یاس وقنوط طاری کر دیا اور اُن کو یقین ہو گیا کہ انگریز کا بوٹ اور پیٹ ہندوستان کے زمین و آسمان سے ہمیشہ کے لئے پیوست ہو گیا ہے۔ جرمنی جیسی کسی بیرونی طاقت کا خنجر آبدار ہی اس پیوستگی کو کاٹ سکتا ہے۔ تحریک خلافت جیسی آزادئ ہند کی تحریکوں کا مستقبل وہی ہوگا جس کا نقشہ ماضی نے پیش کیا۔ مزید برآں جب انگریز کی شہرۂ آفاق ڈپلومیسی نے "شردھانند" جیسے ہندو نیتاؤں (لیڈروں) کے ذریعہ سے "شدھی" اور "سنگھٹن" کا ترش اور تلخ جام ہندوستانیوں کو پلایا تو ان خام مزاج سرمستوں کی تمام مستی ختم ہو گئی۔ لیکن بارگاہ رشیدی اور محمودی کا یہ پختہ کار مسند نشین (جس کی حیات کے مختصر حالات درج کرنے کے لئے ہمارا قلم سرنگوں ہے) اپنے دماغ میں وہ نشہ نہ رکھتا تھا جس کو کوئی ترشی اتار سکے۔ کیونکہ اس کے سامنے پہلے ہی دن سے مذہب کے ساتھ سیاست بھی تھی۔ اس کی ایک نظر دولت عثمانیہ کے زوال و بقاء پر تھی تو دوسری نظر بلکہ پہلی نظر ہندوستان کی آزادی پر۔ اس نے تحریک خلافت اور آزادئ ہند کو مذہبی دلائل سے بھی پیش کیا اور اقتصادی اور معاشی نقطہ نظر سے بھی۔ (بارگاہ رشیدی سے مراد مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ اور محمودی سے مراد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ہیں)

اس کی یادداشت میں مذہبی دلائل کا ذخیرہ بھی تھا اور اس کے ساتھ ہندوستان کی معاشی اقتصادی اور سماجی تباہیوں کا نقشہ بھی پتھر کی لکیر تھا جو صفحۂ دماغ سے کبھی محو نہ ہوتا تھا۔ اس نے حریت اور اخلاص وطن کے مذہبی دلائل پیش کیے اسی طرح اس نے آٹے دال کے پرانے اور نئے نرخ۔ ہندوستان کی قدیم صفت اور عہد برطانیہ میں اس کے زوال، ہندوستان کی گزشتہ دولت مندی اور موجودہ تباہ حالی کے تاریخی شواہد پیش کر کے ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو اقتصادی، معاشی نقطۂ نظر سے بھی ذہن نشین کرایا کہ آزادئ ہند کس قدر ضروری اور بنیادی مسئلہ ہے۔ جس کے بغیر کوئی جماعتی مصیبت زائل نہیں ہو سکتی اور کوئی سماجی بلندی اور بہتری حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ان خیالات کا اندازہ ان تقریروں سے ہوسکتا ہے جو ۱۹۲۱ء میں آپؒ جگہ جگہ فرماتے رہے۔ جن میں سے بعض تقریریں اور خطباتِ صدارت شائع بھی ہو چکے ہیں ذیل میں ان خطبات کے ضروری اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے خطباتِ اسارت سے اقتباسات

خلافت کانفرنس منعقدہ ۲۱ فروری بمقام ''سیوہارہ ضلع بجنور'' کے خطبہ صدارت میں حضرت مدنیؒ نے تحریک خلافت کی اہمیت اور ضرورت سے متعلق ضروری امور کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا۔

یہ وہ واقعات ہیں جن کا تعلق عالم انسانی سے بحیثیت تدیُّن اور مذہب ہے اور اُن کی خصوصیت ہمارے پیارے وطن کے خارجی ممالک سے بہت زیادہ ہے ذرا اپنے وطن اور ملک پر آنکھ اٹھایئے اور تواریخ قدیمہ پر گہری نظر ڈالئے اور پھر اپنی قدیمی اور موجودہ حالتوں کا امتیاز کیجیے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی وہ ہندوستان ہے جو کہ اطراف عالم کو اپنی صناعتوں اور تجارتوں سے مالا مال کرتا تھا وہ دوسروں سے مستغنی اور دوسرے اس کے محتاج تھے۔ ابتدائے دنیا سے لے کر سو برس پہلے تک ہندوستان کی تاریخ ہر حیثیت سے نہایت روشن و وزرّین نظر آتی ہے۔ وہ فقط انسانیت ہی کا معدن نہ تھا بلکہ متمدنی شعبوں کی شاخیں بھی یہاں سے پھیلیں وہ تمدن آج تک آسمان پر ایک ایسا روشن ستارہ نظر آتا ہے جس کی نظیر مغرب میں تو در کنار مشرق کے کسی خطہ میں بھی نظر نہیں آتی۔ ہندوستان اس وقت متمدن تھا جب کہ سارا عالم وحشی تھا۔ وہ عالم و فاضل تھا جبکہ طبقات زمیں میں جہل کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ سیر تھا جب کہ ساری دنیا بھوکی تھی۔ علم ہند اور حساب جو کہ ترقی اور تمدن کا اکیلا مدار ہے۔ کیا اسی کا جملہ عالم کو عطیہ نہیں ہے؟

علم حکمت (ویدک) اور نجوم کیا اسی کا مایۂ ناز نہیں ہے؟ ''علم سیاستِ ملوک'' کیا اس کا وہ خزانہ نہیں ہے؟ جس کے لئے ''بادشاہ فارس'' مدتوں سرگرداں رہے ہیں۔ علم موسیقی اور حکمت صناعی میں کیا اس کا جھنڈا تمام ملکوں کے جھنڈوں سے سربلند نہیں گردو نواح کے ملکوں کا پیشرو نہیں تھا؟ اسلام کا چمکدار اور نہایت روشن آفتاب جب کہ ہندوستان پر پرتو افگن ہوا تو اس نے ہندوستان کے قدیمی کمالات میں سے کسی قسم کی کمی نہیں کی بلکہ عرب و عجم اور روم و ترک کے ان کمالات کا اضافہ کردیا جن کی ہوا ہندوستان کو اس وقت تک نہ لگی تھی۔

ہندوستان فطرتی طور پر نہایت سمجھدار دماغ، نہایت ذکی طبیعت، نہایت گہری فکر، نہایت شعور والا قلب، نہایت صبر والا جسم رکھنے والا ملک بن گیا تھا۔ اس کا ''اعتدالِ ہوائی'' اس کے تفاخر کا گواہ اور اس کا مرکز انسانی ہونا اس کی فوقیت کا شاہد ہے یہی وجہ ہے کہ مدتوں تک یورپ نے اس طرف اپنی ہمتوں کو متوجہ کیا اور سالہا سال تک

ہزاروں قسم کی اس فکر میں مصائب جھیلیں۔ وہ کون سا بادشاہ ہے جس کی عنانِ خواہش اس ملک کی طرف اس کے قدرتی کمالات کی وجہ سے متوجہ نہیں رہی اور وہ کون سی قوم ہے جس نے ہندوستان کے فرطِ عشق ومحبت میں اس کے حسن خداداد کی بناء پر داغ رنج والم نہیں کھائے۔ کون سی چیز دنیا میں موجود ہے کہ ہمارا پیارا وطن اس کا گنجینہ نہ ہو اور کون سا وہ کمال ہے جو دیگر اقامت پذیر ہوا ہو اور ہندوستانی قومیں اس سے عاجز رہی ہوں۔ شاہان ہند کا اپنے آپ کو شاہجہان ملقب کرنا اور مؤرخین کا اس کو ربع مسکون قرار دینا آخر کس بنا پر ہے؟ فطرت نے جیسے کہ اس کو "اوارامسٹ" جیسی مادی چوٹی روئے زمین کے جملہ پہاڑوں سے بلند تر عطا کئے کہ کوئی ملک اور کوئی اقلیم اس کے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتی۔ ہندوستان کے ہر ہر ذرہ اور ہر ہر پتہ سے اس کے تفوق کی دلیلیں اور اس کے کمالات کے شواہد ملتے ہیں جن کو مؤرخین عالم کہتے کہتے عاجز ہو گئے۔

وہ ایک اکیلا ملک (ہندوستان) کہ وحشت اور درندگی کے بدنما دھبہ سے اپنے دامن کو ہمیشہ پاک وصاف دکھلا سکتا ہے وہ تنہا ایسی تاریخ رکھتا ہے جو کہ اس کے تمام گزشتہ عمر میں تمدن کے چمکنے والے آفتاب کی صاف اور تیز روشنی ڈال رہی ہے مگر افسوس کہ بدقسمتی سے اس آخری صدی میں اس کا نہ گہنے والا آفتاب زرد ہو گیا اور نہ چھپنے والا ستارہ اس طرح غروب ہو گیا کہ یورپ کی تہذیب اور مغربی انصاف نے اس کو ایک ایسے گہرے اور تاریک گڑھے میں دھکیل دیا جس کی گہرائی اور تاریکی کی کوئی حد ونہایت نہیں۔ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ برطانیہ کے مسیحا صفت ڈاکٹروں نے اس کو بزعم خود ایسی زندہ کرنے والی دوائیں دیں کہ قیامت آجائے مگر اس کو حرکت کرنا تو درکنار چھینک کی بھی طاقت نہیں رہی۔ کل کی جملہ وحشی اقوام آج تختِ آزادی پر جلوہ افروز ہو کر دادِ زندگی دے رہی ہیں مگر ہندوستان میں آزادی کی قابلیت ہی پیدا نہیں ہوئی۔

بڑے بڑے انگریزی ڈاکٹر ۱۸۵۷ء میں بلکہ اسے پہلے سے اس کا نہایت جاں فشانی سے معالجہ کرتے ہوئے اس کو صحیح وسالم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ شفایاب ہونے ہی پر نہیں آتا اس کو ہر طرح بیدار کرتے ہیں مگر وہ کروٹ ہی نہیں بدلتا۔ وہ ملک جن کو ابتدائے آفرینش دنیا سے آج تک آزادی کی جھلک اور خودمختاری کی مہک بھی نہ پہنچی تھی آج وہ "کوس لمن الملک الیوم" بجا رہے ہیں۔ وہ قومیں جن کے جہل، وحشت، درندگی، دنائتِ طبع، رذالتِ اخلاق وغیرہ پر آج تک مشرقی اور مغربی تاریخیں اور ہزار ہا وقائع شہادت دے رہے ہیں وہ خودمختاری اور استقلال کے مستحق اور لائق بنائے جاتے ہیں ان پر کسی قسم کی سیادت کا جائز رکھنا یورپ کی نظروں میں غیر قابل عفو گناہ ہے مگر وہ ہندوستان جس نے ابتدائے دنیا سے آج تک اپنا ذاتی فرمانروا ہونا اور مستقل نظم ونسق بتاتے ہوئے اقوام عالم کا استاد ہونا صفحات تاریخ میں ثابت کر دیا ہو۔ اس کو غلامی اور دریوزہ گری کی سخت سے سخت آہنی زنجیروں میں جکڑنا عین تہذیب وعدالت ہے۔ اس کے لئے خیال آزادی گناہ، لفظ استقلال حرام، اظہار

استحقاق حریت گناہ کبیرہ اور کوشش خود مختاری بدترین بغاوت ہے، وہ اگر کسی زنجیر غلامی کے حلقہ کی وسعت کا خواب بھی دکھ لے یا اس کی توسیع کی خواہش ظاہر کرے تو سزائے قید بامشقت یا پھانسی کا مستحق قرار دیا جائے۔

حضرات یہ ہے یورپ کی اصلاء اس کی اقوام ضعیفہ کی آزاد پسندی، اس کی انسانیت کی ماہیت، اس کی اقوام عالم کی ہمدردی، اس کی بنی نوع انسانی کی حمیت......

ہندوستان (برصغیر) کے مصائب

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ہندوستان جو کچھ دنوں پہلے فقط اپنے ملک کو ہی نہیں بلکہ سینکڑوں ملکوں کو جام ہائے گوناں گوں سے مزین کرتا تھا۔ اس کی "تجارت پارچہ" ایشیائی افریقی اور یورپین ممالک میں بڑے زور شور سے جاری تھی۔ آج وہ ایسا محتاج و دریوزہ گر یورپین حکمت عملیوں اور مغربی اصلاحی سکیموں کے ذریعہ سے بنادیا گیا ہے کہ فقط سوتی کپڑوں کے لئے تقریباً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ اس کو انگلینڈ بھیجنا پڑتا ہے۔ وہ ہندوستان جو کہ اپنی پیداوار سے اپنے بچوں کی وسیع پیمانہ پر پرورش کرتا ہوا دوسرے ممالک کو بھی پالتا تھا۔ آج اس کے بچوں کو روٹی کا ٹکڑا ملنا مشکل ہوگیا ہے۔ روزانہ قحط کا دور دورہ ہے کروڑوں ہندوستانی نژاد بھوک کی وجہ سے غیر ممالک میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ نہ ان کا وہاں کوئی پرسان حال ہے نہ خبر گراں۔ آج ہندوستان کی بدولت مغربی قومیں اونچے اونچے محلوں اور نرم سے نرم گدوں پر آرام کر رہی ہیں مگر ہندوستان کے بچوں کو صرف چارپائیاں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔

آج یورپین اتنیں قیمتی پوشاک زیب تن کئے آٹھ، آٹھ، نو، نو وقت ہندوستان کے اموال سے روزانہ پیٹ بھرتی ہیں مگر ہندوستان کی اولاد کے بدن پر نہ چیتھڑا ہے نہ جیب میں دمڑی ایک وقت اگر سوکھی روٹی نصیب ہوئی تو دوسرے وقت فاقہ کی تیاری ہے۔ وہ ہندوستان جس میں غیر قومی اپنا خون بہاتی تھیں آج اس کے سپوتوں کا بے حساب خون غیر قوموں کے فوائد کیلئے ہر ہر ملک میں بہایا جاتا ہے وہ ہندوستان جس میں گنجینۂ زر و مال رہتا تھا آج وہ گنجینۂ فقر و مسکنت ہے۔ وہ ہندوستان جو اپنی آبادی، قومی، ملکی، صناعتی، علمی، خلاقی جملہ حیثیتوں سے استحقاق خود مختاری سب سے اول رکھتا تھا آج اس کے غلامی کے شکنجہ اور زیادہ کرنے کے لئے "ابدالآباد تک" کی فکریں کی جارہی ہیں۔ جبرالٹر، مالٹا، عدن وغیرہ پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ بحری سیادت اور بحری حکومت اپنے لئے مخصوص کی جاتی ہے۔ مصر کو دبایا جاتا ہے عراق دبوچا جاتا ہے۔ فلسطین شکار کیا جاتا ہے، خلافت ترکی کا شیرازہ بکھیرا جاتا ہے ممالک سوڈانیہ و عربیہ کی قوت پاش پاش کی جاتی ہے۔ یہ کس وجہ سے؟ فقط بنی نوع انسان کی خیر خواہی، امم ضعیفہ کی آزادی، عالم میں اصلاح اور صلاح، امن و امان پسندی، عدل و انصاف گستری کی بناء پر ہی سب کچھ کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی (برصغیر) خون کا انعام

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے ہندوستان تیرے ننھے ننھے لاکھوں بچوں کا خون فرانس کے میدانوں میں، اطالیہ کے پہاڑوں میں، سالونیکا کے مرغزاروں میں، درہ دانیال کی چٹانوں میں، صحرائے سینا اور سوئز وسوابیہ کے ریگستانوں میں، عدن اور یمن کے سنگلاخوں میں عراق وایران کی خندقوں اور سبزہ زاروں میں، مشرقی ومغربی افریقہ کی، جرمنی آبادیوں میں، ایشیائے کوچک اور قفقازیہ کے برف ستانوں میں، بحر اسود وابیض اور احمر کے سواحل میں بہائم کی طرح بہایا جاتا ہے۔ ان پر گولی اور گولوں کی بارش ہوتی ہے مصائب کے شکار ہوئے کر کروڑوں جاں بلب ہو رہے ہیں۔ مگر تجھ کو اسی کے بدلے میں کیا ملتا ہے۔ فقط یہی کہ تیری بچیوں کا بیوہ ہونا؟ تیری اولاد کا یتیم وبرباد ہونا؟ تجھ پر طوق غلامی کا کڑا ہونا، رولٹ بل کا پاس ہونا؟ کورٹ مارشل لاء کا جاری ہونا؟ پنجاب میں رنگین مظالم کا منتشر ہونا؟ جلیانوالہ باغ میں مشین گنوں کا مینہ (بارش) برسانا؟ تیری اولاد واطفال پر مظالم وعصمت دری وبے آبروئی کی بوچھاڑ کرنا؟ تیری رہی سہی آزادی کو سلب کرنا؟ تجھ کو قسم قسم کی بغاوت کے نئے نئے پھندوں میں پھنسانا؟ تجھ کو اقوام عالم میں بدنام کرنا؟ تیری دکھ کی کہانیوں پر کان نہ دھرنا؟ تیری شکایات پر ظالموں اور جابروں کے بجائے سزائے تحسین کرنا اور آفرین دینا؟ ان کی امداد کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستانی قوم پر مصائب کی وجہ

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ اے حضرات آخر یہ ہر قسم کے پہاڑ ہم پر کیوں ٹوٹتے ہیں۔ کبھی بھی آپ نے اپنے اذہان کو اس طرف متوجہ کیا؟ کبھی بھی آپ نے اس پر غور کیا؟ اگر ذرا بھی آپ توجہ فرماتے تو یہ سب کچھ ہماری نااتفاقی اور موالات کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم ساڑھے پینتیس کروڑ (۱۹۲۱ء میں پورے ہندوستان کی کل آبادی اتنی ہی تھی) مرد وزن، چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان ایک ہو جائیں تو بڑی سے بڑی قوت ہم پر ظلم وشدائد کی بارش نہیں برسا سکتی۔ گولیاں اور توپ کے گولے تو درکنار بجلی جیسی قوی چیز بھی اس ریگ کے تودہ میں نفوذ نہیں کر سکتی جس کے ضعیف وناچیز ذرات مجتمع ہو کر ایک دوسرے پر جان نثاری کر رہے ہوں۔ ہم کو اس اتفاق میں مذہبی ''خلتوں'' (دوستیوں) کی ہرگز ضرورت نہیں اور نہ یہ کوئی ''عاقل متدین'' گوارا کر سکتا ہے۔ ہم کو محض ملکی اور سیاسی امور میں ایک کو دوسرے پر جان نثاری کرنے کی حاجت ہے۔ ہمارے سامنے اس کی سینکڑوں نظیریں موجود ہیں دور نہ جائیے فقط یورپ کو دیکھ لیجئے۔ آج لندن، فرانس، روس، یونان وغیرہ میں عیسائی اور یہودی دونوں بستے ہیں اور دونوں میں مذہبی حیثیت سے قدیمی ایسی عداوت ہے

جو کہ ہندو مسلمانوں کی مخالفت سے سینکڑوں درجہ زائد ہے جو مظالم عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان تواریخ مذہبی حیثیت سے دکھلا رہی ہیں کہ عشر عشیر بھی ان دونوں فریق میں کبھی وجود میں نہیں آیا مگر آج وہ سب سیاسی امور میں ایک قالب وجان ہیں۔

عیسائی اگرچہ کوئی پروٹسٹنٹ، کوئی کیتھولک، کوئی آرتھوڈک وغیرہ ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے مذہبی حیثیت سے سخت مخالف اور زمانہ سابق میں نہایت قطیع وشنایع ان میں واقع ہو چکے ہیں مگر پھر سیاسی امور میں، وطنی مصالح میں، ملکی ضروریات میں، قومی منافع میں، سب کے سب باہم شیر وشکر ہیں۔ جیسا کہ فدائے قوم ووطن مسٹر گاندھی جی اور مولانا شوکت علیؒ وغیرہ لیڈران قوم اور علماء نے جمعیت العلماء کے سالانہ اجلاس میں دہلی میں تقریر کی تھی کہ مذہبی مسائل میں ایک مسئلہ کو بھی اس اتفاق میں داخل کرنا اور چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ہر فریق اپنے مذہب میں پورا آزاد ہے۔ ہندو دھرم اپنی جگہ پر ہندو ہو کر اور مسلمان دھرم اپنی جگہ پر مسلمان رہ کر ہندوستانیت کی حیثیت سے جان توڑ کوشش اور کامل اتفاق کر کے اپنے حقوق اور آزادی کی فکریں کریں اور پوری جاں نثاری سے کام کریں۔ ایسا ہی جملہ رہنمایانِ قوم کا خیال ہے اور تمام قوم کو اس پر عامل ہونا ضروری ہے۔ اس جگہ دشمن اور اس کے ہوا خواہوں کی پوری کوشش ہوگی کہ ایسے مذہبی امور کو درمیان میں لا کر اپنی سابق پالیسی کے موافق شیرازۂ اتفاق کو بکھیر دیں۔ ''نان کوآپریشن'' (عدم تعاون) کی تجاویز کو باطل کر دیں گے اس پر کان نہ دھرنا چاہیے اور سمجھ بوجھ کر آگے قدم بڑھانا اور استقلال وثبات قدمی اختیار کرنا چاہیے۔

حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں نا اتفاقی کی مضرتیں اور اتفاق کی ضرورتیں دینی اور دنیاوی ہر دو پہلو سے تمام پبلک سمجھ چکی ہے بلکہ اس کا معائنہ کر رہی ہے یہ ایک ایسا بسیط اور ظاہر مسئلہ ہے کہ جس کی توضیح کی حاجت اور اثبات واستدلال کی کوئی ضرورت نہیں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط رسا جس سے آپ بڑے سے بڑے ہاتھی کو باندھ سکتے ہیں اور قوی سے قوی جہاز کا لنگر ڈال کر اس کو روک سکتے ہیں اگر اس کے دھاگے بکھیر دیئے جائیں تو چند منٹ میں ایک ذرا سا بچہ اس کو نیست ونابود کر سکتا ہے۔

نا اتفاقی کی نحوست

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہماری سابقہ نا اتفاقیوں کی نحوستیں ہم کو ہی ان جملہ مصائب میں فقط پھنسانے والی نہیں ہیں بلکہ دوسری مشرقی قوموں کی آزادی بھی سلب کرنے والی ہیں اور انہیں نحوستوں کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ آج ہندوستان کی قومیں ہندوستان میں نہیں بلکہ تمام ملکوں میں نہایت ذلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور مجمع اقوام میں سب سے زیادہ کمزور اور بے حمیت ثابت ہوئی ہیں کوئی قوم ایشیائی یا افریقی ایسی نہیں کہ

جنہوں نے رابطۂ اتحاد و مودت کے لئے اب اپنے دلوں میں ہندوستان کو جگہ دینا گوارا کر رکھا ہو۔ بہت سی یورپین اقوام بھی مثل دیگر اقوام کے نہایت بغض و غضب کی نظر سے ہند کی طرف دیکھ رہی ہیں۔

دوسرا امر جو کہ باعث ان جملہ مصائب و شدائد کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں وہ ''موالات'' ہے۔ جس کو تعلقات دوستی اور ''تناصر'' (یعنی ایک دوسرے کی مددگاری) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی اس کو شرکت عمل وغیرہ سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جملہ ان ہستیوں پر یہ امر واضح ہے۔ جنہوں نے تواریخ عالم پر نظر ڈالی ہے کہ ہندوستانی نفوس نے ابتداء سے ہمیشہ گورنمنٹ کو ہر قسم کی مدد پہنچا کر وفاداری اور نمک حلالی کا دم بھرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی اور دوسری قوموں کو بھی ہلاک کیا اور اسی وجہ سے (حکومت) برطانیہ روز افزوں قیدیں اور سخت سے سخت قانون نکالتی ہوئی مذہبی اور سیاسی جملہ آزادیاں سلب کر رہی ہے اور زندگانی کے تصور و محلات کو ڈھاتی ہوئی عدم کے مقبروں میں ہم کو دفن کرتی جا رہی ہے۔ تعجب ہے کہ جو قوم ہمارے نمک سے آج پرورش پا رہی ہو اور پھر ہماری نمک حرامی کرتے ہوئے ہر طرح سے ہم کو قعر مذلت میں ڈال رہی ہے اس کی بھی نمک حرامی حرام ہو۔ حالانکہ وہ نمک بھی ہمارا ہی ہے۔ افسوس ! افسوس۔ (بحوالہ: مجموعہ خطبات صدارت و نیاب تقاریر از صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

تحریک خلافت کا خاتمہ، تحریک شدھی سنگھٹن اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی تبلیغی خدمات

مقدمہ کراچی کے بعد ایسی تحریک میں اضمحلال لازمی تھا جو ابھی ابتدائی دور میں تھی۔ علاوہ ازیں راہنماؤں کی غیر موجودگی میں عدم تشدد کی پابندی عوام کے لئے مشکل تھی۔ چنانچہ چورا چوری ضلع گورکھپور کی پولیس کی چوکی پر حملہ کر کے سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔ جب گاندھی جی نے جو اس وقت تک گرفتار نہ ہوئے تھے تحریک کا یہ رخ دیکھا تو تحریک کے بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اب حکومت کو متوقع ملا کہ ہندو مسلم اتحاد کے پیکر کو زیادہ سے زیادہ مجروح کر دے؛ چنانچہ ''شردھانند آنجہانی'' کو ''تحریک شدھی'' کا علمبردار بنا کر جیل خانہ سے رہا کیا گیا۔ ''پنڈت مدن موہن مالویہ'' آنجہانی نے ہندوؤں کی تنظیم اور سنگھٹن کا بیڑا اٹھایا آگرہ اور متھرا وغیرہ کی نو مسلم جاٹ قوم جو مذہب سے صرف اتنی آشنا تھی کہ مردم شماری کے وقت مذہب کے خانہ میں مسلمان لکھوا دیا کرتی تھی۔ اس کو ترغیب دی جانے لگی کہ اس مذہب کو چھوڑے اور اپنا قدیم مذہب اختیار کرلے۔ چنانچہ ایک طرف اُن اضلاع میں شد و مد سے ارتداد شروع ہوا اور دوسری جانب مالوی جی کے سنگھٹن نے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع کرا دیا۔ شاطران برطانیہ کے اس ایک شعبدہ نے اس ہندوستان کو جو کچھ عرصہ پیشتر ہندو مسلم اتحاد کا گلستان بنا ہوا تھا ہندو مسلم نزاع اور کشاکشی کا جہنم بنا دیا۔

حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس

وقت رہا کیے گئے کہ ہندوستان کا زمین و آسمان بدل چکا تھا۔ چونکہ برطانوی ایجنٹوں کی یہ تمام شعبدہ کاری اس لئے تھی کہ جذبۂ آزادی کو کچلا جائے اور ہندو مسلم اتحاد سے جو حریت و استقلال کی شاہراہ قائم ہو گئی تھی اس کو بند کر دیا جائے۔ لہٰذا محبان حریت کا پہلا فرض تھا کہ وہ برطانیہ کے اس حملہ کی پوری قوت سے مدافعت کریں اور جذباتِ حریت کو سرد نہ ہونے دیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے بائیس دن کا برت رکھا یعنی بھوک ہڑتال کی اور مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ کو قیام کے لئے منتخب کیا۔ غالباً یہ خیال کیا ہوگا کہ جن سے اتحاد کی اپیل ہے انہیں کے در پر موت آنی چاہیے۔ (ملاحظہ ہو مضامین مولانا محمد علی جوہر صفحہ ۱۲)

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اپنی پوری قوت اس دبانے میں صرف کر دی۔ مگر اتحاد کی ان کوششوں کے مقابلہ میں تفریق کی وہ جدوجہد جس کو انگریزی سرکار کی پشت پناہی حاصل تھی کامیاب رہی۔ ان رہنمایانِ قوم کی دعوت اتحاد صدا بصحرا ثابت ہوئی اور مسلمان تحریک آزادی سے کنارہ کش ہوتے رہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور آپؒ کی جماعت (جمعیت علماء ہند) کو اس عرصہ میں دو طرفہ جنگ کرنی پڑی۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ جماعت کے فتنہ کا بھی پامردی سے مقابلہ کیا اور ''شدھی'' کی تمام تحریک کو ناکام کر دیا۔ انگریز کی ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں درسِ آزادی سے دماغی انقلاب بھی پیدا کرتے رہے۔ اس صبر آزما دور میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سٹیج کانگریس کا پلیٹ فارم تھا جہاں سے دولت برطانیہ کی طاغوتی طاقت پر ضرب لگائی جاتی تھی۔ اور آپؒ کا موقف ارشاد تبلیغ کا منبر تھا جہاں سے گم کشتگانِ راہ کو دعوتِ اسلام دی جاتی تھی اور کشتگانِ وباء ارتداد کو دوبارہ زندگی عطا کی جاتی تھی۔ آپؒ کی جدوجہد کا سب سے اہم محور صوبہ بنگال پھر صوبہ آسام رہا۔ یہی صوبہ بنگال ہے جو حضرت سید صاحب شہیدؒ اور پھر آپ کے خلفاء کے دائرۂ تبلیغ و ارشاد کا بھی اس علاقہ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا۔

۱۹۲۳ء-۲۸-۱۹۲۷ء تک تقریباً ۶ یا ۷ سال آپ بنگال میں پھر سلہٹ (آسام) کے جامعہ اسلامیہ میں ''شیخ الحدیث'' کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقہ کی اصلاح کے لئے آپ کا قیام رحمتِ خداوندی اور تائید غیبی تھا اس عرصہ میں درس و تدریس کے علاوہ آپ کا مشغلہ صرف تبلیغ و اصلاح تھا۔ صوبہ آسام کی مرطوب آب و ہوا میں کافی احتیاط کے بغیر صحت کا باقی رکھنا بالخصوص غیر بنگالی اور غیر آسامی کے لئے امر محال ہے۔ ندیوں، نالوں اور سیلاب زدہ نشیبی زمینوں کا ایک سلسلہ ہے جس کا نام آسام اور بنگال ہے۔ قدرت نے گویا اس کو طوفان، سیلابوں اور بارشوں کے لئے بنایا تھا۔ مگر انسان نے زبردستی رہنا شروع کر دیا ہے اور سطح زمین نہیں ملتی تو سطح آب پر کشتی کے سینہ ہی کو مسکن بنا لیتا ہے۔ ایسی سرزمین میں کسی خشک ملک کا باشندہ کس طرح صحت باقی رکھ سکتا ہے۔ مگر حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو خداوند

عالم نے فوق العادت ہمت عطا فرمائی ہے۔ آپؒ نے چھ سال تک وہاں قیام ہی نہیں کیا بلکہ سطحِ آب کو سطحِ زمین کی طرح تبلیغی دوروں کی جولان گاہ بنالیا۔ وہ ندی اور نالے جو ہر آبادی کے گردا گرد ہیں اور ایک آبادی کو دوسری آبادی سے جدا کرتے ہیں اور بسا اوقات ایک ہی آبادی کے سینہ کو چاک کرتے ہوئے گزرتے ہیں گویا شہر کی گلیاں تھیں جن کو بلا تکلف حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ رات کے وقت طے کر کے قرب و جوار کی آبادیوں میں پہنچتے اور وعظ و تبلیغ فرماتے۔

ایسا بھی ہوتا کہ ان خطرناک ندیوں اور نالوں کو طے کرنے کے بعد جس گاؤں میں پہنچتے وہاں مٹھی بھر انسان ہی کا اجتماع ہوتا۔ مگر آپ مجمع کی قلت سے کبھی بھی کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ اور سات آٹھ آدمیوں کے مجمع کو بھی اسی بشاشت کے ساتھ اللہ کے احکام سناتے جس مسرت اور ولولہ کے ساتھ ہزاروں کے مجمع کو......

ان مجاہدات کا اثر بہت خوشگوار رہا۔ تھوڑے عرصہ بعد ہی سلہٹ اور کچھار وغیرہ کے اضلاع آپؒ کی طرف متوجہ ہو گئے اور آپ کی اخلاص وایثار سے متاثر ہو کر حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ چنانچہ یہ علاقہ جہاں بیس سال پیشتر دو چار عالم ہی ہوں گے بفضلہٖ تعالیٰ گلشنِ علم بن گیا ہے دو در جن کے قریب عربی مدارس صرف ضلع سلہٹ میں قائم ہو گئے جن میں ہزاروں بچوں کو نہ یہ کہ دینیات کی تعلیم دی جاتی بلکہ بعض مدرسوں میں عربی کی انتہائی تعلیم بھی دی جاتی۔ تجوید اور قرأت کو تعلیم کا لازمی جزو قرار دے دیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اس علاقہ کا ہر بچہ متوسط درجہ کا قاری ہوتا ہے۔

''باگھا'' وغیرہ کے مدرسوں میں کئی کئی سو طلبہ تعلیم پاتے جن کو تعلیم کے ساتھ رضا کارانہ پریڈ بھی سکھلائی جاتی اور ''ہنوٹ'' (لاٹھی سے لڑائی کے فن) وغیرہ کی تعلیم بھی جاتی۔

مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ جون ۱۹۴۶ء میں احقر نے ضلع سلہٹ کا دورہ کیا تو یہ مدراس اور ان کے طلبہ کی حسینی فوج اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور جمعیت علماء ہند وغیرہ کے متعلق ان کے دل آویز ترانے احقر کے لئے روحانی غذا ثابت ہوئے۔ جن کا لطف آج تک محسوس ہوتا ہے۔

۱۳۴۶ھ بمطابق ۱۹۲۷ء میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صدارتِ دارالعلوم دیوبند کے لئے ''سلہٹ'' کو خیر باد فرمارہے تھے تو اہل سلہٹ کی عقیدت ومحبت اور شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ ارشاد واصلاح نے اک باہمی معاہدہ کرایا تھا کہ رمضان المبارک کا مبارک مہینہ حضرت ممدوح سلہٹ میں گزارا کریں گے۔ چنانچہ اہل سلہٹ سارا سال تمناؤں اور مرادوں میں گزارتے تھے اور جیسے ہی شعبان المعظم شروع ہوتا تھا دعوتی خطوط اور تار پہنچنے لگتے تھے۔ اگر کچھ شبہ ہوجاتا تو سلہٹ سے وجود حاضر ہونے لگتے۔

چنانچہ ۲۷،۲۸ شعبان المعظم تک حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے روانہ ہو کر سلہٹ پہنچتے عقیدت

مندوں کے گروہ کئی سٹیشنوں تک اور بعض حضرات کلکتہ تک آپ کے استقبال کے لئے پہنچتے اور اس طرح اہل سلہٹ ابتداء رمضان ہی میں ہلال عید کی خوشیاں مناتے۔ سلہٹ پہنچ کر حضرت کے مشاغل حیرت انگیز ہوتے۔ پورے آسام اور بنگال سے متوسلین ومریدین سلہٹ پہنچ جاتے کچھ قیام کرتے اور کچھ زیارت کر کے اور دو چار روز خدمت میں حاضر رہ کر واپس چلے جاتے۔ اس طرح اوسطاً چار سو پانچ سو کا مجمع ہر روز حاضر ہوتا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ مختصر سے افطار کے بعد نماز مغرب سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے اور تمام سال کے معمول کی طرح اس وقت نوافل میں سوا یا ڈیڑھ پارہ کی تلاوت ہوتی۔ پھر تراویح میں سلہٹ اور بیرون سلہٹ کے سینکڑوں مؤمنین قائمین شریک ہوتے۔ قرآن شریف حضرت مدنیؒ خود سناتے اور جس طرح ائمہ حضرات فرائض میں تجوید وقرأت کرتے ہیں اسی طرح حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تراویح میں قرأت کرتے ہیں۔ چنانچہ تراویح میں اگرچہ یومیہ سوا یا ڈیڑھ پارہ سنایا جاتا ہے مگر اس طرز تلاوت کے بعث تقریباً سوا دو گھنٹے ۲۰ رکعت میں صرف ہو جاتے ہیں۔ تراویح کے بعد حضرت مدنی سادہ اردو زبان میں وعظ (تقریر) فرماتے اور وہ انداز خطابت اختیار کرتے کہ آسام ومشرقی بنگال کے باشندے جو اردو بہت کم سمجھتے ہیں وعظ مبارک کے ہر ایک لفظ کو آسانی سے سمجھ جاتے۔ اہل سلہٹ کی طرف سے چائے کا انتظام ہوتا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اثناء وعظ میں چائے بھی پلائی جاتی۔ وعظ سے فراغت کے بعد نوافل میں ایک قرآن پاک کا سلسلہ چلتا اس کے بعد تھوڑی دیر آرام فرمایا جاتا اور پھر تہجد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جس میں دو ڈھائی پارے یومیہ ہوتے یہ سلسلہ صبح صادق سے تقریباً نصف گھنٹہ پیشتر تک جاری رہتا۔ نماز تہجد کے لئے حضرت مدنی خاموشی کے ساتھ اٹھتے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ کبھی اس میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن عموماً یہی ہوتا کہ خاص خاص متوسلین بھی تاک میں رہتے اور جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نوافل کی نیت باندھ لیتے تو وہ شریک ہو جاتے۔

نماز صبح سے فراغت کے بعد تقریباً دو ڈھائی گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر بیدار ہوتے ہی خطوط کے جوابات وغیرہ میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور کبھی سلہٹ یا مضافات سلہٹ کے حضرات اپنے مکان پر لے جا کر برکت حاصل کرتے جہاں کچھ کلمات وعظ وپند بھی ارشاد فرمائے جاتے دوپہر کو قلیل سے قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز ادا کی جاتی اور پھر قرآن شریف کے دور کا سلسلہ عصر تک اور عصر کے بعد مغرب سے کچھ پیشتر تک جاری رہتا۔ اس طرح دن اور رات میں کم وبیش دس دس قرآن شریف کا سلسلہ جاری رہتا۔ نماز عید سے فراغت پا کر واپسی ہوتی تھی آسام سے دیوبند تک متوسلین اور مشتاقان زیارت کے تقاضوں کے بموجب موقع بموقع قیام فرماتے ہوئے آخر شوال تک دیوبند ورود (واپسی) فرماتے پھر اگر حج بیت اللہ شریف کا عزم بھی ہوتا تو یہ مسلسل سفر متواتر چھ ماہ تک باقی رہتا جس میں آرام وراحت کا نام بھی منزلوں دور ہوتا۔

معلوم ہوا ہے کہ حجاز پہنچ کر بھی زائرین کی کثرت آرام کا موقع نہیں دیتی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں جب آپ حجاز مقدس تشریف لے گئے تو مولانا محمد اسماعیل صاحب مدرس قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد ایم۔ ایل۔ اے یو پی بھی ہمراہ تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں مکہ معظمہ میں قیام فرما تھے۔ مولانا محمد اسماعیل کا بیان ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی خواہش رہی کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ عیلہ سے ایک گھنٹہ تخلیہ کا موقع مل جائے مگر ممکن نہ ہو سکا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا سلہٹ تشریف لے جانے کا یہ سلسلہ ۱۳۶۵ھ بمطابق ۱۹۴۶ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے انقلابی خلفشار نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا اور جب تک مسلم لیگی وزارت کے بل بوتے پر غنڈہ گردی باقی ہے شاید حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سلہٹ جانا پسند نہ فرمادیں گے کیونکہ غنڈوں کی جماعت حضرت کی واپسی کے بعد سال بھر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام پر عرصہ حیات تنگ رکھتی ہے۔ خدام کی تکلیف کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ برداشت نہیں کر سکتے۔ (تحریر مولانا سید محمد میاں۔ بحوالہ حیات شیخ الاسلام صفحہ ۹۱ تا ۹۵)

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دارالعلوم دیوبند میں مسند حدیث سنبھالنے پر مشروط آزادگی

دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت کے لئے خداوند عالم کے فضل و کرم نے ہمیشہ ایسے بزرگوں کو منتخب فرمایا ہے جو علم و فن کے تبحر کے ساتھ زہد و تقوی کے بھی تاجدار رہے ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسنؒ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ اسرارہم کے سینے دریائے علم کے سرچشمہ تھے تو ان کے مبارک قلوب تجلیات الٰہیہ کے عرشِ معلیٰ اور روحانی فیوض و برکات کے کوثر و تسنیم۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز کے استعفے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دارالعلوم دیوبند کی صدارت پیش کی گئی جس کو آپؒ نے مصالح دارالعلوم کے پیش نظر منظور فرمالیا۔ لیکن مسلمانوں کی دوسری مذہبی و سیاسی خدمات کا جذبہ جو آپ کے رگ و پے میں نفوذ کر کے طبیعت ثانیہ بن چکا تھا اس نے اجازت نہ دی کہ عام مدرسینؒ کی طرح آپؒ ملازمت اختیار کر لیں بلکہ اہتمام کے سامنے (اس وقت دارالعلوم کے مہتمم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فرزند مولانا حافظ احمدؒ تھے) اپنے سیاسی مذاق اور سیاست ملت کی اہمیت کو پیش کرتے ہوئے کچھ شرطیں طے کر لیں۔ جن کے مطابق

(۱) سیاسی خدمات کے لئے آپ (حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ) آزاد ہوں گے۔

(۲) سیاسی امور میں مدرسہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہ عائد کی جائے گی۔

(۳) ہر مہینہ میں ایک ہفتہ آپ کو اختیار ہوگا کہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے دیوبند سے باہر

دوسرے مقامات پر سفر کر سکیں۔ جس کے لئے کسی رخصت یا اطلاع کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس سے زائد پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

اور پھر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا کمال تقوی ہے کہ جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی اور فریضۂ اہتمام (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا حافظ احمدؒ فرزندار جمند) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی نانوتویؒ کے سپرد ہوا تو آپ نے ارکان شوریٰ سے ان شرائط کی دوبارہ تجدید کرائی مگر چند سال بعد ایک ہفتہ بلا وضع تنخواہ کی شرط ارکان مجلس شوریٰ کے کرم سے حذف کردی گئی اور اب تمام مدرسین مدرسہ کی طرح آپ کی تنخواہ بھی وضع ہوتی ہے۔ پورے سال میں صرف پندرہ یوم کی رخصت اتفاقیہ بلا وضع تنخواہ مل سکتی ہے۔

لیکن سیاسی، تبلیغی، تدریسی، تینوں قسم کی خدمات اور مزید برآں دارالعلوم دیوبند کی صدارت کے (منصبی) فرائض یعنی خصوصی مشورے، نگرانی تعلیم، چندہ کی مساعی، مالیات کی ترقی وغیرہ وغیرہ۔ بیک وقت ادا کرنا درحقیقت حضرت محترم ہی کا ظرف اور آپ ہی ہمت ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ راحت و آرام بے فکری اور سکون سب کچھ قربان ہوگیا۔ شب و روز کی ایک مسلسل جدو جہد ہے جس کو وہ انسان انجام دے رہا ہے، جس کو خدا نے ''فوق العادت'' روحانی قوت عطا فرمائی ہے۔ شب کو کئی گھنٹہ مسلسل تقریر۔ اس کے بعد سفر اور صبح کو مدرسہ میں پہنچ کر مسلسل کئی گھنٹہ تک ڈھائی سو طلبہ کی جماعت کو درس دینا جس میں ہر قابلیت اور ہر مزاج کے طلبہ موجود ہوں جن میں بعض وہ بھی ہوں جو کئی سال مدرسی کر کے محض سماعتِ حدیث کے لئے حاضر ہوئے ہوں۔ پھر وہ دماغ سوز مشقت جو ڈھائی سو تین سو طلبہ کے وسیع حلقہ میں تقریر کرتے ہوئے پیدا ہوں۔ پھر اسی طرح ظہر کے بعد، عصر کے بعد اور بسا اوقات عشاء کے بعد، برابر درس اور پھر ایک دو دن نہیں ہمیشہ مسلسل اور نہ صرف دن کو بلکہ شب کو بھی اسی طرح مشاغل کا تسلسل، مثلاً قیام دیوبند کے زمانہ میں مغرب کے بعد ''صلوٰۃ اوابین'' جن میں کم از کم سوا پارہ یومیہ کی تلاوت پھر مسترشدین کو تلقین یا بیعت۔ پھر عشاء کے بعد ایک دو گھنٹہ درسِ حدیث۔ کتب بینی، اخبارات دیکھنا۔ ان سے یادداشتیں مرتب کرنا۔ جن کا بیش بہا ذخیرہ ہزار ہا صفحات کا اس وقت حضرت موصوف کے پاس موجود ہے۔ پھر آخر شب میں تہجد، اس کے بعد مراقبہ وغیرہ وغیرہ۔

غور فرمایئے کہ کیا کوئی ہے جو اس طرح مسلسل اپنے آپ کو قربان کرتا رہے۔ ہم جیسے آرام طلب مولوی اپنی تن آسانی کو چھپانے کے لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ لیکن جب کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے آغاز درس یعنی ۱۳۴۶ھ سے دورۂ حدیث کے داخلہ (حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے آخری دور میں زیادہ سے زیادہ شرکاء دورۂ حدیث کی تعداد ۹۰ (نوے) ہے اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے

زمانہ میں اسی دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد ڈھائی سو کے قریب پہنچ چکی تھی اور کل طلبہ کی تعداد تقریباً ۱۶۰۰ رہتی ہے۔ (الھم زد و بارک) کی تعداد روز افزوں ہوگئی ہے اور نہ صرف طلبۂ دورۂ حدیث بلکہ دارالعلوم کے کل طلبہ کم از کم ۹۸ فیصدی حضرت شیخ مدنیؒ کے گرویدہ و جاں نثار بن کر واپس ہوتے ہیں تو کیا کوئی انصاف پسند جو رشک و حسد کے بدترین مرض سے محفوظ ہو۔ اس قسم کے اعتراضات کی طرف التفات کر سکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اختتام سال پر کتاب کے ختم ہونے میں دشواریاں ہوتی ہیں زمانۂ امتحان میں بخاری شریف ہوتی رہتی ہے مگر کیا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایسا نہ ہوتا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ دورۂ حدیث میں بہت سے وہ حضرات شرکت کرتے ہیں جو بار بار کتب حدیث پڑھ چکے ہوتے ہیں اور اب ان کا مقصد تشفی اور اطمینان حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ کے سوالات بسا اوقات اسباق میں تاخیر پیدا کر دیتے ہیں اور بالخصوص حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق اس درجہ وسیع ہیں کہ کسی طالب علم کے کسی سوال پر کسی وقت بھی آپ چین بہ جبیں نہیں ہوتے۔ اس طرح ایک ایک مسئلہ میں پوری جماعت کی طرف سے بسا اوقات دسیوں سوالات ہوتے ہیں۔

گلشن مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ گل چیں صرف ہندوستان کے باشندے نہیں ہوتے بلکہ افغانستان، ایران، چینی ترکستان، حجاز، یمن، برما اور جاوا وغیرہ جزائد شرق الہند کے طلبہ کی کافی تعداد بھی اس زمرہ میں شریک رہتی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں کم و بیش پانچ ہزار طلبہ کی کافی تعداد بھی اس زمرہ میں شریک رہتی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں کم و بیش پانچ ہزار طلبہ بلاواسطہ آپؒ سے فیضیاب ہوئے جو آج تمام عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں اور علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس عرصہ میں اگر ہر ایک فیض یافتہ کے سلسلۂ درس سے دس طلبہ بھی فیضیاب ہوئے ہیں تو آپ کے بالواسطہ شاگردوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ ان ہزاروں خداترس خداپرستوں کی تعداد جنہوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعتِ طریقت کی۔ ان کے سوا ہے اور جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دس سال آپ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ''حرم اطہر'' میں طلبۂ عرب و عجم کی علمی اور روحانی تربیت فرمائی ہے تو ان مسترشدین و متوسلین کی تعداد کا تخمینہ لاکھوں تک پہنچ جاتا ہے۔ جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مشکوٰۃ علم و فضل سے نور و ضیاء حاصل کر رہے ہیں۔ اس بناء پر آپ کے لئے شیخ العرب والعجم کا خطاب ایک حقیقت کی تعبیر ہے۔ جس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(تحریر مولانا سید محمد میاں۔ بحوالہ حیات شیخ الاسلام صفحہ ۹۷ تا ۱۰۰)

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی توہین اور اس کا عبرت خیز انجام

سید پور اور بھاگلپور میں جس نوعیت سے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند وصدر جمعیت علماء ہند کی ذات بابرکات پر قاتلانہ اور وحشیانہ حملے ہوئے وہ ہر سنجیدہ شخص کے لئے انتہائی رنج وقلق کا موجب ہیں۔ حضرت مولانا ریاض الدین صاحب سید پوری جو کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے میزبان اور ''سید پور'' لانے کے باعث تھے۔ وہ کلکتہ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ موصوف (یعنی مولانا ریاض الدین سید پوری) نے راقم الحروف (یعنی مولانا کفیل احمد صاحب مضمون نگار) کو نماز جمعہ سے قبل نمازیان مسجد کی موجودگی میں اپنی درد بھری داستان سنائی کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خادم ''احسان الحق مرحوم'' کی تعزیت میں قصبہ سونار تشریف لائے ہوئے تھے اور میری درخواست پر شام کا کھانا تناول فرمانے کے لئے سید پور اسٹیشن پر اترے تھے اور افسوس کہ ممدوح کو (یعنی حضرت مدنیؒ) میرے غریب خانہ تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعتاً تقریباً (۷۰۰) سات سو لوگوں کا انبوہ لیگی نعرے لگاتا ہوا سٹیشن پر آدھمکا اور حضرت شیخ (یعنی حضرت مدنیؒ) کو عریاں وشنام وہی شروع کردی۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں ڈنڈے اور چھریاں تھیں۔ بدتمیزی سے نام لے لے کر قتل کردو، مار ڈالو، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو یہ غدار ہے، ایسا ہے ویسا ہے جو کچھ منہ پر آرہا تھا بکواس کی۔ ہم بنا بر استقبال صرف دس پندرہ آدمی تھے، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین ہزار غنڈے سید پور ورکشاپ اور مضافات سے جمع ہوگئے اور پھر کربلا کا منظر حسین احمد بن حسین کے سامنے آگیا۔ مار دھاڑ شروع کردی اور ہم چند لوگ جو حضرت شیخ (یعنی حضرت مدنیؒ) کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے کچھ مجروح اور کچھ مضروب ہو رہے تھے اور خدا جانے ہم لوگوں میں آیا فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہا قوت ہمارے اندر پیدا ہو رہی تھی اور ہم ''کانہم بنیان مرصوص'' بنے ہوئے تھے اسی اثناء میں ایک فرعون بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا۔

حضرت مدنیؒ کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی بے دردی سے گریبان اور آخر میں سخت مدافعت کے باوجود کلاہ (یعنی پگڑی مبارک) سر مبارک سے اتارلی۔ بے ہودہ کلمات بکتے ہوئے پاؤں کے نیچے روندا اور پھر اس کو جلا دیا۔ ہم میں سے بعض اشخاص نے ایک مسلمان سب انسپکٹر جو قریب ہی تھا امداد کے لئے متوجہ کیا مگر افسوس اس نے لیگی ذہنیت کی وجہ سے ابتداء لطائف الحیل (حیلہ بازی) سے کام لے کر کچھ دیر بعد صاف وصریح انکار کردیا کہ میں اس بڑے مجمع کو قابو میں لانے سے معذور ہوں۔ جب اس پولیس افسر نے اپنی شرعی وقانونی ذمہ داری کا قطعی احساس نہیں کیا تو ہم میں سے بعض مایوسانہ طریقہ پر ورکشاپ کے

''اینگلوانڈین'' افسر کے پاس پہنچے وہ فوراً اسٹیشن پر آیا اور اس نے فی الواقع امن وامان قائم کرنے کی بہت کچھ کوشش کی اپنے ماتحت مزدوروں سے یہاں تک کہا کہ خبردار! یہ تم کیا کام کرتے ہو؟ ہم جانتے ہیں یہ شخص تمہارا بہت بڑا پوپ ہے۔ زبردست پادری ہے نہایت نیک آدمی ہے کیا تم اس طرح غنڈہ پن سے شراب پی پی کر پاکستان لینا چاہتے ہیں؟۔

دور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔ غرض اس افسر نے سب کو سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اسی درمیان میں بمشکل تمام ویٹنگ روم میں داخل کیے جانے کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کی طرح مظلومانہ محصور تھے اس ناکامی کے بعد اسٹیشن افسران وغیرہ کی سعی (وکوشش) کے ذریعہ غنڈوں سے یہ طے پایا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اس صورت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ اسی طرح شب کی ''دارجلنگ میل'' سے واپس ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت شیخ (مدنیؒ) ساڑھے آٹھ بجے شام سے لے کر ڈیڑھ بجے شب تک ۵ گھنٹہ اس مصیبت عظمیٰ میں مبتلا رہ کر ''دارجلنگ میل'' سے بھاگلپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ پھر بھاگلپور میں پہنچ کر دوبارہ جو مصیبت آئی وہ بھی اخبارات میں مجملاً آچکی ہے۔

یہ ہے وہ رقت خیز اور روح فرسا داستان کہ جس سے سوائے لیگی پریس کے ہر شخص مغموم ومتاثر ہے اور ارباب لیگ کی طرف سے واقعہ کی تکذیب کی جارہی ہے۔ افسوس صد افسوس۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مولانا ریاض الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت مدنیؒ اپنے دوستوں کو صبر وسکون کے ساتھ تسلی وتشفی دیتے رہے اور فرمایا یہ تو کچھ بھی نہیں آئندہ ملک کی اس سے زیادہ خراب حالت ہونے والی ہے حملوں اور سب وشتم کے وقت حضرت شیخ (مدنیؒ) کی کیا حالت تھی؟ مولانا ریاض الدین صاحب فرماتے ہیں کہ چہرہ پر قطعاً خوف وہراس نہ تھا اور حضرت مدنیؒ اکثر مراقبہ کی حالت میں ہو جاتے تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ممدوح (مدنیؒ) سے دیگر اشخاص نے تحریری طور پر اجازت طلب کی کہ ہم غنڈوں کے قلع قمع کے لئے حاضر ہیں مگر مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بلوہ کے اندیشہ اور اپنے اعتماد علی اللہ کی بنا پر اجازت نہیں دی۔ غالباً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قام الملک ووقع الشیطان'' فرمایا تھا ممدوح (حضرت مدنیؒ) کے پیش نظر تھا یہ ہے عمل بالحدیث۔

ادام اللہ فضلہ وظلہ علی المسلمین و المسترشدین.

(بحوالہ: حیات شیخ الاسلام صفحہ نمبر ۱۷۲)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ گستاخی کرنے والوں کا انجام

اولیاء اللہ سے جو عداوت کرتا ہے وہ دراصل باری تعالیٰ سے جنگ کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کے نیک بندوں کا بحالتِ مظلومیت صبر وضبط رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ سیدنا امام حسینؓ کے قاتلین نے زیادہ عرصہ میں نہیں تھوڑے ہی دنوں میں اپنی ذلت ورسوائی کا جو مہیب نقشہ دیکھا وہ اسلامی تاریخوں میں آج بھی روشن ہے۔ مظلوم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی غالباً حدود بنگال سے باہر نہیں نکلے تھے کہ خداوند تعالیٰ کا قہر وغضب ظالموں کی طرف متوجہ ہو گیا اور منتقم حقیقی کی گرفت شروع ہوگئی۔ چنانچہ مولانا محمد صالح صاحب سید پوری فاضل دیوبند خلف الرشید مولانا ریاض الدین صاحب کا گرامی نامہ آج ہی اپنے پدر بزرگوار کے نام کلکتہ پہنچا۔ مکتوب (خط) بنگلہ زبان میں ہے۔ مگر مولانا سید محمد میاںؒ نے اس کا اردو ترجمہ جناب قاری عتیق الرحمٰن فرید پوری مدرس اعلیٰ شعبۂ تجوید مدرسہ عالیہ سے کرا کے بعینہ درج ذیل کر دیا ہے۔

مولانا صالح محمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہٗ

ابا جان۔ آپ کا خط موصول ہوا ہم لوگ خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ بے فکر ہو کر کام کاج کریں اور ہم لوگوں کے لئے دعا کرتے رہیں۔ جن غنڈوں نے جناب حضرت قبلہ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گستاخی کی تھی وہ لوگ ابھی اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ بڑے داروغہ کا بڑا لڑکا دوسرے ہی دن قضا کر گیا (مر گیا) یہ بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو اس کے بعد جس شخص نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سر مبارک کی ٹوپی اتاری اور جلا دی تھی دوسرے ہی دن وہ بھی تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ سید پور میں ہلڑ مچ گیا۔ شیان ڈاکٹر اور جیتنا سب لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم لوگ ان غنڈوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ ہم لوگوں سے ایسا ذلیل کام نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلم لیگیوں میں دو فرقے ہو گئے ہیں۔ بہت سے لوگ افسوس کر رہے ہیں کہ ایسا کام کرنا مسلم لیگیوں کو غلطی ہوئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ مسلم لیگ سے ناراض ہو گئے کل بعد جمعہ قرب وجوار گاؤں کے سردار لوگ ہمارے گھر میں آئے اور تبلیغی جماعت قائم کی اور جمعیت علماء ہند کی ایک شاخ قائم کی جس کا صدر آپ کو بنایا گیا ہے اور مرحوم مظہر اللہ منڈل کے لڑکے عبدالکریم منڈل کو اسسٹنٹ سکریٹری بنایا اور آس پاس کے لوگوں کے نام کی فہرست بھیجی ہے۔ آپ کے گھر آنے پر تمام سردار لوگ آپ کے پاس آئیں گے۔ فقط صالح (بحوالہ حیات شیخ الاسلام صفحہ نمبر ۱۵۷)

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ سچے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح سچا ثابت کرتا ہے۔

گو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کیسی زبردست اور کھلی ہوئی کرامت ہے۔اس کے علاوہ چند عبرت ناک واقعات اور بھی ہیں۔ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب آزاد راوی ہیں کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ایک جلسہ گاہ میں تشریف فرما تھے "نبی گنج بھڑ گاؤں" کے مولوی ممتاز الدین نے آپ کی پیشانی پر سجدہ کا نشان دیکھ کر از راہ تمسخر کہا کہ یہ جوتے کا داغ معلوم ہوتا ہے۔(نعوذ باللہ من ذالک) لوگوں نے دیکھا کہ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس گستاخ نے قادیانیت اختیار کر لی اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بن گیا۔

(۲) ایک مرتبہ بہاولپور سے حضرت مولانا رحمت اللہ (حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے) تشریف لائے۔انہوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے امرتسر کے رہنے والے ایک صاحب کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو گستاخیاں کی تھیں ان کی سزا دنیا ہی میں مل گئی جس طرح ہم نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بدتہذیبی کا ننگا ناچ ناچا تھا ہمارے سامنے ہماری بہو بیٹیوں کو سر بازار نچایا گیا خدا اگر مجھے پر دے دے تو میں اڑ کر حضرت مدنی کی خدمت میں پہنچوں اور ان سے معافی طلب کروں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باتیں سن کر اظہار افسوس کیا اور ان صاحب کو معاف کر دیا۔

(۳) ایک مرتبہ سہارنپور میں جمعیت علماء ہند کا جلسہ تھا۔یہ اس دور کی بات ہے جب کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے ہنگامے ہو رہے تھے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس جلسہ میں تقریر کرنے والے تھے۔مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے دعویٰ کیا کہ میں سیاست میں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مناظرہ کروں گا۔حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (بانی تبلیغی جماعت) کو معلوم ہوا تو آپؒ نے فرمایا کہ میاں ظفر احمد اپنی گھڑی کی خیر منائیں مگر وہ کب سننے والے تھے بہر حال حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کے خدام نے یہ کہہ کر دیو بند واپس کر دیا کہ حضرت آپ کی تقریر کل ہوگی۔حضرت مدنی تو دیو بند واپس تشریف لے گئے لیکن چند دنوں کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے میاں ظفر احمد تھانویؒ کی خلافت چھین لی۔غالباً اسی بات کی طرف مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے ارشارہ فرمایا تھا (میاں ظفر احمد اپنی گھڑی کی خیر منائیں) (انفاس قدسیہ)

(۴) آج بھی ایک صاحب حیات ہیں (اب حیات نہیں ہیں جب یہ تحریر لکھی جا رہی تھی وہ اس وقت حیات تھے) یہ صاحب حضرت مدنیؒ کو ایسی فحش گالیاں دیا کرتے تھے کہ دل لرزنے لگتا تھا۔قدرت نے ان سے انتقام لیا اور ان کے چہرے پر اس طرح آبلے پڑے کہ تمام منہ سوج گیا اور بالکل توے کی طرح سیاہ ہو گیا آج بھی یہ صاحب طبیب ہونے کے باوجود اپنے سیاہ چہرے کو درس عبرت بنائے ہوئے ہیں اور اعتراف کرتے

ہیں کہ مجھے مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو گالیاں دینے کی سزا ملی ہے۔ (انفاس قدسیہ)

(۵) ۱۳۷۴ھ رمضان المبارک کے موقعہ پر ٹانڈہ تراویح کے دوران ایک صاحب حضرت مدنیؒ کو نہایت بھونڈے لب ولہجہ میں بکثرت لقمہ دیا کرتے تھے انداز کچھ ایسا تھا کہ حاضرین کو انتہائی ناگوار ہوتا تھا لیکن حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خوف سے کوئی شخص کچھ نہیں کہہ سکتا تھا آخر ایک دن جب انہیں خون کی قے ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ یہ ان کی بے ہودگی کا نتیجہ ہے۔ (انفاس قدسیہ)

(بحوالہ: مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ سوانح وافکار صفحہ نمبر ۱۰۴)

تقسیم ہند کے بعد جمعیت علماء ہند کا سیاست سے علیحدگی کا اعلان

جمعیت علماء ہند کی سیاسی علیحدگی کے بارے میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خطبۂ صدارت کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے تاکہ مستند طور پر پوری وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ سامنے آجائے۔
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

جمعیت علماء ہند ہمیشہ سیاسیات میں ہندو مسلم اشتراک واختلاط کی قائل رہی ہے۔ چنانچہ اس نے ہمیشہ مسلمانوں کو ملک کی مشترک جماعت کانگریس میں شرکت کی دعوت دی، عقل وقیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ہندو مسلمانوں کے ملک، اقتصادی اور شہری مفادات مشترک ہیں تو ان کی سیاست بھی مشترک ہو اور سیاسی پلیٹ فارم بھی اشتراک واختلاط کا پلیٹ فارم ہو، جب میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلیں اور اسمبلیاں مشترک ہیں، ان کے ایوانوں میں ہندو اور مسلمان مل کر بیٹھتے ہیں، مشترک طور پر ان کے عہدیداران اور سب کمیٹیوں کا انتخاب کرتے ہیں، مشترک طور پر رائے دے کر کسی قانون کو منظور یا مسترد کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ سیاسی اور ملکی حقوق کی تحصیل وحفاظت کا پلیٹ فارم مشترک نہ ہو، اکبر بادشاہ کی قوم پرستی کسی تحریر اور تفصیل کی محتاج نہیں، جہانگیر بادشاہ کا عدل ومساوات بھی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے اس کے توپخانہ کے افسر اعلیٰ "راجہ بکرماجیت" تھے جن کے ماتحت ۵۰ ہزار توپچی اور تین ہزار توپیں رہتی تھیں۔ اورنگزیب عالمگیر کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے مگر جب اس سے کہا گیا کہ حکومت کا منصب کسی غیر مسلم کو سپرد نہ کیا جائے تو اس نے نہایت تعجب اور حیرت سے سنا اور بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ دنیا کے انتظامی امور میں منصب کا مدار قابلیت ہوتی ہے۔ مذہب کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اس کے بڑے بڑے منصب داروں میں ساہو پسر راجہ سجا، جے سنگھ، جسونت سنگھ، سیواجی کے داماد راشند رجی اور ان کے علاوہ بڑے بڑے راجپوت اور ہندو تھے جن کی تعداد بقول "منشی کیول رام بٹالوی" ۱۰۰ سے زیادہ تھی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ تذکرۃ الامراء)

''مہاراجہ رنجیت سنگھ'' جیسے کٹر مذہبی راجہ کی وزارت میں ہندو اور سکھوں کی طرح مسلمان شریک تھے، فقیر زادہ عزیز الدین وزیر تھے اور الٰہی بخش توپ خانہ کے سردار، مرہٹوں کے توپ خانہ کا اعلیٰ افسر ''ابراہیم گردی'' تھا اور حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنی توپ خانہ کا افسر ''راجہ رام راجپوت'' کو بنایا، ''لارڈ ولیم بینٹنگ'' نے ۱۹۸۸۲ء کی تقریر میں ''ڈبلیو ایم ٹارنس'' نے اپنی کتاب ''ایشیاء میں شہنشاہیت'' ''سر بی رام آف بنگال'' نے اپنی تصنیفات میں اور ''پنڈت سندر لال'' آف الہ آباد نے اپنی کتاب ''بھارت میں انگریزی راج'' میں ایسی بہت سی مثالیں اور نظیریں پیش کی ہیں جن سے ہندو مسلمانوں کے باہمی بہتر تعلقات اور آپس کے اعتماد پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے حکمران ہمیشہ اس اصول کے حامی رہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ حتیٰ کہ سلطنتِ مغلیہ کے بانی ''بابر بادشاہ'' نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی: ''اے پسر! سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے، الحمدللہ اس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی، تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوحِ دل سے دھو ڈالو اور عدل و انصاف کرنے میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے، اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ ہی سے مرہون ہوتی ہے جو قوم یا ملک حکومت کی مطیع اور فرمانبردار رہے، اس کے مندر اور مزار برباد نہ کیے جائیں، عدل و انصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے، ظلم و ستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہوگا جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں، اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد اور میل جول پیدا کرو تاکہ ''جسم سلطنت'' مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے، ''سرگذشتِ تیمور'' کو جو کہ اتفاق و اتحاد کا ملک تھا، اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو'' (بحوالہ خفیہ وصیت ظہیر الدین محمد بابر شاہ بنام شہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں عطاءاللہ عمرہ بحر روبرائے استحکام و استقامت سلطنت صفحہ ۱۶)

اسی اشتراک و اختلاط کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کی آبادیاں مشترک ہیں، بازار مشترک ہیں، عام کاروباری زندگی مشترک ہے، حتیٰ کہ اس اشتراک نے ایک مشترک زبان کے ایجاد پر مجبور کیا اور اس تقریب سے ''اردو'' یا ''ہندوستانی'' زبان عالم وجود میں آئی۔ اس مشترک زبان کے ایجاد میں جو خوش گوار تعلقات کے ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کے جلیل القدر شیخ یعنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلویؒ نے خاص حصہ لیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے خاص احباب کی ایک جماعت بنائی اور اس کو ہدایت کی کہ ایسی زبان تیار کریں کہ ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان اس کے ذریعہ لین دین اور دوسری ضرورتوں کی بات چیت کر سکیں۔ اس کمیٹی کے ارکان ۹ تھے، ۴ ہندو، پردیو، چیتل دیو، سنبھل دیو، سیتل دیو اور ۵

مسلمان امیر خسروؒ، خواجہ سید محمدؒ، خواجہ سنجریؒ، خواجہ سید موسیٰؒ اور خواجہ سید رفیع الدین ہارونؒ امیر خسروؒ کی مشہور کتاب ''خالق باری'' اس حسن تعلق کی یادگار ہے جو آج تک بچوں کو پڑھائی جاتی ہے، برطانیہ کا دور حکومت سب سے پہلا دور تھا جس میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی نامبارک پالیسی اختیار کی گئی، اس تخم خبیث کو بار آور کرنے کے لئے بہت سے مٹے ہوئے نشانات ابھار لئے گئے اور نئے نئے اختلافی مسائل پیدا کر کے اس تخم خبیث کی آب یاری کی گئی، مسٹر بندری ایلیٹ اور مسٹر کیمن مامور کیے گئے کہ تاریخ میں اختراعات کریں اور فرقہ وارانہ نقطہ نظر کی بنیاد پر پرانے واقعات کو مسخ کر کے نئی تاریخ مرتب کریں، اس مسخ کردہ تاریخ کو کورس میں داخل کر کے نوجوانوں کے دماغوں کو مسموم کیا گیا۔

اردو ہندی کا قصہ چھیڑ کر ملی جلی خوش گوار تہذیب کے جگر پر نشتر لگایا گیا اور اس قسم کے مہلک اور تباہ کن مسائل کی زہر افشانی کو مسلسل جاری رکھنے اور اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو پیہم شکست دینے کے لئے جداگانہ انتخاب کا نرالہ طریقہ جاری کیا گیا جب ہم اس مطالبہ، اس کے پیش کرنے اور اسکی منظوری کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے: خود کوزہ خود کوزہ گر و خود گل کوزہ۔

یعنی برطانوی مفاد کے ایجنٹوں نے خود ہی مطالبہ ایجاد کیا، خود ہی درخواست لکھی، خود ہی اپنے کاسہ لیس مسلمانوں کا ایک وفد مرتب کیا جو شملہ حاضر ہوا اور پھر اس کے مطالبہ کو منظور کر کے مسلمانوں پر احسان عظیم رکھا گیا اور اس طرح مسلسل احسانات کے ذریعہ سے اتحاد و اتفاق کی تعمیر کو خاکستر کر کے دلوں کی سرزمین میں بغض وعناد کا جوالا مکھی تیار کیا گیا جس کا پہلا نتیجہ مطالبۂ پاکستان تھا۔ دوسرا نتیجہ وہ عبرتناک اور لرزہ خیز کشت و خون جو ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا جس نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ایک کروڑ سے زائد انسان بے خانماں ہوئے اور مہاتما گاندھی جیسا انسان اس کی بھینٹ چڑھ گیا۔

محترم بزرگو اور دوستو! جب ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا فرقہ وارانہ اور غیر فطری طریقہ رائج اور انتخاب کے موقع پر فرقہ وارانہ مسائل کو ابھار کر کامیابی کا مستحق اسی کو سمجھا جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ متعصب، تنگ نظر اور فرقہ پرست ہو تو مجبوراً قوم پرور جماعتوں کو بھی فرقہ واریت کے میدان میں اترنا پڑتا تھا تاکہ فرقہ وارانہ زہر کو جہاں تک ممکن ہو، کم کر سکیں اور جدا جدا پلیٹ فارموں سے وہ مشترک ملکی مسائل پیش کر سکیں جو درحقیقت انتخاب کا معیار ہونے چاہئیں۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

نقوش و تاثرات

مولانا مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی و چیف ایڈیٹر ماہنامہ ''نقوش اسلام'' مظفر آباد

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی برصغیر ہندوپاک کی گذشتہ صدی کی عظیم شخصیات میں ممتاز مقام کی حیثیت رکھنے والی چند عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے، امت اسلامیہ ہندیہ کی انہوں نے جو عظیم ملی خدمت انجام دی وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں سنہرا باب سمجھی جائے گی، انہوں نے آزادی ہند کو ملت اسلامیہ کی آزادی اور سربلندی سمجھتے ہوئے اپنی دانشمندانہ مہارت سے سب کو فائدہ پہنچایا، اس طرح ملک کو جو صدیوں اسلامی قیادت میں رہا تھا، اور مغربی استعمار نے اس کو مسلمانوں سے چھین کر غلام بنایا تھا، آزادی دلانے میں نمایاں حصہ لیا، لیکن حضرت مولانا کی اس حیثیت سے بڑی شہرت ہوئی اور سب اس کے معترف ہیں لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تنہا یہی اہم خصوصیت نہیں رہی بلکہ باطنی سیرت وسلوک وتربیت میں بھی ان کا بڑا مقام رہا'' حضرت مولانا کی بڑی خصوصیات اتباع سنت کی تھی، وہ زندگی کے سارے پہلوؤں میں سنت کی پوری پیروی کرنے کی پابندی کرتے تھے، لوگوں سے معاملات میں، خانگی زندگی میں، مہمانوں کی خاطر تواضع میں، اور حق بات کے لئے متحرک ہوجاتے اور سینہ سپر ہوجانے میں اور اپنے کو مادی فوائد بے نیازی اختیار کرنے میں بڑے ممتاز نظر آتے تھے، اور تعلیم حدیث اور تزکیہ وتربیت کے اپنے کاموں میں مشغول رہتے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچاتے۔

ولادت باسعادت اور بھائی بہن:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ۱۹ رشوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بمقام بانگر مئو ضلع اناؤں میں پیدا ہوئے، تاریخی نام چراغ محمد ہے، آپ کے چار بھائی اور بھی تھے، جن کے نام مولانا سید محمد صدیق، مولانا سید احمد، مولانا سید جمیل احمد اور مولانا سید محمود تھے، بھائیوں میں آپ درمیانے تھے، آپ کی تین بہنیں بھی تھیں، ایک بہن کا نام زینب تھا، جو چار برس کی عمر میں فوت ہوئی، دوسری کا نام تسیم زہرا تھا، وہ بھی ڈیڑھ سال کی عمر میں فوت ہوئی، تیسری بہن کا نام ریاض فاطمہ تھا، جو ۲۴ رسال کی عمر میں مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں۔

ابتدائی تعلیم:

حضرت مدنی کے والد سید حبیب اللہ قصبہ صفی پور ضلع اناؤں میں ہیڈ ماسٹر تھے، پھر بانگر مئو میں تبدیل کروئے گئے، جب حضرت مدنی پیدا ہوئے تو آپ کے والد بانگر مئو میں تھے، جب تین سال کی عمر کو پہنچے تو والد ماجد کی تبدیلی قصبہ ٹانڈہ میں ہوگئی، آپ نے ابتدائی تعلیم یہاں حاصل کی۔

حضرت مدنی اپنی تعلیم وتربیت اورایام طفولیت کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”مجھ کو ہوش وحواس آئے، تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا، بانگر مئو بالکل یاد نہیں، والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم وتربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لئے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے، ہر بچہ کو جب وہ چار برس کا ہو جاتا، پڑھنے کے لئے بٹھا دیتے تھے، نہ پڑھنے اور لکھنے پر خوب مارتے تھے، مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے۔

آغاز شعور سے پابندی اور تربیت کا اہتمام:

جب اس عمر کو پہنچا تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد سپارہ پڑھنا پڑتا تھا، صبح ساڑھے نو بجے تک یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی، اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا، اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانہ میں خوب مار پیٹ کرتے تھے، چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا، اس کے بعد والد مرحوم کے ساتھ ہی گھر آنا ہوتا تھا، گھر پر بھی سخت قید تھی، باہر نکلنا، گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا، اس کی بالکل اجازت نہ تھی، اگر کبھی موقع پا کر نکل جاتا تو سخت مار پڑتی۔

بکری چرانے کی خدمت:

والد صاحب نے ایک اچھی نسل کی بکری پال رکھی تھی، اسکول جاتے اور واپس آتے ہوئے اس کو

اور اس کے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا، چونکہ اسکول کا احاطہ بڑا تھا، وہ لمبی رسی میں باندھ دی جاتی تھی اور دن بھر اس طرح چرتی رہتی تھی، دیگر فارغ اوقات میں مکان کے قریب جنگل میں اس کو اور اس کے بچوں کو چرانا پڑتا تھا، اس طرح بچپن میں یہ سنت ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی، پتنگ اڑانا، یا گیند کھیلنا، یا گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلنا کبھی نصیب نہیں ہوا۔

آٹھ سال کی عمر میں علمی حذاقت اور تجربہ:

الحاصل آٹھ برس تک اس طرح وطن میں قیام رہا، اس دوران پانچویں سپارہ تک والدہ مرحومہ سے اور پانچ سے اخیر تک والد مرحوم سے ناظرہ قرآن شریف پڑھا، اس کے بعد آمدنامہ، دستور الصبیان، گلستاں کا کچھ حصہ مکان پر پڑھنا ہوا، اور اسکول میں درجہ دوم تک پڑھنا ہوا، اس وقت اسکول میں فنون اور کتب زیادہ تھے، تمام اقسام حساب، جبر و مقابلہ تک مساحت اور اقلیدس مقالہ اولی تمام جغرافیہ عمومی خصوصی، تاریخ عمومی وخصوصی، مساحت علمی (تختہ جریب وغیرہ سے زمین ناپ کر باقاعدہ نقشہ بنانا) تحریر املا، ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ از بر بخوبی جواب دے سکتا تھا۔

دیوبند میں سب سے پہلی حاضری:

جب عمر کا تیرہواں سال شروع ہوا تو بھائی سید احمد مرحوم دیوبند چلے گئے، بڑے بھائی حضرت مولانا سید محمد صدیق پہلے سے دیوبند میں آخری کتابیں پڑھ رہے تھے، اب ہم مکان پر اس حیثیت سے آزاد ہو گئے کہ ہم کو ڈھونڈ کر گھروں سے نکال لانے اور والد مرحوم کے سامنے پیش کر دینے والا کوئی نہیں رہا، طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا، اس وجہ سے والد صاحب نے مار اپیٹا بھی زیادہ، مگر بے سود معلوم ہوا، دو چار دن مار کا اثر رہا، پھر وہی کھیل کود کا شوق سوار ہوا، بالآخر والد صاحب نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہئے بلکہ دیوبند بھیج دینا چاہئے، چنانچہ بھائیوں کی تین مہینہ روانگی کے گزرنے کے بعد منشی فیروز الدین بٹالوی مرحوم کے ساتھ دیوبند بھیج دیا، چنانچہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں ان کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا، اور اپنے بھائیوں کے زیر سایہ انہیں کے کمرہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے مکان کے قریب رہنے لگا، یہ کمرہ حضرت کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا۔

مولانا خلیل احمد سے درسی کتب کا آغاز:

یہاں پہنچنے کے بعد گلستاں اور میزان شروع کی، بڑے بھائی صاحب نے حضرت شیخ الہند سے درخواست کی کہ آپ تبرکا اس کو دونوں کتابیں شروع کرادیں، مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد مرحوم اور

دوسرے اکابر علماء موجود تھے، حضرت شیخ الہند نے مولانا خلیل احمد سے فرمایا کہ آپ شروع کرادیں، چنانچہ انہوں نے ہر دو کتابوں کو شروع کرادیا، اور پھر بھائی صاحب نے میزان، منشعب پڑھائی، اگرچہ عمر کے لحاظ سے تیرہ سال کا تھا لیکن دبلا پتلا اور پستہ قد کہ دیکھنے میں گیارہ سال کا نظر آتا، اس وجہ سے مجھ پر شفقت زیادہ کی گئی۔

دیوبند پہنچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی، وہ بھی جاتی رہی، دونوں بھائی صاحبان بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے، خوب مارا کرتے تھے، اس تقید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو ولعب کا شغف کم سے کم کردیا۔ (تلخیص نقش حیات صفحہ ۵۲ تا ۵۵)

اپنے استاد سے عشق ومحبت:

حضرت مدنی اپنے اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے، خصوصاً حضرت شیخ الہند سے تو ان کو بے حد محبت گرویدگی اور تعلق خاطر تھا، انہیں حضرت شیخ الہند کی شاگردی پر فخر وناز تھا، جب بھی اپنے اساتذہ کا تذکرہ کرتے تو حضرت شیخ الہند کا بڑے شاندار الفاظ سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے بلکہ ہر مجلس اور ہر محفل میں کسی نہ کسی طرح حضرت شیخ الہند کے تذکرہ کی راہ نکال لیا کرتے تھے، شیخ الہند سے عشق ومحبت اور جذبہ خدمت کی برکت تھی، بلکہ یہی سعادت مندی تھی کہ اللہ تعالی نے حضرت مدنی کے علم میں برکت ڈال دی تھی اور پوری دنیا میں ان کے علم کا ڈنکا بجتا رہا۔

رفاقت زنداں:

حضرت شیخ الہند نے جیل میں حضرت مدنی سمیت اپنے جانثاروں (حضرت شیخ الہند کے ساتھ چار جانثار خادم تھے) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”انگریزی گورنمنٹ نے مجھ کو تو مجرم سمجھا ہے، تم تو بے قصور ہو، اپنی رہائی کی کوشش کرو، مگر تمام نے یہی جواب دیا، حضرت! جان چلی جائے گی، مگر آپ کی خدمت سے جدا نہیں ہوں گے......

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

ایام اسیری میں صدمات:

حضرت مدنی جب مالٹا میں اسیر تھے تو آپ کے خاندان کے سات افراد فوت ہوگئے، فرید الوحیدی اپنی کتاب ”شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ایک تاریخی وسوانحی مطالعہ“ میں رقم طراز ہیں:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہرگز
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

''حضرت مدنی جب مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے تھے، تو بھرا پورا خاندان اور بسا بسایا گھر چھوڑ کر نکلے تھے، سفر صرف دو چار دنوں کا اور انتظام مختصر سی جدائی کا تھا، مگر مقدر کی بات کہ سفر طویل ہوتا گیا، گرفتاری ہوئی، مصر کی جانب روانگی ہوئی، سزا ہوئی، پھانسی کی خبریں گرم ہوئیں، مالٹا کی قید و اسارت پیش آئی، استاد کی قربت اور ان کی پدرانہ شفقت نے ہر مشکل آسان اور ہر مصیبت قابل برداشت بنادی تھی، قید و بند کی سختیاں، صبر و شکر کے ساتھ جھیل رہے تھے۔

ایک دن کئی ہفتوں کی رکی ہوئی ڈاک ملی اور اس کے ہر خط میں کسی نہ کسی فرد خاندان کی وفات کی خبر درج تھی، اس طرح ایک ہی وقت میں باپ، جواں سال بچی، ہونہار بیٹے، جانثار بیوی، بیمار والدہ اور دو بھاوجوں سمیت سات افراد خاندان کی موت کی جانکاہ خبر ملی، موت تو برحق ہے، مگر جن حالات میں اور جس مجبور ماحول میں یہ اطلاعیں ملیں تھیں، انہیں برداشت کرنے کے لئے پہاڑ جیسا کلیجہ چاہئے تھا:

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر اک زندگی مستعار رکھتے ہیں

جیل میں قرآن یاد بھی کیا اور شیخ الہند کو سنا بھی دیا:

حضرت مدنی اپنے محبوب استاذ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں ہمیشہ حاضر باش رہے، خصوصاً مالٹا کی جیل میں جی بھر کر دن رات خدمت کر کے اپنے استاذ کے مواہب و کمالات کشید کر لئے، حضرت مدنی مالٹا کی جیل کی رفاقتوں کی داستان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھ کو زمانہ طالب علمی ہی سے شوق تھا کہ قرآن مجید حفظ کرلوں، مگر بدقسمتی سے کبھی ایسا فارغ وقت نہیں ملتا تھا کہ اس مراد کے حصول کی کوئی صورت ہوتی، مدینہ منورہ میں بڑی مشکلوں سے سورہ بقرہ اور آل عمران کئی دفعہ یاد کیں، مگر سنبھال نہ سکا اور بھول گیا، جب طائف پہنچا پھر اس کو دہرایا اور سورہ نساء، المائدہ اور الانعام یاد کرلیں، مگر جب مکہ آنا ہوا، پھر بھول گیا، کثرت اشتغال نے مہلت نہ دی کہ آگے بڑھتا یا ان ہی کی حفاظت کرتا، مالٹا پہنچ کر پھر از سر نو شروع کیا، چند دن تو وہاں کے انتظامات وغیرہ میں خرچ ہو گئے، اس کے بعد تقریباً نصف جمادی الاولیٰ سے آخر شعبان تک پندرہ پارے یاد ہو گئے، چونکہ فارغ وقت فقط ظہر کے بعد ڈھائی گھنٹے یا اس سے بھی کم ملتا تھا، اس لئے زیادہ یاد نہ ہو سکا، جب رمضان المبارک کا مہینہ آیا، حضرت

الاستاد شیخ الہند نے فرمایا کہ نوافل میں سنانا چاہیے، چنانچہ ہر شب میں تراویح کے بعد نوافل میں سنا کرتے تھے (تراویح الم ترکیف سے ہوا کرتی تھیں کیونکہ ہمارے پڑوسی عرب زیادہ دیر تک کھڑے نہیں ہو سکتے تھے) رمضان شریف کے بعد پھر آگے یاد کرنا شروع کر دیا، مگر اس مدت میں مدینہ منورہ میں والد مرحوم کی خبر وحشت اثر اور دیگر کنبہ والوں کے رنج دہ واقعات نے تشویش بہت زیادہ کی، تاہم فضل و کرم خداوندی سے تقریباً دس ماہ میں صفر تک پورا قرآن ختم ہو گیا، پھر روزانہ دور کر کے محفوظ رکھا اور دوسرے رمضان شریف میں حضرت شیخ الہند نے سن لیا"۔

بعض واعظین اور خطیب حضرات زیب داستاں کیلئے آپ کے حفظ القرآن کے قصہ کو صرف ماہ مبارک کا واقعہ بتاتے ہیں، جو سراسر غلط اور کذب ہے، یہ ایک ماہ میں یاد نہیں ہوا، دس ماہ میں ہوا اور یہی حقیقت ہے۔

شیخ الہند کی خدمت فریضہ منصبی سمجھا:

مالٹا میں دن رات برفیلی ہوائیں چلتی تھیں، رات کو باوجود یکہ ہم اپنے اپنے کپڑوں کو پہنے ہوئے دو دو کمبل اور ایک چادر اوڑھے ہوئے گدوں پر ایک کمبل بچھائے ہوئے سوتے تھے، مگر دو ڈھائی بجے رات کو شدت سردی کی وجہ سے نہ نیند آتی اور نہ اٹھنے کی ہمت ہوتی، صبح کے وقت مجبور ہو کر نماز کے لئے اٹھنا پڑتا تھا، تو خیمے سے سر نکالنا ایک عذاب الیم کا سامنا ہوتا تھا، سرد ہوا کے اس زور کے تھپیڑے لگتے تھے کہ معلوم ہوتا کہ جسم کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

عرب کیمپ میں پختہ کمروں اور مکان میں قیام ہوا اور خیموں سے نجات ملی، تاہم مالٹا کی شدید سردی میں حضرت شیخ الہند کے لئے چوبیس گھنٹے گرم پانی کا انتظام رکھنا ضروری تھا، دن میں تین مرتبہ ناشتے میں اور صبح وشام کھانے کے بعد چائے بنتی تھی، اس کے علاوہ بعض اوقات ملاقاتیوں اور دوسرے کیمپوں سے حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لئے آئے ہوئے قیدیوں کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا، روزانہ علی الصبح ناشتہ تیار کرنا اور دونوں وقت کھانا پکانا مشقت طلب مشغولیتیں تھیں، تمام ضروری خدمتوں کو انجام دینا میرا فرض منصبی تھا، ہر کام کی باگ ڈور میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، دوسرے رفقاء نے بسا اوقات معارضہ کیا او رکاموں کے بعض یا اکثر حصے اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش کی، بعضوں نے نوبت مقرر کرنے کی خواستگاری کی، مگر میں نے مخالفت کی اور یہی کہا کہ میرے فرض منصبی میں آپ لوگوں کو دخل نہیں دینا چاہیے"۔ (اسیر مالٹا صفحہ ۷۰)

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا:

حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نے حضرت مدنی کی ایک جامع سوانح "چراغ محمد" کے نام سے لکھی،

اس میں حضرت قاضی صاحب لکھتے ہیں: ''اپنے شیخ حضرت شیخ الہند کے ہمراہ جب حضرت مدنی مالٹا سے ہندوستان تشریف لائے تو یہاں کے حالات وواقعات کا نقشہ سراسر بدل چکا تھا، حضرت مدنی جب گرفتار ہوئے تو وطن آباد تھا، خاندان پھیلا پھولا ہوا اور آباد تھا، باپ بھائی بھاوجیں اہل وعیال اور گھر بار اطمینان وعافیت سے آباد تھے، زندگی کا چمن سرسبز وشاداب تھا، اب ساڑھے تین برس کے بعد رہا ہوئے تو وطن لٹ چکا تھا، گھر اور خاندان اجڑ گیا تھا، ماں باپ اہل وعیال ختم ہو چکے تھے، چالیس بیالیس سال کی عمر تھی، گھر تھا، نہ در تھا، نہ خاندان باقی رہا تھا، نہ اہل وعیال زندہ بچے تھے''۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
بہار تھی، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا

حکم شیخ کی تعمیل کو ترجیح دی:

حضرت شیخ الہند نے اپنی وفات سے پہلے حضرت مدنی کو کسی اہم کام کے لئے کلکتہ جانے کا حکم فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ خدمت میری خدمت سے زیادہ اہم اور بامقصد ہے، آپ نے بادل نخواستہ حکم کو ترجیح دی اور کلکتہ روانہ ہو گئے، شیخ الہند کے حقیقی بھتیجے مولانا راشد حضرت مدنی کو کلکتہ روانہ کرنے کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آپ نے حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے تمام جسم پر پھیرا اور دعائیں دے کر خدا حافظ کہا، حضرت مدنی جانے کے لئے مڑے، پانچ دس قدم چلے تو استاد نے شاگرد کو آواز دی سینے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا جاؤ، تم کو اللہ کے حوالے کیا، اس وقت ماحول پر عجیب کیفیت طاری تھی اور حاضرین خاص قسم کی برکات وفیوض کا وجود محسوس کر رہے تھے، اہل تصوف اپنی اصطلاح میں ایسے موقع کو نسبت خصوصی کی منتقلی کا لمحہ بیان کرتے ہیں''۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے:

حضرت مدنی کی جو کیفیت تھی، وہ بیان نہیں ہو سکتی کہ جس آقا کی خدمت میں سب کچھ نثار کر دیا، اب اس کو بستر علالت پر نہیں بستر رحلت پر چھوڑ کر جانا بہت مشکل تھا، لیکن عاشق حکم کا غلام ہوتا ہے، وہ بزبان حال وقال کہتا ہے:

ہجر اچھا ہے نہ عاشق کو وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

کچھ ایسا ہی منظر یہاں بھی تھا، جب حضرت مدنی کلکتہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچے، کچھ دن کے بعد حضرت شیخ الہند وصال فرما گئے، حضرت مدنی کو وفات کی اطلاع دی گئی، حضرت مدنی خود فرماتے ہیں:

''میں صبح کو تقریباً ۹ ربجے دیو بند پہنچا، حضرت شیخ الہند کے در دولت پر پہنچا، تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آ رہے ہیں، اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا، کلیجہ پکڑ کر رہ گیا''۔

(نقش حیات جلد ۲ رصفحہ ۲۷۲)

حاضری کی رت بدلی ہوئی تھی:

قارئین! اس کیفیت وحالت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، جو ایک ایسے جانثار، محب اور عاشق زار کو اس وقت پیش آئی ہوگی، جس نے اپنی اولاد، اپنا خاندان، اپنا آرام، اپنی جوانی جس ذات کے لئے وقف کر رکھی تھی، نہ تو اس کے آخری غسل میں شریک ہو سکا، نہ تجہیز و تکفین اور نہ نماز جنازہ میں، اردو کے ایک شاعر کی مندرجہ ذیل رباعی ایسی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے:

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل تھا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی ایک شور تھا غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتا تا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

یہ شعر بھی مناسب حال ہے:

وائے ناکامی نہ پوچھو عاشق دل گیر سے
ایک دل رکھتا تھا وہ بھی چھن گیا تقدیر سے

(تلخیص چراغ محمد ۱۳۸ تا ۱۴۲)

اب حاضری کی رت بدلی ہوئی تھی، قسمت پلٹی ہوئی تھی، دکان معرفت و مکتب علم و عرفاں بند ہو چکا تھا، مطب روحانی اجاڑ تھا، شفاء کے بجائے حسرت شفا، دوا کی جگہ یاد اور مکین کے عوض صرف مکان:

بتا تا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

بھنگی کے بجائے خود نالی صاف کر دی:

حضرت مدنی کی نیاز مندی اور سعادت مندی کی شان یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند کے یہاں سے

کسی نے فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرادو، بھنگی نہیں ملا، مگر نالی صاف ہو کر دہل بھی گئی، حضرت مدنی نے اپنے ہاتھوں سے نالی کی گندگی اور کیچڑ کو صاف کیا، یہ واقعہ طالبان علوم نبوت کے لئے باعث موعظت ہے، علم تب حاصل ہوتا ہے جب اساتذہ کے حقوق وآداب کی رعایت کی جائے، علم وحفظ کے لئے تعلق مع اللہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ وشیوخ کی خوشنودی حاصل کرنا از حد ضروری ہے کہ ان کی دعائیں موجب ترقی علم ہوتی ہے۔

بدن کی حرارت سے پانی گرم کرنا:

حضرت مدنی نے زمانہ اسارت میں حضرت استاد کی وہ خدمت کی کہ جس کی نظیر ومثال ممکن نہیں، حضرت شیخ الہند معمر اور مریض تھے، ٹھنڈا پانی استعمال کرنے سے تکلیف ہوتی تھی اور مالٹا میں بلا کی سردی پڑتی ہے، مگر گرم پانی کہاں سے آئے، حضرت استاد کو گرم پانی مہیا کرنے کے لئے مولانا مدنی عشا اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد برتن میں پانی ڈال کر پیٹ سے لگا کر ساری رات بیٹھے رہتے اور تہجد کے وقت بکمال ادب واحترام استاد محترم کی خدمت میں پیش کر دیتے، بہت عرصہ کے بعد منتظمین جیل نے گرم پانی کا اہتمام کیا تو مولانا مدنی کو استاد کی اس خدمت سے محروم ہونا پڑا۔ (بیں بڑے مسلمان)

شیخ الہند کی خدمت کی برکتیں:

مولوی ہدایت اللہ میاں چنوں ضلع ملتان راوی ہیں کہ میں نے حضرت مدنی سے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت! آپ ساڑھے چار سال حضرت شیخ کی خدمت میں رہے کہ آپ کی اس صحبت میں کوئی دوسرا حائل ہونے والا نہیں تھا؟ آپ نے اس دوران میں بہت کچھ حاصل کیا ہوگا، تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے:

مولوی صاحب! میں نکما تھا، کچھ حاصل نہیں کر سکا، میں نے پھر بار بار عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میں نے نیند پر قابو پالیا، اب جب خیال آئے، سو جاتا ہوں اور جس وقت اٹھنا چاہوں، بیدار ہو جاتا ہوں، پانچ دس منٹ کے لئے بھی سو سکتا ہوں، ارادہ کروں تو نیند آجاتی ہے، اور اس قسم کی بہت سی حکایتیں حضرت مدنی کے متعلق مشہور ہیں کہ کسی جگہ گئے، وہاں پانچ منٹ فرصت ملی، سو گئے اور خود بخود اٹھ کھڑے ہوئے، بہر حال نہ صرف نیند پر قابو پانا یہ حضرت استاد کی خدمت کرنے سے حاصل ہوا بلکہ معرفت کے وہ دریا ہضم کئے ہوئے تھے جس کا ایک جرعہ بھی بے خود کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ (بیں بڑے مسلمان)

صدیقی نسبت:

حضرت شیخ الہند کے تمام شاگردان رشید میں سے استاذ العرب والعجم، مہاجر مدینہ، وارث علوم قاسمی

شیخ الاسلام السید حسین احمد مدنی قدس سرہ کو حضرت شیخ الہند سے وہی نسبت ہے، جو (بلا تشبیہ) خلیفہ بلافصل، مزاج شناس نبوت، جانشین رسول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امام الاولین والآخرین، خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور یہ رائے ہے آپ کے ایک ہم عصر و رفیق درس حضرت میاں اصغر حسین قدس اللہ سرہ کی، جس کا اظہار انہوں نے ''حیات شیخ الہند'' میں کیا ہے۔

یہ سعادتیں حضرت مدنی کا مقدر تھیں:

اسارت مالٹا کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کلکتہ میں دارالعلوم قائم کرتے ہیں، خواہش یہ ہے کہ صدارت حضرت شیخ الہند قبول فرمالیں، مقاصد ملی کی خاطر شیخ الہند کو انکار نہیں، لیکن علالت ونقاہت مانع ہے، نتیجتاً اسی محبوب شاگرد کو اشارہ ہوتا ہے وہ تیار ہو جاتے ہیں، بقول حکیم عبدالجلیل مرحوم استاد مکرم شاگرد عزیز کو رخصت کرنے لگے تو غایت ضعف کے سبب اٹھ نہ سکے، لیٹے لیٹے حضرت مدنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے پکڑا سر پر رکھا، چوما، آنکھوں سے لگایا سارے بدن پر پھیرا۔ (الجمعیۃ نمبر صفحہ ۶۲)

بتلائیں دنیا میں کسی استاذ نے شاگرد کے ساتھ شفقت وکرم کا یہ معاملہ کیا؟ ہاں اصل قصہ یہ ہے کہ ایسا شاگرد بھی تو کسی کو نہیں ملا، یہ سعادتیں حضرت مدنی کا مقدر تھیں، مولانا مدنی اشکبار آنکھوں سے رخصت ہو گئے، استاد مکرم کی حالت کا احساس ایک طرف، امتثال امر کا معاملہ دوسری طرف، چلے تو گئے کہ حکم آقا تھا، لیکن کلکتہ پہنچنے سے پہلے حضرت شیخ الہند اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آخری لمحات کی خدمت سے محروم ہو گئے، آخری زیارت نصیب نہ ہوئی، جنازہ مقدر میں نہ تھا، لیکن کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ حسین احمد نے استاد کا آخری حکم ٹالا، شاید اس لئے قدرت کو حسین احمد پر پیار آ گیا اور اسے ہمیشہ کے لئے پہلوئے محمود میں لٹا دیا۔

حضرت شیخ الہند سے اسی نسبت وتعلق کا تو ہی صدقہ تھا کہ قاسمی ورشیدی موجہائے رحمت سے سیراب ہونے والے بھی اکابر واصاغر آپ کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے۔

شریعت وطریقت کا سب سے بڑا عالم:

یاد رہے کہ اختلاف ومخالفت میں فرق ہے، حضرت تھانوی کو حضرت مدنی سے اختلاف تھا، جس کی پشت پر دلائل تھے، مخالفت نہ تھی، مخالفت کا رنگ دیکھنا ہو تو خوارج وشیعہ کی صحابہ دشمنی دیکھیں، اختلاف کو دیکھنا ہو تو سیدنا علی ومعاویہ یا ائمہ مجتہدین کے اختلاف سامنے رکھیں، اور مسلم کے شارح علامہ عثمانی، حضرت مدنی کے سب سے بڑے سیاسی حریف؛ لیکن (للہ فی اللہ یہ کہ دنیوی مقاصد کے پیش نظر) فرماتے ہیں: ''بھائیو! اس

سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ میرے علم میں بسط ارض پر شریعت وطریقت وحقیقت کا حضرت مدنی سے بڑا کوئی عالم موجود نہیں''۔ (روایت حضرت شیخ السید محمد یوسف بنوری صفحہ ۲۸)

امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں'' انہوں نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں ان کی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اس قدر شاندار ہیں کہ ہم انہیں فراموش نہیں کر سکتے، ان کی ذات محترم تھی ان کا انتقال قومی نقصان ہے۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

میرے استاد کے جانشین:

۱-ایک مرتبہ حضرت مدنی تھانہ بھون تشریف لائے، حضرت تھانوی کا نظام العمل سامنے تھا، اس کی رو سے ملنے کا وقت نہ تھا، آپ مسجد میں لیٹ گئے، لیکن حکیم الامت قدس سرہ کو پتہ چلا، بھاگم بھاگ تشریف لائے، فرمایا کہ آپ نے کیا غضب کیا، فرمایا آنے کا وقت نہ تھا، حضرت تھانوی نے فرمایا وقت کی قیودات دوسروں کے لئے ہیں، آپ کے لئے نہیں، چنانچہ ہمراہ لے گئے، اصرار سے اپنی مسند پر بٹھایا اور فرمایا...... بھائی! آپ تو میرے استاد کے جانشین ہیں'' مزید یہ کہ ایک تھان ململ کا منگوا کر نذر کیا، حضرت شیخ الاسلام نے احتراماً سر پر رکھا، چوما اور فرمایا حضرت! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے ولائتی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے، اتنا ہی فرما پائے تھے کہ مولانا تھانوی نے وہ واپس لے کر گاڑھے کا تھان بڑے گھر سے منگوا کر نذر کیا، باہمی احترام کی اس سے بڑھ کر مثال کیا ہو سکتی ہے، نیز جانشین شیخ الہند کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا؟

۲-حضرت شیخ الہند کے خادم خصوصی، رفیق مالٹا، مولانا عزیز گل نے اپنے تعزیتی پیغام میں آپ کو جانشین شیخ الہند لکھا۔ (صفحہ ۱۱۰)

۳-حضرت العلامۃ الشیخ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے ایک خط میں آپ کو لکھتے ہیں (حضرت مدنی کے خط کا جواب لکھتے ہوئے) سچ تو یہ ہے کہ یہ مکتوب میرے نزدیک جناب محترم کی سیادت وشرافت اور جانشینی استاذ مرحوم کا مرقع ہے، آپ کے بزرگانہ اخلاق سے ہم نیاز مند یہی توقع رکھتے ہیں۔ (انوار عثمانی صفحہ ۴۹)

۴-خان عبد الغفار خاں صاحب جنہیں حضرت شیخ الہند سے باقاعدہ بیعت کا شرف حاصل ہے، اور جو بقول حضرت شیخ الہند کے خصوصی تعلق والے تھے (نقش حیات) دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے جلسہ تعزیت میں تشریف لائے اور فرمایا: ''حضرت شیخ الاسلام کے سانحہ ارتحال سے ہندوستان ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گیا اور ہم سے حضرت شیخ الہند کے جانشین جدا ہو گئے''۔ (صفحہ ۱۰۹)

۵-مولانا خورشید عالم نگینوی فرماتے ہیں کہ'' حضرت شیخ الہند کے فراق سے مرجھائے ہوئے دلوں نے

آپ کو جانشین شیخ الہند کہہ کر اور سمجھ کر تازگی حاصل کی، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد جب آپ کلکتہ سے دیوبند تشریف لائے، تو خلافت کمیٹی نے تعزیتی جلسہ میں آپ کو بطور جانشین شیخ الہند متعارف کرایا''۔(صفحہ۹۲)

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو:

حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا محمد سہول بھاگلپوری نے فرمایا، آپ جانشین شیخ الہند ہیں، حضرت مدنی نے جواباً فرمایا:

معلوم نہیں آپ مجھے کیوں جانشین کہتے ہیں، مجھ سے ہر حیثیت کے بڑے شاہ صاحب (انور شاہ کشمیری) اور مفتی صاحب (کفایت اللہ) ہیں، ان کو جانشین کہنا چاہئے، مولانا نے فرمایا:''زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو، مسلمان آپ کو حضرت کا جانشین کہتے ہیں، لہٰذا آپ ہی جانشین ہیں''۔

قصہ تو وہی ہے کہ پروردگار عالم نے اس اعزاز کا آپ کے لئے فیصلہ کر دیا، بات ملائکہ کی وساطت سے انسانی قلوب تک پہنچی، مولانا محمد سہول نے اسی کی ترجمانی فرمائی۔

۷-مولانا مفتی محمود احمد مو چھاؤنی نے بھی اسی انداز کی بات ارشاد فرمائی کہ''حضرت شیخ الہند کے انتقال کے وقت سے ہی جانشین شیخ الہند کے لقب کے نقارۂ خدا سے آوازہ بلند ہوا اور سب ائمہ وقت نے عملاً اس کا اعتراف فرمایا۔(صفحہ۱۱۸)

۸-امیر امان اللہ خان مرحوم والی افغانستان نے ایک خاص انداز کی بات فرمائی، جس کے راوی حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند ہیں:''شیخ الہند ایک نور تھے تو شیخ الاسلام اس نور کی ایک ضیاء اور چمک''۔(صفحہ۱۴)

سیرت واخلاص کے خصائص وکمالات کا مجموعہ:

جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری تحریر فرماتے ہیں:

''علم وعمل کی دنیا میں عظیم الشان شخصیات کے ناموں کے ساتھ مختلف خصائص وکمالات کی تصویریں ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، لیکن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام زبان پر آتا ہے، تو ایک کامل درجے کی اسلامی زندگی اپنے ذہن وفکر، علم وعمل اور اخلاق وسیرت کے تمام خصائص وکمالات اور محاسن ومحامد کے ساتھ تصور میں ابھرتی اور ذہن کے پردوں پر نقش ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسلامی زندگی کیا ہوتی ہے؟ تو میں پورے یقین اور قلب کے کامل اطمینان

کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسین احمد مدنی کی زندگی کو دیکھ لیجئے، اگر چہ یہ ایک قطعی اور آخری جواب ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس جواب کو عملی جواب تسلیم نہیں کیا جائے گا، اور ان حضرات کا قلب اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتا، جنہوں نے اپنی دور افتادگی وعدم مطالعہ کی وجہ سے یا قریب ہو کر بھی اپنی غفلت کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ کسی خاص ذوق ومسلک کے شغف وانہماک، یا بعض تعصبات نے ان کی نظروں کے آگے پردے ڈال دیے تھے، اور وہ حسین احمد کے فکر کی رفعتوں، سیرت کی دل ربائیوں اور علم وعمل کی جامعیت کبری کو محسوس نہ کر سکے تھے اور ان کے مقام کی بلندیوں کا اندازہ نہ لگا سکے تھے۔ (ایک سیاسی مطالعہ)

جلسہ نہ یہاں ہوا نہ وہاں:

حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، حضرت مدنی اور مولانا الیاس کے اخلاص کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں: ''ایک مرتبہ کھتولی میں تبلیغی اجتماع تھا، ہم لوگ مولانا محمد الیاس صاحب کی سرپرستی کی ہمرکابی میں کھتولی پہنچے، ریل سے اتر کر معلوم ہوا کہ ہاتھی وغیرہ آئے ہیں، اور اسٹیشن سے جلوس کی شکل میں جانا ہوگا، ہم نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ تبلیغی اصول کے خلاف ہے، جلوس سے انکار کر دیا، اور ایک معمولی یکہ پر بیٹھ کر قیام گاہ پہنچ گئے، جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی، اچانک معلوم ہوا کہ اس وقت کانگریس کا بھی جلسہ ہے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی بھی تشریف لائے ہوئے ہیں، اس کی مخالفت میں یہ جلسہ کیا گیا ہے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے تقریر بند کر دی اور فرمایا'' شیخ الاسلام حضرت مدنی تشریف لائے ہوئے ہیں، سب چل کر ان کی تقریر سنیں، یہ فرما کر اپنے جلسے کو ختم کر دیا اور اس مقام پر پہنچے جہاں کانگریس کا جلسہ ہو رہا تھا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مدنی کو جب اس بات کا علم ہوا کہ اس وقت تبلیغی جلسہ ہے اور مولانا محمد الیاس صاحب تقریر فرما رہے ہیں، تو اپنی تقریر ختم کر دی، اور لوگوں کو تبلیغی جلسہ میں شرکت کی ہدایت فرما کر دیوبند روانہ ہو گئے، جلسہ نہ یہاں ہوا نہ وہاں، دونوں بزرگ چل بسے، مگر آنے والی نسلوں کے لئے اپنے خلوص وللہیت کی ایک مثال قائم کر گئے۔ (شیخ الاسلام نمبر ۳۶)

حضرت مدنی کے یہاں دکھلاوا نام وریا اور شہرت کا کوئی تصور نہ تھا، وہ فرمایا کرتے ہم جس کے لئے کرتے ہیں وہ کام بھی جانتا ہے، نام اور انعام بھی۔

محاصرہ طائف کی فاقہ مستیاں:

شیخ الاسلام حضرت مدنی اپنے استاذ محترم حضرت شیخ الہند کے ساتھ طائف میں دو ماہ بیس یوم محصور رہے، اس مدت میں آپ حضرات کو ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا، مجاہدین کے پاس سامان خورد ونوش ختم

ہوگیا، پانی بھی ملنا مشکل ہوگیا اور تمام شہر بلبلا اٹھا، مگر ان اللہ والوں نے غریب الوطن اور مفلوک الحال ہونے کے باوجود کبھی کسی سے سوال تو کجا اظہار پریشانی بھی نہ کیا، ایک طرف فاقوں پر فاقے بیت رہے تھے، دوسری طرف اللہ والوں کی یہ ٹولی عبادات اور روحانی ترقی میں مصروف تھی، حضرت مدنی عبادات سے فراغت کے اوقات میں حضرت شیخ الہند کی خدمت میں مصروف رہتے جو پہلے سے بہت ضعیف تھے اور موجودہ مصائب نیز فاقوں سے ضعف میں مزید اضافہ ہوگیا تھا، حضرت مدنی اپنی پوری جماعت کے لئے خورد ونوش کا انتظام فرماتے اور جو کچھ روکھا سوکھا میسر آتا، اسے دسترخوان پر رکھ دیتے اور جب تمام حضرات کھانے میں مصروف ہوتے تو خود کسی بہانے سے پہلے ہی دسترخوان سے اٹھ جاتے، یا اس قدر آہستہ کھاتے کہ کھانے اور نہ کھانے میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا، یہ سب ایثار اس لئے تھا کہ استاد محترم اور دیگر رفقا بھوکے نہ رہ جائیں، بارہا ایسا بھی ہوا کہ دسترخوان بچھانے کے بعد فرمادیا کہ آپ حضرات کھائیں کیونکہ میں کھاچکا ہوں، شاید ایک آدھ لقمہ کوئی چیز کھالیتے ہوں گے، مختصر یہ کہ آپ کے اس طرز عمل سے کمزوری اس قدر بڑھ گئی کہ آواز سے نقاہت محسوس ہوتی تھی، ایک روز دوپہر کے کھانے کے وقت ایک آدھ لقمہ کھانے کے بعد جب یہ کہہ کر اٹھنا چاہا کہ میں کھاچکا ہوں تو حضرت شیخ الہند اس قدر ناراض ہوئے کہ غصہ سے کانپنے لگے، حضرت مدنی یہ کہہ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ آنکھوں میں آنسو آگئے کیونکہ استاد محترم کی ناراضگی ناقابل برداشت تھی، استاد محترم نے بھی معاملہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے غصہ ختم کردیا اور نہایت شفقت سے فرمایا کہ "حسین احمد! تم اپنے اوپر ظلم کرتے ہو اور ہمیں ظالم بناتے ہو، اس واقعہ کے بعد حضرت شیخ الہند نے دیگر رفقاء سے فرمایا کہ وہ حضرت کی نگرانی رکھیں اور ہمارے بغیر انہیں کھانا کھانے کا موقع نہ دیں۔

خودداری واستغناء:

فقروغربت کے وباوجود استغناء کا یہ عالم تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی ایک مرتبہ بہت زیادہ مقروض بھی تھے، چند دوستوں نے حیدرآباد دکن میں نواب فخر یار جنگ معتمد محکمہ فائنانس اور چند بااختیار حکام سے درخواست کرکے پانچ ہزار روپیہ حضرت کے لئے منظور کرایا، شرط یہ تھی کہ حضرت مدنی خود رقم لینے جائیں گے، جب حضرت مدنی کو یہ بات معلوم ہوئی، فرمایا مجھے ایسی ذلت کے ساتھ پانچ ہزار نہیں پانچ کروڑ بھی منظور نہیں، آپ کی ساری زندگی صبر وتحمل ورضا اور توکل کی آئینہ دار تھی۔

اصول کی پابندی:

مولانا عبدالحق مدنی کا بیان ہے کہ میرے والد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب کی یہ خواہش تھی کہ حضرت

مولانا سید حسین احمد مدنی میری تعلیم کے لئے مکان پر تشریف لایا کریں اور حسب خواہش ماہوار رقم مقرر کر دی جائے، والد صاحب نے بیحد اصرار کیا لیکن حضرت شیخ کسی طرح راضی نہ ہوئے، اور والد صاحب سے فرمایا کہ عبدالحق کو حرم شریف بھیجو، میں بلا معاوضہ اور حسبۃ للہ پڑھاؤں گا، طرفین سے اپنی اپنی بات پر اصرار ہوتا رہا، یہاں تک کہ والد صاحب نے حضرت کی خودداری واستغناء اور پابندی اصول کے سامنے سپر ڈال دی، معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اس دور کی بات ہے کہ جس زمانہ میں حضرت شیخ کا پورا خاندان جو کہ تیرہ افراد پر مشتمل تھا، تین پاؤ ابالی ہوئی مسور کے پانی پر گزارا کیا کرتا تھا۔ (تذکرہ شیخ مدنی)

صبر وقناعت:

حاجی احمد حسین لاہرپوری کہتے ہیں، برطانوی حکومت کے ایماء پر ڈھاکہ یونیورسٹی سے شعبہ دینیات کے لئے حضرت مبلغ پانچ سو روپے ماہوار پر بلائے گئے مگر حضرت نے انکار کر دیا، پھر حکومت مصر کی جانب سے جامعہ ازہر میں شیخ الحدیث کی جگہ کے لئے مبلغ ایک ہزار پانچ سو روپے ماہوار مکان وموٹر بذمہ حکومت، سال میں ایک بار ہندوستان کی آمد ورفت کے کرائے کے وعدے پر حضرت کو دعوت دی گئی، اگرچہ اس زمانہ میں حضرت کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ ملتے تھے، لیکن حضرت نے وہاں تشریف لے جانے سے قطعاً انکار فرمادیا۔ (شیخ الاسلام نمبر ۷٦)

خدا کی ذات پر اعتماد:

مولانا عبدالحمید الاعظمی لکھتے ہیں کہ حضرت کے ساتھ افطار کرتے وقت اگر کوئی کھانے پینے کی چیز اٹھا کر رکھ دی جاتی کہ مغرب کے بعد اطمینان سے کھائی جائے گی، تو حضرت خفا ہو کر فرماتے: آخر یہ کیا بری عادت ہے کہ اصحاب مائدہ کی طرح ذخیرہ کرتے ہو، جس خدا نے مغرب سے قبل یہ نعمت دی ہے وہی خدا کیا مغرب کے بعد نہیں دے سکتا، بلا آخر جب تک وہ چیز دوسرے افراد خصوصاً بچوں کو کھلا نہ دیتے آپ کو چین نہ آتا"۔ (شیخ الاسلام نمبر ۱۵۹)

سلاطین کے دربار سے مجھے کیا واسطہ:

حاجی احمد حسین لاہرپوری کہتے ہیں ۱۹۵۵ء ماہ جون میں حضرت بسلسلہ حج وزیارت حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے، میں وسط جولائی کو آخری جہاز سے روانہ ہوا، بمبئی میں ایک شناسا سے معلوم ہوا کہ ملک حجاز نے حضرت کو آپ کی پوری جماعت کے ساتھ ریاض مدعو کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کانوں تک پہنچی کہ

حضرت نے جلالۃ الملک کی دعوت کو قبول فرمالیا ہے، مجھے مسرت ہوئی کہ میں بھی حضرت کے ہمراہ ریاض جاؤں گا، مکہ مکرمہ میں جب حضرت سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنی تمنا کا اظہار کیا، آپ نے حیرت سے فرمایا کہ "مجھے سلاطین کے دربار کی حاضری سے کیا واسطہ؟ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں، سلاطین وامراء سے تعلق نہیں رکھتا ہوں، میری اس گفتگو کے بعد ایک صاحب نے بتایا کہ حکومت کی جانب سے اس قسم کی تحریک ضرور ہوئی تھی مگر حضرت اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ (شیخ الاسلام نمبر ۱۳۵)

جامع مذہب وسیاست:

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

حضرت شیخ الاسلام کی ایک خوبی علم وعمل، دین وسیاست، تصور وحقیقت، روز وشب کے معمولات اور ملی وقومی تقاضوں، واجبات دنیا وفکر آخرت کا حسین امتزاج وتوازن اور کمال جامعیت ہے، ہماری تاریخ بڑے بڑے اصحاب علم سے، عظیم مدبروں اور مفکروں سے، نہایت ذہین افراد سے، ملک وقوم کے بڑے بڑے خدمت گزاروں، نہایت دینداروں، شریف دنیا پرستوں سے، عدیم المثال شاعروں سے، سراپا عمل مجاہدوں سے، شب زندہ دار زاہد اور عابدوں اور اپنے علم وعمل سے یا اپنے ذہن کی فکر پیمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے ایک دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈالنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہی، لیکن شیخ الاسلام حضرت مدنی کے توازن وجامعیت کی شخصیت کی دید کے لئے چشم نرگس کو صدیوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی علم وعمل کی جامعیت کی مثال تھے، وہ عالم تھے، مگر صرف فکر وفلسفہ کی گتھیاں ہی نہیں سلجھاتے رہے، عملی زندگی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا، زندگی کے میدان میں ان کی شخصیت سراپا عمل نظر آتی ہے، لیکن علم وفکر کی دنیا سے ان کا رشتہ اس وقت بھی قائم تھا، دین کے واجبات اور سیاست کے فرائض میں ایک ایسا حسین توازن پیدا کیا تھا کہ خالص سیاسی ہنگاموں اور ہجوم افکار واعمال میں بھی فرائض وسنن تو کیا مستحبات بھی نہ چھوٹتے تھے، آپ کی ذات گرامی تصوف وحقیقت کا مجمع البحرین تھی، روز وشب کے معمولات میں "فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان" کی مثال تھے، حضرت دین وسیاست کی تفریق کے قائل نہ تھے، لیکن آپ کے متوازن فکر اور جامع سیرت کا کمال یہ تھا کہ قوم وملت کا ہر تقاضہ اور ہر کام اپنے وقت پر اور اپنے دائرے میں صحیح طور پر انجام پاتا۔

وہ انسان جو اپنا جی جان اور خاندان کنبہ رکھتا ہے ان کے واجبات اور ذمہ داریوں سے کیوں کر چھٹکارا پاسکتا ہے، بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کی زندگی کی ضروریات واحتیاجات بعض اوقات انسان کو فکر آخرت سے غافل بھی کردیتی ہیں لیکن ٹھیک اسی طرح آخرت کی فکر اور عبادت وریاضت کا ذوق

وانہماک بھی دنیاوی واجبات وفرائض میں غفلت اور کوتاہی کا موجب ہوتا ہے، جام شریعت اور سندان عشق سے کھیلنا اور دونوں کے حدود برقرار رکھنا، ہر مدعی اتباع شریعت اور حقوق عباد و دنیا کے فہم وادراک کا ذوق رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں رہتا، لیکن حضرت شیخ الاسلام کے لئے جام وسندان کا یہ ملاپ محض ایک کھیل تھا، حضرت کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک کامل درجے کی دینی واسلامی زندگی اور اس کے تمام ظاہری وباطنی لوازم کے ساتھ سیاست کے بحر مواج میں تختہ بندی کا عزم لے کر اترے تھے اور اس کے پانی کی ایک چھینٹ سے اسلامی شرعی زندگی کو آلودہ اور دامن تر کئے بغیر وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ (ایک سیاسی مطالعہ)

حضرت مدنی جود وسخا، توکل واستغناء، زہد وتقویٰ اور عفو ودرگزر علم وعمل، مذہب وسیاست، الغرض ہر میدان میں ایک ممتاز بلند اور نمایاں مقام رکھتے تھے، وہ ہر میدان میں رہرو نہیں رہبر تھے، ایسے باامتیاز رہبر کے اسوہ عمل کو اپنے لئے شمع راہ بنانا چاہئے۔

اہلیہ کی تدفین سے فراغت کے بعد درس بخاری:

شیخ الاسلام حضرت مدنی اکثر کوشش فرماتے کہ سبق کا ناغہ نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ کے آفتاب علم کی ضیاپاشیوں سے لاکھوں طالبان علوم حدیث کے قلوب منور ہوئے۔

داغ سادوسرا نہ دیکھو گے
گل ہزاروں ہیں ایک صورت کے

مولوی حکیم ضیاء الدین صاحب (ہردوئی) بیان کرتے ہیں کہ جب صاحبزادہ مولانا سید اسعد صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو بعد فراغت تدفین حضرت کے آستانہ پر کل اساتذہ اور عمائدین مجتمع ہوئے، حضرت نے کچھ دیر کے بعد دارالحدیث کا رخ فرمایا، مجمع میں ہلچل پڑ گئی، تمام حضرات نے سمجھایا کہ حضرت اس وقت درس ملتوی فرمادیجئے، صدمہ بالکل تازہ ہے، اور اس سے دل ودماغ کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے، مگر حضرت نے دارالحدیث میں پہنچ کر بخاری شریف کا درس شروع فرمادیا، صدر مہتمم مولانا شبیر احمد عثمانی نے جاکر دوبارہ سمجھانے کی کوشش فرمائی، لیکن صرف یہ جواب تھا کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر اطمینان قلب اور کس چیز سے حاصل ہوسکتا ہے؟۔ (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۷۵)

زندگی کے آخری اسباق:

مولانا افضال الحق قاسمی رقمطراز ہیں:

''شیخ الاسلام حضرت مدنی ۲۸ / محرم الحرام ۱۳۷۷ھ کو بخاری شریف جلد اول کا سبق پڑھا کر اٹھے تو فرمایا: ''تم لوگ سبق میں سوتے ہو اور میری ٹانگیں سوتی ہیں، اسی دن سے حضرت کی نقل وحرکت مکان تک محدود ہو کر رہ گئی اور طلباء درس کو پھر آپ کے فیض سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا، اس سال حضرت نے کل تریسٹھ سبق پڑھائے، بخاری شریف جلد اول میں ایک چلہ یعنی چالیس یوم پورے ہو گئے تھے، اور بخاری شریف جلد ثانی کے تیئس اسباق پڑھائے تھے، حضرت کی زندگی کے یہ آخری اسباق تھے، حضرت کے خلف اکبر مولانا اسعد صاحب مدنی مدظلہ کی جانفشانی اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے حسن انتظام سے شیخ الاسلام، حضرت مدنی کی سینتیس درسی تقاریر ریکارڈ کر لی گئیں، جو آنے والے طلبہ کے لئے انشاء اللہ یادگار علمی سرمایہ ثابت ہوں گی۔

درس حدیث میں خصوصیات:

شیخ الاسلام حضرت مدنی نے کئی سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیا، آپ کے حلقہ درس میں علماء کی کثرت ہوتی تھی، مدینہ منورہ میں حضرت مدنی کا طرز تدریس امعان وتعمق کا ہی ہوا کرتا تھا، اور دار العلوم دیوبند میں جب صدر مدرس اور شیخ الحدیث کی مسند سنبھالی تو ابتداء میں چھ ماہ تک بطریق امعان وتعمق حدیث کا درس دیا کرتے تھے، پھر سال کے آخری تین چار مہینوں میں بحث وحل کے طرز پر اکتفا کیا کرتے تھے، محدثین کے ہاں سماع کے دو طریقے رائج ہیں ''سماع عن الشیخ اور قراۃ علی الشیخ'' حضرت مدنی کے ہاں دونوں طریقے رائج تھے، سال کی ابتداء میں عموماً شاگردوں میں سے کوئی شاگرد حدیث پڑھتا اور حضرت مدنی حدیث کی تشریح فرما دیا کرتے اور سال کے آخر میں حضرت مدنی خود قراءت حدیث کرتے اور شاگرد سنتے رہتے، ذیل میں حضرت مدنی کے درس حدیث کی خصوصیات اور جھلکیوں کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

۱- حضرت مدنی کی تقریر بہت صاف اور اس کی رفتار بہت آہستہ ہوتی تھی، ایک ایک کلمہ اور ہر کلمہ کا ایک ایک حرف نہایت متین آواز میں زبان مبارک سے نکلتا اور سننے والے کو مطمئن کر دیتا، مشکل مقامات کو سادہ مثالوں سے حل کرتے، اسلئے ذہین طلبہ تو مستفید ہوتے، غبی طلباء بھی اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہو جاتے۔

۲- جب کسی مسئلہ میں حدیث کی توجیہ بیان کرتے اور توجیہات متعدد ہوتیں تو ان کو شمار کر کے بیان فرماتے۔

۳- سال کے ابتداء میں صحیح بخاری وجامع ترمذی میں سے ہر ایک کتاب کو شروع کرتے وقت مصنف کتاب تک اپنی سند بیان کر دیتے اس سند کے تین حصے تھے، حضرت مدنی سے شاہ محمد اسحاق تک، شاہ محمد اسحاق سے شیخ عمر بن طبرزد بغدادی تک، عمر بن طبرزد سے امام ترمذی تک۔

۴۔ حضرت مدنی اپنی تصنیف ''نقش حیات'' میں لکھتے ہیں، میں نے اپنی ہمیشہ سے یہ عادت رکھی تھی کہ جب کسی پیغمبر کا اسم گرامی آئے تو علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام یا علیہ السلام کہوں، اگر کسی صحابی کا نام تنہا آئے تو رضی اللہ عنہ کہوں، اگر سند حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آئے تو رضی اللہ عنہ وعنہم کہوں، اگر ائمہ مذاہب اور علماء، اولیاء سلف کا نام تنہا آئے تو رحمہ اللہ علیہ اور چند کا نام آئے تو رحمہم اللہ کہوں، خواہ وہ اپنے مذہب کے ہوں یا شافعی، مالکی اور حنبلی وغیرہ کے ہوں، بشرطیکہ اہل سنت والجماعت ہوں، دوران درس حدیث تصوف کے بہت سے مسائل کو بھی بیان فرماتے تھے۔

طلبہ کی ناز برداریاں:

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

حضرت مدنی یوں تو سب ہی کے لئے ہمہ وقت سراپا شفقت ورحمت تھے، لیکن دوران درس یہ صفت اپنے منتہیٰ کو پہنچی ہوئی نظر آتی تھی، طلبہ کے لئے ان کے ہر جا وبے جا سوالات نیز تک اور بے تک کے اعتراضات کے جوابات نہایت انبساط اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیتے اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی کسی خوش نصیب سے مزاح بھی فرمالیتے، خاص طور پر رات کے وقت سبق پڑھاتے ہوئے یہ وصف اتنا بڑھ جاتا کہ تھوڑے وقفہ کے بعد مجلس درس قہقہہ زار بن جاتی، خاص طور پر جب کسی طالب علم کے بارے میں حضرت کو مطلع کیا جاتا، یا وہ خود دیکھ لیتے کہ فلاں اونگھ یا سو رہا ہے، تو حضرت نہایت ظریفانہ انداز میں بآواز بلند اس طالب علم کا نام لے کر مخاطب فرماتے اور حکم دیتے کہ اٹھئے جائیے وضو کیجئے، اگر کوئی گہری نیند میں ہوتا تو اسے صدر النائمین جیسے القاب سے یاد کیا جاتا۔

طلبہ کو بھی اپنے شیخ اور ان کے درس حدیث سے عشق تھا:

بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ حضرت مدنی دور دراز کے پر مشقت سفر سے تھکے ہارے واپس آتے اور تھوڑی دیر بھی آرام کئے بغیر دار العلوم آجاتے، گھنٹہ بجتا، طلبا جمع ہوجاتے اور سبق شروع ہوجاتا، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ وہ طالب علم کس مٹی کے بنے ہوئے تھے، جو گرمیوں کے دنوں کی لو اور جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد آنے والی راتوں کی ٹھنڈی ہواؤں کو نظر انداز کرکے اور جاڑوں کے گرم گرم لحافوں کو چھوڑ کر آنکھیں ملتے اور نیند کو بھگاتے ہوئے گھنٹے کی آواز سنتے ہی شیخ کے درس میں حاضر ہوجاتے تھے، شیخ تو اپنے احساس فرض وذمہ داری سے مجبور ہوکر اپنے آرام کو تجتے تھے، لیکن ان کے شاگردوں کے دل میں کونسا جذبہ کارفرما تھا کہ وہ اپنے شیخ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی کچی نیندوں سے جاگ کر دوڑتے بھاگتے درس گاہ میں پہنچ جاتے تھے،

ایسا ہونا بلکہ بار بار ہونا کیا اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ ان کو اپنی میٹھی نیند سے زیادہ اپنے شیخ کی زیارت ان کی مصاحبت اور درس میں شرکت محبوب تھی۔

بخاری شریف متناً وسنداً یاد تھی:

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق کا بیان ہے کہ استاذ المکرم شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، ایک مرتبہ بخاری پڑھا رہے تھے کہ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری دارالحدیث میں تشریف لا کر طلباء کے ساتھ شیخ کے پس پشت بیٹھ گئے، حضرت مدنی اس وقت بخاری کی عبارت خود بھی پڑھ رہے تھے اور اس پر بحث بھی کر رہے تھے اور ان کے پاس بجائے بخاری کے قسطلانی کی باریک حروف کا نسخہ تھا جو آسانی سے نظر نہیں آتا تھا، تقریباً دو گھنٹے سبق پڑھا کر جب فارغ ہوئے، حضرت لاہوری سے ملاقات ہوئی تو فرمایا آپ محسوس نہ کریں، دارالحدیث میں آپ کی آمد مجھے محسوس نہ ہوسکی، وجہ یہ تھی کہ مجھے سبق پڑھانے کے دوران نیند آ گئی، تو اس واقعہ سے ہم نے اندازہ لگایا کہ غالباً شیخ مدنی کو بخاری متناً وسنداً یاد ہے، اگرچہ آپ نے خود کبھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ (حقائق السنن جلد ا رصفحہ ۳۴۲)

حضرت شیخ مولانا عبدالحق صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے استاد شیخ مدنی کا انداز تدریس بے حد پسند تھا، حدیث کا جو فیض اور افادہ ہمارے شیخ مدنی کے ذریعہ ہوا، اس کی نظیر نہیں ملتی، فرمایا کرتے میں نے علماء کی زیارتیں کی ہیں، کئی مدرسین علماء کے حلقہ درس میں شمولیت اور رشتہ تلمذ کی سعادتیں نصیب ہوئی ہیں، مگر جو امتیازی صفات حضرت مدنی میں دیکھے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہ آئے:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اب نہ کہیں نگاہ ہے اور نہ کوئی نگاہ میں، حدیث کی اشاعت تدریس اور خدمت کے سلسلہ میں حضرت مدنی کی مساعی سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

مشتبہ گوشت سے پرہیز:

جزیرہ مالٹا میں بہت سے مسلمان قیدی تھے، ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، حضرت مدنی اور کئی دوسرے علماء بھی تھے، قیدیوں کو جو گوشت دیا جاتا تھا، اس کے بارے میں یہ بات تقریباً یقینی سی تھی، کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ کا ذبیحہ نہیں ہے، یہ گوشت آسٹریلیا اور دیگر ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا، اور برف خانوں میں اس کے ذخائر برسوں سے محفوظ تھے، چونکہ اس کے بارے میں تقریباً یہ بات یقینی تھی کہ اہل اسلام کا ذبیحہ

نہیں ہے، اس لئے حضرت شیخ الہند وحضرت مدنی نے تمام دیگر رفقاء کے ساتھ اس کے کھانے سے کلیۃ پرہیز فرمایا، ترکی اور شامی علماء اس گوشت کو بڑے اطمینان سے استعمال کرتے تھے، کیونکہ حکام جیل نہ تو اس گوشت کو واپس لیتے تھے اور نہ حلال گوشت کے انتظام پر آمادہ ہوتے، چنانچہ بعض علماء نے کہا کہ یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ جائز ہے، اور بعض نے اپنے عمل کی یوں تاویل کی کہ ہم مضطر ہیں، اس لئے یہ گوشت ہمارے لئے حلال ہے، مگر اہل اللہ کی یہ جماعت اپنے فیصلہ پر قائم رہی، شیخ الاسلام حضرت مدنی سے بعض علماء نے بحث کی اور آپ نے ان کو بہت تشفی بخش جواب دیا لیکن پھر بھی وہ گوشت کی لذت سے دستبردار ہونے کیلئے آسانی سے تیار نہ ہوئے۔

عیسائیوں کا جسم پر تسلط ہے دل پر نہیں:

بلکہ بعض حضرات نے یہ کہہ دیا کہ ہم لوگ نصاریٰ کے قیدی ہیں، عیسائی افسران کو اگر یہ بات معلوم ہوئی تو معلوم نہیں وہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کریں، یہ سن کر شیخ الاسلام حضرت مدنی نہایت برافروختہ ہوئے اور فرمایا کہ:

''ان عیسائیوں کو ہمارے جسموں پر قابو ہے وہ ہمیں اذیتیں دے سکتے ہیں، تختہ دار پر چڑھا سکتے ہیں؛ لیکن ہمارے قلوب کو پروردگار کی اطاعت سے نہیں پھیر سکتے''۔

اس کے بعد اصل مسئلہ کی جانب رجوع کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیت تلاوت فرمائی جس میں اس ذبیحہ کی حرمت کو واضح طریقے پر بیان کیا گیا ہے، جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

ذبیحہ کی صحت کے لئے دو شرطیں:

آپ نے فرمایا کہ ''ہر حلال جانور کے ذبیحہ کی صحت کے لئے دو شرطیں ہیں: اول تو یہ کہ شرعی ذبح ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت اسم الٰہی ذکر کیا جائے، البتہ اگر ذبح کرنے والا مسلم ہے اور وہ اتفاقاً ذبح کرتے وقت تسمیہ (اللہ کا نام لینا) بھول گیا، تو حسب ارشاد نبوی ایسا جانور حلال ہے، الغرض جو حیوانات عیسائی ملکوں میں ذبح ہوتے ہیں، وہاں مذکورہ شرائط کا فقدان ہوتا ہے، عموماً بڑے شہروں میں مشین سے ذبیحہ ہوتا ہے، شیخ الاسلام حضرت مدنی کے دلائل مسکت اور تشفی بخش تھے، لیکن بعض حضرات نے یہ نکتہ اٹھایا کہ جب کسی چیز کی طہارت ونجاست کے دونوں پہلو متصور ہوں تو جب تک ایک پہلو کے بارے میں ظن غالب او ریقین حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اس پر حضرت مدنی نے فرمایا کہ ذبح کا حکم اس سے مختلف ہے۔

اللہ نے بہتری کی صورت پیدا کردی:

چنانچہ رفتہ رفتہ بہت سے قیدیوں نے یہ حرام گوشت کھانا چھوڑ دیا اور بغیر گوشت کے ہی گزارا کرنے لگے؛ لیکن اللہ تعالی نے ان اصحاب تقوی کے لئے ایک دوسری صورت پیدا فرمادی، ہوا یہ کہ مولانا وحید احمد صاحب چونکہ ترکی اور انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے، اس لئے رفتہ رفتہ افسران سے آپ کی بے تکلفی ہوگئی اور آپ نے ان کے تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس بات کی کوشش کی کہ باہر سے مرغی، کبوتر، مچھلی وغیرہ منگانے کی اجازت دیدی جائے، مگر افسران نے بتایا کہ قلعہ میں کوئی جانور ذبح نہیں کیا جاسکتا، آپ باہر سے ذبح کراکے آلائش دور کرنے کے بعد اندر منگا سکتے ہیں، مولانا وحید احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم تو اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے کھانا چاہتے ہیں، چونکہ مخالفین اور افسران قانونی پہلو سے مجبور تھے، اس لئے انہوں نے انکار کردیا مگر مولانا وحید احمد صاحب بھی اپنی دھن کے پکے تھے، اپنے موقف پر جم گئے اور دفتر انتظامات کو لکھا کہ ہم چونکہ مسلمان ہیں اور ہم مذہبی پہلو سے مجبور ہیں، لہذا گوشت ہم صرف اس شرط پر کھاسکتے ہیں جب کہ ہمیں زندہ جانور دیا جائے اور خود ذبح کریں، اسکے بغیر ہمارے لئے کسی قسم کے گوشت کا استعمال ناممکن ہے، اگرچہ اس بات کا سلسلہ طویل ہوگیا؛ لیکن انجام کار خصوصی طور پر آپ حضرات کو اجازت مل گئی، صرف اتنی قید تھی کہ جانور محافظین کے سامنے ذبح کیا جائے اور صفائی کی پوری رعایت کی جائے، یہ شرط قبول کرلی گئی اور باہر سے جانور منگا کر ذبح کرنے لگے، بہت سے لوگ جو تاویلیں کر کے حرام گوشت کھارہے تھے، وہ ان حضرات کے استقلال اور کمال تقوی سے نہایت متاثر ہوئے۔

حضرت خود مصارف ادا فرماتے تھے:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کہتے ہیں:

اگر شیخ الاسلام حضرت مدنی کی (جمعیۃ) دفتر میں تشریف آوری اپنے کسی بھی کام سے ہوتی تو یہ گوارا نہیں تھا کہ چائے یا کھانے کا انتظام دفتر کی جانب سے ہو، اس لئے یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ یہ انتظام فلاں خادم نے اپنے پاس سے کیا ہے، ورنہ حضرت خود مصارف ادا فرماتے، اب چند سال سے دہلی کے مشہور صاحب خیر جناب حاجی محمد یسین صاحب گزک والے نے یہ انتظام بڑے اصرار والتجا سے اپنے ذمہ لے لیا تھا، جب تشریف آوری کے بارے میں معلوم ہوتا مولانا وحید الدین صاحب قاسمی حاجی صاحب کو اطلاع کردیتے اور حاجی صاحب بڑے شوق سے عین سعادت سمجھ کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے اور کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

صرف ایام درس کی تنخواہ:

حضرت مولانا رشید الدین صاحب لکھتے ہیں:

حضرت مدنی ایام درس کے علاوہ دوسرے دنوں کی تنخواہ لینا ہرگز گوارا نہ فرماتے، بارہا ایسا ہوا کہ مدرسہ کے سلسلے میں سفر کرنا پڑا، مگر سوائے ایام تدریس کے ایک پیسہ بھی کسی دن کا معاوضہ نہیں لیا، حضرت مدنی نے ایام مرض میں ایک ماہ کی استحقاقی رخصت سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ دوسری چھٹیاں لیں، جن کا آپ کو قانونا حق تھا، یہاں تک کہ ان ایام کی تنخواہ جو ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہوتی تھی، جب اہل مدرسہ نے آپ کی خدمت میں بھیجی تو آپ نے یہ کہہ کر واپس فرمادی کہ:

جب میں نے پڑھایا نہیں تو تنخواہ کیسی؟؟ حضرت کے وصال کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند گھر میں تشریف لائے، اور فرمایا کہ حضرت کا کمال زہد وتقوی اس بات کو گوارا نہ کرتا تھا، کہ آپ ایام مرض کی تنخواہ قبول فرمائیں لیکن اس میں شرعا کوئی سقم نہیں بلکہ (سلسلہ مرض رعایتی قوانین کے لحاظ سے) حق ہے، لہٰذا اگر آپ قبول فرمائیں تو وہ رقم آپ کی خدمت میں پیش کردوں، مگر خالہ صاحبہ (یعنی اہلیہ شیخ الاسلام حضرت مدنی) نے فرمایا کہ جس چیز کو حضرت نے پسند نہیں فرمایا، میں اس کو کیسے پسند کرسکتی ہوں، آپ کا بہت بہت شکریہ، بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ (شیخ الاسلام نمبر ۳۱۰۰)

ارسال کردہ رقم کا حساب:

آپ کو پہلی مرتبہ باڑھ (ضلع پٹنہ) مدعو کیا گیا، تو سفر خرچ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا گیا، یہ کافی متمول مسلمانوں کی آبادی ہے، جلسہ کے بعد جب واپسی کا وقت آیا لوگوں نے ایک بڑی رقم پیش کی، حضرت نے فرمایا ٹھہریئے لوگوں نے سمجھا کہ حضرت رقم کو کم خیال کرتے ہوئے ایسا فرمایا ہے، تو فوراً اس میں اضافہ کردیا گیا، لیکن اسی اثناء میں حضرت نے بیگ سے کچھ روپے اور حساب کا کاغذ نکال کردیا اور فرمایا، آپ نے جو روپے بھیجے تھے اس کا حساب یہ ہے، اور اتنے روپے اس میں سے بچ گئے ہیں، لوگوں نے بیحد اصرار کیا کہ حضرت بچی ہوئی رقم کو واپس نہ فرمائیں، اور جو روپے پیش کیے جارہے ہیں، ان کو قبول فرمالیں، مگر حضرت نے صاف انکار فرمادیا۔ (تذکرہ شیخ مدنی صفحہ ۱۷)

غیر محرم سے نظریں بچانے کا اہتمام:

مولانا فرید الوحیدی کہتے ہیں: گھر میں ہر طبقہ کی خواتین ہر قسم کی درخواستیں اور اپنی پریشانیاں گوش گزار

کرنے کے لئے حاضر ہوتی تھیں، حضرت مدنی عموماً اہل خانہ کے واسطے سے درخواستیں سنتے اور جوابات، دعائیں، مشورے اور تعویذات مرحمت فرماتے، اور براہ راست بھی پندونصائح اور مشوروں سے مستفید فرماتے، خواتین کو بیعت کرنے کا طریقہ تھا کہ ایک لمبا کپڑا عمامہ وغیرہ کا ایک سرا خود پکڑتے اور دوسرا سرا پس پردہ خواتین پکڑتیں، پھر کلمات بیعت تلقین فرماتے، گاؤں کی خواتین کبھی کبھی اہل خانہ کی نظر بچائے ہوئے مطالعہ گاہ تک پہنچ جاتیں اور سامنے کھڑی ہو جاتیں، ایسی صورت میں حضرت مدنی بہت پریشان اور سراسیمہ ہو کر اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیتے۔ (شیخ الاسلام نمبر ۲۳۱)

مہمان نوازی:

مہمان نوازی سارے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وصف خاص تھا، ان کا طبعی جذبہ تھا کہ کوئی مہمان آئے اور اس کو کھانا کھلائیں، حضرت مدنی بھی طبعی طور پر مہمان نواز تھے، ان پر یہ وصف غالب تھا، وہ چاہتے تھے کہ سارا گھر مہمان کے حوالے کر دیں، حضرت کا طبعی جذبہ تھا کہ مہمان کی جتنی خدمت ہو سکے کی جائے۔

نجی معاملات، دفتر، کتب خانہ اور خانقاہ:

حضرت مولانا فرید الوحیدی اپنے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

مطالعہ کے لئے کوئی مخصوص کمرہ یا لائبریری نہ تھی، ایک بڑے کمرے کا درمیانی حصہ کتابوں کی الماریوں سے گھرے سے خود بخود الگ ہو گیا تھا، اس میں ایک چٹائی پر ہرن چیتل یا پہاڑی بکرے کی کھال بچھی ہوئی تھی، اور چمڑے کا ایک گاؤں تکیہ سہارے کے لئے رکھا ہوتا تھا، جس میں کھجور یا تاڑ یا ناریل کی چھال بھری ہوئی تھی، چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر ہوتے تھے، اور سامنے کاغذات کا ایک انبار ہوتا تھا، جو درخواستوں، خطوط، مضامین اور دارالعلوم کی فائلوں اور دیگر یادداشتوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس چٹائی کی ایک جانب لکڑی کے تختہ پر ایک اسٹیل کا معمولی سا بکس ہوتا تھا، جس میں چند جوڑے معمولی کھدر کے ہوتے تھے اور اسی بکس کے قریب ایک کھونٹی پر حضرت اپنی شیروانی، عبا اور عمامہ ٹانگ دیا کرتے تھے، یہی مطالعہ کا کمرہ حضرت کا عبادت خانہ بھی تھا، تہجد و نوافل یہیں ادا فرماتے اور اسی جگہ ذکر و مراقبہ میں مصروف ہوتے، اس مطالعہ گاہ کی ایک جانب حضرت کی چارپائی تھی اور دوسری جانب وضو کی چوکی، ہمارے بچپن کے دور میں چارپائی پڑی رہتی تھی، اور چٹائی ہی پر استراحت فرمایا کرتے تھے، مگر کم و بیش پندرہ برس سے تقریباً تین گھنٹے کے لئے یہ چارپائی استعمال میں آنے لگی تھی، مگر چارپائی پر آرام کے یہ تین گھنٹے مسلسل نہ تھے، بلکہ دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ

گھنٹہ اور رات کو ساڑھے بارہ یا ایک بجے کے بعد تقریباً ڈھائی گھنٹوں پر مشتمل تھے، گھر کے افراد میں سے جس کو کچھ عرض کرنا ہوتا وہ مطالعہ گاہ میں حاضر ہوتا اور حضرت ہمیشہ اسے وظیفہ پڑھتے، مطالعہ کرتے یا کچھ تحریر فرماتے ہوئے ملتے، بچے تو آواز دے کر اور "ابا جی یا دادا میاں" کہہ کر مخاطب کر لیتے تھے، مگر ہم لوگ یا حضرت دادی صاحبہ کھڑی رہ کر انتظار کرتیں کہ حضرت متوجہ ہوں تو عرض مدعا کیا جائے، عموماً سر اٹھا کر دریافت فرماتے کہ کیوں آیا ہے؟ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انتظار بسیار کے بعد ہمیں واپس آنا پڑتا، گھر میں بلا ضرورت کسی سے گفتگو نہ فرماتے اور جب گفتگو کرتے بہت ٹھہر ٹھہر کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح بولتے جیسے روزمرہ کی زبان آتی ہی نہ ہو، بچوں سے البتہ کبھی کبھی خوش طبعی اور مزاح کی گفتگو فرمالیا کرتے تھے، جس میں ہم نوجوانوں کو بھی شریک کر لیتے تھے۔

ایثار وفیاضی اور مہمان نوازی:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

ناظرین نے ایثار وفیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے، خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں؛ لیکن حضرت مدنی کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا، اس کی مثال تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

حضرت مدنی کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی حضرت کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا، وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، بیسیوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے حضرت کے یہاں مہمانوں کا اوسط روزانہ چالیس پچاس سے کم نہ رہتا تھا، ان میں ایک خاص تعداد تو اہل طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لئے دور و قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے، ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت وملاقات کے لئے یا کسی معاملہ میں دعا کی درخواست کے لئے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت کی سفارش حاصل کرنے کے لئے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے، ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے، جو ذکر وشغل اور روحانی تربیت کے لئے کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے۔

جو مہمان کا دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا:

اور میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت کی اس فیاضی اور مہمان نوازی

سے بے جا فائدہ اٹھانے والے بھی ہوتے تھے، میں نے واقفین سے سنا ہے کہ قرب وجوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانہ یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہمان نوازی کرتے تھے، بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں ہی کی طرح اس کا اکرام کیا جائے، مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انہوں نے ایسے ہی ایک صاحب سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت غصہ ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔

اکرام ضیف کا ایک حیرت انگیز واقعہ:

اگر کبھی کوئی شخص مہمان کے ساتھ بد خلقی سے پیش آیا اور آپ کو علم ہوا تو انتہائی غضبناک ہوئے، ایک مرتبہ ایک صاحب تقریباً دو ماہ مقیم رہے، نہ نماز پڑھتے، نہ حضرت کی مجالس میں شریک ہوتے، خادم مہمان خانہ نے ان سے کہا کہ تم دو مہینے سے مقیم ہو نہ حضرت کے سامنے اپنا مقصد پیش کرتے ہو اور نہ ہی نماز پڑھتے ہو، اگر یہاں آنے سے تمہارا کوئی مقصد نہیں ہے تو جاؤ اپنا گھر بار دیکھو، اتفاق اور سوئے قسمت سے جس وقت خادم نے یہ گفتگو کی اس وقت میں بھی وہیں موجود تھا، بات رفت وگزشت ہوگئی اور وہ مہمان رخصت ہو گئے، ہمارے ذہن سے بھی واقعہ نکل گیا، مہینوں کے بعد حضرت کو یہ واقعہ کسی طرح معلوم ہوا، حضرت کی خدمت میں راقم الحروف حاضر ہوا تو آپ مطالعہ میں مصروف تھے، جوں ہی مجھ پر نظر پڑی، مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا، مہمان سے یہ کس نے کہا کہ چلے جاؤ، مردک، گدھے، تو اسی لئے پیدا ہوا تھا؟؟ یوں عموماً حضرت مجھے مختلف باتوں پر تنبیہ فرمایا کرتے تھے، لیکن جب کبھی تنبیہ زبان وبیان کی حد سے گزر کر دست مبارک تک پہنچنے والی ہوتی، پہلی ہی نظر اس کا اندازہ ہو جایا کرتا تھا، آج جوں ہی حضرت نے میری جانب نگاہ اٹھائی، مجھے فوراً صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور نہایت صفائی کے ساتھ اپنا بے قصور ہونا ثابت کرنا شروع کر دیا، تو وہاں موجود تھا، تو نے روکا نہیں، میں نے جرأت کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ مہمان دو ماہ سے مقیم تھے، تارک صلوۃ تھے، اس لئے میرا خیال تھا کہ صوفی جی کچھ بے جا نہیں کر رہے ہیں، فرمایا:

تارک صلوۃ ہمارا نہیں خدا کا قصور وار ہے، اس پر ان کو سمجھانا چاہئے تھا، اور کوئی مہمان دو ماہ رہے چاہے سو ماہ رہے، کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھے، یہ نہ سمجھنا کہ میں سفر پر رہتا ہوں مجھے علم نہیں ہوتا، اگر کسی نے مہمانوں کو تکلیف پہنچائی تو میں قیامت کے دن دامن گیر ہوں گا۔

مہمانوں کی خدمت اور کمال وسعت ظرف:

مہمانوں کے لئے نہ کوئی وقت تھا اور نہ قاعدہ، جس وقت بھی مہمان آتا، گھر میں جو کچھ موجود ہوتا، مہمان کے سامنے لاکر رکھ دیا جاتا، عالم، جاہل، شہری دیہاتی غرض کہ ہر قسم کے مہمان آتے، آپ نہایت خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کرتے اور ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، ایک مرتبہ ایک مہمان آیا جس کے کپڑوں سے تعفن کے بھپکے اٹھ رہے تھے، اور ان میں بے شمار جوئیں بھی تھیں، مہمان خانے میں کوئی بھی اس کو اپنے پاس بھٹکنے نہ دیتا، لیکن کھانے کے وقت حضرت جب مہمان خانے میں تشریف لائے تو اسے اپنے برابر بٹھا کر کھانا کھلایا اور کھانے کے بعد منہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے اپنا تولیہ عنایت فرمایا، قریب بیٹھنے کی وجہ سے حضرت کے کپڑوں پر بھی جوئیں چڑھ گئیں، جن کو آپ نے اندر تشریف لے جا کر صاف کر دیا۔ (انفاس قدسیہ)

ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی:

جناب مولانا فیض اللہ صاحب فیض آبادی مجاز حضرت مدنی اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں، یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب کہ موصوف دورۂ حدیث میں تھے، اور دارالحدیث کی آمد و رفت کے وقت راستے میں حضرت مدنی کو لالٹین دکھانے پر مامور تھے، ان کا بیان ہے کہ درس سے فارغ ہو کر ایک دن حضرت نصف شب کے قریب مکان تشریف لائے تو مہمان خانے میں دیکھا کہ ایک صاحب بہت خستہ حال اور بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں، حضرت نے مجھ سے یہ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ جب سارے مہمان سو رہے ہیں، وہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ مجھ سے یہ فرما کر حضرت خود ہی ان صاحب کی طرف بڑھے اور دریافت کرنے پر جب یہ معلوم ہوا کہ انہیں کسی نے دسترخوان سے اٹھا دیا اور ان کے حصے میں کوئی لحاف وغیرہ بھی نہیں آیا ہے، تو حضرت بے حد متاثر ہوئے، بار بار دریافت فرماتے تھے کہ کس نے یہ حرکت کی ہے؟ مگر کچھ پتہ نہ چلا، الغرض حضرت فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور خود کھانا لئے ہوئے باہر تشریف لائے اور اس وقت تک باہر بیٹھے رہے، جب تک کہ مہمان کھانے سے فارغ نہیں ہو گیا، سارے مہمان اور اہل خانہ سو چکے تھے، حضرت اندر تشریف لے گئے اور اپنا بستر اٹھا لائے، اس کو بچھوا دیا اور خود ساری رات عبا اوڑھ کر گزاری، مولانا فیض اللہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے بہت اصرار کیا اور چاہا کہ اپنا بسترہ لے آؤں اور حضرت آرام فرمائیں، مگر آپ نے کسی طرح یہ بات گوارا نہ فرمائی۔ (شیخ الاسلام نمبر ۲۹۳)

برابری کا برتاؤ کرتے صرف حضرت مدنی کو دیکھا:

سیتارام جی ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، حضرت مدنی کے ساتھ جیل میں کچھ وقت گذرا، اپنے چشم

دید حالات بیان کرتے ہیں:

بھائی بھائی برابر ہیں، یہ کہتے ہوئے بہتوں کو سنا ہے؛ لیکن برابری کا برتاؤ کرتے صرف مولانا مدنی کو دیکھا ہے، کھانا پکاتے وقت باورچی باورچی رہتا تھا، آپ کی حیثیت مالک کی ہوتی تھی لیکن کھانا کھاتے وقت باورچی و مالک ایک ہوتے تھے، یہی نہیں بلکہ حضرت مدنی کو صرف ایک پاؤ گوشت ملتا تھا، لیکن کھانے کے وقت جو بھی آ کر کھاتے وقت بیٹھ جائے، اس کو حصہ مل جاتا تھا، پتہ نہیں تھا کہ جیل میں کب تک رہنا پڑے گا لیکن اگر کوئی معمولی قیدی کھانے کے وقت آ گیا تو اس کا کھانا اور اپنا کھانا ملا کر اس کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے، تندرستی گرنے لگی تو میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنی اپنا کھانا تقسیم کر دیتے ہیں، اس لئے تندرستی گرتی جارہی ہے، ڈاکٹر نے پہلے تو یہ کہا کہ میں کیا کر سکتا ہوں، قاعدہ یہی ہے کہ صرف پاؤ بھر گوشت دیا جائے لیکن جب دوسرے دن آ کر معائنہ کیا تو صحت میں انحطاط دیکھ کر پاؤ بھر گوشت کا اضافہ کر دیا لیکن اسی کے حساب سے حضرت مدنی کا خرچ بھی بڑھ گیا اور پہلے سے بھی زیادہ لوگ کھانے میں شریک ہونے لگے۔

کیا سب مہمانوں کے لئے انتظام ہو جائے گا:

ایک مرتبہ رمضان شریف میں آپ سے عرض کیا گیا کہ آج کل گرمی اور خشکی زیادہ ہے، سحری میں کچھ دودھ نوش فرمالیا کریں، آپ نے دریافت کیا کہ کیا سب مہمانوں کے لئے دودھ کا انتظام ہو جائیگا۔

چونکہ ٹانڈہ میں اس قدر زیادہ دودھ کی فراہمی دشوار تھی، لہٰذا یہ طے پایا کہ سحری میں چاول یا کھیر وغیرہ تیار کرادی جائے اور اسی میں دودھ وغیرہ ڈال دیا جایا کرے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور حضرت بھی سحری میں سب کے ساتھ وہی چاول کھیر استعمال فرماتے۔ (انفاس قدسیہ)

شیخ الاسلام حضرت مدنی ہمیشہ نبوی اخلاق پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش فرماتے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حد سے زیادہ مہمان نواز تھے، بلکہ مہمان نوازی عرب کا شیوہ تھا، حضرت مدنی بھی اخلاق نبوی کا پرتو اور مجسمہ تھے۔

نماز میں استغراقی کیفیت:

شیخ الاسلام حضرت مدنی نے ایک مرتبہ میرٹھ اسٹیشن پر نماز مغرب شروع فرمائی، نماز کی نیت باندھی ہی تھی کہ گاڑی نے سیٹی دیدی، بہت سے حضرات نیت توڑ کر گاڑی میں سوار ہو گئے؛ لیکن حضرت نے بہت اطمینان سے نماز ادا فرمائی، اور دعا مانگ کر گاڑی میں سوار ہوئے، خدام میں سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت! ہم لوگوں کو سیٹی کی آواز سن کر اس قدر بے تابی کیوں ہو گئی تھی؟ حضرت نے فرمایا:

''بھائی! اگر میں بھی کبھی سیٹی کی آواز سنتا تو میرے بھی ایسی ہی حالت ہو جاتی، کسی نے خوب کہا ہے:

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
تیرے ذکر سے، تیرے شکر سے، تیری یاد سے تیرے نام سے

آج عملی زندگی میں دینیات، دینی فکر، دینی ذہن، اسلامی معاملات اور اسلامی معاشرت متروک ہو چکی ہے، صرف نماز باقی رہ گئی تھی، مگر مسلمانوں نے اسے بھی طاق نسیاں پر دے مارا ہے، بہت سے فقیر، بہت سے پیر زادے، اور بہت سے صاحبزادے تارک الصلوۃ ہو کر بھی مرجع خلائق ہیں، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری فرمایا کرتے، لوگ منزل گاہ قرب کے نزدیک صرف اس وقت جا سکتے ہیں جب نماز میں مکمل فرماں برداری کریں............۔

جذب و جنوں کا راستہ نکلا قریب کا
کیفی حرم کی راہ طوالت کی راہ تھی

تراویح میں حفص کی قراءت:

حضرت مولانا عبدالحمید اعظمی فرماتے ہیں: ''شیخ الاسلام حضرت مدنی کے پیچھے تراویح پڑھنے میں ہم نے یہ عجیب بات دیکھی کہ حضرت مرحوم ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ الرحمان الرحیم بھی جہراً پڑھتے، چند روز تک مسلسل دیکھنے کے بعد آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور دریافت کر بیٹھا، فرمایا: ''میں تراویح میں حفص کی قرأت پر عمل کرتا ہوں، ان کی تحقیق یہ ہے کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہر سورۃ کا جزو ہے، اس لئے فرائض میں ایسا کرنے سے احتیاط کرتا ہوں، مگر نوافل میں حفص کی تحقیق پر اس لئے عمل کرتا ہوں کہ ان کے نزدیک بھی پورا قرآن کریم ختم ہو جائے، ورنہ خواہ مخواہ ایک ایک آیت ہر سورۃ میں تلاوت سے رہ جائے گی، اور اس طرح کچھ لوگوں کے نزدیک پورا قرآن شریف ختم نہ ہو سکے گا''۔

پھر فرمایا ''مجھے حیرت ہے کہ لوگ ''بسم اللہ مجریھا و مرسا ھا'' میں تو حفص کی قرأت کا لحاظ کرتے ہوئے عام قاعدہ کے خلاف پڑھتے ہیں، پھر بسم اللہ کی جہراً قرأت اور وہ بھی نوافل میں کیوں تامل کیا جاتا ہے، بہر حال تراویح میں پورے قرآن کے ختم کے خیال سے حفص کی تحقیق پر عمل کرتا ہوں، اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی''۔ (مولانا مدنی کا رمضان صفحہ ۱۷۳)

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، پڑھتے جایئے اور نیکیاں سمیٹتے جایئے، افسوس ہم صبح اٹھتے ہی اخبار پڑھتے ہیں، چائے نوشی میں لگ جاتے ہیں، رات گئے تک کہانیاں، ڈائجسٹ، میگزین اور کیا کیا پڑھ جاتے ہیں، لیکن قرآن مجید کی تلاوت کا ذوق ہم میں موجود نہیں، اگر ایک پارہ ہم روزانہ پڑھیں، تو نیکیوں کے کتنے خزانے

ہمارے ہاتھ لگ سکتے ہیں:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

محبت اور اتباع سنت:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

اس عاجز نے اس باب میں حضرت مدنی کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنی نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتی کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت کو جو خاص قلبی تعلق تھا، جس کا اظہار اپنے موقع پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا، اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

روزمرہ کے اعمال میں سنت کی پابندی:

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے، تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی، اس سلسلہ میں بعض عادات اور روزمرہ کی بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا، جن سے اندازہ ہوسکے کہ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی، اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے) سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتنے میں پڑتے، حتی کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔

گفتگو میں اتباع سنت:

ایک مرتبہ حضرت مدنی نے درس بخاری کے دوران ارشاد فرمایا کہ:

''بفضلہ تعالی میں بسرعت تقریر کرسکتا ہوں، لیکن یہ توقف فی الکلام (ٹھہر ٹھہر کر بولنا) بہت مشقت کے بعد حاصل کیا ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تیزی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے جیسے کہ تمہاری زبان چلتی ہے، بلکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے کہ جو شخص آپ کے پاس ہوا سے محفوظ ہو جائے۔

خلاف وضع مسنون دعوت طعام سے انقباض:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب راوی ہیں: حضرت مولانا آزاد کی وزارت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ آپ نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز اور ان کے چند مخصوص خدام کو کھانے پر مدعو فرمایا، کھانے کا انتظام میز پر تھا، حضرت مدنی نے کھانا تو تناول فرمالیا مگر طبیعت منقبض رہی، اور صرف یہی نہیں بلکہ ایک لطیف انداز میں اس جانب اشارہ بھی فرمایا، اب حضرت مولانا آزاد کی حساس طبیعت کو ملاحظہ فرمائیے کہ کچھ دنوں کے بعد موصوف نے دوبارہ دعوت کی، اور ان تمام حضرات کو مدعو کیا، جنہیں پہلی مرتبہ دعوت دی تھی، اس بار آپ نے کھانے کا انتظام فرش پر کیا۔ (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۳۱۶)

عزیمت واستقامت:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت مدنی میں جہاں تواضع وخاکساری اس درجہ کی تھی ، اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے ، پھر کسی کا کہنا، سننا، کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضگی، کسی کی تحسین یا ملامت، حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا، اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں''۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارہ میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انہوں نے اپنالیا تھا، جن لوگوں کو ماضی کے واقعات بھولے نہیں ہیں، انہیں یاد ہوگا کہ حضرت کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت وآبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی، حضرت کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط، غیر متزلزل اور پرجوش پایا گیا۔ (تحدیث نعمت)

عزیمت وحمیت:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: ''راقم کی کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنہوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے، ایک عزیمت دوسری حمیت، عزیمت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آپ نے علماء اور اہل درس کے حلقہ سے باہر قدم نکالا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، جو وقت کا اہم مسئلہ تھا اور عین انگریزی حکومت کے عروج کے زمانے میں جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، اعلان کر کے ''کلمۃ حق عند سلطان جائر'' کے افضل جہاد کا شرف حاصل کیا، مالٹا میں اسیری کے دن گزارے اور ہندوستان کی جیلوں میں مہینوں رہ کر سنت یوسفی ادا کی اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مقابلے

میں برسوں سینہ سپر رہے، یہاں تک کہ آپ کا مقصد پورا ہوا۔

پھر یہ عزیمت آپ کی پوری زندگی میں نمایاں ہے، فرائض کی ادائیگی، نوافل و مستحبات کی محافظت، مخالف ماحول میں معمولات کی پابندی، اس زمانہ میں بڑی استقامت ہے، وعدوں کے ایفاء دور دراز کے جلسوں اور اجتماعات میں شرکت اور اس کے لئے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا مستقل عزیمت ہے، پھر اس کے ساتھ دارالحدیث کے اسباق کی پابندی اور کتابوں کی تکمیل ایک مستقل مجاہدہ، مہمانوں کی میزبانی اور مختلف الطبائع اشخاص کے ساتھ ضیافت و اکرام کا معاملہ اور ان کی مزاجی خصوصیات کا تحمل مستقل جہاد، پھر مریدوں کی تربیت اور نگرانی، کثیر التعداد خطوط کا جواب دینا، اور سب اس ضعف و پیری اور مصروفیت میں، یہ سب آپ کی غیر معمولی عزیمت و علو ہمت کی دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں "ان اللہ یحب معالی الامور ویکرہ سفسافہا" (اللہ تعالی ہمت اور عزیمت والے اونچے کاموں کو پسند فرماتا ہے اور فروتر اور بے سود اعمال و حرکات کو ناپسند فرماتا ہے) پر عمل کر کے دکھایا۔

اسی طرح حمیت بھی آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی، جب تک انگریز اس ملک سے نہیں چلے گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کرتی رہی تھی، اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد سرگرم رکھے ہوئے تھی، اور اسی نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی، جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش و ولولہ کے ساتھ پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے اور الفاظ نہیں ہیں بلکہ شرارے ہیں جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں۔

انتقام کے سفلی جذبات سے نفرت تھی:

حضرت مدنی کی سیرت کا بڑا عنصر اور جوہر معافی تھا، انہوں نے اپنے قلب و ذہن کو انتقام کے سفلی جذبات سے پاک کر لیا تھا، جن لوگوں نے حضرت مدنی کو تکلیفیں پہنچائیں، حضرت نے ان کے ساتھ بھی احسان، کرم، مہربانی اور عفو کا معاملہ کیا، ہمیشہ ان کی نفع رسانی اور خدمت کی فکر میں رہتے، براہ راست بھی اگر آپ کے مخالفین کو ضرورت پڑی تو ان کی ضرورت پوری کی، اپنے معاندین کو صرف معاف ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے لئے دعائیں بھی کرتے:

ہر کہ مارا یار نہ بود اورا یار باد
ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد

ہر کہ در راہ منم خارے نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد گلزار باد

سپرنٹنڈنٹ جیل کو معاف کردیا:

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

۲۴رجنوری ۱۹۴۳ء کو حضرت نینی جیل الہ آباد میں داخل کیے گئے، مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری، مولانا عبدالحئی صاحب، عبدالمجید صاحب، مولانا عبدالقیوم صاحب لکھنوی، مولانا عبدالباری صاحب عباسی جیسے احباب بھی وہاں موجود تھے، یہ حضرات یکے بعد دیگرے رہا ہوتے رہے، مگر شیخ الاسلام حضرت مدنی تقریباً ۱۹رماہ جیل میں محبوس رہے۔

یکم نومبر ۱۹۴۳ء کو مغرب کے وقت سپرنٹنڈنٹ جیل نے حضرت کے ساتھ گستاخانہ حرکت کی، محض اس لئے کہ گنتی کے لئے جس قدر عجلت سے وہ طلب کر رہا تھا اتنی عجلت سے حضرت اس کے حکم کی تکمیل نہ کر سکے، سپرنٹنڈنٹ جیل کی بیہودگی سے جیل کے تمام نظر بند برافروختہ ہو گئے اور جب یہ خبر شدہ شدہ باہر پہنچی تو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور اگرچہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اگلے ہی دن اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے تیسرے روز حضرت سے معافی مانگ لی، مگر جیل سے باہر تمام ملک میں ایجی ٹیشن بڑھتا رہا، چنانچہ ۲۶رنومبر ۱۹۴۳ء کو تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے کیے گئے۔

بالآخر ۲۷رنومبر کو ہندوستان ٹائمز میں گورنر یوپی کا ایک ''کمیونکے'' شائع ہوا، جس میں اس واقعہ کی توجیہ کرتے ہوئے ذکر کیا گیا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے مولانا کے سامنے اظہار افسوس کیا اور اب مولانا افسران جیل سے مطمئن ہیں؛ لیکن حضرت کے متوسلین کے لئے یہ کمیونک بھی اطمینان بخش ثابت نہ ہوا، ان کا اصرار تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو برطرف کیا جائے، حضرت کے محبین نے اس پر دعوی دائر کرنے کی تیاری بھی کر لی تھی، لیکن حضرت کا ایک پیغام پہنچا کہ ہم نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو معاف کر دیا ہے، اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، حضرت کے اس پیغام کے بعد تمام خدام کو اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔

ایک مرید کے غلط اعتراض پر صبر وتحمل:

ٹانڈہ کا واقعہ ہے، رمضان المبارک کا زمانہ تھا، حضرت کا ایک مرید جناب قاری اصغر علی صاحب کے پاس پہنچا اور جا کر کہنے لگا کہ حضرت ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' غلط پڑھتے ہیں، یہ سن کر قاری صاحب بہت خفا ہوئے اور اس سے کہا کہ تم کیسے مرید ہو کہ پیر پر بھی اعتراض کرتے ہو، اس کے بعد اس سے دریافت کیا کہ کیا

تم نے شاطبیہ، سراج القاری وغیرہ تجوید کی کتابیں پڑھی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، تب قاری صاحب نے فرمایا کہ پھر اعتراض کیوں کرتے ہو؟۔

اس کے بعد موصوف نے حضرت سے عرض کر دیا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ قرآن شریف غلط پڑھتے ہیں، حضرت نے عشاء کی نماز کے بعد فرمایا کہ بھائی! میں نے کسی قاری سے باقاعدہ نہیں پڑھا ہے اور نہ میں کوئی قاری ہوں، البتہ میں قرآن شریف قرائے حرمین شریفین کے طرز پر پڑھتا ہوں، یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو پوری خانقاہ سر پر اٹھالیتا اور جاسوسوں کے ذریعہ معترض کو تلاش کر کے ایسی سزا دیتا کہ توبہ بھلی، حضرت نے اس اعتراض پر ادنی سی ناگواری کا اظہار بھی نہیں فرمایا اور نہایت انکساری کے ساتھ جوبات تھی سب کے سامنے ظاہر کر دی۔ (انفاس قدسیہ مع حذف واضافہ)

کھجوریں اور زمزم تو لیتے جایئے:

آخری حج سے آپ کی واپسی ہوئی تو اس موقع پر ایک دن بعد نماز ظہر مہمان خانے میں تشریف فرما تھے کہ مظفر نگر کے ایک ڈاکٹر صاحب بغرض ملاقات تشریف لائے، جب کافی دیر انہیں بیٹھے ہوئے ہوگئی تو انہوں نے حضرت کو اپنی جانب متوجہ کیا، حضرت نے فوراً انہیں داڑھی کے سلسلہ میں ٹوکا اور نصیحت فرمائی، انہیں یہ بات ناگوار گزری اور (جھنجلا کر) نہایت اونچی آواز سے کہا کہ مولانا آپ کو کیا معلوم کہ ہمیں کس قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ اس داڑھی کے نہ ہونے کی وجہ سے جان بچی ہے، یہ کہہ کر وہ چل دئے، مگر حضرت نے فرمایا کہاں جاتے ہیں؟ کھجوریں اور آب زمزم تو لیتے جایئے: اور فوراً ہی یہ دونوں چیزیں باصرار عنایت فرمائیں، کوئی دوسرا ہوتا تو مکان سے نکال دیتا، مگر حضرت نے ان کی بدتمیزی کے باوجود وسعت اخلاق میں فرق نہ آنے دیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مقدمہ مکتوبات جلد ثانی میں تحریر فرمایا ہے کہ ''حضرت نے جمعہ کی نماز ایک جامع مسجد میں ادا فرمائی، اس مسجد کے خطیب صاحب حضرات دیوبند کی تکفیر کرنے والوں میں سے تھے، انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض بزرگوں کے متعلق بہت کچھ کہا، مولانا سنتوں سے فارغ ہو کر خاموش بیٹھے تھے، نماز ہوئی اور پھر خاموش تشریف لے آئے، سفر کے اختتام تک کہیں بھول کر بھی خطیب صاحب کا تذکرہ نہیں کیا۔ (انفاس قدسیہ)

شیخ الاسلام حضرت مدنی جس چیز میں ممتاز تھے وہ ان کی بلند حوصلگی ہے، ہر تکلیف، مصیبت، پریشانی، دکھ، بیماری اور ناگوار واقعات کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، حضرت مدنی صبر وتحمل کے پہاڑ تھے،

انہوں نے کبھی مخالفین، حاسدین اور معاندین کا گلہ تک نہیں کیا، گالی کے جواب میں پھول برسائے، غصے کے مقابلے میں خندہ پیشانی سے پیش آئے، وہ اخلاق کریمانہ کا مظہر اتم تھے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

حسین احمد کا سر آپ کے سروں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے:

حکیم عبدالرشید صاحب بریلی رقم طراز ہیں: "دسمبر ۱۹۴۵ء کا پر آشوب دور تھا، مسلم لیگ کی تحریک کانگریس کے مقابلہ میں شباب پر تھی، حضرت کانگریس کی حمایت میں بریلی تشریف لائے ہوئے تھے، اور اہالیان بریلی کو اپنے تدبر سے راہ راست پر لانے اور آئندہ خطرات سے آگاہ فرمانے کے لئے عوام کو خطاب کرنا چاہتے تھے، اس وقت کا جو دلخراش منظر میری آنکھوں نے دیکھا اس کا مختصر سا خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں، شہر کے مرکزی حصے موتی پارک میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا، گلی گلی اور کوچہ بکوچہ اعلان ہو چکا تھا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شام کو بعد مغرب موتی پارک میں تقریر فرمائیں گے۔

چنانچہ مقررہ وقت پر موتی پارک سامعین سے پر ہو چکا تھا، اور حضرت ممدوح کا انتظار ہو رہا تھا کہ یکا یک حضرت تشریف لے آئے، شہر کے بعض معززین بھی حضرت والا کے ساتھ، یہ خادم دیرینہ بھی ہمرکاب تھا، پارک سے باہر مسلم لیگ کے حامیوں کا ایک زبردست ہجوم تھا، جنہوں نے اپنے مخالفانہ اور معاندانہ فلک شگاف نعروں سے مولانا موصوف کو تقریر سے باز رکھنے کی انتہا کوشش کر رکھی تھی لیکن حضرت نے اس قسم کے معاندانہ نعروں کی کوئی پروانہ کی، اور تلاوت کلام پاک سے جلسہ کی کارروئی کا آغاز ہوا، حضرت نے آیت کریمہ "وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھٰذا القرآن والغو فیہ لعلکم تغلبون" تلاوت فرمائی جو موقع اور محفل کے مطابق تھی، اور اس کا ترجمہ کر کے تقریر کا سلسلہ شروع فرمادیا۔

اس دوران میں مخالفین نے انتہائی بداخلاقیوں کا مظاہرہ کیا، تارکول کے خالی ڈرم اور ٹین کے کنستر پوری قوت کے ساتھ بجا رہے تھے، سڑک پر پڑے ہوئے کیلے کے ڈنٹھل وغیرہ حاضرین جلسہ پر پھینکے، جب ان کی تمام حرکات کا بھی کوئی اثر نہ لیا گیا تو ان ناعاقبت اندیشوں نے سنگ باری شروع کردی، اتفاق سے اس وقت کہ اس زمانہ میں پارک کی چاروں جانب پتھروں کے انبار لگے ہوئے تھے، کیونکہ سڑک پر کوٹنے کے لئے پتھر جمع کیا گیا تھا، وہی مخالفین کے لئے میگزین بن گیا، جسے بے دریغ پرامن جلسہ گاہ پر برسا رہے تھے، اگرچہ پولیس کی پوری طاقت اور محکمہ پولیس کے تمام افسران موقع ہی پر موجود تھے، مگر ضلع کے افسران اعلیٰ کی ذہنیت

بھی لیگی اثرات سے مسموم تھی، اس لیے پولیس کا وجود اور عدم وجود برابر تھا، بلکہ پولیس کی چشم پوشی سے مخالفین کی حوصلہ افزائی ہورہی تھی، آخر تا بکے؟ حاضرین جلسہ مضروب ہوئے اور مجمع منتشر ہونے لگا، حضرت مدنی کے جانثاروں نے چاہا کہ موصوف کے اوپر کوئی سایہ کرلیں، تاکہ آپ کا جسم مبارک محفوظ ہوجائے لیکن اس پیکر صبرواستقامت نے لوگوں کو اپنے اوپر سایہ کرنے سے روک دیا اور انتہائی محبت وشفقت سے فرمایا کہ حسین احمد کا سر آپ حضرات کے سروں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے، بہرحال آپ اس سنگ باری میں سینہ سپر ہوکر مجاہدانہ انداز میں تقریر فرماتے رہے، آخر کار مخالفین نے بجلی کے قمقموں کو پتھروں کا نشانہ بنایا، فضا پر تاریکی چھاگئی اور جلسہ برخاست کردیا گیا، اور حضرت مدنی اپنی قیام گاہ تشریف لے آئے اور بریلی سے رخصت ہونے سے قبل آپ کی جانب سے ایک ہینڈبل شائع ہوا جو دعاؤں اور نصیحتوں سے لبریز تھا، اور جس کے اختتام پر یہ شعر تھا:

مراد ما نصیحت بود گفتیم ✿ حوالت با خدا کردیم و رفتیم

(شیخ الاسلام نمبر ۲۹۷)

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شیخ الاسلام حضرت مدنی کا جو مقام ہوگا، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں، وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ حضرت مدنی کو حاصل تھی، دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے، ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع وعریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور رفدائی، ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت وسیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام، ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو، وہ کبھی اندازہ نہیں لگاسکتے، بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کردینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لئے مضر ہو، اس سلسلہ میں بھی خود اپنے ساتھ گزرے ہوئے بعض واقعات کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

تواضع کی انتہاء:

۴۳ھ کی بات ہے کہ میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا، ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا، اس میں جماعت دیو بند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیو بندی) نے شرکت فرمائی تھی، حضرت مدنی بھی تشریف لائے تھے، مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کے منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کھانے کا انتظام میرے والد ماجد نے اپنے یہاں کیا تھا، جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا، اس لئے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا، اور سب حضرات سواری ہی سے آئے، لیکن حضرت مدنی نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیاز مند کو بطور راہنما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشرف لائے، حالانکہ موسم گرما تھا، اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا، فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی، دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور حضرت سے ان کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا، حضرت مدنی سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پیجئے، مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، لیکن حضرت نے بغیر کسی عذر ومعذرت کے قبول فرمالیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔

عظمت مدنی کا ایک اہم پہلو:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: "حضرت والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ عام طور سے لوگوں نے حضرت مدنی کی صرف سیاسی جدو جہد کو ان کا اصل کمال سمجھ لیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سالہا سال حضرت شیخ الہند کی خدمت وصحبت میں رہنے کی جو توفیق عطا فرمائی اور انہوں نے اپنے شیخ کی خدمت میں اور عقیدت ومحبت میں اپنے آپ کو جس طرح فنا کیا اور اپنی عام زندگی میں اپنے شیخ کے اوصاف وکمالات کو جس طرح منعکس کرنے کی کوشش کی، حضرت مدنی کی عظمت کے اس پہلو کو اتنا اجاگر نہیں کیا گیا جتنا اس کا حق تھا۔

عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے:

حضرت مولانا خدا بخش صاحب لکھتے ہیں:

مولانا عبداللہ صاحب فاروقی ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں، لاہور میں قیام رہتا ہے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری (قدس سرہ) سے بیعت ہیں، اور حضرت شیخ سے شرف تلمذ حاصل ہے، جس زمانہ میں حضرت شیخ الہند دیوبند میں مقیم تھے، اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدینہ طیبہ میں رہا کرتے تھے، اس زمانہ میں آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے یہاں قیام فرمایا، مولانا عبداللہ صاحب فاروقی کا بیان ہے کہ ایک روز جب کہ میں حضرت مدنی کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو واپسی میں مولانا کا جوتا اٹھالیا، مولانا اس وقت تو خاموش رہے لیکن دوسرے وقت جب ہم لوگ نماز پڑھنے گئے اور نماز سے فارغ ہوکر مسجد سے واپس ہونے لگے تو میں دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب میرے جوتے اپنے سر پر رکھے ہوئے جارہے ہیں، میں پیچھے پیچھے بھاگا، اس پر مولانا نے بھی تیز چلنا شروع کردیا، میں نے بہت کوشش کی کہ جوتا لے لوں مگر نہیں لینے دیا، میں نے کہا، خدا کے لئے سر پر تو نہ رکھیے، فرمایا عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے، میں نے عہد کرلیا تب جوتا سر پر سے اتار کر نیچے رکھا۔ (شیخ الاسلام نمبر ۱۸۷)

روحانی قوت:

تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الدین کاندھلوی مرحوم سے فرمایا:

''میاں ظہیر! لوگوں نے حسین احمد کو پہچانا نہیں، خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا چاہیں، تو نکال سکتے ہیں، لیکن چونکہ یہ عالم اسباب ہے، اس لئے ان کو ایسا کرنے سے منع کردیا گیا ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں''۔

حضرت مدنی بے غرض تھے:

حضرت مدنی بے غرض تھے، قوم وملت کی خدمت کو شعار بنایا اور تحریک آزادی کی راہ میں قدم رکھا تو پہلے اپنے قلب کو غرض سے پاک کرلیا، تا کہ کوئی تلوار انہیں کاٹ نہ سکے، حیدرآباد (دکن) کے وظیفے کی رشوت ہو یا کسی سرکاری مدرسے (مثل مدرسہ عالیہ کلکتہ) کی پرنسپل شپ کی پیش کش ہو یا جامعہ ازہر (مصر) کے منصب بلند کا لالچ ہو، حالات کی سنگینی کا خوف ہو یا خاندان کے مستقبل کا اندیشہ، انہوں نے ہر خوف وحزن سے اپنے قلب کو پاک کرلیا تھا، اگر انہوں نے دارالعلوم میں کوئی مقام حاصل کیا تھا، یا جمعیت علماء ہند کی صدارت کو قبول کرلیا تھا، تو صرف کسی کو آگے بڑھتے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے نہ دیکھ کر، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت

کا میدان خالی پا کر اور غلام ملک میں استعمار و استبداد کے عذاب سے سسکتی انسانیت کو نجات دلانے کے لئے صرف اپنے اسلامی اور انسانی فرض کی ادائیگی کے لئے قدم آگے بڑھایا تھا، اگر چہ حضرت کا اخلاص تیس سال سے زیادہ عرصے تک آزمائش کی کسوٹی پر بار بار پرکھا جاتا رہا تھا۔

قومی اعزاز اور حکومتی پیش کش کی ایک آزمائش:

اور آپ کے اخلاص کا سونا ہر دفعہ زر خالص ثابت ہو چکا تھا، لیکن ابھی آزمائش کا ایک مرحلہ باقی تھا، یہ مرحلہ ملک کی آزادی کے بعد اس وقت پیش آیا، جب حضرت کی خدمت میں ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز "پدم بھوشن" پیش کیا گیا، اگر ہندوستان میں چند حضرات اس کے مستحق تھے تو حضرت اس اعزاز کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے، یہ حضرت کی عظیم الشان قومی خدمات کا صلہ نہیں، اعتراف تھا، یہ اعزاز حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ قوم کی جانب سے ملک کو آزادی اور قوم کو غلامی و استبداد کے عذاب سے نجات دلانے میں ان کی خدمات کے لئے اظہار تشکر تھا، اس کو قبول کر لینے کے جواز میں ایک سو ایک دلیلیں پیش کی جاسکتی تھیں، اور آج بھی کہ ملک کی آزادی کو ایک دہائی کے بعد نصف صدی پوری ہو جائے گی، اور نصف قرن آپ کی وفات حسرت آیات پر بھی گزر چکا ہے، اس اعزاز کے لئے آپ کے استحقاق اور جواز کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، آپ کو معلوم ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی نے قوم کی اس پیش کش و اعزاز کا کیا جواب دیا تھا؟ کیا یہی جواب نہ تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے ایک شرعی حکم اور ملکی فرض کی ادائیگی کیلئے تھا، صلہ و ستائش آرزو و اعتراف خدمات کے جذبے اور کسی اعزاز و منزل کیلئے نہ تھا۔ (مولانا حسین احمد مدنی ایک سیاسی مطالعہ)

خانقاہ مدنی کے شب و روز کے معمولات:

حضرت مدنی کی مسند ارشاد آباد رہتی، آپ بیعت بھی فرماتے، ذکر و اذکار بھی تلقین فرماتے، خانقاہ مدنی میں تشریف لانے والے سعادت مند ہر وقت خصوصاً رات کے وقت ذکر و اذکار، نوافل اور تلاوت میں ساری رات اس طرح مصروف و مشغول ہوتے کہ خانقاہ مدنی انوارات روحانیہ سے جگمگا اٹھتی، برصغیر کے مشہور کمیونسٹ لیڈر محمد اشرف روایت کرتے ہیں۔

جب میں ۱۹۳۶ء میں مولانا (حضرت مدنی) کی رہائش گاہ پر پہنچا، تو اٹھارہ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا، چنانچہ میں نے مہمانوں کے ایک بڑے کمرہ میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا، دینداروں کے معمولات سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں، مگر پہلے دو دن میرے اوپر بڑے سخت گزرے، نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا، مگر یہاں تو سب قائم اللیل تھے، کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بمشکل گھنٹہ بھر سویا ہوں گا، کہ کسی نہ کسی

کونہ سے تکبیر بالجہر بلند ہوئی، میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح ووظیفہ میں، تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لئے اٹھ بیٹھے، پھر فجر سے پہلے اور بعد میں قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہوگیا، جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوگئی، تو میں نے حضرت مدنی سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو، مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چکا ہے، حضرت مدنی نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن مجھے علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا۔ (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۵۳)

بیک وقت چھ ہزار افراد نے بیعت کی:

شیخ الاسلام حضرت مدنی اگر چہ چاروں سلاسل طریقت کے شناور تھے، مگر چشتیہ، صابریہ میں بیعت فرمایا کرتے تھے، سفر حضر میں بیعت فرماتے، آپ سے بیعت ہونے والے سعادت مندوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، ایک دفعہ بانسکنڈی کے مقام پر چھ ہزار افراد نے بیک وقت حضرت مدنی کے دست حق پر بیعت کی، جہاں حضرت مدنی کے عاشق زاروں کی کمی نہیں تھی، وہاں مخالفین، معاندین اور حاسدین بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے، یہ ایک سلسلہ چلا آرہا ہے، اور چلتا رہے گا، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جو خدا کے دوستوں سے دشمنی کرتا ہے وہ دراصل اللہ سے جنگ کرتا ہے، اللہ کے نیک بندوں کا صبر وتحمل رنگ لائے بغیر نہیں رہتا، حضرت عثمان ذی النورین اور حضرت حسین کے قاتلین نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی ذلت ورسوائی کا جو مہیب نقشہ دیکھا، وہ اسلامی تاریخوں میں آج بھی انمنٹ نقوش میں لکھا جاچکا ہے۔

لاش تک نہ ملی:

شورش کاشمیری ہفت روزہ چٹان لاہور مارچ ۱۹۶۳ء میں مکافات عمل اور حضرت مدنی کے دشمنوں کے عبرتناک انجام کی کہانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس واقعہ کے راوی جالندھر کے ایک نوجوان مولوی محمد اکرم صاحب قریشی ہیں جو حمید نظامی مرحوم کے جگری دوست، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کے دست وبازو، اسلامیہ کالج کے فارغ اور لیگ کے آغاز سے آج تک اس کے حامی چلے آتے ہیں، وہ مولانا مدنی اور ان کے مدرسہ فکر کے کبھی ہم خیال نہیں رہے، بلکہ ان نوجوانوں میں سے تھے جنہیں جالندھر میں لیگ کا ہراول دستہ کہا جاتا تھا، اس واقعہ کے راوی یہی محمد اکرم قریشی ہیں، جن کو لاہور کے احباب ڈاکٹر بھی کہتے ہیں اور آج کل بیڈن روڈ لاہور میں رہ رہے ہیں، ان کی روایت کے مطابق اس واقعہ کے کئی راوی اب تک بقید حیات ہیں، ان کا بیان ہے کہ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا زمانہ تھا، مولانا حسین احمد مدنی پنجاب یا سرحد کے سفر سے واپس جارہے تھے، جالندھر کے

اسٹیشن پر یہی نوجوان مسٹر شمس الحق کی ہمراہی میں اپنے رہنماؤں کے استقبال کے لئے گئے ہوئے تھے، رہنما کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے، شمس الحق کی نظریں مولانا مدنی پر پڑ گئیں، وہ اپنے ساتھ کے نوجوانوں کو لے کر ان کے ڈبے پر چڑھ دوڑا، نعرے لگائے، سب وشتم کیا، حتی کہ داڑھی کو پکڑ کر کھینچا، ایک بیان کے مطابق رخسار پر طمانچہ مارا، مولانا صبر کی تصویر تھے، آہ تک نہ کی، اس کارنامہ کے بعد شمس الحق یا اس کے کسی ساتھی نے یہ واقعہ مولانا عظامی سے بیان کیا، جو جالندھر لیگ کے نائب صدر تھے، انہوں نے سنتے ہی کانپ کر پوچھا کیا یہ صحیح ہے؟ جب تصدیق کی گئی تو ان پر رعشہ طاری ہوگیا، اکرم قریشی کہتے ہیں کہ وہ کانپ رہے تھے اور انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: ''اگر یہ سچ ہے تو جس نے حضرت مدنی کی داڑھی پر ہاتھ ڈالا ہے، اس کی لاش نہیں ملے گی، اس کو زمین جگہ نہیں دے گی''۔

عظامی کانپ رہے تھے، ان کا چہرہ اشکبار تھا اور آنکھیں پرنم تھیں۔

آپ جانتے ہیں کہ شمس الحق کون تھا؟ یہ وہی نوجوان ہے جو لائل پور میں قتل وخون کا شکار ہوگیا، جس کی نعش کا پتہ نہ چلا، کفن ملا نہ قبر، اس واقعہ کو تقریباً گیارہ سال ہو چکے ہیں، روایتوں پر روایتیں آتی رہیں، خود لیگ کے زعماء مہر بلب رہے، کسی نے کہا بھٹہ میں زندہ جلا دیا گیا، کسی نے کہا لاش کے ٹکڑے کر کے دریا برد کر دیا گیا، جتنے منہ اتنی باتیں، پولیس نے انعام بھی رکھا، سب کچھ کیا لیکن شمس الحق کا سراغ نہ ملا۔ (بوئے گل)

تین ہزار غنڈوں کی یلغار:

حضرت مولانا ریاض الدین صاحب سید پوری جو کہ حضرت مدنی کے میزبان اور سید پور لانے کے باعث تھے، وہ کلکتہ تشریف لائے ہوئے ہیں، موصوف نے راقم الحروف کو نماز جمعہ سے قبل نمازیان مسجد کولوٹولہ کی موجودگی میں اپنی درد بھری داستان سنائی کہ حضرت مدنی صاحب اپنے خادم احسان الحق صاحب مرحوم کی تعزیت میں قصبہ سونار تشریف لائے ہوئے تھے، اور میری درخواست پر شام کا کھانا تناول فرمانے کے لئے سید پور کے اسٹیشن پر اترے تھے، افسوس کہ موصوف کو میرے غریب خانہ تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعۃً تقریباً سات سو لوگوں کا انبوہ لیگی نعرے لگاتا ہوا اسٹیشن پر آدھمکا اور حضرت شیخ کو عریاں گالیاں، دشنام دہی شروع کر دی، ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے اور چھریاں تھیں، بے تمیزی سے نام لے لیکر قتل کر دو، مار ڈالو، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو، یہ غدار ہے، ایسا ہے، ویسا ہے، جو کچھ منہ میں آرہا تھا، بکواس کی، ہم برائے استقبال صرف دس پندرہ آدمی تھے، اور ان لوگوں میں برابر ایک شخص کے ناقوس پر ناقوس بجانے پر زیادتی ہو رہی تھی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین ہزار غنڈے سید پور در کشاب اور مضافات سے جمع ہو گئے، اور پھر کربلا کا منظر حسین احمد بن حسین کے سامنے آ گیا۔

کلاہ مدنی کو پاؤں تلے روند کر جلا دیا گیا:

مار دھاڑ شروع کردی اور ہم چند لوگ جو شیخ مدظلہ کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے کچھ مجروح اور کچھ مضروب ہو رہے تھے، اور خدا جانے ہم لوگوں میں آیا فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہا قوت ہمارے اندر پیدا ہو رہی تھی اور ہم "کانہم بنیان مرصوص" بنے ہوئے تھے، اسی اثناء میں ایک فرعون بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا، اس نے حضرت مدنی صاحب کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی، بے دردی سے گریبان پکڑا، اور آخر میں سخت مدافعت کے باوجود کلاہ سر مبارک سے اتارلی، بیہودہ کلمات کہتے ہوئے پاؤں کے نیچے روندا، اور پھر اس کو جلا دیا، ہم میں بعض اشخاص نے ایک مسلمان سب انسپکٹر کو جو قریب ہی تھا، امداد کے لئے متوجہ کیا، مگر افسوس اس نے لیگی ذہنیت کی وجہ سے ابتداء لطائف الحیل سے کام لے کر کچھ دیر بعد صاف وصریح انکار کردیا کہ میں اس بڑے مجمع کو قابو میں لانے سے معذور ہوں۔

ایک اینگلو انڈین افسر کی فرض شناسی:

جب اس پولیس افسر نے شرعی وقانونی ذمہ داری کا قطعی احساس نہیں کیا تو ہم میں سے بعض مایوسانہ طریقہ پر ورکشاپ کے اینگلو انڈین افسر کے پاس پہنچے، وہ فوراً اسٹیشن پر آیا اور اس نے فی الواقع امن وامان قائم کرنے کی بہت کوشش کی، اپنے ماتحت مزدوروں سے یہاں تک کہا کہ خبردار! یہ تم کیا کرتے ہو؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ شخص تمہارا بہت بڑا پوپ ہے، زبردست پادری ہے، نہایت نیک آدمی ہے، کیا تم اسی طرح غنڈہ پن سے شراب پی پی کر پاکستان لینا چاہتے ہو، دور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔

غرض اس افسر نے سب کو سمجھایا، مگر کچھ اثر نہ ہوا، اور مدنی صاحب اسی درمیان میں بہ مشکل تمام ویٹنگ روم میں داخل کئے جانے کے بعد حضرت عثمان غنی کی طرح مظلومانہ محصور تھے، اس ناکامی کے بعد اسٹیشن افسران وغیرہ کی سعی کے ذریعہ غنڈوں سے یہ طے پایا کہ مولانا کو اس صورت میں چھوڑا جاسکتا ہے کہ یہ اسی شب دارجلنگ میل سے واپس ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت شیخ ساڑھے آٹھ بجے (۸-۱-۲) شام سے لے کر ڈیڑھ بجے (۱-۱-۲) شب تک پانچ گھنٹے اس مصیبت عظمی میں مبتلا رہ کر دارجلنگ میل سے بھاگلپور کے لئے روانہ ہو گئے۔

قدرت کا انتقام:

حضرت مدنی غالباً حدود بنگال سے باہر نہیں نکلے تھے کہ خداوند تعالی کا قہر وعذاب ظالموں کی طرف

متوجہ ہو گیا، اور منعم حقیقی کی گرفت شروع ہو گئی، چنانچہ مولانا صالح صاحب سید پوری فاضل دیوبند خلف رشید مولانا ریاض الدین صاحب کا گرامی نامہ آج ہی اپنے پدر بزرگوار کے نام کلکتہ پہنچا، مقام عبرت ہے کہ جس فرعون بے سامان نے زیادہ فرعونیت سے کام لیا تھا، وہ تو اگلے ہی دن تالاب میں غرق ہو کر فوت ہو گیا اور جس پولیس افسر نے اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا تھا اور کھڑے ہوئے کلوخ اندازی وغیرہ کا تماشا دیکھا تھا، وہ بھی اپنے نوجوان فرزند کو سپرد خاک کر کے سراپا تماشا بن گیا، پھر خدا کی شان کہ جس خیال سے یہ ہڑبونگ مچائی گئی تھی کہ جمعیۃ علماء کی تبلیغ نہ ہو، آج بڑے اہتمام سے اسی جگہ جمعیۃ قائم کی جا رہی ہے، جو لوگ اب تک غنڈہ بنے ہوئے تھے، وہ اب تائب ہو کر ایک دوسرے کو متہم کر رہے ہیں اور جس جھنڈے کے تحت یہ سب خرافات کی گئی تھیں، اسی جھنڈے کی اب علانیہ مخالفت شروع کر دی گئی ہے، اللہ رے قدرت کیا برعکس معاملہ ہے، صالح صاحب لکھتے ہیں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ابا جان! آپ کا خط موصول ہوا، ہم لوگ خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں، ہم لوگوں کے لئے کسی قسم کی فکر نہ کریں، بے فکر ہو کر کام کاج کریں اور ہم لوگوں کے لئے دعا کرتے رہیں، جن غنڈوں نے جناب حضرت قبلہ مولانا مدنی کے ساتھ گستاخی کی تھی، وہ لوگ اب اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں، بڑے داروغہ پولیس انسپکٹر کا بڑا لڑکا دوسرے ہی دن قضا کر گیا، یہ بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو، اس کے بعد جس شخص نے حضرت کے سر مبارک سے ٹوپی اتار کر جلا دی تھی، دوسرے دن وہ بھی تالاب میں ڈوب کر مر گیا، سید پور میں ہلڑ مچ گیا، شیان ڈاکٹر اور چھینا سب لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم ان غنڈوں کے ساتھ نہیں ہیں، ہم لوگوں سے ایسا ذلیل کام نہیں ہو سکتا"۔ (روزنامہ حقیقت لکھنؤ ۱۹۳۶ء)

بیان خطابت:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی تقریر میں خطابت کم اور مضامین وحقائق زیادہ ہوتے تھے، جیسے کوئی مشاق مصنف اپنی تحریروں میں منطقی استدلال سے کام لیتا ہے، حضرت مدنی اپنی تقریروں میں اسی طرح استدلال فرماتے تھے، آواز کا اتار چڑھاؤ بہت کم ہوتا تھا، اور جذبات کا اظہار اس سے بھی کم، وہ دلنشین انداز میں بات کو سمجھایا کرتے تھے، ان کی تقاریر میں تفہیم دین اور ارشاد الی الحق کا رنگ زیادہ ہوتا۔

مدارس اسلامیہ کی اہمیت:

یہاں حضرت کے بعض ملفوظات نقل کیے جا رہے ہیں:

ارشاد فرمایا: کہ مسلمانوں کے لئے ہر قسم کا علمی ذخیرہ بلکہ نفس اسلام کی تعلیم عربی اور فارسی زبان میں تھی اور ہے، بغیر اس کی تعلیم کے جاری ہونے کے اسلام کا بقاہی ناممکن تھا، اس لئے بقیۃ السلف علماء کو ضروری معلوم ہوا، کہ پوری جدوجہد کے ساتھ مذہبی علوم اور اسلامی فنون کو ملک میں جاری کریں، یہ بدیہی امر ہے کہ مسلمان اگر کسی بھی فن میں ترقی کریں، مثلاً مال ودولت، حکومت وتجارت وغیرہ؛ لیکن اسلام اور اس کے احکام سے نابلد اور ناواقف ہوں تو وہ مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی، چہ جائیکہ وہ نجات اور فائز المرامی کے مستحق ہوں، ارباب مدارس اس ضرورت کو محسوس کر کے خدا کے نام پر اٹھے، قوم کو اس طرف متوجہ کیا، ہر قسم کی صعوبتیں جن کے وہ عادی نہ تھے، برداشت کیں اور اسلامی مدارس کی بنیاد ڈالی۔ (خطبات مدنی ۱۱۸)

عزم وعمل:

ارشاد فرمایا: نصب العین کی بلندی، عزم وعمل کی ہم آہنگی اور گفتار وکردار کا ارتباط ہی انسانوں کو لافانی عظمت اور حقیقی کامرانی عطا کرتا ہے، گویا یہ ایک فطری ضرورت ہے کہ انسانی زندگی کو تسلسل کے ساتھ عزم وعمل اور گفتار کردار کی صالح قوتوں سے مربوط رکھا جائے، تاکہ مقصد زندگی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، اور عزم وعمل کی حدت وحرارت میں کسی وقت بھی فرق نہ آئے۔

وسعت رحمت:

ارشاد فرمایا! رحمت خداوندی سے کسی بھی وقت مایوس نہ ہوں، وہ کریم کارساز، عمیم الاحسان، غفار الذنوب والخطایا ہے، اس کا وعدہ ہے، اور نہایت سچا وعدہ ہے، کہ وہ آسمان اور زمین کی تمام فضا کو بھرے ہوئے گناہوں کو بھی رجوع اور انابت الی اللہ کی بناپر اپنی مغفرت سے عفو اور محو کردے گا، کوئی بھی دل لگانے کے قابل نہیں:

ارشاد فرمایا! مخلوق خواہ کوئی بھی ہو استاد ہو یا مرشد، باپ ہو یا ماں، بیٹا ہو یا بیٹی وغیرہ سب فانی ہیں، کوئی بھی دل لگانے اور محبوب ہونے کے قابل نہیں، محبوب حقیقی صرف اللہ تعالی ہے اور بس:

جہاں اے برادر نماند بکس
دل اندر جہاں آفریں بندو بس

ماں کی خدمت واطاعت:

ارشاد فرمایا حضرت اویس قرنی ماں کی اطاعت اور خدمت میں مصروفیت کی وجہ سے بارگاہ نبوت میں حاضری کو ترک کر دیتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کو ان سے دعا کرانے کا ارشاد ہوتا ہے، حالانکہ

اویس قرنی رویت نبوی سے ممتاز نہ ہوئے تھے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

نیت کی برکت:

ارشاد فرمایا مولانا روم فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بودن

نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

کھانا پینا، سونا جاگنا وغیرہ نیت سے عبادت ہو جاتی ہے، اور بلا نیت یا بہ نیت ریا وسمعہ نماز بھی عبادت نہیں رہتی، پھر آپ اس قدر غلط فہمی میں مبتلا کیوں ہیں "انما الاعمال بالنیات وانما لامری مانوی" (اعمال کا دارومدار نیات پر ہے، اور بے شک ہر وہ کام جس کے لئے نیت کی جائے) کو بھول گئے؟ نیت کیجئے، حقوق پہنچانے کی نیت کیجئے، اپنے چلنے بیٹھنے، سونے جاگنے کو عبادت بنایئے، ہر کام میں رضائے باری تعالی کو ملحوظ رکھیئے۔ (ملفوظات شیخ الاسلام)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں:

یہاں حضرت کی بعض کرامات اور رویائے صالحہ نقل کئے جاتے ہیں، شیخ الاسلام حضرت مدنی نقش حیات میں تحریر فرماتے ہیں:

ا- مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جب قضیمہ سے رابغ کو قافلہ جا رہا تھا، رات کو اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرور کائنات علیہ السلاۃ والسلام تشریف لائے ہیں، میں قدموں میں گر گیا، آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا، کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں، اور جو نہیں پڑھی ہیں، ان کو سمجھنے کی قوت ہو جائے، تو فرمایا تجھ کو دیدیا۔

ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں: بہر حال مدینہ منورہ میں سلسلہ رویائے صالحہ وغیرہ بکثرت جاری رہا، مگر اس وقت لکھنے اور ضبط کرنے کا خیال نہیں ہوا، خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، اولیاء عظام، ائمہ فخام اور جناب باری عز اسمہ کو بار ہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، چونکہ قلمبند کرنے کی نوبت نہیں آئی، اس لئے بلا ترتیب زمانہ جس قدر یاد ہے لکھتا ہوں:

آپ کے ہاتھوں سے تخم کدو دامن میں لینے کی سعادت:

۲-ایک مرتبہ دیکھا کا آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف کے شمالی دروازہ باب مجیدی کے باہر بجانب شمال منہ کئے ہوئے (قبلہ مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کا بجانب جنوب ہے) مسجد سے نکل کر کھڑے ہیں اور آپ کے لپ (دونوں ہاتھوں کا مجموعہ) میں میٹھے کدو (جس کو کھنٹرا اور عرب میں دبائے رومی کہتے ہیں) کے بیج بھرے ہوئے ہیں، میں نے سامنے سے حاضر ہوا، جب میں قریب پہنچا تو آپ نے لپ کو نیچے سے کھول دیا، کچھ بیج گرے تو میں نے دامن میں لے لئے، ان کی مقدار تقریباً تیس عدد تھی۔

اتباع سنت کی تعبیر:

۳-دیکھا کہ مسجد شریف میں منبر شریف کے سامنے مکبریہ کے نیچے لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے، اور ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تیرے قدم جناب رسول اللہ علیہ وسلم کے قدم جیسے ہیں، ان کی تعبیر حضرت گنگوہی نے اتباع سنت سے دی ہے۔

۴-دیکھا کہ ایک جگہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھلی ہوئی ہے، میں نے دیکھا کہ لاش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس باہر ہے، کفن کھلا ہوا ہے، چہرہ مبارک نہایت تروتازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تروتازہ ہے، اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم چت سو رہے ہیں۔

۵-دیکھا کہ روضہ مطہرہ (وہ حجرہ مطہرہ جس میں قبر مبارک ہے) کی جنوبی دیوار کی جڑ میں ایک پختہ خندق تقریباً ڈیڑھ دو ہاتھ گہری اور کئی گز لمبی بنی ہوئی ہے، جس کی لمبائی دیوار کی جڑ سے متصل سر مبارک کی طرف سے پاؤں کی طرف کو چلی گئی ہے اور کچھ لوگ کھڑے ہو کر لمبی جھاڑو سے اس سے میں جھاڑو دے رہے ہیں، میں ایسی ہی لمبی جھاڑو لیکر پہنچا تو وہ لوگ ہٹ گئے، میں نے تمام خندق میں جھاڑو دی اور پانی ڈال کر پانی کو جھاڑو ہی سے صاف کیا، میں جھاڑو سے پانی کو صاف کرتا ہوں اور صاف کردہ جگہ میں پانی خشک ہو جاتا ہے، پھر دیکھتا ہوں کہ اس میں رومی قالین خوش رنگ بچھ گئے ہیں، خندق کے آگے (بجانب قبلہ شریف) کی طرف چہرہ کئے ہوئے کچھ لوگ تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہیں۔

کھانے میں حیرت انگریز برکت:

حاجی احمد حسین صاحب (لکھیا) دیوبند بیان کرتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ دیوبند میں (سیاسی) کانفرنس تھی، اس موقعہ پر میں نے پچاس مہمانوں کو مدعو کیا، ان میں سے

پچیس مہمان کانفرنس کے تھے اور پچیس حضرت شیخ الاسلام کے مہمان تھے، مختصر یہ کہ میں نے پچاس افراد کے لئے کھانے کا انتظام کیا، جب کھانا تیار ہو گیا، تو مولانا عثمان صاحب نے مولانا سلطان الحق صاحب سے کہا کہ جاؤ! حضرت کو بلا کر لے آؤ، مولانا سلطان الحق حضرت مدنی کی خدمت میں تشریف لے گئے، لیکن وہاں سے واپس آکر مولانا عثمان صاحب سے سرگوشی کے انداز میں کوئی بات کہی اور مولانا عثمان صاحب نے مجھ سے کہا کہ مولانا تمہارے ہی بلائے آئیں گے، تم خود چلے جاؤ، یہ سن کر میں حضرت کے مکان پر پہنچ گیا، آپ تیار ہو کر پہلے ہی باہر آچکے تھے، آپ نے بآواز بلند فرمایا کہ سب مہمان چلے آئیں، تمام مہمان چلے آئے، جن کی تعداد تین اور چار سو کے درمیان تھی، مہمانوں کو دیکھ کر میں گھبرا گیا، بھائی اسعد صاحب نے مجھے پریشان دیکھ کر سبب معلوم کیا، تو میں نے صاف بات ظاہر کر دی کہ میں نے صرف پچاس ساٹھ مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کیا ہے اور مہمانوں کی تعداد آپ دیکھ رہے ہیں، وقت اس قدر تنگ ہے کہ مزید انتظام کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی، بھائی اسعد صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ صورت حال تم خود جا کر حضرت سے بیان کر دو۔

میں نے جا کر حضرت سے عرض کر دیا کہ اس وقت کھانا کم تیار ہے اور مہمان بہت زیادہ ہیں، اب کیا کرنا چاہئے؟ یہ سن کر حضرت کھانے کے پاس تشریف لائے، روٹی کا ٹوکرا پلاؤ کی ڈیگ کے پاس ہی رکھوایا اور دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد کھانے پر دم کر دیا اور فرمایا کہ کھانا کھلانا شروع کرو، اور کھانا نکالنے کے بعد ڈیگ کو بند کر دیا کرنا اور ہاں میرے لئے ایک چار پائی منگا دو میں (یہیں) لیٹ جاؤں گا، چنانچہ فوراً چار پائی بچھا دی گئی اور آپ اس پر لیٹ گئے، مہمانوں نے کھانا شروع کر دیا، جب تین محفلیں کھانا کھا کر فارغ ہو گئیں تو چوتھی اور آخری محفل میں حضرت بھی شریک ہوئے، جب آخری محفل بھی اٹھ گئی تو ہم منتظمین نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے کھانے میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر برکت عطا فرمائی کہ تقریباً چار سو آدمی شکم سیر ہو گئے، بہر حال مہمانوں کے جانے کے بعد ہم چند آدمی رہ گئے اور خیال تھا کہ چاولوں کا تو نام و نشان بھی نہ ہوگا، البتہ روٹیاں کافی بچ گئی ہیں، اسی پر اکتفا کر لیں گے، مگر جب میں ڈیگ کے قریب گیا اور اس کے اندرونی حصہ کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں چاول اس قدر موجود تھے کہ جسے ہم سب مل کر کھا سکیں۔

روضۂ مطہرہ سے آپ کو سلام کا جواب:

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر المدرسین مدرسہ عالیہ فتح پوری تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی مرحوم مفتی مالیر کوٹلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب

سہارنپوری کے ہمعصر تھے، جن کو خدا نے علم ظاہری کے ساتھ تقویٰ اور طہارت باطنی کی دولت سے بھی نوازا تھا، صاحب سلسلہ بزرگ تھے، اور تقریباً سو سال عمر میں اب (۱۹۵۷ء) سے تقریباً پندرہ سال قبل عالم آخرت کی طرف رحلت فرما ہوئے، اس خادم کو مرحوم سے شرف نیاز حاصل تھا، جب کبھی دہلی تشریف فرما ہوتے، اکثر وبیشتر حاضری کی سعادت حاصل ہوتی تھی، چونکہ شیخ الاسلام حضرت مدنی سے بھی اس خادم کو شرف تلمذ حاصل ہے، اس تعلق کے لحاظ سے مرحوم سے اثنائے ملاقات حضرت مدنی کا بھی ذکر آجایا کرتا تھا، ایک ملاقات میں مرحوم نے فرمایا کہ: ''ایک بار زیارت بیت اللہ سے فراغت کے بعد دربار رسالت میں حاضری ہوئی تو مدینہ طیبہ کے دوران قیام مشائخ وقت سے یہ تذکرہ سنا کہ امسال روضہ اطہر سے عجیب کرامت کا ظہور ہوا، ایک ہندی نوجوان نے جب بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر صلاۃ وسلام پڑھا، تو دربار رسالت سے ''وعلیکم السلام یا ولدی'' کے پیارے الفاظ سے اس کو جواب ملا''۔

مولانا مرحوم نے فرمایا، اس واقعہ کو سن کر قلب پر ایک خاص اثر ہوا، مزید خوشی کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ سعادت ہندی نوجوان کو نصیب ہوئی ہے، دل تڑپ اٹھا اور اس ہندی نوجوان کی جستجو شروع کی، تا کہ اس محبوب بارگاہ رسالت کی زیارت سے مشرف ہوسکوں اور خود اس واقعہ کی بھی تصدیق کرلوں۔

تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ وہ ہندی نوجوان سید حبیب اللہ مہاجر مدنی کا فرزند ارجمند تھا، مرحوم نے فرمایا کہ سید صاحب سے ایک گونہ تعارف وتعلق بھی تھا، گھر پر پہنچا، ملاقات کی، اپنے اس دوست کے سعادتمند سپوت ہندی نوجوان کو ساتھ لے کر گوشہ تنہائی میں چلا گیا، اپنی طلب وجستجو کا راز بتایا اور واقعہ کی تصدیق کی، ابتداءً خاموشی اختیار کی؛ لیکن اصرار کے بعد کہا ''بے شک جو آپ نے سنا وہ صحیح ہے'' یہ واقعہ بیان فرمانے کے بعد مولانا نے فرمایا، سمجھے؟ یہ ہندی نوجوان کون تھا؟ یہی تمہارے استاذ مولانا حسین احمد۔

اکابر کا سایہ:

کبھی کبھی مندرجہ ذیل شعر بھی بڑے سوز وگداز کے ساتھ پڑھا کرتے......

ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ أَكْنَافِهِمْ
بَقِيَ الَّذِيْنَ حَيَاتُهُمْ لَاتَنْفَعُ

وہ لوگ چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزاری جاتی تھی، وہ لوگ رہ گئے، جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں۔

رضائے الٰہی کا حصول:

فَلَيْتَكَ تَحْلُوْا وَالْحَيَاةُ مَرِيْرَةٌ
وَلَيْتَكَ تَرْضٰى وَالْأَنَامُ غِضَابٌ

کاش! آپ کی محبت کی مٹھاس مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی تلخ ہوتی اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے، خواہ ساری دنیا ناراض ہو جاتی۔

اسلامی مدارس اور توکل علی اللہ:

ایک ساتھی کے نام رقمطراز ہیں:

میرے بھائی! ابتدائی اسلامی مدارس کا قیام اور اس کی بقاء ہی اہم اور بنیادی فریضہ ہے، جہاں بھی رہنا ہو، اس خدمت سے غافل نہ رہنا، اخلاص اور ہمدردی اور نہایت مستعدی سے اس کام میں لگے رہنا، اس راہ کی دشواریوں پر صبر کرنا اور ہمت سے کام لینا ہی اعلیٰ درجہ کی خدمت ہے، اپنی اصلاح سے غافل نہ ہونا چاہئے، توکل علی اللہ بہترین سہارا ہے، اس سہارے کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔

حضرت مدنی کا آخری درس بخاری شریف:

حضرت مدنی قدس سرہ العزیز نے آخری سال ۶ رذیقعدہ ۱۳۷۷ھ بروز بدھ درس بخاری شریف کا آغاز فرمایا، طلباء دورۂ حدیث کی تعداد ۱۸۴ رتھی، اور حسب معمول درس سننے کے لئے عام آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر درس گاہ میں موجود تھا، ٹھیک دس بج کر چار منٹ پر آپ نے خطبہ مسنونہ اور حدیث پڑھنے کے بعد تقریر کا آغاز کیا، اور فرمایا ہم اس وقت فن حدیث میں داخل ہوتے ہیں، علماء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر فن میں تین اصولی چیزیں ہوتی ہیں:

غایت موضوع اور غرض

یہ مبادی ثلاثہ کہلاتی ہیں، بخاری شرف کی جلد اول چالیس دن میں پڑھائی "باب الفہم فی العلم" کا سبق آپ کا آخری درس تھا، درس گاہ آپ اس دن ایک گھنٹہ تین منٹ تشریف فرما رہے ہیں، جس میں سے ۱۳ رمنٹ حاضری لینے میں صرف کئے، تین منٹ خطبہ مسنونہ اور عبارت پڑھنے میں لگے اور چھبیس منٹ درس دیا، طلباء سے آپ کے آخری خطاب کے کلمات یہ تھے:

"غبطہ کے معنی یہ ہے کہ دوسرے کے پاس نعمت دیکھ کر اس چیز کی تمنا کرنا، اور اس تمنا کا مقصد اس چیز کا ازالہ نہ ہو"۔

بخاری شریف کی دوسری جلد پر آپ نے کل ۲۳ ر روز درس دیا، بخاری مطبوعہ نور محمد میں صفحہ ۵۰۷ ر پر "باب قتل ابی رافع" آخری عبارت تھی، جو آپ نے خود پڑھی تھی، آپ کی درس گاہ میں ۶ ربج کر ۲۳ رمنٹ پر تشریف آوری ہوئی اور سات بج کر ۵۵ رمنٹ پر آپ نے سبق پڑھایا، اس طرح تین ماہ پندرہ دن بعد آپ نے

آخری درس ختم کیا تھا۔

یہ آپ کا آخری درس تھا، اس کے بعد دارالحدیث دارالعلوم دیوبند ہمیشہ کے لئے آپ کے فراق میں روتا رہے گا۔

علالت اور وفات:

چونکہ حضرت مدنی کا علالت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس لئے اس امید میں کہ اللہ کرے گا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس عارضی علالت سے پھر اٹھ کر کھڑے ہوں گے، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد سے درخواست کی گئی اور انہوں نے عارضی طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف کے اسباق شروع کردئے اور بالکل مجبور ہو کر حضرت سارے معمولات سے دستکش ہو گئے، اب تک تو اتنی سکت تھی کہ کسی نہ کسی طرح نمازیں گھر سے متصل مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے رہے، مگر اب یہ آخری قوت بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی، ناچار بڑی مشکل سے حجرہ استراحت سے اٹھ کر مہمان خانے تک تشریف لاتے اور نمازیں وہیں جماعت سے ادا فرماتے، مگر ابھی تک اٹھنے اور چلنے میں کسی کا سہارا لینے سے انکار فرماتے رہے، اور ساری نمازیں کھڑے ہی ہو کر پڑھتے رہے۔

اسی عالم میں ایک روز مولانا فخر الدین صاحب (جو حضرت کی جگہ حدیث پڑھا رہے تھے) مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے، حضرت نے ان سے اپنی قلبی احساسات بیان فرمائے، کہ اب اللہ تعالی کے سامنے حاضری کا وقت آ گیا ہے، کوئی عمل اپنے پاس نہیں ہے، نمازیں بھی تیمم کر کے اور بیٹھ کر پڑھ رہا ہوں، توشہ آخرت بالکل خالی ہے، مغفرت کا کوئی سامان نہیں ہے، دعا کیجئے کہ حق تعالی کی رحمت کاملہ جوش میں آ جائے اور میرا بیڑا پار ہو جائے، اس بیان کے درمیان حضرت کا دل بھر آیا، آنکھوں سے زاروقطار آنسو رواں ہو گئے اور آہستہ آہستہ آنسو ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے، بیاسی برس کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ کسی نے حضرت کے آنکھوں میں آنسو اور مزاج پر گریہ کا اثر دیکھا تھا۔

ایسی حالت میں بھی ضروری کاغذات دیکھتے، ہدایات دیتے اور دستخط کرتے رہے، عیادت کرنے والوں سے باتیں بھی کرتے رہے، ان کے احوال اس طرح پوچھتے رہے کہ گویا عام حالات کی معمول کے مطابق ملاقاتیں ہیں، امیر جماعت تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ وغیرہ تشریف لائے تو نہایت بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کیں، اپنی بیماری، کمزوری اور تکلیفوں کا کوئی شکوہ وتذکرہ نہیں فرماتے تھے، مزاج پرسی پر بھی یہی فرماتے رہے کہ الحمد للہ اچھا ہوں، ہاں

بزرگان دین وعلماء کرام کے سامنے مسجد کی عدم حاضری جماعت سے محرومی اور بیٹھ کر نمازوں کی ادائیگی پر صدمہ اور دکھ کا اظہار فرماتے تھے، پہلی یا دوسری دسمبر کو تنفس کی شکایت میں بہت افاقہ ہوگیا، بڑی راحت محسوس فرمائی، کچھ آرام بھی فرمایا، اہل خانہ میں، خدام میں اور مریدین ومعتقدین میں یہ مسرت افزاء خبر پھیل گئی کہ اب مرض کا ازالہ ہو رہا ہے صرف کمزوری باقی ہے۔

۱۳ر جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات کی ایک ابر آلود صبح کو نو یا دس بجے کے قریب کمرے سے نکل کر بغیر کسی مدد کے چھڑی کے سہارے صحن میں تشریف لائے اور آرام فرمایا، بہت دنوں کے بعد صحت اور طاقت کی یہ معمولی سی نشانی نظر آئی تھی، امید اور اطمینان کے لئے یہ تھوڑا سہارا بھی بہت کافی تھا، منٹ منٹ پر افاقہ اور اطمینان کی خبریں مدرسے میں، شہر میں، اور شہر سے باہر علاقوں میں پھیل رہی تھیں، لوگوں کی خوشی ومسرت کا اندازہ لگانا مشکل تھا، درمیان میں باتیں بھی کرتے رہے، مسکراتے اور ہنستے بھی رہے اور ہشاش وبشاش رہے، بارہ بجے کے قریب کمرے میں واپس آئے، کسی طرح غذا تناول فرمائی، بچوں اور اہلیہ محترمہ سے باتیں کیں، پان کھایا، اہلیہ محترمہ اور سب بچوں کو حسن خلق، حسن معاملہ اور پابندی شریعت کے بارے میں نصیحتیں فرماتے رہے، اس کے بعد کمرہ خالی کر دیا گیا، دروازہ بند کر دیا گیا، اور سب ہی لوگ اس خیال سے باہر آگئے کہ کچھ دیر نیند آجائے، اس کے آدھ پون گھنٹے یا شاید ایک گھنٹہ کے بعد کوئی لڑکا کمرے میں داخل ہوا، حضرت آرام کے ساتھ محو خواب تھے، اس نے خوشی میں غور سے دیکھا تو پیشانی اس طرح پھڑک رہی تھی جیسے آنکھیں پھڑکتی ہیں، یا گوشت کا کوئی ٹکڑا خود بخود مرتعش ہو جاتا ہے، خیال بھی نہ گزرا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہوسکتی ہے، اور باہر آگیا، اس کے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گھر کے لوگ نماز کے لئے بیدار کرنے کی غرض سے اندر گئے، پکارا، جگایا اور آخر میں ہلایا مگر کوئی جواب، کوئی حرکت نہ دیکھی، تو لوگ سراسیمہ اور بدحواس ہو کر دوڑے بھاگے، ڈاکٹروں حکیموں کو بلایا، انہوں نے معائنہ فرمایا اور تھوڑی ہی دیر میں اعلان کر دیا کہ حضرت شیخ العرب والعجم، امام العصر، محدث دوراں، قطب وقت، مجد دامت، جانشین شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا وصال ہو چکا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون، اس طرح حضرت کی وفات سے ایک عہد زریں کا خاتمہ ہوگیا۔ ■

حضرت مدنیؒ اور ندوۃ العلماء

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ)

دنیائے علم وفکر میں جب کبھی کوئی دعوت اور نئی تحریک اٹھتی ہے تو اس کے اثرات لوگوں پر یکساں مرتب نہیں ہوتے، بلکہ اس تحریک کے معاملے میں تین طرح کے لوگ سامنے آتے ہیں:

ایک گروہ تو ان سلیم الفطرت انسانوں کا ہوتا ہے جو تحریک کی حقانیت وصداقت کو فوراً پا لیتے ہیں اور بلا جھجک تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینا چاہتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان مخالفین ومعاندین کا ہوتا ہے جو مختلف عوامل ومحرکات (جن کی پشت پر ان کے مصالح ومفادات ہوتے ہیں) کی وجہ سے اول وہلہ میں تحریک کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے ہیں اور اس کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔

تیسرا گروہ تذبذب وتردد میں مبتلا ان لوگوں کا ہوتا ہے، جو تحریک کی صداقت وافادیت کو محسوس تو کرتے ہیں مگر علانیہ تحریک کا ساتھ دے کر اس کی خاطر ایثار وقربانی کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے، یہ لوگ تحریک کی کامیابی دیکھتے ہیں تو اس میں آکر شامل ہو جاتے ہیں، جب کامیابی نظر نہیں آتی بلکہ الٹے تحریک مصائب کے گرداب میں گھر جاتی ہے تو وہ اپنی سابقہ روش سے چمٹے رہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں تحریک ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی تو یقینی طور پر اس کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی، عوام الناس سے قطع نظر ملت اسلامیہ کے وہ خواص جو خود اداروں اور تحریکات سے وابستہ ہوں گے ایک نئی دعوت وتحریک کے حوالے سے ان کی حساسیت بہت بڑھی ہوئی ہوگی، جس وقت ندوۃ العلماء

قائم ہوا تو دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ جیسے ملت کے دو عظیم ادارے بلکہ دو تحریکیں سرگرم سفر تھیں، ندوۃ العلماء کی تحریک کو حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی نہ صرف تائید حاصل تھی بلکہ ندوۃ العلماء کے قیام کو آپ نے الہام غیبی سے تعبیر فرمایا تھا، مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی اس کے متعدد اجلاسوں میں شریک رہے لیکن اس کے باوجود دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں دونوں کے لئے ندوۃ العلماء نامانوس و بیگانہ ہی رہا۔ ارباب ندوہ کو اس بیگانگی و عدم توجہی کا شدت سے احساس ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے زمانے میں ہوا، مزید یہ خیال بھی ان کے دلوں میں قرار پکڑ چکا تھا کہ ندوہ کے ماحول میں دینی رجحان اور روحانی میلان کی کمی ہے۔ ان دو اسباب کے ازالے کے لئے ذمہ داران ندوہ کشاں کشاں دیوبند اور سہارنپور کے قریب آنے لگے۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ صاحب کو ان کے والد ماجد مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے حدیث کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند بھیجا جہاں سے انہوں نے باقاعدہ سند فراغت حاصل کی، اس قابل فخر اور عظیم الشان ادارے سے ان کی خوشہ چینی بعد میں ندوہ کو دیوبند سے قریب کرنے میں بہت کام آئی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے عہد نظامت کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کے دور کی سب سی بڑی خصوصیت جو کسی دینی ادارے کی بنیادی خصوصیت ہونی چاہئے، وہ اس کے دینی رجحان اور روحانی میلان کا زیادہ واضح طریقہ پر سامنے آنا تھا، ان کے دور سے قبل ندوۃ العلماء کے متعلق معلومات کی کمی اور غلط فہمیوں کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں، دینی اداروں اور دینی شخصیتوں سے اتنا قریب نہ تھا جتنا کسی دینی ادارے کو ہونا چاہئے تھا۔

اس میں ان کی دینی تعلیم اور روحانی ربط و تعلق کو بھی دخل تھا جو انہیں دیوبند اور سہارنپور کے دینی و روحانی حلقوں سے قریب لے آیا اور ان کے واسطے سے دارالعلوم میں دینی فضا، نمایاں دینی رجحان، دعوتی و تبلیغی کاموں سے دلچسپی شروع ہوئی اور ندوۃ العلماء سے جماعت تبلیغ کا خصوصی تعلق قائم ہوا اور ندوۃ العلماء میں حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا الیاسؒ، حضرت رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی بار بار آمد ہوئی اور قیام رہا اور حضرت تھانویؒ کی توجہ بھی حاصل رہی۔ (تاریخ ندوہ حصہ دوم ص ۴۰۳)۔

دیوبند اور سہارنپور کے دینی و روحانی حلقوں سے تعلق کو مزید تقویت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ان دینی مراکز اور روحانی شخصیات کی بار بار کی زیارت سے حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا نے دیوبند، رائے پور اور دہلی کا ایک یادگار سفر کیا تھا جس کے نتیجہ میں یہاں کے علمی اور دینی مراکز سے روابط کا آغاز ہوا اور ان میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ جس کے سبب سے آج ندوۃ العلماء ایک دینی ادارے کی حیثیت سے

ملک اور بیرون ملک وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مولانا کے اس سفر کے بارے میں مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم فرماتے ہیں:

"ابھی حال ہی میں ہمارے دوست مولانا سید ابوالحسن علی نے سہارنپور، دیوبند رائے پور، دہلی، اور مضافات دہلی کی سیاحت کی اور تقریباً ڈیڑھ ہفتہ وہاں کے علمی اور دینی بزرگوں کی ملاقات وزیارت میں صرف کی ہے۔ سفر سے واپسی کے بعد الاصلاح کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے اپنی مشاہدات اور تاثرات بیان کئے، اس تقریر کا سامعین پر گہرا اثر پڑا خصوصاً مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا محمد الیاس کا ندھلویؒ کے تذکرے سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور دینی خدمت کا ایک خاص ولولہ پیدا ہو گیا، امید ہے کہ یہ سفر آئندہ بہت سی سیاحتوں کا پیش خیمہ ہوگا۔

(الندوہ، فروری ۱۹۴۰ء، بحوالہ تاریخ ندوہ، حصہ دوم، ص ۳۰۷)۔

ہماری اس خامہ فرسائی کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہم تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کے مابین تعلقات اور ہم آہنگی کو موضوع گفتگو بنانا چاہتے ہیں، ہمیں تو ندوۃ العلماء اور اس کے ارباب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درمیان کے تعلق وشیفتگی پہ اظہار خیال کرنا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ قدرت کا عطیہ اور ان یگانہ ہستیوں میں سے تھے جو کبھی کبھی منصۂ عالم پر جلوہ گر ہوتی ہیں، لیکن اشخاص چاہے جس مقام و مرتبے پر فائز ہوں دوسرے اشخاص کو اختلاف آراء کا حق حاصل رہتا ہے اور ذوقی، نظری اور علمی خیالات بلکہ اختلافات کی گنجائش رہتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اختلافات کو مخالفت وعدوات میں تبدیل نہ ہونا چاہئے۔ مولانا سید احمد ادریس دہلویؒ جو ایک صاحب دل بزرگ تھے ایک دفعہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی اشغال کے متعلق فرمایا:

"حسین احمد تمہاری سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی، سمجھ میں آتا تو میں تمہارے ساتھ شب روز چکر کاٹتا، لیکن تمہاری مخالفت بھی نہیں کرتا کیونکہ مجھے تمہارے دینی مرتبے کا علم ہے، اور تمہاری مخالفت کر کے میں جہنم کی آگ نہیں خریدنا چاہتا"۔ (قلمی چہرے از شورش کاشمیری۔ ص ۹۸)

حضرت دہلوی جیسے خداترس اور صاحب دل بزرگ کو مولانا حسین احمد کی سیاست سمجھ میں نہیں آتی تو راقم جیسے بے مایہ کو بھی حضرت کی سیاست سمجھ میں نہ آئے تو اس میں کسی کو کوئی حیرت نہ ہونی چاہئے، ہاں میدان سیاست کے علاوہ بھی

تو زندگی کے متعدد میدانوں میں ان کے کمالات وفضائل بے شمار ہیں، چنانچہ آپ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ حضرت شیخ عبد القادر رائے پوریؒ کے ان الفاظ سے لگایئے حضرت فرماتے ہیں: ''مسلمانوں نے حسین احمد اور ابو الکلام کے ساتھ سب وشتم کا جو برتاؤ کیا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں حسین احمد کا تقویٰ اور ابو الکلام کا صبر انہیں لے نہ ڈوبے'' (ایضاص ۹۹)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے بوقلموں خوبیاں دی تھیں، ان کی یہ خوبیاں ان کے شاگردوں نے آپس میں بانٹ لیں، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے علم حدیث لیا، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے قرآن کا علم لیا، مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے میدان سیاست میں جانشینی کا حق نبھایا، اور ایثار وعمل اور تقویٰ ومعرفت میں مولانا حسین احمد مدنیؒ خلف الرشید قرار پائے۔

مولانا بہت پائے کے سیاست داں نہ تھے، ہاں انگریز دشمنی انہیں ورثے میں ملی تھی اور یہی چیز انہیں میدان سیاست تک لے آئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے روح فرسا حالات تو انہوں نے نہیں دیکھے تھے مگر ان کا وجود ۱۹۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علماء کی بغاوت کا مظہر تھا، مولانا پائے کے خطیب بھی نہ تھے مگر گھنٹوں بے تکان بولتے تھے، آپ کی شخصیت ایک مستند عالم دین کے مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ آپ گوناگوں فضائل وکمائل سے مالامال تھے۔ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد حد شمار سے باہر ہے، دنیا میں جہاں دیوبند مکتبہ فکر کے افراد اور ادارے ہوں گے وہاں آپ کے عقیدت مند ضرور موجود ہوں گے، آپ جمعیۃ العلماء کے روح رواں تھے اور آپ کے حلقہ بگوشوں کا آپ کو بھرپور تعاون حاصل تھا، آپ اسیر مالٹا کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں، سالہا سال تک آپ نے روضۂ رسول ﷺ کے پاس بیٹھ کر حدیث کا درس دیا ہے۔ لیکن مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی دو صفات آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بناتی ہیں، ایک عزیمت یعنی آپ کا علماء اور اہل درس کے حلقے سے باہر قدم نکالنا اور وقت کے اہم مسئلے کے حل کے لئے سینہ سپر ہو جانا۔ اور انگریزوں کے دور عروج میں کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فرض انجام دینا دوسری چیز حمیت جس سے آپ کی پوری زندگی عبارت ہے، اسی حمیت نے آپ کو انگریزوں کی مخالفت پر اس حد تک آمادہ کیا کہ جب تک انگریز اس ملک سے چلا نہ گیا آپ کو قرار نہ آیا۔

اس عالی قدر شخصیت کے متنوع فضائل، کمالات، خصوصیات اور امتیازات کا نہ یہاں تذکرہ مقصود ہے نہ ان صفحات میں ان کا احاطہ ممکن ہے، ہمیں تو ندوۃ العلماء سے حضرت مولانا مدنیؒ کے تعلق پر روشنی ڈالنا پیش نظر ہے، مگر اس موضوع پر خاصا مواد موجود نہیں ہے۔ لہٰذا جو کچھ مواد دستیاب ہے وہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی

ندویؒ کے قلم سے نکلی ہوئی چیزیں ہیں جن کے بیشتر حصے کا تعلق حضرت کے گھریلو اور خاندانی پس منظر سے ہے۔

۱۹۳۰ تا ۱۹۴۷ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ خصوصاً شمالی ہند میں رستہ خیزی کا زمانہ ہے، مولانا استخلاص وطن کے اولین قائدین میں تھے، پورے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے، لکھنؤ بھی بار بار آمد رہتی تھی اور حسنی خاندان کے بزرگوں سے عقیدت و شیفتگی کا تعلق تھا، حضرت مولانا علی میاںؒ کے الفاظ میں اس تعلق کی کیفیت ملاحظہ ہو:

''۱۹۳۰-۱۹۳۱ء میں ہمارا مکان لکھنؤ میں مولانا کی مستقل قیام گاہ قرار پایا، راقم سطور کے برادر معظم حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تلمیذ رشید تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبت خاندانی کی بدولت بزرگان دیوبند اس خاندان کے افراد سے ہمیشہ سے محبت و شفقت و یگانگت کا معاملہ کرتے رہے۔ بھائی صاحب جب تک دیوبند میں رہے شیخ الہندؒ کے الطاف وعنایات سے سرفراز رہے، بیعت و ارادت کا اگر کبھی خیال آتا تو نظر حضرت کی ہی طرف جاتی، ابھی اس ارداے کی تکمیل نہیں ہو پائی تھی کہ حجاز کا سفر اور مالٹا کی منزل پیش آگئی، واپسی میں بھی اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اب اس ارادے کی تکمیل اس سے ہوئی جس کو حضرت کے بہت سے ارادوں کی تکمیل کرنی تھی، لکھنؤ بہت سے اسباب وخصوصیات کی بنا پر قومی وسیاسی تحریکوں کا ایک بڑا (غالباً سب سے بڑا) تھا، کانگریس سے لے کر معمولی کمیٹیوں اور سیاسی انجمنوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوتے تھے اور مولانا کو اکثر ان میں شرکت کرنی ہوتی تھی۔ سیاسی انہماک، کانگریس کے جلسوں اور کانفرنسوں کی ہمہ وقت شرکت بھی مولانا کے مزاج، افتاد طبع اور معمولات میں فرق نہیں پیدا کر سکی، سیاسی رہنماؤں اور مندوبین کی قیام گاہ لکھنؤ میں عموماً بڑے ہوٹل، قیصر باغ کے پرانے محلات یا امرا کی کوٹھیاں ہوتی تھیں، مولانا کو اس ماحول سے کبھی مناسبت نہیں رہی، ان کو ایک سادہ بے تکلف قیام گاہ جہاں سے مسجد قریب ہو اور جہاں معمولات آسانی سے پورے ہو سکتے ہوں اور جہاں رہنے اور کھانے میں تکلفات نہ ہوں ہزار درجہ پسند تھی، ہمارا محلہ (بازار جھاؤلال) ہمیشہ سے اس بارے میں ممتاز رہا ہے کہ وہاں صحیح العقیدہ مسلمان رہتے ہیں، والد صاحب (مولانا سید عبدالحی حسنیؒ) کی وجہ سے اور ندوے کے تعلق سے یہ محلہ اور اس کی مسجد ہمیشہ علماء اور فضلاء کا مرکز

رہی ہے، مولانا نے اس محلے اور ہمارے مکان کو لکھنو کے قیام کے لئے منتخب فرمالیا اور اس طویل مدت میں کبھی اس وضع داری اور معمول میں فرق نہیں آیا اور ایسا بھی ہوا ہے کہ سلیم پور ہاؤس یا شاہی بارہ دری کے شاندار ایوان کے جلسے اور مباحثوں میں گھنٹوں شریک رہے اور کھانا ہمارے ''شیرازی'' دستر خوان پر کھایا، خواہ کتنی ہی دیر لگ جائے۔ مسلم پارلی منٹری بورڈ کے زمانہ میں کسی حلقہ انتخاب میں تشریف لے گئے دیر رات گئے تشریف لائے معلوم ہوا کہ کھانا نہیں کھایا ہے ما حضر تناول فرمالیا اور استراحت کی، اس گھر کی یہی ادا (سادگی) آپ کو پسند تھی، اگر کبھی کوئی تکلف کیا گیا تو شکایت فرمائی''۔

(پرانے چراغ حصہ اول ص ۸۸-۸۹)

حضرت مولانا علی میاںؒ چار مہینے دیوبند رہے، ان چار مہینوں میں تقریباً ایک مہینہ مولانا کے دولت کدے پر رہے، ان دنوں کے احوال بیان کرتے ہوئے مولانا اپنی اپنی محبت وعقیدت اور گرویدگی وشیفتگی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

''دیوبند کے قیام میں میرے لئے دلبستگی کا واحد ذریعہ مولانا کی ذات گرامی تھی، میرے لئے وہاں کی درسی ومدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا، سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا رہتا'' (ایضاً ص ۹۲)۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' میں فرماتے ہیں:

''مولانا کو بھائی صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہو گیا کہ لکھنؤ میں ان کے مکان کو مستقل قیام گاہ بنالیا۔۔۔ اس سے پہلے ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا کی زیارت ہوئی تھی، اب اس قیام کی وجہ سے جس کی نوبت جلد جلد آتی تھی اور بعض مرتبہ کئی کئی دن قیام رہتا تھا مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور گھر کا سب سے چھوٹا باشعور فرد ہونے کی وجہ سے خدمت کرنے کا موقعہ ملا، باطنی کمال اور روحانی مرتبہ کا ادراک نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، لیکن اتنا یاد ہے کہ مولانا کے آنے سے گھر میں ایک خاص رونق اور برکت محسوس ہوتی تھی، جس کو ''نورانیت'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں تک کے سادہ کھانے میں بھی (جس کے لئے مولانا کی بڑی تاکید تھی اور اگر کوئی تکلف کی چیز پکتی تھی تو احتجاج فرماتے تھے) عجیب لذت اور ذائقہ محسوس ہوتا تھا، مولانا بھی مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے۔۔۔ یہ پہلی دینی وروحانی شخصیت تھی جس سے میں متعارف اور متاثر ہوا اور الحمد للہ بعد میں اس میں اضافہ ہی ہوا اور عقیدت ومحبت

ابھی تک قائم ہے۔ یہ تاثر مولانا کی تقریروں یا دوسرے کمالات کی بنا پر نہیں تھا جس کا اندازہ اس وقت میرے لئے مشکل تھا، ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھینچتا تھا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھ کو بوسہ دینے کو جی چاہتا، بعد میں جب کچھ عرصہ تلمذ اور صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں مزید اضافہ اور استحکام حاصل ہوا"۔ (کاروان زندگی حصہ اول ص۱۲۴)۔

۱۹۳۲ء جولائی، اگست مطابق ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں مولانا علی میاںؒ اپنے بڑے بھائی صاحب کے مشورے سے مولانا مدنی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، اپنی حاضری کی بابت فرماتے ہیں:

"۱۹۳۲ء جولائی، اگست کو دیوبند حاضر ہوا، مولانا مدنی نے اپنے ہی پاس ٹھہرایا، اس وقت تعلیم اور درس حدیث اپنے نقطۂ عروج پر تھا، مولانا کے یہاں بخاری اور ترمذی ہوتی تھی، میں نے اس میں باقاعدہ شرکت شروع کر دی، بھائی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو تو انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ اب جب میں طویل قیام کر رہا ہوں تو اپنے کھانے کا مطبخ میں باقاعدہ انتظام کرلوں، میں نے مولانا سے اس کی اجازت لی تو کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ اس کی اجازت دی، لیکن فرمایا: ناشتہ ساتھ ہی ہوا کرے گا، میں مولانا کے دولت خانہ سے منتقل ہو کر دار الشفا کے کمرے میں ٹھہر گیا جو متصل ہی تھا۔ مولانا نے جاتے ہی مجھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا ایک رسالہ غالباً "تقریر دلپذیر" مطالعہ کے لئے دیا، نیز مولوی سید محمد طفیل احمد صاحب منگلوری کی کتاب "حکومت خود اختیاری" پڑھنے کو دی"۔

(کاروان زندگی حصہ اول ص۱۲۹)۔

آگے مولانا درس میں نمایاں شان محدثیت، فضا میں طاری نورانیت وسکینت کا تذکرہ فرماتے ہیں، نیز یہ بھی بتاتے ہیں قرآن کی بعض مشکل آیات کی تفہیم کے لئے میں نے درخوست کی اور آپ نے اس کے لئے جمعہ کا وقت عنایت فرمایا۔ مولانا اپنے چار ماہ کے قیام کی بابت فرماتے ہیں:

"دارلعلوم کے اس چار ماہ کے قیام میں میری دلبستگی کا سامان اور میرے انس و عقیدت کا مرکز مولانا مدنی ہی ذات تھی دراصل مناسبت انہیں سے تھی۔ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے: کہئے مولوی علی میاں صاحب آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا؟ تو مجھے دن بھر اس کا مزہ آتا رہتا اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا بقول شاعر:

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر جو بوقت ناز کچھ جنبش تیرے ابرو میں تھی

(ایضاً ۱۳۰)

کئی سال بعد مولانا نے ندوہ کی تدریس کے زمانے میں عربی میں ایک مضمون "صلتي بمولانا حسين أحمد المدني أو صفحة من صفحات حياتي" بھی لکھا جس میں اپنے قلبی تاثرات اور عینی مشاہدات کا ذکر فرمایا: (حوالۂ سابق ص ۱۳۱)۔

۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے عالم عربی کے مختلف ممالک کے تبلیغی اسفار کیے، ان دعوتی کوششوں کی اطلاع مولانا کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ صاحب نے حضرت مدنیؒ کو دی، جس کے جواب میں مولانا مدنیؒ نے ایک مکتوب ڈاکٹر صاحب کے نام ارسال کیا، اس مکتوب کی بابت مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں "اس کو اپنے حق میں ایک بشارت اور تبرک سمجھتا ہوں"۔ مکتوب کا لب لباب ملاحظہ ہو:

"اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ کریم وکارساز موصوف (مولانا علی میاں) کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے، اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے، آمین۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ" (کاروان زندگی حصہ اول ص ۳۹۴)

۱۹۵۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں بہار کے طلبا کی انجمن سجاد لائبریری کے ذمہ داروں نے مولانا علی میاںؒ کو دارالعلوم دیوبند آنے اور طلبا کو خطاب کرنے یا مقالہ پڑھنے کی دعوت دی اور قبولیت دعوت کو یقینی بنانے کیلئے مولانا مدنیؒ اور مولانا اعزاز علیؒ صاحبان سے سفارشی خط لکھوایا، مولانا مدنی کا یہ خط بجنسہ نقل کیا جاتا ہے:

جناب مولانا علی میاں صاحب زید مجدہٗ بعد از سلام مسنون

عرض آنکہ طلبائے دارالعلوم سجاد لائبریری کی پرزور خواہش ہے کہ وہ آپ کی گراں قدر نصائح اور ہدایات سے مستفید ہوں، امیدوار ہوں کہ ان کی تمناؤں کو قبولیت سے نواز دیں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲۰ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ" (حوالۂ سابق ص ۴۰۲)۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ندوہ کے اجلاسوں میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی مگر اپنی بے انتہا مصروفیات کے سبب کسی جلسہ میں شریک نہ ہو سکے تھے، لیکن جب سید عبدالعلی صاحب کے دورِ نظامت میں حضرت کا ندوہ سے ربط و تعلق بڑھا تو بڑھتا ہی چلا گیا، چنانچہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ حضرت مدنیؒ کے ندوہ آمد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''جناب حسین احمد صاحب نے مدرسہ کے عام معاینہ کے علاوہ انجمن الاصلاح کے ایک جلسہ میں ایک بڑی موثر اور ایمان آفریں تقریر فرمائی'' (تاریخ ندوہ حصہ دوم ص ۴۱۱)۔ اس تقریر کا خلاصہ ''الندوہ'' فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

پھر ملت اسلامیہ کا یہ مرد جلیل، حریت و استخلاص وطن کا یہ مرد مجاہد، سرمایۂ دین و ملت کا یہ نگہبان، اسلامیان ہند کا یہ اولی العزم قائد، اقلیم علم و معرفت کا یہ حکمراں، ایک محدث جلیل، ایک مخلص و مستند عالم دین، ایک ماہر معلم اور حکیم مربی، رزم گاہ سیاست کا ایک نڈر و بے باک سپاہی، ایک شیخ طریقت، ایک رواں دواں مصلح و مبلغ اور مرجع خلائق ہستی اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر عالم جاودانی کے سفر پر گامزن ہوگئی، اس جیسی جامع کمالات شخصیت کے بچھڑ جانے کا غم کس غیرت مند مسلمان پر کوہ غم بن کر نہ ٹوٹے گا سو اہل ندوہ کا دل بھی رنج و غم سے نڈھال ہوا، چنانچہ ۳ راگست ۱۹۵۸ء کے جلسۂ انتظامیہ میں منظور کی گئی تعزیتی تجویز اسکی بین دلیل ہے، اس تجویز کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''۲- (الف) ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا یہ جلسہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اس دور پُرفتن میں سلف صالحین اور علمائے راسخین کی سچی یادگار اور آپ کا وجود مسلمانانِ ہند کے لئے باعث برکت و تقویت تھا، اخلاص و تعلق مع اللہ، اصلاح و ارشاد کی سرگرمی، خدمت خلق کا جذبہ، درس حدیث سے شغف اور انہماک، یہ وہ اعلیٰ صفات تھے جنہوں نے آپ کی ذات کو ملت اسلامیہ کا ایک قیمتی سرمایہ اور آپ کی وفات کو عصر حاضر کا ایک ملی حادثہ اور خسارہ بنا دیا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے، اور امت کو آپ کا صحیح جانشیں عطا کرے''۔ (تاریخ ندوہ حصہ دوم ص ۴۴۰) ■

شیخ الاسلام حضرت مدنی کا گنگوہ سے والہانہ تعلق

مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب قاسمی

شیخ الحدیث وناظم جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے مغربی اضلاع پر مشتمل دوآبے کا روحانی علاقہ جتنا مردم خیز رہا ہے اور یہاں کے جیالوں نے علم وعرفان کے جوز مزے بلند کئے ہیں ان سے تاریخ کا ہر فرد بشر واقف ہے، ایک ضلع سہارنپور کو دیکھ لیجئے کہ اس کے اندر برصغیر کی دو سب سے بڑی دینی درسگاہیں دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور اپنی دینی عظمت وشہرت کے لحاظ سے دنیا بھر میں ممتاز مقام رکھتی ہیں، مذکورہ ضلع کے صدر مقام سے تقریباً ۴۲ رکلومیٹر دور مغرب میں خاصان خدا کی مولد ومسکن کا شرف رکھنے والی بستی گنگوہ بھی نہایت مردم خیز رہی ہے، یہاں پانچ صدی سے زائد مدت سے شریعت وطریقت اور روح وروحانیت کی بادِ نسیم چل رہی ہے اس طویل زمانی رقبہ کے دوران بہت سے اصحاب فضل وکمال یہاں کی خاک سے اٹھے، احیاء سنت کی شمع روشن کرنے والے کتنے ہی دیوانوں نے جنم لیا اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر تن من دھن کی بازی لگادی آج بھی ان یاران عشق ووفا کا نام زباں پر آتا ہے تو عجیب لذت محسوس ہوتی ہے ع

زباں پہ بار الٰہ یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

کس کس کا نام لیا جائے اور کس کی خدمات سے صرف نظر کی جائے ان بندگان خدا میں کوئی شبلی تھے تو کوئی اپنے زمانہ کے جنید اور بوذر وسلمان، ان خدامست درویشوں نے دین مبین کی قدروں پر آنچ نہیں آنے دی، آج دنیا انہیں شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ، شاہ ابوسعید نعمانی متوفی ۱۶۳۰ء شیخ عبدالنبی نعمانی متوفی ۱۵۸۴ء

مولانا رشید احمد گنگوہی متوفی ۱۹۰۵ء مفتی محمود حسن گنگوہی متوفی ۱۹۹۶ء اور مولانا قاری شریف احمد گنگوہی متوفی ۲۰۰۵ء کے نام سے یاد کرتی ہے اور ان کی خدمات کو سلام کرتی ہے اوسط الذکر قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی حیات و خدمات پر صرف طائرانہ نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ اس زمین پر اللہ کی کتنی بڑی نشانی تھے اور ان کے علمی و روحانی فیوض و برکات کا کس قدر عرفان ہوا ع

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر آپ کے تلامذہ و مسترشدین میں کیسے کیسے رازی اور غزالی بن کر نکلے جن کی مجاہدانہ قربانیوں نے ملک و ملت کی کایا پلٹ دی اپنی زندگی اپنا راحت و آرام سب کچھ قربان کردیا، آج اس چمن میں جو بہاریں محسوس ہوتی ہیں اور پھول پتیوں میں جو مہک برقرار ہے یہ انہیں اسلاف امت کی بے مثال جدوجہد کا ثمرہ ہے، ذرا ماضی کے اوراق پلٹ کر دیکھئے اور یاد کیجئے وہ فرنگی دور جب اس ملک پر برطانوی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا غلامی کے مضبوط پھندوں نے دل و دماغ کو مفلوج بنادیا تھا، ملک کا اکثریتی طبقہ آنکھ مچولی کررہا تھا لیکن یہ بوریہ نشیں علماء ہی تھے جو کفن بردوش ہوکر میدان میں آئے تھے یہ حضرت گنگوہیؒ حضرت نانوتویؒ اور ان کے کفش بردار ہی تھے جنہوں نے گوروں کو للکارا تھا اور انہیں سات سمندر پار کا راستہ اپنا لینے پر مجبور کیا تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید احمد مدنیؒ بھی انہیں علماء کی صف میں شامل تھے جن کی روحانی تربیت اس قصبہ گنگوہ میں امام ربانی قطب صمدانی عالم حقانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی چوکھٹ پر ہوئی، جہاں ملک کی تقدیر سنورنے کے فیصلے تجویز ہوتے تھے۔

چنانچہ حضرت گنگوہیؒ سے روحانی استفادہ کرنے والوں میں ایک جامع الکمالات منبع الفیوض والبرکات ہستی حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کی بھی ہے، آپ ۱۹ ر شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے، آپ کے فیض سے ایک عالم سیراب ہوا اور ہورہا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس داستانِ عشق و محبت کو اور اس تعلق سلوک و روحانیت کو خود ان کی زبانی سنیں اس لئے حضرت قدس سرہ کے دست مبارک کی لکھی ہوئی تحریر پیش کی جاتی ہے کیونکہ اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات جتنا خود بیان کرسکتا ہے دوسرے اس کی وہ ترجمانی نہیں کرسکتے، چنانچہ حضرت لکھتے ہیں۔

استفادۂ طریقت و روحانیت کی کہانی حضرت مدنیؒ کی زبانی

پہلے ذکر آچکا ہے کہ خاندان کے اسلاف اہل معرفت و طریقت تھے صرف اخیر میں دو تین پشتیں دنیادار زمینداروں کی ہوگئی تھیں، نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہانِ دہلی سے خاندان کو چوبیس گاؤں دیئے گئے تھے،

شاہ مدنؒ کے بعد شاہ نور اشرف مرحوم نے سجادہ طریقت اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائداد کا انتظام سنبھالا، اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہو گئیں، مگر خاندان میں کوئی شخص باہر کسی دوسرے خاندان سے بیعت نہ ہوتا تھا، والد صاحب مرحوم سب سے پہلے باہر بیعت ہوئے، جس کی صورت یہ پیش آئی کہ ان کی شادی نانا اکبر علی مرحوم کی دختر سے ہوئی (نانا صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں تمام جائداد کے متصرف تھے اور ۱۸۵۸ء میں امن قائم ہونے پر ضلع بستی سے واپس آتے ہوئے دریائے گھاگرا میں کشتی الٹ جانے سے ڈوب گئے تھے) نانی صاحبہ مرحومہ نندرولی ضلع فیض آباد کی رہنے والی تھیں اور صاحب کشف ونسبت تھیں، انہوں نے اپنے ماموں سے میکہ ہی میں سلوک طے کیا تھا ان کے ماموں بہت بڑے صاحب نسبت تھے، والد صاحب مرحوم کو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ تمہارے گھرانے میں مرید کرنے کا طریقہ جاری ہے، مگر یہ غلط ہے جب تک کسی کامل سے بیعت ہو کر منازل سلوک طے نہ کر لئے جائیں مرید کرنا جائز نہیں، قیامت میں سخت وبال ہوگا اسلئے والد صاحب مرحوم کو شیخ طریقت کی تلاش تھی، خاندان کے دوسرے لوگوں نے بغیر سلوک، خاندانی نام پر یہ سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور ان خاندانوں میں جو کہ اضلاع بستی گونڈہ، گورکھ پور وغیرہ میں سلسلہ اسلاف میں داخل ہوتے جاتے تھے اور نذرانہ وغیرہ وصول کرتے تھے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے، والد صاحب مرحوم جب صفی پور میں مدرس اور ہیڈ ماسٹر ہوئے تو چونکہ گنج مراد آباد شریف قریب تھا اور ان اطراف میں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کا شہرہ تھا، ان کی کرامت اور بزرگی بہت زیادہ زبان زد عوام وخواص تھی اس لئے حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں آمد ورفت شروع کی اور وہ کمالات جو اہل اللہ میں ہونے چاہئیں دیکھ کر گرویدہ ہو گئے، اور انہیں سے بیعت ہو گئے اور حسب تعلیم وارشاد فرائض سلوک انجام دینے لگے۔

جہاں تک معلوم ہے حضرت مولانا قدس اللہ سرہ العزیز نے طریقہ قادریہ کا سلوک حضرت والد صاحب مرحوم کو تلقین فرمایا تھا، اور پھر جب تبدیلی بانگر مئو کی ہوگئی تو بہت زیادہ حاضری کا موقعہ مل گیا کیونکہ بانگر مئو گنج مراد آباد سے بہت ہی زیادہ قریب ہے غالباً دو یا تین ہی میل کا فاصلہ ہے، پھر والدہ مرحومہ کو بھی مولانا ہی سے بیعت کرایا۔

خاندان کے لوگوں نے والد مرحوم پر باہر بیعت کرنے پر اعتراضات بھی کئے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، والد صاحب کے ارشاد پر ہم تینوں بھائیوں مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم اور مولانا سید احمد صاحب مرحوم اور راقم الحروف کو بھی دیوبند سے بعض اوقات میں واپسی پر گنج مراد آباد بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جب بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق صاحب) دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے

تو انہوں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کی اجازت والد صاحب مرحوم سے طلب کی والد صاحب کی منشا طبعی طور پر یہی تھی کہ وہ حضرت گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز ہی سے بیعت ہوں، دونوں میں عرصہ تک خط وکتابت رہی بالآخر والد صاحب مرحوم نے ان کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت دے دی اور وہ ان سے بیعت ہو گئے، اس عرصہ میں بھائی صاحب مرحوم بلند شہر اور سہوارہ وغیرہ بصیغۂ تدریس ملازم رہے اور حسب تعلیم ذکر وشغل بھی برابر کرتے رہے۔

۱۳۱۶ھ میں جب کہ والد صاحب مرحوم نے بعد وفات حضرت مولانا گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز ارادۂ ہجرت کیا (چونکہ والد صاحب مرحوم کو حضرت مولانا قدس اللہ سرہ العزیز سے بہت گہرا تعلق تھا اور تقریباً ان میں فنا تھے، اس لئے مولاناؒ کے وصال سے انکو اسقدر صدمہ ہوا کہ ہندوستان میں بسر کرنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا، اسی وقت سے اس فکر میں ہو گئے کہ کوئی انتظام کرکے مع جملہ متعلقین مدینہ منورہ میں گزر بسر کی جائے) اور ماہ شعبان میں بھائی صاحب جائے ملازمت سے دیوبند پہنچے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ ان دونوں (بھائی سید احمد صاحب اور حسین احمد) کو حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کرادو خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلے پڑ جائیں، کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں، بھائی صاحب مرحوم نے ہم سے فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوں گا۔

واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ گنگوہ میں ایام طالب علمی میں بارہا حاضری کی نوبت آچکی تھی مگر حسن عقیدت اور محبت حضرت شیخ الہندؒ ہی سے تھی، بچپن سے ان کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لے کر آخری کتابوں تک کا اکثر حصہ انہیں سے پڑھتا رہا تھا، مضامین علمیہ اور اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے، حضرت شیخ الہندؒ ایسے الطاف وکرم فرماتے تھے جو کہ اولاد کے لئے ہوتے ہیں، اس لئے پوری وابستگی انہیں سے تھی، حضرت گنگوہیؒ کو بہت بڑا عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل سمجھتا تھا بھائی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ حضرت شیخ الہندؒ بیعت نہیں کرتے، میں نے خود بہت کوشش اپنے لئے کی تھی جب راضی نہیں ہوئے اور حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہو جانے کا ہی ارشاد فرمایا تب میں وہاں بیعت ہوا، تم دونوں کیلئے بھی ان کا یہی ارشاد ہے، بالآخر وہاں ہم دونوں حاضر ہوئے، اس زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی وہیں خانقاہ میں رہتے تھے، اور مشاغلِ سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطب عالمؒ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے، بھائی صاحب مرحوم نے ان کو خط لکھ دیا تھا کہ ان دونوں کو حضرتؒ سے بیعت کرا دیجئے، جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے دونوں کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ مولوی صدیق احمد صاحب نے اپنے دونوں

چھوٹے بھائیوں مولوی سید احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لئے بھیجا ہے وہ حاضر ہیں، حضرتؒ کی عادت تھی کہ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ ردوقدح فرمایا کرتے تھے، بالخصوص لکھے پڑھے اور عربی تعلیم یافتہ لوگوں کے متعلق تو بہت زیادہ کنج وکاؤ اور گفت وشنید کی نوبتیں آتی تھیں، بعض حاضرین اور بے تکلف خدام مثل مولانا محمد یحیٰ صاحب مرحوم کاندھلوی کے دریافت کرنے پر یہ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کس شخص کو مجھ سے قلبی مناسبت ہے اور کتنی مناسبت ہے، اگر مناسبت نہیں ہوتی تو میں انکار کردیتا ہوں ورنہ بیعت کرلیتا ہوں، بہر حال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس وپیش نہیں فرمایا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے پیش فرمایا اور حضرتؒ نے بیعت فرمالیا، مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کرلیا اب تم مکہ معظمہ جارہے ہو وہاں حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز) موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرمادیں گے، پس اسی روز ہم دیوبند واپس آگئے اور پھر وطن کو روانہ ہوگئے، دیوبند سے رخصت ہوتے وقت حضرت شیخ الہندؒ پیدل اسٹیشن تک ساتھ ساتھ تشریف لائے اور راستہ میں صدر چوکی کے پاس وصیت فرمائی کہ پڑھانا نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی طالب علم پڑھنے والا ہو۔

برکاتِ بیعت

اگر چہ بیعت بادل ناخواستہ ہوئی تھی مگر اس کے آثار مبارکہ میں نے اپنے اندر اسی دن محسوس کئے اس سے پہلے کبھی کبھی نماز چھوٹ جاتی تھی مگر اس روز سے برابر مداومت ہوگئی کبھی قضا نہیں ہوئی، اور اگر کسی عذر قوی سے بلا اختیار فوت بھی ہوگئی جو کہ شاذ ونادر ہوئی تو قضا کرلی گئی (جو نمازیں بیعت سے پہلے کبھی کبھی فوت ہوئی تھیں ان کو بھی ایام اسارت احمد آباد میں تخمینہ کر کے ادا کرنے کی توفیق ہوئی، وللہ الحمد)۔

بیعت کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے اور اس کے بیچ میں ایک قبر ہے جو کہ حضرت خواجہ علاؤ الدین صابرؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ہے، خواب میں ایک ہی قبر کو دونوں بزرگوں کی قبر سمجھ رہا ہوں میں اس قبر کی طرف جارہا ہوں اور بالکل قریب پہنچ گیا ہوں، میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہندؒ کے پاس لکھ کر بھیجا وطن پہنچتے ہی الہ آباد کو (جو کہ اس زمانہ میں یوپی کے حجاج کیلئے قرنطینہ کا مقام مقرر کیا گیا تھا) روانگی ہوگئی، وہاں تقریباً پندرہ بیس دن قیام کرنا پڑا، یہ جگہ شہر کے باہر پریاگ کے قریب خصوصی انتظام کے ساتھ حجاج کیلئے علیحدہ بنائی گئی تھی، وہیں جواب منگایا، حضرت اس وقت گنگوہ شریف میں بارادہ قیام رمضان شریف مقیم تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے اس خواب کو حضرت قطب عالم گنگوہیؒ سے ذکر کیا تو تعبیر میں فرمایا لکھ دو کہ منزل مقصود کو پہنچے گا، یہ جوابی خط الہ آباد میں قرنطینہ کے کیمپ میں موصول ہوا، سفر حج کرتے

ہوئے جبکہ اواخر ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ میں حاضری مکہ معظمہ نصیب ہوئی تو جائے قیام پر اسباب وغیرہ منظم کرنے کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں صبح کو حاضر ہونے کی عزت نصیب ہوئی، موصوف اس وقت بہت ضعیف ہو گئے تھے، اکثر لیٹے رہتے تھے، صبح کو مثنوی شریف پڑھایا کرتے تھے اس وقت پلنگ پر کچھ دیر بیٹھ جایا کرتے تھے، مولانا محب الدین صاحبؒ اور مولانا شفیع الدین صاحبؒ اور چند حضرات حاضر درس ہوتے تھے، جب ہم سب مع والد محترم حاضر بارگاہ ہوئے تو حضرت قطب عالم نے بہت توجہ فرمائی حضرت گنگوہیؒ کا سلام و پیام سنکر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا کہ تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں ان سے ملاقات ہو جاتی۔

بالآخر ہم دونوں بھائی (سید احمد صاحب اور راقم الحروف) نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہیؒ نے ہم کو بیعت تو کر لیا تھا مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقین ذکر حضرت سے حاصل کر لینا تو آپ نے پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو آ کر یہاں بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو، چنانچہ جب تک مکہ معظمہ میں رہنا ہوا حتی الامکان روز حاضر ہوتے رہے، چونکہ زمانہ حج قریب تھا اس لئے جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ جس میں عرفات منیٰ وغیرہ کا سفر ہوا، حج سے فارغ ہونے کے بعد پھر خدمت میں چند دنوں حاضری کا شرف حاصل ہوا، جب قافلہ حجاج اخیر عشرۂ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو خلاف معمول بعد از ظہر ہم تینوں کو حاضری کا شرف حاصل ہوا، حضرت نے بہت شفقت فرمائی اور سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، ہم نے سکوت کیا تو فرمایا کہ کہو ہم نے قبول کیا ہم نے حسب تلقین عمل کیا، حضرتؒ نے دعا فرمائی ہم نے رخصتی مصافحہ کیا اور پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کچھ ایسی مشغولیتیں پیش آئیں کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت نہ ہو سکی، چند مہینے کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا ماہ جمادی الاول میں وصال ہو گیا۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جب کہ قصیمہ سے رابغ کو قافلہ جا رہا تھا رات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں میں قدموں پر گر گیا، آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کے سمجھنے کی قوت پیدا ہو جاوے تو فرمایا کہ تجھ کو دیا۔

مدینہ منورہ پہنچنے سے کچھ عرصہ بعد بعض ہندوستانیوں اور بعض عربوں کی خواہش ہوئی کہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا جائے، نحو صرف وغیرہ کی کتابیں ایک ایک دو دو آدمیوں کو خالی اوقات میں حسب ارشاد حضرت شیخ الہندؒ حرم محترم نبویؐ میں پڑھانے لگا اور دن کے باقی اوقات میں دوکان کا کام کرتا تھا یا کتابت کا، کیونکہ

روزگار کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے یہ مشغلہ تھا کہ اجرت پر بعض کتابوں کو کتب خانہ سے نقل کرتا اور کبھی کبھی اس دوکان پر بیٹھتا (جو بڑے بھائی صاحب نے بازار میں کھولی تھی جس میں شکر، چائے، چاول، صابون وغیرہ بکتا تھا، اور نوبت بنوبت ہم تینوں اس پر بیٹھتے تھے) ان مشاغل نے اس قدر مشغول کیا کہ ذکر پر کوئی مداومت نہ ہوسکی، حضرت قطب عالم قدس اللہ سرہ العزیز کے وصال کے بعد شوق پیدا ہوا کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت کی جائے، چنانچہ حرم محترم (مسجد نبویؐ) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت قطب عالم گنگوہیؒ سے محبت اور تعلق قلب میں بڑھنا شروع ہوا اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح حضرت گنگوہیؒ کی محبت بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ حضرت شیخ الہندؒ کے تعلق پر ان کا تعلق بہت بڑھ گیا حالانکہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق کم نہیں ہوا بلکہ اپنی حالت پر ہی قائم رہا، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلسلۂ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی، اس اثناء میں رویاءِ صالحہ اور جناب رسول اللہ ﷺ کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں، مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں چونکہ لوگوں کا مجمع ہر وقت رہتا ہے اس لئے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے، وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا چنانچہ روزانہ ایسے وقت میں ناشتہ کر کے باوضو مسجد شریف میں داخل ہوکر تحیۃ المسجد ادا کر کے مواجہہ شریف (قبر مبارک کے سامنے کی وہ جگہ جو کہ چہرۂ مبارکہ کے سامنے ہے) میں حاضر ہوتا، آداب والفاظ شرعیہ زیارت کے بعد جس قدر ممکن ہوتا الفاظ صلوٰۃ وسلام بجالا کر پھر مسجد شریف میں جہاں خالی جگہ پاتا وہاں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ (جس قدر جی لگتا تھا) ذکر میں مشغول رہتا تھا مگر جب آثار ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں کی شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا، مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے (مدینہ منورہ کا مقبرہ) آبادی نہیں ہے ادھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں (یہ مسجد مشہور ہے اور اب بالکل جنگل میں واقع ہے یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ ﷺ کی مقبول ہوئی ہیں) اور کبھی اسی کے قریب کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا۔

اسی حالت پر ایک مدت گزری جو حالتیں یا رویائے صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں ان کو قلمبند کر کے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا، ایک روز مسجد نبویؐ میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا عصر بیٹھا ہوا تھا یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی کا جسم ہوگیا ہے یہ حالت اس قدر قوی ہوگئی کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی، یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہوگئی میں نے اس حالت کو بھی لکھا، حضرتؒ نے جواب میں

فرمایا کہ یہ حالت فنافی الشیخ ہونے کی ہے ۱۳۱۸ھ شوال میں والا نامہ گنگوہ شریف سے وارد ہوا کہ اگر چہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہوتا کہ تو ایک مہینہ کیلئے گنگوہ آجاتا، چونکہ والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحبان میری مشغولی ذکر اور بعض رویاء وغیرہ سے واقف تھے ادھر اس والا نامہ سے بھی واقف ہو گئے تھے، اس لئے جب کہ میں نے اس والا نامہ کے مضمون کی وجہ سے سفر کی اجازت طلب کی تو والد صاحب مرحوم نے بجز قلت خرچ اور کوئی عذر پیش نہیں فرمایا اور یہ واقعی تھا چونکہ اس مدت میں سرمایہ تقریباً قریب الختم ہو چکا تھا اس لئے مجبوراً سکوت کرنا اور سفر سے باز رہنا پڑا، مگر بڑے بھائی صاحب کو (مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم) جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات کے انجام دینے والے تھے اور ہندوستان سے روانگی پر جب کہ حضرت گنگوہیؒ سے انہوں نے اپنے ذکر وشغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی، اور حضرتؒ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اب تو چلے جاؤ پھر وہاں سب کو چھوڑ کر چلے آنا یہ مقولہ یاد آگیا، اور ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی اور انہوں نے خفیہ طریقہ پر انتظام شروع کردیا، ماہ ذیقعدہ میں جب کہ ایک قافلہ مدینہ منورہ سے رابغ کو روانہ ہو رہا تھا اس کے ساتھ چھپ کر بارادہ ہندوستان روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ساٹھ یا ستر روپے لے گئے، گھر میں جب دن بھر نہیں آئے تو تلاش ہوئی ان کے کمرے میں ایک تحریر لٹکی ہوئی پائی گئی جس میں انہوں نے ارادہ کا تفصیلی ذکر لکھا ہوا تھا، اس پر مطلع ہونے کے بعد حضرت والد صاحب مرحوم نے مجھ کو فرمایا اب تو بھی جا تجھ کو وہاں سے طلب کیا گیا تھا مگر وہ روانہ ہو گئے ہیں خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے میں متوقف تھا، ان کو راستہ میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہوگی، چنانچہ انہوں نے زاد راہ کا انتظام کردیا، بھائی صاحب مرحوم رابغ سے بادبانی جہاز پر جدہ پہنچے راستہ میں تکلیف زیادہ ہوئی طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کم تھی تنہائی بھی تھی جدہ میں کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہیں ملا دو چار روز جدہ میں رہ کر پریشان ہو گئے اور والد صاحب مرحوم کو مفصل خط لکھا کہ اب میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں اور چونکہ حج کا زمانہ قریب آگیا ہے حج کر کے واپس آجاؤں گا، والد صاحب مرحوم عزائم کے بہت پختہ تھے ان کو ناگوار ہوا، اور مجھ کو کہا کہ تو جا کر ان کو واپسی کے ارادہ سے باز رکھ اور تم دونوں ہندوستان کو روانہ ہو جاؤ، مجھ کو بھی تقریباً ساٹھ روپے خرچ کیلئے عطا فرمائے اور مال لانے والے قافلہ میں جبکہ وہ مال پہنچا کر واپس ینبع البحر کو جارہا تھا تاجروں کے ذریعہ پشت شتر کرایہ کر کے روانہ کردیا، اگر چہ قوافل ینبع سے پانچ یا چھ دن میں آتے ہیں مگر یہ خالی اونٹ تھے مختصر راستوں سے پہاڑوں میں ہوتے ہوئے رات دن چل کر دو یا تین دن میں ینبع پہنچ گئے، اتفاق سے خدیوی ڈاک کا جہاز جدہ جانے والا آیا ہوا تھا، فوراً اس پر سوار ہو گیا اور اگلے روز جدہ پہنچ گیا وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم گھبرا کر مکہ معظمہ روانہ ہو گئے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جہاز ممبئی سے آیا ہوا ہے اور وہ ممبئی واپس ہونے والا ہے میں نے اس کو غنیمت کبریٰ سمجھ کر یہ

چاہا کہ میں جلد سے جلد حضرتؒ کی خدمت اقدس میں بھائی صاحب مرحوم سے پہلے پہنچ جاؤں اوران کواس جلد بازی اور چھپ کر آنے کی سزا دیدوں اس کا ٹکٹ چالیس روپے میں خرید لیا اور ایک خط مکہ معظمہ میں بھائی صاحب اور ایک مدینہ منورہ میں والد صاحب مرحوم کو تفصیلی لکھ دیا اور اپنی روانگی کی اطلاع دیکر جہاز پر سوار ہوگیا، مگر ایک روز کے بعد ہی ممبئی سے تار آ گیا کہ جہاز ممبئی نہ آئے بلکہ جدہ ہی میں ٹھہرا رہے حج کے بعد حجاج کو لیکر واپس ہو، اس بنا پر ایک یا دو دن جہاز میں رہنے کے بعد جدہ واپس آنا پڑا، یہ تاریخیں اواخر ذیقعدہ کی تھیں ٹکٹ کے روپے واپس لیکر اب یہی ضروری معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ روانہ ہو کر نعمت حج اور رفاقت بھائی صاحب مرحوم کا شرف حاصل کیا جائے، چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اطلاع دیدی اور چونکہ خرچ کم تھا اور اسباب بھی زائد نہ تھا یکم ذی الحجہ شام کے وقت پیدل مکہ معظمہ روانہ ہوگیا، قرب حج کی وجہ سے راستہ میں پیدل جانے والوں کی کثرت تھی اخیر شب میں بحرہ پہنچ کر کچھ آرام کیا اور پھر دن بھر چل کر شام کو مکہ معظمہ پہنچا۔

بھائی صاحب مرحوم میرے خط اور جہاز کی خبر سے سخت پریشان اور پشیمان ہوگئے تھے، اس واقعہ سے بہت خوش ہوئے، بفضلہ تعالیٰ اداء مناسک حج سے فارغ ہو کر جب جدہ پہنچے تو سفر شروع کیا چونکہ مجھ کو بحری سفر میں چکر نہیں آتا اس لئے اس تمام سفر میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی، اس بحری سفر میں میں نے ایک شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں مکہ معظمہ میں حاضر ہوا ہوں آپ نے فرمایا تو جو کھجوریں مدینہ منورہ کی دے گیا ہے اس کو آ کر تقسیم کر دے میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو آپ کے لئے لایا ہوں میرے یہاں تو ان کی دوکان ہے تو فرمایا کہ نہیں تو ان کو تقسیم کر دے میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں کھجوریں کن دقتوں سے حاصل ہوتی ہیں، اس خواب کو میں نے گنگوہ شریف پہنچ کر جب حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز سے ذکر کیا تو فرمایا کہ تجھ کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے اجازت ہوگئی میرے یہاں سے بھی ہو جائے گی، اس تعبیر پر میں شرمندہ ہوگیا کیونکہ میرے وہم وخیال میں بھی اس وقت اجازت حاصل کرنے کی طلب نہ تھی اور خیال ہوا کہ حضرتؒ سمجھیں گے کہ طلب خلافت اس کی غرض وغایت ہے۔

بہر حال سفر کرتے کرتے سہارنپور پہنچے چونکہ ہمارے پاس مدینہ منورہ کی کھجوریں اور دیگر تبرکات تھے اور کھجوروں پر چنگی لگنی ضروری تھی، پیسے پاس نہ تھے اس لئے مع اسباب اسٹیشن کی مسجد میں ٹھہر گیا اور بھائی صاحب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں اس لئے چلے گئے کہ وہاں سے کچھ پیسے لاکر چنگی والوں کو دے دئے جائیں گے مگر مولانا مرحوم نے ان کو روک لیا اور کسی خادم کو مع پیسوں کے بھیج دیا، پھر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت مجھ کو بھی نصیب ہوئی، بھائی صاحب مرحوم وہاں سے براہ راست

گنگوہ شریف روانہ ہو گئے، مگر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے دیوبند حاضر ہولوں اس کے بعد وہاں سے گنگوہ شریف کا قصد کرونگا، جو ہدایا وہاں کے حضرات کے ہیں وہ بھی پہنچا دیئے جائیں گے اور ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو جائے گا اور پھر باطمینان گنگوہ شریف میں قیام ہو سکے گا، گنگوہ شریف کے لئے جو تبرکات عامہ تھے وہ بھائی صاحب اپنے ساتھ لے گئے مگر حجرہ شریفہ کا غبار مسجد شریف کی کھجوریں (اس زمانہ میں صحن مسجد نبویؐ میں بھی چند درخت کھجوروں کے تھے) اور بعض خصوصی دیگر تبرکات میرے ہی پاس تھے چونکہ حجرہ مطہرہ نبویہؐ کے خاص خدام جن کو آغاوات کہتے ہیں مجھ سے پڑھا کرتے تھے اس لئے خصوصی تبرکات مجھ کو حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی، میں اول دیوبند گیا اور حضرت شیخ الہندؒ اور دیگر اساتذہ کرام سے شرف ملاقات حاصل کیا، میری ایک غرض اس میں یہ بھی تھی کہ میں حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں تنہا اور پیادہ پا حاضر ہوں بھائی صاحب پیادہ چلنے پر راضی نہ تھے۔

چونکہ ہم کو جدہ سے روانہ ہو کر تقریباً دو ماہ گزر چکے تھے اس لئے حضرت والد صاحب مرحوم بیتاب تھے کیونکہ اس مدت طویل میں ان کو کوئی خبر ہماری نہیں ملی تھی وہ اس خیال میں تھے کہ جہاز آٹھ دس دن میں ممبئی پہنچتا ہے تو پندرہویں سولہویں دن ممبئی یا کراچی پہنچنے کی خبر آجانی چاہیے، اس لئے انہوں نے گنگوہ شریف حضرت قطب عالمؒ کی خدمت میں خط بھیجا کہ بقصد حاضری بارگاہ عالی میرے فلاں فلاں لڑکے روانہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر ان کے پہنچنے کی معلوم نہیں ہوئی، اس لئے فکر ہے اس لئے وہاں بھی انتظار تھا، بھائی صاحب مرحوم کے پہنچنے سے پہلے حضرتؒ نے دو جوڑے نئے کپڑوں کے کرتہ پانجامہ تیار کرار کھے تھے جب بھائی صاحب پہنچے تو فرمایا کہ میں نے تم دونوں کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تیار کرار کھا ہے مگر جب دوں گا کہ حسین احمد آجائے، نیز پوچھا کہ حجرہ شریفہ کا غبار بھی لائے ہو یا نہیں؟ بھائی صاحب نے فرمایا کہ وہ حسین احمد کے ساتھ ہے جو تبرکات کھجوریں زمزم وغیرہ بھائی صاحب لے گئے تھے ان کو پیش کیا اور مشرف بقبولیت ہوئے۔

دیوبند میں ایک دن قیام کرنے کے بعد ظہر کے بعد پیدل روانہ ہوا اور چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے راتوں رات چل کر صبح کو نو دس بجے گنگوہ شریف پہنچا، اپنی نالائقی اور تن پروری اور راہ طریقت میں کسلمندی وغیرہ کی وجہ سے خجالت اور شرمندگی کا اثر بہت قوی تھا، اس لئے راستہ میں برابر گریہ طاری رہتا تھا اور شوق حضوری بارگاہ کشاں کشاں قدم بڑھا رہا تھا، بالآخر حاضر خدمت ہوا اور شرف ملاقات سے فیضیاب ہوا بہت زیادہ شفقت فرمائی اور وہ دونوں جوڑے عنایت فرمائے، چونکہ ان میں عمامے نہ تھے، اس لئے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہم اپنے اپنے عمامے لے آتے اور پیش کرتے ہیں آپ اپنی طرف سے ہم کو وہ عطا فرمادیں تاکہ جوڑا مکمل ہو جائے، تو ارشاد فرمایا کہ نہیں پھر دیکھا جائے گا، اس کے بعد ذات حق کا مراقبہ تعلیم فرمایا اور کہا کہ یہ

چیز وہاں کسی طرح لکھی جا سکتی تھی۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ حاضر باش خدمت تھے، ان سے کہلوایا کہ دونوں سے پوچھو کیوں آئے ہیں؟ اگر مدرسی یا ملازمت کے قصد سے آئے ہوں تو کوئی کوشش کی جائے، مجھ کو اس پر تعجب ہوا میں نے عرض کیا کہ میں کسی دنیوی مقصد یا نفسانی غرض سے نہیں آیا، میرا مقصد بجز طلب ذات حق سبحانہ اور کوئی نہیں ہے، ارشاد ہوا تھا کہ ایک مہینہ کے لئے تو یہاں آ جا اس لئے حاضر ہوا ہوں میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا اس کو سن کر سکوت فرمایا۔

خانقاہ قدوسیہ میں ہر ایک کو ایک ایک حجرہ مل گیا اور وہاں رہنے لگے، کھانے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ ہمارے یہاں سے دونوں کا کھانا آیا کرے گا، چنانچہ جب تک قیام رہا حضرتؒ کے یہاں سے ہی کھانا آتا رہا، غبار حجرہ مطہرہ پیش کیا گیا اس کو سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ اس سرمہ کو استعمال فرماتے رہے، مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کھجوروں کے تین دانے پیش کئے گئے ان کو تقریباً ۲۰ حصوں میں کر کے تقسیم فرمائے، مدینہ منورہ کی کھجوریں جو تقسیم کی گئیں ان کے متعلق ہدایت فرمائی کہ ان کی گٹھلیاں پھینکی نہ جائیں ان کو ہاون دستہ میں کٹوا کر رکھ لیا اور روزانہ اس میں سے تھوڑا سا پھانک لیا کرتے تھے، میں نے تعلیم فرمودہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا عصر کے بعد جب کہ صحن میں مجلس عمومی فرماتے تھے تو میں اس مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ (جس میں حضرتؒ رہتے تھے) کے برآمدہ میں ستون کے پیچھے (تقریباً دو تین گز فاصلہ سے) مشغول ہو جاتا تھا، مغرب کے وقت تک مشغول رہتا تھا، حضرتؒ کے یہاں مثل مشائخ نقشبندیہ توجہ اور حلقہ کی کوئی مجلس نہیں ہوتی تھی البتہ مسترشدین اپنی اپنی جگہ اپنے مشغلہ قلبی میں مشغول ہو جاتے تھے، عادت شریف یہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد حجرہ شریفہ میں داخل ہوتے اور دروازہ بند کر لیتے، مشاغل روحانیہ میں مشغول رہ کر ڈیڑھ دو گھنٹہ دن چڑھنے کے بعد دروازہ کھلتا اور صحن میں گولر کے درخت کے نیچے بیٹھتے تھے، مہمانوں سے باتیں، خطوط کے جوابات، فتاویٰ وغیرہ اسی وقت انجام پاتے تھے، یہ عام مجلس تقریباً گیارہ بجے تک رہتی تھی، مسترشدین کو اگر کوئی بات مجمع میں پوچھنی ہوتی تھی اسی وقت پوچھتے تھے ذاکرین اپنے کمروں میں مشغول رہتے تھے، اس کے بعد حضرتؒ مکان تشریف لے جاتے تھے اور کھانے کے بعد تشریف لا کر قیلولہ فرماتے تھے، ظہر کے بعد حجرہ شریفہ میں دروازہ بند کر کے تلاوت قرآن شریف وغیرہ میں تھوڑی دیر مشغول رہتے تھے پھر دروازہ کھلتا تھا، اس زمانہ میں معجم کبیر طبرانی کا ایک قلمی نسخہ آیا ہوا تھا، چونکہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے اس لئے اسی وقت مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

عصر کے بعد خدمت میں قریب بیٹھ کر مشغولیت مراقبہ سے مجھ کو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا،

چند دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی میدان میں وہ گولر جو صحن حجرہ میں تھا اور اس کے سایہ میں حضرتؒ بیٹھا کرتے تھے کھڑا ہے اور اس میں گولر پکے ہوئے لگے ہیں، کچھ لوگ ڈھیلے پھینک رہے ہیں تا کہ پکا ہوا گولر حاصل کریں، میں نے بھی یہی کوشش کی مگر کوئی گولر ہاتھ نہیں آیا یکایک دیکھا کہ ایک پکا ہوا گولر مع اس ٹہنی کے جس میں وہ لٹک رہا تھا خود بخود ٹوٹا اور لٹکتا ہوا نیچے اترتا ہوا آہستہ آہستہ میرے پاس آ گیا اور میں نے ہاتھ میں لے لیا ہے، اس خواب کو میں نے حضرتؒ سے عرض کیا تو فرمایا کہ ثمرۂ مقصود ہاتھ آئے گا۔

ایک روز عشاء کے بعد دوسرے خدام کے ساتھ میں بھی حضرتؒ کا بدن دبا رہا تھا، میں پشت کی طرف تھا، دباتے دباتے آنکھ جھپک گئی تو دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ چالیس دن گزرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا، اس تاریخ کے ٹھیک چالیس دن گزرنے پر عصر کے بعد حضرتؒ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ بھائی صاحب لے آئے، حضرتؒ نے ہر ایک کے سر پر اس کا عمامہ باندھ دیا جس وقت حضرتؒ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زوردار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مائیگی اور خجالت کا شدید احساس تھا، اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیسی دستار ہے؟ بھائی صاحب نے عرض کیا کہ دستار فضیلت ہے فرمایا کہ "نہیں دستار خلافت ہے" میری طرف سے تم دونوں کو اجازت ہے۔

بھائی صاحب مرحوم کو بہت خوشی تھی مگر مجھ پر اس وقت سخت صدمہ تھا اور بار بار روتا تھا کیونکہ اپنی نا قابلیت، نامرادی اور بدحالی مشاہد تھی اور اس صدمہ کا اثر چہرہ اور گفتار و رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا، مولانا صادق الیقین صاحب مرحوم نے (موصوف کرسی ضلع لکھنؤ کے باشندے اور حضرت گنگوہیؒ کے خاص خلفاء میں سے تھے) جبکہ اس صدمہ کا مذاکرہ ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بے بضاعتی اور بدحالی کا تذکرہ کیا تھا فرمایا کہ مخبر صادق نے خبر دی ہے اس کا اعتبار ہونا ضروری ہے، اس کے دو تین دن بعد میں نے عرض کیا کہ سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک بھی میں طے کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں اسی کی مشق کرو، اسی میں جدوجہد کر کے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں جو احوال اور کیفیات قلب پر وارد ہوتی تھیں یا جو رویاء صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں ان کا تذکرہ حضرتؒ سے کردیا کرتا تھا، اثناء سلوک میں انوار مکاشفات الہامات وغیرہ بالکل پیش نہیں آئے، ایک مرتبہ برقی کیفیت کے انوار پیش آئے حضرتؒ سے ذکر کیا تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی ہاں یہ بہت پیش آیا کہ اپنے سامنے بدر یا تیز روشنی کی شمع یا دائیں جانب ایک ایک یا دو دو شمع بین النوم والیقظہ دیکھتا تھا، جس کی تعبیر ظاہر ہے، یہ حالت مدینہ منورہ میں بھی اور بعد میں احمد آباد جیل وغیرہ میں بھی کبھی کبھی رہتی تھی جس سے

حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز اور جناب رسول اللہ ﷺ کی روحانی امداد معلوم ہوتی ہے۔
دو ماہ سے دو چار دن تقریباً زیادہ حاضر باشی کو ہو گئے تھے کہ یک بارگی بعد از اجازت یہ کیفیت پیش آئی کہ نماز میں اور باہر بھی یہ تمام فضا بین السمٰوات والارض مجھ کو تنگ معلوم ہونے لگی اور نماز میں اس قدر اس کا اثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ نماز توڑ کر بھاگ جاؤں، حضرتؒ سے عرض کیا تو فرمایا کہ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ، حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بھی جب قبض پیش آتا تھا تو ایسے مقامات پر تشریف لے جاتے تھے، چنانچہ ہم دونوں کلیر شریف اور دیوبند وغیرہ گئے اور چند دنوں میں واپس آ گئے، یہ حالت اس سفر میں جاتی رہی واپسی کے بعد تقریباً پندرہ دن قیام رہا، پھر فیض آباد اور بھوپال وغیرہ کا سفر پیش آ گیا وہاں سے واپسی پر موسم حج قریب آ گیا تھا، حضرتؒ نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جن سے مدینہ منورہ تک واپسی کی صورت ہو گئی اس زمانہ میں بھی ممبئی اور کراچی کے بندرگاہ بند تھے، پور بندرگاہ سے حجاج کرام کے جہاز کی روانگی مقرر ہوئی تھی، غالباً ابتدائے شوال میں جہاز روانہ ہوا، ذیقعدہ کے ابتدا میں جدہ پہنچا اور پھر بعد از حج ابتدائے ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔
اس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی، ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں، عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہو گئی تھی، اس لئے طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوا، ضروری تھا کہ کچھ وقت مشاغل طریقت کے لئے روزانہ مقرر کیا جاتا اور اس میں تعلیم فرمودہ اشغال کو انجام دیا جاتا، مگر بدقسمتی سے جب بھی اس کے لئے بیٹھتا تو ہجوم خواطر و حوادث نفس و غلبۂ نوم سے پریشان ہو جاتا، ادھر طلبہ کے ہجوم نے اس پر مجبور کر دیا کہ جس قدر بھی ممکن ہو ان کو اوقات تعلیم کیلئے دئے جائیں، بالآخر اپنی بدقسمتی اور شومی احوال کی شکایت اور مشاغل تدریسیہ کی کیفیت حضرت قطب العالم قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں لکھی تو جواب آیا کہ ''پڑھاؤ اور خوب پڑھاؤ''، نفس کو یہ جواب خوب پسند آیا، مشاغل طریقت تو تقریباً چھوٹ گئے اور مشاغل تعلیمیہ اس قدر جملہ فنون میں بڑھ گئے کہ دن رات میں تقریباً تین گھنٹہ بمشکل سونا ہوتا تھا، باقی اوقات تدریس اور مطالعہ اور شخصی ضروریات میں صرف ہوتے تھے، اس سے علوم و فنون میں تو قوت بحمد اللہ ترقی کرتی رہی مگر معرفت و طریقت میں پسماندگی ہی رہی۔
یہ کس قدر بدنصیبی تھی کہ حضرت قطب عالم مرشد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضری اور مشغولیت سے جو فیض روحانی میں محسوس کرتا تھا وہ نہایت ہی عظیم تھا اور اصلاح حال بہت زیادہ ہوتی تھی، کاش کچھ عرصہ تک اس کے حصول کی نوبت آتی تو خدا جانے کہاں تک ترقی ہو جاتی مگر:

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل که خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

بدقسمتی نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسے اسباب و عوارض پیش آ گئے جنہوں نے قیام نہ کرنے دیا،

یہ وہ زمانہ ہے کہ گھر کے لوگوں پر مدینہ منورہ میں سخت عسرت کا حال گزر رہا تھا، والد صاحب مرحوم کے بھی تقاضے آتے تھے، جس کی بناء پر بھی حضرت گنگوہیؒ نے جلد واپسی کا ارشاد فرمایا، بہر حال شوئی قسمت اور طبعی رذالت، تن پروری، کسلمندی، عدم استقلال، راحت طلبی وغیرہ نے ایسے گل کھلائے کہ باوجود ہر قسم کے سامان ترقی کے محرومیت ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم　　　چند بر خود تہمتِ دین مسلمانی نہم

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ایسے مقدس اور بابرکت اور کاملین اہل اللہ کے دروں تک پہنچایا جو کہ نہ صرف اپنے زمانہ کے ممتاز اور مایۂ ناز اور آسمان طریقت و شریعت کے درخشندہ آفتاب تھے بلکہ صدیوں میں بھی زمانہ کو ایسی ہستیاں نصیب نہیں ہوئی تھیں، مگر اپنی دنائت اور خست کی وجہ سے میں حقیقی معنوں میں ان بزرگوں بلکہ تمام سلسلہ کے لئے ننگ اور عار ہوا، کاش ان قدموں کی برکت سے مغفرت اور اصلاح حال کی نعمت اور رضاء الٰہی حاصل ہو جائے، وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔

یظن الناس بی خیراً واننی　　　لشر الناس ان لم یعف عنی

(نقش حیات رص ۱۰۵ ج ۱)

یعنی آپ نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا جلسوں میں بیانات کئے اور تقریروں کے ذریعہ سے ہندوستان کی آزادی کی روح پھونکی جو آپ کو اپنے اکابر سے ورثہ میں ملی تھی، سفر کی زبردست مشقتیں برداشت کیں، راتوں کو جاگتے تھے تہجد اور دیگر اوراد و وظائف میں مشغول رہتے اور دن میں اپنے تمام اوقات مطالعہ و تدریس مہمانوں کی خدمت آنے والوں کے استقبال ان کے احترام میں وقت گزارتے، حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے دیوبند سے ڈابھیل جانے کے بعد دار العلوم کی مسند حدیث کے لئے اکابر نے آپ ہی کا انتخاب کیا تھا اور آپ نے اس کو پورے طور پر نبھایا، آپ علوم و معارف اور جملہ فنون عقلیہ و نقلیہ میں اپنے پیش رو بزرگوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ روحانیت، زہد و تقویٰ، تواضع اور خدمتِ خلق میں بہت آگے تھے، مولانا عبد الماجد دریا آبادی ایک مقام پر لکھتے ہیں "شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے فضل و کمال، مرتبہ و مقام پر گفتگو تو وہ کرے جو خود بھی کچھ ہو، مجھے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ تو مولانا کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے نفسی، سادگی، تواضع اور انکساری اور خدمتِ خلق کا عشق ہے، کہتا ہوں اور گویا خانہ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں، بہترین رفیق سفر ہیں، مہمان ہوں تو آپ کی میزبانی میں اپنے معمولات کو ترک کر دیں گے، روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آئے تو خود قرضدار ہو جائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور پوری کر دیں گے، خدانخواستہ بیمار پڑ جائے تو تیمارداری میں دن رات ایک کر دیں گے،

نوکری کی ضرورت پیش آئے، کوئی مقدمہ کھڑا ہو کسی امتحان میں بیٹھ جائے تو سفارش ناموں میں عملی دوڑ دھوپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے نہ ہی اپنی صحت کا اور نہ خرچ کا جس طرح بھی ہوگا آپ کا کام نکالنے پر تل جائیں گے، اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں اپنے خوردوں، شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ یہ روش رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں" حالی کے شعر کے معنی اب جا کر روشن ہوئے ہیں:

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا　　　خاکساری اپنی کام آئی

بہت سنا ہے کہ یہ شان محمود حسن شیخ الہند دیوبندیؒ کی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد کسی کو نہیں پہونچتا۔ (اقوال سلف ص ۲۵۸ ج ۴)

چنانچہ آپ کے فیض یافتگان تلامذہ و مریدین کی تعداد بے حساب ہے جنہوں نے اپنے اپنے علاقہ میں دینی خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں، صاحب نزہۃ الخواطر یہاں تک لکھتے ہیں کہ اخیر عمر میں خشوع وخضوع، رقت، ابتہال الی اللہ اور اللہ پاک کی ملاقات کا شوق آپ پر غالب آ گیا تھا، نیز یہ بھی لکھا کہ صدق اخلاص، علو ہمت، پختگی ارادہ، مکارہ اور تکالیف پر صبر و استقلال میں آپ کا جواب نہیں تھا، الغرض خدمت خلق اور عبادت رب میں بے مثال واقع ہوئے تھے، اپنے خاص استاذ و شیخ حضرت شیخ الہندؒ کے علوم کے امین، مزاج شناس اور ان سے بے حساب محبت کرنے والے اور ان پر اپنی جان قربان کرنے والے تھے، یہاں تک کہ مالٹا کی جیل میں اپنے استاذ کا ساتھ دینے کیلئے پہنچ گئے اور جب تک وہ وہاں رہے ساتھ ساتھ رہے، آپ کے تفصیلی حالات کیلئے آپ کی خود نوشت سوانح "نقش حیات" اور آپ پر لکھی ہوئی دیگر کتابیں مطالعہ کرنی چاہئیں یہاں تو ضمنی طور پر کچھ باتیں لکھی گئی ہیں۔

کاتب الحروف (خالد سیف اللہ گنگوہی) کے پدر بزرگوار شریف الامت حضرت مولانا قاری شریف احمد قدس سرہ متوفی ۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ مطابق ۴ مئی ۲۰۰۵ء کا اپنے اکابر کے یہاں آمد و رفت اور ان کی بہر نوع خاطر و مدارات کا ہمیشہ اہتمام رہا مظاہر علوم اور پھر دارالعلوم دیوبند کے ایام طالب علمی میں بھی اپنے اساتذہ و مشائخ علماء عظام کی خدمت میں حاضری اور ان سے علمی و روحانی استفادہ کا بھرپور جذبہ عشق کی حد تک بڑھ گیا تھا آپ اپنے اساتذہ کرام کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں فرمایا کرتے تھے بلکہ بسا اوقات شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے تعلق سے تذکرہ کرتے کرتے آب دیدہ ہو جاتے۔

شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ سے حضرت والد صاحبؒ کا زانوئے تلمذ

حضرت والد صاحبؒ اپنے شیخ و مرشد اپنے استاذ گرامی کے تعلق سے اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ مجھ

کو دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۴۹ء میں بخاری شریف مکمل و ترمذی شریف مکمل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا طحاوی شریف نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ سے صبح نماز فجر کے بعد پڑھنے کا موقعہ نصیب ہوا اور ابوداؤد شریف شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے پڑھنے کی سعادت میسر آئی اور مؤطاء امام مالک و مؤطاء امام احمد و مسلم شریف کے اسباق دیگر اکابر اساتذہ سے متعلق رہے۔

دارالعلوم کی تعلیم کے دوران حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضری

دارالعلوم میں ہم دو ساتھی (۱) بندہ شریف احمد (۲) قاری عبدالجلیل نانوتویؒ روزانہ سبق سے چھٹی کے بعد بالاستقلال حضرت مدنیؒ کے مہمان خانہ میں مہمانوں کی خدمت کیلئے پہونچ جایا کرتے تھے۔

حضرت مدنی قدس سرہ کا کمال اخلاق

ایک مرتبہ ایک مجذوب صاحب حضرت مدنیؒ کے یہاں مہمان ہوئے جو اپنی ظاہری حالت کے اعتبار سے نہایت ہی مفلوک الحال تھے کپڑے میلے کچیلے لمبے لمبے سفید بال نیز بالوں اور کپڑوں میں جوئیں بے حد جو کپڑوں پر صاف پھرتی ہوئی نظر آتی تھیں اور حضرت کا یہ حال تھا کہ مجذوب صاحب کی اس پراگندگی کے باوجود اپنے ساتھ بٹھلا کر کھانا کھلاتے تھے جس کی وجہ سے حضرت کے کپڑوں میں بھی جوئیں چڑھ جاتی تھیں اس صورت حال کو دیکھ کر ہم نہایت پریشان اور متفکر ہوتے تھے مگر کیا کر سکتے تھے کہ حضرت کے مہمان خانہ میں کسی کو کسی مہمان سے یہ پوچھنے کی ہمت و مجال نہ ہوتی تھی کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو کتنے دن ٹھہرو گے؟ اسلئے ان مجذوب صاحب سے بھی کسی کو پوچھنے کی ہمت نہ پڑی ادھر ہم لوگ دل ہی دل میں کڑھتے تھے کہ مجذوب صاحب کو حضرت سے کس طرح علیحدہ کیا جائے اور حضرت کا حال تھا کہ ان کو علیحدہ کرنے کیلئے تیار نہ تھے آخر کار ہم لوگوں نے یہ مشورہ کیا کہ آج مجذوب صاحب کو حضرت کے آنے سے پہلے ہی کھانا کھلا دیا جائے اور اس طریقہ سے کھلایا جائے کہ حضرت مدنیؒ بھی ان کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ لیں اس کا طریقہ ہم نے یہ کیا کہ سہ دری کے اس حصہ میں جو زنان خانہ سے قریب ہے اور حضرت کے اندر آنے کا راستہ بھی ہے مجذوب صاحب کو اس میں بٹھا کر کھلانے کا پروگرام بنایا چنانچہ جب حضرت کی آمد کا وقت ہوا تو ہم نے مولوی نصیر احمد صاحب سے کہا کہ مجذوب صاحب کیلئے گھر سے کھانا لیکر آؤ چونکہ مولوی نصیر احمد صاحب فیض آبادی رشتہ میں حضرت کے پوتے ہوتے تھے گھر میں انکی آمد و رفت بھی رہتی تھی حضرت کے گھرانہ کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے اور حضرت کے گھر کے کام کاج انہیں کے سپرد تھے اسلئے گھر سے کھانا لانے کیلئے انہیں کو کہا، چنانچہ مولوی نصیر

احمد صاحب گھر سے کھانا لیکر آ گئے مہمان خانہ میں جو چار پائیاں رہتی تھیں ان میں سے ایک چار پائی پر دستر خوان بچھا کر اس پر کھانا رکھدیا اور مجذوب صاحب کو کہا کہ آیئے کھانا کھا لیجئے مجذوب صاحب ہاتھ دھو کر دستر خوان پر آ گئے اور کھانا کھانا شروع کر دیا مجذوب صاحب ابھی کھانے میں مشغول ہی تھے کہ حضرت مدنیؒ اندر سے تشریف لے آئے اور مجذوب صاحب کو کھانا کھاتے اور ہمیں پاس کھڑے دیکھ کر فرمایا ارے آج ان کو پہلے ہی کھلا رہے ہو تم لوگوں نے یہ کیا حرکت کی بس یہ فرما کر مزید کچھ نہیں فرمایا اس کے بعد ہم ہر دن اسی طرح کرنے لگے اور حضرت دوسرے مہمانوں کیساتھ کھانا تناول فرمانے کیلئے بیٹھنے لگے ہم کو بہت راحت ملی اور جب تک مجذوب صاحب رہے ان کیساتھ ہمارا یہی عمل رہا کہ حضرت کی آمد سے پہلے ہی ان کو کھانے سے فارغ کر دیتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی مجاہدانہ شان کا ایک واقعہ

- جس مسند پر دارالعلوم کے دارالحدیث میں درس حدیث دیا جاتا ہے حضرت الاستاذ حضرت مدنی کو خالی چوکی پر بیٹھے دیکھ کر گدا بنوایا حضرت شیخ الاسلامؒ تیسرے اور چوتھے گھنٹہ میں ترمذی شریف اور بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے خالی چوکی پر تین تین گھنٹے مسلسل بیٹھے دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑی کوفت ہوتی تھی اور بار بار آپکی تکلیف کا احساس ہوتا تھا ہم نے حضرت کی اس پریشانی کو دیکھ کر مولانا نصیر احمد صاحب (خادم خاص شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ) سے کہا کہ تم کوئی تدبیر کرو کہ کس طرح حضرت کیلئے گدا بنوایا جائے کیونکہ ساتھیوں کے پاس وسائل نہ ہونے کی وجہ سے گدا بنوانا مشکل ہے اماں جی سے درخواست کرو کہ وہ گدا بنوا کر بھجوا دیں چنانچہ مولانا نصیر احمد صاحبؒ نے حضرت کی اہلیہ محترمہ سے جو کہ مولانا نصیر احمد صاحب کی قریبی رشتہ دار بھی تھیں اس تکلیف کا ذکر کیا چنانچہ انھوں نے ایک گدا تیار کرایا اور گدا تیار کرا کے حضرت سے ذکر کر دیا کہ آپ بہت دیر تک تخت پر خالی چٹائی پر بیٹھتے ہیں تھک جاتے ہوں گے میں نے گدا بنوا کر بھجوا دیا ہے آپ اس پر بیٹھ کر سبق پڑھایا کریں اماں جی کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ حضرت پر اس بات کا کیا اثر ہوگا اور حضرت کے سامنے تذکرہ سے کیا ثمرہ مرتب ہوگا تاہم گدے کی بات حضرت کے ذہن میں نقش ہوگئی اور معاملہ کا رخ پلٹ گیا اگر اماں جان ذکر نہ کرتیں تو شاید معاملہ مبہم رہتا اور حضرت کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہوتا بہر حال حضرت کے دارالحدیث میں تشریف لانے سے پہلے چوکی پر گدا اور گدے کے اوپر چادر بچھا دی گئی حضرت تشریف لائے جیسے ہی حضرت کی نظر گدے پر پڑی حضرت نے بلا کسی تاخیر کے انتہائی ناگواری کیساتھ پہلے چادر اٹھا کر پھینکی پھر گدا اٹھا کر پھینکا اور ساتھ میں گدے کے نیچے بچھی چٹائی اٹھا کر پھینک دی اور خالی چوکی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ حضرت

شیخ الہندؒ صرف چوکی پر بیٹھ کر سبق پڑھایا کرتے تھے اب اس پر چٹائی بچھ گئی اور چٹائی پر چادر بچھ گئی اب گدے بھی بچھنے لگے ہیں آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت نے چوکی پر چٹائی اور چادر بھی بچھوانا بند کر دی ہم یہ صورت حال دیکھ کر نہایت ہی ملول اور رنجیدہ رہتے تھے اور خالی چوکی پر تین تین گھنٹہ بیٹھے دیکھ کر نہایت دکھ ہوتا تھا مگر سوائے قلق واحساس کے کوئی چارہ نہ تھا۔

حضرت مدنیؒ کے درس کا انداز

حضرت مدنیؒ کتاب شروع کرانے سے پہلے فضائل علم حدیث ومبادیات فن بیان کرتے اور علم حدیث کی عظمت وشرافت کو آیات وروایات سے مدلل فرماتے تھے آپ روزانہ درس حدیث دینے سے پہلے خطبۂ مسنونہ خود پڑھتے اور عربی لہجہ میں یہ عبارت پڑھتے تھے فان اصدق الحدیث کتاب اللہ واحسن الھدی ھدی محمد صلی اللہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدث بدعۃ وکل بدعۃ ضلالہ وکل ضلالۃ فی النار وبالسند المتصل منا الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المومنین فی الحدیث ابی عبداللہ محمد ابن اسماعیل ابن المغیرۃ ابن بردزبہ الجعفی البخاری رحمۃ اللہ تعالی ونفعنا بعلومہ آمین یہ عبارت عربی لہجہ میں جس عجیب کشش اور جاذبیت سے ہوتی تھی اور عشق الہی کا سوز وگداز شامل ہوتا تھا سنکر ہر سامع کا دل کھچا چلا جاتا تھا پھر آپ حدیث پاک پر نہایت محققانہ مدققانہ مکمل تشفی بخش کلام فرماتے اختلاف ائمہ بیان فرمانے کے بعد مذہب حنفی کو ترجیح دیتے اور حدیث پاک کے ساتھ اس طرح منطبق فرماتے معلوم ہوتا تھا کہ فقہ حنفی ہی احادیث نبوی کے عین مطابق ہے آپ کی پوری تقریر نہایت صاف شفاف موتیوں کی طرح لڑی میں پری ہوئی معلوم ہوتی تھی دوران سبق تصوف کے بہت سے مسائل حل ہو جایا کرتے تھے، آپ طلبہ کی اخلاقی تربیت کے پیش نظر اخلاقی درس بھی دیا کرتے تھے اور عالمی انسان بننے کی فکر دلاتے تھے ایک مرتبہ حضرت نے بخاری شریف کے سبق کے دوران نہایت ہی عجیب وغریب واقعہ سنایا آپ نے فرمایا کہ آدمی جیسی عادت بناتا ہے ویسی ہی عادت بن جاتی ہے اور یہ کہکر آپ نے واقعہ سنایا کہ جیل میں ہمارے ساتھ ایک آدمی صرف پانی پی کر گذارہ کرتا تھا اور اسکی تمام ضروریات بول وبراز وغیرہ دوسروں کی طرح معمول کے مطابق پوری ہوتی تھیں میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کس طرح عادت بنائی اس نے بتلایا کہ اولا میں نے اپنے کھانے میں کمی شروع کی اور کچھ دودھ کا اضافہ کیا کھانے میں کمی کرتا رہا دودھ میں اضافہ کرتا رہا یہاں تک کہ غذا بالکل ختم کر دی اور صرف دودھ پی کر گزارہ کرنے لگا پھر یہ خیال ہوا کہ دودھ پینا بھی ختم کروں اور صرف پانی پر اکتفا کروں چنانچہ جتنی مقدار دودھ پینے کی عادت تھی اس میں کچھ کمی کرنا شروع کر دی اس طرح کہ جتنا دودھ کم کرتا اس میں اتنا ہی پانی کا اضافہ کر دیتا مگر یہ عمل ہر روز نہیں کرتا تھا بلکہ ایک

ہفتہ میں ایک مرتبہ تھوڑا دودھ کر کے اس میں اتنا ہی پانی ڈال دیا کرتا تھا ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہونچی کہ میں نے دودھ ختم کر دیا اور پانی پر اکتفا کرنے لگا اب صرف پانی پیتا ہوں اور اپنی تمام ضروریات معمول کے مطابق پوری ہوتی ہیں اور مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی غذا کی طرف میرا میلان ہے۔

دوران درس ایک طالب علم کا سوال

حضرت شیخ الاسلامؒ بخاری شریف کا سبق پڑھا رہے تھے ایک طالب علم نے پرچی کے ذریعہ سوال کیا کہ حضرت کیا آپ کو کانگریس سے وظیفہ ملتا ہے حضرت مدنیؒ برداشت وتحمل کے پہاڑ تھے آپ نے نہایت سنجیدگی اور بردبار لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حسین احمد جب جیل میں ہوتا تھا تو حسین احمد کے گھر میں فاقے پڑتے تھے اور جواہر لال نہرو جب جیل میں ہوتا تھا تو اسکی قوم اس کے گھر اشرفیوں کی تھیلیاں بھیجا کرتی تھی میں نے کانگریس کے نام پر ایک پان تک بھی نہیں کھایا واقعی حضرت مدنیؒ نے کانگریس کی بے لوث خدمت کی ہے۔ جب میں (احقر شریف احمد گنگوہی) مظاہر علوم میں زیر تعلیم تھا اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ شباب پر تھی لیگی لوگ حضرت مدنیؒ کو گورنمنٹ کا پٹھو سمجھتے تھے حضرت مدنیؒ کا نظریہ یہ تھا کہ پاکستان مت بناؤ اور حضرت نے اپنے نظریہ کو تقویت دینے اور فروغ دینے کیلئے بہت زیادہ اسفار بھی کیئے اس موقعہ پر مسلم لیگ کے بہت سے نا عاقبت اندیشوں نے آپ کی شان میں نہایت بے ہودہ گستاخیاں بھی کیں جن کا حشر بہت برا ہوا کوئی قتل ہوا کوئی ڈوب کر کوئی بھٹی میں جل کر مرا کسی کے بدن میں پھوڑے نکلے اور ان میں لمبے لمبے کیڑے پڑ گئے آخر گل سڑ کر مر گیا بہرحال جس نے بھی حضرت کے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی یا بدسلوکی کا معاملہ کیا اس کو دنیا ہی میں برا انجام بھگتنا پڑا، اس دوران جبکہ میں مظاہر علوم میں زیر تعلیم تھا حضرت شیخ کے یہاں حضرت مدنیؒ تشریف لائے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ بھی تشریف لائے ہوئے تھے حضرت رائے پوریؒ حضرت مدنیؒ کا بے حد احترام کرتے تھے آپ نے حضرت مدنیؒ سے فرمایا کہ حضرت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اگر آپ سن لیں چھوٹا منہ بڑی بات ہے اتنا کہکر خاموش ہو گئے دوسری مرتبہ پھر کہا کہ حضرت کچھ گزارش ہے چھوٹا منہ بڑی بات ہے پھر خاموش ہو گئے تیسری مرتبہ پھر فرمایا اس پر حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ حضرت فرمایئے تو سہی کہتے تو کچھ نہیں حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا کہ حضرت آپ ہی اپنے اسفار بند کر دیں یہ قوم بدبختی میں مبتلا ہے جہالت میں ڈوبی ہوئی ہے وہ لوگ بے حرمتی پر اتر رہے ہیں ان کو اس کا انجام معلوم نہیں آپ اسفار کرتے ہیں ان کو گستاخیاں کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے اس لئے آپ اس سلسلہ کو ترک فرمادیں کیونکہ میں پنجاب کی طرف اپنی آنکھوں سے عذاب کو اترتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

یہ سن کر آپ پر عجیب وغریب کیفیت اور حال طاری ہو گیا اور طبیعت میں ایک جوش ابھر آیا اور آپ نے جواب میں اس طرح فرمایا کہ کیا حق کی خاطر اللہ کے رسول علیہ ﷺ کو مکہ سے نکالا نہیں گیا کیا حق کی خاطر عمر فاروقؓ کو شہید نہیں کیا گیا کیا حق کی خاطر عثمان غنیؓ کو شہید نہیں کیا گیا کیا حضرت شاہ ولی اللہ کو حق کا اعلان کرنے پر تکلیفیں نہیں پہنچائی گئیں کیا حضرت گنگوہی نے حق کیلئے جہاد نہیں کیا کیا حضرت شیخ الہند کو حق کا اعلان کرنے پر مالٹا کی جیل میں بھیج کر برف کی سلوں پر لٹا کر تکلیف نہیں دی گئی حضرت نے فرمایا مجھ تک جو حق پہونچا ہے کیا میں اس کو چھوڑ دوں چنانچہ حضرت مدنیؒ کے اسفار جاری رہے حضرت مدنیؒ تقاریر کے ذریعہ حق سمجھانے کی کوشش کرتے مگر ناعاقبت اندیش اور بد بخت لوگ آپ کے ساتھ بد سلوکیاں بد تمیزیاں کرتے مغلظات بکتے غلاظتیں اوپر پھینکتے مگر آپ صبر وتحمل کا پہاڑ بنے رہتے کہیں کہیں تو پورا مجمع آپ پر ٹوٹ پڑتا اور آپ کے قتل کے درپے ہوتے بلکہ قاتلانہ حملہ کر دیتے مگر نصرت الٰہی آپ کی دستگیری اور حفاظت کرتی رہی۔

دراصل آپ کی یہ سیاسی جدوجہد صرف ملک کی سالمیت اور آزادی کیلئے نہیں تھی بلکہ آپ اس کو شرعی فریضہ کے طور پر انجام دیتے تھے اور حضرت سمجھتے تھے کہ میں دین کا اہم کام کر رہا ہوں اور میری یہ تمام کوشش اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے ہے اس لئے اس راہ کی مصیبت کو باعث اجر وثواب سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ توہین وتذلیل کے مواقع پر کبھی آپ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا جو مقام صبر ورضا کے خلاف ہو حضرت مولانا احمد علی مفسر لاہوری فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں چودہ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کی اور اللہ نے اپنے فضل سے مجھے یہ بصیرت عطاء فرمائی ہے کہ امت کے اولیاء کرام کو میں پہچان لیتا ہوں بندہ نے چودہ بار کعبہ میں موجود اولیاء کرام کو دیکھا مگر حضرت مدنیؒ کے ہم پلہ کسی کو نہ پایا۔

حضرت مدنیؒ کا معائنہ

حضرت والد صاحبؒ کی فراغت دار العلوم سے شعبان ۱۳۴۹ھ میں ہوئی اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد والد صاحبؒ نے جامعہ اشرف العلوم گنگوہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اس وقت بھی آپ کا حضرت مدنیؒ سے برابر تعلق قائم رہا بلکہ حضرت کے ساتھ تعلق میں مزید قوت پیدا ہوئی اور حضرت نے اپنی بے پناہ توجہات سے نوازا چنانچہ قبل ازیں آپکی درخواست پر حضرت مدنیؒ دیگر اکابر کے ساتھ ماہ رمضان ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۴ء میں گنگوہ تشریف لائے اور جامعہ اشرف العلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور آپ کی دعوت پر بارہا مدرسہ اشرف العلوم میں تشریف لائے متعدد جلسوں کو خطاب کیا حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ گنگوہ میں جے رہنا دعاؤں سے بھی نوازا مدرسہ کا معائنہ لکھا چنانچہ ایک معائنہ میں لکھتے ہیں۔

الحمد للہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

آج بروز دوشنبہ ۳؍ ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ مجھکو گنگوہ شریف میں مدرسہ اشرف العلوم کے معائنہ کا شرف حاصل ہوا چند بچوں کے قرآن شریف سننے اور بعض مسائل دینیہ کے سوال کی بھی نوبت آئی بحمد اللہ بچوں کی صلاحیت امید افزاء ہے، ایسے مدارس کا مسلمانوں میں جاری ہونا از بس ضروری ہے مدرسین کی تعداد ضرورت سے کم ہے میں ان مدرسین کرام کی جدوجہد اور کوششوں کی تعریف کرنے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اہل قصبہ اور اہل ہمت مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ اس مدرسہ کی ترقی اور خدمت میں بیش از بیش حصہ لیں اور اس کو اعلیٰ پیمانہ پر پہونچائیں اخیر میں دعاء کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطاء فرمائے اور عام مسلمانان قصبہ اور ان کے بچوں کو زیادہ سے زیادہ علمی ترقیات پر پہونچائے واللہ الموفق۔

ننگ اسلاف: حسین احمد غفرلہ

مدرس دار العلوم دیوبند

حضرت مدنیؒ اور مجاہد ملت کی تشریف آوری

حضرت والد صاحبؒ کا تعلق حضرت مدنیؒ سے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ جب بھی حضرت مدنیؒ کا علاقۂ گنگوہ میں تشریف آوری کا علم ہوتا تو فوراً حاضر خدمت ہو کر مدرسہ اشرف العلوم میں تشریف لانے کی دعوت دیتے اور حضرت مدنیؒ اس کو بخوشی قبول فرمالیتے چنانچہ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی گنگوہ کے قریبی گاؤں میں سالانہ جلسہ کے موقعہ پر تشریف آوری طے ہوئی اور مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے حضرت کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا کہ حضرت آپ جمعرات کو فلاں گاؤں میں تشریف لے جائیں گے ہمارے یہاں کا بھی پروگرام بنالیجئے اس پر حضرت نے فرمایا کہ جمعرات کو تو گاؤں میں ٹھیک ہے اور جمعہ کو آپ کے یہاں پروگرام ہو جائے گا اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت جمعہ کو دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں ہوگا اور جمعہ کی نماز کے بعد بیان ہوگا اس کو حضرت نے منظور فرمالیا پھر کسی کام سے دہلی گیا وہاں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند سے ملاقات کی اس سے قبل بھی بارہا اس بات کا اشتیاق ہوا تھا کہ حضرت مولانا موصوف کسی موقعہ پر ہمارے یہاں اشرف العلوم میں تشریف لائیں مگر یہ تمنا ابھی تک پوری نہ ہوئی تھی اسلئے حضرت سے عرض کیا کہ گنگوہ کا پروگرام بنالیجئے اور پرچہ بھی لکھ کر دیدیا چونکہ حضرت کے اوقات بے حد مشغول رہتے تھے اسلئے آپ کو تحریری طور پر دینا پڑتا تھا۔

بہر حال حضرت نے قبول فرما کر منظور فرمالیا اور اپنے منشی کو تاریخ نوٹ کرادی اس تاریخ میں گنگوہ چلنا

ہے جبکہ اس موقعہ پر حضرت کے سامنے اور بھی پروگرام تھے مگر حضرت نے گنگوہ کی تاریخ کو ردنہ فرمایا منشی نے تاریخ نوٹ کر لی تھی اور ان کو پرچہ بھی دے دیا تھا اسلئے میں مطمئن ہو کر گنگوہ چلا آیا اور یہاں آکر قصبہ اور اطراف قصبہ میں اعلانات کرائے کہ فلاں دن اور تاریخ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی تشریف لارہے ہیں اور اشرف العلوم میں خطاب فرمائیں گے اطراف گنگوہ میں بھی چونکہ اسی تاریخ میں ایک مدرسہ میں جلسہ ہونا تھا ان لوگوں کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلسہ کے دن حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب گنگوہ مدرسہ اشرف العلوم میں تشریف لاکر خطاب کریں گے تو اس مدرسہ کے ایک مدرس نے بالآخر یہ حرکت کی کہ ایک خط ہماری جانب منسوب کر کے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے نام لکھا اور اس ڈھنگ سے مضمون مرتب کیا گویا کہ میں اشرف العلوم سے خط لکھ رہا ہوں اور یہ بات لکھی کہ قریب کے ایک گاؤں میں آپکی تشریف آوری کے دن حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تشریف لارہے ہیں اسلئے آپ کو مدرسہ اشرف العلوم میں جس پروگرام کیلئے آنا تھا نہ آئیں یہ خط جب حضرت کے پاس انہوں نے بھیجا تو حضرت نے گنگوہ آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس تاریخ میں حضرت کو جو میٹنگ کرنی تھی لوگوں کو کہلوا دیا کہ انشاء اللہ اس دن میٹنگ ہوگی لیکن مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہ تھی کہ بالآخر ہمارے پروگرام کو بگاڑنے کی کوئی سازش رچی جارہی ہے الغرض حضرت نے ایک خط گنگوہ بھیجا کہ آپ کے جلسہ کے التواء کا خط ہم کو مل گیا ہے یہ خط جیسے ہی مجھ کو ملا میں حیران و ششدر رہ گیا کہ ہم نے پورے علاقہ میں حضرت کی آمد کا اعلان کر رکھا ہے ادھر یہ حال کہ کسی نے حضرت کے پاس خط بھیج دیا کہ جلسہ ملتوی ہو گیا اور مزید پریشانی یہ کہ تاریخ قریب سے قریب تر ہوتی چلی جارہی ہے چنانچہ میں بذات خود بلا تاخیر دہلی گیا اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملاقات کی اور حضرت کا روانہ کردہ خط خدمت میں پیش کر کے کہا کہ حضرت آپ کی جانب سے یہ خط پہونچا ہے ہم نے تو آپ کے پاس التواء کا کوئی خط نہیں بھیجا حضرت کو بڑا تعجب ہوا اور اپنے منشی کو بلا کر کہا کہ جو خط گنگوہ کے جلسہ کے التواء کا ہمارے پاس آیا تھا وہ نکال کر لاؤ چنانچہ منشی جی نے وہ خط نکالا اس میں دستخط دیکھے تو محمود نامی شخص کے دستخط تھے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرا نام تو شریف احمد ہے میں نے جو پرچہ لکھ کر دیا تھا اس پر میرے دستخط ہیں اور اس خط پر تو محمود کے دستخط ہیں حضرت کو اس پر مزید تعجب ہوا کہ یہ غلطی ہم سے کیسے ہو گئی کہ ہم نے بلا تحقیق التواء کا خط جاری کر دیا تاہم حضرت نے اپنے منشی کو سخت لہجہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے دیکھا بھی نہیں کہ پہلے پرچہ پر جو دستخط ہیں وہ شریف احمد کے ہیں اور جلسہ کے التواء کا جو خط ہمارے پاس آیا ہے اس میں محمود کے دستخط ہیں، بہر حال حضرت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اچھا گنگوہ ضرور چلیں گے اور منشی کو کہا کہ گنگوہ والی تاریخ میں جو میٹنگ ہونی طے کر دی تھی وہ ملتوی کر دو اور سب لوگوں کو کہلوا دو کہ فلاں

تاریخ میں حضرت کہیں تشریف لے جائیں گے اس لئے میٹنگ نہیں ہو سکے گی اور مجھے کہا کہ آپ چپے جائیں انتظام کیجئے ہم ضرور گنگوہ آئیں گے چنانچہ تاریخ مقررہ پر حضرت دہلی سے بذریعہ ٹرین سہارنپور پہونچے اور وہاں سے بذریعہ ٹیکسی گنگوہ تشریف لائے بعد نماز عشاء آپ کا بیان ہوا لوگ بڑی تعداد میں جوق در جوق شریک اجلاس ہوئے اور حضرت کا بیان بڑی دلجمعی، ذوق وشوق کیساتھ سنا، اور پروگرام بخوبی اختتام پذیر ہوا، اجلاس کے بعد حضرت نے کھانا تناول فرمایا اور پھر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد لیٹ گئے صبح ناشتہ سے فراغت کے بعد حضرت نے چلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت قریب کے ایک گاؤں میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اور ابھی وہیں پر ٹھہرے ہوں گے تو حضرت نے کہا بہت اچھا ضرور ملاقات کروں گا، چنانچہ بذریعہ ٹیکسی ہم گاؤں میں پہونچے حضرت سے ملاقات ہوئی دونوں اکابر کی ملاقات بڑی ہی پرکیف تھی ملاقات اور گفتگو سے فراغت کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وہیں سے سہارن پور کیلئے روانہ ہوگئے اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین دہلی پہونچے میں گاؤں میں ہی حضرت مدنیؒ کے پاس ٹھہر گیا اور حضرت سے ملاقات کی حضرت بڑے غصہ کی حالت میں تھے فرمایا کہ آپ لوگ پوری رات سے کہاں ہو میں یہاں سردی میں ٹھٹھر گیا میں نے دیکھا کہ جس کمرہ میں حضرت کو آرام کرایا گیا تھا اس کے جنگلوں میں کھڑکیاں نہیں تھیں حضرت کی اس بے آرامی پر بے حد احساس ہوا اور طبیعت پر حضرت کی پریشانی بڑی ہی گراں بار ہوئی میں نے کچھ دیر توقف کیا پھر حضرت سے گنگوہ تشریف لے چلنے کی درخواست کی اور حضرت کو گنگوہ کا پروگرام بھی یاد دلایا حضرت نے فرمایا ضرور چلیں گے چنانچہ حضرت نے اہل مدرسہ سے کہا کہ ناشتہ جلدی لاؤ ورنہ ہم چلتے ہیں تھوڑی دیر بعد حضرت کو کسی نے بتلایا کہ ابھی ناشتہ میں دیر ہے تو حضرت فوراً چلنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تو مدرسہ والوں نے کہا کہ حضرت صرف دس منٹ میں ناشتہ تیار ہو جائے گا حضرت نے گھڑی دیکھ لی جب دس منٹ پورے ہوگئے تو حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر ناشتہ کے ہی چلدئے اور مجھ سے فرمایا کہ تیرے گھر میں تو کھانا مل ہی جائے گا میں یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا کیونکہ یہ بات ذہن میں تھی کہ حضرت دوپہر کا کھانا گاؤں میں تناول فرما کر گنگوہ تشریف لائیں گے اور حضرت نے بھی اپنا پروگرام اسی طرح طے فرمایا تھا اسی لئے پہلے سے گھر میں کھانے کی کوئی خاص تیاری اور انتظام نہیں کیا تھا تاہم حضرت بذریعہ کار گنگوہ کیلئے روانہ ہوگئے میرے پاس اپنی ایک پرانی سائیکل تھی جس کو میں اس زمانہ میں استعمال کرتا تھا میں اس پر سوار ہو کر حضرت کے پیچھے پیچھے چلا اور تقریباً ساتھ ساتھ ہی گنگوہ پہونچ گیا حضرت مدنیؒ اور اکثر اکابر کا اس زمانہ میں یہ معمول تھا کہ جب گنگوہ تشریف لاتے تو اولاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نواسے حضرت مولانا ایوب صاحبؒ کے یہاں قیام فرماتے کسی اور جگہ جانا ہوتا تو اس کے بعد جاتے چنانچہ حضرت مدنیؒ حسب

معمول مولانا ایوب صاحبؒ کے مکان پر پہونچ گئے ادھر میں نے ایک طالب علم بڑی تیزی کے ساتھ گھر دوڑایا کہ جلدی معلوم کر کے آؤ کہ رات کا بچا ہوا کچھ کھانا رکھا ہے یا نہیں گھر سے جواب ملا کہ رات کا بچا ہوا کھانا رکھا ہے بس میری جان میں جان آ گئی چونکہ رات میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی آمد پر پلاؤ تیار کرائی تھی میں نے جلدی سے اس کو گرم کرایا اُدھر حضرت مولانا ایوب صاحبؒ بہت متفکر تھے کہ حضرت کی دفعۃً آمد پر کیا کھانا تیار کرایا جائے چنانچہ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ میں پلاؤ گرم کرا کے مولانا ایوب صاحبؒ کے مکان پر پہونچ گیا مولانا موصوف بے حد خوش ہوئے اور راحت کی ٹھنڈی سانس لی دستر خوان بچھا دیا گیا اور حضرت کھانے کیلئے بیٹھ گئے کھانا تناول کرنے کے دوران مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ارے وہاں تو تو بولا نہیں اور یہاں اتنی جلدی کھانے کا انتظام بھی ہو گیا میں نے عرض کیا حضرت رات یہ پلاؤ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے لئے بنوائی تھی لیکن میں یہ جواب دینے کے بعد سوچ میں پڑ گیا اور تعجب کرنے لگا کہ حضرت نے کیسے تاڑ لیا کہ کھانا میں لایا ہوں جبکہ دستر خوان تو مولانا ایوب صاحب کا ہے اور حضرت نے بلا کسی شبہ کے پورے یقین کے ساتھ کیسے فرما دیا کہ وہاں تو تو بولا نہیں اور یہاں اتنی جلدی کیسے انتظام ہو گیا سچ ہے کہ اولیاء اللہ خداداد فراستِ ایمانی کے ساتھ متصف ہوتے ہیں اس نورِ ایمان کی روشنی میں وہ بہت ساری ان باتوں کو ایسے دیکھ لیتے ہیں جیسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اسی لئے حدیثِ پاک میں وارد ہوا ہے: اتقو فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ اس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں کشف والہام سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ان کو دوسرے کے قلب و دماغ کی بات ایسے صاف نظر آتی ہے جیسے دوسرے لوگوں کو اپنی صورت آئینہ میں نظر آتی ہے پھر حضرت شیخ الاسلامؒ کی بصیرتِ ایمانی تو جس قدر بڑھی ہوئی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے حضرت شیخ الاسلامؒ نے کھانے سے فارغ ہو کر جمعہ کی تیاری فرمائی اور جمعہ کے بعد حضرت کا نہایت ہی ولولہ انگیز پر مغز اور مؤثر بیان ہوا،، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مولانا ایوب صاحبؒ کے یہاں اکثر و بیشتر تشریف لاتے رہتے تھے مہینہ میں ایک مرتبہ اور کبھی تو بیس ہی دن میں تشریف آوری ہوتی تھی میں ہر موقعہ پر حاضر ہو کر خدمتی امور انجام دیتا تھا مثلاً دستر خوان بچھانا، دروازہ سے طعام لیکر دستر خوان پر رکھنا، پانی کا گھڑا اٹھانا، گلاس میں پانی بھر کر رکھنا اور بوقت طلب پانی پیش کرنا، بول و براز کی ضرورت ہوتی ڈھیلے اور پانی کا لوٹا رکھنا، نیز پھر وضو کیلئے پانی رکھنا، بعد وضو تولیہ پیش کرنا، ہاتھ میں ٹوپی دینا، سردی کا زمانہ ہوتا تو عمامہ اور جبہ مبارک پیش کرنا اور پوری تیاری کے بعد حضرت کے ساتھ نماز باجماعت پڑھنے کے لئے جانا، حضرت کو اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ مسجد جا کر نماز پڑھیں حالانکہ مسجد اونچی تھی کئی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں حضرت کے ساتھ ساتھ مسجد جاتا اور نماز جماعت سے پڑھتا بحمد اللہ بندہ کو حضرت کی ان خدمات کا شرف حاصل ہوا اور حضرت کی توجہاتِ

کاملہ نصیب ہوئیں جو میری زندگی اور مدرسہ کی ترقی میں رنگ لائے بغیر نہ رہ سکیں حق تعالیٰ حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطاء فرمائے مذکورہ بالا خدمات کا شرف حاصل ہونے میں جناب مولانا ایوب صاحب گنگوہیؒ کا خصوصی تعاون رہا وہ بھی میرے ساتھ بہت ہی شفقت ورحمت کا معاملہ فرماتے تھے ان کے والد گرامی قدر جناب حافظ محمد یعقوب صاحب حضرت گنگوہیؒ کے نواسے تھے میں نے سات سال تک انہی کی کرم فرمائیوں اور مہربانیوں کی بدولت انکی مسجد میں تراویح میں قرآن پاک سنایا وہ اپنی قلبی محبت کی وجہ سے مجھے کسی طرح بھی نہیں چھوڑتے تھے انکی وفات کے بعد دوسری مساجد میں سنانے کا موقعہ ہوا بڑے ہی مہربان تھے کبھی کبھی اپنے گھر پر بلا کر مجھکو رس کی کھیر کھلاتے اور چائے کا اہتمام کرتے کبھی کبھی تو میرے انتظار میں چائے نوش نہ فرماتے اور کھانا نہ کھاتے تھے اللہ تعالیٰ موصوف کو جنت میں درجات عالیہ نصیب فرمائے حضرت شیخ الاسلامؒ کی مدرسہ اشرف العلوم میں بارہا تشریف آوری ہوئی خصوصاً سالانہ اجلاس کے موقعہ پر اکثر و بیشتر آپ جلسہ کو رونق بخشتے تھے اور اپنے گراں قدر وعظ اور بیش بہا خطاب سے لوگوں کو مستفیض فرماتے تھے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بروقت شدید اعذار پیش آنے کی وجہ سے آپ کی تشریف آوری نہ ہو پاتی تھی جب کبھی ایسا ہوتا آپ معذرت نامہ تحریر فرماتے اور تواضع جو آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی آپ کی تحریر سے عیاں ہوتی چنانچہ ۱۳۷۲ھ میں جلسہ کے عین موقعہ پر آپ کو شدید مرض لاحق ہوا جسکی وجہ سے آپ تشریف نہ لا سکے آپ نے معذرت پر مشتمل تحریر روانہ فرمائی۔

حضرت مدنیؒ کا ایک گرامی نامہ

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں گنگوہ اس وقت حاضر نہ ہو سکا باوجودیکہ میں دوشنبہ اور سہ شنبہ کو بیمار ہو گیا تھا دوتے اور چھ سات دست آئے اور انکی وجہ سے بہت ضعف ہو گیا تھا ڈاکٹری دوائیں کل تک استعمال کرتا رہا مگر آپ کے نمائندہ مولوی حافظ شبیر احمد صاحب کے آنے پر پختہ ارادہ کر کے روانہ ہو گیا تھا یہاں لوگوں کا اصرار تھا کہ موجودہ حالت میں مجھکو نہ جانا چاہیے مگر میں ایفاء وعدہ کرنا چاہتا تھا افسوس کہ وہ تانگہ جسکو حافظ شبیر احمد صاحب لائے تھے نہایت ہی خراب تھا باوجودیکہ گاڑی میں پندرہ منٹ باقی تھے وہ راستہ میں ہی نہایت سست چلا قدم قدم پر ٹھہرتا تھا راستہ ہی میں صدر چوکی کے کچھ آگے تھا کہ گاڑی آگئی تیز چلنے کی جب تاکید کی گئی اور چلایا گیا تو یکبارگی پہیہ نکل گیا گھوڑا گر گیا اگرچہ کسی کو خدا کے فضل سے چوٹ نہ آئی مگر اس قدر تاخیر ہو گئی کہ گاڑی چھوٹ گئی پھر ہم لاری کے اڈہ پر گئے مگر وہاں پونے چار بجے پہونچے تو معلوم ہوا کہ

پونے پانچ بجے تک انتظار کرنا ہوگا اس لئے بمجبوری ارادہ فسخ کرنا پڑا، میرا عذر اراکین مدرسہ سے ذکر کردیں اور معافی کی درخواست کردیں چونکہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور دوسرے حضرات پہونچ گئے ہیں اس لئے میری غیر حاضری سے جلسہ میں کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تقدیر الٰہی پر تدبیر غالب نہیں ہوتی جملہ اراکین مدرسہ سے سلام مسنون عرض کردیں، والسلام۔

ننگ اسلاف: حسین احمد غفرلہ

۲۷ر شوال ۱۳۷۲ھ

اس طرح ایک اور اجلاس کے موقعہ پر آپ کو شدید عذر پیش آیا آپ کی طبیعت بے حد ناساز تھی آپ نے اس کے باوجود کوشش کی مگر کارگر نہ ہوسکی چنانچہ میں اشرف العلوم کے سالانہ جلسہ کی تاریخ کی تعیین کے سلسلہ میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت نے جمعرات کا دن مقرر فرمایا میں نے یہاں آکر قرب وجوار قصبہ میں سالانہ جلسہ اور اس میں حضرت مدنیؒ کی تشریف آوری کی اطلاعات اعلانات لوگوں میں کرادیئے اور حضرت کو لینے کیلئے دیوبند پہونچ گیا برسات کا موسم تھا نماز ظہر سے قبل حضرت سے ملاقات ہوگئی ملاقات کے بعد حضرت کو اشرف العلوم کے جلسہ کی تاریخ یاد دلائی حضرت نے فرمایا ہاں ضرور چلوں گا دریں اثنا حضرت سے میں بات ہی کر رہا تھا کہ سامنے والے حجرہ سے مولانا قاری سید اصغر صاحبؒ خادم خاص حضرت مدنیؒ آگئے اور مجھے بات کرتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ حضرت کو بخار ہے اور حضرت کی طبیعت ناساز ہے انہوں نے کہا کہ اتنا بھی خیال نہیں کرتے اور حضرت کو لینے کے لئے آگئے پھر وہ حضرت مدنیؒ سے مخاطب ہوئے اور بہت ہی سخت مگر ہمدردانہ لہجہ میں کہا کہ آپ گنگوہ نہیں جائیں گے آپ کی طبیعت خراب ہے آپ کی طبیعت خراب ہے دو تین مرتبہ دہرایا مگر حضرت نے ان کے یہ جملے سننے کے بعد فرمایا کہ انہوں نے جلسہ کا انتظام کررکھا ہے اور میں نے وعدہ کررکھا ہے اس کا کیا ہوگا لوگ یوں کہیں گے کہ وعدہ کرتے ہیں مگر اس کو پورا نہیں کرتے مگر وہ بار بار محبت میں یہی کہتے رہے کہ حضرت آپ کی طبیعت خراب ہے عذر تو ہو ہی جاتا ہے اور آپ کو تو واقعی عذر ہے اس گفتگو کی وجہ سے نماز میں بھی پانچ سات منٹ کی تاخیر ہوگئی حضرت مسجد میں نماز کیلئے تشریف لے گئے نماز کے بعد مجھ سے فرمایا کہ تانگہ لے آؤ میں تانگہ کی تلاش میں نکلا اس وقت تمام تانگے اسٹیشن جاچکے تھے پھر میں جامع مسجد تک تانگہ سواری کی تلاش میں گیا وہاں صرف گھوڑا ایکی تانگہ ملا جو کمزور قسم کا تھا میں اس کو لے آیا اور آکر حضرت کو اطلاع کردی کہ حضرت تانگہ آگیا حضرت شیروانی پہن کر اندر سے تشریف لائے اور تانگہ میں بیٹھ لوگ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے حضرت مدنیؒ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے میں اور مولانا اسعد مدنی صاحب آگے کی سیٹ پر بیٹھے تانگہ چلا تانگہ ابھی بازار ہی میں تھا کہ ٹرین کے آنے کی آواز

کانوں میں پڑی تانگہ والے نے ذرا تیز بھگانا شروع کیا تانگہ جب حکیم محمد عمر صاحب مرحوم کی مسجد کے قریب پہنچا تو گاڑی نے روانگی کی سیٹی دیدی تانگہ والے نے اور تیز بھگانا چاہا مگر گھوڑا ایک دم گر گیا ہم دونوں چونکہ آگے تھے اس لئے ہم دونوں کو معمولی سی چوٹ لگی اور حضرت بحمد اللہ محفوظ رہے ادھر اسٹیشن سے ریل گاڑی روانہ ہوگئی، حضرت نے فرمایا گھر چلو چنانچہ ہم لوگ گھر کی طرف واپس ہوئے، حضرت اندر گھر میں تشریف لے گئے اور میں باہر عجیب مایوس کن حالت میں باہر کھڑا رہ گیا کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی رات میں جلسہ ہوتا ہے لوگ قصبہ و دیہات سے شریک اجلاس ہونے والے ہیں اور حال یہ ہے کہ اب گنگوہ کے لئے میری واپسی کا راستہ نظر نہیں آتا کیونکہ اس زمانہ میں سہارنپور آنے کے لئے بسیں نہیں چلتی تھیں ٹرین ہی واحد ذریعہ تھا وہ جا چکی تھی پھر میں نے ٹیکسی والے کو تلاش کیا مگر وہ بھی نہ ملا اس لئے کہ ٹیکسیوں کا بھی اس وقت زیادہ رواج نہیں پڑا تھا بالآخر مایوس ہو کر بعد نماز مغرب سہارنپور روڈ پر آکر کھڑا ہو گیا اس خیال سے کہ شاید کوئی سواری مل جائے اور میں کسی طرح گنگوہ پہونچ جاؤں، کافی دیر بعد ایک ٹرک آیا میں اس میں بیٹھ کر سہارنپور پہونچا سہارنپور سے آخری بس مل گئی اس میں بیٹھ کر گنگوہ پہونچ گیا برسات کا موسم تھا یہاں گنگوہ میں بارش ہو رہی تھی جسکی وجہ سے جلسہ کا سارا انتظام بگڑ گیا تھا پھر اگلے دن صبح کو جلسہ کی دوسری نشست ہوئی اور جلسہ کا پروگرام نماز جمعہ سے قبل پایۂ اختتام کو پہونچا۔ پھر بھی آئیں گے گر خدا لایا

جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں حضرت مدنیؒ کا آخری ورودِ با مسعود

سالانہ جلسہ کا پروگرام تو حالات واعذار کی نذر ہو گیا تھا مگر ڈیڑھ دو ماہ بعد حضرت شیخ الاسلام گنگوہ اپنے پروگرام سے تشریف لائے حسب معمول آداب ملاقات و شرف نیاز حاصل کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت نماز عشاء مدرسہ میں ادا فرمالیں اور بعد نماز چند دعائیہ کلمات ارشاد فرمادیں میری اس درخواست پر حضرت نے فوراً فرمایا ہاں ہاں تیرا قرض بھی تو میرے ذمہ باقی ہے، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت نے اس ناچیز کو کس قدر یاد رکھا اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت اپنے چھوٹوں پر بڑی توجہ فرماتے اور حسب موقعہ اس کا اظہار بھی فرمادیتے تھے تاہم آپ مدرسہ تشریف لائے اور بعد نماز عشاء حضرت نے موعظت و نصیحت کے کلمات ارشاد فرما کر دعا فرمائی۔

بندہ کی حضرت مدنیؒ کے جنازہ میں شرکت

حضرت کو مسلسل جدوجہد اسفار کی کثرت اجلاسات کی شرکت نے عوارض جسمانیہ میں مبتلا کر دیا تھا انتقال سے دو سال قبل یہ حالت ہو گئی تھی کہ تھوڑی دور پیدل چلنا دشوار تھا اس کے باوجود آپ ایک دینی جلسہ

کی شرکت کیلئے مدراس کا سفر کیا وہاں آپ کو قلب کا عارضہ پیش آیا تو سفر مختصر کر کے جلد واپس تشریف لے آئے اس سفر میں طبیعت اس قدر خراب ہوئی تھی کہ آئندہ سفر جاری رکھنا سخت نقصان دہ تھا زیادہ تقریر کرنے اور چلنے سے سانس پھولنے لگتا تھا جب یہ حالت ہوگئی تو ڈاکٹروں نے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا اور زیادہ چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کی ممانعت کر دی اور ڈاکٹروں نے کھڑے ہونے سے منع کیا مگر آپ نے ان کی بات نہ مانی اور مہمان خانہ میں باجماعت نماز ادا فرماتے رہے کچھ دن بعد آپکی حالت بہتر ہوگئی مگر اچانک دوبارہ تنفس کا حملہ ہوا معالجین نے اپنا علاج شروع کیا مگر مرض کی شدت بڑھتی چلی گئی اور کمزوری اس قدر آگئی تھی کہ سہارے کے بغیر اٹھ بیٹھ نہ سکتے تھے اسی دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب تشریف لائے تو حضرت نے فرمایا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی وہیں سے دعاء فرما دیتے شیخ صاحب نے فرمایا کہ خدا آپ کا سایہ مبارک قائم رکھے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی حضرت شیخ زکریا ڈاکٹر برکت علی کو ساتھ لائے تھے انہوں نے حضرت کا پون گھنٹہ معاینہ کیا اور بڑی حیرت کے ساتھ کہا کہ حضرت زندہ کیسے ہیں ان کے اعتبار سے زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی وصال سے تین دن قبل آپ بصحت معلوم ہوئے اور یہ خیال ہوا کہ اب صرف کمزروی باقی ہے مگر تین دن بعد آپ عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ گفتگو کرنے کے بعد بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے اور کروٹیں بدلنے لگے زبان پر اللہ اللہ جاری تھا عرض کیا گیا کہ حضرت کچھ تکلیف زیادہ ہے فرمایا ہاں بھائی ذرا اٹھا دو سہارا دیکر اٹھا دیا گیا آپ نے پانی طلب فرمایا پانی پلایا گیا پھر آپنے کچھ علمی گفتگو کرنے کے بعد فرمایا مجھے لٹا دو آپ لیٹ گئے اور صبح نماز فجر آپنے اول وقت ادا فرمائی اشراق تک وظائف میں مشغول رہے جب اچھی طرح دن نکل آیا تو آپ نے صحن میں آنے کی خواہش ظاہر فرمائی آپ کو صحن میں چارپائی پر لٹا دیا گیا بارہ ۱۲ بجے شربت کے چند گھونٹ پئے اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئے دادی محترمہ نے کہا آپ لیٹ جائیے آپ لیٹ گئے اور حضرت مولانا اسعد صاحب بدن دبانے لگے حضرت مولانا اسعد صاحب نے دیکھا کہ حضرت سو گئے تو وہاں سے آہستہ آہستہ ہٹ گئے اور ہر دس منٹ بعد کمرہ میں کوئی نہ کوئی آتا جاتا رہا جب ڈھائی بج گئے تو آپ کو اٹھانا چاہا مگر بدن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی گھبراہٹ ہوئی حضرت مولانا اسعد صاحب کو بلایا گیا آپ آئے نبض دیکھی تو ساکت تھی مولانا اسعد صاحب مولانا اصغر صاحب وغیرہ حضرات نے خوب اچھی طرح دیکھا موت کے بالکل آثار نہیں نہ چہرہ پر مردنی ہے نہ روح پرواز کرنے کی علامتیں ہیں سب حیران تھے ڈاکٹر کو بلایا گیا اس نے دل پر آلہ لگا کر دیکھا تو دل کی دھڑکنیں بند ہو چکی تھیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جان کر منجملۂ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

تمام اہم مقامات پر بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی گئی ہم کو عصر کے وقت ہی حضرت کے وصال کی خبر مل گئی

تھی میں علی الفور حضرت مولانا ایوب صاحب گنگوہی کولیکر دیو بند روانہ ہوگیا تھا تجہیز و تکفین میں جلدی کی گئی بعد مغرب ہی غسل کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں غسل دینے والے حضرات میں حضرت شیخ زکریا صاحبؒ حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ مولانا عبدالاحد صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیو بند مولانا راشد حسن عثمانی صاحبؒ نبیرہ حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ حضرات شریک تھے جنازہ رات آٹھ بجے ہی تیار ہوگیا تھا جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جنازہ اٹھانے کی سعادت حاصل ہوسکے لوگ ٹرینوں بسوں ٹیکسیوں اور ٹیمپوؤں کے ذریعہ بڑی تعداد میں دیو بند پہونچے مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی جنازہ احاطہ مولسری لیجانے میں ۵۰ رمنٹ کا وقت لگا آخری دیدار کیلئے آپ کا جنازہ دارالحدیث میں رکھا گیا حضرت شیخ زکریاؒ نے نماز جنازہ پڑھائی چراغ محمدی میں لکھا ہے کہ انتقال کے بعد حضرت شیخ زکریاؒ تشریف لائے حضرت کی پیشانی کو بوسہ دیا تو ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ کر رہ گیا پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں جنازہ قبرستان قاسمی میں لایا گیا اور آپ کو شیخ الہندؒ کے قریب میں دفن کیا گیا

اس طرح یہ شیخ الہندؒ کا وفادار اور مخلص شاگرد جو سفر وحضر میں مصیبت وتکلیف میں اور ان کے کام اور کاز میں اور ان کے عزم وارادہ اور منصوبہ کی تکمیل میں اور ان سے حاصل کردہ امانت کی اشاعت میں ہمیشہ اپنی جان ، مال ، وقت قربان کرتا رہا اور دیو بند سے لیکر مالٹا تک اور ہندوستان سے حرمین تک ہمیشہ ساتھ دیتا رہا بالآخر آخرت کی منازل میں بھی رفاقت اختیار کرگیا اور اپنے محبوب استاذ کے ہی قرب میں آرام کرنے کیلئے ہمیشہ ہمیش کیلئے لیٹادیا گیا اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا ۔

جان دے ہی دی جگر نے پائے زلفِ یار پر — مدتوں کی بے قراری کو قرار آہی گیا

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرماتے تھے: بندہ کے ساتھ حضرت کا زندگی بھر بے حد مشفقانہ والہانہ تعلق رہا جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں حضرت کی بارہا تشریف آوری ہوئی دعائیں دیں ہمت بندھائی دار قدیم کا سنگ بنیاد رکھا حضرت کی یادگار میں مدرسہ میں کتب خانہ قائم ہے جس میں تقریباً بارہ ہزار مختلف علوم وفنون کی کتابیں موجود ہیں، حضرت شیخ الاسلامؒ کے سلسلہ میں مدرسہ کی روئیداد میں بسال وفات حضرت والد صاحبؒ نے اس طرح لکھ کر اپنے غم وافسوس کا اظہار کیا۔

تازہ صدمہ

اب حسین احمد نہیں ہیں گو ہمارے درمیاں — لیکن ان کا فیض روحانی تو ہے رحمت فشاں
وہ حسین احمد یہاں تھے کل جو محبوب نظر — آج ہیں بام حقیقت کی فضا میں جلوہ گر

علم وعمل کا آفتاب غروب ہوگیا، علمی وعملی دُنیا بلکہ تمام عالم سوگوار ہے اور ارباب فضل وکمال غم والم کے عمیق سمندر میں ڈوب گئے، شیخ الاسلامؒ کی موت نے ہم جیسے بینوا انسانوں کی کمر ہمت توڑ دی، حضرت شیخ سراپا شفقت ومحبت تھے وسعت علم میں اپنی آپ مثال تھے، پھر حافظہ کی بے پناہ قوت، قدرتی ذکاوت اور طبعی ذہانت بھی از بس تھی جن لوگوں کو آپ سے ملاقات کا موقعہ ملا ہے وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت شیخ میں دین کا کیسا مخلصانہ جذبہ تھا، علم میں اگر آسمان کی سی وسعت کے مالک تھے تو عمل میں سمندر کی گہرائی رکھتے تھے، حمیت وغیرت کا جیسا جوش وتلاطم تھا اس کی مثال اب کم ہی دیکھنے میں آئیگی

بروں ہینم اوصاف شیخ از حساب　　　نگنجد دریں نامہ مختصر ہمچناں

ایسے موقعہ پر سخت کمی ہوگی اور اس روئداد میں ایک خاص نقص ہوگا جو یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ سالانہ اجتماع میں خصوصاً وقتاً فوقتاً عموماً مدرسہ اشرف العلوم رشیدی قصبہ گنگوہ کو حضرت شیخ اپنے فیوض وبرکات سے مستفیض فرماتے تھے نیز مجاہد جلیل عالم کبیر حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کے وطنِ مالوف ہونے کے باعث بیحد شفقت وکرم اور خاص وابستگی رکھتے تھے کہ یہ مقام علم وعمل سے خالی نہ رہے، حضرت شیخ نے ۱۲ رجمادی الاول ۱۳۷۷ھ بروز جمعرات بوقت ۳ ربجے شام دیوبند ہی میں انتقال فرمایا اور ان کے بعد ہمارے لئے ان کے اخلاص ومحبت اور نیکی اور نیکوکاری کی صرف یاد رہ گئی ہے، ہم خدامان وکارکنان مدرسہ ہذا دعا گو ہیں اور اپنے دوستوں سے دعائے مغفرت کے طلبگار ہیں کہ حق تعالیٰ حضرت شیخ مرحوم کے اعمال صالحہ کو قبول فرمائے اور رحمت الٰہی حیاتِ اُخروی میں ان کی دستگیر ہو اور ان کے متعلقین صبر اور زندگی کا حوصلہ پائیں آمین ثم آمین۔

ناشر

شریف احمد ناظم مدرسہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

اس موقع پر شیخ السلام حضرت مدنیؒ کی اعلیٰ وارفع شخصیت کی ترجمانی میں منظوم تأثرات نقل کیے جاتے ہیں

وہ شیخ الہند محمود الحسن کی آنکھ کا تارا
وہ نور عینِ امداد ورشید قطبِ ربّانی
رسول اللہ کا وارث ولی اللہ کا وارث
وہ فخر خاندانِ قاسمی وہ شیخِ ربّانی
وہ شمس علم وحکمت جس سے عالم ہوگیا روشن
عجم میں جس کی تنویریں عرب میں جس کی تابانی
وہ شیرِ بیشۂ اسلام وہ مستانۂ وحدت
وہ جس کی گونج سے دُشمن کا پتہ ہوگیا پانی
حسین احمد اسی قدسی صفت کا نامِ نامی ہے
اسی پر آج ہے اتمام نعمت ہائے ربّانی
اسیر مالٹا وہ یاد گار احمد حنبل
اسیر قیدِ زنداں ہوگیا وہ یوسفِ ثانی
دبانے سے نہیں دبتے یہ حُریت کے متوالے
کہیں روکے سے رُکتی ہے سمندر کی بھی طغیانی
کبھی مردانِ غازی غیر حق سے ڈر نہیں سکتے
یہی وہ ہیں جو کرتے ہیں فقیری میں بھی سلطانی
اَشِدَّآءِ عَلَی الْکُفَّارِ کی تلوار ہاتھوں میں
نظر آجائے بینھُم جوکوئی دیکھے تو پیشانی
تَرٰہُم رُکَّعًا او سُجَّدًا فی اللَّیل رہبان
شعارِ زندگانی ابتغاءِ فضلِ ربّانی
صحابہ کانمونہ اور رسول اللہ کا اُسوہ
انہیں دیکھو کہ ہیں یہ منظرِ آیات قرآنی
حسین احمد کے حصے کا پلاؤ کھانے والوں کو
تن آسانی تو آسان ہے مگر مشکل ہے قربانی
خدا کی راہ میں مرمٹنے والوں سے کوئی پوچھے
کہ قیدوبند میں ہیں کیسی لذتہائے روحانی

(چراغ محمدؐ ص ۳۷۰)

دعا ہے کہ اللہ پاک حضرت مدنی قدس سرہ کو کروٹ کروٹ راحت وسکون نصیب فرمائے ان کے فیوض وبرکات کو تا قیامت جاری رکھے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ہم سبھوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے آمین۔ ■

مسئلۂ قومیت، علامہ اقبال اور مولانا مدنیؒ

افاداتِ مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ

قومیت کی بحث میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقالہ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کی علمی حیثیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ پورا مقالہ ہی نقل کر دیا جاتا لیکن مولانا فرید الوحیدی نے اپنی تالیف لطیف "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سوانحی و تاریخی مطالعہ" میں جس حد تک مذکورہ مقالے کے اقتباسات سے مقصد کے حصول میں کام لیا ہے، اسی سے استفادہ کر لیا جائے۔ پورا مقالہ نقل کرنے میں فاضل مرحوم مولف کو عدم گنجایش مانع ہوئی تھی۔ قلت صفحات کا امر یہاں بھی مانع ہے۔ اگرچہ پیش نظر صورت میں ذوق مطالعہ کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کا محاکمہ قلب کو مطمئن کر دیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

سید صاحب لکھتے ہیں:

"جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی شخصی عزت و احترام، علمی فضل و کمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جا سکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرے کو جس طرح سیاق و سباق سے قطع کر کے اچھالا گیا ہے اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے، وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے ان کا اعتبار کر کے شاعر اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک

ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بناء پر تھی۔ صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لیے بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہوگیا۔ (اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ اراپریل ۱۹۳۸ء)

''صحیح وفصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں ''ملت'' کے ایک ہی معنی اور وہ مذہب کے، ملت ابیکم ابراھیم .(حج) (ایضاً)

قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں، یہ قرآن پاک اور عربی محاورے میں تین معنوں میں آیا ہے، مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے ذالک بانھم قوم لایعقلون۔ (سورۃ المائدہ)

یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

بانھم قوم لایفقھون. (توبہ) اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

انکم قوم منکرون۔ (حجر) تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہوسکتا ہے۔

(ایضاً)

''ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہوتو ہومگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں، لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کہ وفوق کل ذی علم علیم.

''اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں، اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترکہ سیاسی باطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس لفظ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبہ سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنہوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاکِ وطن کو مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے؟

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنہوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے۔

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انہی کا بخشا ہوا ہے۔

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ ''قوم اوطان سے بنتی ہیں'' قابل اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا...... ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے''۔

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی ''ملت'' ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔

(ایضاً)

آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بہ شانہ رہتے ہیں اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہر حال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے، ملت و امت کے لفظ قطعاً نہیں ہیں اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے تو کیا اس کے لیے ''جنسیت'' کا لفظ بول سکتے ہیں؟ مگر بولنے سے پہلے قوم کے مفتیوں کی قوم سے بہر حال پوچھ لینا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا اور ملت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بناء پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائے گا''۔ (اخبار مدینہ بجنور، ۱۳/اپریل ۱۹۳۸ء)

(ماخوذ از شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی: مولانا سید فرید الوحیدی، مکتبہ محمودیہ۔ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۶-۴۳۳) ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

فیوض و تاثرات

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

(مدیر البعث الاسلامی، و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

میں جامعہ مفتاح العلوم مئو جو پہلے اعظم گڑھ ضلع میں تھا (اور اب خود ضلع بن گیا ہے) میں ابتدائی درجوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ مدرسہ میں ایک دن اچانک اعلان ہوا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے ہیں اور چند گھنٹے مدرسہ کے مہمان خانہ میں قیام فرمائیں گے میں اور میرے ساتھی سراپا شوق بن کر حضرت مدنی رحمہ اللہ علیہ کو دیکھنے کے لئے مدرسہ کے باہر کھڑے ہو گئے، تھوڑی دیر میں حضرت مدنی کی گاڑی آئی، مدرسہ کے ذمہ داروں نے استقبال کیا، ہم کم عمر بچے حضرت مدنی کی نورانی شکل دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے، گاڑی سے اتر کر حضرت مدنی کے چلنے کا انداز، ان کا طرز تکلم ان کی مجلس اور کھانے کے وقت سنت کا اہتمام ساری چیزیں دیکھ کر شخصیت کی عظمت و محبت کا ایک شعور دلوں میں بیدار ہوا، کھانے کھانے کے بعد قیلولہ کا انتظام تھا، گرمیوں کا زمانہ تھا، قیلولہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوا، لوگ مہمان خانہ میں حضرت کے قریب بیٹھ گئے، اس وقت بجلی کے پنکھے کا انتظام نہیں تھا، تو بیٹری کے ذریعہ ایک چھوٹا سا پنکھا حضرت کے جسم مبارک کو ہوا دیتا رہا، عصر کا قریب تھا، حضرت قیلولہ فرما چکے تھے، وضوء کے لئے قریب ہی انتظام تھا، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں حضرت کے وضوء فرمانے کا طریقہ دیکھ لوں، مدرسہ سے ملحق جامع مسجد میں عصر کی نماز حضرت نے جماعت کے ساتھ پڑھی، اور مغرب کی نماز کی امامت فرمائی، محراب میں

کچھ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے، حضرت نے اسے ہٹانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ محراب کے اندر بے سادگی ہونی چاہیے، دوسرے ہی دن اس حکم پر عمل کیا گیا، نقش نگار ہٹادئے گئے اور محراب سادہ کردی گئی، حضرت مجلس میں تشریف فرما تھے، علماء کرام کی ایک بڑی جماعت حاضر خدمت تھی، مدرسہ کے ایک معزز ممبر حضرت سے ملنے کے لئے آگے بڑھے، اور مصافحہ کر کے بیٹھ گئے، لوگوں نے تعارف کرایا، ان کی داڑھی نہ ہونے کے برابر تھی، حضرت نے صراحت سے فرمایا: نام اتنا خوبصورت، اور چہرے پر داڑھی نہیں، اس زمانہ میں بھی اور ہمیشہ حضرت مدنی رحمہ اللہ علیہ داڑھی سنت کے مطابق رکھنے کی تاکید فرماتے تھے، اور نہ صرف داڑھی بلکہ جملہ امور زندگی میں سنت کا اتباع کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۵ء سے پہلے کا ہے، ان دنوں ملک کی آزادی کا ہر طرف چرچا تھا، جلوس نکلتے تھے، اس میں مسلم وغیر مسلم سبھی شریک ہوتے تھے، اس زمانہ میں حضرت ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے تھے اور انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کے موضوع پر جو جلسے ہوا کرتے تھے اس میں شرکت فرما کر پراثر تقریروں سے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جمعیت علماء ہند کے صدر ہونے کے ساتھ حضرت کا سیاسی تعلق کانگریس سے تھا اور مسلم لیگ ان کوششوں کی مخالفت کررہی تھی، وہ حضرت مدنی کی کانگریس کے ساتھ آزادی حاصل کرنے کی کوششوں کو غلط سمجھتی تھی، مسلم لیگ کے لوگ ملک کو آزاد کرا کے ایک بڑا پاکستان وجود میں لانا چاہتے تھے اور حضرت مدنی کی شان میں گستاخیوں کا ارتکاب کیا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں حضرت مدنی کا ایک سفر صوبۂ بہار کے مختلف علاقوں کا ہوا، مسلم لیگ کے لوگوں نے حضرت کا بائیکاٹ کرنا طے کیا اور بھاگلپور میں ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوکر حضرت کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا، جس کی مذمت کے لئے الفاظ نہیں ہیں، ہندوستان کے علماء کرام کو اس نازیبا حرکت کی خبر پہونچی، سخت ترین احتجاجات ہوئے اور مسلم لیگ کے خلاف جلوس نکالے گئے، مئو ضلع اعظم گڑھ کے ایک جلوس میں بچوں کی جماعت کے ساتھ میں بھی لگا ہوا تھا، اس میں حضرت مدنی کے ساتھ ناروا سلوک پر جلوس کے ذمہ داران ایک نظم پڑھ رہے تھے، اس کا ایک شعر یاد ہے

وہ بھاگلپور میں نقشہ نظر آیا مدینہ کا
کب ان کو چھوڑ کر جائیں گے غداروں کی جھرمٹ میں
امیر الھند، شیخ الہند، مولانا حسین احمد
انہیں کے ساتھ مرنا ہے، انہیں کے ساتھ جینا ہے

اللہ تعالی نے اس واقعہ سے حضرت مدنیؒ کی شان میں اضافہ فرمایا، اور جہاں ایک طرف آزادیٔ ہند کے

لیڈروں نے حضرت کو سر پر بیٹھا یا وہیں جماعت علماء ہند میں ان کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہوا، اور سبھی لوگوں نے یک زبان ہوکر ان کو دینی پیشوا اور قائد آزادی تسلیم کرلیا اور حضرت کا دورہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جاری رہا، ہر جگہ توقیر و تعظیم کے ساتھ استقبال ہوتا، عوام وخواص سبھی حضرت کو اپنی آنکھوں اور سروں پر بیٹھاتے اور ان کی تمام باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے۔

الحمد للہ حضرت مدنی جمعیت علماء کرام ہند کے صدر الصدور تھے، اور آپ کے ساتھ پورے ہندوستان کے موقر علماء کرام کی ایک بڑی جماعت تھی، آپ کی کوششوں سے ملک کے سبھی لیڈر (جس میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پیش پیش تھے) اور اس دور کے سبھی بڑے علماء کرام آپ کے قیادت میں ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کررہے تھے اور شب وروز اس کے لئے محنت کرتے تھے، خود حضرت مدنی ان کے ساتھ تمام کاموں میں شریک رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو قبول فرمایا، اور آخر کار سامراجیوں کو ملک چھوڑنا اور اہل وطن کے حوالے کرنا پڑا، اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوگیا، اس آزادی میں جمعیت علماء ہند کے صدر نشیں حضرت مدنیؒ کی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے جو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا اور آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کریں گی، اور ان کی معلومات میں زبردست اضافہ ہوگا۔

آزادی کے بعد حضرت مدنیؒ کا ایک سفر اعظم گڑھ ضلع میں ایک گاؤں پورہ معروف کا ہوا، وہاں کے لوگ حضرت مدنیؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اور دل وجان سے فدا تھے، وہاں کی جامع مسجد جس کی نئی تعمیر ہوئی، صحیح قبلہ رخ ہونے کے بارے میں اعتراض کیا گیا، اس کا فیصلہ کرانے کے لئے حضرت مدنیؒ سے درخواست کی گئی کہ حضرت والا جو فیصلہ فرمادیں اس پر عمل کیا جائے گا۔

اعلان ہوا کہ پورہ معروف میں حضرت مدنیؒ فلاں تاریخ کو تشریف لارہے ہیں، لوگ جوق در جوق وہاں جانا شروع ہوگئے، جس میں، میں بھی مدرسوں کے ساتھیوں کے ساتھ والد معظمؒ کی اجازت سے حضرت سے ملنے کے لئے گیا، جب وہاں پہونچا تو حضرت والا وضو فرمارہے تھے اور کئی حضرات وضو کرارہے تھے، حضرت مدنیؒ نے موزہ پر مسح کیا تو اس سے مسح کا طریقہ اس ناچیز نے سیکھا، وضو کرنے کے آداب کا علم ہوا، پھر حضرت کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کی گئی اور قبلہ کا اختلاف الحمد للہ ختم ہوگیا۔

اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے زمانہ میں حضرت کی تشریف آوری ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کے دولت کدہ پر ہوئی، مرشدی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ تشریف فرما تھے، میں بھی اپنے دوست مولانا محمد حسنی کے ساتھ کمرہ میں کنارے بیٹھا ہوا تھا، حضرت کا حسن

وجمال، نورانیت اور ہیبت کا احساس ہوتا رہا، حضرت کی باتیں جس انداز سے فرماتے تھے، سن کر عجیب وغریب لذت وچاشنی محسوس کرتا رہا، حضرت مدنیؒ وہاں اٹھ کر غالباً امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ سے ملنے کے لئے دارالمبلغین تشریف لے گئے۔

۱۹۵۶ء میں اچانک حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی اہلیہ محترمہ اور صدیق محترم مولانا محمد حسنیؒ کی والدہ صاحبہ کا اچانک حادثہ وفات پیش آیا، ڈاکٹر صاحب پر اس کا شدید اثر ہوا، اور پورے خاندان کے لوگ غم زدہ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کے حزن وملال کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی ایسا سفر ہوجائے جس سے رنج وغم دور ہو، حضرت مولانا علی میاںؒ نے ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے طے فرمایا کہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں دیوبند جہاں وہ مقیم تھے کا سفر کرنا زیادہ انسب ہوگا، خاص طور سے اس تعلق کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب کو حضرت مدنیؒ سے تھا، اس سفر سے ڈاکٹر کا غم ہلکا ہوا، حضرت مدنی کی دعائیں غم کے ازالے کا باعث ہوئی اور ڈاکٹر صاحب اطمینان کے ساتھ ندوہ تشریف لائے۔

میں نے سادات حسنیہ کو حضرت مدنیؒ اور ان کے خاندان سے کس قدر محبت وتعلق ہے، اس کی ایک جھلک بچشم خود دیکھا ہے، اگر چہ اب حضرت مولانا علی میاں حسنیؒ اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلیؒ، ان کے فرزند اور دیگر اہل تعلق موجود نہیں، لیکن موجودہ حضرات کا تعلق اور بے حد محبت وعقیدت حضرت مدنی اور خاندان مدنی کے اس طرح موجود ہے، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی اس وقت اس محبت وتعلق کے نہ صرف نمائندے بلکہ اسکے علم بردار ہیں۔

حضرت مدنیؒ کا وصال ۱۹۵۷ء میں ہوا، ان کے بعد حضرت کے جانشیں حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ ہوئے، انہوں نے اس جانشینی کا پورا حق ہر اعتبار سے ادا کیا، سیاسی، اجتماعی، دینی اور دعوتی ہر میدان میں مولانا اسعد صاحبؒ نے حضرت مدنی کے نقش قدم کو اپنایا، مجھے بار بار حضرت مولانا اسعد صاحب سے ملاقات کرنے اور ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، وہ ہمیشہ لکھنؤ آمد کے موقع حضرت مولانا علی میاںؒ سے ملنے ندوہ تشریف لایا کرتے تھے، اس طرح حضرت سے ملاقات اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا، اسی طرح حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ سے شروع کے ملاقات اور ان کے بارے میں حسن ظن اور شعور محبت کا موقع حاصل ہے، ان کے زندگی میں بھی حضرت مدنیؒ کا عکس جمیل موجود ہے، وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں، لیکن ملک کے مثبت مسائل اور خاص طور سے مسلم مسائل کے بارے میں نہایت جرأت مندانہ اقدام کرتے ہیں اور اصحاب اقتدار سے نہایت بے تکلفی اور بلندی سے ملتے ہیں اور مسائل کو حل کرنے کی طرف جرأت کے ساتھ توجہ

دلاتے ہیں، حضرت مولانا اسجد مدنی صاحب، حضرت مولانا محمود مدنی صاحب اور اسرۂ مدنیہ کے بھی حضرات سے تعلق ومحبت، دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے، میرے برادر بزرگ حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی اس خاندان سے بے تکلفانہ تعلق رکھتے تھے اور حضرت مدنیؒ کے بے حد معتقد تھے اور ہمیشہ حضرت کی عظمت کے قصے بیان کیا کرتے تھے، میرے والد معظم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حضرت مدنیؒ سے والہانہ تعلق رکھتے تھے اور بہت تعظیم کرتے تھے۔

امید ہے کہ حضرت مدنیؒ کی نیابت اس خاندان کے علماء اور ان کی آنے والی نسلیں ہمیشہ کرتی رہیں گی اور تاریخ مدنی کو روشن کرتے ہوئے حضرت کے نقش قدم پر چل کر اپنی خاندانی عظمت اور دین وتقویٰ وقیادت کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔

اپنے ذاتی احساسات ومشاہدات کی چند سطریں نذر قارئین ہیں، ورنہ:

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

حضرت مدنی کا ایک سفر اعظم گڑھ کے اہل تعلق وارادت کے اصرار پر ہوا، اور غالباً یہ آخری سفر تھا، سخت ترین گرمی اور لو کا موسم تھا، اس سفر کا اثر صحت پر پڑا، اور حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی، اور سفر آخرت کا سبب بنی، اور ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو آپ مسکراتے ہوئے دربار الٰہی میں حاضر ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ■

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

کل شیء ھالک الا وجھہٗ.

آہ! کیوں کر کہیے کہ فلک علم و فضل کا آفتاب رخشندہ غروب ہو گیا، بزم انس و قدس کی شمع فروزاں گل ہو گئی۔ درج تقویٰ و طہارت کا لعل شب چراغ گم ہو گیا، شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا محرم جاتا رہا۔ اخلاق و مکارم اسلامی کے ایوان میں خاک اڑنے لگی۔ جو کل تک لاکھوں انسانوں کے لیے طبیب عیسیٰ علیہ السلام نفس تھا خود وہ موت کی آغوش میں جا سویا، ملت بیضا کا سہارا، فرزندانِ توحید کی امیدوں کا مرجع، پیروان دین محمدی کی تمناؤں کا مرکز راہی ملک عدم ہو گیا، یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ۵ ردسمبر کو بمقام دیوبند سہ پہر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

حضرت مولانا کی وفات ایک فرد، ایک شخص اور ایک انسان کی موت نہیں، بلکہ ایک خاص دور ایک عہد اور حیات ملی کے صحیفے کے ایک باب کا اختتام ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جو چمن لگایا تھا مولانا اس چمن کی آخری بہار تھے، حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا نانوتوی نے شریعت و طریقت، علم و عمل اور تقدس و طہارت کی جو بزم سجائی تھی اجل کی باد صرصر اس کے چراغ بجھاتی رہی مگر ساتھ ہی چراغ سے چراغ بھی روشن ہوتے رہے اور بزم کبھی تاریک نہیں ہوئی۔ لیکن اب اس بزم کا آخری چراغ بجھ گیا، روشنی کی جگہ ظلمت نے لے لی، تاریکی چھا گئی اور بزم کی بساط الٹ گئی۔

اسلام میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا تصور یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ فکر و نظر کی بلندی اور جہد و عمل میں پختگی اور ہمہ گیری ہو اور یہ سب کچھ تعلق باللہ کے واسطہ سے ہو۔ مولانا اس دور میں اس معیار پر

جس طرح پورے اترتے تھے، ہندو پاک تو کیا پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ علم وفضل کا یہ عالم کہ اسرار وغوامض شریعت اور طریقت ہر وقت ذہین میں مستحضر کسی مسائل نے کوئی مسئلہ پوچھا نہیں کہ معلومات کا سمندر ابلنے لگا۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح حضرت مولانا کے مکتوبات بھی جو کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور جو سب کے سب بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ علم وفضل اور حکمت ربانی کا گنجینہ ہیں۔ علوم شریعت وتصوف کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا خاص ذوق اور ان کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے، بین الاقوامی سیاسیات حاضرہ اور علی الخصوص مشرق وسطی اور ممالک عربیہ کی سیاسیات پر بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے اور اس پر برابر غور وفکر کرتے رہتے تھے، گذشتہ سال کلکتہ میں ناگا قبائل کا تذکرہ آ گیا تو مولانا نے ان قبائل کی تاریخ اور ان کی جغرافیائی پوزیشن پر اس قدر عالمانہ اور مبصرانہ تقریر کی کہ سننے والے حیران رہ گئے۔

عربی زبان خالص عربی لب ولہجہ میں بولنے اور گھنٹوں اس میں برجستہ تقریر کر سکتے تھے ترکی زبان سے واقف اور مگدھی زبان سے آشنا تھے۔ اس زبان سے بعض گیت اور اشعار یاد تھے، سلوک ومعرفت میں یہ حال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں نے تجلیۂ باطن کا فیض حاصل کیا اور روحانی مقامات طے کیے، مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الحسن ایم۔ اے کاندھلوی مرحوم سے خود ان کے مکان پر فرمایا کہ میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں، خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں؛ لیکن چونکہ یہ عالم اسباب ہے اس لیے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس غرض کے لیے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں۔

جہد وعمل کے میدان میں مولانا کی زندگی سرتاپا ارباب عزیمت کی زندگی تھی۔ مالٹا کی اسارت سے لے کر ملک کی آزادی کے حصول تک یہ زندگی جو ورع وتقدس کی مکمل آئینہ دار تھی ہمیشہ دار ورسن کے خطرات سے کھیلتی رہی، مصائب وآلام اور شدائد ومحن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا مذاق اڑاتی رہی۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدھلوی کے مکتب خیال کے ایک فرد فرید ہونے کی حیثیت سے اپنے مرشد حضرت شیخ الہند کے ساتھ مولانا نے حریت واستخلاص وطن کی راہ میں دار ورسن کو اس وقت لبیک کہا جب کہ ابھی کانگریس کی زبان کامل آزادی کے لفظ سے آشنا بھی نہیں ہوئی تھی، اس راہ میں طوفان آئے، زلزلے آئے، بجلیاں کوندیں، بگولے اٹھے، کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے لیکن یہ مرد حق آگاہ وحق پرست اپنے مقام پر کھڑا رہا اور اس کے پائے ثبات واستقلال میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔ سیاسیات میں اس درجے عملی انہماک وتوغل کے باوصف جس کا مقصد وحید بھی دین قیم کا احیا اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ ظواہر شریعت میں تقشف اور سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اس محفل نکاح میں شرکت نہیں

فرماتے تھے جس میں عام رسم ورواج کے مطابق دھوم دھڑکا، شاندار دعوت مسرفانہ رسوم اور مہر حضرت فاطمہؓ سے زیادہ مہر باندھا جاتا ہو، اگر حسن ظن کی بنا پر کسی ایسی مجلس میں شریک ہو بھی گئے تو جونہی کوئی ایسی بات علم میں آئی فوراً سخت غیظ وغضب کے ساتھ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے، نشست و برخاست، کھانا پینا، وضع قطع ہر چیز میں آنحضرت ﷺ کے سنن عادیہ تک کا اتباع کرتے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ دینی اور ملی معاملات کے علاوہ نجی زندگی میں حد درجے خوش مزاج، خندہ جبیں اور شگفتہ طبع تھے۔ مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ دونوں وقت کھانے پر اور ناشتہ پر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا، ان کو کھلا کر قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے، متواضع اور منکسر المزاج اس درجے کہ بس عجز وتواضع اور انکسار کا اس سے بڑھ کر تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں مولانا کے بعض واقعات ایسے ہیں کہ قلم کو ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔

مولانا جامعیتِ کمالات اوصاف کے اعتبار سے بے شبہ شیخ العرب والعجم تھے وہ خود تو ۷۸ برس کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے جس کے لیے کم وبیش پانچ ماہ سے ان کی روح ہر وقت بے چین اور مضطرب تھی لیکن عالم اسلام یتیم ہوگیا، مولانا کی وفات ملت بیضا کے لیے ایک سخت اور عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی کی بہ ظاہر مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ''نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ و برد مضجعہ''۔ ■

مسلمانوں کے فرائض ثلاثہ
اور ان کا سرمایۂ حیات

دین وملت کی حفاظت اور تبلیغ وترقی کے لیے پورے اخلاص، استقلال اور صبر وشکر کے ساتھ مکمل کوششیں صرف ہونی چاہئیں۔ وطن عزیز کی حفاظت، ترقی اور سربلندی کے لیے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ اتفاق، اتحاد، یکجہتی اور رواداری کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میں آپ کو کسی خاص جماعت میں شرکت کا حکم نہیں دیتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ملک اور اہل ملک کی ترقی اور بہبود کے لیے آپ اسی جماعت میں شریک ہوں جس کو ان مقاصد اور اصولوں کی روشنی میں بہتر سمجھیں۔ آپ کا نصب العین ملک کی خدمت اور آپ کی زندگی کا سرمایہ بلند حوصلگی، اولوالعزمی اور انتھک جدوجہد ہونا چاہیے۔

(خطبہ صدارت جمعیت علمائے ہند۔ حیدرآباد (دکن)، ۱۹۵۱ء)

شیخ العرب و العجم
خصائص سیرت پر ایک نظر

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

علم وعمل کی دنیا میں عظیم الشان شخصیات کے نام کے ساتھ مختلف خصایص وکمالات کی تصویریں ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، لیکن شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا نام زبان پر آتا ہے تو ایک کامل درجے کی اسلامی زندگی اپنے ذہن وفکر، علم وعمل اور اخلاق وسیرت کے تمام خصایص وکمالات اور محاسن و محامد کے ساتھ تصور میں ابھرتی اور ذہن کے پردوں پر نقش ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسلامی زندگی کیا ہوتی ہے؟ تو میں پورے یقین اور قلب کے کامل اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسین احمد مدنی کی زندگی کو دیکھ لیجئے۔ اگر چہ یہ ایک قطعی اور آخری جواب ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس جواب کو علمی جواب تسلیم نہیں کیا جائے گا اور ان حضرات کا قلب اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتا، جنھوں نے اپنی دور افتادگی وعدم مطالعہ کی وجہ سے یا قریب ہو کر بھی اپنی غفلت کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ کسی خاص ذوق ومسلک کے شغف وانہماک، یا بعض تعصبات نے ان کی نظروں کے آگے پردے ڈال دیے تھے اور وہ حسین احمد کے فکر کی رفعتوں، سیرت کی دل ربائیوں اور علم وعمل کی جامعیت کبریٰ کو محسوس نہ کر سکے تھے اور ان کے مقام کی بلندیوں کا اندازہ نہ لگا سکے تھے۔ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے فکر اور سیرت کے بعض خصایص کی طرف قارئین کرام کو توجہ دلاؤں۔

جامعیتِ علوم وفنون:

حضرت شیخ الاسلام ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ اپنے دور کے بے مثال محدث تھے۔ درس وتدریس

اور تحقیق حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ تدریس حدیث میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا جس نے انہیں اقران و امثال میں امتیاز بخشا تھا۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے اور انہیں نہ صرف فقہ کے مسائل از بر تھے بلکہ فقہ و حدیث میں ان کا درجہ ایک محقق اور مجتہد کا تھا۔ وہ مفسر بھی تھے اور نہ صرف حروف و سواد کی رہنمائی میں بلکہ معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن کے بصائر و حکم اور مسائل و احکام کی تشریح و تفسیر فرماتے تھے۔ وہ ایک زاہد شب زندہ دار بزرگ اور اپنے وقت کے ایک عظیم الشان شیخ طریقت تھے۔ انہیں انسان کے امراض نفس و قلب کا پتا چلانے میں حذاقت کا کمال حاصل تھا۔ معالجہ نفس و طبائع اور اصلاح و تزکیہ میں انہیں ید طولیٰ ملا تھا۔ تاریخ عالم میں انکا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخ معاشیات ہند کے وہ ایک عظیم اسکالر تھے۔ بحر سیاسیات ہند و انقلابات عالم اسلامی کے وہ بے مثل شناور تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے اور افکار کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے اور اپنے عہد کے مشہور خطیب بھی تھے۔ جنگ آزادی میں انہوں نے اپنے جسم و جان اور وقت و مال کی بے مثال قربانیاں دی ہیں۔ وہ ایک صاحب عزیمت شخص تھے۔ ان کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے، جب وہ رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے؛ لیکن ان کی عزیمت اور بلند ہمتی نے رخصت کی پناہ گاہوں کی پستیوں اور ذلتوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ عزائم وقت میں ان کے ذوق فکر و عمل کا پایہ ہمیشہ بلند رہا۔ ذوق میزبانی سے انہیں حصہ وافر ملا تھا۔ وہ اپنے دور کے علما و امرا اور صوفیہ و مشائخ میں سب سے بڑے مہمان نواز تھے۔ عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں سے ان کی طبیعت کا خمیر اٹھا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام وہ کمالات ہیں جو حضرت کی صحبت و قربت رکھنے والا ہر شخص محسوس و معلوم کر لیتا تھا۔ اور آج بھی حضرت کی زندگی کے مطالعے سے بہ آسانی ان خصایص و کمالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، لیکن میں حضرت کے بعض ان کمالات کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا جن کے وزن و قدر کے اندازے کے لیے علم و سائنس کی اس ترقی یافتہ دنیا میں ابھی تک کوئی میزان اور پیمانہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔

اخلاص:

حضرت شیخ الاسلام کے ان کمالات میں سے جو دیکھے اور دکھائے نہیں جا سکتے۔ البتہ کوئی شخص بے میل ذوق، متوازن ذہن اور قلب سلیم کے نعمتوں سے نوازا گیا ہو تو وہ حضرت کے ان خصایص و کمالات کو محسوس کر سکتا ہے۔

حضرت کی سیرت کا پہلا عنصر ”حسن اخلاص“ ہے۔ لیکن اخلاص کیا ہے؟ اخلاص ایک ”جوہر سیرت“ ہے۔ اس کا بیج قلب کی سرزمین میں پھوٹتا ہے، برگ و بار پیدا کرتا ہے اور اس کی سرمدی مہک سے مشام روح معطر ہو جاتا ہے۔ اس جوہر سیرت کو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے لیکن ذوق بے میل اور قلب سلیم ہو تو

اسے خوشبو کی طرح محسوس ضرور کرلیا جاسکتا ہے۔

جوہر اخلاص داد و تحسین سے بے نیاز اور ستایش کی تمنا سے بے پروا ہوتا ہے۔ اخلاص چاہتا ہے کہ صلہ وثواب کی آرزو سے قلب کو پاک کرلیا جائے۔ حسن واخلاص عشق کے مدعی سے مطالبہ کرتا ہے کہ میری محبت کا دم بھرتے ہو اور میرے قرب وصال کے طالب ہو تو پہلے اپنی ذات کے تمام اغراض سے دست بردار ہو جاؤ اور دنیاوی عیش وراحت کی ہر خواہش کو اپنے دل سے نکال پھینکو۔ غیرتِ اخلاص انسانی سیرت کی کسی کوتاہی کو برداشت کرے خواہ نہ کرے، لیکن اس کی پاکیزہ سرشت ذوقِ ما ومن کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کرسکتی۔ اخلاص اور لوث وغرض کبھی ایک قلب میں جمع نہیں ہوسکتے۔ صاحب غرض کبھی صاحب اخلاص نہیں ہوسکتا، جو بے غرض ہوتا ہے وہی صاحب اخلاص ہوتا ہے اور جو بے غرض ہوتا ہے وہ بے پناہ ہوتا ہے اور اسے بہ قول ایک عارف کے تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔

حضرت شیخ الاسلام بے غرض تھے۔ قوم وملت کی خدمت کو شعار بنایا اور تحریک آزادی کی راہ میں قدم رکھا تو پہلے اپنے قلب کو غرض سے پاک کرلیا تاکہ کوئی تلوار انہیں کاٹ نہ سکے۔ حیدر آباد (دکن) کے وظیفے کی رشوت ہو یا کسی سرکاری مدرسے (مثل مدرسۂ عالیہ کلکتہ) کی پرنسپل شپ کی پیشکش ہو یا جامعۂ ازہر (مصر) کے منصب بلند کا لالچ ہو۔ حالات کی سنگینی کا خوف ہو یا خاندان کے مستقبل کا اندیشہ، انہوں نے ہر خوف وحزن سے اپنے قلب کو پاک کرلیا تھا۔ اگر انہوں نے دار العلوم میں کوئی مقام حاصل کیا تھا یا جمعیت علمائے ہند کی صدارت کو قبول کرلیا تھا تو صرف کسی کو آگے بڑھتے اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے نہ دیکھ کر، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا میدان خالی پاکر اور غلام ملک میں استعمار واستبداد کے عذاب سے سسکتی انسانیت کو نجات دلانے کے لیے صرف اپنے اسلامی اور انسانی فرض کی ادائیگی کے لیے قدم آگے بڑھایا تھا۔ اگرچہ حضرت کا "اخلاص" تیس سال سے زیادہ عرصہ تک آزمایش کی کسوٹی پر بار بار پرکھا جاتا رہا تھا اور آپ کے اخلاص کا سونا ہر دفعہ زرِ خالص ثابت ہو چکا تھا، لیکن ابھی آزمایش کا ایک مرحلہ باقی تھا۔ یہ مرحلہ ملک کی آزادی کے بعد اس وقت پیش آیا، جب حضرت کی خدمت میں ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز "پدم بھوشن" پیش کیا گیا۔ اگر ہندوستان میں چند حضرات اس کے مستحق تھے تو حضرت اس اعزاز کا سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے۔ یہ حضرت کی عظیم الشان قومی خدمات کا صلہ نہیں، اعتراف تھا۔ یہ اعزاز حکومت یا انتظامیہ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ قوم کی جانب سے ملک کو آزادی اور قوم کو غلامی واستبداد کے عذاب سے نجات دلانے میں ان کی خدمات کے لیے اظہار تشکر تھا۔ اس کو قبول کرلینے کے جواز میں، ایک سو ایک دلیلیں پیش کی جاسکتی تھیں اور آج بھی کہ ملک کی آزادی کو نصف صدی پوری ہونے والی ہے اور ایک قرن آپ کی وفاتِ حسرت آیات پر بھی گزر چکا ہے، اس اعزاز کے لیے

آپ کے استحقاق اور جواز کے باب میں دورائیں نہیں ہوسکتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قوم کی اس پیشکش اعزاز کا کیا جواب دیا تھا؟ کیا یہی جواب نہ تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے ایک شرعی حکم اور ملکی فرض کی ادائیگی کے لیے تھا۔ صلہ وستائش کی آرزو، اعتراف خدمت کے جذبے اور کسی اعزاز ومنزلت کے لیے نہ تھا۔

استقامت:

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کی ایک خوبی وہ ہے جسے ہم استقامت سے موسوم کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک شخص اپنے معتقدات وافکار میں نہایت مخلص ہوسکتا ہے لیکن اخلاص کے لیے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اس میں استقامت بھی ہو، یہ بات بالکل اسی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح ایک صاحب استقامت کے لیے ضروری نہیں ہوتا ہے کہ وہ راہ حق وصواب پر بھی ہو۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے فکر میں مخلص ہوتا ہے لیکن وہ راہ حق وحریت کے شدائد ومصائب کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر آپ چاہیں تو رہروانِ جادۂ حق وحریت کو ان کے ذوقِ فکر وعمل کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں:

۱- وہ حضرات جو فکر صحیح رکھتے ہیں یعنی حق پسند ہوتے ہیں لیکن راہ عمل وسعی کے شدائد اور اعلانِ حق کے نتائج سے اس درجہ خوف زدہ ہوتے ہیں کہ لسان حق کا اعتراف واعلان نہیں کرسکتے۔

۲- وہ حضرات جو فکر صحیح بھی رکھتے ہیں اور لساناً حق کا اعتراف واعلان بھی کردیتے ہیں لیکن آزمائش کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور

۳- وہ حضرات جو حق شناس بھی ہوتے ہیں، اعلان واظہار حق سے بھی ان کی زبانیں بند نہیں رہتیں اور جب اس راہ کی مشکلات پیش آتی ہیں، انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے پھانسی کے تختے لگادیے جاتے ہیں، آزمائش کی صلیبیں کھڑی کردی جاتی ہیں اور تعزیر وتعذیب کے لیے زندانوں اور کال کوٹھریوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ پھر انہیں متاثر کرنے کے لیے ان کے سامنے سے انعام یافتہ انسان نما حیوانوں کی قطاریں گزاری جاتی ہیں۔ پھر ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ بتاؤ حالات ووقت میں سچائی کا راستہ کون سا ہے؟ لیکن وہ نہ تو کسی چیز سے متاثر ہوتے ہیں، نہ کسی بات سے خوف زدہ ہوتے ہیں، اور نہ کسی عمل سحر سے دھوکا کھاتے ہیں۔ ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے کہ تو اپنی

طاقت وقوت سے دھوکا نہ کھا۔ اقتدار کا گھمنڈ نہ کر، انسانوں پر ظلم سے باز اور باطل اور غلامی کے مقابلے میں حق وآزادی کے انتخاب کا حق ان سے نہ چھین۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ رہروانِ جادۂ حق وحریت کی اس آخری جماعت کے رہنما تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی طاقت کی طرف سے کسی عہدہ ومنصب کی پیشکش سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کا نام ہے۔ اقتدار کے راستے سے کسی کو ہٹانے کی کوشش کا یہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انہیں ٹیڑھا کرلیا جائے اور اگر پہلے مرحلے میں کامیابی نہ ہو تو قید وبند اور تعزیر وتعذیب کے دوسرے مرحلہ کا آغاز کردیا جائے۔ حضرت شیخ الاسلام کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں دنیا کے سامنے ہے۔ جسے دیکھنے کے لیے کسی باطنی بصیرت کی ضرورت نہیں، ظاہری آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے کہ قید وبند اور تعزیر وتعذیب کے ہر مرحلے میں آپ کے اخلاص کو متزلزل نہ کرسکی تھی۔ اسی طرح تعزیر وتعذیب کا خوف آپ کے پائے ثبات کو اس کی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

آپ میں سے بعض حضرات شاید اس بات میں شک کریں کہ ایک دور میں ایک جماعت کی طرف سے حضرت کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا گیا تھا، اسے ملک کے خان بہادروں، نوابوں، جاگیرداروں کی سرپرستی اور حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن اس بات کو تو بہرحال آپ تسلیم فرمائیں گے کہ کسی صاحب اخلاص ودیانت کا دنیا بھر کو راضی رکھنا اور خوش کرنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے ایک بڑی جماعت کو وہ اپنے اخلاص ودیانت کا گرویدہ بنالے لیکن افراد کی ایک چھوٹی سی جماعت اس کی مخالف ضرور رہ جائے گی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ افراد کی اس چھوٹی سی جمعیت کا تعلق اس "خاص جماعت" کے نظام فکر سے نہ تھا جس کے وہ واقعی رکن یا کارکن تھے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اختلاف وناراضگی کی صورت میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے تھا؟ آپ اس سوال کا جواب دینے کی زحمت نہ اٹھائیے، لیکن یہ ضرور سوچیے کہ مخالفت اور توہین وتضحیک کے اس طوفانِ بے تمیزی میں حضرت شیخ الاسلام کی استقامت کا کیا عالم رہا؟

خواہ آپ زبان سے اس کا اقرار نہ کریں لیکن آپ کا دل گواہی دے گا کہ آزمائش کے اس مرحلے میں بھی جو حکومت کی طرف سے قید وبند اور تعزیر وتعذیب کی صورت میں پیش آیا ہو، خواہ کسی جماعت کے کارکنوں کی طرف سے غیر شریفانہ مخالفت اور تضحیک وتوہین کی صورت میں نمایاں ہوا ہو، حضرت شیخ الاسلام کا اخلاص بے عیب اور استقامت بے داغ ثابت ہوتی ہے۔

جامع مذہب وسیاست:

حضرت شیخ الاسلام کی ایک خوبی علم وعمل، دین وسیاست، تصور وحقیقت، روز وشب کے معمولات اور

ملی قومی تقاضوں، واجباتِ دنیا وفکرِ آخرت کا حسنِ امتزاج وتوازن اور کمال جامعیت ہے۔

ہماری تاریخ بڑے بڑے اصحاب علم سے، عظیم مدبروں اور مفکروں سے، نہایت ذہین افراد سے، ملک وقوم کے بڑے بڑے خدمت گزاروں، نہایت دین داروں، شریف دنیا پرستوں سے، عدیم المثال شاعروں سے، سراپا عمل مجاہدوں سے، شب زندہ دار زاہدوں اور عابدوں سے اور اپنے علم وعمل سے یا اپنے ذہن کی فکر پیمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والوں سے کبھی خالی نہیں رہی لیکن حضرت شیخ الاسلام کے توازن وجامعیت کی شخصیت کی دید کے لیے چشم نرگس کو صدیوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علم وعمل کی جامعیت کی مثال تھے۔ وہ عالم تھے مگر فکر وفلسفہ کی گتھیاں ہی نہ سلجھاتے رہے، عملی زندگی کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ زندگی کے میدان میں ان کی شخصیت سراپا عمل نظر آتی ہے۔ لیکن علم وفکر کی دنیا سے ان کا رشتہ اس وقت بھی قایم ہوتا تھا۔ دین کے واجبات اور سیاست کے فرایض میں ایک ایسا حسین توازن پیدا کیا تھا کہ خالص سیاسی ہنگاموں اور ہجوم افکار واعمال میں بھی فرایض وسنن تو کیا مستحبات بھی نہ چھوٹتے تھے۔ آپ کی ذات گرامی تصور وحقیقت کا مجمع البحرین تھی۔ روز وشب کے معمولات میں فی اللیل رهبان و فی النهار فرسان کی مثال تھے۔ حضرت دین وسیاست کی تفریق کے قایل نہ تھے لیکن آپ کے متوازن فکر اور جامع سیرت کا کمال یہ تھا کہ قوم اور ملت کا ہر تقاضا اور ہر کام اپنے وقت پر اور اپنے دایرے میں صحیح طور پر انجام پاتا رہا۔

وہ انسان جو اپنا جی جان اور خاندان کنبہ رکھتا ہے، ان کے واجبات اور ذمہ داریوں سے کیوں کر چھٹکارا پاسکتا ہے، بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کی زندگی کی ضروریات واحتیاجات بعض اوقات انسان کو فکر آخرت سے غافل بھی کر دیتی ہیں لیکن ٹھیک اسی طرح آخرت کی فکر اور عبادت وریاضت کا ذوق وانہماک بھی دنیاوی واجبات وفرایض میں غفلت اور کوتاہی کا موجب ہوتا ہے۔ جام شریعت اور سندان عشق سے کھیلنا اور دونوں کے حدود برقرار رکھنا، ہر مدعی اتباع شریعت اور حقوق عباد ودنیا کے فہم ادراک کا ذوق رکھنے والے کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام کے لیے جام وسندان کا یہ ملاپ محض ایک کھیل تھا۔ حضرت کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک کامل درجے کی دینی واسلامی زندگی اور اسکے تمام ظاہری وباطنی لوازم کے ساتھ سیاست کے بحر مواج میں تختہ بندی کا عزم لے کر اترے تھے اور اس کے پانی کی ایک چھینٹ سے اسلامی شرعی زندگی کو آلودہ اور دامن تر کیے بغیر وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔

فیضانِ سیرت کا ایک خاص پہلو:

اب میں حضرت شیخ الاسلام کے فیضانِ سیرت کے ایک خاص پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں:

آپ جانتے ہیں کہ کسی خاص کمیونٹی کے مفادات کی بات کرنا، اس میں مذہبی عصبیت پیدا کرنا، ے افراد کو منظم کرنا، انہیں خاص انداز سے تعلیم دینا، ان کی تربیت کرنا اور اس کمیونٹی کے سامنے ایک نصب ن رکھنا اور اگر پہلے سے کوئی نصب العین ہو جو فراموش کر دیا گیا ہو تو اسے یاد دلانا اور اس کے لیے جان و مال قربانی اور وقت کے ایثار کی دعوت دینا اور اسی ذریعے کو اس کی ہر طرح کی کامیابی کا ضامن قرار دینا عام پر ''فرقہ واریت'' کہلاتا ہے اور کسی سوسائٹی میں فرقہ واریت کی زہرناکی اور سمیت اس کی زندگی، اس کی یت اور امن و سکون کے لیے تباہی اور ہلاکت کا جو سرو سامان اپنے اندر رکھتی ہے، اس پر کسی بحث کی ورت نہیں۔ حضرت شیخ الاسلام کی زندگی آپ کے سامنے ہے، اس کا یہ پہلو چھپا ہوا نہیں کہ حضرت نے لمانوں کے ملی اور فرقہ وارانہ مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کی۔ ان میں لامی زندگی پیدا کرنے کی تلقین کی۔ رضائے الٰہی اور اتباع سنت کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اسلامی فکر و رت کو اپنانے کی دعوت دی اور اسلام اور صرف اسلام کے لیے جان و مال اور وقت کے ایثار و قربانی کا جذبہ ا کرنے کے زندگی بھر داعی رہے۔ جمعیت کے نظام کو مستحکم کرنے یعنی مسلمانوں کی بہترین خدمات انجام ینے کے لیے رضا کاروں کے ایک مستحکم نظام کی ضرورت کو محسوس کیا اور ملت کے جاں نثاروں کا ایک نظم قایم ی کر دیا اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت خود بھی ایک کامل درجے کی دینی اور شرعی زندگی کھتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ذبیحۂ گاؤ کے لیے ہمیشہ اصرار کیا، نہرو رپورٹ کی مخالفت کی، دے ماترم کے خلاف احتجاج کیا۔ واردھا تعلیمی اسکیم کو رد کرتے ہوئے ایک متبادل تعلیمی اسکیم پیش کی۔ سی پی ورنمنٹ کی ودیا مندر اسکیم کو جوں کا توں قبول کرنے سے صاف انکار کیا۔ کشمیر اور دوسری ریاستوں میں مسلم قوق کی پامالی کے خلاف نہ صرف جمعیت کے پلیٹ فارم سے احتجاج کیا، اخبارات میں مضامین لکھوائے اور ملی میدان میں حصہ لیا، گاندھی جی کے پرارتھنا کے گیت کو مسلمانوں کے عقیدے کے بالکل خلاف، مسلمانوں کے لیے قطعاً ناقابل قبول بتایا اور اسے صرف گاندھی جی کا فعل قرار دیا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران میں کانگریسی حکومتوں کے کردار اور فیصلوں کے خلاف سب سے زیادہ لیکن سنجیدہ، مدلل اور مثبت تنقید کے محاذ کے رہنما حضرت شیخ الاسلام تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اور حضرت کی سیرت کا یہ فیضان بھی ملک کے سامنے ہے کہ س سے فرقہ واریت پیدا نہیں ہوئی جو انسانی سوسائٹی کے لیے تباہی اور ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ایک مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح کے قومی رہنما تھے حالانکہ تاریخ میں یسے قومی رہنماؤں اور سیرتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جو اگرچہ قطعاً مذہبی نہ تھیں اور بہ قول مولانا غلام رسول مہر

مسلمان تھے لیکن سورۂ اخلاص بھی صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ان کے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل نے انسانی سوسائٹی اور ملک کی معاشرتی زندگی میں مذہبی تعصب اور منافرت کا جوزہر گھولا تھا، وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے میں بھی دور نہ ہوسکا اور فرقہ واریت کا جو سبق ایک خاص قومی سطح پر حالات سے نمٹنے کیلئے پڑھایا گیا تھا، اس کے اثرات نے معاشرتی زندگی کو تہ وبالا اور باہمی اعتماد ومحبت کی فضا کو مسموم کردیا ہے۔

جو بات کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ایک شخص نے پڑوسی کو ڈرانے کے لیے (تعصب کا) کتا پالا تھا۔ بھونکنا اور کاٹنا کتے کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد مالک نے ضرورت نہ سمجھتے ہوئے کتے کو آزاد کردیا۔ اب وہ کتا دوسروں ہی کو نہیں اپنے سابق مالک کے خاندان کو بھی بھنبھوڑ رہا ہے۔ پورا خاندان خوف زدہ ہے۔ خاندان کا اطمینان وسکون تباہ ہوگیا ہے۔ اب مالک دوبارہ اس کے گلے میں پٹا ڈالنا اور اسے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اب یہ اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ یہ ایک عذاب الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس کی بداعمالیوں اور ظلموں سے باز آجانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے، اور رحمتِ الٰہی انتظار کرتی ہے کہ نزول عذاب سے پہلے وہ قوم اپنی بداعمالیوں سے باز آجائے لیکن جب اس کی مہلت ختم ہوجاتی ہے اور عذاب کا نزول شروع ہوجاتا ہے تو پھر سنتِ الٰہی پوری ہوکر رہتی ہے اور قوم کو اس کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا ملتی ہے۔

اور یہ حضرت شیخ الاسلام کی سیرت ہی کا فیضان ہے کہ حضرت کے وابستگانِ دامن، وہ ہندوستان میں ہوں، خواہ پاکستان میں یا دنیا کے کسی اور ملک میں ہوں، فرقہ واریت کے جذبات سے پاک، تعصب ومنافرت سے دور ونفور، خدا کی مخلوق سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے اور دنیا کے سب سے زیادہ فراخ قلب انسان ہیں، صاحب عزم وہمت ہیں، اپنے مذہب پر مستقیم، اپنے اعتقاد میں راسخ اور اپنے دلوں میں سارے جہاں کا درد اور احترام آدمیت لیے ہوئے بلاتفریق مذہب وملت دنیا کے تمام انسانوں کی خدمت کے لیے ہمہ وقت آمادہ ومستعد نظر آتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی سیرت کے اس پہلو کے مطالعے، اس کے فیضان کے مشاہدے اور حالات کے تجزیے ہم یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ فرقہ سراریت یا تعصب کا تعلق مذہبی خیالات و افکار یا تعلیمات سے ہے۔

سیاسی رہنمائی:

حضرت شیخ الاسلام جنگ آزادی میں صفِ اول کے رہنما تھے۔ ریشمی رومال تحریک کی وہ اہم شخصیت

تھے (۱۹۱۷ء)۔ قیدِ مالٹا سے رہائی اور ہندوستان واپسی (۱۹۲۰ء) کے بعد حضرت نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری۔ اس دوران میں سب سے پہلی تحریک خلافت کی تھی۔ اس کے لیے ترک موالات کا جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اسے کامیاب بنانے اور تحریک خلافت کے مقاصد کے حصول کے لیے آپ نے سرگرم حصہ لیا (۲۱-۱۹۲۰ء)، سائمن کمیشن کو بے ضرورت سمجھا اور اس کی مخالفت کی (۱۹۲۷ء) کمیونل ایوارڈ کو قومی مقاصد کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا بلکہ نقصان دہ تصور کیا اور اس کی مخالفت کی (۱۹۳۲ء) واردھا تعلیمی اسکیم پر تنقید کی اور اسے قابل قبول بنانے کے لیے مناسب و مثبت تجاویز پیش کیں (۱۹۲۸ء) شاردا ایکٹ کے خلاف تحریک کے رہنماؤں میں آپ ایک بلند قامت شخصیت تھے (۱۹۲۹ء) سول میرج کے قانون کے خلاف تحریک پیدا کی (۱۹۳۲ء)۔ اسلامی اوقاف کی حفاظت اور انہیں ان کے متعین مصارف میں خرچ کرنے اور حکومت کے دستِ تصرف سے انہیں بچانے کی کوششوں کی رہنمائی کا شرف جمعیت علمائے ہند اور اس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام کو حاصل تھا (۱۹۳۷ء)۔ ودیامندر اسکیم کو اس کی طے شدہ صورت میں قبول کرنے سے انکار کیا (۱۹۳۸ء) اردو کے بارے میں یوپی کانگریس کمیٹی اور کانگریس حکومت کے رویے کو انصاف اور کانگریس کی متفقہ پالیسی کے خلاف پایا تو انہیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے باز رکھنے کی کوشش کی (۱۹۳۸ء) شریعت بل کے نفاذ کی کوششوں میں سب سے زیادہ منظم حصہ حضرت کی جماعت نے لیا تھا (۱۹۳۷ء) نظم جماعت کی تحریک کی رہنمائی (۱۹۲۰ء سے) اور امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک کا سہرا جمعیت علمائے ہند اور اس کے زعما کے سر ہے۔ اس کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے تقریباً ۲۵ سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ انفساخِ نکاح کے قانون، خلع بل، قاضی بل، طلاق کا ترمیمی بل وغیرہا کے لیے کوششیں (۴۱-۱۹۳۹ء) حضرت شیخ الاسلام اور جمعیتِ علمائے ہند جس کے آپ صدر تھے، کی ملی خدمات میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ تمام کارنامے ملی مفاد اور اسلامی شرعی زندگی کے قیام و تحفظ کے نقطۂ نظر سے تھے۔ آپ نے ان تمام تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن کا فائدہ کسی ایک قوم یا ملت کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے فوائد نہ صرف پورے ملک کے لیے عام تھے۔ بیرون ملک کے مسلمان ممالک اور تمام برطانوی مقبوضات اور دنیا کی تمام محکوم اور غلام قوموں کو پہنچنے والے تھے۔ ان تحریکوں میں سب سے بڑی تحریک ملک کی آزادی اور استقلالِ قومی کی تحریک تھی، اس کے بعد ریشمی رومال اور خلافت کی تحریکات اور ترکِ موالات کا پروگرام تھا، پھر سول نافرمانی کی تحریک (۱۹۳۰ء و ۱۹۴۰ء)، نمک ستیہ گرہ، کھدر کے استعمال اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریکات پیدا ہوئی اور آخری اہم تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک (۱۹۴۲ء) تھی۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان تمام تحریکوں میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں آپ کو قید و بند کی صعوبتوں اور ایثار وقت و مال کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

۱۹۴۰ء کے بعد آپ کو سخت آزمایشوں اور بری کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔ خاص طور پر ملک کی آزادی سے قبل کے ڈھائی تین برس آپ کے لیے سخت مشکلات کے تھے۔ اس دوران لوگ آپ کی جان کے لاگو اور عزت کے دشمن ہو گئے تھے۔ آپ کو نہ صرف تحریکِ پاکستان کا مخالف بلکہمسلمانوں کا دشمن کہا گیا۔ حالانکہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے میں آپ اپنا ایک نظریہ اور مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا رکھتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا نظریہ رکھنے والا جمعیت علماء کے زعماء سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اس کے حق میں اپنے نظریے اور اس کے لیے اپنے بہترین دلایل سے دست بردار ہو جائیں تو یہ حق حضرت شیخ الاسلام، جمعیت علمائے ہند اور دوسری قوم پرور مسلمان جماعتوں اور ان کے زعما کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کے حق میں اپنے نظریے اور اپنے دلایل سے دست بردار ہو جائیں۔ جمعیت علماء نے جو فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا تھا اور جسے ''مدنی فارمولا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے مجلس احرار اسلام، مومن کانفرنس، جمعیت القریش، شیعہ پولٹیکل کانفرنس، مسلم مجلس کے علاوہ سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال وغیرہ کی متعدد جماعتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ لیکن کسی جماعت نے دوسری جماعت سے بے سوچے سمجھے اس منصوبے کو مان لینے کی توقع کے بجائے اصل مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور متفقہ طور پر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی آرزو کی تھی۔

مدنی فارمولا:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ملک کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے میں اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے۔ حضرت کے نزدیک اس مسئلے کا صحیح ترین حل وہ فارمولا تھا جسے جمعیت علمائے ہند نے اپنے پلیٹ فارم سے ۱۹۳۱ء میں پیش کیا تھا اور بعد میں بعض وضاحتوں اور تشریحوں کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں قوم کے سامنے رکھا تھا۔ اور یہی فارمولا ملک کی قوم پرور جماعتوں کی تائید کے ساتھ کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس کے بارے میں مشن کی رائے تھی کہ یہ ایک سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، اس کے پیچھے سیاسی بصیرت کارفرما ہے اور قابل عمل۔ اس فارمولے میں برصغیر ہندوستان کے ہر صوبے کو مستقل اکائی کی حیثیت حاصل تھی۔ چند مفوضہ امور کے علاوہ تمام معاملات میں صوبے آزاد و خود مختار تھے۔ مفوضہ امور کی ذمے داری مرکز کی تھی۔ مرکز کی ہیئت ترکیبی میں ۴۵ ہندوؤں کے بالمقابل ۴۵ سیٹیں مسلمانوں کی تھیں جبکہ ۱۰ سیٹیں اقلیتوں کے لیے مخصوص تھیں۔ کوئی ایسا سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی مسئلہ جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو، ان کی دوتہائی اکثریت کے اتفاق رائے کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ وہی منصوبہ تھا جس کے صوبوں کو مختلف گروپوں کی شکل میں مرکز کی اسی ہیئت ترکیبی کے ساتھ وہی

ق واختیارات تفویض کیے گئے تھے اور کانگریس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا اور
نٹ مشن نے بعض جزوی ترامیم کے بعد اپنا لیا تھا اور ملک کی دیگر جماعتوں کے بہ شمول مسلم لیگ کے زعما
اس یقین دہانی پر کہ اسکے ذریعے پاکستان کی بنیاد فراہم کردی گئی ہے، مسلم لیگ کونسل نے بھی اسے منظور
لیا تھا، لیکن کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی جانب سے اس منصوبے کی ایک شق کی غلط تشریح
ے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ اس منصوبے کے بارے میں اپنی منظوری سے دست بردار ہوگئی اور اپنے سابق
نف پر لوٹ گئی۔ جس پر اس کے ثبات نے تقسیم ملک کے نتیجے اور قیام پاکستان کے انجام پر پہنچا دیا۔

اب جس طرح اس عہد کی خوبیاں بانیان پاکستان کے نصیب کی تاریخ میں، اسی طرح اگر اس دور میں
وستان کے مسلمانوں کے مسئلے میں پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں یا پاکستان میں مختلف قومیتوں اور مقامی اور
مقامی کے مسئلے نے سر اٹھایا ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل تقریباً نصف صدی کی مسافت طے کرنے
ے بعد بھی قریب نظر نہیں آتی، اسلام کے نظام سیاسی یا طرز حکمرانی کا مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے۔ اسلامی
یب کی تعریف پر بھی اگر اتفاق نہیں ہو سکا، اردو ہندی مسئلے کے بجائے اردو بنگالی مسئلہ پیدا ہو کر ملک دو
ت ہو چکا ہے۔ اردو اور مقامی زبانوں کا مسئلہ موجود ہے اور اردو کے نفاذ کی راہ ابھی ہموار نہیں اور سب سے
ہ کر شریعت کا مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے تو اس کے لیے اسی تحریک کے رہنماؤں کی بدبختی اور بے دینی کو ذمے
قرار دینا چاہیے، اور یہ حقیقت تسلیم کی جانی چاہیے کہ زندگی کے واقعی مسائل کے تصفیے کے لیے حقیقی بنیاد کی
رورت ہوتی ہے۔ زندگی کے مسائل خوبصورت نعروں اور گلے کی قوت سے طے نہیں کیے جا سکتے اور نہ
روضوں پر ان کے تصفیے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ
اور
ان کی سیاسی فکر

مولانا رحمت اللہ ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ ان بزرگان دین، مجاہدین، باعمل علمائے راسخین ومخلصین میں سے ہیں، جن کی زیارت سے میری گنہگار آنکھیں بے نور اور ان کی ملاقات و دیدار سے میرا وجود کوسوں دور اور اس حسرت وتاسف سے دل رنجور ہے، وجہ زمانہ کا تقدم وتاخر ہے؛ لیکن ان پر لکھی جانے والی کتابوں اور تحریروں کو پڑھ کر ان سے محبت وعقیدت ہے؛ کیونکہ میرے سامنے ان کے کمالات وامتیازات کی پوری حقیقت ہے؛ لیکن ان کی زندگی کے دیگر گوشوں کو قلم انداز کر کے اس وقت میرا موضوع صرف ان کی سیاست ہے۔

ویسے آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے موجب عبرت وموعظت اور ذریعہ رشد وہدایت ہے؛ کیونکہ وہ اخلاق نبوی، اتباع سنت اور تواضع وفروتنی کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ حمیت وغیرت اور سرفروشی وعزیمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مجاہدہ وجانبازی کا امتیازی جذبہ رکھتے تھے حتی کہ آپ کا نام آتے ہی احقاق حق اور ابطال باطل کا نہ صرف تصور آتا ہے؛ بلکہ ایک سچی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے اور ذہنوں میں گردش کرنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظارے ابھی گذشتہ کل کے ہیں۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد ماجد اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ مدینہ منورہ

نقل مکانی فرمائی تھی، اسی لیے "مدنی" کہلائے، انہیں متفرق اوقات میں کم وبیش ۱۴ سال مسجد نبوی صاحبہ ألف ألف تحية وسلام میں درس وتدریس کی سعادت ملی، یہ آپ کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی اور ہندوستانی عالم آپ کا ہمسر وشریک نہیں، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم.

این سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اسلاف اور بزرگوں کا تذکرہ باعث خیر وبرکت اور موجب ترقی وسعادت ہے، مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے صحیح لکھا ہے:

"اسلاف کے تذکرے، ان کے واقعات وارشادات بعد والوں کے لیے اسوۂ اور نمونہ ہوتے ہیں، جن پر عمل کے نتیجے میں دارین کی فلاح ونجاح حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء سابقین کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتداء کا حکم دیا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونہ قرار دے کر امت کو آپ کی اقتداء کا حکم دیا ہے"۔

(از مقدمہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ۔ واقعات وکرامات کی روشنی میں ص: ۱۷)

علماء اور صلحاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین، اللہ کے ولی اور ہمارے مقتداء ہیں، ان کے احوال واقوال میں تاثیر وتاثر ہے، وہ بڑے مقام ومرتبہ کے مالک ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے "عند ذكر الصالحين تنزل الرحمة" (صالحین کے تذکرہ پر رحمت برستی ہے)۔

ان انفاس قدسیہ سے دلوں میں ایمان واحسان کی شمع فروزاں ہوتی ہے اور ان کے فیوض وبرکات کا سلسلہ حیات وموت کی حد سے گزر کر ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: "قدمات قوم وهم في الناس أحياء" (کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی لوگوں میں زندہ ہوتے ہیں)، لیکن ان کے تذکرے اور احوال واقوال سے ہر شخص اپنی استعداد وصلاحیت کے مطابق استفادہ کرتا ہے۔

حضرت مدنیؒ کی زندگی کے تین ادوار ہیں، اس سلسلہ میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

"مولانا کی زندگی کے تین دور ہیں: پہلا دور خالص علمی خدمت کا دور تھا، جو ابتدائی سے قیام مدینہ منورہ (۱۳۱۷ھ) سے شروع ہو کر اسارت مالٹا (۱۳۳۴ھ) پر ختم ہوتا ہے، اس سترہ سال کی مدت میں تین بار ہندوستان واپس آئے ہیں اور کبھی چند مہینے اور کبھی چند برس رہ کر پھر حجاز چلے گئے......

دوسرا دور مالٹا سے واپسی (۱۳۳۸ھ) کے بعد سے (۱۳۴۶ھ) دارالعلوم دیوبند کی صدارت عظمیٰ پر فائز ہونے تک کا ہے، یہ زمانہ آپ کی سیاسی گرم جوشی، تحریک خلافت وتحریک آزادی کی علمبرداری، فرنگی

حکومت سے ٹکر لینے اور اس کے نتیجہ میں قید و بند کا دور ہے، جس میں آپ کی سیاسی بصیرت و تدبر، مجاہدانہ عزم و ہمت اور غیر متزلزل صبر و استقامت کا ظہور ہوا۔

تیسرا دور دار العلوم کی صدارت (۱۳۴۶ھ) سے لے کر وفات تک کا زمانہ ہے، جس میں بیک وقت آپ دنیائے اسلام میں اپنے نوع کی واحد اور سب سے بڑی دینی درسگاہ کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے۔ اور اس مدت کے اکثر حصہ میں ہندو اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کی کفیل جماعت جمعیت علماء ہند کے صدر و رئیس مجلس بھی تھے، اور ان تمام تعلیمی، سیاسی و اصلاحی عظیم مہمات کی سرانجام دہی کے ساتھ اس دور میں ہندوستان کے سب سے اونچے عارف باللہ اور شیخ طریقت بھی تھے۔ جن کے ہاتھ لاکھوں بندگانِ خدا نے بیعت کر کے ہدایت پائی اور کتنوں کو معرفت خداوندی نصیب ہوئی۔ (مولانا مدنی - ایک شخصیت ایک مطالعہ ص:۲۸۳)

مولانا مدنیؒ کا دوسرا دور ہمارا موضوع ہے، "وخير الأمور أوسطها" (بہترین کام درمیانی ہوتا ہے)

حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت مدنیؒ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں، جو کام بھی انجام دیا، پورے عزم و استقلال کے ساتھ اور انتہائی ہمت و حوصلہ سے انجام دیا۔

جس کی مثال دوسری جگہ نہیں مل سکتی... برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا، وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے، حصول آزادی کے لیے جو جدوجہد کی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا...... ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنیؒ کے عزم و استقلال کا ایک ادنی کرشمہ ہے، ورنہ نہ معلوم مسلمانوں کی تباہی اور مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچ جاتی اور نقشہ کیا سے کیا ہوتا"۔

(حضرت مدنی - ایک شخصیت ایک مطالعہ ص:۷۷)

حضرت مدنیؒ کی سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کا اس وقت آغاز ہوتا ہے، جب آپ ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے، اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی، آپ بھی سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے؛ گرچہ شروع سے آپ حضرت شیخ الہند کے شریک کار تھے..... جب آپ مالٹا کی رہائی کے بعد برملا سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرمجوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو برطانیہ کے خلاف جاری تھی، پھر جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی تو آپ نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا:

"موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کر دے" اس کی

پاداش میں حضرت مدنیؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور دوسرے حضرات کی گرفتاری عمل میں آئی اور خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ کی سماعت ہوئی، حضرت مدنی کا جب بیان ہوا، تو آپ نے بے خوف وخطر صاف طور پر کہہ دیا کہ "اگر مذہبی فرائض کا لحاظ واحترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلہ کا تصفیہ کر لینا چاہئے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کردوں گا۔

آخری الفاظ پر بے ساختہ مولانا محمد علی مرحوم نے حضرت مدنیؒ کے قدم چوم لیے جو گویا اس بات کی شہادت تھی کہ وہ میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کردوں گا"۔ (ایضاً ص:۲۶۵/۲۶۶)

حضرت مدنی کی سیاسی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے لیے مجبور کیا گیا تو آپ نے حسب ذیل شرائط کے ساتھ قبول فرمائی:

۱۔ سیاسی خدمات پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۲۔ دارالعلوم کی جانب سے سیاسی امور میں کوئی مخل نہ ہوگا۔

۳۔ ہر مہینہ میں ایک ہفتہ کی رخصت ہوگی، تا کہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے دیوبند سے باہر دوسرے مقامات کا سفر کیا جاسکے۔

۴۔ ایک ہفتہ سے زائد رخصت اگر لی گئی تو اس پر تنخواہ وضع کی جائے گی؛ چنانچہ یہ شرطیں منظور ہوئیں اور دارالعلوم کی صدارت کے بعد پھر اس نظام سے سیاسی جدوجہد جاری رہی، اور طویل اسفار کر کے ہندوستان کے طول وعرض، چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں بیداری کی لہر دوڑائی اور برطانوی ظلم واستبداد سے خلاصی اور حصول آزادی کا عام جذبہ پیدا کر دیا اور اس مقصد کے لیے اس قدر سفر کیے جس کی نظیر نہیں ملتی، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ سال کا قریب قریب نصف حصہ سفر ہی میں گزرتا تھا اور حصول آزادی کے لیے وہ قربانیاں دیں جو کوئی دوسرا نہیں دے سکتا، حضرت مدنیؒ کی تقریر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ واقعات اور خود برطانوی تحریرات سے حکومت برطانیہ کی مخالفت ہوتی تھی، محض الفاظ کی بارش نہ ہوتی تھی، اس لیے آپ کی تقریر حکومت برطانیہ کے خلاف ایک زبردست تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی، اور سامعین کے قلوب میں راسخ وپیوست ہو جاتی تھی، اس لیے حکومت برطانیہ آپ کو "بڑا خطرناک آدمی" سمجھتی تھی، اور روک تھام کے لیے ہر وقت تدابیر کرتی رہتی تھی، مگر آپ کسی حال میں رکنے اور باز آنے والے نہ تھے اور نہ کسی زبردست سے زبردست طاقت سے ڈرنے والے تھے۔

انجام کار برطانوی حکومت کا بساط لپٹ گیا اور ایک طویل مجاہدہ کے بعد ہندوستان کو ان کے پنجہ استبداد سے خلاصی ملی اور ایک گونہ آزادی حاصل ہوئی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) حضرت مدنیؒ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی، آپ نے آج کے لادینی اور مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعام کے لیے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا، دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

(حضرت شیخ الاسلام ایک شخصیت ایک مطالعہ ص:۱۹۹ر۲۰۰)

حب الوطنی آپ کے نزدیک صرف ایک سیاسی نظریہ ہی نہ تھی؛ بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ "اچھا مسلمان دنیا کا ایک اچھا شہری بھی ہو۔ (ایضاً: ص:۲۰۰)

حضرت محترم ایک عظیم سیاسی راہنما اور زبردست انقلابی مجاہد بھی تھے جنھوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔

(ایضاً: ص:۲۰۲)

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، بانی دار العلوم حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے تاریخی فلسفہ اور حکمت کے امین اور اپنے استاذ شیخ الہند دیوبندیؒ کے حکیمانہ جوشِ عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا، اور آخر کار شیخ الہند بلکہ شیخ العرب والعجم کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔

ایک طرف کانگریس کے سرگرم ممبر، دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند کے صدر، اگر کانگریس کے خاص پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سیاسی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے، جواب یہ دونوں پلیٹ فارم ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے، وہیں وہ دار العلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنت کی ترویج میں اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے، جس میں متوسلین کی اخلاقی اور علمی اصلاح وتربیت وذکر اللہ اور اصلاح نفس کی انتھک سعی اور متوسلین کو صحیح معنی میں مسلم امت بنانا ان کا نصب العین تھا، کوری سیاست کے لیے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لیے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی؛ لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑے رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہ تھا۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کے

ئی رائے قائم کی، وہی رائے صحیح اور وقعاتی ثابت ہوئی۔

شیخ الاسلام اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وادراک کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری ں سے ملک اور ملک کے ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے، وہ بلا استثناء اپنے تمام اکابر وشیوخ ی وعملی یادگار تھے، قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب، وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے وفعل سے نمایاں رہتی تھی، آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا، اس پر صدیوں کام ہوتا ے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتی رہے گی۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے حضرت مدنیؒ کی وفات پر ندوہ میں تعزیتی جلسہ کو ب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سرتاپا اخلاص تھے، وہ اپنے ہر کام میں اور ہر وقت مخلص تھے، ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی سے غیر دینی کام، اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جدوجہد محض ابتغاء رضوان اللہ تھی، وہ صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اس سے قرب الٰہی چاہتے تھے، وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا یہ ان کے لیے جہاد تھا اور وہ اس میں شرکت سے محض تقرب بالجہاد چاہتے تھے، جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اس نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے"۔

(مولانا مدنی ایک شخصیت، ایک مطالعہ ص:۳۰۹)

اس اخلاص کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی آس سیاسی جدوجہد میں شروع سے حصہ لیا اور اس وقت تک حصہ لیتے رہے جب تک اس کی ضرورت تھی؛ لیکن جب یہ ضرورت پوری ہوگئی اور وقت اور موقع آیا اس محنت کی قیمت وصول کرنے کا، تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لئے..... جب آزادی کا درخت لگایا جارہا تھا اور اس کی آبیاری کے لیے خون پسینہ کی ضرورت تھی، وہ پیش پیش تھے؛ لیکن جب اس درخت کے پھل کھانے کا وقت آیا، اس وقت وہ اللہ کا بندہ اتنی دور جا بیٹھا جہاں اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے، وہ آزادی سے پہلے بھی ایک مدرس تھے، اب بھی وہی مدرس رہے، پہلے بھی ایک مختصر تنخواہ پاتے تھے، اب بھی وہی پاتے رہے الخ (ایضاً ص:۳۱۰/۳۱۱)

میں یہ کہوں گا کہ مولانا معصوم نہیں تھے، ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو،

ضروری نہیں کہ ان تمام سیاسی اور اجتہادی آراء ونظریات میں ان سے اتفاق کیا جائے؛ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا اور جو کچھ انہوں نے کہا محض رضائے الٰہی اور حمیت دینی میں، ان کے لیے کوئی دنیاوی محرک یا مصلحت نہ تھی''۔ (ایضاً ص:۳۱۵)

حضرت مدنیؒ کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے، یہ ہے کہ ۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے بقاو قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ جب بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آگئے، سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں دو چار ہی دور ایسے گزرے ہیں، جب مسلمانوں اور اسلام کے بقا کا سوال آ گیا ہے۔ ۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے تحریر فرمایا ہے:

آپ نے سامراجی طاقت کو مٹانے کے لیے اس ہمت وجرأت سے جان کی بازی لگائی کہ اپنے عزم واستقلال کی حرارت نے دوسروں میں بھی گرمی پیدا کی، تاکہ صرف ہندوستان نہیں؛ بلکہ وہ تمام ممالک جو سامراجی پنجہ میں گرفتار ہیں، غلامی سے نجات پائیں اور اس قابل ہوں کہ اپنا مستقبل خود بنا سکیں، افسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہیں، جن سے میں نذرِ عقیدت پیش کرسکوں''۔ (ایضاً ص:۲۹۰)

حضرت شیخ الاسلامؒ کی ایک خوبی علم وعمل، دین وسیاست، تصوف وحقیقت، روز وشب کے معمولات اور ملی، قومی تقاضوں، واجبات دنیا وفکرِ آخرت کا حسنِ امتزاج وتوازن اور کمال، جامعیت ہے، جنگ آزادی میں صف اوّل کے رہنما تھے، ریشمی رومال تحریک کی وہ اہم شخصیت تھے، (۱۹۱۷ء) قیدِ مالٹا سے رہائی اور ہندوستان واپسی (۱۹۲۰ء) کے بعد حضرت نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری، الغرض نام حسین تھا، کام حسین تھا، عزیمت ومجاہدہ اور اخلاص وللہیت کی ایک مشین تھا اور ہر ایک کو اس بات کا پورا یقین تھا۔

حضرت مدنیؒ کی زندگی کا صرف یہ سیاسی پہلو اور اس کی چند جھلکیاں ہیں، ورنہ انہوں نے علم وفضل، زہد وتقویٰ، ریاضت ومجاہدہ، اخلاص وللہیت، رعایا پیروی ومہمان نوازی، دعوت وارشاد، تزکیہ وتربیت، تہذیب نفوس واخلاق، اصلاح معاشرہ، اور دیگر تعمیری تنظیمی اور رفاہی کاموں اور سرگرمیوں سے بھرپور زندگی گزاری، اللہ ان کی شایان شان بدلہ دے اور ہر طرح کی خدمات قبول فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) ■

دارالعلوم، دارالحزن ہوگیا

شورش کاشمیری

ایشیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے رئیس الجامعہ شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ دیوبند میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. مرحوم خون کے دباؤ کے مریض تھے۔ بالآخر یہی مرض آپ کا جان لیوا ہوگیا۔ وصال کے وقت بیاسی برس کی عمر میں تھے۔ کمالات کا مجموعہ اور محاسن کا مرقع، تمام عمر جدوجہد میں بسر کی۔ ابھی سنِ شباب کا آغاز تھا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اختیار کیا اور دین وسیاست، دونوں میں انہی کی سیادت قبول فرمائی۔ پھر ان کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے۔ روضۂ اطہر کے سامنے بیٹھ کر حدیث کا سبق پڑھا اور پڑھایا۔ وہیں پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے ''مرشد و مرید'' دونوں کو گرفتار کر لیا اور مالٹا کے جزیرے میں نظر بند رکھا۔ وہاں آپ پر مظالم روا رکھے گئے اس کا ذکر یہاں ''بیکار'' ہے۔ کیونکہ زخموں سے کھیلنے والوں کو زخم سہنے والوں کو کہانی سنانا بجائے خود زخموں کی اہانت کرنا ہے..... مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ کے ہمراہ ہندوستان پہنچے اور تحریکِ خلافت میں شریک ہوگئے۔ پھر آپ کے تقویٰ وفراست اور مرتبہ وسیادت کا یہ نقش اُجاگر ہوتا چلا گیا۔ جب تک انگریز اس برصغیر سے نکل نہیں گئے۔ آپ نے کسی موڑ پر بھی بڑھاپے کو جھکنے نہیں دیا، شب و روز لڑتے رہے۔ آزادی کے بعد بھی آپ کی جدوجہد ختم نہ ہوئی۔ اس پامردی سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی کہ پورے ہندوستان کی مسلمان سیادت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اپنی عظیم الشان ہمت کے اعتبار سے آپ اس گئے دور میں مسلمانوں کی ہچکولے کھاتی کشتی کے ناخدا تھے۔ آپ نے ان کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا۔ کئی دفعہ زندگی میں دوستوں اور دشمنوں کا ہدف بننا پڑا؛ لیکن کبھی ملال نہ کیا۔ آج دنیائے اسلام میں بالعموم اور پاکستان

اور ہندوستان میں بالخصوص جتنے آپ کے شاگرد ہیں اتنے شاید کسی دور میں کسی شیخ الحدیث کے صحبت یافتہ اور جاں نثار نظر نہیں آتے۔ آپ کی موت بلاشبہ علم کی موت ہے۔ آپ ایک ادارہ تھے جو ختم ہوگیا۔ آپ کی پرہیز گاری اور شب زندہ داری کا یہ عالم تھا کہ چراغ فکر لے کر بھی نکلیں تو ثانی ملنا محال ہے۔ ایک مکمل کتاب تھے۔ کبھی کسی کی دل آزادری نہیں کی۔ کسی کے خلاف کلمہ اہانت نہیں کہا۔ ہر شخص کی اختلافِ فکر ونظر کے باوجود عزت کی۔ دین کو دین کی سطح پر رکھا، کاروبار کا ذریعہ نہ بنایا۔ غیرت وجرأت دوایسے وصف تھے جو آپ کے لہو میں دوڑتے تھے، تقویٰ کی اس منزل میں تھے کہ مولانا الیاس دہلوی جیسے بزرگ نے سیاسیات کی گرم بازاری کے دنوں میں کہا تھا کہ:

''آپ سیاستہً جو کچھ کہتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر سمجھ میں آسکتا تو میں آپ کے ہمراہ دوڑ اپھرتا۔ لیکن اللہ کے نزدیک آپ کا جو درجہ ہے چونکہ میں اس سے کماحقہٗ واقف ہوں اس لیے آپ کی مخالفت کرکے میں جہنم کی آگ خریدنا نہیں چاہتا۔'' یہ مقامات کی بات ہے جو ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ حسین احمد نام کے بچے پیدا ہوتے رہیں گے لیکن حسین احمد پیدا نہیں ہوگا۔ ہم اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بھارتی مسلمان پھر سے یتیم ہوگئے ہیں۔ آپ محض دار العلوم کے سربراہ یا جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر ہی نہ تھے ایک بیش بہا متاع تھے، زندہ ہندوستان میں ہوتے تو آج بھارت کے پرچم آپ کی خدمات کے اعتراف وستائش میں جھکے ہوتے لیکن آپ اس ملک میں بھی اجنبی تھے آپ کی قوم..... تقدیر کے ہاتھ میں ایک المیہ ہے۔ آپ اکیلے نہیں گئے۔ اپنے ساتھ ایک تاریخ، ایک جذبہ اور ایک تحریک بھی لے گئے۔ ابوالکلام کی گوشہ نشینی میں غموں کی زردی اور کھنڈگئی ہے۔ دار العلوم، دار الحزن ہوگیا۔ ■

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے میری واقفیت

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

غالباً ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کی بات ہے، میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے (مدرسۃ الشرع) میں صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی ہوگی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانے میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں، اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسے کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ سے بیعت وارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسے تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا، میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کا نام سنا۔

حضرت مولانا سے ابتدائی تعارف:

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ غالباً یہ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ (جون ۱۹۲۰ء) میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میرے والد ماجد نے آیندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم ان دنوں مدرسۂ عبدالرب دہلی میں مدرس تھے)۔

مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہوگی اس زمانے میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی۔ اس لیے سنبھل سے مراد آباد تک سفر لاری سے ہوا مراد آباد پہنچ کر دیو بند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت شیخ الہند آج ہی دیو بند سے فتح پور ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں۔ اس لیے اس وقت دیو بند پہنچ کر حضرت کی زیارت نہ ہوسکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کردیئے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہوگئے۔ صبح کو جب ہم دہلی پہنچ کر مدرسۂ عبدالرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش وفروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اسی وقت تشریف لا رہے ہیں شام تک یہیں مدرسے میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لیے روانگی ہو جائے گی۔ استاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقا سمیت تشریف لے آئے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیر گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہیں ہیں۔

حضرت کی پہلی زیارت:

چند مہینے کے بعد (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو) حضرت شیخ الہند کا وصال ہوگیا۔ مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہوگئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا، جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی شریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور اسارت مالٹا کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا، حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقعے پر ہوئی، خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر کو نکلتے تھے مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسے کی اپنی تقریر میں لوگوں کے اصرار پر ان تکلیفوں مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اہل مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کے لیے بہت دردناک تھے، مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزا یاد ہیں۔

ضرت کی گرفتاری:

اس کے کچھ عرصے کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے
ے مشہور ہے، اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مراد آباد
ے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجدی طاقت نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف
ین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا، خبریں آ رہی تھیں کہ شریف حسین بعض یورپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے
دیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔
یت العلماء کے اجلاس میں ایک ریزولیشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضی
اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ و اقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی اس
یزولیشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی بسیط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی
رمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ وجدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ
ر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے
فتر کے دفتر حفظ ہیں اور اس وصف میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلّہ نہ ہوگا۔

دیوبند کی آمد ورفت:

میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا، اگلے سال میں پڑھنے کے لیے
دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانے میں غالباً سلہٹ رہتا تھا،
لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانے میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً
ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی، آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں خاص
طور سے ہم طلباء ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض خاص تقریریں قلم بند بھی کی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند کی صدارت:

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات
دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحب نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرما لیا،
اس وقت دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ
موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمے داری کو قبول فرما لیا، چونکہ دارالعلوم

میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لیے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گزشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربے کی بنا پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انہیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز:

خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لیے حضرت مولانا جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو جائے تو سمجھیے کہ اس کو بندگی کا کمال نصیب ہو گیا۔ اسی لیے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ:

اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِکُمْ عِنْدِیْ الصَّلٰوۃ "تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے"۔

حضرت مولانا مدنی کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصے میں فرائض ہی نہیں بلکہ اوابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طول قرأت اور طولِ قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت ولذت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ کی قرۃ عینی فی الصلوۃ اور یا بلال اوحنی بالصلوۃ والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع سنت:

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ ﷺ کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے۔ فرمایا گیا کہ جس شخص کو

اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضور کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات واطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں بھی حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ ﷺ سے ادنی نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتی کہ مدینۂ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا ظہور اپنے موقع پر ہوتا رہتا تھا، اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے، تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے حتی کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقے پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتی کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقۂ سنت کی پابندی فرماتے۔ اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیازمند اور تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرت اور عادت میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہوگا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانے میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت، وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔

دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درس گاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے، ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع وعریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت وسیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام۔ ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو۔

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بناء پر حضرت کے چند نیازمندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں اور حضرت قبول فرما لیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضرور ہی ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند فرما دیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کیا کروں لوگ آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں، عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرما لیں کہ اس سلسلے کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصے تک تو ایسا ہوگا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرما دینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے۔ اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرما لیا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں، عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعے ہی پر صرف ہونا چاہیے، حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں، میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے، یہ کہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ:

حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجے کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا، کسی کا ساتھ

دینایاساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یاناراضگی کسی کی تحسین یاملامت، حتی کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کواس راستے سے ہٹانہیں سکتاتھا۔اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اوراس سلسلے کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارے میں ایک رویے کوصحیح سمجھ کرانہوں نے اپنالیا تھا، جولوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں انہیں یاد ہوگا کہ مولانا کواس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑااورعزت وآبروتک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کواس زمانے میں اتنا ہی زیادہ مضبوط، غیر متزلزل اور پرجوش پایا گیا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علما اور غیر علما میں اور بھی بہت سے تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملے میں بالکل نرالی تھی۔وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلے کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔یہ میں نے ایک ایسے مسئلے کی مثال دی ہے، جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویے کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھران کے خاص معتمد اور نیاز مند بھی ان کورویہ بدلوانے اوررخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکے، الایہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیل ہو جائے۔یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کردینے کو جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامیابی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثاروفیاضی اور مہمان نوازی:

ناظرین نے ایثاروفیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جونمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی کم مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافرخانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برس ہابرس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا۔اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہوجاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا مثلاً پلاؤ پکتا یا ثرید تیار کیا جاتا، یا دیوبند کی مشہور فیرنی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنہوں نے حضرت کی عجیب و غریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری للہی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل و عیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قایم کرنے کا حق ہے، اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شح اور حب مال سے حضرت کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور انشاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (تغابن: ۱۶)

اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حب مال کی بری خصلت سے بچایا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجئے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کے فکر و اہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۱۹۲۳ء (یا ۱۹۲۴ء) کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک کے مقابلے میں ''جمعیۃ العلماء ہند'' کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا۔ اسوقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعے وقتی دفاعی کوششوں کے علاوہ ان علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے، مذہبی مکاتب قایم کرنے کا ایک ٹھوس، مستقل اور وسیع کام بھی، جس کے لیے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ جمعیۃ العلماء ہند اور اکابرِ دیوبند سے تعلق رکھنے والوں رنگون کے صاحب خیر تاجروں نے اس سلسلے میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی، اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا۔ یہ وفد رنگون پہنچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیت کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب

مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگٹھن کے مقابلے میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقبل کام ہورہا تھا)۔

بہر حال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے۔ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلے میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں، ان میں ایک آدمی، مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے، اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے؛ لیکن اس نے کہا، نہیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کردی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہٰذا آپ حضرات کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں، اور واپس چلا جاؤں؛ لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں، پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بیچارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی ان کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرمادیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ اس کے بعد میں کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت مولانا نے (انہیں کی خیر خواہی کے لے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادل ناخواستہ ماننا پڑا۔ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا، حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی کہ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرے کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا اور وہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے

لیکن بہر حال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کرآتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے۔ بیان کرنے والے کا بیان ہے کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کرآتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا۔ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہوگیا ہوں اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتا۔ پھر چند کلمات وفد کے مقاصد کے متعلق بھی کہہ کر تقریر ختم فرمائی۔

عند اللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی:

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے، اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے ان میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا۔ یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی۔ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے میں خاصا بعد ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یہ یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے ان ایمانی اوصاف کے ورثے سے ہم کو محروم نہ رکھے۔ (الفرقان، لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۵۸ء) ■

شیخ الاسلام اور متحدہ قومیت

مولانا عبدالحمید نعمانی

سکریٹری برائے نشرواشاعت جمعیۃ علماء ہند

مختلف مذاہب اور فرقے والے ملک میں کچھ مشترک مسائل ومقاصد میں اس کے تمام باشندوں کا اتحاد ضروری ہوتا ہے۔ مشترک مقاصد کے حصول کے لیے بھی مشترک جدوجہد ضروری ہوتی ہے، خاص طور سے اگر کوئی تیسرا گروہ غاصبانہ طور سے ملک کے اقتدار اور وسائلِ حیات پر قبضہ کرکے اصل باشندوں کو محرومی وغلامی کی اذیت میں ڈال دے۔ یہاں یہ سوال کوئی قابلِ توجہ اور بامعنی نہیں رہ جاتا ہے کہ کیا باہمی فرقوں کے اتحاد اور مشترک جدوجہد سے ایک دوسرے کی تہذیبی وفکری شناخت اور وجود خطرے میں نہیں پڑ جائے گا، نیز یہ کہ کیا ایک ہی قومیت کے تمام امور میں یک بیک اقلیت کو اکثریت کے ساتھ اتحاد کیے بغیر متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آسکتا ہے؟

متحدہ قومیت کی بحث کا آغاز:

متحدہ قومیت کی بحث وگفتگو اور اس اصطلاح کا استعمال تحریکِ خلافت کے زمانے میں خاص طور سے ہونے لگا تھا، نیز عالمی سطح پر بھی متحدہ قومیت ووطنیت کے تصور پر بحث اور اس کو عملی شکل دیتے ہوئے رائج کرنے کی مہم شروع ہوگئی تھی، لیکن اس میں منفی رجحان، دوسرے سے نفرت اور اچھائی وخیر کے اضافے کا تصور غالب تھا، اس کے ساتھ اسے ایک سیاسی ہیئت اور اجتماعی صورت دے کر تمام شعبہ ہائے حیات اور زندگی کے تقریباً تمام امور کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

متحدہ قومیت کے عناصر:

قومیت سے متعلق تمام امور کی، جو عناصرِ ترکیبی کے ذیل میں آتے ہیں، بیک وقت یکجائی ضروری ہے۔ یہ امور (۱) اشتراکِ نسل، (۲) اشتراکِ جائے پیدائش اور زمین (۳) اشتراکِ زبان (۴) اشتراکِ رنگ (۵) اشتراکِ اغراضِ معاشی (۶) اشتراکِ نظامِ حکومت (۷) اشتراکِ ارادۂ عامہ (۸) مذہب (۹) تہذیب (۱۰) جغرافیائی وحدت جیسے ہیں، ایسی شکل میں ظاہر ہے کہ دین و شریعت کا رول انسانی زندگی میں یا تو ختم ہو جاتا ہے یا دوسرے، تیسرے درجے میں آ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی ادنیٰ مذہبی شخص، خاص طور سے صاحبِ ایمان متحدہ قومیت کے تصور کو نہ تو تسلیم کر سکتا ہے، نہ کسی کو اس کے اختیار کرنے کا مشورہ و ترغیب دے سکتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام اور جدید مغربی تصورِ قومیت میں فرق:

تو پھر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مغرب و یورپ کے ایسے جدید تصورِ قومیت کو تسلیم کر سکتے ہیں، جس سے خلقِ خدا کی غلط تقسیم ہو جائے، دین و شریعت کی جڑ کٹ جائے اور جو مذہب کا کفن بن جائے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مغربی و یورپی سیاسی تصورِ متحدہ قومیت کو تسلیم کر کے ایسا غیر اسلامی کام کیا ہے، جس سے ملتِ اسلامیہ کا وجود ختم ہو جاتا ہے، کو قدیم تعلیم یافتہ مذہبی علماء اور جدید تعلیم یافتہ اہلِ دانش وادب نے سخت تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا، جب کہ مذکورہ مفروضہ کا حضرت شیخ الاسلامؒ کی تحریر و بیان میں دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں ہے۔

متحدہ قومیت کا سوال:

انھوں نے تو صرف ایک جغرافیائی حدود والے ایک ملک کے تمام باشندوں کو، چاہے اُن کا مذہب و مشرب کوئی بھی ہو، ایک قوم قرار دے کر اپنے ملک کے غیر ملکی غاصب طاقتوں کے خلاف جدوجہد کے لیے آمادہ کیا تھا۔ متحدہ قومیت کا یہ تصور ایسا ہے، جو مشترک مسائل و امور میں متحدہ جدوجہد کی راہ ہموار کرنے میں ہمیشہ معاون ثابت ہوگا، اور اس کے نتیجے میں قومی یکجہتی کے تحت ملک کے مختلف اقوام و قبائل اور مذاہب والوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر نفرت و دشمنی کو دور کر کے ایک پر امن اور بہتر معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں بنیاد کا کام کرے گا۔ تاریخ و جغرافیہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مطالعے کے خصوصی موضوعات تھے۔ اپنے مطالعہ کی روشنی میں وہ ہندستان جیسے مختلف مذاہب والے ملک میں اسلام اور امتِ محمدیہ کے وسیع تر

مفاد میں اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ تمام باشندگان ملک کے لیے کوئی ایسی متحدہ بنیاد ہونا چاہیے، جس پر الگ الگ مذہب رکھنے کے باوجود یک جا ہونے میں کوئی دقت اور تحفظ ذہنی نہ ہو۔ ایسا ایک ملک و وطن کا تصور کر سکتا ہے۔ مٹی سے جڑے ہونے کا تصور انسانی سماج کی وحدت میں انتہائی اہم رول ہوتا ہے۔ یہ ایک برادری اور قبیلہ کے دائرہ سے لے کر پورے ملک کی جغرافیائی حد تک وسیع ہو سکتا ہے اور اس میں دینی، شرعی اور تہذیبی لحاظ سے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے۔ اس بات کو حضرت شیخ الاسلامؒ کے تمام ناقدین و مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے اور بعد میں ان کے متبعین کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ایک ملک کے تمام باشندے وطنی حیثیت سے ایک قوم ہو سکتے ہیں۔

غلط فہمی کے اسباب:

تاہم ایک طبقہ آج بھی ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا مودودی کے مداحوں اور حامیوں کا ایسا ہے، جو ادھر اُدھر کی باتوں اور حوالوں سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنانے کے لیے موقع نکال لیتا ہے، لیکن کسی ایک نے بھی اپنی تنقیدی تحریر میں حضرت مدنیؒ کی اصل تحریر کا اقتباس دے کر باحوالہ اپنی تنقید کو مدلل بنانے کی کوشش و جرأت نہیں کی۔ ناقدین نے اپنے طور پر ایک بھیانک مفہوم و معنی متعین کیا اور قرآن و سنت کا نام لے کر تنقید کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہم مولانا مدنیؒ سے زیادہ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو جانتے ہیں اور کانگریس کی حمایت اور اسے تقویت دینے کے جذبے سے رسول عربیؐ کے مقام اور قرآن و سنت اور سیرت کے حوالے کی اَن دیکھی کر گئے ہیں۔ اگر مولانا مدنیؒ کی بات پر توجہ دیتے ہوئے ان کے مشورے پر عمل کیا گیا تو لامحالہ تمام مذہبی امتیاز مٹ جائیں گے۔ اس سلسلے کی افسوسناک اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کی فرقہ پرستی کے زیر اثر آ گئے علماء سے تعلق رکھنے والے، حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند کے حلقے کے کچھ علماء بھی حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مقام و حیثیت کو نظر انداز کر گئے اور مخالفین کے غلط پروپیگنڈے اور متحدہ قومیت کے مفروضہ معانی و مفاہیم کو بنیاد بنا کر خامہ فرسائی پر اتر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سیاسی چپقلش و مخالفت کے جذبے کے تحت ہوا تھا۔ راقم سطور نے پوری ایمانداری اور ایک طالب علم کے طور پر دونوں طرف کی تحریروں کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ ناقدین نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ، پروپیگنڈے کے دھویں سے خود کو بچاتے ہوئے انصاف نہیں کر سکے ہیں، اور انھوں نے علامہ اقبال جیسے عظیم فلسفی، مفکر و شاعر کے نام کا سہارا غلط طور سے لیا ہے، ورنہ اصل مسئلے اور نتیجے کے طور پر متحدہ قومیت کے متعلق مولانا مدنیؒ سے ان کا موقف الگ بالکل نہیں ہے۔

یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اقبال سے متعلق، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مولانا نجم

الدین اصلاحی مرحوم جیسے کچھ عقیدت منداہلِ علم نے جو سخت تنقید و تبصرہ کیا ہے، اس کا حضرت شیخ الاسلامؒ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ نہ انھوں نے اس کی تائید و اتفاق کیا ہے۔

باہمی اعترافِ عظمت:

اقبال اور حضرت مدنیؒ ایک دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے کہ صرف ایک نظریاتی اختلاف تھا۔ زمین جائیداد کا جھگڑا تو تھا نہیں، معاملے کی وضاحت کے بعد اقبال نے کھلے الفاظ میں غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے حضرت مدنیؒ کے مقام و مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا طالوت کے نام لکھے مکتوب میں رقم طراز ہیں: ''مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلایئے کہ میں ان کے احترام میں کسی مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔'' ایک اخباری بیان میں بھی اقبال نے کہا کہ میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں، نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں اُن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔ (روزنامہ احسان، لاہور، ۲۸ ر مارچ ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر محمد اقبال کے خطوط و مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ راقم سطور کے پیشِ نظر 'انوارِ اقبال'، 'مکاتیبِ اقبال' اور 'اقبال کے نثری افکار' ہیں۔ ان میں مذکورہ قسم کے اعترافات درج ہیں۔

دوسری طرف حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کا معاملہ یہ تھا کہ اقبال کے انتقال کی خبر سنتے ہی دعائے مغفرت کی اور دیگر لوگوں سے بھی اس کے لیے کہا۔ اس کے چشم دید گواہ اور ذاتی مشاہد جناب قاضی مسعود حسن میرٹھیؒ نے راقم سطور سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ جس دن علامہ اقبال کا انتقال ہوا، اُس دن ہماری انجمن اصلاح المسلمین میرٹھ کا جامع مسجد میں جلسہ تھا۔ حضرت مولاناؒ کی تقریر تھی۔ میں استقبال کے لیے جامع مسجد کے دروازہ پر کھڑا تھا کہ علامہ اقبال کے انتقال کی خبر ملی۔ تھوڑی دیر میں مولانا تشریف لے آئے۔ تقریر سے پہلے انتقال کا ذکر کیا اور حاضرین سے کہا کہ سب علامہ اقبال کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ چناں چہ حضرت مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعائے مغفرت کی۔ جناب مرحوم مسعود حسن صدیقی تبصرہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ'' یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولانا کے خلاف قومیت کے مسئلے پر سخت الفاظ استعمال نہ کیے ہوتے۔ اس سے حضرت مولاناؒ کی وسعتِ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔'' اسے راقم سطور اور دیگر حضرات کی گزارش پر مرحوم صدیقی صاحب نے اپنی زندگی پر لکھی تحریر'' کچھ یادیں'' میں شامل بھی کر دیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے بعد میں'' متحدہ قومیت اور اسلام'' کے موضوع پر لکھی اپنی کتاب میں بھی کئی مقامات پر اقبال کی بلند فکر شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ'' جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی،

اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ آسمان حکمت و فلسفہ، شعر وسخن، تحریر وتقریر، دل ودماغ اور دیگر کمالات علمیہ وعملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۴۴، مطبوعہ مرکز دعوت اسلامی، نئی دہلی، الجمعیۃ بک ڈپو، ص ۶، قومی ایکتا ٹرسٹ نئی دہلی، سنہ اشاعت سب میں ندارد)

کتاب کے اختتام پر تحریر فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنی مغفرت اور فضل سے نوازے۔" کتاب کے پیش لفظ کے اس جملے سے ڈاکٹر محمد اقبال سے تعلق خاصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ بالآخر جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصدِ اصلی سے نقاب اُٹھانا چاہتا تھا، ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے وصال کی خبر شائع ہوئی۔ اس ناساز اور دل دوز خبر نے ذہنِ خیالات وعزائمِ افکار پر صاعقہ کا کام کیا۔ طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہو گئے۔ تحریر شدہ اوراق طاقِ نسیاں کے سپرد کر دینا ہی انسب معلوم ہوا اور اگرچہ اس کے بعد بھی احباب کے تقاضے پریشان کر رہے تھے، لیکن طبیعت اس قدر بجھ گئی تھی کہ اُبھرنے میں نہ آتی تھی:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

دونوں طرف سے ایک دوسرے کے اعترافِ مقام وعظمت کے بعد دونوں عظیم شخصیات میں سے کسی کی تحقیر دونوں کے عقیدت مندوں کے لیے روا نہیں ہوگی۔ اگر محمد اقبال اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے ایک دوسرے کی کچھ باتوں کو لے کر تبصرہ وتنقید سے کام لیا ہے تو وہ معاصرین سے کوئی بعید نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال، حضرت شیخ الاسلامؒ سے عمر میں چند سال بڑے تھے۔

حضرت مدنیؒ کے موقف کی غلط تشریح:

یہ افسوسناک بات ہے کہ مسئلہ متحدہ قومیت کے تناظر میں اقبالیات پر جن کتابوں میں بحث وگفتگو کی جاتی ہے، ان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نقطۂ نظر کو غلط انداز میں پیش کر کے ان کو غلط تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، لیکن علامہ اقبالؒ اور حضرت مدنیؒ کی اصل باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے صحیح صورت حال سے قارئین کو واقف نہیں کرایا جاتا۔

علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا حوالہ:

سوال یہ ہے کہ کیا علامہ شیخ الاسلامؒ کے دو بڑے ناقد ڈاکٹر اقبالؒ اور مولانا مودودی ایک ملک کے باشندوں کو وطنی حیثیت سے ایک قوم قرار دینے میں، جو شیخ الاسلامؒ کا موقف تھا، کے خلاف تھے یا ان کے دلائل

کی تردید کر سکتے ہیں؟ جتنا کچھ اقبال اور مولانا مودودی لکھتے اور کہتے ہیں، بنیادی مسئلے میں اس سے زائد حضرت شیخ الاسلامؒ نے نہ کہا ہے نہ لکھا۔

ڈاکٹر اقبال کا حوالہ:

ڈاکٹر محمد اقبال کی آخری تحریر زیر بحث مسئلے سے متعلق روزنامہ 'احسان' لاہور میں شائع ہوئی اور اقبال کے نثری مضامین کے کئی مجموعے میں شامل ہے، اس میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"مولانا (حضرت مدنیؒ) کا یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں، قابلِ اعتراض نہیں، اس لیے قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں، کیوں کہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ، کل تک اہلِ برما ہندستانی تھے، اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کرتے ہیں، حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے، جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں، مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے، چوں کہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لیے جب وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔" (روزنامہ 'احسان' لاہور، ۹ر مارچ ۱۹۳۸ء، اقبال کے نثری افکار، ص ۱۸۵ تا ۱۸۶، مرتب عبدالغفار شکیل، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی، مارچ ۱۹۷۷ء)

مولانا مودودی کا اعتراف وتبصرہ:

مولانا مودودی نے بھی اپنی کتاب 'مسئلہ قومیت' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ مولانا نے اپنے ذہن میں

'متحدہ قومیت' کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے، جس کے حدود انھوں نے تمام شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں، اور ان کو وہ ایسی پُر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لا سکے، لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہے کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں، حالاں کہ کانگریس اس سے بمراحل دور ہے، اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ 'متحدہ قومیت' سے میری مراد یہ ہے تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں کانگریس کی مراد بھی یہی ہے اور کانگریس بالکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چل رہی ہے اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالے کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے، یہی سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔

(مسئلہ قومیت، ص ۱۰۶، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۷ء، دوسرا ایڈیشن)

اس اقتباس سے اتنا تو ثابت ہی ہو جاتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، متحدہ قومیت سے جو معنی اپنے طور سے مراد لیتے ہیں، اس میں اختلاف و نزاع نہیں ہے، البتہ کانگریس کی مراد کو اپنی مراد سے جو وابستہ کر دیتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ نے بنیادی حقوق اور پرسنل لاء وغیرہ سے متعلق جو تحریری و زبانی یقین دہانیاں اور آئینی تحفظ فراہم کرنے کی باتیں کہی تھیں ان میں کہیں اس کا ذکر تھا کہ مسلم اقلیت اپنی مذہبی شخصیات کو ختم کر کے ہندو اکثریت میں جذب و ضم ہو جائے، اس کے بغیر وہ متحدہ قومیت کا حصہ نہیں بن سکتی ہے۔ گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو (لال غلط ہے) عملاً کیا چاہتے تھے اور ان کے دل و دماغ میں کیا تھا، وہ بالکل الگ معاملہ ہے۔ اصل بات اصولی و آئینی ہے اور حضرت مدنیؒ کی گفتگو اسی حد تک محدود ہے، اس کو اس سے آگے بڑھا کر اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کانگریس کے کردار و عمل سے جوڑ دینے سے ظاہر ہے کہ ملی جذبے کے مدنظر بات خاصی اشتعال انگیز ہو جاتی ہے۔ حضرت مدنیؒ نے اپنی کسی تحریر یا بیان میں کانگریس کے عمل و رویہ کو اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑ کر نہیں دکھایا بتایا ہے، کانگریس کے عملی رویے سے متعلق بحث و گفتگو کی خاصی گنجائش ہے، تاہم حضرت شیخ الاسلامؒ نے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تناظر میں کانگریس کے عملی رویے یا گاندھی جی و جواہر لعل نہرو وغیرہ کے عمل کو پیش ہی نہیں کیا ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ کیا وہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنظر رکھ کر اپنی پالیسی یا لائحۂ عمل تیار کرتے تھے۔ حضرت مدنیؒ کے سامنے درحقیقت یہ بات براہ راست تھی ہی نہیں کہ قومیت و وطنیت کا مغربی و یورپی سیاسی تصور کیا ہے، وہ دینی احکام کی روشنی میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اقدامات سے موجودہ حالات میں مشترک مفادات و مقاصد کے حصول کی ایک راہ نکال رہے تھے تاہم اُن کو اس کا احساس تھا کہ کانگریس کے نام کو حد سے زیادہ

نمایاں کر کے غلط فہمی پیدا کی جاسکتی ہے، اس لیے انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت اجلاس عام جون پور ۱۹۴۰ء میں اس کی وضاحت کردی تھی کہ کانگریسیوں کی انفرادی اور غلط باتوں سے ہماری بحث کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا حوالہ آگے آرہا ہے، اور اس تعلق سے مولانا مودودی کو خود اعتراف ہے کہ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے انگلی رکھنے اور کوئی حرف لانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

خبر وانشاء سے مشورہ تک:

کتاب وسنت اور فقہ وسنت کی روشنی میں اگر ماضی کے قول وفعل کا موجودہ حالات پر انطباق کر کے اس کے مطابق لوگوں کو روش اپنانے کا نیک نیتی سے مشورہ بھی دے تو غلط نہیں کہا جاتا ہے، اسی کے تحت حضرت شیخ الاسلامؒ نے اگر خبر و بیان حالات سے گزر کر بات کو مشورہ تک پہنچادیا تو اس کی بنیاد پر ان پر فریب دہی کا الزام عائد کرنا کوئی راست رویہ نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ پروفیسر عمر حیات خاں غوری نے اپنی دو کتابوں 'اقبال اور مودودی' اور 'معرکۂ وطنیت' میں کیا ہے۔

کلامِ اقبال میں شیخ الاسلامؒ سے متعلق نظم کی شمولیت واخراج کا مسئلہ

پہلے قومیت کی جدید ذہنیت ونظریت کی خبر واطلاع اور بعد میں متحدہ قومیت کی جدوجہد اور عملی جامہ پہنانے سے متعلق مشورہ کو بنیاد بنا کر اقبال کے مجموعہ کلام 'ارمغانِ حجاز' میں حضرت شیخ الاسلامؒ سے متعلق اشعار کی شمولیت کی حمایت اور اس سے اشعار کے اخراج کی مخالفت ایک ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ اپنے نظریے کی مخالفت کی بنا پر ایک بزرگ مسلمہ عالم دین اور رہنما و مرشد کی تضحیک وتجہیل میں تسکین کا سامان تلاش کیا جاتا رہے۔

حضرت مدنیؒ کی شخصیت کا وزن:

لیکن ایسے ناقدین کو غالباً اس کا اندازہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شخصیت اقبال کے چند اشعار سے ختم نہیں ہوجائے گی۔ وہ اپنے عہد کے اہم ترین رہنما واکابر میں سے تھے اور عوامی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ سب سے بااثر عالم دین ومرشد تھے، یقیناً کلام اقبال میں وہ طاقت واثر ہے کہ کوئی اور ہوتا تو لوگ اس کا نام لینا تک پسند نہ کرتے اور وہ ختم ہوجاتا، لیکن حضرت شیخ الاسلامؒ کا جادو آج بھی چل رہا ہے۔ ایک موقع پر غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین دہلی میں جناب حضرت خواجہ ثانی نظامی نے علامہ اقبال پر منعقد ایک پروگرام میں کہا تھا کہ ''میرے والد صاحب کے دوست ڈاکٹر اقبال نے جس شدت وطاقت سے مسئلہ قومیت کے تناظر میں حضرت مدنی کے متعلق اشعار کہے اور وہ برابر شائع ہو رہے ہیں،

اگر کوئی اور ہوتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا، لیکن حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت اتنی بھاری بھرکم اور طاقتور ہے کہ اسے ڈاکٹر صاحب کے اشعار کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔"

ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟

لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اشعار میں جس جذبے کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا رہے گا کہ علامہ اقبال کی بیماری کی حالت، جس میں آدمی کا قویٰ بہت حد تک مضمحل ہو جاتا ہے، کا کچھ لوگوں نے غلط فائدہ اُٹھایا، بعد کے حالات میں مسئلے کی جو شکل سامنے آئی اگر اقبال زندہ ہوتے اور مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو ان کی شرافت سے یہ بعید تھا کہ مذکورہ اشعار کو اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کرتے، جیسا کہ انھوں نے مختلف شخصیات سے متعلق کہے اشعار، مجموعہ ہائے کلام میں شامل نہیں کیے یا بعد میں ان سے خارج کر دیا۔ حافظ سے متعلق اشعار کا اخراج اس کی واضح مثال ہے اور کیوں کر اشعار کو مجموعۂ کلام میں شامل کرتے، سوال یہ ہے کہ وطنی حیثیت سے ایک قوم شمار ہونے کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبال یا مولانا مودودی الگ موقف دلائل سے کہاں پیش کر سکے، جس طرح حضرت شیخ الاسلامؒ کی کتاب 'متحدہ قومیت اور اسلام' اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، اسی طرح مجموعۂ کلام 'ارمغانِ حجاز' بھی انتقال کے بعد ہی اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اگر علامہ اقبال 'متحدہ قومیت اور اسلام' کا مطالعہ کر لیتے تو وہ زیادہ وضاحت اور ہمدردی و سنجیدگی سے متحدہ قومیت سے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ کے نظریے پر غور کر کے مختلف سوالات کے جوابات فراہم کرتے۔

بنیادِ قومیت کا مسئلہ:

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اہلِ ایمان امتِ مسلمہ کی قومیت کی بنیاد اسلام ہے، اس کا مولانا مدنیؒ نے انکار و تغلیط کب کی ہے۔ وہ اس کا امتِ مسلمہ کے حوالے سے اثبات کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ہندو، بودھسٹ، عیسائی، سکھ جیسے مختلف مذاہب و فرقے والے ملک، جیسا کہ ہندستان ہے، کی قومیت کی بنیاد اسلام کیسے بن سکتا ہے، اس کے قبول کر لینے سے پہلے سب مذاہب والوں کی اسلام مشترک بنیاد نہیں بن سکتا ہے، اس سے پہلے پہلے، ملک میں رنگ، پیشہ وغیرہ میں سے کسی کو متحدہ قومیت کی بنیاد بنائے بغیر مشترک مقاصد ومفادات کے حصول کی راہ کیسے نکالی جائے، اس کا جواب اقبال اور مولانا مودودی جیسے حضرات کی تحریروں وبیانات میں نہیں ملتا ہے، جب کہ حضرت شیخ الاسلامؒ جیسے بزرگوں کی تحریروں اور نظریے میں مذکورہ سوال کا تشفی بخش جواب مل جاتا ہے۔

اقبال ومودودی کے پیروکاروں کی مشکل:

یہی وجہ ہے کہ اقبال ومودودی کے پیروکاروں اور حضرت مدنیؒ کے ناقدین تک کو حالات کے صحیح انطباق اور عملی جواب کے لیے حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کا جیسا موقف رکھنے والوں کی رہنمائی کی مدد لینی پڑی، علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال، جن کی اپنے والد کی حیات کے تشکیلی، وسطی اور اختتامی موضوع پر ضخیم کتاب 'زندہ رود' ہے، اس میں انھوں نے متحدہ قومیت کے مسئلے پر حضرت شیخ الاسلامؒ اور اقبال کے اختلاف اور موقف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے چودھری محمد حسین جیسے حضرات کی کل ملا کر حمایت کی ہے، جو مولانا مدنیؒ سے متعلق اشعار کو مجموعۂ کلام میں شمولیت کے حق میں رہے ہیں، واضح رہے کہ چودھری صاحب نے ہی 'ارمغانِ حجاز' کو وفاتِ اقبال کے چھے مہینے بعد شائع کیا تھا۔ جاوید اقبال یہاں تک کہتے ہیں کہ "بات جو واقعی عجیب وغریب ہے، یہ ہے کہ ایسے علماء مسلمانوں کے متحدہ قومیت میں جذب ہو جانے اور یوں ہندستان کی سیکولر یا لادین ریاست قبول کر لینے کو تو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز سمجھتے ہیں، مگر پاکستان میں وہ ایسا روایتی نظام اسلام نافذ کرنے کے درپے ہیں جس کا آج کے متغیر زمانہ میں نفاذ مشکل ہے، ممکن ہے وہ ایسے نظام کے نفاذ کی پاکستان میں ناکامی سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا موقف درست تھا اور اقبال کا غلط۔" (زندہ رود، ص ۱۰۴۵، مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۹ء)

مفروضہ یا حقیقت:

اکثریت میں جذب وضم ہونے کے مفروضہ کی تردید تو آزادیٔ وطن سے لے کر اب تک ہندی مسلمانوں کی مسلم پرسنل لاء اور اپنی شناخت کے تحفظ کی جدوجہد کی تحریک ہے، جس میں جمعیۃ علماء ہند نے ہمیشہ قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کی طرح کا موقف رکھنے والے اہلِ علم ودانش کے نقطۂ نظر کی صحت اور دو قومی نظریے کی خامی تو محمد علی جناح کی اس تقریر سے ہو گئی ہے، جس میں انھوں نے تمام پاکستان کے باشندوں کو پاکستانی قوم قرار دیا ہے، چاہے ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔

پاکستان میں قومیت کا سوال:

گزشتہ کچھ عرصہ سے خود پاکستان نے ملک کے باشندوں کی وطنی حیثیت سے قومیت کے سوال نے وہاں دانشوروں اور اقبال ومودودیؒ کے عقیدت کیشوں کو ذہنی وفکری کشمکش اور عملی طور سے فیصلہ کرنے میں تذبذب میں ڈال دیا ہے۔ مشہور ناقد ومحقق جناب سلیم احمد نے اپنی کتاب (اقبال-ایک شاعر، ص ۱۱۷) میں یہ مدعا اُٹھایا ہے کہ اقبال اور مولانا مدنیؒ کی بحث قیامِ پاکستان پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، بلکہ اور تازہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ

ہمارے سامنے اس وقت بھی یہی مسئلہ ہے کہ ہم پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کی زمین سے وفادار ہیں یا نہیں۔"

فرزندِ اقبال جاوید اقبال کا انٹرویو:

جناب جاوید اقبال کا مسئلہ قومیت سے متعلق ایک بڑا فکر انگیز اور چشم کشا انٹرویو پاکستان کے اخبار اور میگزین میں شائع ہوا تھا، جس میں وہ اپنے سابقہ موقف سے ہٹ کر حضرت مدنیؒ کے قریب ہو گئے ہیں، بلکہ کہیے کہ حالات نے آمادہ کیا کہ وہ اقبال-مدنیؒ کو ایک جگہ کھڑا کر کے مسئلے کا حل نکالیں۔ سوال یہ تھا کہ اقبال نے کہا تھا کہ قومیں مذہب سے بنتی ہیں، مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کہا کہ قومیں جغرافیہ سے بنتی ہیں۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ جس وقت یہ مناظرہ ہوا اس وقت قوم سازی کی بہت ضرورت تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا کہ قوم مذہب سے بنتی ہے۔ یہ ایک نظریاتی بات تھی، لیکن جب ملک بن گیا تو اس کی شناخت جغرافیے سے ہونے لگی۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ آج اگر یہ نعرہ لگایا جاتا ہے "سب سے پہلے پاکستان" تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ (روزنامہ خبرمیل، سنڈے میگزین، ۱۳/اگست ۲۰۰۶ء)

اس سے ان حضرات کو روشنی لینا چاہیے جو حضرت شیخ الاسلامؒ اور مولانا آزاد پر آج بھی متحدہ قومیت کے مسئلے پر اس کا خاص مفہوم لے کر غلط تنقید کرتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال جناب الطاف احمد اعظمی کی کتاب 'احیائے ملت اور دینی جماعتیں' میں متحدہ قومیت کی بحث ہے، پاکستانی ادیب و دانشور جناب ڈاکٹر سلیم احمد کو یہ کہنا پڑا کہ اقبال کی نظر میں قوم اور ملت کا فرق واضح نہیں تھا، قوم اور ملت کے فرق کو واضح طور پر سمجھے بغیر ہماری سیاسی، تہذیبی زندگی کے بہت سے مسائل حل نہیں ہو سکتے ہیں، اس کشمکش کی حالت میں امجد علی شاکر نے اہلِ پاکستان کو متوجہ کیا کہ اس علمی، فکری اور تہذیبی صورتِ حال میں ہمارا فرض ہے کہ علامہ (اقبال) کے دو قومی نظریے کا تجزیہ کیا جائے اور مولانا مدنیؒ کے متحدہ قومیت کے نظریے کو بھی دیکھا، سمجھا اور پرکھا جائے اور جہاں کہیں خیر موجود ہو اسے کھلے دل سے تسلیم کیا جائے۔ (مسئلہ متحدہ قومیت، ص ۱۴-۱۵، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۶ء)

پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر عمر حیات خاں غوری، جناب الطاف احمد اعظمی جیسے حضرات متحدہ قومیت کے حوالے سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا آزاد کو مطعون کرتے ہوئے قارئین کو غلط فہمی میں ڈال تو دیتے ہیں، لیکن اس کا جواب نہیں دیتے کہ مختلف مذاہب والے ملک میں کوئی ایک مذہب، تمام باشندگانِ ملک کی قومیت کی بنیاد کیسے بن پائے گا، یقیناً مذہب بھی امت و قوم کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے، مگر مختلف مذاہب والے باشندگانِ ملک کی قومیت کی بنیاد کوئی ایک مذہب یا بیک وقت تمام مذاہب کیسے بن

سکتے ہیں۔ کوئی ملک وجود میں آجانے کے بعد کیا مذہبی قومیت کے ساتھ وطنی حیثیت ایک قوم مثلاً ہندستانی ہونے میں کوئی تضاد ہے۔ سعودی عرب جیسے مسلم غلبے والے ملک میں وطنی حیثیت سے متحدہ قومیت کی بات بالکل بے معنی ہوگی۔ متحدہ قومیت کی ضرورت مشترک مفادات کے حصول اور قیامِ امن و یکجہتی کے لیے ہندستان جیسے ملک میں پڑتی ہے، یہ اقبال اور دوسرے حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں، چاہے ہندستانی قومیت کی بات ہو یا پاکستانی قومیت کی، وہاں تک جغرافیے اور مجرد تصورات کے درمیان ربط تلاش کیے بغیر رسائی نہیں ہوسکتی ہے، محض تصورات سے معاملات کی صورت گری نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر خالص اسلامی حکومت ہوگی تو غیر مسلم اقلیتوں کو اہلِ کتاب، مشابہ اہلِ کتاب اور ذمی قرار دے کر شریعت کے فراہم کردہ حقوق و اختیارات دے کر مسائل کا حل نکالا جائے گا، سیکولر جمہوری حکومتوں میں تو مختلف مذاہب کے باشندوں کی شناخت ملک و وطن کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے، پاکستان کے تناظر میں اقبال کے نظریے کی اہمیت سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔

جناب مولانا صلاح الدین احمد کا تجزیہ:

جناب مولانا صلاح الدین احمد علمی، ادبی حلقے کے لیے جانا پہچانا نام ہے، وہ کلاسیکی طرزِ بیان اور جدید رجحانات و فکر کے حسین امتزاج کے لیے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے فکر و تصور کے ضمن میں مختلف مواقع پر جو کچھ لکھا تھا، ان کے صاحبزادے معز الدین احمد نے 'تصورات اقبال' کے نام سے ۶۷-۱۹۶۶ء میں کتابی شکل میں شائع کرایا تھا۔ راقم سطور کے زیر مطالعہ کتاب کا ہندستانی ایڈیشن مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء رہا ہے۔ کتاب میں مولانا صلاح الدین احمد نے شیخ الاسلامؒ اور اقبال کے حوالے سے بھی بحث و گفتگو کی ہے۔ اقبال کے انتہائی عقیدت مند و مداح ہونے کے باوجود انھوں نے حضرت مدنیؒ سے متعلق اشعار میں جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کو اقبال کی عام روش سے الگ منفی اور محبوط قرار دیا ہے اور تحریر کا عنوان بجا طور سے 'فکر اقبال میں وطن و ملت کی کشمکش' رکھا ہے۔ ایک دوسری تحریر میں اقبال کے تصورِ قومیت و وطنیت میں مصنف کو اسلامی مملکت میں امت مسلمہ کی نظریاتی بنیاد تو اسلام کی شکل میں مل جاتی ہے، لیکن ایک جمہوری ملک میں غیر مسلم باشندوں کی معتدبہ تعداد کی بنیاد کو لے کر پریشان نظر آتے ہیں، تاہم بغیر نام لیے حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کے ہم مسلک اربابِ فکر و نظر کے موقف کی مدد سے پریشانی کا حل نکالتے ہیں، انھیں مولانا مودودی، اقبال اور مسلم لیگ کے اور کسی رہنما کی فکر و مسلک میں حل نظر نہیں آتا ہے، مولانا صلاح الدین احمد حضرت مدنیؒ اور وطنیت و قومیت سے متعلق دیگر اشعار نقل کرتے ہیں، اور عملی حالات اور مجرد آفاقی

تصورِ مملکت کے درمیان عملی ربط نکالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مفکرِ اسلام نے اپنے شاعرانہ الہامات کی موجودگی میں ایک وقفۂ قلیل کے لیے مسلمانانِ ہند کے لیے عملی سیاست کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تو انھیں شمال مغربی ہندستان نے ایک اسلامی حل کے قیام کی دعوت کی، یہاں میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ یہ دعوت جمرود سے لے کر راس کماری تک تمام اسلامیانِ ہند کے لیے تھی یا صرف انھیں اقطاع کے باشندوں کے لیے جو دریائے ہند سے لے کر دریائے جمنا تک آباد تھے، اور وہ خواب جسے ٹیپو سلطان نے بھی دیکھا تھا، اور عبدالحمید خاں ثانی نے بھی، جمال الدین افغانی نے بھی دیکھا اور خود مفکرِ اسلام علامہ اقبال نے بھی، کس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا، لیکن ایک بات بالکل صاف اور عیاں ہے، اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ملت اور مقاصدِ ملت کے امکاناتِ فروغ کے سلسلے میں جب شاعرِ مشرق نے جذبات سے افکار کی طرف انحراف کیا تو اسے مومن کی ترک تاز کے لیے اس جہاں کی وسعتیں اور قدر کے لیے جینے کے سفر کے لیے بحر امکان کی ناپیدا کناریاں بے کار اور بے معنی نظر آئیں، اور اس نے اپنے تاریخی خطبے میں مسلمانوں کو اس ملک کے شمال مغربی کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس وتشکیل کی دعوت دی۔ شاعر، آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں سے اُتر کر زمین کے ایک تنگ ٹکڑے کی حدود میں ملت اور اس کے مفاد کو محصور ومحدود کرنے پر نہ صرف آمادہ ہوگیا بلکہ اس میں اس کو اس کی نجات بھی نظر آئی۔

زمین آخر زمین ہے، اور ہمارے تخیل کی ہزار پروازیں اور ہماری آرزوؤں کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بنا سکتیں، اور حقیقت کی دُنیا میں ہمیں آسمان سے بہت زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے، تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو اور اللہ کی اس زمین پر اس کے فرمانبردار بندے متصرف ہو کر اسے اپنا وطن بنائیں، اور اس وطن کی حفاظت میں اگر ضرورت پڑے تو اپنی جانیں اور اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کردیں۔

اقبال نے جب ہمیں پاکستان کا تصور دیا تو بلاشبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کی رجعت ایک حقیقت پرستانہ رجعت تھی، ملت

اسلامیہ ہند کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی بحرِ بے پایاں یا کسی آسمان بے کراں کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے خطۂ زمین کی حاجت تھی جس میں سما کر یا سمٹ کر، پھیل کر یا بٹ کر، اسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی۔ خدا کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پوری ہوئی۔ یہاں اس بحث میں الجھنا بے سود ہوگا کہ ہم میں سے کتنے اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے، لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہو سکے ان کے لیے نجات و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے، جو مومن کی منزلِ مقصود ہے۔"

آگے مزید لکھتے ہیں:

"جہاں تک اس برِ اعظم کا تعلق ہے، قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا محاذ یکسر بدل چکا ہے، اب وطن اور ملت کے مفاد متضاد نہیں رہے، بلکہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور ایک کا فروغ دوسرے کی ترقی کا ضامن ہو چکا ہے، اس کے ساتھ ہم پر ایک نئی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی ہے اور وہ ہے ایک کروڑ غیر مسلم پاکستانیوں کی ذمہ داری۔

ظاہر ہے کہ قیامِ پاکستان میں ان کی کسی قسم کی آرزوؤں نے حصہ نہیں لیا بلکہ وہ خود بخود اس کے حصے میں آگئے ہیں۔ انھیں مفید شہری بنانے کے لیے اور ان کے اور اپنے درمیان بنیادی ہم آہنگی اور ہم مقصدی کے لیے لازم ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسا مشترکہ نصب العین ہو جس کے تقدس سے نہ انھیں مجالِ انکار ہو اور نہ ہمیں یارائے انحراف، ظاہر ہے کہ یہ نصب العین وطن پروری اور وطن دوستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

یہی نصب العین ان کی وفاداری کا ضامن اور مملکت کی سلامتی کا سہارا ہوگا اور اسی وجہ سے ملک کی اکثریت اور اقلیت ہاتھوں میں ہاتھ دیے آگے بڑھیں گی اور ملک کی فلاح و بہبود میں برابر کا حصہ لیں گی۔" (تصورات اقبال، ص ۳۲۳ تا ۳۲۶)

پہنچے وہیں:

دیکھیے کہ جس بات کو حضرت شیخ الاسلامؒ اور مولانا آزادؒ اور دیگر اکابر جمعیۃ پہلے دن کہہ چکے تھے،

ان کے ناقدین عملی حالات کا اتنے دنوں تک تجربہ وسامنا کرنے کے بعد پہنچے ہیں، اور وہ بھی اتنے بے محابا ہوکر کہ حضرت شیخ الاسلامؒ وغیرہ کی تحریروں اور بیانات میں تو اس کا اس حد تک اظہار بھی نہیں ہے، پاکستان جہاں غیر مسلم اقلیت کی تعداد اور پھیلاؤ، ہندستان کی مسلم اقلیت کی تعداد کے مقابلے عشر عشیر بھی نہیں ہے، اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے تو ملک کی آزادی سے پہلے غیر منقسم ہندستان میں حالات کا گہرا تجزیہ کرکے متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری جن کا حوالہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنی تحریر وبیان میں دیا ہے اور دیگر اکابر بھی متحدہ قومیت کا تصور پیش کر چکے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے صرف اسے مخصوص انداز میں شرعی شواہد ودلائل سے مدلل کرکے پیش کیا ہے، اور زد میں زیادہ اس لیے آگئے کہ متحدہ قومیت سے متعلق بیان اس وقت آیا جب کہ ملک میں مخصوص قسم کے گرم سیاسی حالات تھے، اور اس وجہ سے وہ معانی بھی نکالے گئے، جن کا بین السطور میں بھی نام ونشان نہیں ہے، اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی متحدہ قومیت اور اسلام اور بعد کے بیانات نے غلط معانی اور شرانگیز مطالب کے لیے کوئی گنجائش کی جگہ ہی نہیں چھوڑی ہے، اور حیرت کی بات ہے کہ آج کے دور اور ایسی صورت حال جس میں سیاسی جغرافیہ، سیاسی وحدت کا نشان بن چکا ہے اور جغرافیہ ہی سیاست اور قومیت کا تعین کر رہا ہے، بہت سے لوگ تحقیق وتنقید کے نام پر متحدہ قومیت کے حوالے سے حضرت شیخ الاسلامؒ اور مولانا آزادؒ کو ایک خاص انداز میں مطعون کرکے امت مسلمہ کی نظروں میں گرانا چاہتے ہیں۔

سوال کا جواب کہاں ہے؟

لیکن وہ مختلف مذاہب والے ملک کے باشندوں کے لیے ایسی مشترک بنیاد کی نشاندہی سے گریزاں وقاصر ہیں، جو ان کو مشترک مسائل ومفادات کے حصول میں جدوجہد کے لیے یکجا وآمادہ کرے، حالاں کہ اس کی ضرورت مسلمانوں سمیت باشندگانِ ملک کے لیے آج بھی جوں کی توں باقی ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے عملی مشکلات ومسائل کا حل نہیں نکل سکتا ہے کہ مولانا آزادؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں جس طرح شرعی دلائل سے استدلال کیا ہے، وہ تفسیر بالرائے اور جسارت کے زمرے میں آتا ہے، نیز مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ہندو مسلم اتحاد کے ثبوت میں جو تاریخی دلیل دی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ (دیکھیں احیائے ملت اور دینی جماعتیں، ص ۳۷، از الطاف احمد اعظمی، مطبوعہ ادارہ تحقیقات واشاعت علوم القرآن، علی گڑھ، زیر اہتمام راحت محمود چودھری، سنہ اشاعت ندارد، لیکن مصنف کے مقدمہ کے اختتام پر ۲۱ دسمبر ۱۹۹۸ء تحریر ہے۔)

اعظمی نے لگے ہاتھوں یہ شعر بھی ان دونوں بزرگوں پر چسپاں کر دیا کہ:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

جب کہ ناقدینِ شیخ الاسلامؒ و امام الہندؒ، پاکستان تک میں سجدہ سہو کر کے اور حالات کے مدنظر اپنی نمازیں درست کر رہے ہیں، جیسا کہ ماقبل میں حوالہ دیا جا چکا ہے، ہندستان میں یہ آزادی کے بہت دنوں اقبال کے اشعار نقل کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ "یہ واقعہ ہے کہ اگر مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ اقبال اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہم موجود نہ ہوتے تو مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے علماء ملت اسلامیہ ہندیہ کو متحدہ قومیت کے قومی دھارے میں غرق کر چکے ہوتے، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ ہندستان میں مسلمان کی انفرادیت باقی رہ گئی ہے۔" (معرکۂ وطنیت، از پروفیسر عمر حیات خاں غوری پر مولانا سیّد احمد عروج قادری کا پیش لفظ، ص ۲، مطبوعہ مکتبہ نشانِ راہ، دہلی، سنہ اشاعت ندارد البتہ پیش لفظ کے آخر میں اگست ۱۹۸ تحریر ہے)

اُس کا چرچا ہے جس کا فسانے میں ذکر نہیں:

یہ کتاب مسلسل شائع ہو رہی ہے اور مرکزی مکتبہ اسلامی ہند سے فراہم و دستیاب ہے۔ اگر یہ حضرات ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ غیر جانب داری سے کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ہندستانی مسلمانوں کی انفرادیت کو باقی رکھنے میں جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شیخ الاسلامؒ جیسے اس کے اکابر کی جد و جہد کا اہم ترین رول ہے، انھوں نے کب لکھا اور کہا کہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ اکثریت کے دھارے میں خود کو غرق کر دیں۔ مولانا مدنیؒ تو 'متحدہ قومیت اور اسلام' میں بار بار ہندستانی مسلمانوں کو ان کے مذہبی فریضہ دعوت و تبلیغ کی یاد کراتے ہوئے اپنی مذہبی شناخت اور انفرادیت کی حفاظت کی تلقین کرتے ہیں، چاہے مولانا اشرف علی تھانویؒ ہوں یا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ یا پھر مولانا مودودی و علامہ اقبال یا دیگر علما و اربابِ علم، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا ادریس کاندھلویؒ اور مولانا ظفر عثمانی وغیرہم، یہ سب مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست سے متاثر تھے۔ ان سب حضرات کے پیشِ نظر صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تھی کہ اس کی قبولیت و شناخت کی بنیاد کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں اسلام اور کلمہ جامعہ بنیاد ہوتی ہے، اس کا شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے انکار نہیں کیا ہے، اس کو انھوں نے دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں قبولِ اسلام کے آئندہ مرحلے میں رکھا ہے، سر دست حضرت مدنیؒ کے پیشِ نظر صرف امت مسلمہ نہیں بلکہ اس ملک کے تمام مختلف مذاہب و عقائد والے سارے باشندگانِ ملک تھے۔ اس ابتدائی مرحلے میں کوئی ایک مذہب یا تمام مذاہب قومیت کی بنیاد نہیں بن

سکتے تھے، کیوں کہ مشترک بنیاد متفق علیہ چیز ہی بن سکتی ہے اور یہ ملک و وطن ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی ایک مذہب چاہے وہ اسلام ہی کیوں نہ ہو پورے ملک کے باشندوں کے لیے متفقہ بنیاد نہیں بن سکتا ہے، مسئلے کی یہی نوعیت تھی جس کی وجہ سے حضرت شیخ الاسلامؒ نے بحیثیت وطن تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دے کر مختلف مذاہب اور فرقے والوں میں اتحاد کی صورت نکالی تھی، اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبال اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر مؤقر علماء و اہلِ دانش کی بات مسلمانوں کے تعلق سے بنائے قومیت کے سلسلے میں غلط نہیں ہے۔ غلطی صرف یہ ہے کہ ایک جغرافیائی خطۂ زمین کے تمام باشندوں کے دائرۂ اسلام میں آ جانے اور ایک اسلامی مملکت کی تشکیل و ترکیب کے بعد کے معاملے کو وہ پہلے مرحلے میں اور ایک امت مسلمہ کے معاملے کو تمام باشندگانِ ملک کا معاملہ سمجھ کر بحث کر رہے تھے، جب کہ کسی مسلم اقلیت والے یا جمہوری ملک میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ جس جمہوری و سیکولر ملک میں مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ رہ کر زندگی گزارتے رہے اور ان کے مشترکہ ذرائع و وسائل سے فیض یاب بھی ہوتے رہے اس میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، اقبال و مولانا مودودی کا نام لے کر حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کے ہم خیال علماء پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ وہ اکثریت کے قومی دھارے میں ہندستانی مسلمانوں کو غرق کرنے پر آمادہ تھے۔ یہ حضرات دوسروں پر اکابر اور شخصیت پرستی اور عصبیتِ جاہلیہ کا الزام لگاتے ہیں، لیکن خود ایک بدگمانی کا شکار ہو کر ان بیماریوں کو گلے لگائے نظر آتے ہیں، جب کہ انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے پاکستانی پاسپورٹ کی قومیت کے خانے میں اسلام کے بجائے پاکستانی لکھا جانا شروع ہو گیا تھا، اور آج تک یہی لکھا جا رہا ہے، ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال پر مولانا سیّد احمد عروج قادری، پروفیسر عمر حیات خاں غوری اور حکیم الطاف احمد اعظمی نے غالباً غور ہی نہیں کیا۔ اس سوال کا جواب جناب مولانا صلاح الدین احمد اور دیگر پاکستانی دانشوروں کی تحریروں و بیانوں میں موجود ہے۔ محض مجرد و تصوراتی باتیں کرنا آسان ہے، لیکن عملی حل اور سامنے کے سوال کا جواب فراہم کرنا ایک مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ ہندو پاک کے جماعت اسلامی کے دانشوروں اور اقبال کے فلسفہ قومیت پر تحریر و بیان کا دریا بہا دینے والوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نظر نہیں آتا ہے کہ اگر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا آزادؒ کے اختیار کردہ موقف کے مطابق ہندستانی مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ متحدہ قومیت کو تشکیل نہ دے سکتے تو آزاد ہندستان میں ہندستانی مسلمانوں کی قومیت کیا ہوتی اور اب کیا ہوگی۔ جناب الطاف احمد اور عمر حیات خاں غوری جیسے حضرات سے ہمارا یہ سوال ہے کہ آپ کی آج کی تاریخ میں قومیت کی کیا بنا ہے، وطنیت یا اسلام؟ آپ کے پاسپورٹ کی قومیت کے خانے میں کیا تحریر ہے، اس کی بنا وطن ہے یا دین؟ اگر قومیت کی بنا وطن ہے تو اسے آپ نے مسترد

کیوں نہیں کیا۔ اس جمہوری، سیکولر نظام کے تحت قائم اداروں میں سروس کا کیا جواز ہے؟ آئین ہند میں تو آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کے موقف و نظریے کے مطابق ہندستانی شہریوں خصوصاً اقلیتوں کے بنیادی حقوق شامل کیے گئے ہیں، جن کا فائدہ وہ بھی اُٹھا رہے ہیں جو موجودہ نظامِ حکومت کو طاغوت قرار دیتے ہیں۔

تصور اور حقیقت کا فرق:

بات اصل یہ ہے کہ قومیت کے نظریے کے معاملے میں اقبال اور مودودی کے نظریۂ قومیت کے ساتھ چلنے والوں کی بات مجرد تصورات اور رومانیت سے عملی شکل اختیار نہیں کر پاتی ہے، اور لوگوں کو مشکل اور سوال میں ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فکری پرداز کبھی کبھار ذہنی تسکین کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن انسان تو زمین پر ہی رہتا ہے، اسے تو مسئلے کا حل اور ٹھکانا چاہیے، اس کے بغیر وہ زندگی نہیں گزار سکتا ہے، حضرت شیخ الاسلامؒ اور مولانا آزادؒ کا موقف ہمارے سامنے عملی حل پیش کرتا ہے، جب کہ اقبال و مودودی کا شاہین زمین پر اُترنے کے لیے آمادہ نہیں ہے، اس سلسلے میں اقبال کی گفتگوؤں اور ملاقاتوں پر مشتمل سید نذیر نیازی کی کتاب 'اقبال کے حضور' میں مرتضیٰ خاں میکش اور علامہ اقبال کا مکالمہ بہت کچھ بلکہ زیر گفتگو کے سب کچھ کو عیاں و بیاں کر دیتا ہے۔

سید نذیر نیازی چشم دید گواہ اور ناقل ہیں:

میکش صاحب کہنے لگے: "آپ تو قوم کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے، آپ کے نزدیک حقیقی وجود ملت کا ہے۔"

ارشاد ہوا: "میں وطنی قومیت کا وجود تسلیم نہیں کرتا، وطنی قومیت کا تصور اسلام کے خلاف ہے۔"

میکش صاحب نے کہا: "اگر یہ صحیح ہے تو اسلام کا مطالبہ بڑا سخت ہے۔"

فرمایا: "اس کے سخت ہونے میں کلام نہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسلام کا مطالبہ بہر حال یہی ہے۔"

(اقبال کے حضور، ص ۲۲۳، از سید نذیر نیازی، مطبوعہ اقبال اکاڈمی حکومت پاکستان، وزارتِ ثقافت، لاہور پاکستان، طبع چہارم، ۲۰۰۷ء)

اس تناظر میں پاکستانی ادیب اور محقق و ناقد جناب سلیم احمد کا کہنا بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ اقبال کا شاہین زمین پر نہیں اُترتا، لیکن انسان زمین پر رہتا ہے، اور اس کی حیات عارضی ایک مدتِ معینہ تک زمین سے وابستہ ہے، جنت میں انسان کی زندگی جو کچھ بھی ہو لیکن اس کی معیاری حیاتِ ارضی کا یہی معنی ہے، پھر زمین سے عدم وابستگی اقبال کے یہاں ایک معنی رکھتی ہے؟ (اقبال - ایک شاعر، ص ۱۱۶، مطبوعہ کتاب گھر لاہور، ۱۹۷۸ء)

نقوشِ اقبال کا حوالہ:

اس اہم مسئلے سے متعلق بجا طور سے ہم جیسے طالب علموں کو امید تھی کہ مولانا علی میاں ندویؒ اپنی کتاب 'روائع اقبال' (عربی) یا اس کے اُردو ترجمہ 'نقوشِ اقبال' میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، اقبال اور مولانا مودودی و دیگر متحدہ قومیت کے مخالف و موافق اہلِ علم کے مباحث کے تناظر میں کوئی ایسی رہنمائی دیں گے جس سے ایک طالب علم، عملی حالت اور تصوراتی و نظریاتی حوالے میں انطباق پیدا کر سکے، البتہ 'نقوشِ اقبال' کے ترجمہ نگار مولانا شمس تبریز خاں صاحب نے مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں (ظاہر ہے اجازت سے) 'اقبال اور قومیت و وطنیت' کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ کیا ہے، لیکن اس میں بھی عملی حالات میں پیدا ہونے والے سوال اور مسئلہ کا حل پیش نہیں کیا گیا ہے، امتِ مسلمہ کی اسلامی عقائد و تعلیمات کے حوالے سے آفاقی حیثیت ایک بالکل حقیقت اور غیر اختلافی امر ہے، لیکن آدمی جہاں رہتا ہے، وہاں کی ایک حد، سیما ہوتی ہے، اس کے دائرے میں وہ دوسرے مذاہب و عقائد والوں کے ساتھ کیا طریقۂ عمل اختیار کرے۔ 'نقوشِ اقبال' میں یہ تو کہا گیا ہے کہ قومیت و وطنیت کے معاملے میں اقبال کا ذہن شروع ہی سے صاف تھا کہ اسلام قومیت و وطنیت کا قائل نہیں، ملتِ اسلامیہ اپنے ایمان و عقیدہ اور نظامِ حیات کی وجہ سے زمان و مکان کے حدود و قیود سے بہت بلند ہے۔'' (نقوشِ اقبال، ص ۲۰۰-۲۰۲، مطبوعہ مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، چھٹا ایڈیشن) لیکن کیا حقیقت کی دُنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ کلمہ طیبہ جامعہ کی بنیاد ایک اہلِ ایمان کا دوسرے اہلِ ایمان سے تعلق کی نوعیت یقیناً آفاقی ہے، اور زمان و مکان سے بلند ہے، یعنی زمانہ و جگہ کا محتاج نہیں ہے، ایک کی تکلیف و راحت، دوسرے کی تکلیف ہوگی، اس کی اسلامی شریعت نے واضح طور سے نشاندہی کی ہے، لیکن تصور اور آئیڈیا، جب بھی حقیقت کا روپ دھارے گی تو وہ جغرافیائی ارضی حد میں بھی متشکل ہوگی، اگر جغرافیائی وارضی حد میں رہنے والے سب کے سب امتِ مسلمہ، ملتِ اسلامیہ سے متعلق ہوں گے تو وہاں وطنی بنیاد پر متحدہ قومیت کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، یا مختلف مذاہب والوں کی مشترک آبادی ہے تو وطنی بنیاد کے سوا مشترک مفادات کے حصول کا ذریعہ متحدہ قومیت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ جب کہ اقبال بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جغرافیائی اصطلاح کے طور پر وطن کا تصور اسلام سے متصادم نہیں ہے، جیسا کہ روزنامہ 'احسان' اور 'اقبال کے نثری افکار' سے بہ حوالہ راقم سطور ماقبل میں نقل کر چکا ہے۔ 'نقوشِ اقبال' میں یہ بلا حوالہ نقل کیا گیا ہے۔ حضرت سید احمد و مولانا شاہ اسماعیل شہیدین کی تحریک کے تناظر میں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں ملتِ اسلامیہ کا موقف و رویہ کیا ہونا چاہیے، آئیڈیل اور مملکت اور تصور و حقیقت کے متعلق دوری

ہونے کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں کے امتزاج سے عملی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ ملتِ اسلامیہ کی آبادی والی مثالی مملکت میں حضرت شیخ الاسلامؒ کا تصورِ متحدہ قومیت بحث سے قطعی خارج ہے، ان کے تصور متحدہ قومیت کا تعلق مختلف مذاہب والے ملک سے ہے، اور جہاں تک اس مغربی ویورپی سیاسی تصورِ قومیت ووطنیت کا تعلق ہے، جس میں زمین ہی انسان کا آخر حوالہ اور بنیاد ہو، اور وطن کی نسبت تمام اقدار اور دینی عقائد پر فائق ہوجائے تو حضرت مدنیؒ، علامہ اقبال سے کسی درجے میں بھی کم مخالف نہیں ہیں۔

دلیل کس کے ساتھ ہے؟

البتہ اس میں دونوں الگ الگ موقف رکھتے ہیں کہ کسی میثاق کی بنیاد پر ملی جلی آبادی والے ملک، جیسا کہ ہندستان ہے، کے غیر مسلموں کے ساتھ ایک متحدہ قومیت تشکیل کر سکتے ہیں یا نہیں، حضرت شیخ الاسلامؒ کا جواب اثبات میں ہے، جب کہ علامہ اقبال کا جواب نفی میں ہے کہ ان کے نزدیک (جیسا کہ 'نقوشِ اقبال' میں بھی درج ہے) اسلام وطنیت وقومیت کا قائل ہی نہیں ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کتاب وسنت اور اسلامی فقہ سے کس کے موقف کی تائید وتثبیت ہوتی ہے اور کس کا موقف ثابت نہیں ہوتا ہے اور دعویٰ بلا دلیل رہ جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا یہ دعویٰ کہ اسلام قومیت ووطنیت کا قائل نہیں ہے، ثبوت طلب ہے، یقیناً اسلام میں نفرت وجارحیت یعنی مغربی یورپی سیاسی نظریۂ قومیت ووطنیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، لیکن اس نے قوم ووطن کی نہ تو تردید وتغلیط کی ہے، نہ اس کے وجود سے انکار کیا ہے۔ قوم، برادری، وطن کا وجود ایک حقیقت ہے، اگر اس میں تعصب اور غلط حمایت اور جانب داری کا جذبہ شامل نہ کیا جائے۔ قوم ووطن اتنی مبغوض چیز نہیں ہے، جتنا کہ بتانے دکھانے کی غیر ضروری طور سے کوشش کی جاتی ہے، مگر یہ طے ہے کہ امتِ مسلمہ کا وجود کلمہ جامعہ پر مبنی ہے، اگر اس کی جگہ اور وطن بدل جائے یا ہجرت یا نقلِ مکانی کرلے تو اس کے افراد کی مسلمانی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور اسلامی امت ہونے کے ناتے اس کے افراد اسلامی عقیدہ ونظریہ کے رشتے سے وابستہ رہیں گے جسے ملک اور وطن ختم نہیں کر سکتے کہ دونوں میں تضاد وتصادم نہیں ہے، تاہم یہ رشتہ، وطنی حیثیت سے قائم قومیت کو تمام افراد کے ایک عقیدہ کی وابستگی سے قبل ختم نہیں کر دیتا ہے۔ البتہ جہاں وہ رہائش پذیر ہوں گے وہ وطن بھی ہوگا، اور وہ جس قوم، برادری میں پیدا ہوئے ہیں وہ اس سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ یہ مناسب جگہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے موقف کو نقل کردیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں یہ سمجھا جاسکے کہ متحدہ قومیت کے معاملے میں وہ کہاں اور کس حد تک جانا چاہتے تھے، اور ناقدین کے نکات کیا ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے تصورِ متحدہ قومیت کے متعلق موقف ومراد کے تناظر میں کہتے ہیں:

''ہماری مراد قومیتِ متحدہ سے اس جگہ وہی قومیتِ متحدہ ہے جس کی بنیاد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ میں ڈالی تھی، یعنی ہندستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندستانی ایک قوم ہو جائیں اور اس پر ایسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتے ہوئے سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں، اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ تمام ہندستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد رہیں، اپنے مذہبی رسم و رواج، مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے اپنے پرسنل لاء اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں، نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کر لے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اعلان کانگریس ہمیشہ کر رہی ہے۔'' (متحدہ قومیت اور اسلام، بہ عنوان متحدہ قومیت کے مجوزہ معنی، ص ۳۷-۳۸)

اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسِ عام (منعقدہ جون پور، ۷-۸-۹ رجون ۱۹۴۰ء) کے خطبۂ صدارت کے ایک اقتباس سے بھی متحدہ قومیت سے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ کی مراد و منشا ظاہر ہو جاتی ہے۔ خطبۂ صدارت میں کہا گیا ہے:

''ہم باشندگانِ ہندستان بحیثیت قوم ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں جو کہ اختلافِ مذاہب اور اختلافِ تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلاف، ذاتوں اور صفتوں کے تبائن، رنگوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترک انسانیت میں فرق نہیں آتا، اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات، ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندستانی ہیں، اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے ازالہ کی فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح ملتوں دیگر اور غیر مسلم قوموں کا، اس لیے سب کو مل کر پوری کوشش کرنی ازبس ضروری ہے،

اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے، تو گاؤں برباد ہو جائے گا، اور سب ہی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی۔ اسی طرح ملک کے ایک ایک باشندے کا فرض ہے کہ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ سب پر جب کوئی عام مصیبت گھر جائے تو مشترک قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں۔

اس اشتراکِ وطنی کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رُکاوٹ یا کمزوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر ایسے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں، اس کے دوسرے معانی جو لوگ سمجھ رہے ہیں، وہ غلط ہیں اور ناجائز ہیں۔

اس معنی میں فنڈامینٹل میں ہر مذہب اور ہر تہذیب اور ہر زبان اور رسم ورواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے۔ دھوکہ نہ کھانا چاہیے، اور بیوقوفوں کی بات پر نہ جانا چاہیے۔ اس کے خلاف یورپین لوگ متحدہ قومیت کے جو معنی مراد لیتے ہیں اور جو کانگریسی اشخاص، انفرادی طور پر کانگریس کے فنڈامینٹل (رائٹس) کے مفہوم کے مخالف معانی بیان کرتے ہیں، ان سے جمعیۃ علماء بیزار اور تبریٰ کرتی ہے۔“

حضرت شیخ الاسلامؒ کے بیان کردہ مراد وموقف میں کوئی اخفاء وابہام نہیں ہے۔ کانگریسی کا حوالہ دینے پر مولانا مودودیؒ نے جو اعتراض کیا تھا، اس کا ازالہ بھی اس سے پوری طرح ہو جاتا ہے۔

ایک بہتان کی تردید:

حضرت شیخ الاسلامؒ کی وضاحت کے بعد ان کے موقف ومراد کے برعکس کسی کے لیے شرعاً، اخلاقاً ودیناً جائز نہیں ہے کہ کوئی معنی ومراد لے کر ان کو مطعون کرے، اور ان کی طرف سے خلق خدا کو بدظنی اور مغالطے میں مبتلا کرے۔ حضرت مدنیؒ کے پورے بیان اور تحریر میں کوئی ایسی بات اشارتاً والتزامی طور سے نہیں پائی جاتی ہے کہ اس کی بنیاد پر یہ بھیانک الزام ان پر عائد کیا جائے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا نظریہ باطن قادیانی افکار کا تتبع ہے، علمائے دیوبند سمیت حضرت مدنیؒ قادیانیت کے کتنے شدید مخالف رہے ہیں، یہ بتانے کی

ضرورت نہیں ہے۔

باربراڈیمٹکاف کا تجزیہ:

اس سلسلے میں باربراڈی مٹکاف نے بہت معتدل اور سنجیدہ تجزیہ کیا ہے، جس میں الزام کی تردید کے ساتھ بھرپور جواب ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال اپنے بیان کو ختم کرتے ہوئے باہمی اختلاف سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں اور اپنی نظم میں موجود توہین سے آگے نکل گئے۔ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نظریات کو ایک جدید مذہبی گروہ احمدی (قادیانی) کے نظریات سے مماثل ٹھہرایا۔ احمدیوں (قادیانیوں) کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کے انکار کا ملزم (مجرم) ٹھہرایا جاتا ہے، اقبال نے لکھا ہے کہ نیشنلزم کا عقیدہ سیاسی ہے اور عقیدۂ ختم نبوت الٰہیاتی، لیکن انھوں نے استدلال کیا کہ دونوں مستقل اور دائمی اسلامی مقدس قانون پر اضافہ ہیں، مولانا مدنی جو احمدیوں (قادیانیوں) کی سخت مخالفت میں ایک طاقتور آواز تھے، پر یہ ایک کم تر سطح کا الزام تھا، گویا شاعر اور مولانا میں ایک خلیج حائل تھی۔

باربرا مزید آگے لکھتی ہیں:

علامہ اقبال اور مولانا مدنی نے نیشنلزم کی سیاسیات پر اختلاف نہ کیا، جیسا کہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک مذہب پر اصرار کر رہا تھا، اور دوسرا علاقے پر زور دے رہا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ علامہ اقبال رومانوی اور غیر حقیقی انداز میں بیسویں صدی میں ایک ایسی دنیا کے تصور کی کوشش کر رہے تھے جس میں کوئی قومیت نہ ہو اور مولانا مدنیؒ ایک جیسا تصور اسلام نہیں رکھتے تھے۔ (دیکھیں Husain Ahmed Madani، از باربراڈی مٹکاف، ص ۱۱۲ تا ۱۱۸، نیز مقدمہ متحدہ قومیت اور اسلام کے انگریزی ترجمہ)

دو پاکستانی دانشور کے نقاطِ نظر میں اختلاف اور اس کا تجزیہ:

اس تناظر میں پروفیسر فتح محمد ملک نے ماقبل میں سلیم احمد کے تبصرے اور سوال پر تنقید کرتے ہوئے مسئلہ قومیت پر جس طرح اقبال کی حمایت اور حضرت مدنیؒ کی مخالفت کی ہے، واقعہ سے زیادہ اپنے مزعومہ خیال پر مبنی ہے اور آگے چل کر تضاد کا شکار ہونے کے ساتھ لڑکھڑا بھی پڑتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال جہاں ایک خاص انداز کی قوم پرستی کے مخالف ہیں، وہیں ایک دوسری طرز کی قومیت کے داعی ہیں، وہ ہندستانی قوم پرستی کے اس نظریے کے زبردست مخالف تھے، انڈین نیشنل کانگریس جس کی علمبردار تھی اور مولانا مدنیؒ جس کی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے۔ اقبال متحدہ ہندستانی قومیت کے نظریے کو، ہندی مسلمانوں کی اجتماعی ہستی کے لیے، زہر قاتل

اور اسلام کے آفاقی نصب العین کے، منافی سمجھتے تھے اور اس کے توڑ میں، انھوں نے جداگانہ مسلمان قومیت کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال نے جہاں ہندستانی نیشنلزم کی تردید اور نفی کی ہے وہاں وہ مسلم نیشنلزم کے علمبردار بھی ہیں، جو شخص، قومیت کے جدید ترین تصورات کی روشنی میں، ہندی مسلمانوں کو ہندستان کے دوسرے باشندوں سے الگ قوم قرار دیتا ہو اور قوموں کے حق خود اختیاری کے اصول پر ہندی مسلمانوں کے لیے الگ خطہ زمین کے حصول کی جدوجہد کا نظریہ ساز بھی ہو، ایک باعمل سپاہی بھی اس قومیت کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے۔" (اقبال۔فکر وعمل، ص ۵۹، مطبوعہ بزم اقبال لاہور، جون ۱۹۵۸ء، طبع اوّل)

لیکن فتح محمد ملک نے حضرت مدنیؒ پر تنقید کرتے ہوئے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، اور نہ ہی حضرت مدنیؒ کی طرح اپنے دعویٰ پر کتاب وسنت اور فقہ اسلامی سے کوئی دلیل پیش کی ہے، نیز جواہر لعل نہرو کے سوالات کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اور فتح محمد ملک نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے دعویٰ ودلیل کے حق میں جاتی ہے، نہ کہ دو قومی نظریہ اور اقبال کے مبینہ نظریے کے حق میں۔

اقبال نہرو کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگر قومیت کے معنی حب الوطنی یا ناموسِ وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں تو اسلام اس کے خلاف نہیں ہے، قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے، اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول کا دعویٰ کرتی ہے، اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلامی شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ قومیت کا مسئلہ، مسلمانوں کے لیے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کو مٹا دیں، جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام اور قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیوں کہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں، جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں، مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حقیقت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی اور دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہوں گی۔" (حرف اقبال، ص ۱۷۳)

اس کی تشریح پروفیسر ملک یوں کرتے ہیں:

> "گویا اقبال ناموسِ وطن پر کٹ مرنے کو برحق سمجھتے ہیں، مگر وطن کو اتحادِ انسانی کی اساس ماننے سے انکاری ہیں، بے شک ان کے نزدیک انسانی اتحاد کی پائیداری

کی بنیاد، وطنی اشتراک کی بجائے نظریات وعقائد کی ہم آہنگی ہے، مگر وہ جب وطن کو جزوِ ایمان مانتے ہیں، جہاں وطن سے محبت اور عقائد سے وفا میں کوئی تصادم نہ ہو، وہاں اسلام اور وطنی قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔" (اقبال۔فکر وعمل،ص ۶۱)

اس تمام تشریح میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے اختیار کردہ موقف پر سرے سے کوئی زد ہی نہیں پڑتی ہے۔ ان کے کسی لفظ سے تو کیا اس میں اشارہ تک نہیں ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کو مٹا دیں، اور اسلام، حیات بخش عنصر کی حیثیت سے قومی زندگی میں باقی نہ رہے یا اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے، حضرت شیخ الاسلامؒ مغربی تصورِ قومیت اور کانگریس کے لوگوں کے انفرادی آراء کی تردید اور عدم اتفاق کرتے ہیں، اس کے علاوہ اقبال بھی اس کا اقرار واعتراف کرتے ہیں کہ متحدہ قومیت کا مسئلہ مسلم اقلیت والے ممالک میں پیدا ہوگا۔ مزید یہ کہ پروفیسر ملک صاحب نے بھی اس کا جواب نہیں دیا کہ کسی ایک مذہب وعقیدہ والے گروہ کے نظریات وعقائد پورے ملک کے مختلف مذاہب وعقائد والے باشندوں کی قومیت کی بنیاد کیسے بن پائیں گے، جب کہ اس سوال کا جواب حضرت شیخ الاسلامؒ کی تحریرات وبیانات سے مل جاتا ہے۔

تصورِ قومیت کا قوموں کے نشو ونما میں رول:

علامہ اقبال بذاتِ خود یہ مانتے ہیں کہ تصورِ قومیت قوموں کی نشو ونما میں ایک صحت مند عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ (دیکھیں شذراتِ اقبال، ص ۱۳۴، مرتب جسٹس جاوید اقبال، ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۳ء)

اس سلسلے کی ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے ناقدین اور اقبال، کانگریس کے قومی نظریے اور اپنے مفروضہ ومزعومہ مفہوم کہ متحدہ قومیت اختیار کرنے سے مسلم امت کا وجود مٹ جائے گا، کو لے کر بڑی طول طویل بحث وگفتگو کرتے ہیں۔

میثاقِ مدینہ کا حوالہ اور اس پر بحث:

لیکن انھوں نے میثاقِ مدینہ کا جو حوالہ اپنے موقف کی تائید وتوثیق میں دیا ہے اس کو پروفیسر فتح محمد ملک جیسے حضرات نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں، البتہ مولانا مودودیؒ، جناب الطاف احمد اعظمی اور ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی وغیرہم نے میثاقِ مدینہ کا حوالہ دینے پر حضرت شیخ الاسلامؒ پر تنقید وتبصرہ کیا ہے کہ ان کا دعویٰ کسی بھی طرح سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فہد نے تو تحریک دیوبند کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ایک خامی اور کمزوری یہ بھی تحریر کی ہے کہ اس سے متحدہ قومیت کا فتنہ اُبھرا ہے۔ (دیکھیں تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے

تناظر میں، ص ۲۲۹، مطبوعہ ہندستانی پبلی کیشنز دہلی، اشاعت اوّل ۱۹۸۴ء)

اس کے علاوہ انھوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ کے مقابل حضرت تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو کر کے اُن کی اس لیے تعریف و تحسین کی ہے کہ وہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دیگر علماء سے زبردست اختلاف کے خلاف ڈٹ کر کھڑے رہے اور دیوبند کے حلقہ میں متحدہ قومیت کے سامنے بولتے اور لکھتے رہے۔ (کتاب مذکورہ، ص ۲۸۷-۲۸۸)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تقریروں و تحریروں میں اصل سوال کا جواب نہیں ہے، اور ایک خاص مرحلے میں میثاقِ مدینہ میں جس طرح انصار و مہاجرین اور عرب اور یہود وغیرہ کو ایک امت و قوم قرار دے کر باہمی اتحاد و اشتراک، چاہے جس درجے میں ہو، قائم کیا گیا ہے، اس سے دوسرے مذاہب کے ساتھ مشترک امور میں جدوجہد کا اثبات و اظہار ہوتا ہے اور وطن، یثرب کی حفاظت کے لیے مشترکہ دشمن سے مقابلہ کے لیے باہمی عہد کی بات سامنے آتی ہے، یہاں اسلامی نظریہ وعقیدہ کے تحفظ کے بجائے یثرت کی حفاظت زیادہ نمایاں ہے اور یہودیوں کو اسلامی عقیدہ و نظریہ کے تحفظ سے کیا سروکار ہو سکتا تھا، ان کو وطن اور علاقے کے مشترک امور کے سلسلے میں ہی میثاق میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ مسئلے کا یہ پہلو اس قدر واضح ہے کہ اس پر کمزور تاویل سے پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے 'یہودیت و نصرانیت' نامی کتاب میں میثاقِ مدینہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے نقل کیا ہے، لیکن نہ تو اس کو پورا نقل کیا ہے اور نہ ہی اس کی ان ضروری بنیادی دفعات کو ہی نقل کیا ہے، جن پر مولانا مدنیؒ کے موقف و دعوئی کی بنیاد ہے۔ مستدل دفعات کو نظر انداز کر دینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے نظریے کے خلاف جاتی ہیں، تاہم مودودیؒ نے میثاقِ مدینہ کا جتنا بھی حصہ نقل کیا ہے، اس میں عقائد و نظریات کے بجائے مشترک طور پر یثرت کی حفاظت کا معاملہ ہی معاہدہ کا حصہ ہے، ان کے نقل کردہ حصے کی قابلِ توجہ دو دفعہ یہ ہیں:

(۱) جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کے مصارف اُٹھائیں گے اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء پر یثرب میں کسی نوعیت کا فتنہ و فساد کرنا حرام ہے۔

(۲) اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکاء ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(یہودیت و نصرانیت، ص ۲۵۶، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، جنوری ۲۰۱۱ء)

یہ میثاقِ مدینہ کا متن مولانا مودودیؒ نے تاریخ ابن ہشام سے نقل کیا ہے اور یہ درمیانی سائز کے صرف نصف صفحے میں ہے، جب کہ ہمارے پاس ابن ہشام مطبوعہ قاہرہ کا جو ایڈیشن ہے باریک خط میں یہ معاہدہ ڈھائی صفحات میں آیا ہے۔ انھوں نے تقریباً پون صفحہ چھوڑ کر آخر سے اوپر کا ایک مختصر سا حصہ نقل کر دیا ہے، اور بالکل شروع

ی میں جہاں معاہدے میں شامل تمام شرکاء کو لمۃ واحدۃ من دون الناس کے تحت ایک امت قرار دیا ہے اسے ترک کر دیا گیا ہے۔ (دیکھیں سیرۃ النبویہ المعروف بہ سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص ۳۶۸، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، ۲۰۰۶ء، محقق نسخہ)

میثاق مدینہ کے سلسلے میں سب سے زوردار بہتر تحقیق مرحوم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے 'الوثائق السیاسۃ' میں کی ہے، اس عربی کتاب کا اُردو ترجمہ بھی پاکستان سے شائع ہو گیا ہے، گرچہ یہ سطور تحریر کیے جانے کے وقت کتاب میرے سامنے نہیں ہے، تاہم وہ ہمارے مطالعے میں آ چکی ہے، البتہ مرحوم ڈاکٹر حمید اللہ کی دیگر جو چار کتابیں خاکسار کے ذخیرۂ کتب میں ہیں، ان میں بھی معاہدہ پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے ہوئے اس کی تقریباً ۵۳ دفعات کو نقل کیا ہے۔ (دیکھیں محمد الرسول اللہ، ص ۹۷ تا ۱۰۵، مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۳ء، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی و جانشینی، ص ۶۰ تا ۶۵، مطبوعہ ملی ٹائمز دہلی)

ڈاکٹر حمید اللہ نے میثاق مدینہ کے تعلق سے اس کے مسلم غیر مسلم شامل فریقوں کے سلسلے میں جو اہم نکات دکھائے ہیں ان سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی حیات میں حضرت مولانا مدنیؒ کی 'متحدہ قومیت اور اسلام' شائع نہیں ہوئی تھی، البتہ مولانا مودودیؒ نے اس کا مطالعہ کر کے اس پر تبصرہ بھی کیا تھا، یہ تنقیدی تبصرہ ان کی کتاب 'مسئلہ قومیت' (صفحہ ۷۷ سے صفحہ ۱۰۸ تک) میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت مدنیؒ کے موقف کی تردید کرتے ہوئے میثاق مدینہ کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے، لیکن ایمانداری اور دیانت داری کی بات تو یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے حضرت مدنیؒ کے موقف اور اس کی تعبیرات وتشریحات کے مدنظر دلائل سے تردید وتغلیط نہیں کی ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اخبار واحادیث اور تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے۔ (مسئلہ قومیت، ص ۸۵) لغات اور قرآنی آیات سے استدلالوں سے متعلق کہا گیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے، وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ (مذکورہ کتاب، ص ۸۷) یا کوئی نبی دُنیا میں کبھی اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو ایک قوم بنائے۔ (ایضاً، ص ۸۹-۹۰)

معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کو ہاتھ آ گیا کہ:

وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے۔

آگے مولانا مودودیؒ نے جو بحث کی ہے اس سے مولانا مدنیؒ کی تردید ہونے کے بجائے کلی نہیں تو جزوی طور سے تائید ہوتی ہے، مذکورہ فقرہ کے تناظر میں بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے'' یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے، لیکن یہ پھر لفظی

مغالطہ ہے، لغت عرب میں امت سے مراد وہ جماعت ہے، جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز، اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چناں چہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

وقوله في الحديث ان يهود بني عوف امة مع المومنين يريد افهم بالصلح الذى وقع بينهم و بين المومنين كجماعة انهم كلمتهم وايدهم واحدة.

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یہود بنی امۃ مع المومنین اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

اس لغوی امت کو آج کی اصطلاحی متحدہ قومیت سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military Aliance) کہہ سکتے ہیں۔ مولانا آخر فرمائیں کہ جس متحدہ قومیت کو وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی سے کون سا عنصر پایا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے۔" (مسئلہ قومیت، ص ۹۰ تا ۹۳) آگے مودودیؒ نے حضرت شیخ الاسلامؒ پر سخت تنقید کی ہے۔

ایک انصاف پسند، حقیقت کا متلاشی طالب یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کو مولانا مدنیؒ کے موقف واستدلال کی تردید میں خاص دقتیں ہو رہی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ مختلف فرقوں کی متحدہ قومیت کے مشترک عنصر اور بنیاد کی نشاندہی مقام، وطن کے عنوان سے کر چکے ہیں، اس لیے مولانا مودودیؒ کا مذکورہ سوال کوئی زیادہ وزن نہیں رکھتا ہے، نیز انھوں نے عربی کی مشہور لغت 'لسان العرب' کا جو حوالہ دیا ہے، اس سے مولانا مدنیؒ کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تنقید میں جو سوالات اٹھائے ہیں، اگر تحریر کے طویل ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو راقم دکھاتا کہ ان سے ان کے دعوے وموقف کا اثبات نہیں ہوتا ہے، بلکہ جس منشا ومقصد سے حضرت شیخ الاسلامؒ نے ہندستان کے تناظر میں ایک وطنی وسماجی اور سیاسی ضرورت کے تحت قدیم حوالوں سے متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا تھا، اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ تاریخی طور سے ثابت ہے کہ یہود وغیرہ کو، قائم ہونے والی مملکت مدینہ میں داخلی خود مختاری اور مذہبی آزادی حاصل تھی، تاہم بعض مقدمات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت عالیہ میں پیش کر کے فیصل کراتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مرحوم حمید اللہ کی مذکورہ کتابوں کا مطالعہ چشم کشا ثابت ہوگا۔ مولانا مودودیؒ اور ان کی طرح نظریہ رکھنے والوں کی اصل دقت

اور مسئلہ غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کے اتحاد و اشتراک یا غیر اسلامی حکومتوں میں شمولیت کو باطل اور غلط سمجھنا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور شاہ نجاشی کے عمل و رویہ سے حالاں کہ ان کی تردید ہوتی ہے، لیکن وہ ایک مخصوص قسم کی تاویل سے مسئلے کو ایک خاص رنگ میں پیش کر کے اس کا رُخ دوسری طرف کر دیتے ہیں۔ بعد میں جماعت اسلامی کے کئی اہل علم نے ہندستان جیسے ممالک میں بہت سی دقتوں اور مسائل کو دیکھ کر پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور تحریری طور پر متعلقہ موقف پر تنقید و تردید بھی کی ہے، اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے ایک اہم ذمہ دار مولانا سلطان احمد اصلاحی کی کتاب 'مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار' قابلِ مطالعہ ہے، جس میں مولانا مودودیؒ کے موقف کی واضح الفاظ میں تردید کرتے ہوئے اس کو ایک ضرورت بتایا گیا کہ ایک مختلف مذاہب والے غیر مسلم اکثریت والے ملک میں مسلم اقلیت کو تمام ایسے شعبوں میں حصہ داری کرنی چاہیے جہاں سے ملکی معاملے میں مؤثر کردار کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، اصل بات یہ ہے کہ قومیت اور متحدہ قومیت کے معاملے میں اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ اور ان کے عقیدت کیش تضاد اور انتہا پسندی کے شکار ہیں۔ اقبال کے نام سے جو تردیدی تحریر شائع ہوئی تھی، اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اقبال کی ہے۔ اقبالیات کا کون طالب علم یہ نہیں جانتا ہے کہ اقبال نے ترکوں کے اجتہاد اور نیشنلزم کی تائید کی تھی اور اسے باطل اور کفر نہیں ٹھہرایا تھا۔ مسئلے کا یہ پہلو بھی ان دونوں کے لیے قابلِ توجہ ہونا چاہیے تھا کہ اگر مسلمان غیر مسلموں سے ہر طرح کے سیاسی، وطنی اشتراک و تعلق کو مکمل طور سے ختم کر لیں گے تو کیا دعوت و تبلیغ دین کا راستہ مسدود و محدود نہیں ہو جائے گا؟ کنتم خیر امۃ اختیار کرنا اور اخرجت للناس کو نظر انداز کر دینا دور رس، دانش و بصیرت کی بات نہیں ہو سکتی ہے۔ رام، کرشن، گرونانک، سوامی رام تیرتھ کے، اقبال کے کلام اور تحریر میں حوالے کے تناظر میں غیر مسلموں سے حد سے زیادہ دوری کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے، جب کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے امید اور امکان کے در کو وا رکھا ہے۔ متحدہ قومیت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق جیسے حضرات نے سرسید کے نظریے کے متعلق تاریخ اور وقت کی ترتیب اُلٹ کر معاملے کو اُلجھا دیا ہے، جس کے نتیجے میں بہت سے قارئین گمراہ ہو گئے ہیں۔ جناب الطاف احمد اعظمی جیسے حضرات کی طرف سے ڈاکٹر عبدالحق کی تقلید کرتے ہوئے بتایا اور باور کرایا جاتا ہے کہ پہلے سرسید ہندو مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے، پھر تجربے اور مشاہدے کے بعد اس کے خلاف ہو گئے تھے اور کہنے لگے تھے کہ دونوں ایک کام میں دل سے کبھی شریک نہیں ہو سکتے، جب کہ معاملہ برعکس ہے، ان کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دینا ایک خلاف واقعہ بات ہے اور تاریخ کے ساتھ زیادتی ہے۔ سرسید وغیرہ نے مسلمانوں کے لیے قوم کی بات وحدت افراد کے تناظر میں کہی تھی، نہ کہ وحدت سیاسی کے تناظر میں۔ اور دونوں میں فرق ہے، حضرت شیخ الاسلامؒ کا تصور متحدہ قومیت ایک، وسیع اور سیاسی

وحدت کے مفہوم ومراد کا احاطہ کرتا ہے۔ مولانا مدنی نے سرسیدؒ کا حوالہ بالکل صحیح تناظر میں دیا ہے، لیکن اعظمی صاحب نے مسئلے کی ترتیب کی تحقیق کیے بغیر تردید کردی ہے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ کچھ دہائیوں سے ہندوپاک کی جماعت اسلامی کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے مسلم لیگ کے دوقومی نظریہ کو ہائی جیک کر کے اسے اپنے نظریے میں شامل کرلیا ہے اور متحدہ قومیت کا موقف رکھنے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، جیسا کہ پروفیسر عمر حیات غوری اور ڈاکٹر عبیداللہ فہد کی کتابوں میں دیکھا جاتا ہے، لیکن مولانا مودودیؒ تو مسلمانوں کو قوم ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ (دیکھیں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ص ۴۴، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، طبع دوم، ۱۹۸۲ء) نیز صفحہ ۴۹ و ۵۵ پر مولانا مودودیؒ نے قوم اور قومیت پر جس طور سے تنقید وتبصرہ کیا ہے اس سے مسلم لیگیوں اور اقبالیوں اور ان کی طرح موقف ونظریہ رکھنے والے جماعت اسلامی کے دانشوروں کی کھلی تردید وتغلیط ہوتی ہے، اس سلسلے میں ان کا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نام سے تقویت حاصل کرنا کوئی زیادہ باوزن بات نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ان کے دوقومی نظریے کو یہ کہہ کر منہدم کردیا ہے کہ ''میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے وہ دراصل ایک قوم نہیں ہے، بلکہ ایک جماعت ہے۔ یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے، کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس کلچر سے تبریٰ کرتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ متحدہ قومیت اور دوقومی نظریے دونوں کے مخالف ہیں، پھر سوال یہ ہے کہ ہندستان جیسے ملک میں مشترک مسائل میں غیر مسلموں کے ساتھ جدوجہد کی کیا صورت ہوگی، حضرت شیخ الاسلامؒ کے اختیار کردہ متحدہ قومیت کے موقف وتصور کے علاوہ کون سی صورت نکل سکتی ہے، اس کے ساتھ اس سوال کا جواب تلاش کرنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے کہ کس موقف وتصور کو اختیار کرنے سے ملک کے دیگر مذاہب اور فرقے کے لوگوں کی مسلمانوں سے دوری اور نفرت وعداوت ختم یا کم ہوگی، اگر نفرت اور دوری بڑھے گی تو آر ایس ایس جیسی فرقہ پرست تنظیموں کے مقاصد پورے ہوں گے اور ان کو تقویت ملے گی یا امت مسلمہ کے کاز کو تقویت ملے گی، اسی کے تناظر میں متحدہ قومیت کی معنویت وضرورت کو صحیح طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اور گزرتے دنوں کے ساتھ، ملک کے حالات جس رُخ پر جارہے ہیں، اس کے مدنظر یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ متحدہ قومیت جیسے مسائل پر سنجیدگی سے توجہ دی جائے اور نفرت اور دوری کو ختم کر کے مختلف فرقوں کے قریب ہونے کا ماحول پیدا کیا جائے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوسکیں۔ ■

مسئلہ قومیت، علامہ اقبال اور مولانا مدنیؒ

افاداتِ مولانا سید سلیمان ندویؒ

قومیت کی بحث میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقالہ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کی علمی حیثیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ پورا مقالہ ہی نقل کر دیا جاتا لیکن مولانا فرید الوحیدی نے اپنی تالیف لطیف "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سوانحی و تاریخی مطالعہ" میں جس حد تک مذکورہ مقالے کے اقتباسات سے مقصد کے حصول میں کام لیا ہے، اسی سے استفادہ کر لیا جائے۔ پورا مقالہ نقل کرنے میں فاضل مرحوم مولف کو عدم گنجائش مانع ہوئی تھی۔ قلت صفحات کا امر یہاں بھی مانع ہے۔ اگرچہ پیش نظر صورت میں ذوق مطالعہ کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کا محاکمہ قلب کو مطمئن کر دیتا ہے۔ (ا۔س۔ش)

سید صاحب لکھتے ہیں:

"جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی شخصی عزت و احترام، علمی فضل و کمال اور تقویٰ اور حسن نیت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جاسکتی۔

دلی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرے کو جس طرح سیاق وسباق سے قطع کر کے اچھالا گیا ہے اور اس کے جو معنی پہنائے گئے، وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے ان کا اعتبار کر کے شاعر اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بناء پر تھی۔ صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلقات ہونے کے میرے لیے

بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہو گیا۔ (اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ر اپریل ۱۹۳۸ء)

''صحیح وفصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں ''ملت'' کے ایک ہی معنی اور وہ مذہب کے، ملت ابیکم ابراھیم .(حج)(ایضاً)

قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں، یہ قرآن پاک اور عربی محاورے میں تین معنوں میں آیا ہے، مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے ذالک بانھم قوم لایعقلون۔ (سورۃ المائدہ)

یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

بانھم قوم لایفقھون. (توبہ) اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔

انکم قوم منکرون۔ (حجر) تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ، بہت سی آیتیں ہیں۔ ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔

(ایضاً)

''ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں، لیکن اپنے اس خیال کی قطعیت پر اصرار نہیں کہ وفوق کل ذی علم علیم.

''اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں، اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر، اس ملک کی کوئی مشترکہ سیاسی باطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس لفظ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں۔ اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے، ان کے وطنی جذبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنہوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے:

خاکِ وطن کو مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے؟

مولانا حسین احمد صاحب تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنہوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے۔

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انہی کا بخشا ہوا ہے۔

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ ''قوم اوطان سے بنتی ہیں'' قابل اعتراض نہیں، اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام، اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا...... ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے''۔

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اور نہ اس سے زیادہ ان کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی ''ملت'' ہی کی خاطر! جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔

(ایضاً)

آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بہ شانہ رہتے ہیں اس سے ہمارے ان کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہر حال پیدا ہوتی ہے۔ اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کون سا لفظ ہے، ملت و امت کے لفظ قطعاً نہیں ہیں اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے تو کیا اس کے لیے ''جنسیت'' کا لفظ بول سکتے ہیں؟ مگر بولنے سے پہلے قوم کے مفتیوں کی قوم سے بہر حال پوچھ لینا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا اور ملت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بناء پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمت عملی سے گریز کیا جائے گا''۔ (اخبار مدینہ بجنور، ۱۳/ اپریل ۱۹۳۸ء)

(ماخوذ از شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی: مولانا سید فرید الوحیدی، مکتبہ محمودیہ۔ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۲۶-۴۳۳) ■

ایک قدسی الاصل

مولانا انظر شاہ صاحبؒ
سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

روری ہے آج ایک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آہ! وہ قدسی الاصل جس کے نفس قدسی سے تقریباً ساٹھ سال، حدیث وقرآن کے زمزمے بلند رہے اور جس کے دہن مبارک میں حرکت کرنے والی زبان اس طویل عرصے میں قال اللہ وقال الرسول کی مبارک تشریحات وتفسیر سے تر رہی جس کی ذات گرامی معرفت وطریقت کی درس گاہ تھی اور جس کی محفلِ علم وعرفان میں ملائکۃ اللہ بصد فخر وناز شرکت کرتے تھے، جس کو ابھی ابھی قلم مدظلہُ العالی اور دامت برکاتہم کی دعائیں دیتا تھا، آج اشکبار آنکھیں اس کے جسم اطہر کو تودۂ خاک کے نیچے دیکھتی ہیں اور لکھنے والا قلم نور اللہ مرقدہٗ وقدس اللہ سرہ العزیز کے ماتمی نوحے اس کے لیے تیار کررہا ہے یعنی حضرت الاستاذ، شیخنا الاکبر سید حسین احمد مدنی تغمد اللہ بغفرانہ جن کی ذات سے علم وعرفان کی محفل منور وتاباں تھی اور جنھوں نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے دنیا کو حریت پسندی وانقلاب آفرینی کا گہرا سبق دیا تھا اس خاکدان ارضی سے اٹھے اور بچشم زون، صدیقین، شہداء وصالحین کی مقدس جماعت میں جابیٹھے۔

حضرت مرحوم کی زندگی علم وعمل زہد واتقا، استغناء، وتوکل، عفاف وپاک بازی کی ایک ایسی مرتب اور مبسوط کتاب ہے جس کی ہر ہر سطر آنے والوں کے لیے درس عمل ہے اور جس کے ابھرے ہوئے نقوش پچھلی نسلوں کے اسوہ نمونہ ہیں پچیس سال نہیں، نہ چالیس پچاس برس بلکہ پون صدی تک اپنے خدا کا یہ برگزیدہ

بندہ، اپنے گھر کی زندگی سے باہر تک خلوت وجلوت میں نشست وبرخاست میں سونے اور جاگنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس مبارک ومسعود سنت کی خاموش تعلیم دیتا رہا۔ اب اس کی مثال مشرق ومغرب کی وسعتوں، جنوب وشمال کی پنہائیوں میں ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گی۔

اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رُخِ زیبا لے کر

ان کی زندگی کا نشیب وفراز پھر ان کے مستقبل کا اٹھان دیکھنے کے بعد بڑی آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ قدرت کے عطا بخش ہاتھ، ان کی تربیت میں برابر مصروف رہے نیم سحر گاہی کے جھونکے۔ ان کی زندگی کے گیسو کو سنوارنے اور بنانے میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہے۔ وہ اپنی ابتدائی عمر میں عالم اسلام کی عظیم الشان یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لیے وارد ہوئے اور اپنے وقت کے ایک شیخ کامل کے تلمیذ وشاگرد ہی ہونے کی صرف سعادت ان کو میسر نہ آئی؛ بلکہ ان صاحب باطن، روشن ضمیر، کہن سال کی تمام توجہات کا مرکز یہی محبوب شاگرد بن گیا۔ دینی تعلیمات سے فراغت کے بعد رمز آشنائے حقیقت ومعرفت حضرت گنگوہی کی روحانی توجہات ان کے شامل حال ہوگئیں اور باطنی دولتوں سے دامن مراد بھر کر، عرب کا یہ بانکا نوجوان، دیار عرب کے منور علاقوں اور تابناک ریگستانوں میں پہنچ کر امداد الٰہی درس گاہ میں شامل ہوگیا، محمد عربیؐ فداہ روحی کی مسجد مبارک میں سالہا سال علم وعرفان کے موتی لٹائے اور ہر خاص وعام پر علم کی گوہر پاشیاں کیں، حریت پسندی کے رجحانات اور مجاہدانہ زندگی کے درس، مالٹا کی اسارت میں اسی جواں عزم خضر صورت کے لیے، جس کے سامنے تعلیمات نبوی کو حاصل کرنے کے لیے زانوئے ادب طے کئے تھے۔ گویا کہ ہر قسم کی تعلیم کی ابتداء محمود الحسن کی درس گاہ سے ہوئی اور اس کی تکمیل قدرت کے خاموش ہاتھ کرتے رہے۔ اس طرح اپنی ابتدا سے انتہا تک قدم قدم پر تعلیم وتربیت کے جن مواقع سے وہ سرفراز کئے جاتے رہے بڑے انسانوں کی تاریخ میں اس کی مثال خال ہی خال ملے گی۔ اس تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں، ان کی ذات میں مختلف علوم وکمالات، متضاد صفات وخوبیوں کی یکجائی کچھ اس طرح ہوگئی تھی کہ لکھنے والا قلم ان کی زندگی کے کسی ایک گوشہ کو متعین نہیں کرسکتا، اگر ان کی حیات پاک کا تجزیہ کیا جائے تو علم وعرفان، عمل واخلاص، شہنشاہی وگدائی تمکنت وانکسار عالمانہ انداز اور فقیرانہ طور وطریق کے سینکڑوں نقوش اس طرح ابھر کر آپ کے سامنے آجائیں گے کہ آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے

کرشمہ دامن دل می کشد اینجا است

آپ ہرگز نہیں بتاسکتے کہ ان پر کون سا رنگ غالب تھا اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فقیر منش انسان کون سی افتاد طبع لے کر پیدا ہوا تھا، ابھی رات کا سناٹا ہے سفر ہو یا حضر؛ لیکن فضا اس مرد خود آگاہ کی ذکر جہری سے لبریز ہے

شب کا آخری حصہ ہے اور یہ فقیر گوشہ نشین، سر بسجود، صبح کی پو پھٹی تو ہاتھ خدا کے سامنے ہیں اور دردمند اُمت کا یہ خادم، اسلام اور مسلمانوں کے لیے مصروف دعا، مسجد کے اونچے مناروں سے موذن کی آواز بلند ہوئی تو یہ عابد شب بیدار خدا کے دربار میں صف اولیٰ میں موجود، کلام ربانی کی تلاوت سے فراغت ہوئی تو عقیدت مندوں اور مہمانوں کے جم غفیر کے ساتھ چائے کے دستر خوان پر، صبح کے نو بجے ہیں، تو علم کا یہ کوہ گراں دارالعلوم کی دارالحدیث میں بیٹھ کر بخاری شریف کے درس میں منہمک، دن کے بارہ بجنے کو آئے تو وسیع دستر خوان پر، چہ دشمن چہ دوست، سب کی تواضع کرنے کے لیے یہ سراپا نیاز میزبان، سب کو کھلا رہا ہے، سب کو بٹھا رہا ہے، ظہر کی نماز سے فراغت ہوئی تو انسانوں کو یہ غم گساران کی ضرورت سن رہا ہے اور دل سوزی سے ان کی گزراشیں سنی جارہی ہیں۔ عصر سے لے کر مغرب تک واردین اور صادرین سے ملاقات اور ہر ایک کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جارہا ہے۔ مغرب کے بعد ایک کمرہ میں اندھیرا ہے؛ لیکن اس شیخ وقت کی تلاوت کلام ربانی کے انوار اس کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہیں، بیعت وارشاد کا سلسلہ چلتا ہے، کھانے کی محفل جمتی ہے اور پھر قال الرسول اللہ کی تشریحات مترنم لہجہ میں شروع ہوجاتی ہیں، غرضیکہ ۲۴ گھنٹے اور ہر ساعت کے ساتھ منٹ میں برابر مصروف ومشغول رہنے والا یہ کامل ومکمل انسان کیا تھا؟ یہ ایک معمہ ہے، جس کو مورخ کا قلم ہر پہلو سے کھول کر رکھے گا۔ اور قلم کی تشریحات بتائیں گی کہ وہ اپنے ظاہر وباطن، جسم وروح کے اعتبار سے، ایک مافوق الفطرت ہستی تھی جس کا اب مثل بھی صدیوں میں پیدا نہ ہوسکے گا۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

درس حدیث

بخت بیدار کی دولتوں میں سے اس خاکسار کی ایک یہ بھی فیروز بختی وسعادت ہے کہ بخاری شریف وترمذی شریف کا درس حضرت مرحوم کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر حاصل کرنے کا موقع ملا اور اس طرح حدیث ایک ایسی ذات گرامی سے پڑھنے کا موقع ملا جو علم وعمل کا حسین پیکر اور عارفین کے حلقہ کا شاہ تخت نشین تھا، ان کی درسی تقریریں نہایت بسیط اور بڑی پھیلی ہوئی ہوتی تھیں، مذاہب کا بیان امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی تحقیق وتنقیح، حدیثی نکات سند ورجال کی پُر مغز بحثیں، تصوف کے اسرار ورموز، کلام وحکمت کی دقیق باتیں سب کچھ ہی سبق میں زیر بحث آجاتا۔ خصوصاً بخاری کی جلد ثانی میں سیر ومغازی سے متعلق بڑی لمبی چوڑی تقریر فرماتے اور تاریخی واقعات شگفتہ لب ولہجہ میں دلنشین کردیتے اور پھر درس کے تمام حصہ کو اس اخلاص کے ساتھ طلباء کے لیے مفید بنانے کی کوشش کی جاتی کہ جب تک طالب علم مطمئن نہ ہوجاتے تو سبق شروع نہ ہوتا طلباء کی

دل داری کے لیے ان کے مہمل سوالات پر بھی بڑی بشاشت وانشراح کے ساتھ جواب عنایت فرماتے، تھکے ہوئے دماغوں کو از سر نو تازہ کرنے کی خاطر اور ذہنوں کو خشک علمی باتوں کے قبول کرنے کے لیے درمیان میں سنجیدہ مزاج اور شگفتہ تفنن کا موقع بھی آتا، خصوصاً اگر کوئی طالب سوتا اور حضرت کو اطلاع دی جاتی، تو پھر پُر شکوہ لہجہ اور متبسمانہ انداز میں ''اٹھتے اٹھتے جائیے، اور منہ دھو کر آیئے''۔ کی آواز سے تمام درس گاہ زعفران زار بن جاتی۔ سونے والا طلباء کے ہجوم سے شرمندہ ہو کر اٹھتا تو ؏

ہائے کیا بھری محفل میں رسوائی ہوئی

کے تازیانے اس کا تعاقب کرتے تین تین گھنٹے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ مسلسل سبق ہوتا، لیکن حضرت کی درس گاہ میں یہ طویل وقت بڑے نشاط وفرحت کے ساتھ ختم ہو جاتا اور طلباء کے دل ودماغ پر اتنی طویل مشغولیت قطعاً گراں نہ گزرتی بدشوق طالب علم بھی ان کے درس میں جس ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے اس کو دیکھ کر نظیری کا یہ شعر یاد آتا تھا کہ ؎

''درسِ حدیث'' اگر بود زمزمۂ مجتبیٰ

جمعہ بمکتب آورد، طفل گریز پائے را

طلباء کے ساتھ ان کا معاملہ، ایک شفیق باپ کا تھا جو شفقت ومحبت کے ساتھ اولاد کی کوتاہیوں پر اصلاح بھی کرتا رہتا ہو، وہ طلباء کی تمام ضرورتوں کو غور سے سنتے اور پھر ان کے وکیل ہو کر، ارباب مدرسہ کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے اور طالب علموں کی تمام خواہشات کو خود بھی پورا کرتے، دوسرے ذمہ داروں کو بھی بار بار اس طرف توجہ دلاتے رہتے، آہ! کہ طلباء وعلماء کا یہ غمگسار اب دنیا سے رخصت ہو گیا۔

''نظافت پسندی'' لباس اگرچہ نہایت معمولی زیب تن رہتا؛ لیکن صاف اور اجلے کپڑے پہننے کے عادی تھے، عطر بیحد استعمال فرماتے، خوشبو کے عاشق اور گل ریحان کے شیدائی تھے۔ سبزے سے خاص انس تھا، گھر تو اچھا خاصا چمنستان تھا؛ لیکن دار العلوم کو بھی اپنے اصرار سے ایک خیاباں بنائے ہوئے تھے۔ جب پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے قریب سے گزرتے اور دل آویز روشوں سے چکر آتے تو مسرت وابتہاج ان کے نورانی چہرہ پر پھیلا پڑتا تھا، گرمیوں میں دو پلی ٹوپی، کھدر کا کرتا جس کا گریباں ہمیشہ کھلا رہتا اور کھدر ہی کا پاجامہ حضرت ہی کی پوشاک تھی ہاں پاؤں میں جوتا سلیم شاہی یا جے پوری قیمتی سے ہوتا۔

سردیوں میں پاؤں میں جرموق، سر پر عربی رومال اور ان کے چوڑے چکلے جسم پر عبا عجیب بہار دیتی تھی، جب یہ لباس پہن کر سبک گامی فرماتے تو عرب وہند کی روایات کا حسین امتزاج، ان کی ذات میں نظر آتا اور یہ نیم ہندی ونیم عربی انسان دیکھنے والوں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتا نظریں اٹھتیں اور ان کے سادہ لیکن پر عظمت

جسم وجثہ پر ٹھہر جاتیں۔

"ماکولات ومشروبات" حضرت مرحوم کے خوراک تھے۔ پھلوں میں آم سے خاص رغبت تھی اور مٹھائی کا بھی کافی شوق تھا؛ بلکہ بے تکلف احباب ودوستوں سے زبردستی مٹھائی کا مطالبہ فرماتے، دستر خوان نہایت وسیع تھا جس پر دوست ودشمن کی کوئی تمیز نہیں تھی جس کا جی چاہے کھائے اور جو چاہے شریک ہو جاتے۔ ان کا دولت کدہ صحیح معنوں میں ایک مسافر خانہ تھا جس میں ہر وقت مسافر اترتے رہتے اور پھر لطف یہ تھا کہ نہ بادشاہ کا اہتمام نہ غریب سے سرسری معاملہ نہ رؤساء کا امتیاز، نہ غرباء سے بے نیازی، سب مل جل کر ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ جاتے اور عربی طریقہ کے مطابق بڑی بڑی پلیٹوں میں کھانا شروع ہو جاتا۔ حضرت مرحوم بھی مہمانوں کے ساتھ تناول فرماتے اور مہمانوں سے علیحدہ کھانے کی عادت نہ تھی، شام کو زعفرانی چائے کا دور چلتا جس کے جرعے حضرت کی فیض صحبت سے دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتے۔

"قدامت پرستی" حضرت مرحوم بڑے قدامت پسند اور قدیم روایات کے زبردست دلدادہ تھے۔ موجودہ دور کی لغو تجدد پسندیاں ان کو چھو کر بھی نہیں نکلی تھیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان حدود میں بھی لکیر کے فقیر بنے رہتے، جہاں آج قدامت پرستی، دقیانوسی کا دوسرا نام ہے، انہیں جائز حدود تک مناسب جدت، ان کو ہرگز گوارا نہ تھی، ہاں مغرب پرستی اور یورپ نوازی کے خواہ مخواہ جنون میں اپنی تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر دوسروں کے مکتب فکر سے ہر غلط سے غلط روایت کو قبول کر لینا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ قدامت پرستی اور تجدد نوازی کی یہ ملی جلی صورت کسے ناگوار وگراں ہو سکتی ہے۔

"امر بالمعروف" ان کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز تھا کہ وہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں بڑے نڈر واقع ہوتے تھے، یہ ان کا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کی جماعت میں بڑے بڑے ارباب جبہ ودستار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیا مجال کہ داڑھی منڈا کر کوئی ان کے سامنے آجاتے کس کی جرأت کہ سر پر انگریزی طرز کے بال ہوں اور حضرت شیخ کے روبرو پہنچ جائے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ان کی گرفت سے نہ رؤساء بچ سکتے تھے، نہ ممتاز طبقہ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس ادا کے نتیجہ میں ہزارہا چہروں پر مقطع داڑھیاں نظر آنے لگیں اور ہزارہا سروں پر سے انگریز پرستی کا بوجھ اتر گیا، معروف کی اشاعت اور منکرات سے اس شدت سے روکنے والا جماعت علماء میں اب کاہے کو پیدا ہوگا! باطل پرست جماعتوں کا مقابلہ جس پامردی سے کرتے اور اس راہ میں ہر سب وشتم طعنہ وتعریض کو جس خندہ پیشانی سے قبول کرتے، یقیناً اس کے اجر مضاعف سے عالم اخروی میں ان کا دامن مراد بھر دیا جائے گا عمل وہمت کی ایک چٹان تھی۔ جس نے کبھی تھکنا نہ جانا، عزم وبلند حوصلگی کا ایک کوہ گراں تھا جس کو حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکتے تھے۔

"سلوک وتصوف" یوں اگر چہ حضرت مرحوم بڑے جامع تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں ان کی شہرت تھی۔ ہندوستان کے ممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا، مگر پھر بھی ان پر جو رنگ غالب تھا اور جو مذاق ان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا تھا، وہ ان کی معرفت ربانی اور سلوک وتصوف کا ذوق کامل تھا۔ بلا ریب اس آخری صدی میں ہندوستان کے پورے علاقہ میں اس شان کا کوئی بزرگ پیدا نہ ہو سکا، جس کی ذات سے سلوک وتصوف کے جابجا چراغ روشن ہو گئے ہوں اور جس کے نفس قدسی سے تزکیہ وتطہیر کی سنتیں زندہ ہو گئی ہوں۔ لاکھوں گمراہوں کو ان کے حق پرست ہاتھوں پر عقائد کے صحیح کرنے کا موقع ملا اور ہزاروں انسان شریعت کے متقی سانچے میں ڈھل گئے اپنے اس خاص رنگ میں اگر چہ تالیفات کا بہت کم ذخیرہ انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا! لیکن چلتے پھرتے، جیتے جاگتے افراد کی ایک ایسی بڑی جماعت چھوڑ گئے ہیں جن کی خانقاہوں سے صدیوں تک اسلامی تصوف کا درس بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ملتا رہے گا اور علم وعرفان کی مشعلیں قدم قدم پر جلتی ہوئی ملیں گی۔

"وفات حسرت آیات" تقریباً آج سے آٹھ ماہ قبل جب حضرت بالکل تندرست اور ترو تازہ تھے راقم الحروف کی والدہ محترمہ نے ایک خواب دیکھا جس میں امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا مدنی مرحوم کے ہارٹ فیل ہونے کی دردناک اطلاع سنائی تھی۔ صبح کو یہ خواب والدہ مدظلہا نے سنایا تھا تو سنتے ہی ماتھا ٹھنکا، پھر جیسے ہی حضرت کے مرض وعلالت کی خبریں کان میں پڑنے لگیں تو دل کی بے قراریاں بڑھتی جاتیں اور ہوش وحواس اڑے جاتے اور دل کی دھڑکنوں کا واقعی یہ حال ہوتا کہ ؎

دل کی دھڑکن کا یہ عالم ہے کہ بامنت دست
پرزے ہو ہو کے گریباں اڑا جاتا ہے

آخر کار یہ جام غم لبریز ہو گیا اور زہر کا یہ پیالہ منہ کو لگانا ہی پڑا یعنی ان کانوں نے ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی اور آنکھوں نے شیخ عالم کی میت کو طوعاً وکرہاً دیکھا۔ جس دار العلوم میں ربع صدی تک ان کی ذات سے قال اللہ وقال الرسول کے زمرے بلند ہو رہے تھے اسی درس گاہ میں ان کی نعش آخری زیارت کے لیے رکھ دی گئی۔ تقدس وعظمت ان کی بلائیں لیتے تھے، انوار الٰہی جسم اطہر کا احاطہ کیے ہوئے تھے چہرہ انور پر وہ مسکراہٹ ومسرت موجود تھی جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ مسافر منزل پر پہنچ کر تھکا ہوا نہیں؛ بلکہ اپنی منزل تک پہنچ جانے کی بے پناہ مسرتیں اس کو حاصل ہو رہی ہیں ؎

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

ان کے چہرہ پر جو طمانیت وسکون تھا بشاشت ونشاط کی جو نورانی کیفیات رقصاں تھیں، ایسے انوار اور

تجلیات، حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کسی اور میت پر دیکھنے میں نہیں آئیں، جنازہ اٹھا اور خاص اسی دروازہ سے جس سے تیس سال تک وہ حدیث کا درس دینے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ تو دار العلوم کا ذرہ ذرہ چیخ کر کہہ رہا تھا

کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے
رنگ رخسار پھولوں کے اڑا جاتا ہے

ان کی موت سے شریعت وطریقت کی عظمت مٹ گئی، علم وعرفان کی بزم سونی ہوگئی، سلوک وتصوف کی خانقاہ اجڑ گئی اور عزم واستقلال کے بلند منارے زمین کے برابر ہوگئے، وہ اپنی زندگی میں عمر فاروقؓ سے بڑے مشابہ تھے، دینی امور میں ان کی شدت، ان کا دینی تعلب، حمیت اسلامی، غیرت مومنانہ، ان کی شخصیت کو فاروق اعظمؓ کی پر عظمت ہستی سے قریب کر دیتی تھی۔ اس لیے آج اشکبار قلم کی زبان پر بے اختیار وہی کلمات تھوڑے سے تصرف کے ساتھ لوٹ لوٹ کر آرہے ہیں، جو علی کرم اللہ وجہہ نے ابن خطابؓ کے غم انگیز حادثۂ موت پر کہے تھے یعنی:

انّ موت حسين أحمد ثلمة فی الاسلام لاترتق الیٰ یوم القیامة.

حضرت مولانا مدنیؒ سے میری ملاقات

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ ایک حنفی المذہب عالم دین کے بارے میں لکھے اور پھر عالم دین بھی حضرت مولانا حسین احمد جیسے مرتبہ کا جو بیک وقت دارالعلوم دیوبند جیسی بلند پایہ درسگاہ کا شیخ الحدیث اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ممتاز رہنما رہا ہو اگر واقعہ یہ ہے کہ کمیونسٹ بھی اسی مخصوص دور کی پیداوار ہیں، جس میں علمائے دین محراب و منبر چھوڑ کر دار و رسن کا سبق دہراتے ہیں اور اس اعتبار سے بقول غالب:

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!

اتفاق یہ کہ میری دیوبند اور حضرت مولانا حسین احمد سے یہ نسبت دور کی نہیں، قریب کی ہے، مگر اس کی تشریح کے لیے بھی مجھے خود اپنے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔

میری عمر غالباً ۱۲ برس کے قریب ہوگی کہ مراد آباد مسلم اسکول کے ایک استاد مسمی اصطفا کریم نے مجھے کلام پاک کا درس دینا شروع کیا۔ ابتدا پارہ عم یا سورۂ بقرہ سے نہیں بلکہ سورۂ صف اور سورۂ جمعہ سے ہوئی اور درس کا منشا محض اس قدر تھا کہ میں جہاد کی تعلیم اور جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اپنے فرائض سے باخبر ہو جاؤں۔ اسی مقصد کے لیے تھوڑے دن بعد ایک خفیہ جماعت ''حزب اللہ'' کے نام سے بنی اور میں نے اس میں شریک ہو کر جہاد کا حلف لے لیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اصطفا کریم صاحب نے علی گڑھ سے بی اے پاس کرنے کے بعد نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی میں مولانا عبیداللہ صاحب سے تفسیر قرآن کا درس لیا تھا اور یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی سیاسی تحریک سے وابستہ ہیں۔ یوں سمجھیے کہ حضرت مولانا حسین احمد سے بھی

میرا بالواسطہ غائبانہ تعارف ہوگیا۔ بالآخر جنگ عظیم کے بعد حضرت مولانا محمود حسن مالٹا سے ہندوستان واپس آئے اور جب تحریک ترک موالات کی ابتداء میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالنے کے لیے علی گڑھ کالج وارد ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس کے بعد جامعہ کی زندگی میں مجھے خواجہ عبدالحی کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جو اصطفا کریم صاحب کی طرح مولانا عبیداللہ کے شاگرد رہے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں وکالت کے خیال سے جب میں اپنے راجپوت عزیزوں کے پاس ضلع مظفر نگر پہنچا تو مجھے حضرت مولانا حسین احمد کے بعض عقیدت مندوں سے مولانا کی زندگی کے حالات معلوم ہوئے۔ شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ مرحوم نے بچپن سے ہی جہاد کی تیاری شروع کردی تھی اور نوجوانی میں ان کا معمول تھا کہ مئی جون کی تپتی دھوپ میں گھنٹوں ریت یا پتھر کے فرش پر چلا کرتے تھے اور جاڑوں کی کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے۔ بعض دوستوں نے جب اس لاابالی پن کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آئندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی پڑیں گی غرضے کہ مجھے مولانا مرحوم کے فضائل کا علم تو ہوگیا مگر ابھی تک ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر اور صوبہ متحدہ کانگریس کی مجلس عاملہ کا رکن منتخب ہوا تو مولانا حسین احمد کو ایک رفیق کار اور ساتھی کی حیثیت سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلمانان ہند کی زندگی میں اس سے زیادہ صبر آزما دن کم آئے ہوں گے جب عملاً بے دین اور اعلانیہ بدعقیدہ (لوگ) علمائے دین کے احتساب کے لیے متعین ہوگئے تھے اور مسلم لیگ کے دفتر سے اسلام کی سند تقسیم ہوا کرتی تھی، چنانچہ وہ بزرگ جو برطانوی اقتدار مٹانے کے لیے کانگریس میں شریک ہوئے تھے، اب مسلم لیگی رہنماؤں کی نگاہ میں غدار اور مجرم قرار پائے۔ ہم جیسے نام نہاد مسلمانوں کو اس قسم کے طعن و تشنیع سے واسطہ ذرا کم تھا (گو کانگریس کے رابطہ عوام کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے اوپر بھی فرد جرم لیگ کی سرکار سے قایم ہو چکی تھی) مگر حسین احمد کا جگر دیکھیے کہ آئے دن ان ابوجہلوں کے ہاتھوں اذیتیں اٹھاتے تھے، مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس آزمودہ کار مجاہد کے پائے ثبات میں لغزش آئے۔ مجھے حضرت مولانا کے ساتھ صوبوں کے ضمنی انتخابوں میں کام کرنے کا موقع ملا جب مسلم لیگی حضرات کی نگاہ میں ایمان سے زیادہ ووٹ کی قیمت تھی اور ہمارے باہمی اختلافات مباحثہ و مناظرہ یا مجادلہ سے بڑھ کر کبھی کبھی مقاتلہ کی منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات مسلم لیگی ''مجاہدوں'' کے حلقوں میں حضرت مولانا کے قتل کے منصوبے بھی بنائے گئے اور حافظ ابراہیم کے انتخاب میں کئی عزیز مسلم لیگ کے ہاتھوں زخمی ہوگئے مگر حسین احمد کی زبان سے کبھی اُف نہ نکلی اور اس نے ان حضرات کے حق میں صرف ہدایت کے لیے خدا سے دعائیں مانگیں۔ مجھے آزمائش کی ان گھڑیوں میں حضرت مولانا حسین احمد کا عزم و استقلال ان کا سکون و صبر، ان کا بے مثال تحمل ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک ہم نے قرون اولیٰ کے

مسلمانوں کا حال صرف کتابوں میں پڑھا تھا اب بلالؓ وعمار کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ حضرت مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق البتہ مجھے اب تک نصیب نہ ہوا تھا۔

۱۹۴۶ء میں یہ خوش نصیبی بھی میسر ہوئی۔ ہوا یہ کہ جب مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگایا اور مسلمان عوام کا عام رجحان مسلم لیگ کی طرف ہو گیا تو کیمونسٹ پارٹی کو اس مسئلے کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ اس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ میں اس مواد کی فراہمی کے سلسلے میں دیوبند بھی حاضر ہوا بلکہ حضرت مولانا کی دعوت پر خود ان کے مہمان خانے میں فروکش ہو گیا۔ محراب و ممبر کے جلوے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے ''خلوت'' کے مطالعہ کا موقع اب ملا۔

جنگ عظیم کے بعد اشیا کی گرانی مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور مگر اس سے حضرت مولانا کی مہمان نوازی میں کیا فرق آسکتا تھا اور جب مجھ جیسے نسبتاً انجان اور بے دین کو مولانا نے باصرار اپنے مکان میں ٹھہرایا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست، رشتہ داری، دوستی اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا؟ جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو ۱۸ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا، چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرہ میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا دینداروں کے معمولات سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گزرے نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا مگر مولانا کے یہاں تقریباً سب ''قائم اللیل'' تھے کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بہ مشکل گھنٹے بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونے سے تکبیر بالجہر بلند ہوئی میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح و وظیفہ میں تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لیے اُٹھ بیٹھے، پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوئی تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چلا ہے۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن سے مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا یعنی اب میں اسی آزادی سے اپنے کمرہ میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر حاصل تھی چنانچہ میں نے مواد کی فراہمی کا وہ کام جس کے لیے میں حاضر ہوا تھا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں مجھے دیوبند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیوبند کی قیام کے غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پر دراز تھا رات کے دس بج چکے تھے گھومنے پھرنے کی وجہ سے کچھ تھکن زیادہ تھی، چنانچہ لیمپ گل کیا اور سونے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا مجھے کچھ غنودگی سی تھی کہ میں نے ایک ہاتھ اپنے ٹخنہ پر محسوس کیا پھر دونوں ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیے میں چوکنا ہو گیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا بہ نفسِ نفیس اس گنہگار کے پاؤں دبانے میں مصروف ہیں۔ میری

بدحواسی، حیرانی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں میں نے پاؤں جلد جلد سکوڑے اور بڑے ادب اور لجاجت سے حضرت کو روکا مولانا نے اس پر حسرت سے فرمایا کہ آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں، کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں'' مجھ پر اس ارشاد کے بعد جو گزری میرے لیے اس کا بیان کرنا مشکل ہے، واقعہ یہ بھی ہے کہ میں بارہ برس بعد آج پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں اور اگر حضرت زندہ ہوتے تو اس راز کو فاش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور ان کی فراخ دلی اور ان کے اخلاق کا یہ ادنیٰ نمونہ تھا۔

دوسرے دن حضرت نے دن کا اکثر حصہ میرے ساتھ بسر کیا اور سہ پہر کو حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی قبر پر فاتحہ کے لیے لے گئے قبر کے اردگرد اس وقت ایک دو بکریاں چر رہی تھیں کسی قسم کا کوئی امتیازی نشان یا پختہ تعمیر قبر پر نہ تھی۔ اگر یہ نہ بتایا جاتا کہ صاحب قبر کون ہے تو مجھے اس کا گمان بھی نہ ہوتا کہ بانی دارالعلوم یہاں دفن ہیں۔ میں بڑی دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا اور جب تسکین نہ ہوئی تو دوسرے دن اکیلا پھر حاضر ہوا۔

حضرت شیخ سے میری ملاقات:

وفات سے چند ماہ قبل میں سوویٹ روس کے چند عالموں کے ساتھ دیوبند مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا یہ آزادی کا زمانہ تھا مگر اس آزادی کے ساتھ تقسیم وطن کی لعنت بھی آئی تھی۔ صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع میں (یعنی جہاں دیوبند واقع ہوا ہے) تقسیم وطن کے معنی مسلمانوں کی تباہی و بربادی بلکہ کہیں کہیں قتل وغارت کے تھے اور بہرنوع جو طبقہ دیوبند کی پشت پناہ تھا وہ اقتصادی اعتبار سے مفلوج ہو گیا۔

حضرت مولانا یوں بھی خاموش طبیعت تھے مگر اس زمانے میں میں نے انہیں کسی قدر مغموم پایا وہ میری نجی پریشانیوں، انگلستان کے میرے قیام اور میری علالت سے باخبر تھے چنانچہ دیر تک میری صحت اور خانگی حالات کے بارے میں دریافت فرماتے رہے۔ میں نے ازراہِ مزاح پوچھا کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے صرف حکومت برطانیہ کی امداد لینے سے دارالعلوم کو منع کیا تھا، آپ نے اپنی آزاد حکومت ہند کے اعزاز کو قبول کرنے سے کیوں انکار فرمایا؟ تبسم فرما کر خاموش ہو گئے۔ میں البتہ اس تبسم کی تلخیاں محسوس کر رہا تھا۔

گل چہ داند کہ دردِ بلبل چیست

او ہمی کار رنگ و بو داند!

دیوبند جانے کا مقصد دراصل روس کے مشہور مستشرق مسٹر دیا کوف کو حضرت مولانا سے ملانا تھا، دیا کوف پہلی بار ہندوستان آئے تھے مگر اردو فصیح بولتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردو میں دیوبند میں تقریر بھی کی

ہم جب شام کو لوٹنے لگے تو حضرت نے ''نقش حیات کا ایک نسخہ مجھے تحفہ عطا فرمایا اور سینے سے لگا کر مجھے رخصت کیا۔ میں نقشِ حیات کو اب جب بھی تبرکاً پڑھتا ہوں تو ہندوستان کی پرانی اور حالیہ تاریخ کا ایک پورا مرقع میری آنکھوں کے سامنے سے پھر جاتا ہے اور جنگ آزادی کی صف میں حضرت مولانا کو میں حضرت اسماعیل شہید، مولوی احمد اللہ، مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن، عبید اللہ سندھی، حسرت موہانی، سردار بھگت سنگھ جیسے انقلابی مجاہدوں کے ساتھ پاتا ہوں ہم کمیونسٹ بھی ان ہی روایتوں کے وارث ہیں اور ان کی جانب سے میں بھی اس موقع پر عقیدت کی ادنیٰ نذر پیش کرنا چاہتا ہوں یہ چند سطریں اسی لیے ارسال خدمت ہیں۔

مسافرانِ طریقت زمن جدا مشہور
کہ دور بینم و چشم بہ منزل افتادہ است

شیخ الاسلام جنگ آزادی کے مجاہد

مولانا عبدالصمد قاسمی

اسلام پور پورنیہ بہار

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اپنے مقتدا و پیشوا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی کی وفات کے بعد علم جہاد اپنے ہاتھوں میں لیا اور ان کے نقش قدم پر جدو جہد آزادی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ شیخ الہندؒ اسلامی نظریہ سیاست کے سب سے بڑے علمبردار تھے ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا گیا تو دوسرے اسلامی ممالک بھی جلد ہی اس کی گرفت سے آزاد ہو جائیں گے۔ حضرت شیخ الاسلام عمر بھر اپنے شیخ کی متعین کی ہوئی راہ پر گامزن رہے۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر تا دم زیست جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس سے دو سال قبل ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ جمعیۃ کا نصب العین ایسی آزادئ کامل تھی جس میں مسلمانوں کے مذہب و تہذیب کی حفاظت ہو۔ ان کی مومنانہ فراست نے ابن الوقت سیاست کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا۔

اس مرد مجاہد نے اس وقت آزادی کا علم بلند کیا جب ہندوستان اگر سو نہیں رہا تھا تو پوری طرح بیدا بھی نہیں تھا۔ کانگریس مکمل آزادی کے مطالبہ سے گریزاں تھی اور مکتب آزادی میں اس نے بیٹھنا شروع کیا تھا خلافت کی تحریک قربانی کا مطالبہ کر رہی تھی اور شدھی و سنگٹھن کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ غرض کہ ملک کی فضا پورے طور پر مسموم تھی اور کام کرنے والے ہمت ہار بیٹھے تھے؛ لیکن شیخ الاسلام کے پائے استقامت میں لغزش تک نہ آئی۔ آپ برابر جد و جہد فرماتے رہے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنا پیغام عوام تک پہنچاتے رہے بالآخر وہ دن آیا کہ ہندوستان آزاد ہوا اور غیر ملکی اقتدار کا جنازہ اُٹھ گیا۔

ایسے آڑے اور نازک وقت میں مجاہد ہی کی ہمت وبصیرت ہی کام آسکتی تھی۔ ایسے ہمت شکن لمحات میں حضرت کے مستحکم ارادوں اور غیر متزلزل قوت ارادی میں ذرہ برابر بھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی، اور راہ کی تمام ترر کاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود آپ اپنی قوت وبصیرت اور نور ایمانی سے سوچی ہوئی راہ پر برابر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ گامزن رہے اور بالآخر ہندوستان کو ترنگے جھنڈے کے زیر سایہ جمہوری بنیادوں پر آزادی دلائی اور آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے نظام کو سیکولر شپ (غیر مذہبیت) نصیب ہوئی۔

آزادی کا پھل دونوں ہاتھوں سے اپنے جیب و دامن میں بھرنے والے آئیں اور دیکھیں کہ ۲۱ء کے ہمت شکن ماحول میں جنگ آزادی کے اس جانباز سپاہی نے کس طرح اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جس کی گونج آج بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں سنی جا سکتی ہے ملک کی سالمیت اور تحفظ کے دعویدار سامنے آئیں اور اس مرد مجاہد کی خدمات کے آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں۔ ملک کو تباہی سے بچانے والا حسین احمدؒ کے سوا کیا کوئی دوسرا بھی ہوسکتا ہے؟ وہ حسین احمدؒ ہی تو تھا جس نے ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک شمع آزادی وطن کی تڑپ پیدا کردی اور صحیح معنوں میں شیخ الہندؒ عبید اللہ سندھی اور منصور انصاریؒ کے خواب کی تعبیر پوری کر دکھائی، کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے آزادی کی راہ میں حسین احمدؒ سے زیادہ صعوبتیں برداشت کی ہیں اور اپنی قوم کے طعنے سنے ہیں؛ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کیلئے تیار ہیں کہ اگر کوئی دوسرا اس جگہ ہوتا تو کبھی کا جادۂ حق سے ہٹ گیا ہوتا، ہم آج اس پوزیشن میں ہیں کہ شیخ الاسلامؒ کی حب الوطنی وطن پروری اور حق کوشی کی قسم کھا سکتے ہیں۔

آج تو جماعتوں اور لیڈروں کی کھیپ ہر مہینہ میں تیار ہو کر سامنے آتی رہتی ہیں؛ لیکن ذرا تصور کی نگاہوں سے "زندان مالٹا" کی طرف دیکھئے جہاں حسین احمدؒ مدنی نے اپنے استاذ کے ساتھ چار سال کی اسارت کا طویل زمانہ گزارنے کے لیے دار و رسن کو دعوت دی۔ ذرا "خالق دینا ہال" کی طرف نظر اٹھاؤ جس کے اندر صبح سویرے پولیس کے ڈیڑھ سو مسلح سپاہی داخل ہو گئے ہیں ہال کے احاطہ کے چاروں طرف خاردار تار لگا دیئے گئے ہیں اور سڑک پر بھی پولیس کا دستہ موجود ہے؛ تاکہ عوام قریب جانے سے خوف زدہ ہوں۔ تقریباً دس بجے ڈھائی سو ہندوستانیوں کے مسلح فوجی دستہ نے گولہ بارود کے کافی ذخیرہ کے ساتھ ہال کے عقبی حصہ پر قبضہ کرلیا ہے ٹھیک گیارہ بجے ملزمین کی گاڑی ہال کے احاطہ میں داخل ہوتی ہے مسلح پولیس کی گاڑی کے آگے لاریاں ہیں، ملزمین ہال میں پہنچا دیئے گئے ہیں اور مقدمہ پیش ہے الزام یہ ہے کہ ملزمین نے کراچی کانفرنس میں ایسی تقریریں کی ہیں جن سے ملک عظیم کی فوج میں بغاوت پھیل سکتی ہے جنگ عظیم کا زمانہ اس تحریک کے محرک اور روح رواں شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ ہیں اور عدالت کے سامنے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان فرما رہے ہیں کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے؛ کیونکہ لائڈ جارج اور چرچل نے اعلان کر دیا ہے کہ یہ

جنگ اسلام اور برطانیہ کی جنگ ہے مقدمہ کا فیصلہ سنادیا گیا اور دو سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی؛ لیکن شیخ الاسلامؒ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا اور ہنسی خوشی زنداں کی طرف چل پڑے۔

۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔آپ بھی سرگرمی کیساتھ اس میں شریک ہو گئے اگر چہ شروع سے آپ حضرت شیخ الہندؒ کے شریک کار تھے اور ہر خفیہ تحریک کے رازدار اور معین و مددگار تھے، مگر یہ خفیہ کارروائیاں منظر عام پر اسی وقت آئیں جب آپ مالٹا کی رہائی کے بعد برملا سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو برطانیہ کے خلاف جاری تھی پھر جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی تو آپ نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

''موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کردے''۔

اس کی پاداش میں حضرت مدنیؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ اور دوسرے حضرات کی گرفتاری عمل میں آئی۔اور خالق دین ہال کراچی میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔

''اگر مذہبی فرائض کالحاظ واحترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلہ کا تصفیہ کرلینا چاہئے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کردینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں جو اپنی جان قربان کردوں گا''۔

آخری الفاظ پر بے ساختہ مولانا محمد علی جوہر نے حضرت مدنیؒ کے قدم چوم لیے تو گویا اس بات کی شہادت تھی کہ ''میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔

غرض اس مقدمہ میں سب ماخوذین کو دو دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔حضرت مدنیؒ نے دو سال قید کی سختیاں بھگتنے کے بعد پھر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اور زیادہ بڑھا دیا۔اور ہر وقت جدوجہد آزادی میں منہمک رہنے لگے۔

حق تعالیٰ نے جہاں ایک طرف آپ کو آفتاب شریعت اور ماہتاب طریقت بنایا تھا۔وہاں دوسری طرف آپ کو میدان سیاست کا بہترین شہسوار اور جنگ آزادی کا قابل ترین سپہ سالار نیز محبان وطن کا ایک قائد اعظم اور تسلط اغیار کے مقابلہ میں ایک مجاہد اعظم اور جان باز غازی بھی آپ کو بنایا تھا؛ تاکہ مذہب اور سیاست کے ہر میدانوں میں آپ مسلمانوں کی بہترین راہ بری اور قیادت فرما کر سلف صالحین کا ایک زندۂ جاوید نمونہ اور علماء

امت کے لیے ایک زبردست اسوۂ حسنہ بن کر رہیں اس لیے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ نہیں ؛ بلکہ اسلامی سیاست بھی مذہب کا ایک جزو ہے۔

آپ نے اپنی پوری زندگی دین اور وطن کے لیے وقف کردی تھی ایک ہی وقت جہاں آپ ایک طرف مسند درس پر علوم کے دریا بہاتے ہوئے نظر آتے تھے تو دوسری طرف آزادیٔ وطن کے سیاسی پلیٹ فارموں پر ظالم انگریزوں کے خلاف ترک موالات کے پیغامات بھی سناتے ہوئے دیکھے جارہے تھے، دنوں کو سبق پڑھائے تو راتوں کو سفر کرتے اس طرح دین و مذہب کی، دو زبردست خدمات کو بیک وقت انجام دینا آپ کی ہمت تھی، اگر آپ ایک وقت اپنے گوشۂ عبادت میں ذکر و شغل کرتے ہوئے زاہد و عابد نظر آتے تو دوسری طرف آزادیٔ ملک کے زندانِ فرنگ کی سختیاں جھیلتے ہوئے بھی مسکراتے اللہ اللہ اس فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بیک وقت شجاعت حیدری سیادت حسنی اور شہادت حسینی سب ہی جمع تھیں قوم وملت کے اس مرد خدا کو نہ دن کو چین آتا نہ رات میں آرام، آج خوش نصیب باشندگانِ ہند جو اپنی آزادی کی خوشیاں منارہے ہیں اس میں بہت احسان اہل ملک پر آپ ہی کا ہے اور اسی بنا پر برادران وطن کی بڑی بڑی قدرداں ہستیاں بھی آپ کی رحلت پر ماتم کررہی ہیں اور کیوں نہ ہو آزادیٔ وطن کی خطرناک گھاٹیوں میں جو لوگ اترے ان میں آپ کا نام نامی صف اول میں ہے اور آپ کو جو تقدم میں سبقت حاصل ہے وہ ان موجودہ بڑوں میں سے کسی کو بھی نہیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ اگر حدیث کو صحیح مان لیا جائے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا تو اب تک تیرہ مجدد اسلام پیدا ہونے چاہئے، آگے چل کر شبلیؒ نے لکھا ہے کہ مجدد یا ریفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔

۱۔ مذہب یا علم یا سیاست میں کوئی مفید انقلاب پیدا کردے۔

۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہے کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو؛ بلکہ اجتہاد ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔

ان شرائط کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو مولانا مدنیؒ میں یہ تمام شرائط یکجا پائی جاتی ہیں۔ گو مولانا مدنیؒ درس حدیث اور تعلیم قرآن کو اپنا مطمح نظر تصور فرماتے تھے تو دوسری طرف دیگر علماء کی طرح اپنا فرض منصبی صرف تعلیم و عبادت کو ہی قرار نہیں دیا تھا بلکہ مہمات سیاست اور انقلاب ملکی میں دخل دینا اور ان کیلیے دھڑ کی بازی لگانا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے آپ کی پوری زندگی سیاست ملکی یا ملی سے وابستہ رہی۔ آپ کی عمر کا اکثر حصہ قید و بند کے مصائب میں گزرا۔

آپ کی اس سیاسی زندگی پر بڑے بڑے اہل قلم، علما و فضلاء مضامین تحریر فرمار ہے جن سے مولانا کی شخصیت ہر پہلو، علم و فضل، راہمائی و رہبری سیاست و سیادت اور بحیثیت ریفارمر اور مجدد اسلام ہونے کے امور

واضح ہو جائیں گے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی گرانقدر شخصیت تھی جنہوں نے اپنی خاموش اور ایک بے آواز بے صدا سے سارے ملک کو للکارا عالم سیاست میں ایک بے جان اور طوفان برپا کر دیا۔ قلوب انسانی میں وہ عظیم الشان انقلاب رونما کیا کہ ملک کا بچہ بچہ طالب حریت نظر آنے لگا اور ایک محدود مدت میں مجاہدین کی ایک کثیر تعداد صنف منظم ہو گئی، جن میں سب سے اول شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی ذات گرامی تھی، حریت وہ پودا تھی جس کی محدث دہلویؒ نے داغ بیل ڈالی، قاسم نانوتویؒ نے آبیاری کی شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے تہذیب کی اور حوادث ایام سے بچایا اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے قربانی دے کر پروان چڑھایا اور یہی وہ ذات تھی جس نے ملک کو انگریزوں کی سالہا سال کی غلامی سے نجات دلانے اور آزادی کامل کے لیے تن من کی بازی لگا دی اور ہندوستان کی آزادی کو انگریزوں کے زیر تسلط دیگر ممالک کی حریت کے لیے تمہید اور توطیہ قرار دیا؛ چنانچہ حضرت مدنیؒ نے خود جشن آزادی کے ایک اجلاس کے موقع پر عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ انڈونیشیا، ملایا، مصر اور دیگر ممالک ہندوستان ہی کی آزادی کے طفیل میں آزاد ہوئے ہیں حضرتؒ کی عمر مبارک کے تقریباً ۵۵ یا ۶۰ سال جس رستاخیز ہنگامہ آرائی کے گزرے ہیں وہ ایک عظیم الشان ریکارڈ ہے۔

آپ نے ایسے وقت میں قوم کی زمام قیادت سنبھالی جب کہ ہندوستان کی زمین اور اس کا آسمان بدلہ ہوا تھا، انگریزی جابرانہ تسلط اور تشدد کی مسموم ہواؤں نے فضاء کو تیرہ تار بنا رکھا تھا، انسانیت نیم جان؛ بلکہ لب جان ہو چکی تھی یہ بے باک مجاہد آیا اور ملک وقوم کو خلاف فطرت شاطرانِ مغرب کی غلامی سے آزاد کروانے کا بیڑا اٹھایا اور آزادیٔ ہند کو اپنا فرضِ منصبی سمجھا جو خوابِ حریت کہ شیخ الہندؒ نے کبھی دیکھا تھا حسین احمد مدنیؒ کی سعی پیہم اُسے شرمندۂ تعبیر کر کے رہی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر قوموں میں زندگی کی روح پھونکی اور ان کو بیدار کیا اور احساس حریت کی اہمیت بتلائی۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ اگر ہمارے لیے مسرت وشادمانی کا پیغام لے کر آئی، تو دوسری طرف یہی تاریخ ہمارے لیے رنج والم کا سبب بھی بنی؛ کیونکہ بعض رہنماؤں کی عجلت پسندی سے اسی دن وطن عزیز کے دو ٹکڑے بھی ہوئے جس کا خمیازہ آج تک پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا ہے شیخ الاسلامؒ نے ملک کی تقسیم کی ہمیشہ مخالف رہے، اس لیے کہ برطانوی ڈپلومیسی کی کامیابی وناکامی کا مدار اسی ایک مسئلہ پر تھا افسوس کہ اس مرد بزرگ کی ایک نہ سنی گئی۔ ملک کی تقسیم ہو کر رہی اور مصائب وآلام کے گھرے بادل اس دیس کی دھرتی پر ٹوٹ ٹوٹ کر برسے۔ بدقسمت مسلمان اپنی قسمت کو روتا رہا۔ افسوس کہ شیخ وقت کا پیغام مسلمانوں کو اس وقت یاد آیا جب قدرت کے انتقام کی گھڑیاں شروع ہو چکی تھیں۔

لائق مبارک باد ہیں وہ ہستیاں جو ایسے آڑے وقت میں سامنے آئیں اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا۔
۱۹۴۷ء میں جب کہ جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے اور زبان کھولنا دشوار تھا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے پوری جرأت ایمانی اور ہمت مردانہ کے ساتھ اعلان فرمایا کہ مسلمان کا اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے شہری کا ہوسکتا ہے۔ اسلام اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ مسلمانوں کو پامردی اور استقلال کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اپنے اخلاق و کردار میں بلندی پیدا کرنی چاہئے۔

بہر حال ہمارے عظیم المرتبت رہنما حضرت شیخ الاسلامؒ جاتے جاتے بھی ہماری رہنمائی فرمائی۔ اور ہمیں وطن عزیز میں باعزت زندگی گزارنے کے گر بتائے اگر ہمیں اس ملک میں ایک باوقار مسلمان کی زندگی گزارنی ہے تو انہیں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔

کون ہے؟ جو اس زبردست خلا پُر کرسکتا ہے، کوئی نہیں، کیا یہ بھی کسی ملک کی وزارت عظمیٰ یا صدارت کی کرسی ہے جس پر کود کر پہنچ جانے کے لیے ہر سیاسی لیڈر بے چین رہتا ہے۔ اور جلد ہی یہ کرسی کسی نہ کسی کے سپرد کردی جاتی ہے۔ جی نہیں یہ ایک ایسا خلا ہے جو جلد نہیں پُر ہوا کرتا اس قسم کا خلا پُر کرنے والی شخصیتیں آرام و آسائش کی متلاشی نہیں ہوا کرتیں اور نہ پارٹی پولٹکس کی پابند ہوا کرتی ہیں؛ بلکہ حق گوئی، راست بازی، خدمت خلق اور احیائے دین کے لیے جد و جہد کرنا ان کی امتیازی خصوصیات میں شامل ہوا کرتا ہے اور ایسی شخصیتوں پر خدا کا انعام ہوا کرتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے دین کی، مسلمان کی اور وطن عزیز کی کیا خدمت کی اور کس قسم کی قربانی دی، یہ مؤرخ بتلائے گا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ آپ کی ذات سے اسلام اور مسلمانوں کو کثیر فوائد پہنچے اسلام کے رخ زیبا پر اس کے دشمنوں اور نادان دوستوں نے غلط فہمی اور الزامات کے جو پردے ڈال رکھے تھے وہ اس مردِ مومن نے ہٹائے۔ مسلمانوں پر جو جمود طاری تھا اُسے ختم کیا۔ علماء اسلام کو منظم کیا، مسند درس و تدریس کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ میدان سیاست کی شہسواری بھی کی۔

افسوس آج فرزندانِ توحید کو درس عمل دینے والا راہنما ہمارے درمیان میں نہیں ہے۔ ہماری جنگ آزادی کا مجاہد اعظم نظروں سے اوجھل ہے مگر "نقش حیات" کی صورت میں اس کا نقشِ پا ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اس کی روح مقدس پکار پکار کر آج بھی ہمیں درس حیات دے رہی ہے اور ہمیں جادۂ عمل پر گامزن دیکھنے کی متمنی ہے۔

ہم بد نصیب مسلمانان ہند جو زندگی میں اس کی حق و صداقت میں ڈوبی ہوئی پکار نہ سن کر مبتلائے ستم ہوئے، کیا اب بھی غفلت اور بے ہوشی کے پردے نہ اٹھائیں گے؟ ■

حضرت شیخ الاسلام کے تین امتیازات

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
استاد حدیث دارالعلوم دیوبند

- حضرت شیخ الہند سے کثرت استفادہ
- مسجد نبوی میں تدریس
- الجزائر کے جہاد آزادی میں رہنمائی

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے؛ لیکن یہ باطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے "ان ابراھیم کان امۃ" کی تفسیر تھے؛ کیونکہ وہ بیک وقت علوم و معارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت واستقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عمیق، بصائر و حکم کے سرچشمہ، زہد و قناعت کے مجسمہ، اخلاص وایثار کے پیکر، سخاوت و شجاعت کے مخزن، میدان صبر ورضا کے شہ سوار، قافلۂ جہد و عمل کے تاجدار اور سلفِ صالحین کی مکمل و متحرک یادگار تھے "کثر اللہ امثالہ".

آپ نے سیاست کے بحرِ مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی چھینٹیں آپ کے دامن حیات کو نمناک نہ کرسکیں آپ نے مذہب و سیاست کے جام وسندان کو باہم آمیز کر دیا، مگر اس کمال فراست کے ساتھ کہ دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کے لیے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر

۱۹ رشوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۲ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیاسی سال کی عمر میں جہان فانی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوگئے، اس اکیاسی سالہ حیات کے

۲۰ رسال تعلیم وتحصیل میں بسر ہوئے اور تقریباً ۸ رسال سے کچھ کم وبیش قید فرنگ کی نذر ہو گئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم از کم ۱۰ ربرس خواب وخور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے لیے نکال دیئے جائیں تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجیے کہ مدینۃ الرسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنہوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا۔ لاکھوں سے زیادہ طالبین حق ہیں جنہوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق وتزکیۂ باطن کا درس لیا جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جوان ہمت بھی ہیں جو احسان وسلوک کی منزلیں طے کر کے سند اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کے لیے اس وسیع وعریض ملک کے چپے چپے کا دورہ، اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات وتقریریں، استخلاص وطن، حریت قومی اور ملت کی سربلندی اور اپنے عصر کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی، علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ ومدارس اسلامیہ کی سرپرستی ونگرانی، پھر ان ہمہ جہت ومختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی، علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر کتب ورسائل کی تالیف وتصنیف، نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز احسان اور تاریخ وسیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس کے متعلق پورے اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات وملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۷۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ اور شیخ حسام الدین مانک پوری کے مجموعۂ مکاتیب کے بعد شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اپنی اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ ور بالعموم اسفار یا قید وبند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار وعبقریت کا کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ پھر تکمیل ذات کے لیے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم وآقائے بے نیاز سے عرض ونیاز جو زندگی کا ایک جز بن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گزر جاتا، اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں؛ لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے، الحاصل آپ کی زندگی فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات اور گوناگوں صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد ومحاسن کے ہجوم میں متحیر ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کے درس

وتدریس، اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم و تربیت کو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے تو اسی لمحہ میدان جہاد میں آپ کے محیر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں، وہ اگر آپ کے صدارت جمعیۃ کے عہدہ پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان و احسان کی وہ کیفیت آگیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے اس کے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تاثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق، تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندئ کردار کو اپنی بحث و تحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے تو آپ کے بحر علم سے اسرار و حکم و علوم و معارف کی اٹھتی ہوئی موجیں اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور بالآخر فضائل و کمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مبہوت ہو کر وہ پکار اٹھتا ہے ؎

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچین تو ز تنگی داماں گلہ دارد

یقین جانئے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات و کیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب و مفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی اس لیے یوسف کے خریداروں میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعۃ مزجاۃ بعنوان "تین امتیازات" لے کر حاضر ہو گیا ہوں ---- گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

امتیاز (۱) شیخ الہندؒ سے طویل استفادہ

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور آخر شعبان ۱۳۱۶ھ تک یہاں آپ کا قیام رہا، ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذۂ دار العلوم سے پڑھیں جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقوال، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول،

ایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی حاشیہ خیالی، مؤطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما) = فصول اکبری۔

(۳) مولانا عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم =
مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلویح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = پنج گنج، صرف میر، مختصر المعانی، سلم العلوم، ملا حسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند = شرح جامی بحث فعل، کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنزالدقائق، شرح وقایہ، مایۃ عامل، اصول الشاشی۔

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بغوی، مدرس دارالعلوم دیوبند = نورالانوار، حسامی، قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم = میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی، خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، مراجی۔

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم = شرح جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب = مقامات حریری، دیوان متنبی۔

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) منشعب، ایشاغوجی۔[1]

(۱) تعلیم و تحصیل کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ اور ملازمت میں بسر ہوا، کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان کے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتدا ہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہو گیا۔

(۲) فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہو جانے کے بعد ۱۳۲۷ھ میں جب خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث و تحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں ۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہو کر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا اور ترمذی، بخاری میں شریک ہو گیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں

---

(۱) نقش حیات ج: ۱ص: ۳۵، ۳۶

کو پڑھا مسائل پر پوری بحث کرتا تھا، حضرت رحمۃ اللہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے۔(۱)

(۳) علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت میں گزرا، اور اس کنج تنہائی میں حضرت شیخ کے فیض سے باطمینان خاطر علم، فکر کی روشنی اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت وملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء ومعاصرین میں کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں، علم وفکر کی پختگی میں شیخ سے طول ملازمت کا جو مقام ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھئے تو اسی اتصال ویک نفسی نے حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

امتیاز (۲) مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حلقۂ درس

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم وتحصیل سے فراغت حاصل ہوئی اور اسی سال ماہ شعبان میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ طیبہ زادہا شرفا وتعظیما کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رخت سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انہیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارض رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مسکن وماویٰ بنالیا، جیسا کہ خود رقم طراز ہیں:

''محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا''۔(۲)

مدینہ منورہ میں پہنچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہو جانے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے۔ فرماتے ہیں:

''درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی (حضرت شیخ الاسلام، مولانا صدیق صاحب ومولانا سید احمد صاحب) دیوبند سے

---

(۱) نقش حیات ج:۱ص:۴۵،۴۶

(۲) نقش حیات ج:۱ص:۵۱

آخری طور پر روانہ ہوئے، تو من جملہ رخصت کرنے والوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ ''پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے وہ ایک طالب علم ہی ہوں'' اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستان اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے (اور حسب ہدایت حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کردیا''۔(۱)

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر ابھی کم تھی اور یہاں کے نووارد بھی تھے اور بقول سعدیؒ۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد — عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا اس لیے ابتدا میں تقریباً ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا؛ لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تنا ور درخت ہوگیا جس کے سائے میں حجاز، ترکستان، بخارئی ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور ونزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گلی کوچے پر شور ہوگئے، آپ کے درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذہ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی۔

وہ آئے بزم اتنا میرؔ نے دیکھا — پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک نووارد اور وہ بھی ایک نوعمر کا اس قدر جلد شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیر چشموں کے لیے بھی رشک و رقابت اور حسد کا سبب ہو جاتا ہے کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگِ حسد بھڑک اٹھی، جس کی بنا پر آپ کو چندے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؛ لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو فراز فرمایا تھا اسی نے ان مشکلات کا مداوی بھی کردیا، اور آپ کی نیک نامی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''۱۳۱۸ھ شوال تک.....میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ

(۱) نقش حیات ج:۱ص:۵۷

ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا۔ اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہنچنے کے بعد مدرسہ شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بعہدہ مدرسی ۳۵ روپے ماہوار ملازم ہوگیا چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لیے خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرادیں، سمجھدار اور جدوجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہوگیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہوگئی، طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک، بخاری، قازانی، عزق، ترکستان، کابلی، مصری وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ)..... ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار ہوا کہ خارج از اوقات مدرسہ میں کہیں نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند باتیں اور پیش آئیں جن کی وجہ سے بہ مجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفا دینا پڑا اور یہ ارادہ کرلیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عزاسمہ کی کفالت پر رکھا جائے، چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کردیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی..... (کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہوکر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کررکھا ہے، جواب میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ، اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا، پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد۔(۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا.....
> چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے، تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے..... علوم میں جدوجہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر رہا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی (۲)

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں قیام پذیر رہے اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھی جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دار العلوم نے باقاعدہ طور پر دار العلوم کا استاذ بھی منتخب کرلیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی ہے، درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی جائے گی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کی علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی ایسی گرانقدر سند ہے

---

(۱) نقش حیات ج:۱ص:۵۷تا۶۴ باختصار۔

(۲) ایضاً ج:۱ص:۹۶تا۹۹ باختصار۔

جو فضلائے دار العلوم میں سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی اور غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہو گیا۔
ذلك فضل الله يعطيه من يشاء.

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھ کو تدریس کا حکم دیا جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے۔(۱)

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہو گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں چند مہینوں کے لیے پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم ۱۳۳۵ھ تک آپ کا قیام مدینہ ہی میں رہا اور مشاغل درس و تدریس برابر جاری رہے تا آنکہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کی سازش اور ایماء پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کو گرفتار کر کے مالٹا جیل میں پہنچا دیا گیا، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثناء وقفۂ قیام ہند کم وبیش ۱۲-۱۳ سال مسجد نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب وسنت اور دیگر فنون اسلامیہ کا کامیاب درس دیا، مجد وشرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا بارگاہ صمدیت کا ایسا بیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے، بغیر کسی خوف تردید کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد وممتاز ہیں۔

یہ رتبۂ بلند جس کو مل گیا

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم وفکر اور جہد وعمل کے کیسے کیسے ماہ واختر طلوع ہوئے افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں وروشن باب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اب اس پر ماہ وسال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ انہیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس مشکل کی وجہ سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کر کے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لیے اس کی طرف مختصر طور پر ہی سہی کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ کو انہیں اشاروں کی روشنی میں بحث ونظر کے لیے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کر سکے۔ وما توفيق الا بالله

(۱) ایضاً ج اص: ۱۳۲

علیه توکلت والیه انیب.

''طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء ومدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی''۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتارہا ہے کہ شمع مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ''یہ طالب علم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان، ترک، بخارا، قازان، قزق، ترکستان، کابل، مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ درس ودائرہ تربیت نہایت وسیع تھا۔ مجلّہ المنہل مدینہ منورہ کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہوجاتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کردیا جائے، مجلّہ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے:

فتلقى عليه العلم الناس كثيرون وانتفع الطلاب من تعليمه وكان من تلاميذه مدرسون وقضلة وحكام مديرون وروساء يذكرون منهم المرحومين المشائخ عبد الحفيظ الكردى الكورانى عضو المحكمة الكبرى بالمدينة واحمد البساطي نائب القاضي بها سابقا ومفتي الاحناف بها ومحمود عبد الجواد رئيس بلدية المدينة المنورة وكذلك الشيخ محمد البشير الابراهيمي العالم الجزائري المجاهد فى سبيل التطويح ببغاة الاستعمار من الجزائر العربية العريقه.(۱)

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم وتدریس سے منتفع ہوئے آپ کے تلامذہ میں مدرسین، قاضی وحکام، سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمہ کبریٰ، مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابراہیمی الجزائری، جنھوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

مجلّہ الوعی الاسلامی کویت سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے الامام عبدالحمید بن بادیس المصلح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود بن محمد قاسم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف شیخ عبدالحمید بن بادیس کے سفر حجاز کے ضمن میں لکھتے ہیں:

---

(۱) نقش حیات

ثم سافر الىٰ مكة لاداء فريضة الحج فى سنة ١٩١٣م وفي الحجاز لقى عددا من علماء مصر والشام وتتلمذ على الشيخ حسين أحمد الهندي الذي نصحه بالمعودة الىٰ الجزائر اذلا خير فى علم ليس بعده عمل۔

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضۂ حج کی ادائے گی کی غرض سے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصروشام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنہوں نے شیخ عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد علم نہ ہو۔

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے جنہوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا۔ شیخ عبد الحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبریٰ مدینہ منورہ)، شیخ احمد بساطی نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابراہیمی جزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس الجزائری، آخر الذکر دونوں جزائری تلامذے کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کررہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے آخری جز سے انہیں ہردو حضرات کی خدمات وکارنامے متعلق ہیں اور آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔

امتیاز (۳) الجزائر کے جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ

تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس اور محمد بشیر ابراہیمی کو کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ ومرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی کا الجزائر میں ہے۔

ایک الجزائری مصنف لکھتے ہیں ۱۹۴۰ء میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کررہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آکر کہا "اب سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے" ہم بچوں کو شیخ کے مقام ومرتبہ کی کیا خبر ہمیں تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسطنطنیہ ان کی عیادت کو گیے ہوئے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا، چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں داخل ہوا میری والدہ شام کا کھا

پکار رہی تھی، میں نے بے وقت آنے کی وجہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہوگئی ہے؛ کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے میرے منھ سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہوکر چیخ اٹھیں۔ "اصحیح ما تقول" کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب مؤکد طور پر یہی بات دہرائی اور انہیں اس کا یقین ہوگیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز وتکفین کے بعد میرے والد قسطنطینیہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کبھی شہر جاتے تو میرے لیے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے، میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لیے ضرور کھلونے لائیں گے؛ لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب وغریب کیفیت تھی، گم سم، گویائی کی طاقت بالکل ناپید، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہو جاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدت غم سے تحیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی۔(۱)

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزیری انہیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴ر دسمبر ۱۸۸۹ء/ ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسطنطینیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ر سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسطنطینیہ ہی میں شیخ حمدان لونیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کردی اور پانچ سال تک انہیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لیے ۱۹۰۸ء میں جامعہ زیتونیہ تیونس میں داخل ہوگئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲ء میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آگئے، پھر ۱۹۱۳ء/ ۱۳۳۲ھ میں حج وزیارت کے ارادے سے مکہ معظمہ کا سفر کیا، فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا، بعد ازاں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے اور درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہوگئے، ۱۹۲۵ء میں المنتقد کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا، حکومت کی پابندی عائد کردینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ر شمارے نکل سکے، اس کے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہانہ ہوگیا تھا جس میں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھایا جاتا تھا۔ ۱۹۳۱ء جمعیۃ علماء الجزائر قائم کی اور

(۱) محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ص: ۷، ۸۔

تاحیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے، اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ رسال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶ راپریل ۱۹۴۰ء کو وفات پائی۔ (۱)

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتداء

تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے اس سے پانچ سال قبل ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر وتشدد سے تنگ ہو کر الجزائر سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آباد ہو گئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انہیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں وہاں سے قطع تعلق کر کے جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مقیم ہو جائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلام انہیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابل ملاحظہ ہے۔

''مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰ء میں عم محترم الشیخ السید محمود رحمہ اللہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیہ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے مصافحہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا: ''ابن شیخی وکیف'' میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں اور بحمد اللہ خیر وعافیت سے ہیں، پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہوں اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنیٰ تملیذ، ہمیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دے کر الجزائر واپس بھیجا تھا''۔ (۲)

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں:

''میں ۱۹۵۶ء میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد بشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے انہوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ وآزادیٔ جہاد کے

---

(۱) ماخوذ تر کی رائج: الشیخ عبد الحمید ابن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ۔

(۲) روایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی۔

قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہو رہا تھا، حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا، وہ واپس گیے اور انہوں نے تحریک کی قیادت کی۔(۱)

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجیے:

اذکر انی لما زرت المدینة المنورة واتصلت فیها بشیخي الاستاذ حمدان لونیسی المهاجر الجزائری وشیخی حسین احمد الهندي اشار علی الاول بالهجرة الی المدینة المنورة وقطع کل علاقة لی بالوطن واشار الثانی وکان عالماً حکیماً بالعودة الی الوطن وخدمة الاسلام فیه والعربیة بقدر جهد فحقق الله رائ الشیخ الثانی ورجعنا الی الوطن بقصد خدمته.(۲)

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیر آباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن ومستقر بنالوں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام وعربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کے لیے واپس آ گیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کے لیے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقہ عمل کے تحت انہیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی اب تک کی پوری زندگی گھر یا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم وتحریک کے تجربات سے بالکل نا آشنا ہو، اسے یکا یک بغیر کسی تعلیم وتربیت کے ایسے اہم ترین صبر آزما اور دوررس نتائج کی حامل خدمت پر مامور کر دیا جائے عقل اسے باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس لیے لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول وضوابط سمجھانے کے بعد ہی انہیں اس جوکھم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول وضوابط کیا تھے کن افکار ونظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سراغ ملتا ہے اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اس وقت کے احوال وظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے، ورنہ شیخ کے لیے

---

(۱) مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۲۷/۹/۸۶ء۔

(۲) ابن بادیس: الشہاب ج: ۸/ص: ۳۵۵، عدد اکتوبر ۱۹۳۷ء بحوالہ آثر کی رائع الشیخ عبدالحمید بن بادیس ص: ۲۷

مشکلات ومصائب پیش آسکتی تھیں، اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جا چکے تھے اس لیے یہ راز پردۂ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی و منطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ و شیخ کے فکر و علم میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار و اعمال کو اپنے شیخ سے اخذ و جذب کیا ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول وضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں اتارا تھا، کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقۂ عمل میں اس قدر موافقت اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کے لیے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ اس کے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کیے جاتے ہیں۔

فکر و عمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنے ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال وظروف کے مطابق اسی نظریہ کا اعلان شیخ ابن بادیس ان الفاظ میں کر رہے ہیں:

نعم ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخرىٰ عزيزة علينا هي دائما على بال ونحن فيما نعمل لو طننا الخاص نعتقد انه لابد أن تكون قد خدمناها واوصلنا اليها النفع والخبر من طريق خدمتنا لوطننا الخاص واقرب هذه الاوطان الينا هو المغرب القصىٰ والمغرب الادنىٰ والمغرب الاوسط ثم الوطن العربي اللاسلامي ثم الانسانية العام۔[1]

> اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور انہیں بھی نفع و خیر پہنچا رہے ہیں، اور ان میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ، مغرب ادنیٰ اور مغرب اوسط ہیں، ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

---

(۱) ابن بادیس الشہاب، بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ص: ۵۶

(۲) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہو جائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام میں سنی جا سکتی ہے۔

اننا نفرق جيداً بين الروح الانسانية والروح الاستعمارية فى كل امة فنحن بقدر ما نكره هذه ونقاومها نوالى تلك ونؤيدها لاننا نتيقن كل اليقين ان كل بلاء العالم هو من هذه وكل خير يرجيٰ للبشرية انما يكون يوم تسود تلك فتسقط الروح الاستعمارية والمتندحر والترتفع الروح الانسانية والنشر[1]

ہم روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اور اس کی تائید کرتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمام تر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کے لیے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جا سکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کی سیادت اور بالاتری حاصل ہو جائے، لہٰذا اس وقت روح استعماریت ساقط اور ختم ہو جائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھا جائے گی۔

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فى الدارين والجزائرى انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضي ومصالح الحاضر ومال المستقبل فالذين يعمرون هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الحزائريون[2]

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال اور اخلاق

(۱) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۸ء بحوالہ محمد المیلی: ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ۵۳

(۲) ابن بادیس: الشہاب ج: ۱۰، عدد نومبر

کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے، اور جزائری تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ، حال کے مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کر رکھا ہے، الہٰذا جو لوگ اس ملک میں آباد اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق وانصاف میں ذات ومذہب کی بنیاد پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات ومذہب سے تعلق رکھتے ہوں حق وانصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں۔

شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں:

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على البشرية..... لايخشاها والله النصراني لنصرانيته ولا اليهودي ليهوديته بل ولا مجوسي لمجوسيته ولكن يجب والله ان يخشاها الظالم بظلمه والدجال لدجله والخائن لخيانته۔(۱)

ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ ہے، اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل وفریب اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقۂ کار اور دستور العمل پر بھی ڈالتے چلئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی تحریک کی ابتدا درس وتدریس سے کی تھی۔ دوران درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی فرماتے تھے ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف وجوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لیے تیار ہوگئی تو جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کر لی اور پھر انہیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھا دیا، تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید وبند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انہوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے نام سے ایک محاذ کے بجائے وہ دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر

(۱) ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق۔

اسی جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد و عمل کا مطالعہ کیجئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہو کر درس و تدریس وعظ و تذکیر میں لگ گئے اور ایک دو سال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں:

فضينا عشر سنوات فی المدرس لتكون نشأء العلمی لم تخلط به غيره عن عمل آخر فلما كملت العشر وظهرت بحمد الله نتيجتها الخ۔

ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشأۃ علمی میں گذار دیئے جن میں ترویج علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا اور الحمد اللہ اس کے اچھے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔

طریقہ یہ تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا مجموعی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت ہوئی کہ شہر قسطنطنیہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لیے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، مؤطا امام مالک مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انہوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کر لی اور اپنے تلامذہ اور مستفیدین کے ذریعے پورے ملک میں اپنی نظریات کو عام کر دیا اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو رسالے المنتقد اور الشہاب جاری کیے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب ''الشہاب الثاقب'' کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہو چکی تھی) جس میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے، اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوگئی بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علماء الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ بادیس کے جانشین جمعیۃ علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیۃ علماء کی اہمیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لوتأخر ظهور جمعية العلماء عشرين سنة لما وجدنا فی الجزائر من يسمع صوتنا''۔

اگر جمعیۃ علماء کی تاسیس میں دس بیس سال کی تاخیر اور ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کے لیے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا۔

پھر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے مکمل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی۔

فکر وعمل کا یہ اتحاد بلاشبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ اسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیتاً اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لیے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہندؒ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و ناتمام ہوگی، تو اس کا دعویٰ یقیناً مبنی برحق ہوگا، حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ ع

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

---

(۱) ابن بادیس کے جہد وعمل کی ترتیب کے لیے ترکی رابح الشیخ عبدالحمید بن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیۃ فی الجزائر کے صفحات ۴۳، ۴۷، ۵۷ اور ۵۳ ملاحظہ ہوں۔

صاحب عزیمت سیاسی رہنما

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی

(۱)

عزم و استقلال

کوئی شخص ماں کے پیٹ سے بڑا آدمی بن کر نہیں نکلتا۔ البتہ بڑا آدمی بننے کی قابلیت وصلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے پھر جو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال اور ہمت وحوصلے سے کار نمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے:

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق
باشد بقدرِ ہمت تو اعتبارِ تو

حضرت مدنیؒ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ عزم واستقلال اور ہمت وحوصلے کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے جو کام بھی انجام دیا پورے عزم واستقلال اور انتہائی ہمت وحوصلے کے ساتھ انجام دیا۔ جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود عزم واستقلال اور ہمت وحوصلے میں جواں مرد تھے جو تمام جواں مردوں سے سبقت لے گئے تھے۔ برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے، حصول آزادی کے لیے جو جدوجہد کی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ووقعت برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیے، وہ آپ ہی کا حصہ تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو کچھ کا کچھ کر جاتے جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہ تھا، وہ ہندوستان کی حکومت سے کسی حالت میں بھی مرعوب نہیں ہو سکتا تھا۔ بے پناہ جذبات تھے جن کو بروئے کار لانے کے لیے وقت درکار تھا، حصول آزادی کے بعد ایک مرتبہ میں نے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ اب تو حضرت کی حکومت بن گئی۔ ہنس کر فرمایا:

''ہمارے لیے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا اب بھی جیل خانہ ہے''۔

اسی ایک فقرہ سے اندرونی سارے جذبات اور رجحانات کا بخوبی پتا چلتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنیؒ کے عزم واستقلال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ورنہ نہ معلوم مسلمانوں کی تباہی اور مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا۔

۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگامے میں جب کہ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور مسلمان کے لیے کوئی جائے امان نظر نہ آتی تھی حضرت مدنیؒ پورے عزم واستقلال اور ہمت وحوصلے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش میں مصروف تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کے ہند میں رہنے کی تلقین فرمارہے تھے، ایک آہنی دیوار بن کر سہارن پور کی سرحد پر جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی۔ اس وقت آپ جہاں مسلمانوں کو ہمت واستقلال کا سبق پڑھا رہے تھے۔ وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور بازپرس فرمارہے تھے، اسی دوران جب کاندھلہ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ ہندوستان چھوڑنا تو نہیں ہے۔ لیکن یہ فرمائیے کہ یہاں کس طرح ٹھہرا جائے؟ ارشاد فرمایا:

''ہمت وحوصلہ اور عزم واستقلال کے ساتھ خدا پر بھروسا رکھو''۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران آپ نے پنڈت پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے سخت غضبناک لہجے میں حکومت کے رویے کے خلاف بازپرس کی تو پنڈت پنت نے کہا کہ دارالعلوم کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو حضرت مدنیؒ نے سخت غصے میں فرمایا:

''دارالعلوم تو خدا کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ سہارنپور کی خبر لیجیے اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دے دیں میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کریں''۔

ان تہدیدی کلمات کے بعد جدید انتظام مکمل کیے گئے۔ تب فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ بڑھنے سے رکی۔

(۲)

جدوجہد آزادی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے انتقال (۱۷۶۲ء) کے بعد ان کے اخلاف اور تحریک ولی اللّٰہی کے رہنماؤں نے مسلمانوں کے روز بہ روز تنزل اور انحطاط سے متاثر ہو کر جس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ مولانا احتشام

الحسن کاندھلوی نے انہیں چار نکات میں مرتب کر دیا ہے، مولانا کے خیال میں تحریک آزادی کے آخری دور میں جب کہ اس کی باگ ڈور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں آگئی تھی، یہی چار نکات تھے جو جمعیت علمائے ہند کی قومی اور ملی تحریک کے بنیاد بنے تھے۔ اب آپ پہلے ان چار نکات کو ذہن میں رکھیے اور پھر حضرت کی رہنمائی میں تحریک آزادی کے آخری دور کی روداد کا مطالعہ کیجئے۔ (الف۔س۔ش)

۱- ہر مکمل طریقے سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ کی کوشش کرنا اور غلامی سے آزادی حاصل کرنا اور بیرونی استبداد کا خاتمہ کرنا۔

۲- ناواقف مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات کا واقف اور پیرو کار بنایا۔

۳- ایسے علمی مراکز قایم کرنا جن میں اسلامی تعلیم و تربیت ہو اور اسلامی مجاہد اور اسلام کو پھیلانے والے رضا کار پیدا ہوں۔

۴- اسلام سے ناواقف لوگوں کو اسلام سے باخبر بنانا اور اسلامی تعلیمات کو اس انداز کے ساتھ پیش کرنا کہ طبیعتیں جلد قبول کرلیں۔ اس آخری مقصد کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے متعدد رسالے بھی تحریر فرمائے، جن میں عجیب وغریب انداز سے خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کو پیش کیا اور تمام اسلامی تعلیمات کو عقلی طور پر ضروری اور مفید ثابت کیا تا کہ مسلمان اسلام کو سمجھ کر دوسروں میں پھیلائیں۔

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد ان کے شاگردوں اور مریدوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جان توڑ کوشش کی اور ہر نوع کی قربانی دی پھر ولی اللہی سلسلے کے تمام بزرگوں نے ان مقاصد کو اپنایا۔ لیکن ہر ایک نے اس مقصد میں زیادہ محنت وجانفشانی کی جو اس کو زیادہ اہم نظر آیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حضرت مدنی تھے۔

حضرت مدنیؒ کی سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کا اس وقت آغاز ہوتا ہے جب آپ ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی آپ بھی سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے؛ اگرچہ شروع سے آپ حضرت شیخ الہند کے شریک کار تھے اور ہر خفیہ تحریک کے رازدار اور معین ومددگار رہتے۔ مگر یہ خفیہ کارروائیاں منظر عام پر اسی وقت آئیں جب آپ مالٹا کی رہائی کے بعد برملا سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو برطانیہ کے خلاف جاری تھی۔ پھر جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تو آپ نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

''موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے۔ اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کر دے''۔

اس کی پاداش میں حضرت مدنیؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور دوسرے حضرات کی گرفتاری عمل میں آئی اور خالق دینا ہال۔ کراچی میں مقدمے کی سماعت ہوئی۔ حضرت مدنیؒ کا جب بیان ہوا تو آپ نے بے خوف و خطر صاف طور پر کہہ دیا کہ:

''اگر مذہبی فرائض کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔

آخری الفاظ پر بے ساختہ مولانا محمد علی مرحوم نے حضرت مدنی کے قدم چوم لیے جو گویا اس بات کی شہادت تھی کہ ''میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا''۔

غرض اس مقدمے میں سب ماخوذین کو دو دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔

حضرت مدنیؒ نے دو سال قید کی سختیاں بھگتنے کے بعد پھر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ آپ کے مخلص ہمدردوں کی خواہش تھی کہ دو سال کی سخت سزا کے بعد کچھ آرام فرمائیں۔ کچھ اپنے رویے میں نرمی اختیار کریں۔ ایک مرتبہ ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت مدنیؒ نے جواب دیا میں نے ایک ڈاکو کو دیکھا جو پچیس سال سے جیل میں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے باہر جاتا ہے پھر آ جاتا ہے۔ جب ڈاکوؤں میں یہ ہمت ہے تو ہماری ہمت تو اس سے بہت بلند ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ ہر وقت جدوجہد آزادی میں منہمک رہنے لگے اور جب دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی پر آپ کو مجبور کیا گیا تو آپ نے اس کو ان شرائط کے ساتھ قبول کیا۔

۱- سیاسی خدمات پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۲- دارالعلوم کی جانب سے سیاسی امور میں کوئی مخل نہ ہوگا۔

۳- ہر مہینہ میں ایک ہفتے کی رخصت ہوگی۔ تاکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے دیوبند سے باہر دوسرے مقامات کا سفر کیا جا سکے۔

۴- ایک ہفتے سے زائد اگر رخصت لی گئی تو اس پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

دارالعلوم کی صدارت کے بعد پھر اسی نظام سے سیاسی جدوجہد جاری رہی حضرت مدنیؒ کا جمعہ ہمیشہ سیاسی کام کے لیے باہر گزرتا تھا اور طویل سفروں کے لیے مزید رخصت بھی لی جاتی تھی۔ آپ نے ان سفروں سے ہندوستان کے طول و عرض میں چپے چپے اور گوشے گوشے میں بیداری پیدا کی اور برطانوی ظلم و استبداد سے خلاصی اور حصول آزادی کا عام جذبہ پیدا کر دیا اور اس مقصد کے لیے اس قدر سفر کیے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سال کا قریب قریب نصف حصہ سفر ہی میں گزرتا تھا اور حصول آزادی کے لیے وہ قربانیاں دیں جو کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ حضرت مدنی کی تقریر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ واقعات اور خود برطانوی تحریرات سے حکومت برطانیہ کی مخالفت ہوتی تھی محض الفاظ کی بارش نہ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کی تقریر حکومت برطانیہ کے خلاف ایک زبردست تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی اور سامعین کے قلوب میں راسخ ہو جاتی تھی اسی لیے حکومت برطانیہ آپ کو بڑا خطرناک آدمی سمجھتی تھی اور آپ کی روک تھام کے لیے ہر وقت تدابیر کرتی رہتی تھی۔ مگر آپ کسی حال میں رکنے اور جھکنے والے نہ تھے اور کسی زبردست سے زبردست طاقت سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انجام کار برطانیہ کو اپنا بوریا بستر اٹھانا پڑا اور ہندوستان کو اس بیرونی استبداد سے خلاصی ملی اور قوم کو آزادی حاصل ہوئی۔

حضرت مدنیؒ کی یہ ساری جدوجہد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب والی تحریک کے مقصد اول کے لیے تھی جس کی آپ کے ہاتھوں تکمیل ہوئی۔

پھر یہ آپ کا کمالِ سیادت اور کمالِ طریقت تھا کہ آپ نے اسی سیاسی پلیٹ فارم سے مسجد و خانقاہ کا کام بھی لیا اور انہی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں کو "راہ سلوک" طے کرایا اور بہت سے بندگانِ خدا کو عارف باللہ اور ولی کامل بنا دیا اور اسی سیاسی پلیٹ فارم سے سیکڑوں غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق و کردار سے باخبر اور واقف بنا دیا۔

اس مقصد کی تکمیل اور حصولِ آزادی کے بعد آپ ہمہ تن پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ دیگر مقاصد کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اگرچہ سیاسی سرگرمیوں کے دوران بھی آپ ان دیگر مقاصد میں برابر کوشش کرتے رہے تھے۔ مگر حصولِ آزادی کے بعد تو صرف وہی مقاصد اصلی مقاصد زندگی بن گئے تھے اور دوسرا کوئی مقصد و مشغلہ سامنے نہ تھا۔ (ملخص) ■

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا سیاسی شعور

ڈاکٹر سید عبدالباری

اگر لارڈ ریڈنگ ہندوستان اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں، حدیث شریف کو، کتب فقہ کو برباد کردیں تو سب سے پہلے اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں"۔

یہ تھی وہ صدائے خاراشگاف جو برطانوی استعمار کے خلاف "خالق دینا ہال" کراچی کے اندر انگریز حکومت کے مجسٹریٹ کے روبرو بلند ہوئی تھی جہاں مولانا حسین احمد مدنی کو دیگر چھ رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر کے اس الزام کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تھا کہ انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف ترک موالات کا ملک وملت کو پیغام دیا تھا اور انہیں الفاظ پر شیخ الاسلام نے اپنے بیان کو ختم کیا تھا، اس جملہ کا یہ اثر تھا کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے بے ساختہ آگے بڑھ کر شیخ وقت کی قدم بوسی کی۔

اپنے مشفق استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا میں طویل ایام اسیری گزارنے کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے ہوئے ابھی کچھ ہی مدت گزری تھی کہ شیخ الاسلام کو پیغام اسیری آپہنچا اور یہ سلسلہ آزادی ہند تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ برصغیر کی اس صدی کی نصف اول کی تاریخ میں طبقۂ علماء میں جن چند ہستیوں کو کبھی اس تاریخ ساز کارنامے کی وجہ سے فراموش نہ کیا جاسکے گا کہ انہوں نے مسلمانوں کو بے عملی و بے حسی کی دھند سے نکال کر حکومت ومملکت کے مسائل سے دلچسپی لینے اور امامت وقیادت کا خواب دیکھنے اور مذہب وسیاست کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کی، ان میں شیخ الاسلام کا نام صف اول میں نظر آتا ہے۔

قدیم نصاب تعلیم اور خالص مذہبی نظام تربیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ پیکر زہد وتقویٰ جس کی

رگ رگ میں مشرق کی تمام تابندہ روایات اور تہذیبی اقدار کا لہو دوڑ رہا تھا اور جس نے خالص مذہبی ماحول میں اپنے دور کے ثقہ ترین اور تقدس مآب افراد سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی اور جس کے اندر عجم کا رنگ طبیعت اور عرب کا سوز دروں، دونوں پوری دل کشی کے ساتھ موجود تھے اپنے عہد کے علماء ومشائخ کی صفوں میں بعض مخصوص اوصاف کی وجہ سے سب سے نمایاں وممتاز ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ قرار دی جائے گی کہ اس نے شاہ ولی اللہ کی اس تابناک روایت کا چراغ جسے اس کے اسلاف نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تھا بجھنے نہیں دیا کہ مذہب کو ریاست کے امور مملکت کے مسائل سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے اور زندگی کے کسی گوشے کو مذہب کے دایرہ اطاعت سے خارج نہیں کیا جاسکتا، ایک مسلمان جس ملک میں رہتا ہے، جس معاشرے میں آنکھیں کھولتا ہے اور جس خاندان کے آغوش میں تربیت حاصل کرتا ہے اس کے مسایل اور اس کی ذمہ داریوں سے، اس کے دکھ اور اس کے کرب سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے شعور کی آنکھیں ایک ایسے ہنگامہ پرور دور میں کھولیں جو نہ صرف اس برصغیر کی تاریخ میں بلکہ ایشیا اور افریقہ کی تاریخ میں بے حد انقلاب آفریں دور تھا، اس صدی کے ربع اول میں مسلمانوں کا سیاسی واجتماعی زوال اور تہذیبی اختلال اپنی آخر حدوں تک پہنچ گیا تھا، ایک طرف ترکمان سخت کوش خاک وخون میں مل رہا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد دولِ یورپ سلطنت عثمانیہ کی تکا بوٹی کر رہے تھے، دوسری طرف حرم مقدس میں شریف مکہ کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں اور کھلے بندوں ناموس دینِ مصطفےٰ کا سودا انگریز سامریوں کے ہاتھوں کر رہا تھا اور تیسری طرف ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا دل وطن سے باہر طرابلس وبلقان کے خونچکاں واقعات سے تڑپ رہا تھا اور وطن کے اندر تقسیم بنگال کی منسوخی، مہاسبھا وآریہ سماج کی شدھی وسنگھٹن کی تحریکوں، مسجد کانپور کے ایک حصے کے انہدام وجلیاں والا باغ کے خوفناک واقعات سے لرزاں وترساں تھا، پوری ملت ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم میں یا پھر شکستہ آرزوؤں اور خون چکاں حسرتوں کے ماتم میں مصروف تھی، کسی طرف سے امید وآرزو کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہیں آتی تھی، اس نازک مرحلے میں مشیت الٰہی نے ملت کو ایک نیا ولولہ سفر عطا کرنے کے لیے ایک نہیں کئی کئی چراغ روشن کردیئے، ایک طرف ابوالکلام کی نوائے سینہ تاب بلند ہوئی دوسری طرف علی برادران کی سیماب پا اور زلزلہ صفت شخصیات سامنے آئیں جیسے پرجوش پہاڑی ندی بہہ رہی ہو یا کوئی آندھی گھن گرج کے ساتھ آرہی ہو۔

ان چراغوں کے علاوہ علمائے ملت کی انجمن میں ایک اور انوکھا چراغ روشن تھا، وہ اگرچہ ہندوستان کے ایک گوشہ میں جل رہا تھا مگر اس کی روشنی پورے عالم اسلام میں پھیل رہی تھی، وہ اپنے عہد کی تاریخ کا مزاج

شناس اور آنے والے طوفانوں کا رمز شناس تھا، دیو بند میں شیخ الہند محمود حسن پورے عالم اسلام کے غم اور غلام ہندوستان کی فکر میں گھل رہے تھے، انہیں کے دامن تربیت میں مشیت ایزدی نے اودھ کے ایک دور دراز علاقہ سے ایک لالہ صحرائی کو لا کر ڈال دیا تھا۔

شیخ الہند نے دیو بند کو ایک بین الاقوامی مرکز بنا دیا تھا، ان کے کردار کی عظمت اور ان کی بے پناہ وسعت ظرف نے انہیں ایک ایسی شمع بنا دیا تھا جس کے گرد پروانوں کا ہجوم تھا۔ وہ ملت کے اتحاد اسلام کے غلبے اور دین متین کے وقار کی بحالی کے لیے سرتاپا آرزومند تھے، اس مقصد عالی کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے، زندگی کی آخری گھڑی تک وہ یہی خواب دیکھتے رہے کہ ایشیا کے پابہ زنجیر انسانوں کو کس طرح نجات دلائی جائے، ان کی انگلیاں حالات کی نبض پر تھیں اور وہ آنے والے طوفان سے خبردار تھے۔ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں جو کرب ناک طوفان اٹھ رہے تھے وہ ان سے باخبر تھے اور ان کے مداوے کے لیے متفکر تھے۔ انہوں نے پورے ایشیا کی آزادی کے لیے ایک منصوبہ بنایا تھا اور نہایت خاموشی سفارت اور طویل وخفی سلسلۂ خط وکتابت کے ذریعے اسے کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ اس کی تفصیلات ہم ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے جب دیکھتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ انگریزی سامراج اپنے غیر معمولی وسائل اور خفیہ تنظیموں کے بہت بڑے جال کے باوجود مدت تک اس منصوبے کا بھید نہ پا سکا اور اس کی بہت سی کڑیوں سے آخر تک ناواقف رہا، افسوس کہ یہ تحریک ناکام رہی ورنہ شاید آزادی تیس پینتیس سال قبل ہی حاصل ہو جاتی اور زیادہ باوقار طریقے سے حاصل ہوتی۔ اس تحریک میں آخری طور سے رنگ بھرنے کے لیے جب شیخ الہند عرب پہنچے تو حالات کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ شریف مکہ کی ہوا و ہوس اور انگریزوں کے مکروفریب کی چالیں کامیاب ہوئیں اور شیخ الہند اپنے عزیز شاگردوں کے ساتھ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی زندگی کا یہی نقطۂ آغاز ہے اور اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محدود قوم پرستی کے بجائے عالمگیر انسان دوستی اور ملی اخوت کے وسیع تر جذبے سے اس کی ابتداء ہوئی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے دیو بند ہی میں اس ادارے کی نصف صدی کی روایات جہاد و انقلاب کی حرارت اپنے خون کے ہر قطرے میں اتار لی تھی، اس حرارت کو مزید تب وتاب مدینۂ منورہ کی سرزمین پر حاصل ہوئی تھی جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ اس صدی کے اوائل میں چلے گئے تھے، دس سال تک انہوں نے حرم نبوی میں اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی تعلیمات کا درس دیا تھا، ان کے شاگردوں میں رومی، شامی، مصری، ترک، ہندی اور عرب ہر طرح کے نوجوان تھے۔ یہاں پر مولانا مدنی کی آرزوئے جہاد و انقلاب کو فروغ حاصل ہوتا رہا، یہ تمنا وہ ہندوستان ہی سے لے کر گئے تھے اور ایک دانشور ڈاکٹر اشرف کے مطابق:

"شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ مرحوم نے بچپن ہی سے جہاد کی تیاری شروع کردی تھی اور نوجوانی میں ان کا یہ معمول تھا کہ مئی جون کی تپتی دھوپ میں گھنٹوں ریت یا پتھر کے فرش پر چلا کرتے تھے اور جاڑوں میں کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے تھے۔ بعض دوستوں نے جب اس لاابالی پن کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آیندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی پڑیں گی"۔ (الجمعیۃ، دہلی، شیخ الاسلام نمبر: ص ۶۹)

پھر یہی سبق مولانا کو اپنے استاد شیخ الہندؒ سے بھی حاصل ہوا تھا کہ ظالم کے روبرو کلمۂ حق کہنے میں انسان کو اپنی جان کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیے۔ شیخ الہند کے اندر بھی یہی آرزو شمع کی مانند فروزاں تھی کہ خدا کی راہ میں انہیں اپنی زندگی قربان کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو، زندگی کے آخری لمحات میں آپ نے حسرت کے ساتھ اس کا اظہار فرمایا:

"مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے"۔

(نقش حیات حصہ دوم: ص ۲۶۷)

مالٹا کے ایام اسیری نے شیخ الاسلام کے سیاسی شعور اور بین الاقوامی فہم و فراست کو پختہ تر کردیا، ان کے اندر اپنے استاد جیسی وسعت نظر اور آفاقیت پیدا ہونے لگی۔ مالٹا میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان انگریزوں نے جن بین الاقوامی قیدیوں کا کیمپ لگایا تھا، ان میں ایشیا و افریقہ کے چوٹی کے سیاسی و فوجی لوگ تھے، ان میں جرمن آسٹرین، بلگیرین، ٹرکش، عرب اور ہندوستانی سبھی تھے، ان سے تبادلہ خیالات کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں، یہ سب برطانوی استعمار کے مارے ہوئے تھے، یہاں مسلمانوں میں آزادی ہند کے سب سے بڑے علم بردار شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی نے انگریزوں کی ایشیائیوں اور افریقیوں سے نفرت و حقارت کے برتاؤ کو دیکھا، خاص طور سے ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے ذلت آمیز طرز عمل کا قدم قدم پر مشاہدہ کیا، چنانچہ شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں، ہندو یا سکھ ہوں یا پارسی وغیرہ ایک ہی نظر حقارت سے دیکھے جاتے ہیں اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا جاتا ہے"۔ (نقش حیات: حصہ دوم)

حضرت شیخ نے دنیا کی تمام قوموں میں انگریزوں کے اندر سب سے زیادہ عداوت اور بغض و کینہ مسلمانوں کے سلسلے میں پایا جن سے وہ صلیبی جنگوں کا انتقام لینا چاہتے تھے اور پہلی جنگ کے زمانے میں ترکی سلطنت

کو ختم کر کے دل کی آگ بجھانا چاہتے تھے۔ لسان العصر اکبر نے اسی حقیقت کو شعر کی زبان میں بیان کیا ہے:

کلیسا کے مقابل آج مشکل میرا جینا ہے

کہ غیروں سے اسے غصہ ہی ہے اور مجھ سے کینہ ہے

مولانا محمود حسن کی ریشمی رومال کی تحریک کی ناکامی یقیناً ان نفوس قدسیہ کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی ہوگی! اس لیے کہ اول تو وطن اور عالم اسلامی کی آزادی کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا اور جس کی خاطر مدتوں تک بے شمار جتن کیے تھے وہ چکنا چور ہوگیا، دوسرے اسے چکنا چور کرنے میں غیروں کے ساتھ اپنوں کی بھی کرم فرمائی شامل تھی، مگر عمر کے آخری مراحل میں جب شیخ الہند اس اندوہناک ناکامی کے غم اور مالٹا کی اذیت ناک اسیری کی کلفتوں سے دوچار تھے، اس عالی حوصلہ انسان کے عزم وہمت کا چراغ گل نہ ہوا اس لیے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے تربیت یافتہ جاں نثار اس مشن کی تکمیل کے لیے وہ ساری صفات استقلال و پامردی پیدا کر چکے ہیں جو اس صبر آزما لڑائی کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے، مولانا حسین احمد اپنی خود نوشت سوانح ''نقش حیات'' میں اپنے مرشد و مربی کے عزم و ثبات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عبارت میں آبشاروں کا سا خروش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔

درج ذیل سطور ایک خوش آہنگ، بامحاورہ اور سلیس و رواں نثر کا نمونہ ہیں مولانا کے قلم سے پر جلال استعاروں اور پر ہیبت تمثیلوں کی جھڑی لگ گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ رکھنے والا صاحب زبان ہی ہم سے ہم کلام نہیں بلکہ اردو نثر کا ایک مزاج شناس اور اردو کے اسالیب بیان کا مزاج داں جس کی مادری زبان اردو بلکہ اودھی ہے ہم سے مخاطب ہے۔ مولانا کی نثر کے ساتھ ان کے سیاسی مشن کے جائزے کے لیے یہ طویل اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں، سخت اور تیز آندھیوں کا سامنے کرنا پڑا۔ بادسموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے، احباب و اقارب مار آستین بن گئے ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سدِ راہ بنا اور کیسے ساتھ ہوتا، انگریزوں نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا سنہ ستاون کا سماں باندھتا تھا، آزادی و انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھتا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا، ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی، برطانوی تشددات اور مظالم کے ہونے نے اس قدر حکومت اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا

خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا، خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے لوگ کام کر رہے تھے جن پر شبہ کرنا بے دینی اور کفر سمجھا جاسکتا تھا۔ چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا، پھر کسی طرح امید کی جاسکتی تھی کہ کوئی شخص ہم خیال، ہم زبان یا ہم محل ہو سکتا تھا خصوصاً جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے کان پر ہاتھ دھرتا ہو۔ ان حالات میں شیخ الہندؒ نے اپنی کشتی بحرِ ذخار میں ڈال دی اور طوفان میں کود پڑے اور لوگوں کو ہم خیال بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء ومشائخ سے چوں کہ ناامید و مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہیے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے ہیں اس لیے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے"۔

شیخ الہندؒ کے ایسے مخلص و جانباز معتقدوں وشاگردوں کی تعداد ہزاروں تھی اور پورے برصغیر بلکہ مشرق وسطیٰ میں پھیلی ہوئی تھی، ان سب کو شیخ الہند نے اپنے مشن میں جھونک دیا اور آگے چل کر سب کا سید طائفہ حسین احمد مدنی کو بننا تھا......

مالٹا کے بعد تربیت، ریاضت اور قرآن کی دوسری منزل تحریک خلافت تھی اور مولانا حسین احمد ہندستان آکر اس بھٹی میں کود پڑے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ملکی و بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینے کے لیے ایک منظم گروہ کی حیثیت سے منظر عام پر آئے، شیخ الہند کا یہ خواب برگ وبار لایا کہ مسلمانوں کا مذہب انہیں رہبانیت نہیں سکھاتا بلکہ بنی نوع انسان کے اجتماعی مسایل حل کرنے اور معاشرے کی ضروریات پوری کرنے اور خیرِ امت ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں کے لیے خیر و برکت اور ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ بننے کا سبق دیتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے دین کے اس جامع تصور کو لوگوں کے سامنے رکھا اور خانقاہوں اور مدرسوں سے کھینچ کر لوگوں کو میدان عمل میں لانے کی زندگی بھر جدو جہد کرتے رہے۔ بقول مولانا محمد میاں:

> "آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں رہنما ہونا چاہیے۔ اسی سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قایم رہ سکتا ہے"۔ (الجمعیۃ۔ دہلی، شیخ الاسلام نمبر: ص ۱۳)

چنانچہ ان بزرگوں کے لیے تحریک استخلاص وطن میں شرکت ایک مذہبی فریضہ تھا، حب الوطنی ان کے نزدیک کوئی سیاسی مسلک اور جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک دینی فریضہ اور مذہبی جذبہ تھا، چنانچہ جس ولولے اور جس

سرفروشی کے ساتھ ان بزرگوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی، جدید ہندوستان کا مورخ ان اہل اللہ کے کارناموں کے معاملے میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے تب بھی ان کی عظمت نہیں گھٹ سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ نو کروڑ مسلمانوں کی روحانی وتہذیبی امامت وقیادت کرنے والے یہ افراد اگر جنگ آزادی میں شامل نہ ہوتے تو شاید یہ لڑائی جیتی نہ جاسکتی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی کی خلافت کانفرنس میں وہ تاریخ ساز ریزولیوشن پیش کیا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان اور پورے ایشیا کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں، دینی ومذہبی حیثیت سے شامل ہونے کی راہ ہموار کردی اور اس انقلاب آفریں فتوے سے جو جمعیۃ العلماء نے ۴۲۵ علماء کے دستخط سے شائع کیا تھا، جنگ آزادی کا صحیح معنوں میں بگل بج گیا۔ اس فتویٰ کا لب لباب یہ تھا کہ اعدائے دین سے محبت ودوستی اور موالات حرام ہے اور انگریزی حکومت کے استحکام وانصرام میں شمولیت کفر ہے۔ مولانا مدنی نے اس موقع پر عالم گیر اخوت کا پیغام خلافت کے اسٹیج پر سے مسلمانان ہند کو دیا تھا اور محدود قوم پرستی کے تیشے کو اپنے تیشۂ ایمان سے چکنا چور کردیا تھا، مولانا نے فرمایا تھا:

''قرآن کہتا ہے کہ مسلمان کہیں ہوں، کسی رنگت کے ہوں، کسی نسل کے ہوں، مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، گورے رنگ کے ہوں یا کالے رنگ کے ہوں، کوئی زبان رکھتے ہوں، ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے سے غافل ہوسکے یا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ایسی حالت میں چھوڑ سکے جس میں اس پر یا اس کی کسی عزت یا مال پر صدمہ پہنچتا ہو، یہ قرآنی آیت صاف طور پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے سے ایسا ارتباط ہونا چاہیے جیسا کہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے ہوتا ہے۔

مولانا نے اس موقع پر پوری جرأت ایمانی کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ:

''مسلمانوں کو قرآن میں حکم ہے کہ اے مسلمانو جو لوگ تمہاری عظمت، تمہارے ملک، تمہاری دولت، تمہاری عزت کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ تمہارے مذہب کو دنیا سے ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ تم مقابلہ کرو۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اسلامی شہروں میں سے کسی پر کسی طرح سے حملہ ہو تو اس کے لیے بھی تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر یہ حکم فرض ہوجائے گا کہ وہ اپنی جان ومال اور روپے پیسے سے ان کا مقابلہ کریں اور مسلمانوں کی مدد کریں اور کافروں کو ان کے

شہروں سے نکال دیں مولانا نے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ آج یورپ یہ چاہ رہا ہے کہ حکومت اسلامی روئے زمین پر باقی نہ رہے''۔

(کراچی کا تاریخی مقدمہ: مرتبہ عبدالقادر بیگ، ص ۶۰ تا ۶۴)

اسی موقع پر علمائے دین نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ چونکہ قوانین دیوانی و فوجداری خلاف شرع ہیں اس لیے ان کے مطابق فیصلے کے لیے عدالتوں میں جانا یا ان پر اجرائے عمل کے لیے پیشۂ وکالت اختیار کرنا ناجائز ہے اور ایسے تعلیمی اداروں سے بھی علاحدگی ضروری ہے، جہاں اسلام کی صورت مسخ کرنے اور ذہنوں کو دین سے برگشتہ کرنے والی تعلیم دی جاتی ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمے میں اپنے بیان تحریری کا آغاز مولانا حسین احمد مدنی نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ ''ہندستان ایک مذہب پرست ملک ہے اور ہندوستان کی حکومت کے لیے مذاہب کی رعایت کرنی نہایت ضروری سمجھی گئی ہے''۔ اس سلسلے میں مولانا نے ملکہ وکٹوریہ کے مذہبی آزادی کے اعلان کا ذکر کیا تھا جس کی پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریز خلاف ورزی کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی جان و مال کی حرمت پر شیخ الاسلام نے اس موقعے پر جو تقریر فرمائی تھی وہ اتحاد ملی کے چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا ملت پرست کے بجائے محض قوم پرست تھے ان کی تردید کرتی ہے۔ مولانا نے چھ آیات قرآنی اور ۳۴ احادیث صحیحہ کا حوالہ دیتے ہوئے خونِ مسلم کی حرمت پر روشنی ڈالی تھی، اس موقعے پر ابن ماجہ کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی:

''حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کعبہ شریف کا طواف فرما رہے تھے اور فرماتے تھے کہ اے کعبہ کیا ہی اچھا ہے تو اور کیا ہی اچھی ہے تیری ہوا تو کس قدر بڑا ہے اور تیرا احترام کس قدر بڑا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ مومن کی جان اور مال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے''۔

اس موقعے پر مولانا نے ترمذی کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک دروازہ اس شخص کے لیے ہے جس نے میری امت پر تلوار اٹھائی''۔

مولانا نے آخر میں فرمایا تھا کہ:

''اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی سلب کرنے کا ہے تو صاف صاف اعلان کیا جائے تا کہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کر لیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا اور اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کر لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے کیونکہ

جب مذہبی آزادی چھینی گئی تو سب کی چھینی جائے گی"۔

اکبرالہ آبادی نے اس موقع پر فوج میں موجود مسلمانوں پر طنز کیا تھا:

شیخ خیرات بھی کرتے ہیں نمازی بھی ہیں آپ
مدد کفر بھی ہے، رونق اسلام بھی ہے

مولانا حسین احمد سے زیادہ انگریزوں کے لبرل ازم اور انسانی حقوق کے بلند بانگ دعووں کے کھوکھلے پن کا کون جاننے والا تھا؟ انہوں نے اپنی آنکھوں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران اس قوم کے مکروفریب اور وحشت وبربریت کے مناظر دیکھے تھے، وہ اس قوم کے جو مجموعۂ فتنہ وفساد تھی، پرُفریب انداز سے اچھی طرح واقف تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے لے کر تحریک خلافت وتحریک ترک موالات تک برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ایک باب اور ایک ایک گوشہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہماری اس صدی کے رہنماؤں میں ان کا تاریخی شعور سب سے زیادہ بالیدہ وبیدار تھا۔ عابد الوجدی الحسینی نے ارباب سیاست کا ایک قول نقل کیا ہے کہ گوکھلے کے بعد تاریخی اعداد وشمار کو اس قدر برجستہ بیان کرنے والا مولانا مدنی کے سوا اور کوئی نہیں پیدا ہوا۔

(الجمعیۃ۔ دہلی شیخ الاسلام نمبر: ص ۳۵)

"نقش حیات" کے دونوں حصوں میں وہ غدر ۱۸۵۷ء سے ریشمی رومال کی تحریک کے خاتمے تک کے تمام اہم واقعات کو آئینے کی طرح سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"یہی وہ امور تھے جس نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کردی تھی، یہ تڑپ کیا تھی، ایک درد تھا، پوری ملت کا درد تھا جو اس کو گلوخلاصی پر مجبور کر رہا تھا، یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت ان مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب وروز جسدِ ملت کے ہر رگ وپے میں پیوست تھے"۔

(نقش حیات (حصہ اول): آخری پیراگراف)

کراچی کے مقدمے کے بعد ڈھائی سال جیل میں گزار کر مولانا جب باہر آئے تو تپ کر کندن بن چکے تھے، اب انہوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ قوم کے مختلف حصوں میں جا کر عام ہندوستانیوں اور اپنی ملت کے افراد کو مخاطب کرنے اور جھنجوڑنے لگے سیاسی بیداری کے ساتھ اخلاقی تربیت اور روحانی تزکیے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے عافیت پسند طبقے اور مذہب کا ایک محدود تصور رکھنے والے دیندار گروہ کے طلسم سے مسلمانوں کو نکالے بغیر کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ مغرب سے مرعوبیت ختم کرنے میں انہوں نے اپنی تقریر وتحریر اور وعظ ونصیحت سے کلیدی رول ادا کیا، وہ انگریزی سامراج کے ان ستونوں کو گراتا

چاہتے تھے جو انہیں کی ملت کے ان افراد نے تعمیر کیے تھے جن کو اپنی دنیا عزیز تھی۔ نقش حیات میں وہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر کا یہ قول نقل کرتے ہیں، جو اس کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' سے اخذ کیا گیا ہے:

''مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باعزت وخوددار ہیں، دنیادار لوگ ہمیشہ قایم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں، ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباواجداد کے مذہب سے انکار نہ کرنا جانتا ہو، ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقایق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقے کی امداد حاصل ہے، یہ لوگ اگرچہ کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائیداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں اور بڑے اعتماد سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسایل پر سوچنے کی قطعاً پروا نہیں کرتے''۔

شیخ الہندؒ نے اس ہوشربا دور میں انگریزوں سے گلوخلاصی اور ہندوستان میں ایک خودمختار اور آزاد حکومت کا خواب دیکھا اور اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے برادران وطن سے تعاون کی اشد ضرورت محسوس کی، مولانا حسین احمد مدنی جس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کو پوری دنیائے انسانیت کے بہی خواہ کی حیثیت سے دیکھتا تھا، ایک بار مولانا احتشام الحق کاندھلوی کی روایت کے مطابق مولانا محمد الیاس نے مولانا مدنی سے مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی تو شیخ وقت نے تیز لہجے میں فرمایا کہ کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں۔

مولانا مدنی نے ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت سے تعاون کا اصول اپنے استاد سے اخذ کیا تھا، جنہوں نے اتحاد و تعاون کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کچھ بنیادی اصول متعین کر دیے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن علی گڑھ میں جامعۂ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد، جب دہلی تشریف لائے تو جمعیۃ العلماء کے دوسرے اجلاس کی صدارت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا:

''میں ان دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی''۔

شیخ الہندؒ نے مزید فرمایا تھا:

''ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی اور طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست دے سکے گی۔ ہاں ایہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب میں فریقین کے مذہبی امور میں سے ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حدود سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ہر ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے''۔

شیخ الہندؒ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی معاملات اور سرکاری محکموں میں رقابتوں پر افسوس تھا، بہر حال ملک کی اکثریت سے اصولی اتحاد کا درس شیخ الہندؒ نے دیا تھا۔ اس کی شیخ الاسلام نے زندگی بھر پیروی کی۔ اگر چہ اس راہ میں انہیں فرقہ پرست قوتوں کی وجہ سے اکثر نہایت کبیدہ خاطر ہونا پڑا۔ مذکورہ بالا خطبے میں شیخ الہند نے وضاحت کردی تھی کہ مذہبی حقوق اور اسلامی تشخص کو قربان کر کے کسی طرح کا اتحاد قایم نہیں کیا جا سکتا۔ مرحوم نے نظریاتی اور فکر و عقیدہ کی بنیاد پر ہندوستان میں الگ الگ قوموں کے وجود کو بھی تسلیم کیا تھا جیسا کہ ''نقش حیات'' حصہ دوم کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، بعد میں چل کر کانگریس نے جب جغرافیائی بنیاد پر قومی وحدت کا تصور پیش کیا اور اس کی مولانا حسین احمد مدنی نے حمایت کی تو اس عہد کے بہت سے اسلامی مفکرین نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا، اگر چہ شیخ الاسلام جغرافیائی بنیاد پر ایک ہندوستانی قوم کے تصور سے قطعاً یہ معنی نہیں لیتے تھے کہ مسلمان اپنے ملی تشخص کو ترک کر دیں یا اپنے مذہبی حقوق کو خیر باد کہہ دیں۔ دراصل مولانا قوم یا نیشن کو ملت سے الگ ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر محدود معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ جہاں تک ملی و مذہبی غیرت کا معاملہ ہے، وہ قومی نظریے کے علمبرداران کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس طرح کے

معاملات میں مولانا مرحوم سے تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطاے اجتہادی تو ممکن تھی، لیکن ان کے خلوص وللہیت پر کسی کو انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس لیے موقع پرستی، سربلندی وقیادت کی خواہش اور حب جاہ کی آرزو سے مولانا کی ذات بہت بلند تھی۔

شیخ الاسلام کی سیاسی بصیرت کی روداد جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں کے جائزے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ برصغیر کے اس صدی کے نصف اول کی تاریخ میں مسلمانوں کی سیاسی تگ وتاز کا جائزہ لینے والے اہل نظر کو یہ شکوہ ہے کہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی کوئی معین پالیسی کبھی نہیں رہی۔ مگر میرے خیال میں اگر گہرائی سے جائزہ لیا جاوے تو اندازہ ہوگا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں آزادیٔ ہندوستان تک جمعیۃ العلماء بڑی حد تک جس معین پالیسی پر کاربند رہی، وہ یہ تھی کہ اس ملک میں الگ سے تن تنہا کوئی اسلامی انقلاب نہیں برپا کر سکتے البتہ ایک برابر کے پارٹنر کی حیثیت سے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر اگر وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں تو ضرور آزادی کے بعد نئے ہندوستان میں ان کو اس ملک میں اپنے مذہبی امتیازات کے ساتھ باوقار زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ مولانا مدنیؒ کی قیادت میں جمعیت نے کانگریس کے ضمیمے کے طور پر کبھی کام نہیں کیا جیسا کہ کچھ لوگ اس کے بارے میں یہ رائے قایم کرتے رہے ہیں۔ ملک کے سیاسی مورخین خواہ اسے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جمعیت نے اپنے ساتویں سالانہ اجلاس (بمقام کلکتہ، ۱۹۲۶ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں آزادی کامل کی تجویز منظور کی تھی اور جب کانگریس نہرو رپورٹ کے تارِ عنکبوت میں الجھی ہوئی تھی، جمعیت نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا اور یہ ریزولیوشن منظور کیا تھا:

> ''چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے
> اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے''۔
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل: طفیل احمد منگلوری، ص ۵۳۱)

اس موقعے پر جو نکات طے کیے گئے تھے وہ یقیناً جمعیۃ العلماء کو شیخ الاسلام کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تربیت اور دین کے ایک وسیع وجامع تصور سے ملک کو روشناس کرانے کی سعی مبارک قرار دیے جائیں گے، وہ نکات یہ تھے:

۱۔ مسلم قوم عموماً اور علماء بالخصوص سیاسی امور میں غور وخوض کیا کریں۔

۲۔ آزادی ہند کے فریضہ ہونے کے وجوہ واسباب کو نہایت غور وخوض سے دریافت کریں اور لوگوں

کو سمجھائیں اور دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں۔ آزادی اور دیگر حقوق کے سلب ہونے کی مضرتوں اور مفاسد کی اشاعت نہایت پرامن طریقے سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں۔ ۱۹۳۰ء کے نویں اجلاس میں جو امروہہ میں منعقد ہوا، جمعیت نے کانگریس کمیٹیوں کی مہا سبھائی ذہنیت پر اظہار افسوس کیا اور گول میز کانفرنس میں شرکت کو کارلاحاصل قرار دیا، دسویں اجلاس میں جو بہ مقام کراچی ۱۹۳۱ء میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا جمعیت نے مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی اور پرسنل لا کی حفاظت کا مطالبہ کیا اور اپنے گیارہویں اجلاس میں جمعیت نے ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی واردھا تعلیمی اسکیم کو نامنظور کردیا اور اس کے ساتھ ودیا مندر کی تعلیمی اسکیم سے اختلاف کیا۔ کانگریس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفیوں کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کرے، جمعیت نے ہندوستانی زبان کو سنسکرت کے قالب میں ڈھالنے پر بھی اظہار افسوس کیا، ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں جس کی صدارت خود شیخ الاسلام نے کی اور جس میں مولانا کا خطبہ صدارت ان کی جرأت حق گوئی اور اظہار بے باکی کی وجہ سے انگریزی حکومت نے ضبط کرلیا، جمعیت نے ان لوگوں کی مذمت کی جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو رذیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیت نے مولانا حسین احمدؒ کی صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مختلف فیہ مسایل پر ایک دوسرے کو سب و شتم نہ کریں اور باہمی تعاون کر کے مثل ایک دیوار کے ہوجائیں، جمعیت نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط برداشت نہیں کرے گی اور ایسی آزادی کامل کے لیے جدوجہد کرتی رہے گی۔ اس میں مسلمانوں کے سماجی و تعلیمی مسایل پر بھی کچھ تجاویز منظور کی گئیں، سہارن پور کے اجلاس میں جو ۱۹۴۵ء میں شیخ الاسلام کی صدارت میں ہوا جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں میں عسکری نظم پیدا کرنے کے لیے انصار اللہ رضا کاروں کو تقویت پہنچانے اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے علاوہ تنظیم مساجد اور ائمہ مساجد کے ذریعے مسلمانوں میں اصلاحی نظام عمل کی ترویج و اشاعت پر زور دیا گیا کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں پر تعدی نہ کر سکے اور اس کی صورت یہ ہو کہ مرکزی ایوان میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہندوؤں کے مساوی ہو، گویا اس منزل تک آتے آتے کانگریس کے اندر فرقہ پرست عناصر کی طرف سے خود جمعیۃ العلماء بھی اندیشہ ناک ہوگئی تھی اور مسلمانوں کے تحفظات کا مطالبہ کرنے پر خود کو مجبور پارہی تھی۔ ایک مرحلہ وہ تھا کہ جمعیت کانگریس پر مکمل اعتماد کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں شامل ہوگئی تھی اور جب لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا حسین احمد مدنی سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ جمعیت کی طرف سے کیا مطالبہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو شیخ الاسلام نے صرف اس قدر فرمایا تھا کہ "ہمارا مطالبہ تو ایک ہے وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا حق کیا جائے اور ہم نے کانگریس سے

کہہ دیا ہے کہ جب تک ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے، البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اس وقت اگر ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوالیں گے۔

مولانا اپنی زندگی کے آخری ایام میں تدریسی مشاغل اور بندگان خدا کی روحانی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تا کہ ملت کی اخلاقی و روحانی طاقت برقرار رہے۔ مولانا نے آزادی کے بعد اقتدار میں شرکت گوارا نہ کی ہر شخص ملک کی خدمت کی قیمت وصول کرنے میں لگ گیا اور مولانا ان عظیم مقدس اور مخلصانہ جدو جہد کا یہ انجام دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی ساری سیاسی جدو جہد ایک دینی فریضہ سمجھ کر کی تھی۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی

''مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ و ارادہ کے ماتحت کر رہے تھے۔ وہی بے غرضی، وہی مستعدی، وہی جفاکشی جو ایک سپاہی میں میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے''۔

جنگ آزادی کے آخری چند سال مولانا پر بہت سخت گزرے جب کہ خود ان کی ملت کا ایک بڑا طبقہ ان کے مدمقابل آ گیا اور ان کے دین و ایمان اور ان کے کردار و اخلاص ہر شی پر حملہ آور ہو گیا مگر اس وقت بھی وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کا پوری بے جگری کے ساتھ اعلان کرتے رہے، جب انگریز جیسی جابر طاقت سے ذرہ برابر نہ ڈرے تو پھر اپنوں کی حماقتوں سے کیا ہراساں ہوتے، کمال یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمن کے الفاظ میں:

''اسکے سامنے ایسے مسئلے آئے کہ اگر وہ عوام کے رجحانات کی پیروی کرتا تو کروڑوں گردنیں اس کے سامنے جھک سکتی تھیں اور اگر وہ خاموش رہتا تو اپنے ارادت مندوں کی نظر میں اور اونچا ہو سکتا تھا لیکن اس نے حمایت حق اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے میں نہ اعزاز و احترام کا خیال کیا اور نہ برگشتگی عوام کا خوف اس کے پائے ثبات میں کوئی جنبش پیدا کر سکا''۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر: ص ۶)

آزادی کے بعد شیخ الاسلام اپنی قوم کے کچھ ناعاقبت اندیش افراد کی ستم رانیوں کو فراموش کر کے اس کشتی کی ٹوٹی ہوئی پتوار کو درست کرنے میں لگ گئے اور لوگوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان اور وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی تبلیغ کرتے رہے، ترک وطن سے انہوں نے مسلمانوں کو روکا اور تقسیم کے وقت دہلی میں یہ اعلان فرمایا:

''میں نے تو ہندوستان میں مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

ایسا نہیں کہ آخری ایام میں وہ ملک و ملت کے روشن مستقبل سے مایوس ہو گئے ہوں، فرقہ پرست عناصر

کی ریشہ دوانیوں سے نبرد آزما ہونے کا ان کے اندر اب بھی حوصلہ برقرار تھا، آزادی کے ثمرات سے ملک کے کمزور طبقات کو محروم کرنا چاہتے تھے۔...... اخیر میں اس عظیم المرتبت مذہبی وسیاسی رہنما کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہی انسان عظیم ہے جو اپنی بہترین صلاحیتوں کو پورے طور پر عمر کے آخری مراحل تک بر سر کار لاتا رہے اور زندگی کے کسی مرحلے میں پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہو اور نہ اپنی زندگی کے مشن سے کنارہ کش ہو اور اس کی امید و آرزو کا چراغ ہزار آندھیوں کے بالمقابل جلتا رہے، اس پیمانے پر جب ہم دیکھتے ہیں تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اس صدی کا ایک عظیم و عالی مرتبت انسان، فخر کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ ■

ذالک لمن عزم الامور

حضرت نے اپنی زندگی میں چالیس پچاس برس تک دن رات جس وقار اور عزیمت کیساتھ عداوتیں، طنز و تشنیع، ناگفتہ بہ کلمات اور مختلف قسم کی ناروا حرکات برداشت کیں، اس کی بہترین تفسیر اسکے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ واذا مروا باللغو مروا کراما (الفرقان:۷۲) و اذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما (الفرقان:۶۳) کسی بھی مخالفت، عداوت، سب وشتم، الزام تراشی اور طنز بازی پر کبھی کسی زبانی یا عملی شکوہ وشکایت کا اظہار نہیں کیا۔ خود تو حلم و بردباری اور صبر و برداشت کا ثبوت دیتے ہی تھے، مخلصین و متعلقین کو بھی صبر وشکر کی تاکید کرتے تھے:

"اگر میں حق پر ہوں اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کرتا ہوں تو غیر اور اپنوں سے جو کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آرہی ہیں، ان کے لیے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالی کے احوال اور اعمال مشعل راہ ہیں، جو جو مصائب انبیاء کرام اور اولیاء عظام اور مقدس علماء کو پیش آتے ہیں۔ ان کے سامنے ہمارے مصائب تو وہ نسبت بھی نہیں رکھتے جو ذرے کو پہاڑ سے ہے۔ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل سے تو بشارت حاصل ہوتی ہے۔ جس سے قبولیت عند اللہ کا پتا چلتا ہے اور اگر خدانخواستہ میں غلط راستے پر ہوں اور معاذ اللہ ضلالت اور گمراہی میں پھنسا ہوا ہوں تب تو اس کا مستحق ہی ہوں"۔

(مکتوبات شیخ الاسلام: ج ۲، ص ۳۸۳)

شیخ مدنیؒ خودنوشت سوانح نقش حیات کے آئینہ میں

مولانا عقیدت اللہ قاسمی
آشیانہ قاسمی محلہ دس بسوہ، قصبہ ڈاسنہ، ضلع غازی آباد (یوپی)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن ناظم اعلیٰ جمعیت علماء ہند وممبر پارلیمنٹ نے شیخ مدنیؒ کی خودنوشت سوانح نقش حیات کے تعارف میں لکھا ہے آپ کی شہرت وعظمت کی سطح میرے تعارف الفاظ سے بہت بلند ہے۔ وہ بزرگ باخدا! عالم باعمل جس کو مولانا حسین احمد مدنیؒ کہا جاتا ہے اور علماء ہند کا بہت ہی بڑا طبقہ اس سے یہاں تک عقیدت ومحبت رکھتا ہے کہ ''شیخ الاسلام'' کا خطاب ہی ان کے خذبات احترام کی کسی قدر تسکین کرسکتا ہے وہ علم وعمل اور شریعت وطریقت کا وہ مجمع البحرین ہے کہ اگر ایک طرف اتباع سنت، اخلاق نبوت سیرت صحابہ اور اسوۂ مشائخ کا سرچشمہ ہے تو دوسری جانب وہ ایسا بحر بے پایاں ہے جس سے جذبات حریت، ترقی ملت، حب وطن، میدان خلق خدا غمخواری نوع انسانیت اور ان کے لیے ایثار اور بے پناہ قربانی کے چشمے ابلتے رہتے ہیں اس کا قلب حامل شریعت ہے اور عمل تفسیر شریعت۔

سنہ وتاریخ ولادت:

حضرت شیخ کی اس خودنوشت سوانح میں درج ہے ۱۲۹۶ھ ۱۲ رشوال کی ۱۹ رانیس ویں تاریخ کی شب میں ۱۱ بجے دوشنبہ کا دن گذر جانے کے بعد یعنی شب سہ شنبہ میں بمقام بانگر مؤ ضلع اناؤ میں پیدا ہوا تاریخی نام ''چراغ محمد'' ہے (حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے عیسوی سنہ وتاریخ نہیں لکھا ہے حساب سے ۱۸۷۹ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ کی خودنوشت سوانح ہے مگر نہ جانے کیوں یہ بہت سی اغلاط وتضادات سے پُر ہے خود

مندرجہ بالا ابتدائی سطور ہی قابل توجہ ہیں۔ ''چراغ محمد'' کے اعداد ابجدی قواعد کے لحاظ سے ۱۲۹۶ ہوتے ہیں جبکہ شیخ اپنا سن پیدائش ۱۲۹۶ھ بتارہے ہیں عیسوی سنہ ۱۸۷۹ بھی اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

خودنوشت سوانح کے مطابق آپ کی ولادت قصبہ بانگر مؤ میں ہوئی جہاں والد مرحوم اودو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کئی سال سے مع متعلقین وہاں ہی مقیم تھے۔ اس سے پہلے آپ کے منجھلے بھائی مولانا سید احمد مرحوم بھی ۱۲۹۳ء میں وہاں ہی پیدا ہوئے تھے، آپ بہت ہی چھوٹے تھے کہ والد مرحوم آبائی وطن قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں قیام گزیں ہو گئے اس کے بعد ۱۲ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی میں رہے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

آپ نے اپنا سلسلۂ نسب ۱۸ رویں پشت تک درج کرنے کے بعد لکھا ہے شاہ نورالحق وہ مورث اعلیٰ ہیں جو اس سرزمین میں الہ داد پور قصبہ ٹانڈہ میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے، لکھا ہے کہ آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور سلسلۂ نسب فوقانی کیا ہے اور کس زمانہ میں آئے تھے تاہم شجرۂ طریقت میں جو کہ محفوظ ہے یہ دکھایا گیا ہے کہ آپ کے سلسلۂ چشتیہ میں پانچویں بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

لکھا ہے کہ شاہ نورالحق کی آمد کے زمانہ میں ٹانڈہ اوراس کے گردونواح میں تمام دیہات وغیرہ پر قوم رجھبر کا قبضہ اور تصرف تھا جو مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے، شاہ صاحب نے وہاں پہنچ کر ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی مگر وہ لوگ اور راجہ مقابلہ پر آئے تب آپ نے بزور کرامت ان کو زک دی۔ ان کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام الہ داد پور رکھا اس قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں شمالی دیوار اور مشرقی برجوں کے باقیماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں اس قلعہ میں آپ کی اور آپ کی اولاد کے مزار اب تک بنتے چلے آئے ہیں۔

شیخ مدنی نے اپنے شجرۂ نسب و شجرۂ طریقت کے سلسلہ میں بہت سے بزرگوں کی کرامات کا ذکر کیا ہے ان کرامات کا دین اسلام کے احکام و تعلیمات میں کیا مقام اور کیا حیثیت ہے راقم الحروف کا اس سلسلہ میں کچھ لکھنا یا کہنا دشوار ہے۔

شیخ نے لکھا ہے، والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں جب صفی پور اور نانگر مؤ میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے تذکرہ آتا تھا کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے؛ کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کپڑا بننے والوں و نوربافوں کی بستی مشہور تھی اور واقعی یہاں کے کپڑے بہت امتیازی شان رکھتے تھے۔ ٹانڈہ کی آبادی کا بڑا حصہ اس برادری کا ہے اس لیے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بھی اس قوم سے ہوں گے۔

اس کے بعد شیخ نے مولانا فضل گنج مرادآبادی اور اپنے والد صاحب کے کئی خوابوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے اپنے سید اور پیرزادہ ہونے پر استناد کیا ہے پھر لکھتے ہیں کہ ہماری قدیمی رشتہ داریاں ان اطراف میں محفوظ و مشہور سادات خاندانوں یا شیخوں کے ان خاندانوں میں چلی آئی ہیں جو نسبی حیثیت سے بہت اوپر کی چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں رشتہ ایسے خاندانوں میں کبھی نہیں کیا جاتا تھا جن کے سلسلہ نسب میں نجیب الطرفین ہونے میں کبھی کوئی داغ لگا ہو۔ حسب عادت قدیمۂ ہند۔ خاندانوں کی پشت ہا پشت کی تحقیقات کی جاتی تھی اگر سلسلہ نسب میں کسی پشت میں کسی عورت یا مرد میں کوئی کمی نسبی طور پر معلوم ہو جاتی تھی تو رشتہ نہیں کیا جاتا تھا؛ حالانکہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ سلسلہ نسب آباء اور ذکور سے ہوتا ہے اناث کو اس میں دخل نہیں یہ چیز ہندوستانی شرفا کی غلط ہے اور غالباً ہندوؤں کے پڑوس سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے ہوں عموماً عورتیں باہر سے اپنے ساتھ نہیں لائے یہاں ہی نکاح یا ملک یمین کے ذریعہ سلسلہ تناسل جاری کیا؛ پھر بعد میں ایسے تقلیدات کہاں تک صحیح کہے جا سکتے ہیں؟ شرفا اور سادات حجاز جن کو اپنے نسب پر بڑا غرور اور گھمنڈ ہمیشہ رہا ہے اور شاہان ترک ان کا بے حد احترام کرتے رہے ہیں ان میں سے بہت سے نفوس باندیوں کے بطن سے ہیں۔

اس طرح شیخ نے نسبی تفاخر اور غرور کی قباحت وشناعت شدت کے ساتھ بیان کی ہے جس کے ازالہ کے لیے اسلام نے انتہائی جدوجہد کی ہے کہ بارگاہ خداوندی میں عملی جدوجہد ہی کی اہمیت ہے نسب بغیر عمل صالح اور بغیر اخلاق کاملہ وعقائد فاضلہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

شیخ مدنی لکھتے ہیں فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ نہایت جھوٹا تکبر اور بالخصوص ہندوستان میں اور بالخصوص سادات اور پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے نہایت جھوٹا تکبر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھود ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا؛ بلکہ ہندوستان میں آ کر برادران وطن کی دیکھا دیکھی اور بڑھ گیا...... ان لوگوں کی ایسی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے صرف یہی نہیں کہ غریب مسلمانوں اور پیشہ ور مسلم برادریوں اور نومسلم خاندانوں کے دل ودماغ پر سنگین اور دلخراش ٹیس لگتی ہے؛ بلکہ اشاعت اسلام اور اس کی ہمہ گیری میں بھی فرق پڑتا ہے اسلامی اصول اور اس کا تفوق چکنا چور ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے حجاب بنتے ہیں امت مرحومہ کی زیادتی میں روڑے اٹکتے ہیں جس کی اسلامی تعلیمات میں انتہائی ممانعتیں وارد ہیں، العیاذ باللہ۔

شیخ مدنی مزید تحریر فرماتے ہیں انھی وجوہ سے مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ اعمال واخلاق اور اس کم مائیگی پر خود کو سید یا پیرزادہ کہوں یا لکھوں اور اپنے اس نسب پر فخر کروں مگر اس حیرت انگیز طور پر عمل کی شناعت وقباحت پر بڑی تفظیع کے لیے صفحات ہیں زور دینے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں اس میں

بھی شک نہیں کہ غیر اختیاری نعماء الٰہیہ میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے...... یہ شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت عطیہ خداوندی ہے اس لیے اس پر شکر گزاری اور تحدیث بالنعمہ کرنا ضروری ہے۔

یہ واقع ہے کہ اسلامی احکام وتعلیمات میں نسبی تفاخر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور قبائل و شعوب میں صرف اس لیے بانٹ دیا؛ تا کہ ایک دوسروں کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز صرف وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ (الحجرات)

حیرت انگیز امر یہ ہے جیسا کہ شیخ مدنی نے تحریر فرمایا ہے سلسلۂ نسب آباء اور ذکور سے ہوتا ہے اناث کو اس میں دخل نہیں اس طبقہ کے جتنے بھی شجرۂ نسب پائے جاتے ہیں ان سب میں صرف آباء و اجداد کا ذکر پایا جاتا ہے کہیں بھی ماؤں کا کوئی ذکر نہیں ملتا؛ لیکن نام نہاد سادات نے جب برصغیر ہند میں ورن و بوستا اور ذات پات کا زور دیکھا تو انہیں بھی خود کو سب سے برتر قرار دینے کا خبط لاحق ہوگیا، اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہاں ایک طبقہ خود کو برہمن قرار دے کر اس امر کا دعویدار بن گیا کہ وہ خدا برہما کے سر سے پیدا ہوا ہے اس لیے سب سے ارفع، اعلیٰ و برتر ہے تو وہ بھی ارفع و اعلیٰ و برتر بننے کے جنون میں مبتلا ہو گئے؛ لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اللہ کا سر قرار نہیں دے سکتے تھے کہ اس کی ذات غیر مجسم ہے اس کا سر ہی نہیں ہے اس لیے انہوں نے اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ اگر ہم اللہ کے سر سے پیدا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تو اس کے رسول کے نطفہ سے تو اپنا تعلق جوڑ سکتے ہیں؛ چنانچہ باوجودیکہ یہاں سے وہاں تک ان کا شجرۂ نسب باپ داداؤں پر منحصر ہوتا ہے حسن وحسین کا تعلق باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقطع کر دیا کہ شجرۂ نسب میں حسن حسین کو ابنائے علی نہیں لکھتے؛ بلکہ ابنائے فاطمہ لکھتے ہیں نوع انسانی کی تاریخ میں ماں کی طرف صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کی جاتی ہے ان کو عیسیٰ بن مریم کہا جاتا ہے اس کی وجہ واضح ہے کہ ان کو خالق کائنات نے بغیر باپ کے پیدا کیا تھا جیسے حضرت آدم کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر خاص اپنی قدرت سے پیدا کیا تھا۔ حضرات حسنین کے تو باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں؛ لیکن خود کو سید کہنے والے اپنا شجرۂ نسب یہاں سے وہاں تک باپ دادا کی بنیاد پر تیار کرتے ہیں اور حضرات حسن وحسین کو ابنائے علی لکھنے کے بجائے ابنائے فاطمہ لکھتے ہیں پھر فاطمہ بنت خدیجہ نہیں بت محمد کہہ کر وہی باپ والا سلسلہ چلا دیتے ہیں اس طرح انہوں نے خود اسلام کے برہمن بننے کے لیے یہ چور دروازہ اختیار کیا ہے، یوں بھی اس برصغیر ہند کے علاوہ کہیں کوئی سید قوم یا برادری نہیں پائی جاتی، اہل عرب محض احتراماً محترم جناب اور شریمان وغیرہ کی طرح سید یا پھر شیخ کہہ کر پکارتے ہیں۔

اس کے علاوہ جب حضرات حسن وحسین کی اولاد مصر میں پہنچی اور حکمراں بنی تو تاریخ نے ان کو فاطمی حکمراں کہہ کر پکارا، برصغیر ہند میں دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کرنے والے ان لوگوں نے یہاں لوگوں کو کلمۂ

طلبہ پڑھا کر مسلمانوں کی صفوں میں ضرور شامل کیا؛ لیکن دوسری طرف برہمن وادی غلبہ و تسلط سے نکال کر اپنا زیر دست بنالیا اور اکثر و بیشتر ان کے ساتھ وہی اونچ نیچ کا سلوک روا رکھا جو ہندوؤں کے ساتھ برہمن کرتے تھے یہاں تک کہ شودر کہلانے والوں کے ساتھ وہی اچھوت والا طریقہ اور ان کو حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر جہنم کی آگ سے نجات پا کر جنت کی راہ پر چلنے سے روک دیا، ان کے لیے دین اسلام میں داخل ہونے کی راہیں اس طرح بند رکھیں جس طرح ہندو برہموں نے مندروں میں داخل ہونے وید ہشاستہ پڑھتے، سننے اور دھرم کرم کے ذریعہ مکتی پانے کی راہیں مسدود رکھیں، حالات کی سنگینی کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ گذشتہ دنوں راقم کے قصبہ میں ایک خبط الحواس بازی گری والی ذہنیت کے حامل فرد نے کنورٹڈ مسلم کا لیٹر پیڈ طبع کرالیا اس کا کہنا تھا کہ چار برادریوں شیخ، سید، مغل، پٹھان کے علاوہ سب مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہیں اور صرف مذکورہ چار برادریاں بغیر تبدیلی مذہب کے اصل مسلم ہیں۔ اس سے کہنا پڑا کہ ہمارے بزرگوں نے اب سے ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اسلام قبول کیا تھا وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے ان کو تو تبدیلی مذہب کے ذریعہ مسلمان ہونے والے نومسلم، کنورٹڈ قرار دیا جا رہا ہے۔ مغلوں اور پٹھانوں نے اب سے پانچ سو سال قبل ۱۵۰۰ء کے آس پاس اسلام قبول کیا تھا وہ غیر کنورٹڈ مسلم قرار پاتے ہیں۔ شیخ سیدوں نے ۱۴۰۰ سال قبل رسول اللہ کی بعثت اور دعوت کی بنیاد پر اسلام قبول کیا وہ بھی اَن کنورٹڈ رہے۔ یعنی ۵۰۰ سال پہلے والے بھی اَن کنورٹڈ ۱۵۰۰ سال پہلے والے بھی اَن کنورٹڈ اور بیچ میں ۱۰۰۰ سال پہلے والے کنورٹڈ؟ یہ منطق ناقابل فہم اور بے بنیاد ہے۔ الغرض دین اسلام میں برہمن واد کو جنم دینے کے نتیجہ میں اسلام کی اشاعت کو بہت نقصان پہنچا ہے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کرنے والے اس قباحت و شناعت سے جتنی جلد نجات حاصل کرلیں اتنا ہی بہتر ہے۔

ذریعہ معاش خاندان

شیخ مدنی نے تحریر فرمایا ہے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت خاندان کے پاس تیرہ یا چودہ گاؤں تھے جن کی وجہ سے مشتہر کہ خاندان نہایت ثروت اور رفاہیت سے گذر بسر کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے یہاں پرچہ گذانے پر خانقاہ کے مصارف کے لیے یہ دیہات دیئے گئے تھے (واللہ اعلم) ۱۸۵۷ء میں خانقاہ وغیرہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے ان میں اہل خاندان کے مالکانہ تصرفات جاری تھے اس سے پہلے گیارہ گاؤں غیر معلوم انقلابات اور اسباب کی بنا پر قبضہ و تصرف سے نکل گئے تھے انگریزی حکومت کے زمانہ میں زمینوں اور جاگیروں کی جو قدر و منزلت بڑھ گئی ہے زمانہ سابق میں وہ؛ بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا، رہن رکھ دینا؛ بلکہ دوسروں کو تحفہ بخش دینا معمولی خدمات کے صلہ میں گاؤں گاؤں ہدیہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم رؤساء میں عام تھا۔

۱۸۵۷ء کے آخری ایام میں ٹھکیسی کے راجہ نے موقع پا کر حملہ کر دیا اور سب کچھ لوٹ لیا، آپ کے دادا تین بھائی پیر علی، نوازش علی اور تیغ علی تھے۔ نوازش علی اور تیغ علی لاولد رہے صرف آپ کے دادا پیر علی صاحب کو اولاد ہوئے۔ آپ کے والد حبیب اللہ صاحب مرحوم الہ داد پور میں ۱۸۵۷ء سے ۵۰۴ برس پہلے پیدا ہوئے ان کو منجھلے دادا تیغ علی مرحوم اور ان کی اہلیہ نے گود لے کر نہایت شفقت ومحبت سے پالا؛ لیکن تقدیر الٰہی نے ایسی پلٹی کھائی کہ وہ ۱۸۵۱ء تک تینوں دادا بھائی انتقال کر گئے گھر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا زمین داری اور ثروت چھن گئی افلاس اور ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحومہ نے نہایت تنگ دستی کی حالت میں والد صاحب کی پرورش کی فرمایا کرتی تھیں میں نے چرخہ کات کات کر حبیب اللہ کو پالا۔

والد صاحب کی خوبیاں لکھتے ہیں والد صاحب مرحوم نے فضل وکرم خداوندی سے ذہن اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا طبیعت نہایت تیز اور مستقیم تھی اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ میں علمی درس گاہوں میں پہنچتے رہے اور قرآن شریف، فارسی اور اردو میں مڈل پاس کر لیا اور عنفوان شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ہی پرائمری اسکول التفات گنج میں ۸؍روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس زمانہ میں تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کیے نہیں ہو سکتی تھی؛ جبکہ نارمل اسکول پورے صوبہ میں صرف لکھنؤ میں تھا۔ اس لیے ان کو لکھنؤ جانا پڑا، وہاں پہنچ کر بہت جلد عمدہ طریقہ پر کامیاب ہوئے اور پاس ہوتے ہی پہلے قصبہ صفی پور ضلع اناؤ میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر ناگرمؤ میں تبدیل کر دیے گئے وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے صرف فارسی اردو اور ہندی بھاشا سے واقف تھے جو شیخ نے اپنے والد، والدہ اور نانی کے اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی بھاشا پڑھنے پڑھانے کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ میں ان لوگوں کا ہندی بھاشا پڑھنا حیرت انگیز امر ہے۔ حضرت شیخ کے والد مرحوم نے بعد میں ناگرمؤ سے کم تنخواہ پر ٹانڈہ تبادلہ کرایا اور ملازمت کے ساتھ ساتھ جائیداد کی دیکھ بھال خود کرنے لگے۔ انہوں نے باوجود ہر قسم کی عسرت اور تنگ دستی جس نے ان کو بچپن کے زمانہ سے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا حیران کن ترقی کی اور نہ صرف عسرت اور تنگ دستی کو دور کیا؛ بلکہ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ذکر وفکر ومراقبے میں جد وجہد کی یہاں تک کہ کشف بہت قوی اور زیادہ ہو گیا۔ حضرت مولانا گنج مرادآبادی سے ان کو خلافت اور اجازت زندگی میں ظاہر ہے نہیں ملی تھی مگر بعد از وفات والد صاحب نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کو خواب میں دیکھا کہ میں تم کو اجازت بیعت دیتا ہوں

تعویذ اور عملیات میں بھی ان کو اچھا خاصا ملکہ اور کامل مہارت تھی۔ طبعی طور پر شاعری سے بھی دلچسپی تھی بالخصوص ہندی بھاشا میں ان کے قصائد بہت زوردار اور مضامین تصوف سے بھرے ہوئے ہیں فارسی اور اردو میں ان کے نعتیہ اشعار بہت ہی زمانہ شباب اور مدرس میں ان کی طبیعت ریاضی اور حساب میں بہت زیادہ تیز تھی مگر آخری عمر میں تصوف کا غلبہ اس قدر ہو گیا تھا کہ سب کو بھلا بیٹھے تھے۔ لکھا ہے والد صاحب مرحوم مستجاب الدعوات بہت زیادہ تھے جس نے ان کو ستایا اور اس کو انہوں نے بددعا دیدی تو وہ پنپنے نہیں پایا، ان کے پانچ لڑکے مولانا محمد صدیق، مولانا سید احمد، جو شیخ حسین احمد مدنی، جمیل احمد اور محمود احمد۔ تین لڑکیاں زینب، نسیم زہرا اور ریاض فاطمہ پیدا ہوئیں۔

شیخ مدنیؒ لکھتے ہیں بھائی سید احمد نے ایک خط میں لکھ دیا میاں اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں رہی اب تو مدینہ منورہ چل لیے باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشق محمدی کی آگ بھڑک اٹھی اور ہر دم یہی پیچ وتاب میں رہنے لگے کہ تمام گھرانہ کو لے کر وہیں چلنا چاہیے۔ گیارہ بارہ نفوس والے خاندان کے سفر مدینہ کا بوجھ معمولی نہ تھا۔ مختلف لوگوں نے طرح طرح سے سمجھایا مگر کسی کی بات نہ مانی غالباً تین ہزار روپے میں دونوں گاؤں الہ داد پور اور جڑاون پور کا زرعی حصہ فروخت کر کے شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانہ ہو گئے۔

۳۲-۱۳۳۳ھ میں جب پہلی عالمی جنگ عمومی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھی اور ترکی حکومت بھی اس میں شامل تھی شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا خلیل احمد قدس اللہ سرہما حجاز تشریف لے گئے اسی زمانہ میں شریف حسین انگریزوں کے ساتھ مل کر ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ مدینہ منورہ کی پولیس کو ہندوستانیوں سے عموماً اور ہمارے خاندان سے خصوصاً بدظنی پیدا ہو گئی تھی اس لیے حضرت شیخ الہند کی مدینہ سے مکہ کو روانگی کے بعد والد صاحب کو مع دونوں بھائیوں مولانا سید احمد اور محمود کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کر کے اڈیانوپل بھیج دیا گیا بچوں اور عورتوں کو مدینہ ہی میں چھوڑ دیا گیا بہت عرض معروض کیا گیا؛ لیکن فوجی حکام نے ایک نہ سنی حضرت شیخ الہند کے ساتھ انگریزی اسیری میں تھا اس زمانہ میں مالٹا میں ان کے انتقال کی خبر ہو پہنچی۔

تعلیم وتربیت اور ایام طفولیت

حضرت شیخ مدنی نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت تو بانگر مئو میں ہوئی تھی؛ لیکن انہیں وہاں رہنے کی کوئی بات یاد نہیں، ہوش وحواس آگئے تو اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا۔ والدین مرحومین کو تعلیم وتربیت کا بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لیے والدہ مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے ہر بچہ کو چار برس کا ہو جانے پر پڑھنے کے لیے

ھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے، یاد نہ کرنے اور کھیلنے پر خوب مارتے تھے۔ اس لیے آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع رف چار برس کی عمر تک ملا صبح ساڑھے نو بجے تک گھر میں والدہ مرحوم کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے عد سپارہ پڑھنا پڑتا تھا، پھر کھانا کھا کر والد صاحب کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا جو تقریباً ایک میل یا زیادہ وری پر تھا چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا اس کے بعد والد صاحب کے ساتھ ہی گھر آنا ہوتا تھا گھر پر بھی سخت قید تھی باہر نکلنے، گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اگر کسی موقع پاکر نکل جاتے تو پتہ چلنے پر سخت مار پڑتی تھی۔ صرف دو گھروں میں آزادی کے ساتھ جاسکتے تھے ایک نانے صاحب کے یہاں دوسرے ماموں کے گھر۔ ماموں زاد بھائی ہم عمر تھا موقع پاکر اس کے ساتھ گولی کھیل لیتے تھے وہاں بھی کھیلنے کی خبر ہوجاتی تو مار پڑتی تھی، بہرحال ایام طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی وہ بھی چھپ چھپا کر آزادی کے ساتھ بھی نصیب نہ ہوا پتنگ، گیند، یا گلی ڈنڈا کھیلنا نصیب ہی نہ ہوا اس طرح آٹھ برس وطن میں قیام رہا جہاں پانچ دیں سپارہ تک والدہ سے اور اخیر تک قرآن شریف ناظرہ والد صاحب سے پڑھا اس کے بعد گلستاں کے کچھ حصہ تک فارسی گھر پر اور مختلف فنون جبر و مقابلہ۔ اقلیدس، جغرافیہ تاریخ وغیرہ سب اس عمر میں یاد اور مشق کر چکے تھے۔

بڑے بھائی پہلے سے دیوبند میں پڑھتے تھے جب حضرت شیخ کی عمر کا تیرہواں سال شروع ہوا اس وقت دوسرے بھائی سید احمد بھی اردو مڈل اسکول پاس کر گئے ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ میں دیوبند بھیج دیئے گئے اب حضرت شیخ کو گھروں میں سے ڈھونڈ کر لانے والا کوئی نہ رہا، طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا ہی پوری طرح آزادی مل گئی موقع ملتے ہی ماموں کے گھر جاکر کھیلنا شروع کردیتے وہاں ہر ایک ہمدردی سے پیش آتا تھا اور ان کی مظلومیت کھیلنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے تیلی کے بیل کی طرح دن رات لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا پڑتا ہے، ہمدردی کا اظہار کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے والد صاحب کو سخت پریشانی ہوتی اگرچہ مارا پیٹا بھی بہت زیادہ مگر سب بے سود رہا دو چار دن مار کا اثر رہتا پھر وہی کھیل کا شوق سوار ہوتا۔ بالآخر طے کیا گیا کہ ان کو بھی دیوبند ہی بھیج دیا جائے؛ چنانچہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں دیوبند پہنچادیے گئے وہاں دونوں بھائیوں کے زیر سایہ انہی کے کمرہ میں رہنے لگے، عمر کم تھی پھر جسم دبلا پتلا اور پستہ تھا تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھے خط بھی اچھا تھا اس لیے اساتذہ کے گھروں میں جانے پر پردہ نہ کیے جاتے خانگی خطوط اور حسابات کی خدمت کا سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا حتی کہ مستوراتی منشی مشہور ہوگئے۔ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام کے دوران ساڑھے چھ سال کی مدت میں حضرت شیخ الہند ان کے والد مولانا ذوالفقار علی، مولانا عبدالعلی، مولانا الحافظ احمد خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سمیت ۱۱ اساتذہ سے سترہ فنون کی کتابیں پڑھیں جو اس

نظامی اور درس ولی اللہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

مدینہ منورہ کے لیے روانگی

شعبان ۱۳۱۶ھ میں والد صاحب کی سربراہی میں ۱۲/افراد پر مشتمل قافلہ مدینہ کے لیے روانہ ہوگیا اور ذیقعدہ کی ۲۴ یا ۲۵ رتاریخ کو مکہ معظمہ پہنچا یہاں ہی حضرت قطب عالم الحاج امداداللہ صاحب، تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے بعد ۲۵/۲۶رذی الحجہ کو مدینہ کے لیے روانگی ہوئی اور بارہویں دن مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، مدینہ منورہ پہنچ کر حارۃ الاغارات میں ایک وسیع مکان لیا گیا اور باب السلام کے درمیان ایک دوکان کرایہ پر لی گئی اور پرچون کا سامان چائے، شکر، صابن، دال، چاول وغیرہ رکھا گیا، نیز قرار پایا کہ کھجوروں کے موسم میں جب کھجور باغوں سے نیلام کے لیے بازار میں آتی ہیں خرید لی جائیں اور محفوظ مخزنوں میں ذخیرہ کرلیا جایا کرے پھر موسم حج میں فروخت کردیا جایا کرے۔ تھوک مال بڑے بھائی مولانا محمد صدیق خریدتے تھے اور دوکان پر میں اور بھائی سید احمد باری باری سے بیٹھتے تھے، کبھی کبھی بڑے بھائی بھی بیٹھتے تھے۔ ساتھ ہی میں نے سلسلہ کتابت علی الاجرت شروع کردیا عربی نسخ خط میں کتابیں نقل کرتا اور اجرت حاصل کرتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت دو کتب خانے تھے ایک کتب خانہ شیخ الاسلام اور دوسرا محمودیہ ان دونوں کے لیے استنبول میں اوقاف تھے جن کی آمدنی کا بڑا حصہ ان کے نظم ونسق پر صرف ہوتا تھا۔ بعد میں ترکی حکومت نے ان کو ضبط کرلیا۔ ان دونوں کتب خانوں میں نایاب قلمی کتابیں بکثرت تھیں۔ مدینہ میں مقیم بیرونی باشندے (مجاورین) اہالی شہر، زائرین اور مصر ومغربی افریقہ وغیرہ کے لوگ یہاں سے کتابیں نقل کراتے رہتے تھے مگران کتب خانوں سے کتاب باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی کتب خانہ روزانہ ۷/گھنٹے کھلتے تھے اس وقت میں نقل کی جاسکتی تھی، اس کے علاوہ مدینہ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب مولانا الشیخ آفندی عبدالجلیل براوہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں تینوں بھائی پڑھتے تھے۔

اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو شیخ الہند نے پرزور طور پر ہدایت فرمائی تھی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے ایک دو طالب علم ہی ہوں، اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کچھ ہندوستانی اور عرب طلبہ بغرض عربی کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔ اس لیے ایک ایک دو دو طالب علم کو پڑھانا شروع کردیا، ۱۳۱۸ھ ذیقعدہ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا پھر محرم ۱۳۲۰ھ میں واپس مدینہ منورہ پہنچے تو سلسلہ

تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا۔

اگر چہ ہمارا خاندان غریب تھا تاہم بہت سے خانہ داری امور برتن دھونا جھاڑو وغیرہ گھر میں لگانا ملازم عورتیں انجام دیتی تھیں مگر مدینہ پہنچ کر یہ سب کام گھر کی عورتوں کو خود ہی کرنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا تو یہاں وطن میں بھی انہی کو کرنا پڑتا تھا مدینہ میں آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا؛ حالانکہ وطن میں یہ کام انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا والدہ مرحومہ باوجود ضعیف العمری کے بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں بہوؤں کو باری باری بٹھاتی تھیں مگر خود ہر ایک کے ساتھ چکی پیسنے اور دوسرے کاموں میں لگی رہتی تھیں اس طرح عورتوں کو اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے؛ حالانکہ وطن میں اس سے کبھی بھی واسطہ نہ پڑا تھا؛ مگر مدینہ منورہ میں سب لوگ اپنے اپنے گھروں ہی میں کپڑے دھوتے ہیں۔ متوسط اور غریب طبقہ والوں کی بیویاں خود دھوتی ہیں اور امرا کی باندیاں دھوتی ہیں عموماً گھروں میں دستری اور کلف کا سامان پایا جاتا ہے اہل مدینہ نہایت خوش پوشاک اور خوش خوراک ہیں مگر دھوبیوں کا دستور نہیں ہے۔ اس میں عورتوں کو ابتدا میں ناگواری ہوئی مگر چارہ ہی کیا تھا، آہستہ آہستہ عادت ہوگئی ہم مردوں کو بھی بسا اوقات کپڑوں کا دھونا اور مشکوں میں میٹھا پانی کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا تھا یہ کام میں اور بھائی سید احمد رات کو جب نہر کے مخزن کی بھیڑ کم ہو جاتی تھی انجام دیتے تھے؛ کیونکہ ایک مشک پانی جو سقہ سے روزانہ لیا جاتا تھا کافی نہ ہوتا تھا۔ کھانا بھی نہایت معمولی ہوتا تھا والد مرحوم نہایت منتظم طبیعت کے حامل تھے اکثر بازار کی سستی سے سستی ترکاری لاتے تھے کبھی کبھی گوشت اور اکثر دال ہی پکتی تھی کہ کھجوروں کی تجارت میں نفع تو ہوا مگر کم؛ البتہ کھجور کھانے کو بہت ملیں۔

آگے چل کر دوکان بند کر دینی پڑی بھائی سید احمد کو بغرض نو وارد سیٹھوں کے یہاں بچوں کی تعلیم کی ملازمت مل گئی ان کی تنخواہ بیس روپے ماہانہ تھی۔ اس دوران ہم دونوں بھائی ہندوستان کے سفر پر آ گئے، مجبوراً والد صاحب کو ایک میمن سیٹھ سے ۵۰ روپے قرض لینے پڑے دال اور چاول خریدے ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین پر تمام گھر والوں کو کئی ماہ تک گذارہ کرنا پڑا ہم دونوں بھائی ہندوستان پہنچے تو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں نے کچھ روپے آپس میں چندہ کر کے ہدیۃ والد صاحب مرحوم کو دیئے وہ ہم نے بذریعہ ہنڈی بھیجے تو والد صاحب نے قرض ادا کیا اور کسی درجہ کھانے پینے میں وسعت پیدا ہوئی یہ چند مہینے ہمارے گھر والوں پر سختی کے گذرے اس کے بعد آہستہ آہستہ فراخی آتی گئی۔

تعمیر مکان

ایک افتادہ زمین حجرہ مطہرہ نبویہ کے خاص خادموں کے لیے وقف تھی، ایسی زمین بیکار ہونے پر بحکم

قاضی فروخت کردی جاتی تھیں جس میں صرف منافع فروخت کیے جاتے تھے اور اصل زمین برائے وقف باقی رکھی جاتی تھی جس کا کرایہ سالانہ خریدار کو دینا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں زمینیں سستی تھیں؛ چونکہ اس وقت والد صاحب مرحوم کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی اس لیے اتنا بڑا ایک قطعہ زمین خریدنا ضروری ہوگیا جس میں چھ مکان بن جائیں۔ کچھ روپیہ اپنے پاس تھے پانچ سو روپے قرض لے اس طرح زمین کا ایک بڑا قطعہ نقشہ بنا کر خرید لیا۔

ہندوستان سے واپسی پر مین شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ معہد و مدرس ۲۵/روپے ماہانہ پر ملازمت ہوگیا بڑے بھائی صاحب بمبئی ایک نووارد سورتی سیٹھ کے بچوں کی تعلیم کے لیے ملازم ہوگئے۔ میں نے اس زمانہ میں کتابت کا مشغلہ ترک کر دیا تھا اور چونکہ طلبا کا ہجوم ہوا اس لیے مدرسہ کے اوقات سے خارج میں حرم نبوی میں صبح کی نماز کے بعد عصر کے بعد مغرب کے بعد عشا کے بعد بھی مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھانی شروع کر دیں۔ میرے پاس طلبہ کا اجتماع بہت زیادہ ہوگیا جس کی وجہ سے متعدد مدرسین حرم محترم کو حسد ہونے اور رقابت پیدا ہوگئی، ناظر مدرسہ شمسیہ باغ نے اصرار کیا کہ طلبہ تمہارے پاس مسجد نبوی میں نہیں؛ بلکہ مدرسین آکر پڑھا کریں مگر اس بات کے لیے سب طلبہ راضی نہیں ہوئے ان میں صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے ترک، بخاری، قازائی، قزاق، ترکستان، کابلی، اور مصری وغیرہ بھی تھے ناظر مدرسہ کا یہ بھی اصرار تھا کہ مدرسہ کے خارج اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جس کی وجہ سے مدرسہ کی ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا اور طے کیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کا معاملہ اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے اس طرح طلبہ کی تعداد بڑھ گئی کتب درسیہ کا میدان وسیع ہوگیا روزانہ چودہ اسباق ہونے لگے۔

ناظر مدرسہ شمسیہ کو بات نہ ماننے اور استعفیٰ کی وجہ سے رنجش خاطر ہوگئی انہوں نے نوٹس دیدیا کہ کرایہ پر دیا گیا مکان خالی کر دو ہم نے والد صاحب مرحوم کی سربراہی میں ضروری سمجھا کہ اپنے خریدے ہوئے قطعۂ زمین میں چند کمرے گذارہ کے لائق اپنے ہاتھوں سے بنا لیے جائیں گھر کے مرد وعورت سب اس کام میں لگ گئے میں نے بھی ان دنوں اسباق بند رکھے تقریباً ۱۵-۲۰ دن کی محنت مشقت سب نے مل کر پانچ کوٹھریاں، ایک غسل لخانہ ایک بیت الاخلاء اور ایک پردہ کی دیوار تعمیر کرلیں اور سب اپنے مکان میں آکر رہنے لگے، آگے چل کر بھائی سید احمد صاحب کی عالی ہمتی اور بے انتہا جدوجہد سے مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ وجود میں آیا جس میں علوم دینیہ اور حفظ وقرأت قرآن کریم کا عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا جو اب تک جاری ہے۔ ہندوستان سے والد صاحب کو ان کے پیر بھائی اور احباب جو رقوم بھیجتے تھے یا جو رقوم ہمارے بعض احباب وغیرہ حج وطبرد کے توقع پر دے جاتے یا کوئی اور بالائی آمدنی ہوتی اس سب کو جمع کر کے بعد میں والد صاحب نے تین منزلہ پختہ

کان تعمیر کرادیے۔

۱۳۲۰ھ میں بعض کرم فرماؤں کی عنایت سے حضرت والد صاحب مرحوم کے لیے ۱۵-۲۰ روپے ہوار کا وظیفہ دعاگوئی بھوپال سے مقرر ہوگیا اور نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کی آمد پر دس بارہ آدمیوں کو وزانہ بخاری شریف پڑھنے اور دعا کرنے لیے مقرر کیا گیا ان میں بڑے بھائی صاحب کا اور میرا نام بھی تھا کچھ عرصہ بعد بھائی سید احمد صاحب کا نام آگیا ہر شخص کے لیے ۱۰-۱۰ روپے ماہوار مقرر کیا گیا۔ نقشوں کی ترتیب، خطوط کتابت اور مراسلات وغیرہ کے لیے ایک محرر کی ضرورت تھی یہ خدمت بھی ۱۵ روپے ماہانہ کے معاوضہ پر مجھے سونپی گئی پھر نواب بہاولپور بسلسلہ حج وعمرہ تشریف لے گئے تو ان کے مولانا رحیم بخش مرحوم وزیر عظم کی سعی سے بھی میرے لیے یہ روپے ماہانہ مقرر ہو گئے، اس طرح آہستہ آہستہ خاندان کی فی الجملہ اتنی آمدنی ہوگئی کہ قناعت اور اطمینان کے ساتھ مشاغل علمیہ ودینیہ میں منہمک ہوسکیں۔ ساری رقم والد صاحب مرحوم کی خدمت میں پیش کردی تھی اور وہ اپنے حساب سے صرف فرماتے تھے۔

بیعت وتلقین

دارالعلوم کے دور طالب علمی میں ہی مدینہ کے لیے روانہ ہونے سے قبل میں اور میرا بھائی سید احمد حضرت گنگوہی سے بیعت ہو گئے تھے بڑے بھائی صدیق احمد صاحب پہلے ہی بیعت ہو چکے تھے۔ حضرت نے فرمایا تھا بیعت تو میں نے کرلیا اب تم مکہ معظمہ جارہے ہو وہاں قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ سے ذکر کرنا اور تلقین ذکر حاصل کرلینا۔ حضرت قطب عالم نے ہمیں پاس نفاس کی تلقین فرمائی اور جب قافلہ اخیر عشرہ ذالحجہ میں مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہونے لگا تو خلاف معمول بعد ظہر ہم تینوں بھائیوں کو طلب فرمایا بہت شفقت فرمائی سروں پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ کہو ہم نے قبول کیا، ہم نے حسب تلقین عمل کیا حضرت نے دعا فرمائی اور ہم رخصتی مصافحہ کر کے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو گے حضرت قطب عالم کا چند ماہ بعد جمادی الاول میں وصال ہوگیا۔

شوال ۱۳ھ میں گنگوہ سے حضرت گنگوہی کا والا نامہ وارد ہوا کہ بہتر ہوگا اگر ایک مہینہ کے لیے گنگوہ آجاؤ اس دوران بڑے بھائی محمد صدیق کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات انجام دیتے تھے کہ ہندوستان سے روانگی کے وقت انہوں نے حضرت گنگوہی سے اپنے ذکر وشغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی تو حضرت نے فرمایا تھا اب تو چلے جاؤ پھر وہاں سب کو چھوڑ کر چلے آنا۔ انہیں یہ مقولہ یاد آگیا اور ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی حتیٰ کہ ذیقعدہ میں وہ بغیر بتائے دوبارہ ہندوستان روانہ ہو گئے بعد میں ان کی

روانگی کے بارے میں معلوم ہونے پر والد صاحب نے فرمایا وہ تو بغیر کہے چلے گئے تمہیں وہاں بلایا گیا ہے اس لیے تم بھی چلے جاؤ۔ بھائی صاحب جدہ پہنچ گئے مگر وہاں کوئی جہاز ہندوستان جانے کے لیے نہ ملا تو پریشان ہو گئے والد صاحب ۶۰ روپے سفر خرچ کے لیے دے کر ان کے ساتھ ہندوستان جانے کے لیے مجھے بھی بھیج دیا وہاں سے ہندوستان جانے والا جہاز مجھے بھی نہ ملا اس لیے حج کے بعد ہندوستان جانے کا فیصلہ ہوا اور پہلے مکہ معظمہ پہنچ کر مناسک حج ادا کیے اور پھر وہ جدہ پہنچے اور وہاں سے کافی تکالیف و پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہوئے معمول کے آٹھ دس دن کی بجائے ڈیڑھ مہینہ سے بھی زیادہ مدت میں کراچی پہنچے وہاں سے بھی کافی دشواریوں کے بعد گنگوہ پہنچا ہوں۔ وہاں خانقاہ میں دونوں کو الگ الگ حجرے ملے کھانا دونوں کے لیے حضرت کے یہاں سے آنے لگا اور مراقبہ تعلیم فرمایا۔

عصر کے بعد خدمت میں قریب بیٹھ کر مراقبہ میں مشغولیت سے مجھ کو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوا، بالآخر حضرت نے عمامے منگا کر اپنے دست مبارک سے ہمارے سروں پر باندھ دیے اور فرمایا یہ دستار خلافت ہے میری طرف سے تم دونوں کو بیعت کرنے کی اجازت ہے۔ اس کے دو تین دن بعد میں نے عرض کیا کہ میں سلسلۂ نقشبندیہ کا سلوک بھی طے کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ تمہیں میں نے جو تعلیم دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے۔ یہاں تمام سلسلے مل جاتے ہیں اس کی مشق کرو۔

پھر موسم حج قریب آگیا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جس سے مدینہ منورہ تک واپسی کی صورت ہوگئی۔ مدینہ میں پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوگیا جہاں طلبہ کا بھی بہت زیادہ ہجوم ہوگیا۔ میر پہلی شادی ۱۳۱۲ھ میں قتال پور پرگنہ اتر ولیہ ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی میرے خسر صاحب تو بہت پہلے فوت ہو چکے تھے میری اہلیہ کو اس کے ماموں شیخ کفایت اللہ نے پالا تھا وہ ریاست بلرام پور میں ملازم رہے تھے ہمارے مدینہ منورہ کو روانگی کے وقت وہ بعہدہ معتمد ریاست لکھنؤ میں مقیم تھے۔ ۱۳۲۶ھ میں میرے پہلی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تو نکاح ثانی کی غرض سے ۱۳۲۶ھ کے آخر میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوا جہاں حکیم غلام احمد صاحب بچھرایونی کی منجھلی بیٹی سے نکاح ہوا، اس دوران میں نے دوبارہ ترمذی شریف اور بخاری شریف حضرت شیخ الہند سے پڑھیں اور دوسری اہلیہ کے ساتھ میرا قیام بھی حضرت ہی کے یہاں رہا۔

مدینہ منورہ میں میرے درس میں علمی شغف رکھنے والے طلبا کا اس قدر ہجوم ہونے لگا تھا کہ دوسرے علماء اور مدرسین کے یہاں اس کی کوئی مثال نہ تھی عوام کے اجتماع سے تو بعض حلقے بڑے بڑے ہوتے تھے مگر علمی شغف رکھنے اور جد و جہد کرنے والے دوسروں کے یہاں کم تھے۔ میرے یہاں عوام تو کم ہوتے تھے کہ علمی بحثیں ان کی سمجھ میں آنی دشوار ہوتی تھیں اس لیے ان کو دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ بعض علماء ایسے بھی کہ شروع میں

ان کے یہاں رجوع بہت زیادہ تھا مگر بعد میں کم ہوگیا اور ان کے طلبا بھی میرے یہاں آنے لگے اس بنا پر جہاں ایک طرف بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہوگئی دوسری طرف ایک جماعت حاسدوں اور رقیبوں کی بھی پیدا ہوئی اس کے علاوہ غیر علمی ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت تھی جو محض اس بنا پر کینہ و بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اس قدر قبولیت اور رفعت کیوں حاصل ہوتی جارہی ہے: گرچہ میرے طرز عمل اور اکابر کے اتباع میں اخلاق و اعمال اور تواضع کے اظہار کی وجہ سے ان کی کامیابی کی صورتیں منصۂ ظہور پر نہیں آسکیں پھر بھی ان کے دلوں میں حسد کے زخم و پھوڑے بڑھتے رہے۔

احمد رضا خاں بریلوی کی فتنہ انگیزی

۱۳۲۴ھ کے اوائل میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے اور تقریباً ۱۵ روز یہاں قیام فرمایا؛ چونکہ موصوف میرے اساتذہ کرام میں سے تھے اس لیے طلباء مدینہ منورہ کا ان کی طرف بہت ہجوم ہوا اور عموماً علماء مدینہ بھی آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے رہے اور بہت بڑے مجمع نے اوائل کتب احادیث سنا کر مسجد شریف کے اندر بڑے حلقہ میں اجازت کتب حدیث و علوم حاصل کی یہ امر ان متعدد ہندوستانیوں کو نہایت شاق گذرا جو خود یا ان کے اکابر علماء دیوبند اور ان کے اسلاف رحمہم اللہ سے کسی قسم کا اختلاف رکھتے تھے۔ نیز جاہل ہندوستانیوں کو بھی ان کے حسد نے اس پر مجبور کیا۔ ہم پر تو ان کا داؤ اب تک اس لیے نہ چلا تھا کہ اہل مدینہ اور وہاں کے عمائد وغیرہ ہمارے تعلقات و روابط قوی ہو گئے تھے وہ خود یا ان کے لڑکے و احباب ہمارے زیر درس تھے یا دوستی وغیرہ کا تعلق تھا نیز ہماری کوئی تصنیف بھی نہ تھی جس سے ان کو غلط افواہ پھیلانے کا موقع ملتا۔ ہر قسم کی کتب درسیہ اہل سنت والجماعت کی زیر تدریس تھیں اس لیے ان کی غلط بیانیوں کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کو یہ عظمت و شوکت دیکھ کر ان کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے اس کے علاوہ آپ کی کتاب براہین قاطعہ اہل بدعت کے لیے جس قدر سیف قاطع اور دلوں کو چھلنی کرنے والی تھی اس کو ان کا دل ہی جانتا ہے۔

حضرت مولانا قافلہ کے ساتھ واپسی پر مجبور تھے اس لیے پندرہویں دن مع اپنے رفقائے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے مگر مخالفین کے سینوں کو حسد کی آگ میں بریاں کر گئے۔ حضرت کی واپسی کے چند دن بعد مولوی احمد رضا خاں بریلوی مکہ معظمہ سے مدینہ آئے ان کی آمد پر ہمارے مخالفین کی جماعت ان کے ارد گرد جمع ہو گئی اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت و مقبولیت سے ان کو اپنے عقائد و خیالات اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے متعلق

جو خطرات نظر آرہے تھے ان کو پیش کیا۔ مولوی احمد رضا خاں اپنے ساتھ اپنا رسالہ حسام الحرمین لائے تھے جس پر علماء مکہ معظمہ سے تصدیق وتائید میں دستخط کرا چکے تھے اب علماء مدینہ سے بھی دستخط کرانے کے لیے کوشاں تھے۔
یہاں ان لوگوں کا مشورہ ہوا کہ اگر حسین احمد نے اس رسالہ پر دستخط کے خلاف کوشش کی تو پھر ہمیں کامیابی حاصل نہ ہوسکے گی اس لیے طے کیا گیا کہ بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی حکام سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور ان کی خدمات میں نذرانے پیش کیے جائیں۔ واسطوں سے کام لیا جائے مولوی صاحب کے متعدد رسائل پیش کر کے ان کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس فیض آبادی خاندان کو شہر بدر کر دیا جائے ایسا پہلے بھی بار بار ہو چکا تھا کہ کسی آفاقی یا کسی کا علمی شہرہ ہوا، اور اس سے علماء یا اکابر مدینہ کو نفسانی یا واقعی اختلاف ہوا تو اس کو بذریعہ حکومت شہر بدر کرا دیا؛ چنانچہ اس طریقہ پر عمل کیا گیا اور بہت بڑی رقم خرچ کی گئی دوڑ دھوپ کی گئی اور سازشوں کا جال بچھایا گیا، ایک عرصہ تک ہم بالکل بے خبر تھے آخر معلوم ہوا کہ کسی رسالہ پر دستخط لیے جا رہے ہیں جس میں ہمارے اساتذہ کرام کے خلاف وہابیت کے الزامات لگائے گئے ہیں۔
چونکہ سلطان عبد المجید خاں مرحوم کو حکومت کے ابتدائی زمانہ میں حجاز پر نجدیوں کا غلبہ ہو چکا تھا اور انہوں نے دس برس مکہ معظمہ میں اور بعد کے تین برس مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی یہ لوگ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیروئے اور اپنے عقائد واعمال میں شدت پسند تھے انہوں نے رہائی حرمین پرست سختیاں کی تھیں اور اپنے عقائد واعمال کے نہ ماننے والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا اس لیے اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ تنفر تھا بعد میں سلطان عبد المجید مرحوم کے والی مصر خدیوی محمد پاشا مرحوم سے معاہدہ ہو جانے پر خدیوی مرحوم کے بیٹے ابراہیم پاشا نے حجاز کو نجدیوں کے قبضہ سے واگذار کیا اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ رائج ہو گیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا مقصود ہوتا اس کو وہابیت کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ اہل حجاز کو مظالم مذکورہ کی وجہ سے وہابیت سے اس قدر نفرت ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے سلسلہ میں جاری کیا۔
بالآخر رسالہ حسام الحرمین بڑی مشکل سے ہمیں بعض ان افراد کے پاس سے دیکھنے کو مل گیا جن کے پاس یہ تصدیق کے لیے گیا تھا۔ ہم نے فوراً اس کی غلط بیانی اور افترا پردازی کی پول کھولنے کا تہیہ کر لیا۔
اس عالم امتحان وابتلا میں سنت خداوندی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ نیک وصالح بندوں کے خلاف انسانوں اور جنات میں سے دشمن کھڑے ہوتے رہے ہیں جو ان کے خلاف طرح طرح کی افترا پردازیاں اور سازشیں کر کے ان کو ستاتے اور مخلوق خدا کو دھوکہ دیتے رہے ہیں جہاں انبیا کا یہ حال رہا ہے تو ان کے سچے وارثوں کو اس نعمت میں سے بھی حصہ ملنا ضروری ہے؛ چنانچہ ہر زمانہ میں اکابر علماء راسخین اور اتقیا صالحین کے ساتھ ایسا

ہوتا رہا ہے۔اس لیے اکابر علماء دیوبند کو بھی اس وراثت میں سے حصہ ملنا ضروری تھا؛ چنانچہ وہ مل کر رہا اور ایسا کھلا ہوا جھوٹ ان کے خلاف استعمال کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

رسالہ حسام الحرمین میں اکابر دیوبند سے ایسے عقائد ونظریات وخیالات منسوب کیے گئے جن کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا؛ بلکہ ان کی کتابیں ان خیالات ونظریات کے خلاف تحریروں سے بھری پڑی ہیں دوسری بہت ساری باتوں کے علاوہ حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ پر یہ افتراپردازی بھی کی گئی کہ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ معاذ اللہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ کہتا اور عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کو کافر مت کہو؛ حالانکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے فتویٰ اس واقعہ کی برعکس پہلے طبع ہو چکے تھے جن میں تصریح موجود ہے کہ معاذ اللہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو جھوٹا اور کاذب بالفعل کہتا یا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ کافر وملحد وزندیق ہے۔ یہ فتویٰ اردو زبان میں ہی نہیں؛ بلکہ عربی زبان میں بھی ہے اور اس کی تصدیق علماء حرمین شریفین سے بھی کرائی گئی ہے جو کہ فتاویٰ رشیدیہ میں بعینہٖ موجود ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کے خلاف یہ تہمت لگائی گئی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی یعنی نبی آخر الزماں ہونے کے منکر ہیں اور رسالہ تحذیر الناس میں کاٹ چھانٹ کر ایک عبارت مع ترجمہ پیش کی گئی؛ حالانکہ اس رسالہ تحذیر الناس کے صفحہ ۸؍اور ۱۰؍ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی کا صرف اعلان کیا گیا ہے؛ بلکہ متعدد دلائل سے اس کو ثابت بھی کیا گیا ہے اور پھر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا؛ بلکہ رسول اللہؐ کی خاتمیت زمانی کا انکار کرنے والے کے کفر کو بھی ثابت کیا گیا ہے اور اس کے لیے دلائل قائم کیے گئے ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور وخلیفۂ خاص حضرت گنگوہی وقطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ اسرار ہما کے متعلق یہ افترا طرازی کی کہ انہوں نے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں معاذ اللہ شیطان علیہ اللعنہ کے علم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زائد قرار دیا ہے؛ حالانکہ یہ بھی افتراء محض ہے براہین قاطعہ میں یہ بات نہ صراحۃ ہے نہ بالالتزام الصریح کسی عبارت سے لازم آتا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم تمام علوم عالیہ اور کمالات علمیہ وعملیہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم سے اعلم واشرف مانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی اولیں وآخرین جن وانس وملک میں آپؐ کا ہم رتبہ نہیں ہوسکتا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی خلیفۂ خاص حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ تعالیٰ اسرار ہما کے متعلق افترا کیا کہ انہوں نے اپنے رسالہ حفظ الایمان میں لکھا ہے کہ معاذ اللہ جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زید وعمر بلکہ چوپایوں کے برابر ہے؛ حالانکہ ان کی عبارت اور سیاق وسباق بالکل اس کے خلاف ہے ایسی تہمت طرازی نہایت تعجب خیز بات تھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی معمولی مسلمان بھی ایسی جسارت بیجا نہیں کرسکتا چہ جائے کہ ایک لاعلم وتصوف اور مدعی مہارت علوم وفنون ایسی گھڑی ہوئی باتیں لکھ کر تکفیر کرے اور اپنی تصدیق ہندوستان سے لے کر علماء حرمین تک سے کراتا پھرے؛ کیونکہ تکفیر اور لعن کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے۔ احادیث صحیح کی تصریح کے مطابق اگر تکفیر اور لعن کسی غیر مستحق کی کی جائے گی تو خود تکفیر اور لعنت کرنے والا اس کا مستحق ہو جاتا ہے اور وہ لعن وتکفیر اس پر لوٹ آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی احمد رضا خاں اور ان کی جماعت کس بل بوتہ پر اس قدر جری ہوئے اختلافات کتنے بھی ہوتے اور رقابتیں کسی بھی درجہ کی ہوتیں مگر خود اپنے ایمان کی سلامتی کی تو ضرورت تھی۔ اس افتراپردازی اور تہمت تراشی کا کیا کیا جائے جو کھلے بندوں ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوں جن کو ایک جماعت اپنا مقتدا امام اور پیر ومرشد مانتی ہے۔

مولوی احمد رضا خاں اور وہاں مقیم ان کے ہم نواؤں نے اس رسالہ کو جسے مقدمہ حسام الحرمین علی عنق اہل الکفر والمین کے نام سے شائع کیا گیا تصدیق اور مہر دستخط کے لیے وہاں کے اہل علم اور مذہبی روسا کے سامنے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان عنوانات کی بنیاد پر حقیقت سے ناواقف ہر مسلمان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھے گا۔ اور جو کچھ بھی اس سے ہو سکے گا کر گزرے گا اور جہاں تک ممکن ہو گا بُرا بھلا لکھ دے گا؛ چنانچہ یہی ہوا۔ بعض نے تو غیظ وغضب میں آکر بلا شرط واستثنا تکفیر کی تصدیق کر دی؛ البتہ سمجھ دار اور محتاط افراد نے شرط لگائی کہ اگر واقعی ان لوگوں کے ایسے ہی اقوال وعقائد ہیں اور ان سے اس کے خلاف ثابت نہیں ہے نہ انہوں نے رجوع کیا ہے تو بیشک جو کچھ مولف نے ان کی تکفیر کے سلسلہ میں لکھا ہے وہ صحیح ہے۔

یہ کارروائی نہایت اخفا کے ساتھ ہوا ہی تھا ہمیں صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ یہ لوگ، علما اور مفتی صاحبان اور اہل اثر کے پاس دوڑ دھوپ کر رہے ہیں مگر کسی مقصد کے لیے یہ کارروائی ہو رہی ہے اس کا بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ کئی روز کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کسی تحریر کی تصدیق کرائی جا رہی ہے تو اس کو تلاش ہوئی کہ وہ تحریر کیا ہے؟ بالآخر شیخ عبد القادر شبلی طرابلسی کے پاس وہ تحریر پہنچی تو انہوں نے مجھے بلایا اور وہ رسالہ دکھایا میں نے ان کو حقیقت الامر سے مطلع کیا اور دوسرے لوگوں کو تحذیر الناس اور فتاوی رشیدیہ وغیرہ کی عبارتیں دکھائیں تو انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا اس راز کے انکشاف کے بعد مولوی احمد رضا خاں وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے بعد میں کچھ عرصہ تک وہاں مقیم ہندوستانیوں اور ان کے ہم نواؤں میں ہمارے خلاف کھچڑی پکتی رہی وہ لوگ مخالفتیں کرتے رہے؛ لیکن دو تین سال میں تمام مخالفتوں کا قلع قمع ہو گیا۔

میں ۱۳۲۶ھ میں مدینہ منورہ سے دوسری شادی کے سلسلہ میں ہندوستان آیا تھا۔ شادی کے بعد شعبان

۱۳۲۷ھ تک دارالعلوم میں ترمذی اور بخاری کو دوبارہ پڑھا۔ شوال میں اکابر نے تدریس کا حکم دیدیا اہل شوریٰ نے فیصلہ کر دیا کہ بالفعل بمشاہرہ ۲۴۰ روپے ماہوار مدرس رکھا جائے۔ اس طرح مجھے متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیے گئے اس سے مجھ کو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوگی اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف خدمت گذاری حاصل ہوتا۔ یہ سلسلہ ۱۳۲۹ھ تک چلا چونکہ والد صاحب مرحوم اور دیگر اعزہ مدینہ میں تھے اس لیے وہاں جانے کا طبعی تقاضہ ہوا ادھر والد صاحب کا آئے دن تقاضہ ہوتا رہتا تھا طلباء مدینہ منورہ اور دیگر اعزہ کے بھی تقاضے کئے اس کے علاوہ حج کی بھی خواہش رہتی تھی اس لیے ایک بار پھر سفر حجاز کا ارادہ کیا پھر اوائل ۱۳۳۱ھ میں ہندوستان کا سفر ہوا اور اواخر ۱۳۳۱ھ میں بطور حج بدل حجاج کے جہاز کے ذریعہ حجاز کا سفر کیا۔

سیاست سے تعلق

جس طرح میرے علمی زندگی کا منبع فیض شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرۂ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ الہند کے وہ افکار و خیالات اور جذبات تھے جو عرصہ دراز سے حضرت شیخ الہند کے سینہ پر اور خیمہ روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں۔

ہندوستان نیوں کی آزادی اور عزت و احترام اور شان و شوکت تمام دنیا میں دیگر آزاد قوموں کی طرح ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی تھی؛ چونکہ یہاں کے علوم ہندسہ، حکمت و فلسفہ اور حساب وغیرہ نے بے نظیر ترقی کی تھی جس سے دوسرے ممالک ایشیا و افریقہ وغیرہ بھی فیضیاب ہوتے تھے اور اس لیے کہ مسلم بادشاہوں نے یہاں کی صنعتوں اور تجارت اور اخلاق و علوم میں چار چاند لگا دیئے تھے اور دور دور سے بڑے بڑے نامور اساتذہ کو بلا کر بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ان کی صنعتیں اور کمالات ملک میں پھیلا دیئے تھے دور دراز ملکوں میں ان کی تجارتیں اور آمد و رفت جاری تھی تمام اقوام اور ممالک میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے حکومت اور سلطنت کے یہی مالک تھے فرقہ واریت کا نام نہیں تھا۔ ساری دنیا میں ہندوستانی ایک قوم شمار کئے جاتے تھے اگرچہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کی حکمرانی قائم ہوگئی تھی مگر مسلمان بادشاہ یہاں کے باشندے بن کر یہاں کی قومیت میں گھل مل گئے تھے انہوں نے اپنے اصلی اوطان و اقوام کو بھلا دیا تھا اور ہندوستانی قوم کا جز ولاینفک بن گئے تھے انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو حکومت میں اس طرح شریک کر لیا تھا جیسے ایک قوم اور ایک خاندان آپس میں شریک ہوئے ہیں۔ شخصی حکومت کا دارومدار سراسر رعایا کی خوشنودی پر تھا اور پنچایتوں کے قیام کی وجہ سے عام طور پر عوام الناس کو خود اختیاری حاصل تھی اور ادنیٰ حکام سے لے کر بادشاہوں تک کے

یہاں عام وخاص دربار ہوتے تھے ہر شخص کو اظہار رائے کا موقع ملتا تھا۔

آپس میں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی کا سلسلہ جاری کرلیا تھا۔ ہر قسم کے عہدے وزارت عظمیٰ اور سپہ سالاری سے لے کر ادنیٰ انتظام اور فوجی عہدوں تک بلالحاظ رنگ ونسل اور مذہب ووطن حسب قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے تھے انہوں نے ہندوؤں کو راجہ مہاراجہ تعلقدار بنایا بڑی بڑی ریاستیں اور عہدے ومنصب عطا کئے اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو گورنر بنایا، یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبے افغانستان پر بھی ایک ہندو راجپوت کو نائب السلطنت مقرر کیا، رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی تھی جس طرح بادشاہ اپنے خاندان کے افراد اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہیں کسی طرح گوارا نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی فوجی یا پولیس والا یا کوئی اجنبی رعایا کے کسی فرد پر دست درازی کرے ہندوستانیوں کا طریقہ کاشکاری بے مثل صنعت وحرفت اعلیٰ ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں نوشت وخواند اور حساب کی تعلیم دی جاتی تھی ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد اور اس کی عزت، عصمت اور عفت کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

مگر جب سے انگریزی راج شروع ہوا ہندوستانیوں کی قومی توہین وتذلیل اور نسلی ووطنی ایثار، یورپین اور نیٹو کا رسوا کن تفرقہ شروع ہو گیا جو کہ پوری قوت سے ساتھ بڑھتا ہوا انتہائی درجہ کو پہنچ گیا باوجودیکہ انگریز بطور مہمان تجارت کے لیے آئے تھے اور شہنشاہان ہندوستان کے رحم وکرم سے تجارت کی اجازت حاصل کر کے شاہی فرمانوں کے سایہ میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور پھر شہنشاہان اسلام پر ڈورے ڈال کر دیوانی امور پر قابض ہو گئے اور پھر غداریاں کرتے ہوئے تمام نظام سلطنت کو رفتہ رفتہ ملیامیٹ کر کے ہندوستان کے بادشاہ بن گئے پھر ہندوستانی افسروں کو خلاف معاہدہ برخاست کرنا شروع کر دیا اور جن عہدوں کو ادنی سے ادنی انگریز قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا ہندوستانیوں کو اس سے نکال باہر کیا چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے بھی مسلمانوں کو نکال کر ہندوؤں کو مقرر کیا۔ اس طرح ہندوستانی حکومت کے ارکان نان شبینہ کو محتاج ہو گئے عدالتوں تک میں ہندوستانیوں اور یورپینوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ آئے دن ایسے واقعات رونما ہوئے کہ فوجی اور سول لوگوں کے ہاتھوں ہندوستانی ذلیل ہوتے اور مار ڈالے جاتے۔ ریل کے ڈبوں، شاہراہوں اور تفریحی مقامات میں بھی امتیاز کیا جاتا تھا الغرض ہندوستانیوں کی توہین وتذلیل، قتل وغارت گری تباہی وبربادی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا گیا۔ توہین وتذلیل کی ایسی بے شمار کارروائیاں عمل میں لائی گئیں جن کو معمولی غیرت اور شرافت والا انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا اور جن سے ہر شریف النفس انسان کا دل زخموں سے چور چور ہو گیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام بغیر کسی

فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا بادشاہوں، نوابوں، امراء اور اہل ثروت کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کے لیے وقف کردی گئی تھیں اس طرح صوبہ بنگال کا چوتھائی حصہ اس کے لیے وقف تھا سرکاری خزانوں سے ان کی امداد ہوتی تھی بادشاہ اور امراء تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے اس کے لیے جاگیریں دیتے اور جائیدادیں وقف کرتے تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع اور ہیلکنڈ میں جو دہلی سے قریب تھے پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ الملک نواب روہیلکنڈ حافظ رحمت خاں مرحوم کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے ہر ہر قریہ اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں لکھنے پڑھنے حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ کپتان الکزنڈر ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کی حالت بتاتے ہوئے لکھا کہ صرف شہر ٹھٹھہ سندھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو کالج تھے۔ وہ لفظ کالج لکھتا ہے، اسکول، پرائمری یا مکتب نہیں لکھتا ہے جبکہ دارالسلطنت دہلی سے ایک ہزار میل سے زیادہ دوری پر واقع شہر میں اس قدر کالج تھے تو پھر شہر دہلی، آگرہ اور دیگر شہر ہائے یوپی، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس، ممبئی، سندھ، پنجاب وغیرہ کے بڑے شہروں کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہاں تعلیمی حالت کیا ہوگی، مقریزی نے کتاب الخطط میں لکھا ہے بزمانہ محمد تغلق مرحوم صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ مسٹر کیرہارڈ نے میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے انگریزی عمل داری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح ہر چار سو آدمیوں کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط تھا۔

اس کے برعکس سر میلکہ لوکس جج ہائی کورٹ مدراس وبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا تھا ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کرلیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں اذیتیں دے کر مالی گذاری وصول کی سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں بے گھر و برباد کردینے والے بندوبست قائم کیے۔

حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح بعنوان نقش حیات ۱۹۲۲ء میں اس وقت لکھنی شروع کی تھی جب آپ نینی تال جیل میں قید وبند کی زندگی بسر کررہے تھے آپ اپنے استاذ محترم شیخ الطریقت، حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کے اسارت مالٹا میں رفیق سفر رہے تھے ایک ایسے طبقہ کے افراد کا جو گوشہ نشین صوفی وعالم، رضائے الٰہی میں غرق پبلک کی ہنگامی زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہوں کہ اسی طرح ان کی تقدیس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہوتا ہے خود ان کی جدوجہد کا دائرہ خانقاہوں اور مدرسوں سے وابستہ ہوں اور جن کی تبلیغ وتلقین کا طریق کار خاموش علم وعمل اور پرسکون کردار سے متعلق ہو ایسے قدسی صفات بزرگ اپنے راحت وآرام، درس وتدریس تعلیم وتربیت تزکیہ نفس، تالیف وتصنیف، تفسیر وافتاء وغیرہ کے مشاغل سے

دست کش ہوکر یک بیگ سرگرم سیاست کے میدان میں کود پڑنا اور دنیا کے بڑے غالب حکمراں طاقت کے بالمقابل صف آرا ہو جانا معمولی بات نہ تھا۔ حضرت شیخ مدنی نے اس انقلاب عظیم کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

جلد اول کے ۳۳۶ صفحات میں سے ۱۰۰ ؍ سے زیادہ صفحات میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی تباہی وبربادی، مکروفریب لوٹ کھسوٹ سماجی، اخلاقی، مالی، علمی، تجارتی، زرعی، صنعتی، دستکاری کی تباہی وبربادی رواداری اتحاد ہمدردی و بھائی چارہ کی جگہ نفاق نفرت بغض وعداوت، فرقہ وارانہ منافرت، عہد شکنی وغداری اور خود اپنے وعدوں واعلانات کی خلاف ورزی خاص طور سے مسلمانوں کی توہین وتذلیل اوقاف اور جائدادوں کی ضبطی وغیرہ کی تفصیل سے جائزہ لیا ہے پھر دوسری جلد کے ۲۸۲ میں سے ۱۳۰ صفحات میں تحریک آزادی ہند کے مختلف مراحل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے بالآخر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کے میدان سیاست میں کودنے، تحریک ریشمی خطوط، مولانا عبید اللہ سندھی کی سیاسی سرگرمیوں ہجرت کابل، سیاحت روس، افغانستان پہنچنے ہندو مسلم اتحاد جنود اللہ کے قیام، عارضی حکومت روس ہندوستانی مشن استنبول اور جاپانی مشن، مولانا عبید اللہ اوران کے رفقاء کی افغانستان میں گرفتاری ونظر بندی، امیر حبیب اللہ کی شہادت امیر امان اللہ کی تخت نشینی حضرت شیخ الہند کی ابتدائی کارگذاری وسفر حجاز وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اپنے سیاست میں داخلہ پر کلام کیا ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے بزرگوں سے حب الوطنی اور ہندوستان کو انگریزوں کے جبرواستبداد سے آزاد کرانے کا جو جذبہ وراثت میں ملا تھا اس کے تحت آپ مضطرب اور بے چین رہتے تھے اس سلسلہ میں آپ حتیٰ الامکان سرگرم رہتے تھے کلام اپنے مخصوص متعلقین کو سرگرم رکھتے تھے یہاں تک کہ یاغستان وافغانستان سے متصل آزاد قبائل کے علاقہ میں بھی جہاں آپ کے بہت سے شاگرد اور مخلص رہتے تھے اپنی تحریک انگریزوں کو ہند بدر کرنے اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے زمین ہم وار کی؛ چنانچہ سرحد کے واقعات سے حکومت پوری طرح بوکھلا گئی معمولی معمولی شبہ پر بھی لوگوں کو گرفتار کر کے نظر بند کرنے لگی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں، اس لیے بڑی نگرانی ہو رہی تھی اسی وجہ سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم نے زور دیا کہ آپ جلد از جلد انگریزی علم داری سے باہر چلے جائیں؛ چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کرلیا اور حکومت کی تمام تر کوششوں کا سامنا کرتے ہوئے بحفاظت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی انہوں نے گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کے نام ایک تحریر دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کرو اوران کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچادو دوسری تحریر ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ

شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کئے جائیں پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ سے کہا کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ کے لیے تیار کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کا وعدہ کرتے ہیں ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے تمام حلیف جرمنی اور آسٹریلیا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے پوری جدوجہد کریں گے ایسے میں یہ نہ ہو کہ ہندوستان ست پڑ جائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر مینڈیٹ بارس کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخبارات عام اجتماعات تقریروں وتحریروں کے ذریعہ اندرون وبیرون ہند ایک زبان ہو کر ہی مطالبہ جاری رکھنا چاہئے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے خاموش نہ بیٹھنا چاہئے۔

شیخ مدنی لکھتے ہیں، میں اس وقت تک نہ آزادی ہند کے مشن میں شریک ہوا تھا اور نہ ہی حضرت شیخ الہند کی سیاسی عملی سرگرمیوں سے واقف تھا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت شیخ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھے اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب کر کے اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا: اور یہاں سے میری سیاسیات کی ابتدا ہوئی اسی دوران انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ پہنچ گئے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر میں نے مدینہ منورہ میں مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار مفتی مامون بری اور انور پاشا کے رفقا میں سے نقیب الاشراف شامی کی اعانت اور ہمدردی سے حضرت شیخ کی عرضی انور پاشا کو پہنچائی جس میں تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی گئی تھی؛ چنانچہ مغرب کے بعد ان سے حضرت شیخ الہند کی ملاقات ہوئی انہوں نے حضرت شیخ کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

اگلے دن انور پاشا کی خواہش پر اشراق کے بعد مسجد نبوی میں علماء مدینہ جمع ہوئے انور پاشا صدر نشین ہوئے ان کے سامنے درمیان میں مفتی صاحب، مامون ان کے بائیں شیخ الہند پھر مولانا خلیل احمد اور مجھے بٹھایا گیا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت کے نہ ہونے کا عذر کیا اور مجھے حکم دیا، میں نے حسب مناسب وقت عربی زبان میں فلسفہ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی فلاح وبہبود کے لیے جہاد ضروری ہے۔ یہ تقریر تقریباً آدھا گھنٹہ رہی بعد میں دوسرے علماء نے تقریریں کیں تقریباً دو گھنٹہ کے بعد جلسہ ختم ہوا اور انور پاشا نے عطیہ شاہانہ کے طور پر اشرفیوں کی شکل میں نذرانہ پیش کیا۔

مدینہ منورہ سے روانگی

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقا کا قافلہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ پہنچا اور چند روز قیام کے

بعد وہاں سے طائف کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے محصور رہنا پڑا، بالآخر کئی ماہ کے بعد واپس مکہ معظمہ پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقا ہندوستان کے قصد سے جدہ چلے گئے۔ حضرت شیخ نے ان سے الوداعی ملاقات کو ضروری سمجھا؛ چنانچہ آپ جدہ پہنچے اور ساحل (پورٹ) تک ان کو رخصت کیا، مولانا خلیل احمد اور ان کے رفقا کو لے کر جہاز ممبئی پہنچا تو سی آئی ڈی اور حضرت شیخ الہند کے مخلص رفقا کا خیال تھا کہ حضرت شیخ اسی جہاز سے تشریف لائیں گے اس لیے انگریزی پولیس سی آئی ڈی اور اہل شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا۔ سی آئی ڈی اور پولیس نے حضرت شیخ کو تلاش کیا اور آپ کے نہ ملنے پر مولانا خلیل احمد اور ان کے رفقا کو حراست میں لے کر نینی تال لے جا کر جیل میں بند کر دیا وہاں ان لوگوں سے طرح طرح سے پوچھ گچھ اور تفتیش کی، ڈرایا دھمکایا، سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا مگر جب کوئی قابل اعتراضات بات یا مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی تو سب کو رہا کر دیا۔

حضرت شیخ الہند نے قیام طائف کے زمانہ میں غالب پاشا سے ملاقات کی انہوں نے آپ کو جلد از جلد ہندوستان پہنچ کر رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ کے سلسلہ میں ہموار کرنے کے لیے کہا۔ آپ ہندوستان کے لیے روانگی کے ارادہ سے مکہ معظمہ پہنچ گئے اس دوران حج کا زمانہ قریب آ گیا تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ حج ادا کرنے کے بعد ہندوستان جائیں گے انہی دنوں قاضی مسعود احمد صاحب اور آپ کے ایک عزیز ہندوستان سے حج کے لیے پہنچ گئے ان کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ہندوستان میں انگریز گورنمنٹ کی پالیسی حضرت کے بارے میں بہت سخت ہے کہ جو بھی جہاز ممبئی پہنچتا ہے سی آئی ڈی اور باوردی پولیس کا بڑا دستہ جہاز پر پہنچ جاتا ہے اور حضرت کو تلاش کرنے لگتا ہے جب تک انہیں اطمینان نہیں ہو جاتا کسی بھی مسافر کو جہاز سے اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس صورتحال کے پیش نظر یہی رائے قرار پائی کہ حضرت کا اس زمانہ میں ممبئی پہنچنا یا ہندوستان تشریف لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا۔ شریف حسین اور انگریز فوجیں ہر قسم کی کوششوں کے باوجود مدینہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں تاہم جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے مسدود تھے۔ ۱۳۳۴ھ میں دوسرا حج ادا کرنے کے بعد حضرت شیخ الہند کو فکر لاحق ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان اپنے تحریکی مرکز پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہئے، دوسری طرف مکہ معظمہ میں آپ اپنے قیام کو کسی بھی طرح مناسب نہیں سمجھ رہے تھے کیونکہ انگریزی حکومت بدظن؛ بلکہ برہم اور مخالف تھی اور اور شریف حسین ترکی کے سلطان سے بغاوت کرکے انگریزی حکومت کا آلہ کار بن چکا تھا؛ لیکن فوری طور پر وہاں سے نکلنے کی بھی صورت نہیں بن رہی تھی کہ ایک طرف حضرت کے ساتھ چند رفقا تھے جو اپنا سب کچھ قربان کرکے

آپ کے ساتھ ہوتے تھے وہ حضرت کا ساتھ کسی بھی حال میں چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف حضرت بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے اس کے علاوہ قرآن کریم کے ترجمہ کا سلسلہ جاری تھا جس کی وجہ سے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ساتھ رہتا تھا پھر سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں اس قسم کی اور ضروریات بھی تھیں ان سب کے حمل ونقل کے لیے چند سواریاں درکار تھی اور خاموشی سے دفعۃً روانہ ہوجانا مشکل تھا۔

گرفتاری وقید مالٹا

اس دوران شریف حسین خود جدہ پہنچ گیا اس نے وہاں سے مکہ معظمہ حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا جائے۔ اس طرح ۲۳ رصفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقا مع شیخ مدنی گرفتار کر کے جدہ پہنچادئے گئے۔ وہاں تقریباً ایک ماہ تک زیر حراست رکھے گئے پھر ۱۸ر ربیع الاول کو خدیوی جہاز سے اس طرح زیر حراست سویز پہنچ گئے وہاں سے گوروں کی حراست اور بندوقوں اور سنگینوں کے سخت پہرہ میں ریل کے ذریعہ قاہرہ پہنچائے گئے اور اس دن عصر کے بعد جیزہ کی سیاسی جیل میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان جملہ کارروائیوں کی بنیاد پر ہوئی تھی جو کہ یاغستان سرحد اور دیوبند وغیرہ میں مدت سے ہو رہی تھیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی تھی۔

جیزہ کے جیل مین تقریباً ایک ماہ تک قید رکھنے اور پوچھ تاچھ وتفتیش کے بعد ان سب کے پاسپورٹ تیار کئے گئے اور ۲۴ ر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ اور مطابق ۱۶ر فروری ۱۹۱۷ کو سب کو مالٹا کے لیے روانہ کر دیا گیا، یہاں تک کہ ۲۹ ر ربیع الثانی کو ان کا جہاز مالٹا پہنچ گیا۔ ۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً تین برس دومہینہ کی مالٹا کی قید وبند کے بعد مالٹا سے روانہ ہونے اور ۲۵ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ کو آگبوٹ اسکندریہ پہنچا، وہاں سے اگلے دن مصری قیدیوں کے قید خانہ سیدی بشری میں پہنچا دیئے گئے وہاں ۱۸ر روز رکھنے کے بعد ۱۳ر رجب مطابق ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو تین برس ۷ر مہینہ کے بعد ان لوگوں کو ممبئی پہنچا کر رہا کیا گیا۔

رہائی و واپسی ہندوستان ممبئی پہنچنے پر ان لوگوں کو جہاز پر ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب وہ آزاد ہیں؛ لیکن حکومت نے سی آئی ڈی اور اپنے کچھ مخصوص کارکنوں کے ذریعہ یہ کوشش کی کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا ہی بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں، سیاست سے بالکل کنارے کش ہو جائیں مگر مولانا شوکت علی اور ہزاروں اشخاص وبرادران خلافت کمیٹی نے بندرگاہ پر زبردست استقبال کیا اور حضرت کو اپنے گھیرے میں لے کر کار میں سوار کر کے قیام گاہ پر لے گئے جسے وہ پہلے سے تجویز کر چکے تھے

خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام مسلمانان ممبئی کی طرف سے جلسہ عام کیا گیا جہاں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

ممبئی کے دوردراز قیام کے دوران بیشمار لوگوں نے آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے وہاں روانہ ہوکر ۱۳رجون کی صبح کو دہلی پہنچے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا پھر ۲۶ررمضان کی صبح کو دیوبند پہنچے راستہ میں ہر اسٹیشن پر عقیدت مند مخلص کے ہجوم استقبال اور مصافحہ کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔

دیوبند میں چند روز کے قیام کے بعد حضرت نے کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور میں حکیم نصرت حسین کی والدہ، اہلیہ محترمہ اور بچوں سے تعزیت کرنا ضروری سمجھا؛ کیونکہ حکیم صاحب مرحوم حضرت شیخ الہند کے شاگرد خاص اور مخلص خادم تھے اگرچہ وہ مشن آزادی کے ممبر نہ تھے مگر مکہ معظمہ میں اس ارادہ سے ساتھ ہو گئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ جائیں گے برطانوی اہلکاروں نے انہیں بھی رفقاء میں شمار کرلیا اور گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا حالانکہ نہ ان کا مشن آزادی اور سیاست سے کوئی متعلق تھا نہ ہی سی آئی ڈی کی رپورٹوں وغیرہ میں ان کا کوئی ذکر تھا مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا کہا جاسکتا ہے وہ بھی اسیر مالٹا قرار پائے اور وہیں بیمار ہوکر واصل حق ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا آپ کو ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے بہت زیادہ ہمدردی تھی اس لیے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ الہ آباد والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے وہاں اترنے پر اصرار کیا اچھا خاصا اجتماع ہوگیا تو حضرت نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو تقریر کے لیے فرمایا: اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور دیا گیا تھا۔ پھر غازی پور فیض آباد اور لکھنؤ تشریف لے گئے یہاں بھی شیخ الہند کے ارشاد پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریر کی۔

حضرت شیخ الہند کی تشریف آوری اور خلافت کمیٹی میں شرکت وتائید اور آزادیٔ وطن کی تڑپ اور اس راستہ میں جاں بازی اور استقلال واخلاص ایسے امور تھے کہ انہوں نے قلوب کو مسخر کرلیا۔ عام وخاص مسلمان آپ کی طرف نہایت اخلاص کے ساتھ مائل ہو گئے؛ چنانچہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کے لیے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا جو کہ ہر گوشہ وجماعت میں مقبول ہوگیا حتیٰ کہ آپ کے نام کا حصہ بن گیا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبولیت نے خلقت میں ایسی قبولیت پیدا کردی کہ لوگ پروانہ وار فدا ہونے لگے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اس سفر حجاز سے پہلے وجع المفاصل وغیرہ مختلف بیماریاں لاحق تھیں جو سردی کے موسم میں ترقی کر جاتی تھی مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کہ مالٹا نہایت سرد جگہ ہے وہاں انتہائی شدید سردی پڑتی ہے پھر حضرت حسب عادت رات کو ڈیڑھ بجے اٹھ جاتے اور پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر ٹھنڈے پانی سے

وضو کرتے تھے اس سب کے باوجود وہاں کی قید و بند کے زمانہ میں یہ تکالیف بہت کم تقریباً معدوم ہوگئیں؛ البتہ ہندوستان لوٹ آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں یہ شکایتیں پھر لاحق ہوگئیں اور بڑھنے لگیں۔

پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد عقد ثانی قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد کے سید غلام احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوگیا تھا۔ اسارت مالٹا کے زمانہ میں پہلے والد صاحب ایڈریانویل میں قید کے دوران پھر میرے بیٹے اشفاق احمد اور اس کی والدہ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ مالٹا سے واپسی پر حکیم غلام احمد سے ان کی چھوٹی بہن کے متعلق گفتگو کی گی انہوں نے قبول فرما کر مجھ سے اس کا عقد کر دیا۔

پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد میں والد صاحب کے حکم پر عقد ثانی کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس زمانہ میں تقریباً تین سال دیوبند میں ٹھہرنا پڑا تھا موقع کو غنیمت جان کر میں پہلے سال میں بخاری شریف اور ترمذی شریف حضرت سے دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہوگیا مدینہ منورہ میں میں نے چھ برس کے دوران کتب درسیہ وغیر درسیہ انتہائی محنت سے پڑھائی تھیں اس لیے بہت سی مباحث علمیہ سامنے آگئی تھیں اور ان کی گتھیوں کا سجھانا حضرت شیخ الہند کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس دوران مجھے درسیات کی اعلیٰ درجات کی حدیث، فقہ و تفسیر کی کتابیں بھی درس کے لیے دی گئیں۔

حضرت شیخ نے سویز میں ایک روز فرمایا تھا میں تراجم ابواب بخاری کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ کام مین تنہا نہیں کرسکتا مجھے تمہاری ضرورت ہوگی، اس لیے میں نے اس کام کی تکمیل تک دیوبند میں رہنے کا ارادہ کرلیا مگر تحریک خلافت کے زور و شور اور تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف حضرت کے طبعی رجحان کی وجہ سے وہ علمی کام نہ ہوسکا۔ پھر بھی حضرت نے مدینہ واپس نہ جانے دیا اور میرے محسن حافظ زاہد حسن امروہوی مہتمم مدرسہ جامع مسجد امروہہ کے اصرار پر امروہہ بھیج دیا، پھر تھوڑے ہی عرصہ میں حکم دیا کہ تمہیں یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیے۔

تحریک ترک موالات

تحریک خلافت کا زور تھا، انگریزوں کی شرارت کی وجہ سے لوگوں میں سخت برہمی اور غیظ و غضب تھا۔ ترک موالات کا جوش تھا چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے قطع تعلق کرلے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹی اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے انہوں نے سخت مخالفت کی جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلبا کی ایک بڑی جماعت یونیورسٹی سے الگ ہوگئی۔ طلبا نے حضرت شیخ الہند سے ترک موالات کے حق میں فتویٰ حاصل کرلیا تھا۔ جس میں تمام مسلمانوں اور طلبا سے گورنمنٹ سے قطع

تعلق کرنے اور تمام کالجوں واسکولوں سے سرکاری امداد چھوڑ دینے طلبا کو سرکاری امداد لینا بند نہ کرنے والے کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑ دینے اور سرکاری ملازمت چھوڑ دینے کا مشورہ دیا اور خلافت کمیٹی کے ارکان نے بھی ترک موالات کا فتویٰ حاصل کیا جو طبع ہو کر شائع ہوا اس کے بعد ہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فتویٰ کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا اسی تحریک فتوی اور تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی آزاد نیشنل یونیورسٹی کے قیام کے لیے جلسہ کا پروگرام بنا جس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الہند سے درخواست کی گئی حضرت اس وقت سخت بیمار تھے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی آپ نے فرمایا ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا'' چنانچہ ۶ رصفر ۱۳۳۹ مطابق ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ جلسہ کی تاریخ مقرر کی گئی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد عثمانی کو بتا کر تحریر کرنے کا حکم دیدیا مولانا نے مسودہ لکھ کر سنایا تو اس میں حسب منشا ترمیم فرما کر طباعت کا حکم دیدیا جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ نے شرکت اور صدارت فرمائی ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود نہیں چل سکتے تھے دو افراد کے کاندھوں کے سہارے سے چلتے تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے خطبہ پڑھا خطبہ میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا تھا۔

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں بیشک یہ کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔

ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں قوم وملت کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا آلہ ہے اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

حضرت شیخ مدنی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم وزبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے منصف مزاج انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں؛

چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی تالیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان میں ۱۸۷۱ میں لکھا تھا"۔ مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ واجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہمیں عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائیداد کے مالک ہیں اپنی نماز ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں؛ لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔

انتہائی حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان خیالات اور نظریات نے اہل ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کے دل و دماغ کو جھونکا شکار بنا دیا ان کی فکر و سوچ کی قوت کو سلب کر لیا ورنہ ظاہر ہے کہ تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں کسی بھی زبان کا اپنا ایسا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دین دار حضرات اخلاق یا بداخلاق، مہذب و باکردار یا بدتہذیب و بدکردار وغیرہ بنانے میں زبان کا نہیں بلکہ اس میں پڑھائے جانے والے مضامین اور عبارت کا رول ہوتا ہے۔ چنانچہ عربی و فارسی میں الحاد و بے دینی، صیہونیت و نصرانیت کی تعلیم دی جا سکتی ہے اردو میں ہندوتو اور الحاد کی کتابیں تصنیف کی جا سکتی ہیں اور انگریزی ہندی و سنسکرت میں اسلام کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انگلش اور ہندی وغیرہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے درسیات اور دوسری کتابیں تصنیف و تالیف کی جائیں؛ لیکن افسوس کہ اس مسئلہ پر آج تک نہ علماء نے توجہ دی ہے نہ ہی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ دانشوروں نے دینی اور دنیاوی تعلیم کی تقسیم اور عدم تقسیم کی بحثیں ضرور ہوتی ہیں علم نافع اور غیر نافع کی دہائی بھی دی جاتی ہے جبکہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں محض عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی کتابیں ہی پڑھائی جاتی رہی ہیں جو یقیناً مسلمانوں کو دین اسلام اس کے احکام و عقائد اور تعلیمات سے دور کرتی ہیں ان کے اندر قومی غیرت وحمیت کو نکال باہر کرتی ہیں ان کتابوں کے ذریعہ دی جانے والی تعلیم مسلمانوں کے لیے بحیثیت ملت مہلک، تباہ کن اور سم قاتل ہے سوال زبان کا نہیں اس زبان میں پڑھائی جانے والی درسیات اور کتابوں کا ہے جس کے لیے اسلامی اور مسلم نقطۂ نظر سے درسیات اور کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے مگر تمام تر شور شرابہ کے برخلاف یہ بنیادی کام آج تک کسی نے نہیں کیا۔

شیخ الہند کی وفات

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اجلاس مذکور سے فارغ ہو کر علی گڑھ سے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر

انصاری صاحب کی کوٹھی پر قیام فرمایا ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم نے نہایت توجہ سے علاج جاری فرمایا؛ چونکہ جمعیۃ العلماء کا قیام اس سے پہلے امرتسر میں ہو چکا تھا وہاں ہی اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا اس لیے اہل امراء نے ضروری سمجھا کہ جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند کی صدارت میں منعقد کیا جائے؛ چنانچہ ۷، ۸ اور ۹ ربیع الاول کی تاریخیں اجلاس کے لیے مقرر کی گئیں آپ کی ہدایت پر مفتی کفایت اللہ نے خطبۂ صدارت تحریر فرمایا خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں شریک نہ ہو سکے آپ کی طرف سے خطبۂ صدارت یہاں بھی مولانا شبیر احمد عثمانی نے پیش کیا۔ اجلاس کی اختتامی تحریر میں بھی حضرت شیخ الہند ہی طرف سے پڑھی گئی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ قیام دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا خط آیا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلبا نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرس جو علم حدیث کی کتابوں کا درس دے سکے جلد بھیج دیا جائے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا شاہ صاحب تو دارالعلوم دیوبند کو نہیں چھوڑ سکتے البتہ دوسرے ایسے شخص کو بھیجا جائے گا جو تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکے اور اس کو تجربہ وشہرت بھی حاصل ہو۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن سے کلکتہ جانے کے لیے فرمایا مگر انہوں نے معذرت کر دی میں اس زمانہ میں حضرت کے حکم سے امروہہ کے مدرسہ میں پڑھا رہا تھا۔ حضرت نے مجھے کلکتہ جانے کا حکم فرما دیا اور میں تیار ہو گیا اور دہلی سے مراد آباد کے راستہ سے روانہ ہوا۔ ایک شب بچھراؤں قیام کر کے کلکتہ کا ٹکٹ لے ٹرین پر سوار ہو گیا۔ راستہ میں امروہہ واقع تھا امروہہ اسٹیشن پر بہت سے احباب نے گھیر لیا اور اترنے پر مجبور کر دیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب یہاں تشریف فرما ہیں ان کا حکم ہے کہ حسین احمد کو یہاں اتار لو؛ چنانچہ اترنا پڑا۔

امروہہ اترنے کا سبب یہ تھا کہ شہر کے شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک مناظرہ طے ہو چکا تھا اسی بنا پر اہل امروہہ نے مولانا خلیل احمد صاحب کو تکلیف دی تھی مگر چونکہ اس وقت تحریک وخلافت زوروں پر تھی اور عام فضا مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کے قیام کی متقاضی تھی اس لیے عام اہل شہر مناظرہ کے خلاف تھے سنجیدہ حضرات چاہتے تھے کہ مناظرہ نہ ہو مگر کوئی کھل کر روکنے والا نہ تھا کہ اس سے اس کی جماعت کی بدنامی ہوگی چاہتے تھے کہ کوئی قومی تحریک کا آدمی بیچ میں پڑ کر مناظرہ کو رکوا دے۔ میں اس سے پہلے امروہہ میں کئی مہینے رہ چکا تھا اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ اس کو اتار کر درمیان میں ڈالا جائے تاکہ کسی کو حرف گیری اور اعتراض کا موقع نہ ملے۔ بالآخر میں نے وہاں پہنچ کر بڑے مجمع میں تقریر کی ہر دو فریق سنیوں اور شیعوں کو سمجھایا کہ اس

وقت اس قسم کی کارروائی مناسب نہیں ہے جس سے افتراق کی خلیج وسیع ہو جائے، جس سے فریقین سمجھ گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس کے بعد میں روانگی کا انتظام کر ہی رہا تھا کہ دہلی سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا تار آ گیا کہ حضرت شیخ الہند کا وصال ہو گیا اور جنازہ دیوبند لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کر لیا مگر شام کی گاڑی نکل چکی تھی رات کی گاڑی ملی اور میں اگلے روز صبح ۹ بجے دیوبند پہنچا تو دیکھا لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آ رہے ہیں اپنی ابیچارگی اور بدقسمتی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال کی حاضر باش کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا۔

قسمت کی بدنصیبی کو جیا دکیا کرے　　　　سر پر گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا دو چار روز رہ کر کلکتہ کے لیے روانہ ہوا وہاں پہنچ کر حدیث کے اسباق سنبھال لیے مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر تھی بکثرت جلسے ہو رہے تھے جن میں شرکت ہونا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ کراچی کے مشہور جلسہ میں حاضر ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور مجھے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ کو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اس وجہ سے کلکتہ کی ملازمت ختم ہو گئی۔

میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا باقاعدہ ممبر بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا یہاں تک کہ انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان آزاد ہو گیا۔

اس تحریر (نقش حیات) کی ابتدا نینی تال جیل میں ۱۹۴۳ میں ہوئی تھی ابھی چند صفحات لکھے تھے کہ رہائی ہو گئی پھر جب بھی تکمیل کا ارادہ کیا مشاغل وعوائق حائل ہوتے رہے خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے ۱۹۵۳ کے آغاز میں یہ تحریر اختتام کو پہنچی۔ ■

حرف خیال

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی کتاب

''نقش حیات'' کے ایک حصے ''برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟'' کی تقدیم

مفتی عبدالخالق آزاد، لاہور

پاکستان، ہندوستان، بنگلادیش پر مشتمل یہ عظیم خطہ، ''برصغیر'' کہا جاتا ہے، اپنی تاریخی روایات اور قومی تہذیب وتمدن کی بنیاد پر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس عظیم الشان خطے میں اشوکِ اعظم کا مہذب اور متمدن دور ہو، یا محمد بن قاسمؒ سے لے کر اورنگ زیب عالم گیرؒ تک کے شان دار اسلامی اور قومی ادوار ہوں؛ تاریخی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ دنیا بھر کے خطوں میں ہندوستان اپنی قومی، سیاسی اور اقتصادی روایات اور دینی اقدار کے سلسلے میں بہت زیادہ منفرد حیثیت کا حامل رہا ہے۔

اس خطے میں جتنی نسلیں، برادریاں اور قبائل موجود ہیں اور جتنی متنوع زبانیں بولی جاتی ہیں اور تہذیب وثقافت کے جتنے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں، کسی اور خطے میں یکجا طور پر نظر نہیں آتے۔ ان سب اختلافات رنگ ونسل ومذہب وزبان کے باوجود ماضی کے تمام قومی ادوار میں فکری ونظریاتی طور پر اس خطے کے خمیر میں انسانیت نوازی کی قدر مشترک بڑی واضح رہی ہے۔ اس خطے میں آنے والے تمام مذاہب اور تمام قومی تحریکات میں انسانیت دوستی کا جذبہ اساسی طور پر کارفرما رہا ہے۔ اس بنیادی فکر پر ہی تمام قومی ادوار میں سیاسی نظام تشکیل دیے گئے۔ ایسا سیاسی نظام، جو اختلافات کے تنوع کے باوجود تمام انسانوں کو مکمل امن اور بھرپور تحفظ فراہم کرے اور بلا تفریق رنگ ونسل ومذہب ہر ایک گروہ کو پورا پورا تحفظ اور امن حاصل ہو۔

اسی طرح انسانیت نوازی کے اس بنیادی فکر و فلسفے پر ہی یہاں کے تمام قومی ادوار میں اقتصادی اور معاشی نظام کی صورت گری کی گئی۔ دھرتی سے وابستہ یہاں کی آزاد زرعی معیشت ہو، یا تبادلہ اشیا کا تجارتی ڈھانچہ ہو، یا ابتدائی دور کی ابھرتی صنعت کا تانا بانا ہو، قومی سطح پر ہر ایک کے پس پردہ جو جذبہ کارفرما رہا ہے، وہ بنیادی طور پر انسانیت دوستی کا تھا۔ آج بھی آپ یہاں کسی قدیم دیہاتی علاقے میں چلے جایئے، انسانی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے حوالے سے وہ محض منافع کمانے کی فکر میں نہیں ہوتے؛ بلکہ انسانی تقاضوں کو اہمیت دیتے ہیں۔

پھر اس خطے میں اسلام کی آمد سے قبل اگرچہ یہ تمام صورتیں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ابھی ابتدائی نوعیت لیے ہوئے تھیں؛ لیکن اسلام نے جو بین الاقوامی سیاسی اور معاشی فکر اور عالمی سطح کا عملی نظام متعارف کرایا، اس نے اس خطے میں آ کر انسانیت دوستی کی اساس پر سیاسی اور معاشی ڈھانچوں کی ایسی تشکیل نو کی کہ عالمی تجارتی نظام کے فوائد سے ہندوستان پوری طرح مستفید ہوا۔ محمد بن قاسمؒ سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر تک تقریباً ایک ہزار سالہ دور مسلمانوں کی حکمرانی کا ہے۔ اس پورے دور میں یہاں کے حکمرانوں نے پوری کوشش کی کہ یہاں بسنے والی اقوام، ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے کچھ اس طرح مستفید ہوں کہ تمام افراد، قبائل، نسلیں اور مذاہب کے لوگوں کے حقوق پورے ہوتے رہیں۔ اس طرح گویا اتنے بڑے وسیع و عریض ہندوستان میں مختلف اقوام، قبائل، مذاہب کے باہمی ملاپ سے علاقائی سطح کے ہر ایک نظام نے بڑی عمدہ صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ گویا دنیا بھر کے عالمی نظام کی تشکیل نو کے لیے یہ ایک نمونہ تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسی طریقۂ کار کے مطابق آئندہ چل کر کل دنیا کا بین الاقوامی ڈھانچہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ کہ دنیا بھر کے تمام ممالک اور اقوام اس نظیر کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کے عالمی تقاضوں کو پورا کر سکتی تھی۔ ہندوستان کی اسی انسانیت نواز فکر، پُرامن سیاسی نظام اور معاشی خوش حالی پر مبنی اقتصادی نظام کی وجہ سے اس خطے کو دنیا بھر میں ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا تھا۔

ہندوستان کی ہزاروں سالوں کی سیاسی، معاشی اور انسانیت دوستی پر مبنی قومی روایات اس وقت جبر و دہشت اور غنڈہ گردی کا شکار ہو گئیں۔ جب برطانوی سامراج نے اپنے خونی پنجے اس خطے کے سرسبز و شاداب جسم پر گاڑ دیے اور ایک ایسا ظالم، ایک ایسا عالمی دہشت گرد، ایک ایسا بدترین آمر اور انسانیت دشمن نظام قائم کیا، جس کی تاریخ انسانیت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے لامحدود منافع کی ہوس میں وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کیے، جو مہذب دنیا کے منہ پر ایک طمانچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مکر و فریب کی وہ کون سی سازش تھی، جو اختیار نہ کی گئی ہو۔ جبر و دہشت پھیلانے کا وہ کون سا حربہ تھا، جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ ہندوستان کی دولت لوٹنے کے لیے وہ کون سا

ظالمانہ قانون تھا، جو مسلط نہ کیا گیا ہو۔ اس ظالمانہ لوٹ کھسوٹ نے نہ صرف اس خطے کا امن چھین لیا تحفظ ختم کر دیا؛ بلکہ معاشی خوش حالی کو بدحالی میں تبدیل کر کے بھوک، افلاس، خوف اور تباہی و بربادی پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نہ صرف؛ بلکہ آگے بڑھ کر اس خطے کے اقوام و مذہب کے ماننے والوں میں نفرتوں اور عداوتوں کے بیج بو دیے اور فرقہ پرستی کی ایسی آگ جلائی، جس کی بھڑکتی ہوئی لپٹیں آج اس خطے کی انسانیت کو ''ایٹم بم'' کے ذیعوی جہنم کی طرف دھکیل رہی ہیں۔

برطانوی سامراج کی سب سے بڑی شیطنت یہ رہی کہ اس نے اس خطے میں انسانیت دشمنی کی سوچ کو پیدا کیا۔ نفرتوں کے افکار کو جنم دیا۔ فرقہ پرستی، تشدد پسندی، آمریت اور غنڈہ گردی کو فروغ بخشا اور سیاسی حوالے سے ان ظالمانہ رویوں کی اساس پر ایسی بدامنی اور بزدلی طاری کر دی اور یوں بدامنی اور عدمِ تحفظ کا احساس بڑھتا گیا۔ اسی طرح اس نے ایسے ظالمانہ معاشی نظام کا جال پورے خطے میں پھیلا دیا کہ یہاں کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک ایسے مرکز پر جمع ہو، جہاں سے سامراجی ممالک کے اسٹیج اسے چوس لے جائیں اور برطانیہ کے دریائے ٹیمز کے کنارے نچوڑتے رہیں؛ چنانچہ آج بھی ہمارے ملک میں بالخصوص ملک کی قومی دولت کا بہاؤ غیر ملکی سامراجی ممالک کی سرمایہ پرستانہ کمپنیوں اور اداروں کی طرف بڑی تیزی سے جاری ہے۔

الغرض کسی زندہ سماج کی تین بڑی بنیادوں، یعنی انسانیت دوست فکر، پُرامن سیاسی نظام، خوش حال اقتصادی نظام کو برطانوی سامراج نے ہندوستان بھر میں مسمار کر کے رکھ دیا۔ جس سے اس معاشرے کی ترقی رُک گئی۔ بھوک و افلاس پیدا ہو گیا، بدامنی پھیل گئی اور یوں ترقی یافتہ ہندوستان بتدریج تنزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ایسے زوال پذیر حالات میں اس خطے کی قومی بقا کے لیے یہ ناگزیر تقاضا تھا کہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حیثیت کا صحیح تعین کیا جائے؛ تاکہ اس خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کو قومی آزادی کی راہ پر گامزن کیا جائے چنانچہ ہندوستان کے دل ''دلی'' کے مرکز سے آوازۂ حق بلند ہوتا ہے۔ خانوادۂ ولی اللہی کے عظیم سیاسی مدبر، سماجِ انسانی کے نبض شناس، ہندوستان کے حالات کا صحیح تجزیہ کر کے اس کی سیاسی حیثیت کو متعین کرتے ہیں۔ یعنی حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرزندار جمند حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ قدس سرہٗ اس پوری صورتِ حال کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کر کے ہندوستان ''دارالحرب'' قرار دیتے ہیں۔ اس تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ملک، جس میں انسانیت دشمن فکر کا چلن ہو جائے اور اس کا سیاسی نظام بدامنی اور عدمِ تحفظ پیدا کر رہا ہو اور معاشی نظام بھوک و افلاس مسلط کرنے کا باعث ہو، وہ انسانیت کے ساتھ جنگ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس وقت انسانیت دوستی کا تقاضا، قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس فتویٰ دارالحرب نے ہندوستان بھر کے تمام حریت پسند طبقوں، جماعتوں اور بہادر لوگوں میں آزادی کا ایسا سیاسی اور قومی

شعور پیدا کیا، جس نے آگے چل کر قومی آزادی کی جدوجہد کو منظم کیا۔ اور انسانیت دوستی کا فکر از سر نو زندہ کیا۔ اس سے سیاسی اور معاشی حوالے سے یہاں کے طبقوں میں شعور اُجاگر ہوا۔

پھر خاص طور پر خانوادۂ ولی اللہی نے اسی اساس پر اپنی جان کی قربانیاں دے کر انسانیت دوست فکرو عمل اور جہد و کردار کو زندہ رکھا۔ چنانچہ ۱۸۳۱ء کا معرکہ بالاکوٹ ہو یا ٹیپو سلطان کی شہادت کا میدان، بنگال کی انقلابی جدوجہد ہو یا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی عظیم قومی جدوجہد، تحریکِ ریشمی رومال ہو یا اس کے بعد کی قومی تحریکات آزادی، اس خانوادۂ ولی اللہی اور اس کے جانشین حضرات نے اپنی عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعے ہندوستان بھر میں برطانوی سامراج؛ بلکہ ہر غیر ملکی سامراج کے خلاف ایک واضح شعور و فکر دیا اور آج بھی انسانیت کے ساتھ جنگیں مسلط کرنے والے سامراجی سرمایہ پرست ممالک، اقوام اور طبقات کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اسی خانوادۂ ولی اللہی کے جانشین حضرات کی جماعت کے ایک فردِ فرید اور رکن رکین ہیں اور سلسلہ بہ سلسلہ اس جماعت کے قلوب و دماغ اور فکر و عمل میں انسانیت دوستی کا جو واضح تصور رہا ہے اور اس کے سیاسی اور معاشی تقاضے رہے ہیں، ان پر حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اپنے استاذِ محترم اور مربی، مجاہدِ اعظم حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت، تربیت اور رہنمائی میں رہ کر انسانی سماج کا جو بلند تر سیاسی اور قومی شعور حاصل کیا، وہ بلاشبہ انتہائی عظیم ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پس منظر میں اسلامی دور کے ہندوستان اور برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے بعد کے ہندوستان کا بڑا خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ اور پھر یہ تفصیل بتائی ہے کہ انگریزوں کی اس لوٹ کھسوٹ نے ہندوستان کی تباہی و بربادی میں کتنا کردار ادا کیا ہے۔ جو کچھ آپ نے اس کتاب میں تحریر فرمایا، وہ خالصتاً معروضی انداز میں لکھا گیا ہے۔ یعنی ایسے زندہ حقائق، جن کا بھرپور مشاہدہ یقیناً انہی نتائج کا حامل ہے، جو کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور پھر اس کے لیے ثبوت کے طور پر وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا ہے، جو خود انگریز حکمرانوں نے لکھا اور ان کے ذمہ داروں نے بیان کیا۔ حضرت مدنیؒ نے برطانوی لوٹ کھسوٹ کے پورے عمل کو انہی کی تحریرات کے آئینے میں مرتب کیا ہے۔ اپنی طرف سے آپ نے محض نتائج اور اعداد و شمار کو ایک واضح رُخ دیا ہے۔ ورنہ اصولی طور پر انگریز حکمرانوں کے اعترافات کو گویا جمع کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ سیاسی اور معاشی حوالے سے آپ کی نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے اس کتاب کو ہندوستان کی سیاسی اور معاشی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زیرِ نظر کتاب "برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟" دراصل

آپ کی خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' ہے۔ بظاہر یہ ایک فرد کی سوانح کے طور پر لکھی گئی؛ لیکن اس میں سوا حصہ بہت کم اور برطانوی لوٹ کھسوٹ کے سیاسی اور معاشی حقائق بہت زیادہ ہیں۔ مولانا محمد عباس شاد صاحب انتہائی عرق ریزی سے اس کتاب میں بیان کردہ برطانوی لوٹ کھسوٹ کے سیاسی اور معاشی حقائق کو یکجا کردیا ہے۔ کتاب کے بنیادی مضامین اور عبارت میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا گیا؛ بلکہ جس طریقۂ کار پر مصنف اسے ترتیب دیا تھا، اس کے مطابق اسے مرتب کردیا گیا ہے اور آپ کی سوانح کو الگ ایک کتاب کی صور دے دی ہے۔

اس صورت میں بلاشبہ یہ کتاب برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کو واضح کرنے میں بڑا بنیادی کردا ادا کرتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے وہ سارا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے کہ انگریز کی آمد سے پہلے ہندوستان کیا تھا اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ نے اسے کس مقام تک پہنچادیا۔ شاید اسی صورت میں ہماری نوجوان نسل میں اپنے قومی زیاں کا احساس پیدا ہوجائے اور ایسے حالات میں خوابِ غفلت سے بیدار ہوکر اپنے خطے کے حوالے سے قومی سوچ، سیاسی ومعاشی حوالے سے پختہ شعور حاصل کرنے کی جدوجہد کرے اور زندہ قوموں کے مزاج کو اپنا کر اپنی قومی آزادی کا تحفظ کرسکے اور غیرملکی سازشوں اور ان کے نتائج پر غور کرکے فکروعمل اور جہدوکردار کی ایک روشن راہ پر گامزن ہو، جو دنیا وآخرت دونوں جہاں میں کامیابی وکامرانی دینے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قومی آزادی کے حقیقی رہنماؤں کے فکروعمل کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائے اور گمراہی وضلالت کے راستے سے ہٹا کر انعام یافتہ لوگوں کے سیدھے اور صاف راستے پر چلائے۔ ■

نقش حیات: ادبی نگارخانے میں

مفتی ابرار احمد اجراوی

جے این یو، نئی دہلی

دوسروں کی سوانح لکھنا یا دوسروں کے احوال و کوائف قلم بند کرنا بہت آسان کام ہے۔ اس کے برعکس اپنی خود نوشت مرتب کرنا اور اپنی کتاب زندگی کو بے کم و کاست تحریر کے قالب میں ڈھالنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ سوانح نگاری خارجی زندگی کی تصویر کشی ہے، تو خود نوشت نگاری باطن کے اسرار و رموز کو کاغذ کے سینے پر کندہ کرنے کی جاں کاہی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ خود ستائی کی بے لگام خواہش سے مجبور ہو کر اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اپنے عیوب پر یا تو ملمع سازی کرتا ہے یا دانستہ اس سے چشم پوشی کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داستان خود بقلم خود سے عبارت، خود نوشت نگاری تمام ادبی اصناف میں مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ مشکل اس لیے کہ اس میں حقیقت بیانی اور صدق مقالی سے کام لینے پر اپنی زندگی کی پرتوں کو اس طرح کھولنا پڑتا ہے کہ بسا اوقات دھرم سنکٹ والا معاملہ پیش آ جاتا ہے۔ اور یہیں نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر مصنف کا قلم شکست کھا جاتا ہے۔ اور آسان اس لیے کہ اگرچہ اپنا اعمال نامہ زیادہ 'طویل' ہو، اس پر ادبی لفاظی، عبارت آرائی اور خوش نما ترکیبوں کی قلعی کرتے جایئے اور اپنی خامیوں کو بھی خوبی کے لباس میں پیش کرتے جایئے۔ خود نوشت نگاری کوئی تحقیق یا تنقید کا میدان نہیں کہ اس میں مراجع اور مآخذ کی طرف جھانکنے کی نوبت آئے۔ بس حقیقت کی بینائی کھولے رکھیے اور اپنے ظاہر و باطن کے احوال کو قلم و قرطاس کے حوالے کرتے جایئے۔ تاہم خود نوشت کے لیے اصلیت و واقعیت اور انکشاف ذات خشت بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خود نوشت کا محور چوں کہ مصنف کی شخصیت ہوتی ہے، اس لیے اس میں اپنی ذات سے محبت کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے اور قاری کے محاسبے کا خوف بھی دامن گیر رہتا ہے۔ سوانح عمری اور خود نوشت کے تقاضوں کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”ایک لحاظ سے آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ دوسرں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔ ایک اچھا سوانح نگار، اپنے فن کی لاج رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کر دیتا ہے جو خودنوشت نویس کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کا شمار کر سکتا ہے لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے، نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔

(میر امن سے عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص: ۴۰۰ چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۵ء)

خودنوشت نگاری کے بنیادی لوازم کیا ہیں، ڈاکٹر عمر رضا لکھتے ہیں:

”خودنوشت سوانح عمری کی تعمیر اگرچہ خود مصنف اپنی یادداشت کی بنیاد پر کرتا ہے، لیکن محض یادداشت کی بنیاد پر خودنوشت سوانح مرتب کرنا درست نہیں، بلکہ مصنف کو اپنے حالات وواقعات کی صحت مندی پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اپنے متعلق کوئی بھی غلط بات یا غلط حقائق قارئین کی نذر نہ کر دے۔“ (اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، ص: ۲۲، کتابی دنیا نئی دہلی، ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر سید طفیل احمد خودنوشت سوانح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات ونظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے، جو اس نے سچائی کیساتھ بے کم وکاست قلم بند کر دی ہو، جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔“ (اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت، ص: ۱۲۱)

خودنوشت سوانح کے مذکورہ لوازمات اور فنی تعریف کے علاوہ اگر ماہرین فن کے ذریعے مرتب کردہ اس کے عناصر ترکیبی پر غور کیجیے تو یہ صنف تمام نثری اصناف میں مشکل ترین نظر آتی ہے اور اس دشت کی سیاحی کے لیے قدم قدم پر بڑی جان کاہی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ مشہور مزاح نگار مشتاق یوسفی اسی مشکل کو بیان کرتے ہوئے، اپنی مزاحیہ خودنوشت زرگزشت کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

”آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ اپنی بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ

یقین کرلیں گے۔"

شورش کاشمیری بھی خودنوشت نگاری کونقصان کا سودا ہی بتاتے ہیں، اوراس کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

"لیکن چوں کہ انسان یہ سمجھ کر اپنے حالات حوالۂ قلم کرتا ہے کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا، اس لیے اس تصویر میں جہاں عیب ہیں وہ ان پر سیاہی پھیرتا جاتا ہے اوراس بناء پر یہ مرقع بھی اس کی سچی شبیہ نہیں ہوتی۔" (قلم کے چراغ، مرتب: پروفیسر محمد اقبال، ص: ۴۶۳، دارالکتاب لاہور، ۲۰۰۹ء)

لیکن مشتاق یوسفی کے احتمال وایقان یا شورش کاشمیری کے غیر معتبریت کا مسئلہ ان لوگوں کے ساتھ گمبھیر روپ اختیار کرلیتا ہے جو واقعی اپنی زندگی میں بڑے حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ جن لوگوں کی کتاب زندگی میں حقیقت وصداقت اور اعتبار واستناد کا کوئی باب اور فصل ہی نہ ہو ان کے لیے یہ یقین یا شک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لیے سچ اور غلط بیج اور جھوٹ دونوں یکساں ہیں۔ اکثر خودنوشت نگار اپنی زندگی کے دروں میں جھانکتے ہوئے سچائی اور صداقت پر مبنی ان تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور بس بزبان حال ان کا یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ میں بھی غالب کی طرح عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں۔

خودنوشت نگاری کے مرض میں ہمارے عہد کے قلم کار اس بری طرح مبتلا ہیں، یا شہرت طلبی کے بے لگام شوق اور سیم وزر کی بہتات نے انھیں اس مرض میں مبتلا کر دیا ہے کہ کسی لائبریری کے کیٹلاگ میں جاکر خود نوشت والا حصہ کھنگا لیے تو سب سے پھیلا ہوا اور وسیع وعریض یہی رقبۂ ادب ہوگا۔ ہماری نومولود اردو زبان میں خاص طور سے خودنوشت نگاری کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ افسانہ نگاری اور غزل گوئی کے بعد اس بیچاری زبان کے اسی نثری حصے کو سب سے زیادہ مشق ستم بنایا جارہا ہے۔ اب تو اردو کے نام سے قائم اکیڈمیاں خودنوشت نگاری کے لیے ادیبوں اور ریٹائرڈ پروفیسرز کو خطیر رقم پر مبنی فیلوشپ بھی دینی لگی ہیں تاکہ اس سیلاب بلاخیز پر کوئی بھی بند نہ باندھ سکے۔ اسی قسم کی بے سروپا باتوں پر مبنی، اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا ماتم کرتے ہوئے شورش کاشمیری نے ہی لکھا تھا:

"بین الاقوامی ادب سے قطع نظر اردو میں جس قدر خودنوشت سوانح عمریاں ہیں، ان میں شاعری زیادہ اور اصلیت کم ہے۔" (قلم کے چراغ، ص: ۴۶۲)

جملۂ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ ناچیز راقم الحروف کو خودنوشت نگاری کیا، کسی بھی نثری یا شعری صنف سے کوئی بیر نہیں ہے، میرا یقین ہے کہ تاریخی کتابوں کی طرح یہ بھی معلومات کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

لیکن جب خودنوشت کی تعیین قدر کے معاملے میں بھی ہمارے اردو کے سماجیاتی ماہرین ڈنڈی مارنے لگیں، تو واقعی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ خودنوشت نگاری کی صنف میں بے شمار لوگوں کا نام آتا ہے۔ سر رضا علی، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، ، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، انیس قدوائی، ادا جعفری، شکیل الرحمن، وہاب اشرفی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس طویل فہرست میں کسی ایسے آدمی کا نام نہیں جو یونیورسٹی یا ادبی پارٹی اور سکہ بند نظریاتی ادبی گروہ سے الگ رہ کر اردو زبان کی زلف پریشاں کی مشاطگی میں مصروف ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس فہرست میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا نام نہیں آتا۔ بعض شدت پسند حضرات تو مولانا عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت کو بھی ہضم کر جاتے ہیں۔ تجدد پسند ادبا اس فہرست میں زیادہ سے زیادہ مولانا جعفر تھانیسری کا نام لیتے ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ دستیاب تاریخی دستاویزات کے مطابق ان کی خودنوشت تواریخ عجیب (کالا پانی) کو اردو میں پہلی خودنوشت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کیا یہ پلے درجے کی علمی اور ادبی بددیانتی نہیں؟ جب کہ مدارس کی چہار دیوار میں پرورش پانے والے ان بوریہ نشیں علماء کی خودنوشتوں کو پڑھیے تو وہ معلومات کا جام جہاں نما معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی زبان میں سادگی بھی ہے اور سلاست بھی۔ اختصار بھی ہے اور جامعیت بھی۔ واقعات اور قصوں میں صداقت بھی ہے اور بیانیہ کی چاشنی بھی۔ ان کے مشمولات جگ بیتی بھی ہیں اور آپ بیتی بھی۔ ہاں آج کل کی سطحی رومانیت اور عشق و عاشقی کے جھوٹے اور فرضی لطیفوں سے ان کی تحریریں خالی ہوتی ہیں، معاشقہ بازی کے معاملات اور رومانٹک قصوں سے وہ کیوں سروکار رکھیں کہ یہ عشق مجازی کا بھی ادنی ترین درجہ ہے، لیکن ان کی تحریروں میں عشق حقیقی کے نمونے وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ اور یہی درجہ کسی بھی سچے عاشق کا منزل مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ خود نوشت نگاری اپنی خودی سے آشنائی کا مضبوط ذریعہ ہے، جس کی وساطت سے خداشناسی کی راہ آسان ہوتی ہے۔

شیخ العرب والعجم، اسیر مالٹا اور عظیم مجاہد آزادی مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت 'نقش حیات' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی متعصبانہ اور جانب دارانہ معاملہ رکھا گیا ہے۔ ان کی خودنوشت جو آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کا حسین سنگم ہے، ہماری ادبی بے حسی کی وجہ سے ادبی تحقیقات کا مرکز بننے سے محروم رہی ہے۔ خود نوشت نگاری کی تاریخ اور تنقید پر اردو میں حالیہ برسوں میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں بہت کم ان کی کتاب کا ذکر کیا گیا ہے اور جن ایک آدھ لوگوں نے تحقیق کے 'مرغے' کو حلال کرنے کے لیے اپنی کتاب کے کسی کونے میں اس کا ذکر کیا ہے تو انھوں نے بھی ادبی معیار بندی کا خون کر دیا ہے۔ ان کی خودنوشت کا قدسیہ زیدی، صبیحہ انور اور الطاف فاطمہ نے ذکر کیا، وہاج الدین علوی اور سید عبداللہ نے نام لیا اور وہیں سے ممتاز فاخرہ نے بھی اخذ کیا، لیکن بس اسی حد تک کہ نام شماری کے فرض کفایہ کی ادائیگی ہو جائے۔ صدف فاطمہ کو چھوڑ

مگر کسی نے بھی اس کی ادبی، نیم ادبی، مذہبی یا تاریخی قدر و قیمت پر تفصیل سے بحث نہیں کی۔ ڈاکٹر عبداللہ نے جو اس سلسلے میں سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں بس اتنا لکھا کہ:

''مولانا حسین احمد مدنی نے کوئی بڑا دعویٰ نہیں کیا۔ محاسبۂ نفس کے فرض سے پوری طرح باخبر رہنے کے باوجود اپنی سوانح عمری تدین، اخلاق آموزی اور واقعات سیاسی کی خارجی تفصیل کے مقصد سے مرتب کی ہے۔'' (میر امن سے عبدالحق تک، ص:۴۱۲)

اور وہاج الدین علوی صاحب نے کتاب کا ماحصل لکھتے ہوئے بس یہ دو جملے لکھے کہ:

''نقش حیات مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت ہے۔ اس خودنوشت میں مولانا نے سیاسی حالات اور علمائے دیوبند کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔'' (اردو خود نوشت، فن اور تجزیہ، ص:۴۱۹، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء)

مجھے گلے شکوے نہیں کرنا ہے۔ یہ تو معزز کو معزز اور موثر کو موثر بولنے والے اہل ادب اور اردو اکادمیوں کے ذمے داران کا محبوب مشغلہ ہے۔ مجھے تو نقش حیات کو خودنوشت نگاری کے لیے مقررہ پیمانے پر ادبی زاویۂ نظر سے دیکھنا ہے اور اس کو تقابل و تجزیے کی اس میزان پر تولنا ہے، جس پر عموماً خودنوشت سوانح عمریوں کو ہمارے نقاد تولا کرتے ہیں۔ آخر وہ کون سا پیمانہ ہے، جس کے ذریعے ادب اور غیر ادب کے مابین خط کھینچا جاتا ہے۔ کیا صرف ادب اور غیر ادب اور ادبی تحریکات کی بحث پر مبنی خودنوشت ہی ادب کے زمرے میں آتی ہے؟ کیا صرف مشاعروں، ادبی مذاکروں اور جام و ساغر کی محفلوں کے تذکرے سے پر خودنوشت کے سر پر ہی ادب کا تاج زرنگار رکھا جاسکتا ہے؟ کیا یہ پیمانہ عدل وانصاف سے میل کھاتا ہے، یا پھر یہ اپنی ذہنی عیاشی ہے کہ کس کو ادب کے نگار خانے میں سجانا ہے اور کس کو دودھ سے مکھی کی طرح باہر نکال کر پھینک دینا ہے۔ کسی معیار بندی کا یہ پیمانہ تو صحیح ہو نہیں سکتا۔ ادب تو قاری اور ادیب کے مابین کا مقدس رشتہ ہے۔ کوئی تحریر قاری کے باطن کو اپیل کرتی ہے اور اس کو کتھارسس کے مراحل سے گزارنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کو ادب کے نگار خانے میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ اردو زبان کے اسرار و رموز سے ناواقفیت کا الزام تو اردو کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال اور ترقی پسندوں کے میر فیض احمد فیض پر بھی لگایا گیا ہے، لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ علامہ اقبال اور فیض کا کیا مقام ہے اور لاکھوں کی تعداد میں موجود دوسرے شاعر اور ادیب ان کے سامنے کہاں کھڑے نظر آتے ہیں۔ مدح و ذم یا تحسین و تنقیص سے کسی شخص یا فن کی معیار بندی ممکن نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے استاد ذوق کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دینے اور پہلے ایڈیشن میں مومن کو نظر انداز کر دینے اور مرزا غالب کا یوں ہی سرسری ذکر کر دینے کی وجہ سے، ذوق غالب اور مومن سے بڑے نہیں ہو گئے۔ وقت سب سے بڑا

منصف ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے بعد کوئی عبدالرحمٰن بجنوری، کوئی مالک رام، کوئی احتشام حسین، کوئی شمس الرحمٰن فاروقی بھی پیدا ہوگا جو تعیین قدر کا ایسا پیمانہ متعین کرے گا جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ آنے والے وقت نے ثابت کردیا کہ کہاں غالب و مومن اور کہاں ذوق۔ صرف شہ کا مصاحب بن کر ادبی محفلوں کی صدارت کرنے سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔

مولانا حسین احمد مدنی نے نقش حیات کسی ادبی قلابازی یا کسی ایوارڈ کے حصول یا محض اپنے باطن کی اپیل پر نہیں لکھی تھی، جس میں خودستائی یا نمود و نمائش کا عنصر موجود ہو بلکہ دوستوں اور بے تکلف احباب کے اصرار نے انھیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ جب آپ نینی جیل میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے تو بعض مخلص خدام نے تیری زبان، تیری کہانی، تیرا قلم کے استدلال کے ساتھ، یہ درخواست رکھی کہ نہ صرف اپنی داتی اور خاندانی زندگی کے نشیب و فراز کی مفصل روداد مرتب کردی جائے، بلکہ جنگ آزادی کی مختلف تحریکوں کے دوران اپنے عینی مشاہدات اور تاریخی واقعات کو بھی قلم بند کردیا جائے۔ تاکہ علم و معرفت کا یہ کشکول آنے والے مؤرخین کے لیے مشعل کا کام دے سکے۔ اور بہت سے ان واقعات سے پردہ اٹھ سکے جو کسی وجہ سے اب تک ہماری نظروں سے اوجھل ہیں اور جن کی روشنی میں ہندستان کے باشندگان اور خاص طور سے مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کا نقشہ مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب کوئی یک شبینہ نہیں، بلکہ نو سالہ کدوکاوش اور ذہنی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کا آغاز ہوا اور اس کا اختتام ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ شاہ پارے اتنی طویل ریاضت کے بعد ہی وجود میں آتے ہیں۔ حروف کی نقش گری اتنا آسان کام نہیں اور پھر یہ بھی کہ انھوں نے دوسری مصروفیات سے بھی ہاتھ نہیں کھینچا تھا، بلکہ انھیں قال اللہ اور قال الرسول کی محفل علم و معرفت سجانے اور تصوف و سلوک کی راہ پر چلنے والے ارادت مندوں کی دست گیری کے ساتھ سیاست کی زلف پریشاں کو بھی سنوارنا تھا کہ۔

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ۴۴۸ صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ شروع کے ۱۸۰ صفحوں میں خاندانی اور شخصی کوائف درج ہیں۔ اس کے بعد اپنے استاد گرامی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا مختصر تذکرہ کرکے اس وقت کی عمومی ہندستانی سیاست کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں انگریزوں کی ظلم پیشہ طبیعت کا بیان بھی ہے اور ہندستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی مظلومیت کی دل خراش داستان بھی۔ دوسرا حصہ ۳۵۲ صفحات کو محیط ہے۔ جس میں اسلامی ریاستوں پر یورپی ممالک کی یورش اور استخلاص وطن کے لیے شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور حضرت شیخ الہند کی انقلابی تحریکوں کا تفصیلی جائزہ شامل ہے۔

نقش حیات مولانا مدنی کی تعلیمی، تدریسی اور سیاسی زندگی کا بیان ہی نہیں، بلکہ ملکی اور بیرونی حالات وکوائف کا بھی حسین مرقع ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کتاب پر تعارفی کلمات میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب صرف حضرت مدظلہ العالی کی سوانح حیات ہی نہیں رہی، بلکہ ہندستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے اقتدار کے خاتمے تک تمام نمایاں واقعات کا مجموعہ، برطانوی حکومت کی تباہ کن ڈپلومیسیوں اور سیاسی مکروفریب کا انسائیکلوپیڈیا، حضرت شیخ الہند کی تحریک حریت اور اس عرصے کے سیاسی رجحانات اور انقلابی تحریکات کا وہ مستند اور جامع تذکرہ ہے، جس کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے ضروری ہے، جو ماضی سے سبق لے کر مستقبل کی فکر کرنا چاہتا ہے۔ اور ہندیونین میں ملت اسلامیہ کی عزت وعظمت کا آرزومند ہے۔'' (نقش حیات، ص:۱۴)

نقش حیات کے مضامین اور اس کی زبان و بیان اور طرز ادا کیسی ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق، اس پر آج تک کسی ادیب یا اردو کے ریسرچ اسکالر نے تفصیلی بحث نہیں کی۔ میں مانتا ہوں کہ مولانا مدنی کوئی صاحب طرز ادیب یا انشاء پرداز نہیں تھے۔ وہ شاعر تھے، نہ نثر نگار وہ تو ایک صوفی منش آدمی تھے، جن کے اعصاب پر بس ایک ہی فکر سوار رہتی تھی اور وہ تھی ملک وقوم کی انگریزوں کے چنگل سے آزادی۔ ایسی صورت میں کوئی اپنی زبان دانی کا کیسے ثبوت دے سکتا تھا۔ مصلح قوم سرسید بھی بس قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے، نہ کوئی اہتمام اور نہ التزام، نہ تکلف اور نہ تصنع، ان کے ہاں آمد ہی آمد تھی، آورد کا کوئی دخل نہ تھا، قوم مسلم کو جگانے کے لیے وہ ادبی ملمع سازی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زور بس ادائے مطلب اور مدعا نگاری پر تھا۔ مولانا مدنی نے بھی انھی نکات پر اپنی خودنوشت یا دوسری تحریریں سپرد قلم کی ہیں۔ مولانا مدنی کی حالت تو حالی کے الفاظ میں اس شخص کی سی تھی جس کے گھر میں آگ لگی ہو اور وہ پاس پڑوس کے لوگوں کو مدد کے لیے پکارے، ایسی صورت میں اس کے پاس عبارت آرائی اور لفاظی کے لیے گنجائش کہاں نکلے گی۔ وہ تو بس ادائے مطلب اور مدعا نگاری پر زور دے گا۔

لیکن مولانا نے اس عجلت اور مدعا نگاری میں بھی زبان و بیان کی حد بندیوں کا خیال رکھا ہے۔ ان کی تحریر کو پڑھتے ہوئے خشکی کا احساس تو ہوتا ہے کہ انھوں نے علمی زبان لکھی ہے اور انھوں نے آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کا خیال رکھا ہے اور پاپ بیتی کی طرف تو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کیوں کہ ایجاد معانی تو خداداد ہوتی ہے۔ اس کے لیے جوش ملیح آبادی کی طرح فرضی عشقیہ داستانوں کی پیوند لگانے کی ضرورت نہیں۔ مولانا حقیقت وصداقت کا تھامے رہنے کے باوجود زبان وبیان کی حد بندیوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔

مجھے ذیل کی سطروں میں نقش حیات کے مضامین اور اس کی تاریخی یا سیاسی حیثیت سے بحث نہیں کرنی

ہے کہ اگر ادبی معیار بندی کا یہ اصول قرار پا جائے تو پھر ہمیں بہت سے ادبی مسلمات اور تاریخی حقیقتوں پر خط تنسیخ کھینچنا پڑے گا۔ واقعات اور مواد اور تاریخ نگاری کے حوالے سے کسی دوسری خودنوشت تحریر سے نقش حیات کا کوئی علاقہ نہیں۔ شاہین کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور۔ مجھے صرف زبان و بیان اور خودنوشت کے نام نہاد اصول کی عینک سے اس کو دیکھنا ہے اور ٹوٹی پھوٹی آڑی ترچھی لکیروں کے ذریعے نقش حیات کی وہ تصویر ابھارنی ہے جو ہمارے ذہنی اور ادبی جمود پر ہلکی سی ضرب لگا سکے۔

جو کچھ لکھا جائے بے تکلف اور قلم برداشتہ لکھا جائے۔ یہی طرز تحریر نثر میں محبوب اور مروج ہے۔ نہ جانے کیوں مولانا حالی نے شاعری میں ستر کنویں جھانک کر الفاظ کے تفحص کی ستائش کی ہے۔ خیر شاعری میں تو یہ قدم محبوب اور قابل تقلید ہو سکتا ہے، لیکن نثر خاص طور سے خودنوشت میں تو یہ طرز تحریر کسی بھی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ مولانا مدنی کے موئے قلم سے ایسے بے تکلف اور پر معنی جملے ادا ہوئے ہیں جن پر مقفی اور مسجع تحریروں کا انبوہ قربان کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے طویل جملے نہیں لکھے ہیں کہ اس قسم کے جملوں سے جو دارز نفسی پیدا ہوتی ہے، قاری اس کی مشقت کا بار اٹھانے کے قابل نہیں رہتا اور وہ اکتاہٹ کی گرفت میں کتاب کو ایک طرف ڈالنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ نقش حیات میں اکثر یک سطری جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ اور بہت سے تفریعی جملوں کا اختتام ایک ہی حرف پر ہونے کی وجہ سے موسیقیت کی چاشنی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جملے اتنے چھوٹے اور پرزور ہیں کہ ان میں ڈرامائی مکالموں کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا نے حسب ونسب سے جنم لینے والے امتیازات کو ایک غیر اسلامی تصور قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اور روح نکلنے کے بعد تو جسم انسانی خواہ شریف کا ہو یا رذیل کا، بادشاہ کا ہو یا فقیر کا، قوی کا ہو یا ضعیف کا جس حالت پر پہنچ جاتا ہے سب کو معلوم ہے۔ جماد محض ہو کر پھولتا پھٹتا ہے، سڑتا گلتا ہے، کیڑے پڑتے ہیں، بدبو سخت پیدا ہوتی ہے، پیپ اور لہو بہتا ہے اور زمین میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ شرافت نسبی کچھ فرق کرتی ہے، نہ دولت و ثروت، نہ حکومت وقوت'' (ص:۳۲-۳۳)

مولانا حسین احمد مدنی کو شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی فارسی اور عربی کے بہت سے اشعار انھیں ازبر تھے، جن سے وہ اپنی تحریروں میں موقع بموقع استدلال کرتے ہیں۔ ان اشعار کی تعداد غبار خاطر کی طرح اتنی تو نہیں ہے کہ اس کے لیے محققین الگ سے اشاریہ ترتیب دیں لیکن جتنے فارسی کے جتنے اشعار بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں وہ بے وقت کی راگنی معلوم نہیں ہوتے، ان اشعار کا مفہوم بھی مضمون اور مخاطب کے حسب حال ہے۔ ایک جگہ اپنے اوپر اور اپنے خاندان پر خدائی انعامات واکرامات پر شکریہ سے قاصر

رہنے پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر بروید از ہر مو زبانم
ادادئے شکر لطفش کے توانم
من آں خاکم کہ ابر نوبہاری
کند از لطف بر من قطرہ بازی

برطانوی سامراج نے جس طرح مکروفریب سے کام لے کر اپنے اردگرد بداطواروں، بدقماشوں اور جرائم پیشہ افراد کا گروہ اکٹھا کرلیا تھا اس پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر رقم کرتے ہیں:

کند جنس باہم جنس پرواز
کبوتر باکبوتر باز باباز

مولانا اردو کے قدیم دواوین پر بھی نظر رکھتے تھے اور اساتذہ کے سینکڑوں اشعار ان کے حافظے میں موجود تھے۔ فارسی کی طرح ہی کہیں کہیں اردو کے اشعار سے بھی انھوں اپنی بات کو مزین کیا ہے۔ اپنے والد کے حب نبوی اور مدینہ منورہ سے عشق ومحبت کو ان اشعار کی آنچ دی ہے کہ:

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علمائے اہل سنت اور علمائے دیوبند کے سر پر جس طرح حسام الحرمین میں بے سروپا الزامات کا ٹھیکرا پھوڑنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کا دنداں شکن جواب دیتے ہوئے یہ شعر لکھا کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

جب اپنے استاد اور روحانی پیشوا حضرت شیخ الہند کی تجہیز وتکفین میں شرکت سے محروم رہ گئے تو اپنی حسرت کا اظہار اس شعر سے کیا کہ

قسمت کی بد نصیبی کو صیاد کیا کرے
سر پر گرے پہاڑ تو فرہاد کیا کرے

تشبیہات واستعارات کے مرقعے بھی تحریروں کا حسن دوبالا کرتے ہیں۔ کسی روکھی پھیکی تحریر میں بھی تشبیہ اور استعارے کی پیوند کاری سے ان کے تن مردہ میں جان آجاتی ہے۔ لیکن وہی تشبیہ اور استعارہ چمن تحریر کی حنابندی کرسکتا ہے جس میں برجستگی اور شگفتگی ہو۔ بہ تکلف ڈھونڈی جانے والی تشبیہیں کہاں کی اینٹ، کہاں

کارروڑا ثابت ہوتی ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی نے بھی اپنی تحریر کی جڑوں میں تشبیہ کا آب حیات دیا ہے۔
اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ تمام تر علمی اور سیاسی مصروفیت کے باوجود وہ اس ہنر سے عاری یا غافل نہیں تھے۔
جب مولانا اور ان کے گھر کے دوسرے افراد نے مل کر ان کے والد محترم کو مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنا لینے کی ترغیب دی، تو اس مطالبے کو اس طرح تشبیہ دی ہے:

"یہ کلمات ایسے مؤثر واقع ہوئے جیسے کہ اسپرٹ میں دیا سلائی ہوتی ہے۔" (ص: ۴۷)

اسی طرح جب مولانا کی اہلیہ کے ماموں نے مولانا کے والد محترم سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اس کو لکھنؤ میں رکھ کر طب پڑھاؤں گا تو والد کے انکار اور دینی اور عصری تعلیم کے مابین فرق کو کتنی خوب صورت تشبیہ دی ہے:

"والد صاحب نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد مدنی کو گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا۔ (ص: ۴۸)

اسی طرح ہندستان کی دولت و ثروت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۷۷۲ء میں صرافوں کی دکانوں پر شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوئے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں۔" (ص: ۲۳۰)

مولانا نے کسی بھی چیز کا ذکر کرتے وقت اس کی تمام جزئیات اور مالہ و ماعلیہ کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔
مدینہ منورہ میں پانی لانے کے لیے سقے متعین ہوتے تھے، جو نہر زرقاء سے پانی لانے کا کام کرتے تھے۔ نہر زرقاء کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اس کے جائے وقوع، اس کے اجمالی پس منظر کے عنوان سے دو صفحے کا طویل مضمون لکھا ہے، جس میں اس کے ابتدائی عہد سے لے کر اس کی موجودہ حیثیت تک کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔
اس حصے کو پڑھتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے چڑیا چڑے اور چائے والے خطوط کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی انشاء پردازی اور مضمون آرائی کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا نے اس نہر کے کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔
ایک جگہ ہندستان کی خوبیوں اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات کا شمار کرتے ہوئے کچھ یوں لکھا ہے:

"اس زمانے میں عام طور سے ہندستانیوں میں مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، غرباء اور مصیبت زدوں پر شفقت اور رحم، عہد و پیمان کا تحفظ اور پابندی، خدا ترسی اور سچائی، امانت داری اور سخاوت، وفاداری اور صداقت، دیانت داری اور عدالت، بلند حوصلگی اور شرافت، بیدار مغزی اور جفاکشی، چستی اور بیداری، شجاعت اور مردانگی وغیرہ اوصاف جمیلہ بڑے پیمانے پر پائے جاتے تھے۔" (ص: ۱۹۴)

الفاظ کی تکرار سے غنائیت پیدا ہوتی ہے۔ قدیم شعراء کے دواوین لفظوں کی تکرار والی صنعت سے لبریز ہیں۔ مولانا بھی اس ہنر سے عاری نہیں ہیں۔ شاہان ہند کی رواداری اور ان کے مساویانہ اور عدل پرور نظام حکومت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی نہیں، بلکہ اپنی بے مثل ثروت، بے مثل تجارت، بے مثل دست کاری، بے مثل تمدن اور بے مثل طاقت کی بنیاد پر اقوام عالم میں برتری اور سب سے فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔'' (ص: ۸۶-۱۸۵)

اسی طرح ایک ہی وزن کے متضاد الفاظ کے ذریعے بھی غنائیت اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ تنافس وتنافر، اعمال واخلاق، ذکر وفکر، خلافت اور اجازت، معماروں اور مزدوروں، اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ، سلام وپیام وغیرہ مرکب الفاظ مختلف مواقع پر قاری کی موسیقیت پسندی کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

صنعت تضاد سے بھی تحریر میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اس سے جہاں قاری کی ذہنی ورزش ہوتی ہے وہیں وہ دو مختلف تصورات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ اس سے اشیاء کے حسن وقبح کا پہلو بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ عربی کا مقولہ ہے۔ الاشیاء تتبین باضدادہا۔ مولانا اگر چہ شاعر نہ تھے، مگر اس ادبی خصوصیت سے ناواقف نہ تھے۔ لکھتے ہیں:

''رحمت اور انعام خداوندی کی بے نیازی اور وسعت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ دم کی دم میں ذرہ کو پہاڑ اور قطرے کو سمندر بنادے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عامی مسلمان کو قطب الاقطاب بنادے۔ جاہل کو عالم اور دیوانہ کو افلاطون کردے تو کچھ مستبعد نہیں۔'' (ص: ۳۳)

مولانا کی نظر اردو کے محاوروں، ضرب الامثال اور روزمرہ پر بھی بڑی گہری تھی۔ دیکھیے نقش حیات میں استعمال ہونے والے چند محاوروں، ضرب الامثال اور روزمروں کی جھلک۔ مجھ پر نزلہ زیادہ گرتا تھا، وہ ہمیشہ کاٹ کرتے تھے، میری اولاد پھلے پھولے گی، خاندان کے بڑھنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں، کس کے پلے پڑ جائیں، اپنا الوسیدھا کرنا، مگر خدا جانے اس بے شمار دولت اور بے نظیر سرمایہ کو زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا، فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا، ایڑی چوٹی تک زور لگادیا، کامیابی کے ڈنکے بھی بجائے، تنگ آمد بجنگ آمد، پانی سر سے اوپر گزر چکا تھا وغیرہ۔

مولانا کی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی اور مسجد نبوی میں تعلیم وتدریس کے طویل تجربے نے انھیں عربی کا مرد میدان بنادیا تھا، اسی لیے ان کی تحریروں پر عربی اور فارسی کا گہرا نقش ملتا ہے، لیکن مولانا بلاغت کے اصول سے ناواقف نہیں تھے۔ وہ خود نوشت اردو میں لکھ رہے تھے اور انھیں اپنے مخاطب کی علمی قابلیت اور ذہنی رسائی کا بھی خوب اندازہ تھا۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مقامی زبان کے عام فہم ہندی الفاظ کو بھی

جملوں میں برتا ہے، جس کی وکالت مولانا سید سلیمان ندوی بھی کیا کرتے تھے۔ نقش حیات میں چھپ لک کر، اپرتلی، ٹٹپونجیوں، استری اور کلف، ہنڈی، ٹاٹ، ڈنٹھرو، ڈھلوان، ڈھارس، گارا ڈھونا، اینٹیں پاتھنا وغیرہ خالص مقامی الفاظ ملتے ہیں۔

آج سے پچاس ساٹھ سال قبل اختصار وایجاز کو تحریر کی معراج تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا نے اس عام روش کو اس طرح تو نہیں اپنایا کہ اختصار کے گرداب میں اس طرح الجھ جائیں کہ تحریر ایک معمہ بن جائے، بلکہ انھوں نیا پنے مخاطب اور مضمون کا لحاظ کرتے ہوئے اختصار وایجاز سے کام لیا ہے۔ جملے نہ مختصر ہیں اور نہ طویل۔ ان کی تحریروں میں نہ ایجاز مخل ہے اور نہ اکتا دینے والی طوالت۔ بلکہ درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ محشر اعظمی نے مولانا کی قلمی خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ کا قلم بس وہیں تک چلتا ہے جتنا اسے چلنا چاہیے۔ نہ اتنی تفصیلات اور جزئیات ہوتی ہیں کہ پڑھتے پڑھتے قاری اکتا جائے اور نہ اتنا اختصار کہ مطلب ہی خبط ہو جائے۔ جس بات کی تفصیل ضروری ہوتی ہے اسے پھیلا کر لکھتے ہیں اور جس بات میں اختصار ہونا چاہیے اسے مختصر ہی لکھتے ہیں'' (روزنامہ الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص: ۱۷۳)

نقش حیات میں اختصار و جامعیت سے عبارت اس طرز تحریر کا انھوں نے بھر پور لحاظ رکھا ہے۔ چناں چہ اپنے ذاتی احوال تو اختصار کے ساتھ قلم بند کیے ہیں، لیکن دوسرے حصے میں قومی اور بین الاقوامی حالات پر تفصیل اور طویل حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

خلاصہ یہ کہ نقش حیات میں معانی کا دریا بھی رواں ہے اور زبان و بیان کی نہر بھی بہ رہی ہے۔ یہ صرف معلومات کا خزینہ ہی نہیں، ادبی لطافت کا مرقع بھی ہے۔ نثر کے لیے سادگی، سلاست، اختصار و جامعیت، قطعیت، صراحت اور وضاحت کی جتنی شرطیں درکار ہیں، ان پر نقش حیات سو فی صد نہیں تو ننانوے فی صد ضرور اترتی ہے۔ مشکل سے مشکل مضمون کو انھوں نے آسان جملوں میں قلم و قرطاس کے حوالے کر دیا ہے۔ جو زبان و بیان پر ان کی مہارت کی دلیل ہے۔ انگریزوں کے دجل و فریب اور ان کی ظالمانہ پالیسیوں کے حوالے سے کوئی بات بے دلیل نہیں ہے۔ انگریزی اور اردو کے سینکڑوں حوالے قاری کو ایقان کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ ہر بات قاری کو یقین و عمل اور محبت و معرفت کی لذت سے شرسار کرتی ہے۔ اور دل پر اپنا اثر مرتب کرتی ہے۔ یادوں کی بارات کی طرح خالی خولی بے لطف الفاظ کا مجموعہ نہیں، نہ عشق و عاشقی کے فرضی واقعات سے آلودہ ہے، لیکن پھر بھی خدا معلوم کیوں ہمارے ناقدین اور خود نوشت نگاری پر ریسرچ کرنے والوں نے اس پر مطلوبہ توجہ نہیں دی ہے۔ نامکمل خود نوشتوں پر بحث کی گئی ہے، مگر ایک مکمل خود نوشت کو نظر

انداز کر دیا گیا ہے۔ نقش حیات صرف اپنے مضامین و مشمولات کے اعتبار سے ہی نہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے۔ نقش حیات کوئی ناول اور افسانہ تو نہیں لیکن تاریخی و سیاسی حقائق کا نگار خانہ ضرور ہے۔ اس میں نام نہاد فنی جمالیات تو نہیں، لیکن خودنوشت کی دوسری صفات خود اظہاریت اور تاریخی صداقت کا سنگم ضرور ہے۔ یہ قلب میں سوز اور روح میں احساس کے ساتھ تحریر کی گئی ہے، ایسا قلب جو لا الہ کی صدائے الوہی سے سرشار تھا۔ اور ایسے صاحب دل بزرگ کے قلم کا نتیجہ ہے جو شب زندہ دار ہونے کے ساتھ رسم شاہبازی ادا کرنے کے لیے میدان جنگ میں بھی شہ سواری کا فرض انجام دیتا تھا۔ یہ ایسے مرد مجاہد کی داستان حیات ہے جس کے رگ و پے میں مستی کردار کا لہو گردش کرتا تھا۔ یہ ایسے شخص کی روداد زندگی ہے جو قوم کی حالت اور قوم کی امامت دونوں ہنر سے آشنا تھا۔ اس کی زندگانی صداقت، عدالت اور شجاعت کے خمیر سے تیار ہوئی تھی۔ اس کے اندر کسی قسم کی تعلّی یا نفس پروری نہیں تھی اور حالی نے جو خودنوشت کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ اس میں تعلّی اور خودستائی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے اور خود نوشت تمام کاموں سے سبک دوشی حاصل کرنے کے بعد لکھی جائے، ان دونوں شرطوں پر یہ خودنوشت مکمل اترتی ہے۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ ہماری ادبی حس بیدار ہو اور ساٹھ سال بعد ہی سہی اس کی ادبی قدر و قیمت کا جائزہ ضرور لیا جائے، کیوں کہ یہ محض کتاب ہی نہیں، علم و معانی کا بحر بے کراں ہے، جس سے ہر دور میں مستقبل کی تعمیر کا نقشہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ دور حاضر کے مشہور تخلیقی ناقد حقانی القاسمی نے اسی شکوہ کا اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

''ادبی اور علمی دونوں اعتبار سے اس (نقش حیات) کا شمار اہم خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ گو کہ تنگ نظر ناقدین اس کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں، مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو خود نوشت کے فنی تقاضوں پر یہ کتاب پوری اترتی ہے۔ جس میں مولانا موصوف نے نہ صرف اس عہد کو زندہ کر دیا ہے، بلکہ اس عہد کی پوری سیاسی اور سماجی تاریخ بھی اس کتاب میں سما گئی ہے۔ اس لحاظ سے نقش حیات ایک مقصدی خودنوشت ہے نہ نرگسیت کی شکار خودستائی یا خود بینی کی مظہر'' (دارالعلوم دیوبند، ادبی شناخت نامہ، ص: ۷۰)

نقش حیات ہمارا علمی، ادبی اور تحقیقی سرمایہ اور ہماری مشرقی اقدار حیات کا وہ بیش بہا خزانہ ہے، جو عرصے سے گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ اس متاع بیش بہا کی علمی، ادبی اور تحقیقی بازیافت ازحد ضروری ہے، تاکہ ہم اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں حقیقت کا رنگ بھر سکیں۔ اردو کے ریسرچ اسکالرس کو عموماً اور سوانحی ادب پر کام کرنے والوں کو خصوصاً اس کی ادبی بازیافت کے لیے اس مصرعے کے ساتھ آواز دی جا سکتی ہے کہ

اے اہل ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

اور

اقوام حریت کا عالم گیر تصور

مولانا محمد نوید دیوبندی

دارالعلوم دیوبند

برسہا برس قبل سرزمین ہند پر جب پہلی مرتبہ قافلہ اسلام کے مبارک قدم پڑے اور خدا کے برگزیدہ بندوں نے اس سرزمین اصنام پر جب پہلی مرتبہ اذان دیکر فریضہ خداوندی کو ادا کیا تو خلوص وللّٰہیت اور خشوع وخضوع کی خوشبو سے معطران مومنوں کے سجدوں کی دربار خداوندی میں مقبولیت کا نتیجہ آنے والی صدیوں نے خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، مجدد الف ثانی امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ عبدالقدوس گنگوہی اور شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ وغیرہ جیسے صاحب کشف وکرامت بزرگوں کی شکل میں دیکھا پھر ان علم برداران توحید کے احیاء دین واعلاء کلمۃ اللہ، دعوت وتبلیغ اور ریاضتوں ومجاہدوں کو رب کریم کی جانب سے وہ برکت عطاء ہوئی کہ ان کے نقش پا پر چلنے والے اخلاف اپنے بعد آنے والوں کے لئے آہ سحر گاہی کا ثمرہ بن گئے پھر ان حضرات کی فیض بخشیوں نے تشنگان ہدایت کی سیرابی کے لئے جہاں فکر ولی اللہی کو جنم دیا وہیں ان کے فیض یافتگان کی جماعت نے آگے چل کر حاجی امداد اللہ جیسے سرخیل اور حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ جیسے یکتائے زمانہ افراد پیدا کئے جن کی مساعی جمیلہ کا عملی نقشہ بغداد ہند ''دیوبند،، کی شکل میں نمودار ہوا اور جس نے ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد مسلمانان ہند کی تعلیمی وتربیتی، دینی ومذہبی اور قومی وملکی خدمات انجام دیکر ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سامان بہم پہنچایا اور جس کے عظیم احسان سے تاریخ ہند کے شانے ہمیشہ گراں

بار رہیں گے؛ چنانچہ اسی چمنستان علم وفن "دیوبند" کا ایک گل سرسبد فخر الامثال، زبدۃ الافاضل، عظیم المرتبت، رفیع المنزلت، یادگار سلف، تاجدار خلف، بزرگوں کی آبرو، خردوں کی آرزو، بزم علم وعرفاں کی شمع فروزاں، فن حدیث کا پر شکوہ ایوان، مسند وعظ وہدایت، برکۃ العصر، بطل حریت، مجاہد آزادی، ولی اللّٰہی حریت فکر کے وارث وامین، امام حریت حضرت شیخ الہند کی تحریک حریت کے جانشین، قطب عالم، شیخ العرب والعجم، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شکل میں نمودار ہوا کہ جن کی زندگی مسلمانان ہند کے لئے خصوصا اور عالم اسلام کیلئے عموماً عبرتوں، موعظتوں اور جامعتوں کا حسین گلدستہ حیات ہے اور جن کی ذات والاصفات میں ظاہری شریعت کی ظاہر آرائی کے ساتھ ساتھ باطنی طریقت وسلوک کی رمز شناسی، عرفان نوازی، مشاہدہ حق اور تجلیات وانوارات کی فراوانی کا مجتمع ہو جانا اس اندھیرے دور میں کرشمہ کارساز فطرت ہے؛ تاریخ کی کوکھ سے نکلی یہ حقیقت بھی علماء کے معزز طبقہ کے لئے خصوصا اور عوام الناس کے لئے عموماً درس عبرت ہے کہ آپؒ اپنے اکابر ومشائخ سے حاصل کردہ افکار ونظریات پر اس شدت وصلابت کے ساتھ قائم تھے کہ وقت کا کوئی تیز وتند طوفان ہو، زمانہ کی کوئی ہلاکت خیز آزمائش ہو یا عہد حاضر کی کوئی مصلحت شناسی اس جادہ حق سے انحراف تو درکنار آپؒ کے پائے ثبات میں لغزش بھی نہ پیدا کر سکے بلکہ مذہب ہو یا ریاست زندگی کے کسی بھی شعبہ میں جو مسلک اپنی خداداد بصیرت اور دانائی سے قائم کرلیا تاعمر اسی موقف پر قائم رہے کیسا ہی بڑا مسئلہ کیوں نہ ہو بھی آپؒ کے یہاں دورائے نہیں رہیں حقیقتاً قول وفعل کا اس قدر تطابق کہیں اور ملنا ناممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہے؛ سعادت وخوش بختی کے ان پھولوں کو بھی آپؒ ہی کے دامن زندگی نے سمیٹا کہ امام الہمام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لیکر حضرت شیخ الہندؒ تک جو تسلسل ذہنوی ومعنوی تقریر وتحریر اور شخصیتوں کے سانچے میں ڈھلا چلا آرہا تھا آپؒ کی ذات اس مبارک ومسعود سلسلہ کی ایک سنہری اور سب سے آخری کڑی تھی؛ چنانچہ مورخ جب آپؒ کی قد آور شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کوشش کرتا ہے تو تبحر علمی، حسن عمل، اصابت رائے، بے نفسی وسادگی، سچائی ومہمان نوازی، حلم وتحمل اور صبر وضبط جیسے بے شمار اوصاف حمیدہ اسکے قلم سے نکل کر قرطاس پر نقش ہونے لگتے ہیں۔

یوں تو شیخ اسلامؒ کی زندگی کا ہر پہلو خواہ تصوف وسلوک ہو درس وتدریس ہو یا سیاست وسیادت سبھی نمایاں، اجاگر اور آپؒ کی کلاہ افتخار میں نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں لیکن آج کی اس صحبت میں ہمارا موضوع آپؒ کی حیات مستعار کا ایک اہم پہلو یعنی تحریک حریت ہے، جس کی خاطر آپؒ رزم گاہ حق وباطل میں بے دریغ نبرد آزما ہوئے نیز جس کا تعلق عوام وخواص دونوں ہی کی مصالح حیات کے ساتھ نہایت گہرا اور استوار ہے اور

جو اپنے اندر ایک صدی کی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔

ملک کی تعمیر جدید اور علماء دیوبند

ازل سے خداوند قدوس کی یہ عادت جاری ہے کہ جب بھی خلاف عدل کوئی ظلم کی جمعیت سر اٹھاتی ہے تو اس کو کچلنے اور نظام عالم کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ ایک مصلح جاں باز کو اس کے مقابلہ میں مقرر فرماتا ہے اور یہ عقلاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کوئی شے اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا رد عمل شروع ہو جاتا ہے چنانچہ مجاہدین کی ایک جماعت اسی مقصد کی تکمیل اور آبیاری کے لئے سر بکفن عالم وجود میں آئی اور اس کی سر خیل سید الطائف شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عظیم المرتبت شخصیت بنی جن کے علوم وافکار کا محور ہی درس انسانیت اور عدل وانصاف کی ترویج واشاعت تھا پھر اسی سلسلہ کے بزرگوں میں ایک نام حضرت نانوتویؒ کا بھی ہے جن کی زندگی خدمت خلق اور رفاہ عام کا حسین عنوان بن چکی تھی اور آگے چل کر اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی حضرت شیخ الہندؒ کی گراں قدر شخصیت تھی جنہوں نے اپنی خاموش صداء سے سارے ملک کو للکارا اور قلوب انسانی میں وہ عظیم الشان انقلاب برپا کردیا کہ ملک کا بچہ بچہ طالب حریت نظر آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک محدود وقت میں مجاہدین کی ایک کثیر التعداد صف تیار ہوگئی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اور جہاد حریت کی سرگرمیاں

آپؒ نے ایسے وقت میں قوم کی زمام قیادت سنبھالی جب کہ خطہ ہند کی زمین اور اس کا آسمان بدلا ہوا تھا انگریزی حکومت کے جابرانہ تسلط اور تشدد کی مسموم ہواؤں نے فضاء کو تیرہ وتار بنا رکھا تھا انسانیت نیم جان بلکہ لب جان ہو چکی تھی آپ بے باک مجاہد بن کر میدان عمل میں کود پڑے اور آزادی ہند کو اپنا فرض منصبی سمجھا چنانچہ جو خواب حریت حضرت شیخ الہندؒ نے دیکھا تھا آپؒ کی سعی پیہم نے اسے شرمندہ تعبیر کیا ملک کے گوشے گوشے میں جاکر قوموں میں زندگی کی روح پھونکی احساس حریت کی اہمیت بتلائی چنانچہ دور اسارت میں لکھے آپؒ کے مکتوبات جو در حقیقت مستقل درس حیات اور جذبہ عمل کا پیغام ہیں اور جن کے حرف حرف سے ایک صداقت کیش، جفاء کش، وفاء شعار، مجسمہ اخلاق اور پیکر عمل مجاہد آزادی کی پر خلوص تعلیمات مترشح ہوتی ہیں ہم اس موقع پر آپؒ کے مکتوبات کے کچھ اجزاء افادہ ناظرین کے مدنظر تحریر کرتے ہیں "ہم کمزور ہیں، ہم میں اتفاق نہیں ہم ہتھیار نہیں رکھتے، ہم مال نہیں رکھتے، ہمارا دشمن قوی ہے اسکے پاس ہر قسم کا ساز وسامان ہے ہمیں اس سے بدلہ لینا ہے لیکن ہمیشہ مقابلہ طاقت اور سمجھ سے ہوتا ہے یہی طریقہ قرآن وحدیث اور آنحضورﷺ نے بتایا ہے اسی لئے ہم کو جب تک کہ ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں یعنی خلافت کی آزادی، جزیرۃ العرب کی آزادی،

پنجاب کی تلافی! اس وقت تک ہم کو چین سے نہ بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ مکتوبات کا آخری حصہ قند مکرر کی حیثیت رکھتا ہے" ہم ہر دن اپنے مقصد یعنی آزادی ہند کے قریب ہوتے جا رہے ہیں الحمدللہ ملک اور قوم کا قدم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، ہم ضعیف ہیں مگر انشاء اللہ العزیز پلیگ کے کیڑے ہو کر گورنمنٹ کے موجودہ طریقہ اور جماعت کو مبتلاء کر کے ڈھائی گھڑی کی لگا دیں گے"۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اور حریت اقوام کا عالم گیر تصور

حضرت شیخ الاسلامؒ کی نظر میں ہند کا مسئلہ حریت، جزیرۃ العرب کی آزادی کا خیال یا صرف پنجاب کی تلافی کا منصوبہ ہی نہیں تھا بلکہ آپؒ انسانیت کے خادم اور داعی تھے آپؒ کی نظر میں عالم انسانیت کا مسئلہ تھا آپؒ نے جہاں بانی انسانیت ﷺ کی تعلیمات سے سیکھی تھی جن میں غیر معمولی استحکام، بے مثال صداقت اور بے لاگ حق پسندی تھی یہی وجہ ہے کہ آپؒ نے کبھی بھی مغربی شعبدہ بازیوں کو سیاست کا معزز لقب نہیں دیا اور تا عمر اپنے اس موقف پر قائم رہے خواہ مخالفت کی پر پیچ آندھیوں نے آپ کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کرنے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی ہوں؛ ہزار افسوس! کہ چند تملق پسند لوگوں نے ذاتی مفاد کی خاطر ملکی و ملی مفاد کا خوں کرنا اپنا نظریہ سیاست اور قانون جماعت قرار دیا جس کے نتیجہ میں ہزارہا بے قصور انسان موت کی ابدی نیند سوئے، حق پرست علماء کی پگڑیاں اچھالی گئیں اور انجام سے بے پرواہ نادان قوم کو بلا تعیین منزل ایک گم کردہ راہ راہبر کی حیثیت سے لے چلے لیکن جہاں آپؒ نے حریت ہند کو وقت کی سیاست کا اہم مسئلہ قرار دیا وہیں قرب و جوار کے دیگر ممالک جو انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انکی آزادی کو مقصد اصلی ثابت کر دیا ہندوستان کی حریت کو انکی حریت کی کلید بتلایا اور اس بات کا اعلان کیا کہ اس ملک (ہندوستان) کے آزاد ہونے سے قرب و جوار کے اسلامی ممالک مثلاً یاغستان، افغانستان، ایران، وغیرہ بہت سے مصائب و خطرات سے محفوظ ہو جائیں گے مقامات مقدسہ اور دیار عرب، مصر، شام، فلسطین، سوڈان اور شمالی ہند وغیرہ آزاد ہو سکیں گے۔

مظلوم اقوام اور اتحاد باہمی کی اہمیت

آپؒ نے حصول آزادی کی خاطر تمام ہندی اقوام میں اتحاد باہمی کی وجہ کو لازمی اور ضروری قرار دیا جو کہ قدیم زمانہ سے ہندو مسلم اور دیگر ہندی قوموں کے مابین چلی آ رہی تھی اور ساتھ ہی دشمنان ملک و قوم کی مخالفت کی ہر ممکن تدابیر کو خود بھی اپنے اوپر فرض کر لیا اور قوموں کیلئے بھی فرض قرار دیا اور انکی موافقت اور اموالات کے اسباب کو بہم کرنا بالکل حرام قرار دیا اور ببانگ دہل اعلان کیا چنانچہ اسی زمانہ میں ایک فتویٰ شائع کیا جس کے

خلاف بعض جماعتیں برافروختہ ہوئیں لیکن آپ کی عزیمت وجرئت تھی کہ حدیث رسول ﷺ کی روشنی میں آپؒ نے تمام اہل باطل سے مقابلہ کیا اور یوں اعلان کیا" کہ میں ڈنکے کی چوٹ پر اعلان یہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کیلئے برطانوی فوج میں ملازمت حرام ہے درحقیقت یہ اعلان قرآن کریم کے بالکل موافق تھا یہ صحیح ہے کہ قرآن نے ہمیں اولی الامر کی اطاعت اور بادشاہ وقت کی وفاء شعاری کی تعلیم دی ہے لیکن ایسی اطاعت کو حرام قرار دیا گیا ہے جس میں خالق کی معصیت اور بغاوت لازم آتی ہے یہ کلی اصول آپؒ کا مطمح نظر اور بے باک منی بر صداقت نظریہ تھا۔

قومیت متحدہ کا تصور اور اسکی حقیقت

یہ اتحاد باہمی کا مسئلہ سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں اس طرح ابھر کر سامنے آتا ہے کہ سرزمین مکہ کے بسنے والوں نے آپ ﷺ کو کبھی سنگباری، کبھی توہین آمیز فقروں اور سب وشتم کی صورت میں ایذائیں پہنچائیں اور آپ ﷺ نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور جنہوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے ان کے حق میں دعائیں کیں، آپ ﷺ نے تمام عرب کو اپنی قوم بتایا اور اپنے آپکو انہی میں سے ایک فرد شمار کیا بعینہ یہی صورت حال ہندوستان میں مسلم وغیر مسلم تعاون باہمی اور اتحاد کی تھی چنانچہ وطن کی حفاظت کے لئے رسول اللہ ﷺ نے متحد ہو کر دشمنوں اور مخالفوں سے مقابلہ کرنے اور دفاع کے لئے ہر ممکن قوت کو بروئے کار لانے کی اجازت دی ہے اور جابجا ارشادات نبوی ﷺ میں اسکی نظیر موجود ہے اسی تاریخی پس منظر کی تائید و روشنی کے بل بوتے پر آپؒ نے ہندوستان میں متحدہ قومیت کا اعلان کیا اور مادی طاقتوں کے بل بوتے پر اترانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں اسے ایک مجرب نسخہ اور کارآمد حربہ بتلایا اس مقام پر ہم اس شبہ کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں جو آج بھی ذہنوں میں کھٹکتا ہے اور اس شبہ ہی کی برکت تھی کہ متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف دو منظم مخالف جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور سدراہ بن کر مقصد میں آڑے آگئیں جن کا وجود آزادی کے لئے سم قاتل تھا اور جنہیں تاریخ کی زبان میں مسلم لیگ اور سنگٹھن کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے آپؒ نے دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا" کہ ہمارے زمانہ میں قومیں وطنوں سے بنتی ہیں تمام باشندگان ہند خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، بیرونی طاقتوں کے مقابلہ میں ایک قوم ہیں متحدہ قومیت کا سوال ایک ایسا سوال تھا جو ہر متحدہ شخص کے سامنے آرہا تھا اور معترضین محسوسات، مشاہدات اور تجربات کی دنیا میں سیر کرتے اور متحدہ قومیت کے خلاف مثالیں ڈھونڈتے اور کبھی جرمن وفرانس کی وحدت مذہب اور دوسری طرف تفریق قومیت میں استعجاب کرتے نظر آتے لیکن یہ متبع سنت ﷺ اور قوم کا نبض شناس کب اصول شریعت میں غلط بینیوں اور مصنوعی سیاست دان کہے جانے والوں سے مرعوب ہو کر ادنی ترمیم کو گوارا کر سکتا تھا آپؒ نے اسے غلط توہم اور خدشہ قرار دیا اور سنت کے پیش نظر اپنے قول کی تشریح کی اور اطمینان قلب کا سامان

بہم پہنچایا چنانچہ آپؒ نے فرمایا: "ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنیاد معلم انسانیت ﷺ نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی ایک قوم ہو جائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتے ہوئے سب کو فناء کر رہی ہے جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں اور اس ظالم و بے رحم قوت کو نکال باہر کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالیں ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کریں بلکہ ہندوستان میں بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات اخلاق واعمال میں آزاد رہیں۔ اس تفصیل کے بعد یقینی طور پر خدشات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ متحدہ قومیت ایک شرعی مسئلہ ہے یہ شریعت کا کھلا اصول ہے کہ معاملات اور زواجر سیاسیہ میں مسلم وغیر مسلم دونوں مساوی ہیں ورنہ حیات انسانی کا نظام درہم برہم ہو جائے تخریبی عناصر مادر وطن کے بطن سے پیدا ہو کر ملک بھر میں پھیل جائیں، ظلم وجبر کا بازار گرم ہو جائے اگر ہم تجارت میں، اقتصادیات میں غذاء کی بہم رسائی کے معاملات میں غیر مسلم کے لئے مذہب اسلام میں کوئی صورت نہ ثابت کریں تو یہ دین اسلام کا نقص شمار ہوگا کیونکہ دوسری طرف یہی شریعت نوع انسانی کے قتل وخون کو ظلم عظیم قرار دیتی ہے تو اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا کہ ہم اس ... باب رزق مسدود کر دیں اور فقر وفاقہ پر مجبور کریں خواہ ایسا معاملہ کسی فرد مسلم کے ساتھ ہو یا یہ سلوک کسی غیر مسلم کے ساتھ برتا جائے اور اگر ظالموں اور جابروں کو ان کے جرائم ومعاصی پر کما حقہ سزا نہ دی جائے اور نقصان رساں عناصر کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جائے تو عالم میں عدل وانصاف کا قیام دشوار بلکہ محال ہو جائے اور نت نئے نقائص وعیوب کا ظہور ہونے لگے پھر دلائل عقلیہ کے علاوہ جب خود معلم انسانیت ﷺ کا ارشاد گرامی ہماری راہنمائی کر رہا ہے تو پھر ہمارے لئے متحدہ قومیت کے مسئلہ کو ایک شرعی مسئلہ کہنے میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا پھر وقت اور ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر متحدہ قومیت کا اعلان آپؒ کا ایک مبارک اقدام تھا اور عجیب بات ہے کہ دیگر ماہرین سیاست جب دنیائے سیاست میں قدم رکھتے ہیں تو سیاست کو شریعت کا ایک مستقل موضوع نہ مان کر مذہب سے جداگانہ مسلک تصور کرتے ہیں لیکن آپؒ فطرۃ جری اور فہم رساء تھے اسی وجہ سے جس جماعت کا انتخاب کیا اسکے اصول بھی فی نفسہ نہایت پاکیزہ اور خلوص پر مبنی تھے۔

یہ چند سطور حضرت شیخ الاسلام کی تحریک حریت کا ایک سرسری جائزہ ہیں جو در حقیقت رات میں لکڑیاں چننے کے مترادف ہیں اور جن سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خدمت قوم کا کس قدر جذبہ ودیعت کیا تھا یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے سانحہ وفات کو ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آج بھی آپؒ کی وہ عظیم خدمات آپؒ کی شخصیت کو زندہ وتابندہ کئے ہوئے ہیں خدائے رحمٰن سے کامل امید ہے کہ اسنے آپؒ کو اپنی رحمتوں، مغفرتوں اور انعامات سے خوب نوازا ہوگا اور رحمت خداوندی نے استقبال کرتے ہوئے کہا ہوگا:

فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ

سیاسی مدبر اور رجل کار (۱۸۷۹ء۔۔۔۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر تارا چند

مولانا حسین احمد مدنی ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ (صوبہ یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی مولوی سید حبیب اللہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ بانگر مئو میں تعینات تھے۔ ابھی حسین احمد چھوٹے تھے کہ والد کا تبادلہ ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) ہوگیا۔ حسین احمد کی ابتدائی تعلیم کا مرحلہ یہیں طے ہوا۔ ذی قعدہ ۱۳۰۸ھ مطابق جون، جولائی ۱۸۹۱ء میں انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۂ اسلامیہ دیو بند بھیج دیا گیا۔ وہ مولانا محمود حسن کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کی اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ طے نہ ہوا تھا کہ ان کے والد ماجد نے مدینۂ منورہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرلیا اور شعبان ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں وہ اپنے پورے خاندان کو لے کر عرب چلے گئے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے اس کے بعد سولہ سال مدینۂ منورہ میں بسر کیے۔ انہوں نے ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء تک ہندوستان کے تین سفر کیے اور ان سفروں کے دوران انہوں نے دیوبند میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل بھی کرلی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے سلوک وطریقت میں خلافت بھی پائی۔

۱۹۱۵ء کے آخر میں مولانا محمود حسن عرب تشریف لے گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی اس وقت مدینہ میں تھے اور مسجد نبوی میں حدیث پڑھاتے تھے۔ ابھی تک انہوں نے سیاست سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب مولانا محمود حسن نے انہیں بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اس طرح حسین احمد جو حدیث میں مولانا کے شاگرد اور تصوف میں ان کے مرید تھے، سیاسیات میں بھی ان کے شریک ومعتمد اور تحریک کے اہم رکن بن گئے

اور جب دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا کو برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے ایما پر مکہ کے گورنر حسین نے گرفتار کرلیا تو مولانا حسین احمد نے بھی اپنے آپ کو حسین کی حکومت کے حوالے کر دیا کہ وہ مولانا محمود حسن کے شریک ہیں اور ان سے الگ نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ انہیں بھی گرفتار کر کے ان کے استاد مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۲۰ء کے اوایل تک قید رہے۔

۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد وہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے ایک پر جوش کارکن اور رہنما کی حیثیت سے ملک کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جو تحریک خلافت کے رہنما تھے۔ ان کی دعوت پر انہوں نے مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کی صدارت قبول کی، جو ابھی حال میں قایم کیا گیا تھا۔ یہاں سے وہ سلہٹ کے دارالعلوم چلے گئے جہاں شیخ الحدیث کی حیثیت سے چھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اس کے بعد کے تیس سال انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں گزارے۔ اس زمانے میں جب کہ وہ تعلیمی کاموں میں مشغول اور شیخ الحدیث کے اونچے منصب پر فایز تھے وہ تحریک آزادی میں بھی بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے۔ اپنی سیاسی کارگزاریوں اور بدیشی حکومت کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید کیے گئے۔ گورنمنٹ کی ترغیب وتحریص، مسلم لیگ کی مخالفت، مخالف علماء کے حملے اور خود ان کی قوم کے بھیرے ہوئے لوگوں کی گالیاں، کوئی چیز انہیں وطن کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کے راستے سے ہٹا نہ سکی اور سیاست میں انہوں نے ملک اور قوم کی خدمت کا جو پختہ اور پرجوش عقیدہ قایم کیا تھا اس میں ان کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔

حسین احمد اپنے لایق احترام استاد اور رہنما مولانا محمود حسن کے کہنے پر میدان سیاست میں آئے تھے، لیکن ان کی سیاست جذباتی نہ تھی۔ معاشرے کے مسایل اور حکومت کے بارے میں ان کا ایک اپنا نقطۂ نظر اور تصور تھا، یہ ان کے خطبات وتقاریر اور خطوط ومضامین سے پوری طرح ثابت ہے، جو انہوں نے ہندوستان کی سیاست واقتصادیات اور بین الاقوامی امور پر لکھے ہیں۔

مذہبی معاملات میں ان کا علم گہرائی اور وسعت دونوں میں غیر معمولی تھا۔ لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ دینی علوم کے ماہر ایک مولوی نے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی طاقتوں کے اسلامی ملکوں سے تعلقات کے بارے میں کس طرح اتنی مستند اور کثیر معلومات فراہم کرلیں، اس میں شک نہیں کہ مدینہ میں جو مسلم ممالک کا مذہبی مرکز ہے ان کی پندرہ سال سے زیادہ رہایش اور تین ساڑھے تین سال تک مالٹا کی قید وبند کے زمانے میں مسلم ممالک کے بہت سے زعما سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور یورپ یعنی جرمنی، آسٹریا،

اٹلی وغیرہ ممالک کے لوگوں سے ملتے جلتے رہنے کی وجہ سے بین الاقوامی معاملات میں بھی ان کی نظر بہت گہری اور معلومات بہت وسیع ہوگئی تھیں۔

مولانا محمود حسن کے برخلاف ان کے خیالات ان کے خطبوں، تقریروں، خطوط اوران کے پیروؤں کی تصنیفات اور تحریرات میں بکھرے پڑے ہیں۔ حسین احمد نے ایک کثیر مقدار میں اپنی تصنیفات اور تحریرات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں ان کے خیالات واضح طور پر درج ہیں۔

دوسرے اہم سنجیدہ ہندو اور مسلم مفکرین کی طرح حسین احمد بھی جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے، وہ انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد کے بنیادی اصول، دونوں رخ سے تھے، خواہ وہ مذہب کے راستے سے اندرونی طور پر اس ابدی روح کے بارے میں ہوں اور خواہ سیاست اور معاشیات و اقتصادیات کی راہ سے انسان کی زندگی اور فطرت سے ہم آہنگی کے بارے میں ہوں۔ ان کی تحریرات اور بیانات، (خطبات و تقاریر، خطوط اوران کی خودنوشت ''نقشِ حیات'') میں ان کے خیالات کا اور عمل سے ان کے رویے کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک مسلم اسکالر (عالم دین) کی حیثیت سے ان کا کامل یقین تھا کہ قرآن (کلام الٰہی) اور حدیث (یعنی پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات اور اعمال کا مجموعہ) انسانی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کے لیے اپنے اندر مکمل ہدایت و رہنمائی رکھتے ہیں۔ انکا عقیدہ تھا کہ مذہب انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے مکمل ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ اس لیے نہ صرف اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات کو اس کے زیر ہدایت ہونا چاہیے بلکہ ان تمام امور کو بھی جن کا تعلق سماج، اقتصادیات، سیاست یا کلچر کے معاملات سے ہے، مذہبی ہدایت و تعلیمات اور اخلاقیات کے تحت لانا چاہیے، ان کے خیالات کے مطابق مذہبی، روحانی اور دینی معاملات میں کوئی تصادم نہ ہونا چاہیے۔

اس لیے سچا مسلمان وہ ہوتا ہے، جو خیالات، کلام اور عمل سب میں احکام الٰہیہ کا مطیع ہوتا ہے اور کسی حکم کو جو اس کے مذہب کے خلاف ہو، ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی آزادی کسی دنیوی حکمران کے پاس رہن نہیں رکھ سکتا اور وہ کسی طرح اور کسی بھی حالت میں ایک ایسے غیر مسلم بیرونی حکمران کا مطیع نہیں ہوسکتا ہے، جس کا قانون اور جس کی گورنمنٹ کا مقصد یہ ہو کہ اسلامی تصورات، اسلامی طرز زندگی، اسلامی اقتدار اور مقدرات کو تباہ و برباد کردے۔

اس لیے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی پوری طاقت لگا کر ہندوستان سے برطانیہ کے اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ ان کی تقریروں اور تحریروں کے بے شمار حوالے دیے جاسکتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو پرجوش طور پر ابھارا گیا ہے کہ بیرونی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور

ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے اتحاد و تعاون سے غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔

اس اپیل کے ساتھ ہی ساتھ بغاوت کو حق بہ جانب قرار دین کے لیے مفصل بیانات دیے گئے ہیں۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''نقش حیات'' (حصہ اول) کے ۳۷۶ صفحات میں سے تقریباً دو سو صفحات صرف اس بات کی تفصیل میں صرف کیے گئے ہیں کہ برطانوی ملوکیت کے کتنے تباہ کن نتائج ہوئے ہیں۔ ان میں حسب ذیل باتیں قابل ذکر ہیں:

۱- باشندگان ہند کی اہانت، نسلی اور قومی امتیازات برت کر اور اونچی ملازمتوں سے ان کو محروم کر کے۔

۲- ملک کی اقتصادی تباہی، مال گزاری کے نظام اور صنعت و تجارت کو برباد کر کے۔

۳- غلط نظام عدلیہ، جو مقدمہ بازی اور رشوت خوری کی ہمت افزائی کرتا ہے اور انصاف میں تاخیر اور بہت زیادہ خرچ کرانے کا ذمہ دار ہے۔

۴- قانون سازی کی کارروائیوں سے ہندوستان کو الگ تھلگ رکھنا اور

۵- بیرونی اقتدار کے سبب عامۃ الناس کے اخلاق کی گراوٹ۔

اسی تصنیف کے دوسرے حصے میں کافی اوراق اس تفصیل میں ہیں کہ کسی طرح مغربی طاقتوں نے حکومت آل عثمان کے ساتھ معاملات میں سنجیدہ وعدوں کی خلاف ورزی کی اور فریب کاری سے کام لیا۔ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان تمام طاقتوں میں برطانیہ کا نامۂ اعمال سب سے زیادہ سیاہ ہے۔ ان واقعات سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ برطانوی اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقا اور اپنے مستقبل کی زندگی کے لیے برطانوی مملکت کو جو ایشیا اور افریقہ کی اقوام کے لیے ایک خطرہ ہیں، تباہ برباد کر دیں۔(۱)

لیکن مولانا مدنی کے خیالات کے مطابق مسلمانان عالم کی نجات ہندوستان کی آزادی پر منحصر ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کے افکار پر مبنی ایک تحریک (اصلاح و جہاد) انیسویں صدی میں چلائی گئی جس کا پہلا دور ۱۸۳۱ء میں سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پر ختم ہوا تھا، لیکن ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعد جس بے رحمی اور بربریت کا اظہار کیا گیا، اس نے جوش کو مدہم کر دیا اور تحریک کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کام مذہبی نقطۂ نظر رکھنے والوں کے دائرے میں دارالعلوم دیوبند کے قیام نے اور قومی دائرے میں انڈین نیشنل کانگریس نے کیا، جس نے شروع ہی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور انتہائی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

---

(۱) مدنی، مولانا حسین احمد: نقش حیات، (حصہ دوم): ص ۱۰

مولانا حسین احمد یہ تسلیم کرتے تھے کہ کانگریس ہی طاقت چھیننے کا خاص آلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ان کو بہت اشتعال دلایا گیا، طعنے دیے گئے اور ان کی مخالفت کی گئی، لیکن ۱۹۲۰ء میں جو فیصلہ انہوں نے کانگریس کے نظام کی حمایت کا کیا تھا، اس کے بارے میں ان کے دل کے اندر کبھی شک اور تذبذب پیدا نہیں ہوا۔ خاص کر جب کہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی آخری منزل آزادی کامل ہے۔ ہندوستان کے مسایل کے بارے میں ان کے واضح رویے اور کانگریس کی حمایت کی بنا پر انہیں بہت سے اعتراضات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ان تمام مسایل میں جس مسئلے نے تلخ ترین جھگڑا کھڑا کیا وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو مذہبی اختلافات کے باوجود ایک متحدہ قوم بننا چاہیے تاکہ آزادی حاصل ہو اور سب کے فلاح و بہبود کی حکمت عملیوں کی کارروائیاں کی جا سکیں۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ زمانہ حاضرہ کی قومیں ملک کی بنیاد پر بنی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب کی بنیاد پر۔

اقبال نے یہ سمجھا کہ انہوں نے اس تصور پر حملہ کیا ہے کہ قومیت کی اصل اساس مذہب ہے اور جس قومیت کی بنیاد نسل، زبان یا ملک ہے وہ ملعون ہے! ان کے نزدیک ملک اور علاقائی بنیاد پر قایم قومیت اسلامی تصور کے خلاف تھی۔ انہوں نے ایک بیان میں یہ بحث کی کہ (مولانا) مدنی کے دعوے کی تائید اسلامی لٹریچر سے نہیں ہوتی، انہوں نے ان کے علم کو بھی ناقص بتلایا اور ایک قطعے میں ان کا مضحکہ بھی اڑایا۔

مولانا حسین احمد نے مجبوراً جواب لکھا۔ کیونکہ اقبال کے خیالات سے قومیت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام "متحدہ قومیت اور اسلام" ہے۔[1]

اس رسالے میں بڑے عالمانہ انداز میں انہوں نے مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر بحث کی ہے:

۱۔ قوم کے معنی اور اس کی تعریف اور یہ کہ قوم میں اور ملت میں کیا فرق ہے؟ اور

۲۔ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ وغیرہ اسلامی و تاریخی مآخذ اس بارے میں کیا بتلاتے ہیں؟

انہوں نے ابتدائی، متوسط اور حال تینوں زمانوں کے عربی لغات کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے لفظ "قوم" سے علاوہ اور معنوں کے جن میں وہ استعمال ہو سکتا ہو مراد مردوں اور عورتوں کا وہ گروہ ہے جو کسی مشترک مقصد کے لیے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کے لیے اپنے آپ کو پابند کر لیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ مقصد مذہبی ہی ہو۔

---

(۱) ایضاً۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ہندوستان اور پاکستان سے اس کے بے شمار ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اب اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

قرآن کا طرز کلام اس معنی کی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے خدا کے پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں، دونوں کو ایک قوم کہا ہے۔ مثلاً محمد ﷺ اور قریش! قرآن میں ایک ایسے گروہ کا تصور بھی موجود ہے جو مختلف مذاہب کے لوگوں سے مرکب ہو۔ مثلاً پیروان عاد اور فرعون! لیکن پیغمبر اسلام (علیہ السلام) کی مثال اس معنی کی تائید میں سب سے زیادہ یقین دلانے والی شہادت ہے کیونکہ اپنی پیغمبری کے چودھویں سال محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہودیوں اور اپنے مسلمان پیروؤں کو اس بات پر متحد کیا اور دونوں نے اقرار صالح کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ بت پرست عربوں کے خلاف جو مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، جنگ کریں گے۔ شرائط معاہدہ یہ تھے کہ ہر فریق اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہوگا۔ لیکن بقیہ تمام معاملات میں یہودی اور مسلمان ایک قوم متصور ہوں گے۔

لفظ "ملت" کے بالکل مختلف معنی ہیں اس سے مراد صرف وہ گروہ ہوتا ہے جو مذہب اور احکام الٰہیہ (شریعت) کی بنیادوں پر منظم ہو۔ اس کا اطلاق ہر مذہبی گروہ پر ہو سکتا ہے خواہ اس کے افراد کا مشترک مذہب کوئی بھی ہو۔

چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں سے مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ بلکہ غالباً وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ دیگر تصورات اس اتحاد کی زبردست تائید کرتے ہیں۔ مثلاً ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر ایک ہی نسل کی پیداوار ہیں۔ سیکڑوں سال سے ایک ملک میں رہائش نے ان میں یکساں رویہ اور طرز زندگی بنا دیا ہے، وہ ایک مشترک زبان بولتے ہیں اور ان میں تاریخی روایات بھی مشترک ہیں۔ دونوں نے مل کر اپنا الگ الگ مذہب اور پرسنل لا قائم رکھتے ہوئے یکساں ادب، فنون لطیفہ اور موسیقی کو تعمیر کیا ہے۔ گاؤں اور شہروں میں وہ زندگی کے بے شمار مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ یہی حال اقتصادی امور، اسکولوں، کالجوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل بورڈوں اور قانون ساز اسمبلیوں کا بھی ہے۔

المختصر متحدہ قومیت کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی جا سکتی ہے:

"ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے، جس کی بنا جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں، ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے، بلکہ ہندوستان کی بسنے والی تمام قومیں، اپنے مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو،

امن وامان قایم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشرواشاعت بھی کرتے رہیں، اپنے اپنے پرسنل لا اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست وگریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرلے"۔ (۱)

اقبال نے اعتراض کے رخ سے جو قطعہ لکھا تھا اس کا یہ جواب دیا گیا ہے:

ترسم نہ رسی بکعبہ تو اے اعرابی — کایں رہ کہ تو میروی بانگلستان است

"اے عرب کے صحرانورد! مجھے خوف ہے کہ تو مکہ کے مقدس مقام پر نہیں پہنچے گا کیوں کہ تو نے جو راہ اختیار کی ہے وہ تو انگلستان کو جاتی ہے"۔

جہاں تک ابوالاعلیٰ مودودی کا تعلق ہے۔ حسین احمد نے ان کے مذہبی آرا کی مکمل طور پر تردید کی، جن کے متعلق انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سنیوں کے عقاید کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ خارجیوں اور اسی قسم کے لوگوں کی صف میں آتے ہیں۔ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ مسلمان صرف ایک اپنی علاحدہ سوسایٹی کے اندر رہ سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اقتدار میں شریک نہیں ہوسکتے، بالکل غلط اور ناقابل قبول ہے۔

دستور کے بارے میں کہ آزاد اور بلاتقسیم ہندوستان کا آیندہ دستور کیا ہو؟ مولانا مدنی ایک واضح رائے رکھتے تھے، حسب ذیل دفعات میں ان کا ملخص بیان کیا جاسکتا ہے۔ (۲)

۱- ہندوستان کی حکومت جمہوری ہوگی اور اس کا صدر عام انتخاب سے چنا جائے گا۔ وہ سب سے ارفع آئینی افسر کے اختیارات برتے گا۔

۲- مرکزی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے، لیکن ان کے مذہبی سیاسی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ مرکز صرف چند امور کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ دفاع، خارجہ پالیسی، رسل ورسایل، ٹرانسپورٹ اور مالیات، باقی امور صوبوں کے دایرۂ اختیار میں ہوں گے۔ مذہبی امور کا تعلق بھی صوبائی حکومتوں سے ہوگا۔

۳- تعلیم ایک صوبائی مسئلہ ہوگا۔

---

(۱) ایضاً

(۲) مدنی، مولانا حسین احمد، مکتوبات شیخ الاسلام (حصہ دوم)، مکتوب ۳۳، ص ۱۰۵-۹۵

اس مقام پر مرتب نے مولانا مدنی کے ایک طویل خط کا مفہوم انگریزی میں بیان کیا تھا۔ مترجم نے اس کا ترجمہ کردیا ہے تلخیص اور ترجمہ در ترجمہ کے اس عمل سے مولانا کا مفہوم غیر واضح اور مختلف ہوگیا بنابریں مولانا کے مفہوم کو سمجھنے اور مولانا کے خیالات کے تفصیلی مطالعے کے لیے اس باب کے آخر میں مولانا کا مکمل اردو خط بہ طور ضمیمہ شامل کردیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

۴- ہندوستان کی مشترکہ حکومت مسلمانوں کے مذہبی قوانین (شریعت) یا مسلمانوں کے قانون فوجداری کا نفاذ نہ کرے گا۔ یہ مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری ہوگی۔

۵- حکومت کا نظام مختلف فرقوں کے مل جل کر کام کرنے کی بنیاد پر ہوگا۔

حسین احمد مدنی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت کے نظام کے چلانے میں حصہ دار ہونے اور باہمی اتحاد کے معاہدے کے نفاذ سے مسلمانوں پر چند ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:

''مسلمان غیر مسلم قوم سے بھی تعلقات قایم کر سکتا ہے اور اسلامی برادری کی امداد و اعانت کرتا ہوا، ان معاہدوں کی پابندی کرنے کا بھی جو اس نے غیر مسلم قوم کے ساتھ کیے ہوں، مکلف ہوسکتا ہے، بلکہ اس امر کا بھی مکلف ہوگا کہ اگر کوئی دفعہ اس معاہدے کی، جو اس نے کسی غیر مسلم قوم سے کیا تھا، اسلام کی عالمگیر برادری کی امداد و اعانت کے خلاف واقع ہو، تو اس کو اس دفعہ کی پابندی کرنی ہوگی اور اسلام کی عالم گیر برادری کی اعانت سے اس وقت دست کشی کرنی ضروری ہوگی''۔ (۱)

حسین احمد نے مسلم لیگ کی سیاسیات کو اپنے اصول کی بنا پر جانچا اور ان کو نہ صرف مجموعی طور پر کل ہندوستان کے لیے بلکہ مسلمانان ہند کے واسطے اور دنیا کے واسطے مضرت رساں پایا۔

انہوں نے مسلم لیگ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بتلایا کہ اس کی ابتداء ۱۹۰۶ء میں برطانوی افسران کی ترغیب پر آرچ بولڈ (Archbold) پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ کو درمیان میں ڈال کر ہوئی۔ لیگ کے کرتا دھرتا وہی لوگ تھے جنھوں نے ۱۹۰۶ء کے شملہ ڈیپوٹیشن کی تنظیم کی تھی جو مولانا محمد علی کے الفاظ میں ''ایک خود سپردگی کا کارنامہ تھا'' یہ گروہ اونچے طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اہل ثروت، مالکان آراضی، حکومت سے مراعات پانے والے، مثل ملازمتیں اور خطابات وغیرہ طلب کرنے والے، ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا، جسے پبلک کا لیڈر یا مفاد عامہ کے لیے کام کرنے والا کہا جاسکے۔ پہلے پانچ سالوں میں مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنسیں زیادہ تر اظہار وفاداری، سیاسی ایجیٹیشن کی مذمت اور گورنمنٹ کی حمایت و امداد کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔

اس کے بعد ایک تبدیلی آئی کیوں کہ مسلمانوں کے حکومت سے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم نے مسلمانانِ ہند میں وسیع پیمانے پر غم وغصے کی لہر دوڑا دی اور لیگ کو مجبور ہو کر کانگریس کا انداز سیاست اختیار کرنا پڑا۔ ۱۹۱۸ء میں علماء ایک بڑی تعداد میں مسلم لیگ کے اندر شریک ہوگئے۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے سالانہ جلسے میں ترک موالات کی تجویز منظور ہوئی تو لیگ خوف زدہ ہوگئی۔

---

(۱) ایضاً۔ متحدہ قومیت اور اسلام، ص ۶۵

۱۹۲۱ء میں لیگ نے قوم پرست سیاست سے ہٹ کر کانگریس کی مخالفت اور فرقہ وارانہ مفادات کی ترجمانی کا علم بلند کر دیا۔

مولانا حسین احمد کا خیال یہ تھا کہ اس کے بعد آیندہ کچھ عرصے تک لیگ کا رویہ روز افزوں تخریب اور بربادی کا رہا، مسلم لیگ نے فرقہ وارانہ نفرت کی آگ کو مشتعل کیا، لوگوں کو تشدد پر اکسایا، انتقام کے فلسفے کی تبلیغ کی اور چنگیز خاں اور ہلاکو کی مثال پیش کی۔ سیاسی حقوق کے حصول کے لیے راست اقدام کا اعلان کیا، کانگریسی حکومت کی سخت مذمت کی اور جنگ کی دھمکی دی۔

مولانا مدنی نے لیگ کے دو قومی نظریے کو رد کر دیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ اس سے عظیم مضرات کا غالب اندیشہ ہے۔ اگر ہندوستان تقسیم ہو گیا تو ملک کے داخلی اور خارجی دونوں امور میں سخت مضرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے لکھا:

''اس کے برعکس (یعنی تقسیم کی صورت میں) اگر یہ موضوعات دو مرکز کے ماتحت تقسیم کر دیے جائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا دفاع، خارجہ پالیسی، رسل ورسایل وغیرہ ایک علیحدہ مرکز کے ماتحت دے دیے جائیں تو بحیثیت مجموعی ملکی وقومی نقصانات کے علاوہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچے گا۔ ان کی وحدت فنا ہو جائے گی، اقلیت کے صوبوں میں ان کی سیاسی واقتصادی حیثیت ختم ہو جائے گی اور اکثریت کے صوبوں کی مرکزی حکومت ناقابل حل داخلی وخارجی مصایب میں مبتلا ہو جائے گی۔ بحیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پسماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا، ۳۹-۴۰ فیصد غیر مسلموں کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستان مرکز کے وہ داخلی مسایل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآنہ ہو سکے گی اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گی، جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا، مزید برآں یہ کہ حکومت اپنے وسایل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی، اس لیے اس ملک کے دفاع کو دولتِ مشترکہ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا ہو گا۔ یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ کی سیاسی واقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا''۔ (۱)

اس سلسلے میں پاکستان کے بارے میں انہوں نے مزید لکھا:

''اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور

---

(۱) مکتوبات شیخ الاسلام (حصہ دوم): ص ۱۰-۱۰۰

نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی موثر امداد کر سکے گی۔ بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماج گاہ بن کر رہ جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کے تسلط کے خاتمے کے باوجود از سر نو پاکستان اور ہندوستان میں اس کا اقتدار قایم ہو جائے گا''۔ (۱)

لیگ مسلمانوں میں جو خوف وہراس اس وسیع پیمانے پر پھیلا رہی تھی، اس پر انہوں نے بڑی احتیاط سے غور وفکر کیا اور دکھلایا کہ کس طرح یہ سب باتیں وہم وقیاس سے تعلق رکھتی ہیں اور محض مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اس کو ثابت کیا کہ اگر اس دستوری معاہدے کا جایزہ لیا جائے، جس پر کانگریس کے لیڈران نے علماء کے ساتھ مل کر آزاد ہندوستان کی گورنمنٹ کے بارے میں سمجھوتا کیا تھا تو ہر معقولیت پسند انسان کو یقین آ جائے گا کہ اس معاہدے میں مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی مفاد کو پورے طور پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ان کی رائے میں:

''پاکستان کے ان یقینی نقصانات کے مقابلے میں وہ متوقع خطرات بالکل بے حقیقت ہیں جو ہندوستان کی ایک یونین کی صورت میں...... پیش آسکتے ہیں''۔ (۲)

بد قسمتی سے عقل وبصیرت کی روشنی میں مشورہ دیا گیا تھا وہ جذبات اور تعصبات کے سیل رواں کو روک نہ سکا۔

علمائے دیو بند جنہوں نے تحریک آزادی ہند میں ممتاز اور نمایاں حصہ لیا تھا انہوں نے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی۔ جس کی غرض یہ تھی کہ چوٹی کے مسلم علما وفضلائے ہند مذہبی اور سیاسی امور پر متفقہ رائے قایم کر سکیں۔ مولانا محمود حسن اس کے پہلے صدر تھے (جنہوں نے) ۱۹۲۰ء کی کانفرنس میں جو دہلی میں ہوئی (جمعیت کی تاریخ کا پہلا اور اہم خطبہ پیش کیا اور) اپنے خطبۂ صدارت میں جمعیت کا لائحۂ عمل اور ان کارروائیوں کے اغراض ومقاصد ظاہر کیے ہیں۔

درحقیقت یہ خطرات سے کھیلنے والے ایک قریب المرگ بوڑھے سورما کی اپنے ساتھیوں کے لیے ایک وصیت تھی کہ اس برسر حق جنگ کو جاری رکھیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ فتح حاصل نہ ہو جائے۔ جو قربانیاں دیو بند اسکول کے عالموں اور جمعیت علمائے ہند نے حصول آزادی کے مقصد کے لیے دیں، وہ تحریک آزادی ہند کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے، اس مقصد کے لیے ان کے دل میں کتنی لگن تھی، اس کا مظاہرہ ان کی روزانہ زندگی میں ہوتا تھا۔ کوئی قربانی ایسی نہ تھی جو انہوں نے پیش نہ کی ہو یا پیش کرنے کے لیے تیار نہ رہے ہوں، خواہ مالی ہو یا اور کسی قسم کی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر کے اپنی پوری زندگی نو عمری سے موت تک

---

(۱) مکتوبات شیخ الاسلام۔ ص ۱۰۱

(۲) مکتوبات شیخ الاسلام۔ ص ۱۰۱

ایک بہت ہی معمولی آمدنی، قوت لایموت پر بسر کردی۔ یہ لوگ کم کھانے اور تکلیف اٹھانے ہی کو راحت وآرام قرار دیتے تھے اور اکثر تو اس پر مجبور ہوتے تھے کہ نیم فاقہ کشی پر بسر کریں۔ ان لوگوں نے سالہا سال جلاوطنی کی زندگی بسر کی، کبھی تو خود اختیاری اور کبھی دیگر طور پر یا برطانیہ کے جیل خانوں میں گزاری، ان کو گالیاں دی جاتی تھیں، ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ زندگی کی معمولی آسانیاں ان کو فراہم نہیں کی جاتی تھی اور قید خانے کے سب سے خراب کھانے پر ان کو رکھا جاتا تھا۔

محمود حسن، حسین احمد مدنی، عبیداللہ سندھی، ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے علما نے ایک حرف شکایت زبان پر لائے بغیر ان سختیوں اور زیادتیوں کو برداشت کیا جو ان پر لادی گئی تھیں، ان کا انہوں نے یہ سمجھ کر خیر مقدم کیا کہ یہ سب، بنی نوع انسان اور خدا کی خدمت کی راہ کے لازمات ہیں۔

اس دور میں مسلم افکار کی رفتار کا جائزہ لینے سے متعدد قابلِ لحاظ نتیجے نکلتے ہیں۔ کرزن کے وایسرائے شپ کے زمانے میں ہندوستان کی سیاست کی ایک تیز کروٹ نمایاں ہے۔ جس کا نتیجہ:

۱- اولاً تو یہ ہوا کہ بیرونی حکومت کا جو خوف بیٹھا ہوا تھا، اس کی جگہ تنقیدوں اور مخالفتوں نے لے لی۔ شکریہ اور وفاداری کے جذبات سرد ہونے شروع ہو گئے اور باشندگانِ ہند کے دماغوں میں تلخی اور ذلت کا احساس پیدا ہو کر یہ خواہش بھر گئی کہ شہنشاہیت کے چنگل سے بہ ہر صورت رہائی حاصل کی جائے۔

۲- دوسرے مسلمان قوم جس کے جذبات کے ساتھ گورنمنٹ اس طرح کھیل رہی تھی کہ پہلے بنگال کو تقسیم کیا اور پھر چند سال بعد اس پر نظر ثانی کر کے اسے رد کر دیا۔ گورنمنٹ کے اس رویے سے مسلمانوں کے دماغوں میں تذبذب پیدا ہوا اور وہ اپنے اعتماد اور اپنے وفادارانہ رویے کا محاسبہ کرنے لگے۔ یہ اور اسی کے ساتھ حکومت آل عثمان کو جس انجام تک پہنچا دیا گیا تھا، وہ بھی ان کے سامنے تھا، ان سب باتوں نے نہایت سختی سے سرسید احمد خاں کی پالیسی کی بنیادوں کو ہلا دیا، جس میں قریب نصف صدی تک مسلم فرقے کو بیم ورجا کی حالت میں حکمرانوں نے مبتلا اور ایک خواب آور موت کے گرداب میں پھنسا رکھا تھا۔ لیکن جب ہوا کا رخ بدلا اور قومی غیرت اور خودداری کا احساس ہوا تو ضمیر بیدار ہونے لگا۔

۳- تیسرے مسلمانوں کے ایک وسیع حلقے میں نہایت تیزی سے سیاسی شعور پھیلا اور اسی کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ ہندوستان کی آزادی جس طرح ہندوؤں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے اور یہ صرف ہندو مسلم اتحاد سے ممکن ہوسکتا ہے۔

۴- چوتھے قومی یک جہتی کے بارے میں دو ایک دوسرے کے مخالف نظریے ابھرے۔ ہندو اکثریت کا یہ خیال تھا کہ افراد کو اس طرح ایک دوسرے سے جوڑا جائے کہ ایک یک رنگ سوسائٹی بن جائے۔ دوسری

جانب مسلم اقلیت کا خیال یہ تھا کہ یہ یک جہتی فرقوں اور گروہوں کا ایک وفاق ہو، مذہبی بھی اور علاقائی بھی اور ہر ایک کو اپنے مذہب اور اپنے کلچر کو قایم رکھنے کی آزادی ہو۔

۵- پانچویں ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثریت کا نظریہ تقریباً ایک واحد سوسایٹی اور ایک واحد طرز کی حکومت کا تھا اور اکثریت اس پر راضی تھی کہ فرقوں کو اس طور پر مراعات دے کہ اقلیتوں کے مذہب اور کلچر کے تحفظ کی ضمانت ہو۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ مخصوص برتاؤ اس طور پر فرقوں کے ساتھ اگر کیا گیا کہ ان کو مخصوص حقوق اور مراعات دیے گئے تو یہ جمہوریت کے اصول ''تمام شہریوں کی مساوات اور قوم کی یک جہتی'' کے منافی ہوگا۔

۶- چھٹے جب کہ تمام مسلم جماعتیں اس پر راضی تھیں کہ مسلمانوں کی تنہا حیثیت کو تسلیم کر کے ان کے سیاسی، مذہبی، ثقافتی حقوق کی ضمانت دستور میں دی جائے۔ مسلم لیگ نے یہ رائے قایم کی کہ خواہ کیسی بھی ضمانتیں تحفظ حقوق کی دی جائیں۔ ایک متحدہ ہندستان میں جہاں ہندو اکثریت میں ہوں گے، ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے گا۔ اس لیے اقلیتی مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو دو آزاد اور خودمختار حکومتوں میں بانٹ دیا جائے۔

اس کے خلاف مسلمانوں کی دوسری قوم پرور جماعتوں اور جمعیت علمائے ہند نے تقسیم ملک کی تجویز کی مخالفت کی، جو ان کے خیال میں ہندوستان کے لیے اور اس سے زیادہ مسلمانوں کے لیے مضرت رساں تھی۔

آخرکار مسلم لیگ جیت گئی۔ اس کی کامیابی تین وجوہ سے ہوئی۔

۱- اول تو دولت اور اثر اس کے ساتھ تھے یعنی دولت مند مسلمانوں، زمینداروں اور تعلقہ داروں، راجوں مہاراجوں کے خاندان، بڑے بڑے تجار اور اعلیٰ مناصب کے پیشہ ور۔

۲- دوسرے اکثریتی فرقے کے لیڈر یا تو مسلمانوں کے خوف کے جذبات کی گہرائیوں کو ناپنے میں ناکام رہے یا اقلیتی مسایل کی پیچیدگیوں کے سمجھنے میں وہ ہندوستان کے مسایل کو برطانیہ کے مسایل کے مثل تصور کرنے کی جانب راغب تھے جہاں کلچر کے اعتبار سے ایک متحدہ سوسایٹی ہے اور سیاسی اعتبار سے ایک وحدانی سوسایٹی، بدقسمتی سے مسلم لیگ اسے پسند نہیں کرتی تھی کہ مسلم فرقے کو اقلیت کی حیثیت دے، بلکہ یہ اکثریت سے برابری پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتی تھی جس نے ہندوؤں کے قدامت پرست طبقے کو ڈرادیا۔

۳- لیکن سب سے اہم معاملہ جس سے ملک کی تقسیم ہوگئی حکومت کا رویہ تھا۔ گورنمنٹ نے مخالفین کانگریس مسلم لیڈران پر اپنی عنایات بے غایت اور سرپرستی میں اضافہ کر کے اور پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کے خوف میں اضافہ کر کے اور ہندو مسلمانوں کے اختلافات پر زور دے کر علاحدگی پسندی کے رجحانات کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس پروپیگنڈے میں سرکاری اور غیر سرکاری حضرات اور اینگلو انڈین پریس نے اہم کردار ادا کیا۔

ضمیمہ

مکتوبِ شیخ الاسلام:

محترم المقام زید مجدکم!

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ مزاج شریف؟

والا نامہ باعثِ عزت افزائی ہوا۔ مجھ کو گوناں گوں مصروفیتوں کی وجہ سے اس قدر فرصت نہیں ہے کہ آپ کے سوالات کا تفصیلی جواب عرض کرسکوں، اگرچہ آپ کے سوالات تفصیل طلب ہیں، لیکن تنگی وقت کی بنا پر مختصر جوابات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اسلام نے کسی صورت میں بھی غلامی پر قناعت نہیں کی، بہت سی نصوص سے دلالۃً اور صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا حکومت اور سربلندی ہے۔

۱- قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

هو الذی ارسل رسولهٗ بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله و کفی بالله شهیدا(۱)

۲- جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الاسلام یعلو و لایعلی(۲)

۳- شامی میں ہے:

و الملوک الذین یطیعونهم عن ضرورة مسلمون و لوکانت الاطاعة عن غیر ضرورة منهم فساق و اماطاعة الکفرة فذاک مخادعة (شامی: جلد۳، ص۳۶۶)(۳)

۴- اگر کسی اسلامی ملک پر کفار کا ہجوم ہو تو مسلمان پر ان کا دفع کرنا اور ان سے جہاد کرنا فرض عین ہوجاتا ہے۔ اگر اس ملک کے مسلمان تساہل سے کام لیں تو بتدریج تمام مسلمانانِ عالم پر یہی فرض عاید ہوجاتا ہے۔

(درمختار و حاشیہ ردالمختار: ج۳، ص۳۰۶ و عالمگیری: ج۲)

اس لیے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو کفار کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے احکام کفار کی نافرمانی سے لے کر جہاد بالسلاح تک جو ذریعۂ مقاومت بھی ان کے امکان میں ہو، اس کو کام میں لائیں۔ مسلمانانِ ہند کی اجتماعی قوت اور ان کے موجودہ سیاسی احوال کے پیشِ نظر چوں کہ ہندوستان کے

علماء اور تمام اہل الرائے حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت مسلطہ کے خلاف متشددانہ ذرائع سے جنگ کرنا مسلمانوں کی وسعت اور طاقت سے باہر ہے، اس لیے پرامن ذرائع ہی اختیار کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اگر تنہا مسلمان اس قسم کی جدوجہد کریں تو ناکامی بدیہی ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کے سیاسی واقتصادی نقصانات بدیہی ہیں۔ اس لیے حکومت کے خلاف پرامن جدوجہد کی کامیابی کے لیے نہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اس میں شریک ہوں، مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قایم ہوگا، اس کی تعمیر میں مسلم وغیر مسلم دونوں شریک ہوں گے۔ یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا، تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور مؤثر عنصر ہوگا، اب یہ خود مسلمانوں کی حکمتِ تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر ڈھال سکتے ہیں، ان ہی وجوہ سے آزادی کے بعد قایم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجودہ نظام کے مقابلے میں اہون البلیتین قرار دیا جاتا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے بطور اصول اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت سے متعلق سوالات کا جواب بہ ترتیب حسب ذیل ہے:

۱- ہندوستان کا آیندہ نظام جمہوری ہوگا جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے معینہ عرصے کے لیے ایک صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوتا رہے گا۔ صدر جمہوریہ کبھی مسلمان ہوگا، کبھی غیر مسلم ہوگا لیکن اس کو شاہانہ اختیارات حاصل ہوں گے۔

۲- مرکزی حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب اگرچہ کم ہوگا لیکن بنیادی آئین میں مسلمانوں کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں گے کہ مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی واقتصادی حقوق پوری طرح محفوظ رہیں گے اور مضامین جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے، وہ بہت ہی محدود ہوں گے۔ مثلاً دفاع، معاملات خارجہ، رسل ورسایل اور بعض محدود مالی اختیارات اس کے علاوہ تمام معاشرتی اور تمدنی مسایل صوبوں کے اختیارات ہوں گے، اس لیے اس سلسلے میں قوانین شرعی کے اجرا کے نفاذ کا مسئلہ صوبائی حکومتوں سے متعلق ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی ایسے تحفظات دیے جائیں گے کہ مسلمانوں کو اپنے قوانین اور اپنے قانون شخصی (پرسنل لا) پر عمل کرنے کی آسانیاں حاصل ہوں۔

۳- نظام تعلیم صوبوں کے تحت اختیار ہوگا۔ اس لیے مسلم اکثریت کے صوبوں پر تو آپ کا سوال عاید ہی نہیں ہوتا۔ (۲) اقلیت کے صوبوں میں بھی چوں کہ مسلمان صوبوں کے نظام حکومت میں مختلف تناسب کے ساتھ شریک ہوں گے، اس لیے ان کو حق ہوگا کہ حکومت سے اپنی مذہبی تعلیم کے تحفظ کا مطالبہ کریں، خواہ اس کے لیے مزید ٹیکس عاید کرنا پڑے یا بطور خود اپنی تعلیم کا انتظام کریں جس کی آزادی ان کو حاصل ہوگی، اگر نظام

تعلیم اور تعلیمی نصاب مسلمانوں کے قومی وملی مزاج کے مخالف نہ ہو، محض اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کلاسوں میں مسلم اور غیر مسلم طلبہ کے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، جبکہ تعلیمی اداروں کے باہر مختلف ادارہ ہائے حکومت وتجارت وصنعت میں مسلم وغیر مسلم کی شرکت موجود ہے اور شہری ودیہاتی زندگی میں ان کے اشتراک سے گریز ناممکن ہے، مسلمانوں میں خالص اسلامی تہذیب کی اشاعت اور غیر اسلامی اثرات کی مدافعت، نجی اصلاحی اداروں کے ذریعے عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

۴- ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک ملکی اور قومی سوال ہی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی ملی آزادی کا سوال ہے۔ انگریزی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد اعلاء کلمۃ الحق کے وسائل اختیار کرنے کے لیے نہ صرف ہندوستان کے مسلمان موجودہ حالت سے بہتر حالت میں ہوں گے، بلکہ اسلامی ممالک کی غلامی کی زنجیریں بھی کٹ جائیں گی۔(۵) اسلام کے اجتماعی فرایض ادا کرنے کے لیے وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے زیادہ آزاد ہوں گے اور ہندوستان کے مسلمان رضا کارانہ حیثیت سے موثر امداد کریں گے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی موثر نمایندگی، پورے ملک میں ان کی کثیر تعداد، مختلف صوبوں میں ان کی خود مختار حکومتیں اور ان صوبوں کی جغرافیائی حیثیت مسلمانوں کی قومی وملی خصوصیات اور ہمسایہ اسلامی ممالک سے ان کا مذہبی وسیاسی اتحاد وتعلقات اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی اسلامی مصالح سے متصادم نہ ہوگی۔

۵- بلاشبہ اسلامی قوانین ہی دنیا کے لیے حقیقی امن وسلامتی کے ضامن ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ حکومت میں ان قوانین کی حاکمیت مطلقہ قایم نہ ہوگی اور نہ حدود شرعیہ جاری ہوں گی، لیکن یہ خود مسلمانوں کا علمی وعملی فریضہ ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اسلامی قوانین کی یہ حیثیت تسلیم کرالیں: اہون البلیتین آخری منزل مقصود نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے لیے سعی وعمل کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے یہ راہیں بند نہیں ہوجائیں گی۔

۶- آپ کا یہ سوال تمام مغالطوں اور غلط فہمیوں کا سرچشمہ ہے، ہندوستان کا نظام حکومت خواہ ایک ہی یونین مرکزی کی بنیاد پر قایم کیا جائے، یا دو جداگانہ ریاستوں کے اصول پر بہر صورت مشترکہ نظام ہوگا، جس میں مسلم وغیر مسلم مختلف تناسب، مگر برابر حقوق واختیارات کے ساتھ شریک ہوں گے، محض عددی نسبت کے اختلاف سے ان کی مشترکہ حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔(۶) اس لیے مشترکہ نظام کو اسلامی نظام حکومت یا حکومتِ الٰہیہ نہیں کہا جاسکتا، جہاں تک صوبوں کے داخلی مسایل کا تعلق ہے، مرکز کی وحدت اور تعدد سے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، ایک مرکز کے ماتحت بھی صوبے اسی طرح خود مختار ہوں گے جس طرح دو مرکزوں کے ماتحت ان کو آزادی حاصل ہوگی، اس لیے اگر مسلمان چاہیں تو ایک یونین میں شریک رہتے ہوئے،

ان معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی مسایل میں اس حد تک اسلامی فکر کو بروئے کار لا سکتے ہیں، جس حد تک غیر قوموں کا اشتراک اس کو برداشت کر سکتا ہے، پاکستان کے مشرقی و مغربی منطقوں میں بہ ترتیب ۳۹ اور ۴۰ کی نسبت سے ایک منظم غیر مسلم اقلیت کی موجودگی کی وجہ سے خالص اسلامیت کو بروئے کار لانے میں جو مشکلات سدراہ ہوں گی وہ باخبر لوگوں سے مخفی نہیں ہیں، البتہ دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کرنسی اور بعض محاصل مالیہ کے بارے میں مرکز کی وحدت اور تعدد سے ایک فرق ضرور نمایاں ہوتا ہے، وحدت مرکز کی صورت میں یہ مضامین ایک ایسی یونین کے ماتحت ہوں گے جس میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ ۴۵ فیصد ہوگا، جو بجائے خود ایک اہم اور مؤثر تناسب ہے۔(۷) لیکن اس صورت میں ملک کی طاقت منقسم ہوکر کمزور نہ ہوگی اور خارجی دراندازی کا امکان کم سے کم ہوگا۔ ہندوستان کی اس مرکزی قوت سے غیر مسلم اقوام کی طرح ہندوستانی مسلمان اور ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک بھی مستفید ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ موضوعات دو مرکز کے ماتحت تقسیم کر دیے جائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا دفاع خارجہ پالیسی، رسل و رسایل وغیرہ ایک علیحدہ مرکز کے ماتحت دے دیے جائیں تو بحیثیت مجموعی ملکی و قومی نقصانات کے علاوہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچے گا، ان کی وحدت فنا ہو جائے گی، اقلیت کے صوبوں میں ان کی سیاسی و اقتصادی حیثیت فنا ہو جائے گی اور اکثریت کے صوبوں کی مرکزی حکومت ناقابل حل داخلی و خارجی مصایب میں مبتلا ہو جائے گی۔ بحیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پس ماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا(۸) ۳۰-۴۰ فیصد غیر مسلموں کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستانی مرکز کے وہ داخلی مسایل ہوں گے، جن سے حکومت عہدہ برآ نہ ہو سکے گی اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی، جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا۔ مزید برآں یہ حکومت اپنے وسایل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی(۹) اس لیے اس ملک کے دفاع کو دولت مشترکہ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ کی سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا۔(۱۰) اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی مؤثر امداد کر سکے گی، بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماج گاہ بن کر رہ جائے گی، ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فایدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کے تسلط کے خاتمے کے باوجود از سر نو پاکستان و ہندوستان

میں اس کا اقتدار قایم ہو جائے گا۔ پاکستان کے ان یقینی نقصانات کے مقابلے میں وہ متوقع خطرات بالکل بے حقیقت ہیں، جو ہندوستان کی ایک یونین کی صورت میں غیر مسلم اقلیت کی وجہ سے پیش آسکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان مسلمانوں کے لیے اہون البلیتین نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اہون البلیتین ہے۔(۱۱)

۷۔ ہندوستان دارالحرب ہے، وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا، جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا، دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہما نے اپنے فتاویٰ میں اس موضوع پر جو بحثیں فرمائی ہیں، ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ مزید تفصیلات کے لیے جامع الرموز: جلد۳، کتاب الجہاد، شامی: ج۳، ص ۳۶-۳۳۵ اور فتاویٰ عالمگیری: جلد۲ باب استیلاء الکفار وغیرہ ہم ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ الف: دارالحرب میں غدر اور خیانت کے سوا ہر طریقے سے اہل حرب سے اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لیے مباح ہے۔ اس لیے مسلمان اور حربی کے درمیان معاملۂ سود پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ طرفین کا اصول ہے۔ "لان الرباء لایجری بین المسلم و الحربی فی دار الحرب" (۱۲) امام ابو یوسف کے نزدیک حربی کے ساتھ بھی سودی معاملات جائز نہیں ہیں، جو لوگ از راہِ تقویٰ دارالحرب میں سود لینے سے اجتناب کرتے ہیں وہ امام ابو یوسفؒ کے اسی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن یہ تمام تفصیلات اسی صورت میں ہیں۔ جب کہ سود لینے والا مسلمان ہو اور سود دینے والا حربی ہو۔ مسلمان کا مسلمان سے سود لینا، یا غیر مسلم کو سود دینا متفقہ طور پر ناجائز ہے۔

ب: سرکاری بنکوں میں اور ان میں جن کے مالک غیر مسلم ہوں، روپیہ جمع کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس روپیہ سے وہ کاروبار کر کے مالی استفادہ حاصل کرتے ہیں، اور اسی کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن جمع کرنے کے بعد اس کا سود نہ لینا اور اس کو بنکوں میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ اس روپیہ کو جو بنکوں کے سود کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں صرف کر دینا چاہیے۔ عالمگیری میں ہے وما اوجف المسلمون علیه من اموال اهل الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین ...... الخ (۱۳) (جلد۲، کتاب السیر، ص ۲۱۸) تفصیلات کے لیے ردالمختار: جلد۳، ص ۳۴۵ اور شرح السیر الکبیر: ج۳، ص ۱۴، ۱۷۸، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۹، عالمگیری: ج۲، ص ۲۱۰ وغیرہ ملاحظہ فرمائیے۔

ج: ہندوستان کی زمین نہ عشری ہے نہ خراجی۔(۱۴)

و: استعانت بالمشرکین اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کے بارے میں مولانا محمد شفیع صاحب و مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی وغیرہ ہما کی جانب سے جو فتاویٰ دیے گئے ہیں، (۱۵) ان کے جوابات بھی اخبارات اور مستقل رسایل کی صورت میں شایع ہو چکے ہیں۔ جمعیت علمائے ہند کے دفتر سے یہ جوابی فتاویٰ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مجملاً یہ ہے کہ جن لوگوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، انہوں نے حالات کا صرف ایک رخ نمایاں کیا ہے، بلاشبہ اگر مسلمانوں میں بذاتِ خود قوتِ مقاومت موجود ہو اور استعانت بالکفار میں فتنے کا خوف نہ ہو تو استعانت صرف اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اسلام کا حکم ظاہر اور غالب رہے، جیسا کہ قائلین عدم جواز نے تصریحات پیش کی ہیں، لیکن اگر مسلمانوں میں بذاتِ خود مقاومت (کی قوت) موجود نہ ہو اور ان کے لیے کوئی دوسری جائے پناہ بھی نہیں ہے تو اختیار اہون البلیتین کے اصول کے ماتحت بعض کفار کا مقابلہ بعض کفار کی استعانت سے جائز ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ (شرح السیر الکبیر: ج ۳، ص ۱۸۷) خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مفاد اور مصالح بھی پیش نظر ہوں تو ایسی استعانت بالکفار کے جواز میں شبہ نہیں ہے، چنانچہ شرح السیر الکبیر میں اس قسم کی جزئیات بکثرت بیان کی گئی ہیں:

۱- ولو قال اهل الحرب للامراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين...... الخ (۱۶) کے ماتحت شارح سرخسی نے فرمایا فلا رخصة فی ذالک الاعلیٰ اعزاز الدین و الدفع عن نفسه۔ (جلد ۲، صفحہ ۲۳۱-۲۳۲)

۲- ولو قال لامراء قاتلوا معنا عدونا من اهل الحرب آخرین علی ان نخلی سبیلکم اذا انقضت حربنا...... الخ. فلا باس بان یقاتلوا معهم۔ شارح نے اس صورت مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، اس اعتراض کو بھی دفع کیا ہے، جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (۱۷)

۳- قال قیل کیف یسعهم هذا و فیه قوة علی المسلمین لانهم اذا ظفروا بعدوهم فامنوا جانبهم اقبلوا علی قتال المسلمین، وربما یاخذن منهم الکراع والسلاح فیقودون بها علی المسلمین، قلنا ذالک موهوم و مایحصل لهم من النجاة عن اسر المشرکین بهذا القتال معلوم فیترجح هذا الجانب. (ص ۲۳۲-۲۳۳) (۱۸)

و ان کانو فی حزو بلدیخافون علی انفسهم الهلاک فلاباس بان یقاتلوا معهم المشرکین اذا قالوا الخرجکم من ذالک لان فی هذا القتال غرضا صحیحا وهو دفع البلاء و الضرر الذی نزل بهم. (ص ۲۳۳) (۱۹)

۴- و لوان اهل الحرب ارسلوا الامراء خاصة ان یقاتلوا اهل الحرب آخرین و

جعلوا لامیر من الامراء وجعلوا له ان یکم بحکم اهل الاسلام و سلموا لهم الغنائم یخرجونها انی دار الاسلام فلا باس بالقتال علی هذا اذا خافوهم اولم یخافوا لانهم یقاتلون و حکم الاسلام هو الظاهر علیهم و یکون الجهاد ذالک جهادا منهم۔ (ص ۲۴۷)(۲۰)

جوازِ استعانت کی ان صورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے مشرکین کے ساتھ ان شرائط پر اشتراکِ عمل کرنا کہ اس مشترکہ جدوجہد میں فتح حاصل کرنے کے بعد

۱۔ ملک کے نظام میں ان کا ایک موثر حصہ ہوگا۔

۲۔ مسلمانوں کا قانونِ شخصی (پرسنل لا) محفوظ ہوگا اور ان کو اس پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔

۳۔ مسلمانوں کے مذہبی ادارے، اوقاف، مساجد، مقابر وغیرہ محفوظ رہیں گے۔ ان کا کلچر اور تہذیب وتمدن محفوظ رہے گا۔

۴۔ گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مسلم اکثریت کی حکومتیں قایم ہوں گی، جو تمام داخلی معاملات، قانون سازی، نظامِ تعلیم، اقتصادی نظام کے قیام، معاشرتی اور تمدنی مسایل میں پوری طرح بااختیار ہوں گی، کیا مسلمانوں کے مفاد اور مصالح کے لحاظ سے مفید نہیں ہے؟ یہ مصلحتیں ومفادات ان اغراض سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ جن کی بنا پر استعانت المشرکین کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے ہندوستان کی (تحریک) آزادی (میں) غیر مسلم جماعتوں اور قوموں سے اشتراکِ عمل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ واللہ اعلم و الیہ یعول الحق وهو یهدی السبیل۔

ننگ اسلاف
حسین احمد غفرلہ

حواشی ضمیمہ

(مکتوبات شیخ الاسلام)

۱-وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر تاکہ اوپر رکھے اس کو ہر دین سے اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا۔

۲- سر بلندی تو اسلام ہی کو ہے، کوئی اس پر حاکم نہیں۔

۳-اور وہ بادشاہ جنہوں نے غیر مسلم حکومت کی ضرورتاً طاعت کرلی ہے مسلمان ہیں اور اگر ان کی اطاعت بلاضرورت کے ہو تو فاسق ہیں، لیکن کفار کی اطاعت سو یہ وقتی تدبیر ہے۔

۴-جتنا حصہ اس وقت پاکستان کہلاتا ہے وہ تب بھی قدرتی طور پر مسلم اقتدار کے ماتحت ہوتا، مزید برآں مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال بھی اسی اقتدار کے ماتحت ہوتا کیونکہ یہ تمام علاقہ جو مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش اور پٹیالہ یونین پر مشتمل ہے۔صوبۂ پنجاب کا حصہ تھا، جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس بنا پر پشاور اور کراچی سے سہارنپور تک مسلم اقتدار کے ماتحت آتا، کشمیر کا سوال بھی خود بخود حل تھا۔اسی طرح بنگال کا صوبہ آسنسول تک جس میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے تمام اضلاع شامل تھے، آسام میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی لیکن مسلمان وہاں چونتیس فیصد تھے، باقی میں ہندو اور پہاڑی علاقے کی اقوام شامل تھیں، ہندو بھی چونتیس فیصد تھے یا پینتیس اور توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا، اسی بنا پر ۱۹۳۷ء میں سر سعد اللہ وہاں کے وزیر اعظم بنائے گئے تھے، یہی حال دہلی کا تھا۔اس طرح نصف ہندوستان مسلمانوں کے زیر اقتدار آتا اور اس صورت میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نسبت بہت مضبوط ہوتی۔

۵-ہندوستان کی تقسیم سے اس مقصد کو بہت دھکا لگا یہ مقصد قریب قریب فوت ہوگیا، کیونکہ اول تو ہندوستان کی طاقت گھٹ کر نصف رہ گئی، پھر وہ بھی رات دن خود اپنے مسایل میں الجھی ہوئی۔چنانچہ کشمیر یا نہروں کے پانی جیسے مسایل نے ہندو پاکستان دونوں کو ایک دوسرے کے برخلاف ایسی پیچیدگی میں مبتلا کردیا ہے کہ کسی دوسرے بین الاقوامی مسئلے پر اثر انداز ہونے کے بجائے یہ دونوں ملک دنیا کی بڑی طاقتوں کے رحم وکرم کے محتاج بن گئے ہیں۔

۶-علاوہ ازیں پاکستان ایسی نکیل ہے کہ دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت اگر اس کو تھامے رہے تو ہندوستان کا اونٹ بدک کر کبھی بھی کسی دوسری طرف نہیں جاسکتا۔یہ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے جب پاکستان کا

تصور جنم لے رہا تھا اور تبادلہ آبادی کی بھیانک تصویر کسی کے خواب میں بھی نہیں آتی تھی، اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے اور غیر مسلموں کا تناسب بھی وہاں قائم نہیں رہا تو کیا کوئی اس خالص مسلم اسٹیٹ کے متعلق دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہاں اسلامی نظام حکومت یا حکومت الٰہیہ ہے۔ آج اس کے پرانے عقیدت مند بھی اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ پاکستان کا موجودہ نظام حکومت نہ صرف اسلام کے دامن پر تقدس پر بدنما داغ ہے، بلکہ موجودہ ملت اسلامیہ کے لیے بھی ننگ و عار ہے۔

۷۔ جمعیت علمائے ہند اور قوم پرور مسلمانوں نے جو فارمولا کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا اور اگست ۱۹۴۶ء کے اجلاس میں کانگریس نے اس کو تقریباً منظور بھی کر لیا تھا اس کی اہم دفعات یہی تھیں۔

۱۔ صوبے آزاد ہوں گے،

۲۔ چند موضوعات کے علاوہ باقی جملہ مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہوں گے۔

۳۔ مرکز میں نمائندگی اس طرح ہوگی ہندو ۴۵ فیصد، مسلمان ۴۵ فیصد اور دیگر اقلیتیں ۱۰ فیصد۔

۸۔ صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان۔

۹۔ جب کہ پاکستان بنے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں، اس پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ فرمائیے اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی اتقوا فراسة المومن فانه یری بنور الله او کمال قال ﷺ کی تصدیق کیجئے۔ ترجمہ: مومن کی فراست اور دور اندیشی سے پرہیز کرو، وہ اللہ کے نور سے مستقبل کو دیکھتا ہے۔

۱۰۔ ۴۵۔۱۹۳۹ء کی جنگ عظیم (ثانی) نے برطانیہ کی جگہ امریکہ کو سیاست کا امام بنا دیا۔

۱۱۔ دنیا میں شاید ہی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ سچی ثابت ہوئی ہو، کیا اسی پر کہا جاتا ہے کہ علماء سیاست نہیں جانتے؟

۱۲۔ کیوں کہ دار الحرب میں مسلم اور کافر کے درمیان سود کا حکم نہیں جاری ہوتا ہے۔

۱۳۔ کفار کے جن املاک پر مسلمان بغیر جنگ کے قابض ہو جائیں ان کی آمدنی مسلمانوں کے مفاد عامہ پر صرف کی جائے گی۔

۱۴۔ عشری زمین ہونے کی ابتدائی پانچ صورتیں ہیں:

۱) اول یہ کہ کسی شہر اور گاؤں کے حربی کفار مسلمان ہو گئے تو وہ شہر اور گاؤں عشری ہوگا، یعنی ان کی اپنی تمام زمینوں کی پیداوار میں عشر (جو زکوٰۃ ہے) ادا کرنا ہوگا۔

۲) دوم یہ کہ ملک عجم کے بلاد کو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کر لیا اور وہاں کی زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تو وہ بھی عشری ہوگی۔

۳) سوم یہ کہ عرب کے بت پرستوں پر مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح پائی تو وہاں کی سب زمین عشری ہوگی۔ اگرچہ وہ زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کی جائے، کیونکہ جزائر عرب میں کفار کے قیام کی کوئی صورت نہیں ہے جو ان پر خراج لگایا جائے۔

۴) اسلامی مقبوضہ کی پرانی زمین جس پر کسی کا قبضہ نہ ہو، اس کو کسی مسلمان کا آباد کرنا اور عشی زمین سے قریب ہونا یا عشری یا خراجی اور عشری دونوں پانی سے سیراب ہوتی ہو تب بھی عشری ہے۔

۵) کسی مسلمان نے اپنے گھر کی زمین کو باغ یا کھیت بنالیا تو اس پر بہرحال عشر واجب ہے بشرطے کہ سیرابی صرف خراجی پانی سے نہ ہوتی ہو۔

زمین کے خراجی ہونے کی دو صورتیں ہیں:

۱) جب کفار کے ملک و بلاد کو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کرلیا، لیکن زمین مسلمانوں میں تقسیم نہیں ہوئی؛ بلکہ زمین ان ہی کافروں کی ملک میں چھوڑ دی گئی۔ تو اس زمین پر مسلمان حاکم خراج مقرر کرے گا۔

۲) کسی شہر، گاؤں یا ملک کے کافروں نے بغیر لڑائی و جہاد مسلمانوں کی اطاعت کرلی ہو اور صلح کرلی ہو تو اس صورت میں بھی ان مقامات کی زمین کافروں ہی کی ملک ہوگی اور اس پر خراج لگایا جائے گا، کتاب العشر وزاز کوۃ۔

۱۵۔ مولانا عبدالحق نافع مدظلہ نے "نافع المہدی" رسالہ میں فاضلانہ جوابات دیتے ہوئے، تدلیس سے کام لینے والے مولویوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے اور حضرت امام العصر نے گو مجتہدانہ انداز اپنے اس والانامہ میں اختیار فرما کر اصولی نکتوں پر اکتفا فرمایا ہے جو اپنی جگہ سب سے بڑی حجت ساطعہ ہے، سچ ہے، لکل فن رجال۔

۱۶۔ اگر کفار اپنے مسلمان قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے مشرک دشمنوں سے جنگ کرو۔ تو بقول شارح سرخسی اجازت نہ ہوگی، البتہ دین اسلام کی ترقی اور اپنے اوپر سے مصیبت دور کرنے اور جان بچانے کے لیے جنگ کرنا جائز ہوگا۔

۱۷۔ اگر کفار مسلمان قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے دشمنوں سے ہمارے ساتھ جنگ کرو اور ہم اختتام جنگ پر تم کو رہا کردیں گے، تو اس شرط پر ان کی امداد میں مسلمان جنگ کرسکتے ہیں۔

۱۸۔ اگر اس پر یہ اعتراض ہو کہ مذکورہ بالا شکل میں بھی مسلمانوں کی قوت کمزور ہو جائے گی، کیونکہ کفار اپنے حریف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اپنے دشمنوں سے اطمینان حاصل کر کے مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار ہوں گے اور مسلمانوں کا ساز و سامان ان سے چھین لیں گے اور اس طرح مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی طاقت مضبوط ہو جائے گی، تو ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اندیشہ وہمی ہے اور مسلمانوں کا کفار کی قید سے

نجات پانا قطعی ہے، لہٰذا جنگ کرنے کی تجویز کو ترجیح حاصل ہے۔

۱۹۔ اگر مسلمان ایسے ملک میں ہوں جہاں ان کو اپنی ہلاکت کا خطرہ ہے تو اس صورت میں یہ مسلمان ان کافروں کے ساتھ مل کر ان کے مشرک دشمنوں سے جنگ کر سکتے ہیں بشرطے کہ کفار ان کے اس خطرے کو دور کرنے کا وعدہ کریں کیونکہ اس جنگ کا جائز مقصد ہے، یعنی اپنے اوپر سے خطرہ اور ہلاکت دور کرنا۔

۲۰۔ اگر کفار مسلمان قیدیوں کو کفاروں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجیں اور مسلمان ہی کو مسلم فوج کا سردار بنائیں، اور اس مسلمان افسر کو یہ اختیار ہو کہ وہ احکام اسلامی کے مطابق فیصلہ کرے اور جو مال غنیمت حاصل کریں وہ ان مسلمانوں کے ہی حوالے ہو کر وہ دار الاسلام میں لے جاسکیں تو اس صورت میں جنگ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، خواہ مسلمانوں کو ان سے خطرہ ہو، یا نہ ہو، کیونکہ موجودہ صورت میں ان کی جنگ اسلامی قانون کے ماتحت ہوگی اور یہ جہاد خود ان کی طرف سے ہوگا، یہ جنگ غلبہ اسلام کے لیے ہوگی اور ان کا یہ جہاد شرعی جہاد ہوگا۔

نوٹ: حضرت شیخ الاسلام کے اس مکتوب گرامی پر تمام حواشی مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کے قلم سے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے حواشی کے آغاز میں اس مکتوب اور اس کے علمی مباحث کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قارئین کرام اس پر نظر ڈال لیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''یہ مکتوب سیاسی تاریخ کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرات علمانے جدوجہد آزادی میں جو حصہ لیا، وہ ایک سوچے سمجھے نصب العین کے مطابق تھا۔ تقسیم ہند اور دو قومی نظریے کے جو جھگڑے پیدا کیے گئے۔ اگر مسلمان اس کا شکار نہ ہوتے اور علمائے کرام کی دانش مندانہ سیاست کو تسلیم کر لیتے تو ہندوستان کے صرف ایک کمرے میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ان کی حیثیت اتنی بلند ہوتی کہ یہ زمام اقتدار انہیں کے زیر تصرف ہوتی۔ حضرت مدظلہ العالی نے جو کچھ اس مکتوب میں تحریر فرمایا ہے وہ جمعیت علمائے ہند کے فارمولے کا مفہوم ہے، جس کی تقریباً تمام دفعات کو کانگریس تسلیم کر چکی تھی''۔ (مکتوبات شیخ الاسلام (حصہ دوم)، ص ۹۵، ۹۶) ■

تحریک آزادی میں شیخ الاسلام کا حصہ

پروانہ ردولوی

حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی زندگی ملک کی تاریخ کا زریں باب ہے اور بغیر کسی تامل کے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا راستہ جن ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے ان میں حضرت شیخ کے منجھے ہوئے ہاتھ بھی شامل ہیں، یہ ان کے عزم واستقلال اور ایثار و قربانی کا چراغ تھا جس کی روشنی سے ملک کا گوشہ گوشہ منور ہو چکا ہے۔

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کا جو شعلہ بھڑکا تھا وہ ظاہر کی نظر سے اگر چہ روپوش ہو گیا تھا لیکن باطن کی بھٹیوں میں بھڑک رہا تھا اور اس مقدس شعلہ کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھنے والا دار العلوم دیو بند کا بانی تھا، ظاہر ہے کہ دار العلوم کی بنیاد دینی وروحانی تعلیم و تربیت کے ساتھ آزادی وطن کے پاکیزہ جذبات پر رکھی گئی تھی اس لیے اس عظیم درس گاہ کی ایک ایک اینٹ میں قومی آزادی کی تڑپ موجود تھی جس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اس درس گاہ کا ہر طالب علم تزکیہ نفس، پاک باطنی، روشن ضمیری، روحانی وسیاسی بصیرت کے گوہر نایاب لے کر نکلتا تھا اور اس درس گاہ کی مسند پر جو ہستیاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرماتی تھیں وہ دینی وروحانی تعلیم و تربیت کے ساتھ جنگ آزادی کے نڈر اور سرفروش مجاہد بھی تیار کرتی تھیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی وروحانی تعلیم و تربیت اور وطنی جہاد میں عملی تربیت کا کام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا، اور حضرت شیخ کو اپنی سیرت کا صحیح نمونہ بنا دیا، جس میں خود حضرت شیخ کی انفرادیت کا دیدہ زیب رنگ اپنی اضافی حیثیت سے موجود رہا۔

حضرت شیخ کی سیاسی زندگی، حضرت شیخ الہند کی سرپرستی میں اگر چہ ہندوستان ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن ان کی سیاسی زندگی کا عملی آغاز ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) سے ہوتا ہے جب کہ حضرت شیخ الہند نے حرمین

شریفین کی زیارت کے لیے سفر اختیار کیا تھا۔

ہندوستان کے عمال حکومت اور برطانیہ کے مدبرین کو الجھن تھی کہ حضرت شیخ الہند ہندوستان چھوڑ کر حجاز کیوں جارہے ہیں، یہ الجھن بے وجہ نہیں تھی اس وقت برطانیہ اور جرمنی کی جنگ شروع ہو چکی تھی، حکومت ترکی نے جرمنی کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا اور برطانیہ کو گمان تھا کہ آپ سفر حج کے دوران حکومت ترکی کی حمایت کریں گے اور حکومت برطانیہ کے خلاف مسلم ممالک کو جنگ کے لیے تیار کریں گے، حضرت شیخ الہند کی طویل سیاسی زندگی کے پس منظر میں حکومت برطانیہ کا یہ گمان غلط یا بے جا بھی نہ تھا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ ایک پر جوش انقلابی اور ایک سرفروش مجاہد تھے بلکہ آزادئ وطن کی تحریک کے امام بھی تھے۔ آپ نے یہ طے کر لیا تھا کہ انگریز گورنمنٹ کو ہندوستان سے ختم کر کے اپنے وطن کو ہر قیمت پر آزاد کرایا جائے لہذا تجویز ہوا کہ ایکطرف تو شمالی و مغربی سرحدوں سے ہندوستان پر حملہ ہو اور دوسری طرف ہندوستانی عوام اندرون ملک بغاوت کر دیں اور اس طرح سلطنت برطانیہ کو ہندوستان میں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق افغانستان، ایران اور ترکی کے بعض لوگوں سے قایم ہو چکا تھا، سرحدی قبائل کے مؤثر لوگ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مرید تھے جو اپنے اپنے مقام پر پہنچ کر کام شروع کر چکے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین تیغ بہ دست و سر بکف تھے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے منتظر تھے مگر بعض یگانوں ہی کو یہ بات نہ بھائی اور ان کے توسل سے گورنمنٹ آف انڈیا کو حضرت شیخ الہند کی اسکیم کا پتہ چل گیا مگر گورنمنٹ حضرت شیخ الہند کے خلاف کوئی شہادت فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص مرید مولانا عبید اللہ سندھی۔ فتح محمد اور محمد علی کو شمال و مغربی سرحد اور ترکی کے لیے روانہ کئے۔ یہ حضرات ۱۹۱۵ء میں یہاں سے روانہ ہوئے اس وقت تک مایوسی کی کوئی بات ان حضرات کے سامنے نہیں تھی بعد میں حالات بگڑے اور حضرت شیخ الہند بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے، یہ ان حضرات کا کمال تھا کہ گورنمنٹ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو معہ رفقاء کے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا اور رولٹ کمپنی کو تحقیقات کے لیے متعین کیا گیا، مگر یہ کمیٹی اپنی تحقیقات کے دوران حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں اور ان کی سیاست کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ ریشمی خطوط کی سازش کا تمام تر ذمہ دار مولانا عبید اللہ سندھی کو قرار دیا گیا اور لکھا کہ عبید اللہ سندھی سکھ گھرانے میں پیدا ہوا، مسلمان ہو کر دیو بند پہنچا وہاں مذہبی تعلیم پائی اس نے وہاں برطانیہ کے خلاف جنگی سازشیں کیں، ان سازشوں سے کچھ طلبہ متاثر ہوئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس تحریک کے بانی نہیں ہیں بلکہ عبید اللہ سندھی اصل بانی ہیں جو اس وقت انگریز کی حدود سے باہر ہیں اس لیے

اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو پھانسی اور گولی کے نشانے سے بچالیا اور مالٹا میں آپ قید کر دیئے گئے۔

آخر حالات بدلے ترکی اور جرمنی جنگ میں ہار گئے، برطانیہ کو فتح ہوئی اور تمام نظر بندوں کی رہائی کی بحثیں شروع ہوئیں، دسمبر ۱۹۱۹ء میں اعلان ہوا کہ تمام قیدی چھوڑے جائیں گے چنانچہ ۱۲؍ مارچ ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مالٹا سے روانہ ہوئے۔ ۷؍ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے مگر جہاز سمندر میں دو میل کے فاصلہ پر کھڑا رہا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء نے ۸؍ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی بندرگاہ پر اتر کر مخصوص حضرات سے مصافحہ و معانقہ فرمایا ہجوم اتنا تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر سب ممبئی پہنچ چکے تھے، بمبئی والوں کا اصرار تھا کہ حضرت چند دن بمبئی میں قیام فرمائیں، مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کی علالت کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس لیے ۱۰؍ جون ۱۹۲۰ء کو بروز پنج شنبہ رات کے آٹھ بجے بمبئی سے مع رفقا کے روانہ ہوئے۔ دیوبند تک دہلی، میرٹھ غرض ہر اسٹیشن پر استقبال کیا گیا۔

بہرحال اسیرانِ مالٹا جب ہندوستان واپس پہنچے تو یہاں تین جماعتیں گورنمنٹ برطانیہ سے برسر پیکار نظر آئیں۔ کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء۔ ان تینوں جماعتوں نے حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اسیر مالٹا کو شیخ الہند کا خطاب دیا اور ملک اسیر مالٹا کو شیخ الہند کے خطاب سے یاد کرنے لگا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وعظ اور تقریر بہت کم فرماتے تھے مگر یہ خالص آپ کے خلوص کی بات تھی کہ چند سیاسی تحریکات کے حضرت شیخ الہند علمبردار بنے ان پر پورے ملک نے لبیک کہا۔ تمام ملک میں اس وقت انگریز کے خلاف ایسا جذبہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی اس کا تصور بھی نہ ہوسکتا تھا۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح ایک ہوگیا تھا کہ ہر آدمی کو یقین تھا کہ انگریز کی اب خیر نہیں ہے، ہندوستان کی آزادی اور انگریز گورنمنٹ کی تباہی اب یقینی ہے۔

مگر افسوس کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی زمانے میں علیل ہو گئے اور مرض بڑھنا شروع ہوگیا تھا مگر یہ حب الوطنی تھی کہ بستر مرگ سے بھی حضرت شیخ الہند سیاسی تحریکات کی قیادت فرماتے رہے سیاسی اجلاسوں کی شرکت اور صدارت کی۔ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند کا مرض بھی بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے حضرت شیخ الہند کو اپنی کوٹھی پر روک لیا اور علاج شروع ہوا۔ مگر حضرت شیخ کی نقاہت اور مرض بڑھتا ہی گیا بالآخر وقت موعود آپہنچا اور ۳۰ نمبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حضرت نے انتقال فرمایا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دارالعلوم کی بنیاد کلکتہ میں رکھی اور اس فکر میں تھے کہ کوئی اچھا عالم اس دارالعلوم کی سرپرستی کرے بہت لوگوں سے عرض کیا گیا مگر کوئی راضی نہ ہوا۔ بالآخر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا نام تجویز کیا اور حکم دیا کہ وہ

کلکتہ تشریف لے جائیں استاد محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہو کر انتہائی رنجیدہ اور بے قرار کلکتہ کے لیے سوار ہو گئے، ابھی حضرت شیخ الاسلام امروہہ ضلع مراد آباد ہی تک پہنچے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس جہاں فانی سے رحلت فرما گئے۔ شیخ الاسلام دیو بند واپس تشریف لائے حضرت شیخ الاسلام کو استاد محترم کی وفات کا کتنا رنج تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان، تمام معتقدین، تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ حضرت شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔

آپ نے صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت بھی دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند کیطرح کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک وقوم کی سیاسی تحریکات میں جوش عمل کی روح بھرنے لگے۔(۱) (مقدمہ کراچی میں سزا سے رہائی کے بعد)

...... حضرت شیخ نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ فرمایا اور عوام کے جلسوں میں جوشیلی تقریریں کیں، مگر پورے ملک پر تحریک خلافت کی ناکامی کا گہرا اثر تھا ملک کا ہر لیڈر مایوسی سے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو تک رہا تھا خود حضرت شیخ بھی بعض حالات سے متاثر تھے، قید کی مشقت کا بھی ایک اثر تھا کہ جیل سے رہا ہوئے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے اور قید و بند کے مصائب کا اثر زائل نہ ہوا تھا مگر ملک کے حالات کا یہ تقاضہ تھا کہ آپ ''کناڈا'' میں جمعیت علماء کے اجلاس کی صدارت فرمائیں حالانکہ یہ بات روشن تھی کہ حکومت برطانیہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور سخت ہو چکی ہے، مگر کوکناڈا کے اجلاس میں حضرت شیخ نے ثابت کر دیا کہ شیر زخمی ہونے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارتا بلکہ ہر ضرب کے بعد پہلے سے زیادہ بہادر اور اپنے حملہ میں پہلے سے زیادہ جری اور دلیر ہو جاتا ہے چنانچہ اس اجلاس کا خطبۂ صدارت انتہائی سخت ہے اور جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی، اسی کو پوری قوت سے دہرایا گیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت میں حضرت شیخ نے

---

(۱) اس مقام پر مقالے میں خلاف کانفرنس۔ کراچی میں حضرت شیخ الاسلام کی شرکت، اس میں تقریر، ایک قرارداد کی پیشی، اس پر وضاحتی تقریر، حکومت کے ردعمل، دیوبند میں گرفتاری کے ہنگامے، مقدمے کی پیشی، حضرت کے مجاہدانہ اعلان اور مقدمہ کے فیصلے اور سزایابی تک تفصیلی روداد بیان کی گئی تھی۔ یہ تفصیلات ایک دوسرے مقالے میں بھی بیان ہوئی ہیں چونکہ تکرار مناسب نہ تھی، اس لیے یہ تفصیلات اس مقالے سے حذف کر دی گئی ہیں۔ اگر کسی صاحب ذوق کو اسی مقالے سے استفادہ کرنا مقصود ہو تو اسے ماہنامہ نئی دنیا، دہلی، عظیم مدنی نمبر ۱۹۵۹ء سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ا۔س۔ش)

فرمایا، ضروری اور فرض ہے کہ اس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی عزت وشوکت کو کم اور اس کی قوت کو فنا کر دیا جائے اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی اور سوراج انگلستان کی موت کا مترادف ہے۔

حضرت شیخ نے سوال فرمایا لیکن کیا یہ مقابلہ اور انگریز سے جنگ صرف مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے کی جائے یا صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے لیے؟ آپ نے فرمایا نہیں پورے ہندوستان کے لیے بلکہ پورے ایشیا کے لیے مغرب کے مقابلہ میں تمام مشرق کے لیے یہ جنگ ہونی چاہیے۔

حضرت شیخ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا یہ اعلان دسمبر ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اس وقت فرمایا تھا کہ جب کہ بڑے سے بڑا لیڈر ہوم رول قبول کرنے کے لیے قریب قریب تیار ہو گیا تھا مگر حضرت شیخ نے ملک کے لیڈروں سے الگ ہندوستان کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کی مکمل آزادی کا اعلان فرمایا اور مغرب کے مقابلہ پر مشرق کو مکمل آزادی دلانے کا وعظ کہا۔ تحریک آزادی میں انگریز بھی طرح طرح کی چالیں چل رہا تھا۔

۱۹۲۷ میں ہندستان میں سائمن کمیشن آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لیے سفارشات پیش کرے مگر حضرت شیخ مدنی نے جگہ جگہ تقریر میں فرمایا اور بتایا کہ دستور تو بنے ہندوستان کی حکومت کا اور بنائے انگریز، ایسے دستور کو کسی طرح پسند نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے بھی سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا دستور حکومت ہندوستانیوں کو ہی بنانا چاہیے، چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی جس کے صدر موتی لال نہرو بنائے گئے اور یہ نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو دستور حکومت بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے، مگر اس رپورٹ میں بھی ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور نہ تھا اور بھی کئی باتیں قابل قبول نہ تھیں اس لیے حضرت شیخ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ابھی مذکورہ بالا سیاسی کش مکش چل رہی تھی کہ برطانیہ نے ایک قانون شاردا ایکٹ کے نام سے پاس کیا۔ جس کو شیخ الاسلام نے مذہب میں مداخلت بتایا۔ جمعیت علمائے ہند میدان میں آئی اور قانون کی خلاف ورزی کا ریزولیشن پاس کیا۔ حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء وخدام نے اس کے خلاف تقریریں کیں اور خلاف ورزی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے نکاح پڑھانے اور جیل میں جانے پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ شاردا ایکٹ تھوڑے دنوں میں بے اثر بنا دیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ فیڈریشن ہوم رول اور دوسرے دستوروں پر کافی

بحث ہوئی۔ کانگریس بھی اس پر مجبور ہوئی کہ مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کرے، چنانچہ اس اجلاس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس کر کے آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا اس نازک وقت میں بھی حضرت شیخ کی ذات گرامی تھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرمایا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسراقتدار آتی ہے، مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے بھائیوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے کانگریس میں شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علما کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا اور جمعیت علمائے ہند نے ایک مستقل دائرہ حربیہ قایم کیا۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء میں اس ملک میں جنگ آزادی پورے زوروں سے لڑی گئی جس میں علمائے حق اور قوم پرور مسلمانوں نے ناقابل فراموش جانی و مالی قربانیاں پیش کیں۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے دن رات انتہائی جانفشانی سے ملک بھر کا سفر کیا اور جگہ جگہ جلسوں میں تقریر فرما کر آزادی کی جدوجہد میں جان ڈالتے رہے۔ اس دور کی سختیوں کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے علمائے دیوبند خصوصیت سے حضرت شیخ کے خلاف انتہائی مذموم اقدامات ہو رہے تھے مگر حضرت شیخ اور ان کے خدام سر پر کفن باندھے میدان میں تھے اور کسی کی پروا کیے بغیر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے کہ ملک میں پھر کتابیں شایع کی گئیں جس میں یہ بتایا گیا کہ کانگریس چونکہ ہندوؤں کی جماعت ہے اس لیے اس کی شرکت مسلمانوں کے لیے جائز نہیں مگر اس مرد مجاہد سے جب سوال کیا گیا کہ فلاں شخص نے آپ کے خلاف یوں لکھا ہے تو مسکرا کر فرمایا کہ یہ لوگ تو پہلے سے لکھتے آئے ہیں تم اپنا کام کرو ان کی طرف نہ دیکھو۔ یہ تو ترک موالات کے زمانہ میں بھی اس طرح بہہ گئے تھے، ان سے یہ امید کہ انگریز کے خلاف کچھ کہہ سکیں، غلط ہے، خاموش رہ کر مورد الزام بنیں یہ کیسے ہوسکتا ہے اس لیے اپنی جان بچانے کو ایسی باتیں کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو اور اپنا کام کرو۔ سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں بھی حضرت شیخ ہی تھے یہ تحریک سول نافرمانی ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون پیکٹ پر ختم ہوگئی تھی مگر ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی پر پھر شروع ہوگئی۔

اب انگریز گورنمنٹ نے آڈی نینس جاری کیے اور کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی گئی۔ کانگریس کے لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں، کانگریس نے مختلف طریقوں سے سول نافرمانی کو جاری رکھا۔

چنانچہ جمعیت علمائے ہند نے بھی اپنی مجلس عاملہ کو توڑ کر ڈکٹیٹر شپ کا طریقہ اختیار کیا اور حضرت شیخ نے بحیثیت ڈکٹیٹر اعلان فرمایا کہ فلاں دن دہلی پہنچ کر جامع مسجد میں تقریر کروں گا۔ اس خبر کو ملک میں کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ آج نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت پورے ملک میں تہلکہ تھا برطانیہ عظمی بھی دہل رہی تھی کہ اب

شیخ الاسلام اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے دہلی تشریف لا رہے ہیں، یہ بات گورنمنٹ کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور پریشان کن تھی کیونکہ برطانیہ نے پوری دنیا میں یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی کا اس سول نافرمانی سے کوئی تعلق نہیں ہے اب شیخ الاسلام کو گرفتار کیا جائے تو دنیا کیا کہے گی کہ تمام دنیا میں انگریز کے جھوٹ کی پول کھل جائے گی۔

الحاصل حضرت شیخ جمعہ کے دن دیوبند سے روانہ ہوئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد دہلی کی جامع مسجد میں تقریر فرمائیں گے مگر گورنمنٹ نے مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کی گاڑی کا محاصرہ کرلیا اور آں جناب کو گرفتار کر کے ریل سے اتار لیا گیا آپ کی گرفتاری کا پہلے سے یقین تھا مگر یہ گمان کسی کو نہ تھا کہ مظفر نگر ہی پر اتار لیے جائیں گے حضرت والا کو بھی یہ گمان تھا کہ دہلی جامع مسجد میں پہنچنے سے پہلے دفتر میں یا شہر دہلی میں گرفتاری عمل میں آئے گی اور تقریر کی نوبت شاید نہ آئے۔ اس لیے حضرت شیخ نے اپنا بیان لکھ کر ایک شخص کو پہلے ہی دے دیا تھا اور ہدایت فرمادی تھی کہ اگر میں گرفتار کرلیا جاؤں گا تو یہ بیان جامع مسجد میں پڑھ دیا جائے چنانچہ حضرت شیخ کی ہدایت کے مطابق، حضرت شیخ کا تحریری بیان جامع مسجد میں پڑھا گیا اور انگریز گورنمنٹ حضرت شیخ کے پیغام سے ہندوستانی مسلمانوں کو محروم رکھنے میں کامیاب نہ ہوئی۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۴ء تک ملک کی سیاسی تاریخ کا خاص زمانہ ہے۔ اس زمانے تک مسلم لیگ کی تحریکات نے بھی ملک میں خاص اہمیت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں حضرت شیخ کو پنجاب سے بذریعہ تار دہلی بلایا گیا، اکابر جمعیت العلماء سے مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی صاحب چودھری خلیق الزماں، نواب اسماعیل خاں وغیرہ کی گفتگو پہلے ہی ہو چکی تھی یہ تمام گفتگو حضرت شیخ کو سنائی گئی اور مسلم لیگ سے اتحاد عمل کی تجویز سامنے آئی اگرچہ اس وقت بھی لیگ کے سیاسی کردار سے مشتبہ تھے لیکن حالات نے لیگ کے سیاسی کردار کی عملی آزمائش اور تجربہ کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت اس تجربہ کے نتائج دیکھنے کے لیے خاموش ہو گئے مگر حسب توقع یہ تجربہ ناکام رہا اور ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد مسلم لیگ کے رہنما اپنے مواعید سے منحرف ہو گئے اور ان کا عمل برطانوی گورنمنٹ کی بنیاد کو مضبوط بنانے لگا۔ حضرت شیخ کے لیے یہ بات کسی طرح برداشت کے قابل نہ تھی، چنانچہ حضرت شیخ نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار فرمائی اور ایک رسالہ میں اپنی علیحدگی کے وجوہ بیان فرمائے۔

ملک کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے ملک کو آزادی کی طرف لیے جا رہے تھے، ایک طرف حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء انگریز سے برسرپیکار تھے دوسری طرف انگریز ان نام نہاد لیڈروں کو اپنے مفاد میں استعمال کر رہا تھا جو سیاسی اغراض کی بنا پر خود انگریز نے پیدا کیے تھے چنانچہ ہندو لیڈر رہنماؤں میں اور مسلمان

لیڈر مسلمانوں میں فرقہ واریت پھیلانے لگے اور فرقہ ورانہ سازشوں کے تحت ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑے شروع ہو گئے اور دو قومی نظریہ کی تبلیغ ہونے لگی ان مشکل حالات میں حضرت شیخ نے پورے ملک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ملک والو، مذہب الگ الگ ہیں مگر قوم ایک ہے، دو قوموں کا تصور ملک کو تباہ کر دے گا۔ یہ غلطی نہ کرو۔ اس غلطی سے انگریز کو فایدہ اور تم کو نقصان ہوگا" مگر حضرت شیخ کی یہ آواز نہ سنی گئی اور ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے ہمیں جو نقصانات ہوئے وہ ہر شخص کی یاد میں محفوظ ہیں۔

ملک کے یہ تکلیف دہ سیاسی حالات تھے کہ ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ اور جرمنی کے مابین دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی طرف سے بھی اعلان جنگ کیا لیکن حضرت شیخ نے میرٹھ کے اجلاس میں جو ۸۔۷ ۔۹ر جون ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا تھا صاف اعلان کر دیا کہ اس جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت شیخ کا یہ اعلان کانگریس کے لیے بھی رہنما بنا اور وہ بھی جنگ میں عدم تعاون کے مسئلہ پر غور کرنے لگی، بہر حال اب خود برطانیہ کو بھی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی اور سر اسٹیفورڈ کریس، لارڈ لن لتھگو، وایسرائے، وزیر اعظم مسٹر چرچل اور مسٹر ایمری وزیر ہند یہ طے کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان کی جدو جہد آزادی کو بزور قوت دبا دیا جائے۔

حضرت شیخ ۲۴ر جون ۱۹۴۲ء کی شب میں اس وقت گرفتار کر لیے گئے جب حضرت والا اتحاد کانفرنس کی شرکت کے لیے سفر فرما رہے تھے۔ اسٹیشن دیوبند سے اگلے اسٹیشن تلہیڑی پر سب انسپکٹر پولیس حضرت شیخ کے ڈبے میں آیا اور حضرت شیخ کے سامنے گرفتاری کا وارنٹ پیش کیا اور صبح کو مراد آباد کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ کیونکہ حضرت شیخ کی گرفتاری بچھراؤں ضلع مراد آباد کی ایک تقریر کی بناء پر عمل میں آئی تھی جو حکومت وقت کی نظر میں خلاف قانون اور بغاوت کے مترادف تھی۔

مراد آباد میں حضرت شیخ کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور حافظ محمد ابراہیم صاحب نے مقدمہ کی پیروی کی لیکن حکومت وقت کی مصلحت کے تحت اسپیشل مجسٹریٹ جناب سری واستوا نے حضرت شیخ کو ڈھائی برس قید بامشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا۔

دفاعی کمیٹی نے اپیل دایر کی۔ جناب آصف علی مرحوم کو دہلی سے بلوایا گیا، انہوں نے ۲۹ر جولائی ۱۹۴۲ء کو تقریباً تین چار گھنٹے اپیل پر بحث کی جج نے ۱۳ر اگست ۱۹۴۲ء کی تاریخ فیصلہ کے لیے مقرر کی ابھی فیصلہ کی تاریخ نہ آئی تھی کہ حکومت برطانیہ کے خلاف ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو بازار چوک میں گولی چلی جس سے کچھ اشخاص ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے اور شہر میں انتہائی بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ ۱۳ر اگست کو حضرت شیخ کے مقدمہ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا حضرت شیخ کو مراد آباد جیل کی اس کال کوٹھری میں رکھا گیا جس میں پھانسی والے

قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اخبار یا کوئی کتاب رکھنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

حضرت شیخ ۲۵؍جون ۴۲ سے ۲۳؍جنوری تک مرآباد جیل میں رکھے گئے پھر ۲۴؍جنوری ۴۳ء کو نینی جیل الہ آباد روانہ کردیے گئے جہاں تقریباً بیس ماہ قید رہے۔

بہر صورت ۲۶؍اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت شیخ دو برس دو ماہ کی ظالمانہ اسیری کے بعد رہا ہوئے اور سلہٹ تشریف لے گئے تاکہ رمضان مبارک کا مہینہ حسب وعدہ سلہٹ میں بسر کریں۔

ابھی جیل سے رہا ہوئے چند ماہ نہ گزرے تھے علالت اور جیل کی تکالیف کا اثر زائل نہ ہوا تھا کہ حضرت شیخ نے ۳۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی دو تہائی اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہوسکے گی۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم وغیر مسلم ججوں کی تعداد کی مساوی ہو اور ان ججوں کا تقرر مسلم وغیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

خطبہ صدارت اجلاس سہارنپور ۴۔۵۔۶؍مئی ۴۵ء میں حضرت شیخ نے حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی۔

لیکن دوسری طرف ملک میں مسلم لیگ کی سیاست کو فروغ حاصل ہورہا تھا اور مسلم لیگ کے رہنما قوم پرست مسلمانوں کے لیڈروں کو بدنام ورسوا کرنے کی کوشش کررہے تھے چنانچہ قاید اعظم محمد علی جناح نے ۱۶؍مارچ ۱۹۴۵ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''قوم پرور مسلمان، مسلمان ہی نہیں ہیں، ہندوؤں کے زرخرید خیمہ بردار ہیں''۔

جناب آئی آئی چندریگر نے ۶؍ستمبر ۱۹۴۵ء میں بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قوم پرور جماعتیں کانگریس کے اشاروں پر ناچنے والی طوائف ہیں وغیرہ وغیرہ، اسی کے ساتھ مسلم لیگ نے یہ الزام عاید کیا کہ ۱۹۴۲ء کی تحریک (انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑو تحریک مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھی۔ شیخ الاسلام اور ان کے نیشنلسٹ خدام جیل میں بند تھے اور پورے ملک میں مختلف طریقوں سے یہ پروپیگنڈا ہورہا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان کانگریس کے زرخرید غلام ہیں تاکہ عام مسلمانوں میں ان کے خلاف بدگمانی پھیل جائے اور ان کی آواز کا اثر کمزور ہوجائے، ان حالات میں حضرت شیخ جیل سے باہر تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ پوری جماعت کا شیرازہ منتشر ہوگیا ہے اور پروپیگنڈے کے تمام ذرایع نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف استعمال ہورہے ہیں، خود برطانوی حکومت کو بھی یقین تھا کہ اس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی کمر توڑ دی ہے لیکن سہارنپور کے اجلاس میں حضرت شیخ نے گورنمنٹ کو یہ بتادیا کہ ہم زندہ ہیں اور برطانوی سامراج کو شکست دینے کے لیے

زندہ رہیں گے۔ سہارنپور کے اجلاس کی کامیابی نے انگریز اور انگریز کے خوشہ چین حضرات کو چراغ پا کر دیا اور ملک میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا نے مذموم رخ اختیار کر لیا۔ اسی اثنا میں لارڈ ویول نے اپنی اسکیم پیش کر دی اور شملہ کانفرنس کا کھیل ہندوستانی عوام کے سامنے آیا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب حقیقت میں قاید اعظم محمد علی جناح اور خضر حیات خان کا ٹکراؤ تھا۔ خضر حیات خان وزیر اعظم پنجاب ایک نشست کے مطالبہ سے نہ ہٹے تو محمد علی جناح واحد نمایندگی کے وعدے سے ایک انچ ہٹنے پر راضی نہ ہوئے لہذا کانفرنس ناکام ہوگئی جس کا الزام مسلم لیگ نے قوم پرور مسلمانوں پر رکھا اور ان کے خلاف اشتعال انگیزی شروع کر دی۔

شملہ کانفرنس کے بعد الیکشن کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور حضرت شیخ کی مقبولیت اور اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے جمعیت علمائے ہند کے مقابل جمعیت علمائے اسلام قایم کی گئی، لیکن حضرت شیخ کی تنہا کوشش سے جمعیت علمائے ہند نے چالیس فیصد ووٹ حاصل کیے اور صوبائی اسمبلیوں میں ۱۶ فیصد نشستیں حاصل ہوئیں۔

ابھی صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخابات پورے ہندوستان میں مکمل نہ ہوئے کہ وزارتی مشن لندن سے ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کو ملاقات کی دعوت دی گئی۔

حضرت شیخ بھی ۱۶؍اپریل ۱۹۴۶ء کو حافظ محمد ابراہیم صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب، شیخ حسام الدین صاحب اور شیخ ظہیر الدین صاحب کے ساتھ وزارتی مشن سے ملے اور جمعیت علما کا فارمولا پیش کیا۔

یہ پس منظر ہے جس میں مسلم لیگ نے ۲۸، ۲۹؍جولائی کی قرارداد کے مطابق ۱۶؍اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا اور بنگال میں فسادات شروع ہوگئے جن کا سلسلہ پورے ملک میں پھیل گیا، نواکھالی بہار اور گڈھ مکتیشر میں خوف ناک فسادات ہوئے۔

بہرحال ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کو یقین ہوگیا تھا کہ اب ہندوستان کو آزادی دیے بغیر چارہ نہیں، مگر برطانیہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہندوستان کو کوہ آتش فشاں بنا چکا تھا اور ملک کی تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، جس کے مطابق بالآخر ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا پرچم لہرایا گیا۔

ملک کی طویل سیاسی جدوجہد میں حضرت شیخ نے کس سرفروشانہ جذبے کے ساتھ متواتر حصہ لیا۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا واقعات سے بخوبی ہو جاتا ہے ہندوستان کا مورخ ہندوستان کے جہاد آزادی کی تاریخ میں حضرت شیخ کو ممتاز رہنما کے نام سے یاد کرے گا اور حضرت شیخ کے کارناموں کو زریں حروف میں تحریر کرے گا۔

(روزنامہ نئی دنیا ہولی عظیم مدنی نمبر ۱۹۵۹ء) ■

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وطنی خدمات

وشوا ناتھ طاؤس

حب الوطنی مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ فرزندانِ توحید کے سامنے ان کے پیغمبر جلیل رسول اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے جس سے وطن کی محبت آشکارا ہے اور اپنے ملک سے فطری تعلق کے مضبوط جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جب نبی آخرالزماں حضور سرورِ کائنات ﷺ نے کفار کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر بحکم خداوندی اپنے وطن مکہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا:

"اے مکہ! خدا کی قسم روئے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔
اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"۔

سید الکونین ﷺ کے جذبات وطنی یہ ہیں تو کیا ممکن ہے کہ کوئی سچا مسلمان حب وطن سے خالی ہو؟ مسلمان اپنے دین کی رو سے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس امر کے پابند ہیں کہ وہ اپنے لیے غیر ملکی اقتدار کو پسند نہ کریں، یہی بات ہے، جس کو علمائے حق نے سمجھا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی سربراہی و رہنمائی کی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور فرنگی اقتدار کے سائے ملک پر منڈلا رہے تھے۔ انہوں نے نعرۂ حق بلند کر کے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنے کی کوشش کی اور ایک انقلابی جماعت بنانے کا عزم کیا۔ انہوں نے ایک ایسا نظام وضع کیا اور ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جس کی بنیاد حق کوشی ایمان و ایقان، صدق و صفا، ایفائے عہد و امانت، امن و آشتی، عدل و انصاف، آزادی ضمیر، احترام انسانیت، تحفظ جان و مال اور معاشی انصاف پر تھی۔

حضرت شاہ ولی واللہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز نے

ہندوستان کی ایک حیثیت متعین کردی اور ان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ انہوں نے فرنگیوں کے مکروفریب کے خلاف فتویٰ جاری کیا اور مجاہدین کی تیاری کے لیے اپنی مہم شروع کی۔ حسن اتفاق سے انہیں رائے بریلی کے قدیم بزرگوں کی اولاد کا ایک ہونہار شاگرد سید احمد میسر آگیا۔ انہوں نے عملی بنیادوں پر مجاہدین کی ایک جماعت تشکیل کی اور اپنی دعوت تجدید واحیاے اسلام کا رخ جہاد کی طرف موڑ دیا اور صوبہ سرحد کو مرکز بنا کر آزادیٔ وطن کی سعی شروع کی۔ جو لوگ سید احمد شہید کی تحریک کا رخ ہندوستان کے ایک فرقہ کے خلاف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی دور بینی، فراخ دلی اور بلند نگاہی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید کا طرز عمل اور منشا کیا تھا یہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب "نقشِ حیات" کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط واقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انہیں بتادیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک کے بدیسی لوگوں کے اقتدار کو ختم کرنا ہے، اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سندھیا کے وزیر برادر نسبتی راجہ ہندوراؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت سے متعلق آپ کے نقطہ نظر پر روشنی پڑتی ہے"۔

اس کے بعد اس خط کو نقل کیا ہے جو طویل ہے اور جس میں دربار گوالیار کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اطمینان سے نہ بیٹھے کیوں کہ فرنگی حکومت سرطان کی طرح ملک میں پھیل رہی ہے جس نے عزت والوں کی عزت خاک میں ملادی ہے۔ نہ مسلمان اس سے محفوظ ہیں اور نہ ہندو۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس خط کا جو تجزیہ کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

"۱- آپ انگریزوں کو بیگانگانِ بعید الوطن اور پردیسی سمجھتے تھے اور ان کے تغلب سے تنگ آکر ان سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

۲- آپ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔

۳- جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قایم کرنا ہرگز نہیں تھا۔

۴- آپ مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ

کی غرض ان دونوں ہی کو اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا"۔

حضرت مولانا مدنیؒ نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ تحریک آزادی جو علما کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصے سے شروع ہوئی اور جس کا سنگ بنیاد رکھنے والے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ان کے خاندان کے لوگ اور ان کے شاگرد ہیں۔ ان میں فرقہ واریت اور تنگ دلی کا نام تک نہ تھا، نہ ان کا مقصد دنیاوی مفادات، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا تھا اور یہ تحریک شخصی یا کسی فرقے کی حکومت فسطائیت کے لیے عمل میں نہیں لائی گئی تھی، بلکہ حقیقی جمہوریت اس کا نقطۂ نظر تھا۔

حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کا گروہ مردان خود آگاہ اور خدا پرستوں کا لشکر تھا جنہوں نے دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر آزاد قبائلی علاقے کی سنگلاخ چٹانوں پر میدان جہاد آراستہ کیا اور راہ حق میں شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علمائے صادق پور نے قربانی اور جاں نثاری کی شاندار مثال قایم کی۔ بعد ازاں بزرگانِ دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران معرکۂ شاملی میں بے پناہ جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

استخلاصِ وطن کے لیے برادرانِ اسلام کی کاوشوں اور قربانیوں کی بڑی طویل داستان ہے اور اس کا کچھ حصہ میں نے اختصار کے ساتھ اس لیے بیان کر دیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے آزادیٔ وطن کے مشن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ماضی اور حال کی کڑیاں ملائے بغیر صورت حال کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ماضی کو کریدنا میرے لیے ضروری تھا۔ اب میں اپنے اصل موضوع یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کی وطنی خدمات کی طرف آتا ہوں۔

حضرت کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ ان کی ذات بابرکات ہندوستان کے لیے قدرت کا ایک عطیہ تھی۔ انہوں نے ایک قاید کی حیثیت سے ملک وملت کی آزادی کیلئے جو دلیرانہ جدوجہد کی اور ایک مجاہد کی حیثیت سے ایمانِ کامل، زہد و تقویٰ اور صبر و ایثار کو زادِ راہ بنا کر جس پامردی کے ساتھ فرنگی استعمار خانوں کو خاکستر کیا وہ تاریخ ہند کا ایک تابناک باب ہے۔

ایک محاذ پر وہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کی گمراہ قیادت کو بے نقاب کرنے میں مصروف تھے جو پوری ملت کو صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہی تھی۔ ایک طرف وہ زورِ بازوئے قاتل آزمانے کے لیے بے خوف و خطر اس مقام کی طرف بڑھتے رہے جہاں ہر لمحہ دار و رسن کی آزمایش تھی تو دوسری طرف ماحول کی ناسازگاری اور اپنوں کی جفا کاریوں کا سامنا استقلال و استقامت سے کرتے رہے۔ انہوں نے فرنگی استعمار خانوں کی دیواروں پر تحریک حریت کی شمع کو اس قدر فروزاں کیا جس سے فرنگی اقتدار کا ایوان جل کر خاک ہو گیا۔ برصغیر کی تاریخ آزادی میں ان کا کردار اتنا واضح اور ان کا حصہ اتنا عظیم اور وسیع ہے کہ اس پر کام کرنا ایک ادارے یا ایک اکیڈمی کا کام ہے۔ میرا مختصر مقالہ ان کی پوری جدوجہد کا احاطہ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اگرچہ اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی سے حضرت شیخ الہند کی خصوصی توجہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انہیں اس نہج سے تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہو کر مسلمانانِ ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران پیرحریت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے خانۂ کعبہ کے سائے میں ان کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی، پھر قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی نے خلعت و دستار خلافت بخش کر ان کو جوہر قابل بنا دیا۔ میدانِ عمل میں اترے تو حضرت شیخ الہند کی معیت میں اسارت مالٹا کے دوران جانبازی و سروشی کو مقصدِ حیات بنا لیا۔

حضرت شیخ الہند کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے جانشین قرار پائے اور انہوں نے تحریک آزادی کی زمام سنبھال لی۔ ابھی مالٹا سے واپس آئے ہوئے تقریباً ایک ہی سال گزرا تھا کہ جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں حضرت مدنی نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ سرکار انگلشیہ کی فوج میں ملازمت کرنا یا کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور کسی قسم کی اعانت کرنا حرام ہے اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے"۔

شرکائے کانفرنس نے یہ تجویز پاس کردی اور جب اگلے روز اخبارات میں شایع ہوئی تو انگریزی حکومت کے ایوان لرز اٹھے۔ اس باغیانہ تجویز کی بنا پر ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں حضرت کی گرفتاری کی افواہ پھیلی تو عوام مشتعل ہو گئے اور انہوں نے انگریز افسر کی قیادت میں دیوبند آنے والی مسلح پولیس پر حملہ کر دیا۔ حالات قابو سے باہر ہو گئے تو سہارنپور سے گورکھا پلٹن مدد کے لیے بلا لی گئی جس نے پورے شہر اور حضرت کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت گھر سے باہر تشریف لائے، عوام کو پر سکون رہنے کی تلقین کی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

۲۶ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دینا ہال کراچی میں حضرت مولانا مدنیؒ اور دیگر شرکائے کانفرنس کے مقدمہ کی سماعت ہوئی اور حضرت نے عدالت کے سامنے وہ پرجوش بیان دیا جو وطنِ عزیز کی سیاسی تاریخ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کے "قول فیصل" کی طرح ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے انہوں نے قرآن شریف اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے وہ دلایل اپنے موقف کی وضاحت میں پیش کیے کہ ہر سننے والا جزاک اللہ، سبحان اللہ کہہ اٹھا۔ ہر زبان پر یہ الفاظ تھے کہ اے حضرت! یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ انگریزی سامراج کی تیغوں کے سائے میں کلمۂ حق بلند کر رہے ہیں، بعض اوقات حضرت مدنیؒ کے دلایل و براہین سے سامعین کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی عدالت میں حضرت کے جرأت مندانہ کلمات سن کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ان کے قدموں پر گر پڑے تھے اور پاؤں کو بوسہ دیا تھا

اوران الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا:

''جو جرأت میں نے آج آپ میں دیکھی ہے آج تک کسی مجاہد میں نہ دیکھی اور نہ سنی''۔

یہ تھے ہمارے حضرت مدنیؒ جنہیں انگریز کے دیو ہیکل قید خانے بھی خوف زدہ نہ کر سکے۔ جن کے جذبۂ حب الوطنی اور جرأت ایمانی کے سامنے فرنگی سامراج کے تمام ہتھکنڈے ہیچ ثابت ہوئے اور یہ حسینی چراغ حالات کی تندو تیز آندھیوں کے سامنے بھی ضیا پاشی کرتا رہا۔

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ جیوری نے فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام سے بری قرار دیا البتہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ کے تحت دو سال قید با مشقت کا حکم صادر کردیا۔ چند روز بعد حضرت مدنیؒ کو سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد جب حضرت بڑی خاموشی کے ساتھ تنہا رات کی تاریکی میں دیوبند پہنچے تو لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ جلوس نکالنے پر اصرار کر رہے تھے مگر حضرت نے فرمایا:

''جلوس کیسا؟ کیا ہم نے برطانیہ کو شکست دے دی ہے۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے۔ کبھی شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالا کرتے ہیں؟''۔

سابرمتی جیل سے رہائی کے چند ہی دن بعد انہوں نے کوکناڈا میں جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس ۱۹۲۳ء کی صدارت کی انہوں نے بڑی سخت الفاظ میں جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی اس کو پوری قوت سے دہرایا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ اعلان انہوں نے اس وقت کیا جب انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے بڑے رہنما محض ہوم رول قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ اس کے چھ سال بعد ۱۹۲۹ء میں اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں کیا جو دریائے راوی کے کنارے منعقد ہوا تھا مگر حضرت مدنیؒ نے ۱۹۲۳ء میں ہی پورن سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن اس غرض سے آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ سب سے پہلے حضرت مدنیؒ نے کیا، انہیں اعتراض تھا کہ دستور تو بنے ہندوستان کا اور بنائے انگریز جو ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری قومی جماعتوں نے اس کے بعد یہ طے کیا کہ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ ہندوستان کا دستور ترتیب دینے کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو دستور بنایا وہ نہرو

رپورٹ کے نام سے شائع ہوا۔ اس رپورٹ میں کامل آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا لہٰذا حضرت مدنیؒ نے یہ کہہ کر اسے رد کردیا کہ ہم مکمل آزادی کے سوا کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو ہندوستانیوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے مصائب کا خاتمہ ممکن ہے، آزادی کی تحریک میں حضرت مدنیؒ انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت اور مدد کرتے رہے کیونکہ ان کا یقین تھا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسراقتدار بھی آتی ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ سالانہ اجلاس میں انہوں نے بحیثیت جماعت کانگریس میں شرکت کے فیصلے کا باضابطہ اعلان کیا تھا۔(۱)

آزادی کی جدوجہد میں حضرت مدنیؒ کسی غرض سے شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ صرف حب وطنی کی اس سنت رسول علیہ ﷺ کو تازہ کرنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا کہ اے مکہ تو کس قدر پاک اور مجھے محبوب ہے۔ یہ وطن سے بے پناہ محبت کا اعلان تھا جسے اس مجاہد اعظم نے زندہ کر کے دکھادیا۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات ''نقش حیات'' جو گزشتہ ڈیڑھ صدی کی آزادی کی جدوجہد کی غمازی کرتی ہے ان کی وطن دوستی کی مظہر ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات کے علاوہ سیاسی معلومات کا خزینہ ہے جس میں انگریز کی سیاہ کاریوں، چالبازیوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے جی بھر کے ہمارے ملک کو لوٹا اور برباد کیا اور ہم پر احسانات بھی جتائے۔ حقیقت یہ کہ ''نقش حیات'' تحریکِ آزادی ہند کی ایک جامع دستاویز ہے۔

۱۹۳۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا جس نے پورے ملک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ ۸؍جنوری کو حضرت اقدس مولانا مدنیؒ نے پل بنگش صدر بازار دلی کے ایک جلسہ میں تقریر کے دوران کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ حضرت کی اس تقریر کو دلی کے دو ممتاز اخبارات ''تیج'' اور ''انصاری'' نے شائع کیا۔ چندروز بعد دلی ہی کے دو پرچوں ''الامان'' اور ''وحدت'' نے اس تقریر کو کچھ دوسرے انداز سے اپنے صفحات میں شامل کیا۔ ان پرچوں سے لاہور کے دو مشہور روزناموں ''زمیندار''(۲) اور ''انقلاب'' نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت مدنیؒ کی طرف منسوب کردیے کہ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ حال آں کہ حضرت مدنیؒ کی اس تقریر کا مدعا محض یہ تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کو حفاظت وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بنا سکتے ہیں تو ہندوستان کا

---

(۱) امروہہ میں جمعیت علمائے ہند کا یہ سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا شاہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ کی صدارت میں ہوا تھا۔ (مرتب)

(۲) یہ بحث اخبار احسان۔ لاہور میں چلی تھی اور اسی میں حضرت علامہ اقبال کی معذرت پر اس بحث کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ (مرتب)

مسلمان بھی آزادیٔ وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔

جب اس تقریر کی اخباری اطلاع علامہ اقبال تک پہنچی تو انہوں نے تحقیق یا تصدیق کے بغیر جھٹ سے بڑے تلخ لہجے میں مولانا مدنیؒ کے خلاف تین فارسی اشعار کی ہجو لکھ ماری جو ان جیسے سنجیدہ انسان اور عظیم شاعر کے شایانِ شان نہ تھی۔ اس موضوع پر ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اخبارات میں گرما گرم بحث چل نکلی۔ دونوں طرف سے مضامین نظم و نثر کا تانتا بندھ گیا، یہاں تک کہ حضرت مدنیؒ کو اپنے موقف کی وضاحت میں ایک کتابچہ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے تحریر کرنا پڑا جس پر شمس العلماء عبدالرحمن اور مولانا حفظ الرحمن نے رسالہ ''برہان'' دلی میں کئی ماہ تک مدلل بحث کی۔

حضرت مولانا مدنیؒ کی وضاحت سے علامہ اقبال کا دل صاف ہو گیا اور انہوں نے اظہار معذرت کرتے ہوئے اپنے طنزیہ اشعار واپس لے لیے۔ مگر علامہ کے یہ اشعار ان کے انتقال کے بعد ''ارمغانِ حجاز'' میں شریک کر لیے گئے اور معذرت کو دیدہ و دانستہ غائب کر دیا گیا، حد یہ کہ جس شدت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کی جماعت کے خلاف سیاسی پروپیگنڈا کیا گیا اس کا عشر عشیر بھی اسلام کے خلاف فتنہ آرائی کرنے والی قوتوں کے خلاف مفقود تھا اور اب بھی ہے۔ خود اقبال کے مدرسۂ فکر نے حضرت مدنیؒ کے خلاف قلم درازی کرنے والوں کو چھوا تک نہیں!

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی سیاست ایک طوفانی دور سے گزرتی رہی۔ برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں الجھ گیا تھا۔ اس جنگ میں برطانیہ کی کوئی مدد نہ کرنے کے اعلان کی پاداش میں بڑے بڑے قومی رہنما اسیر زندان بنا دیے گئے تھے۔ میدان اب فرقہ پرست عناصر اور علیحدگی پسند قوتوں کے لیے کھلا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور فرقہ وارانہ سیاست گل کھلانے لگی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے پر قومی رہنما جیلوں سے باہر آئے تو فرقہ وارانہ جنون اپنی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ تعصب اور منافرت کی اس فضا میں ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے ہونے والے تھے۔

جہادِ حریت میں وطن دوست مسلمانوں نے قربانی و استقامت، شجاعت اور جاں نثاری کی روشن مثال قائم کی تھی۔ ایک نہیں بے شمار مسلمان مجاہدینِ حریت پرور تھے جن کے نعرہ ہائے انقلاب سے فرنگی حکومت کی مضبوط اور بلند و بالا دیواریں لرز جایا کرتی تھیں۔ جن کی صدائے حق فضا میں گونجتی تھی تو انگریز حاکموں کی نیندیں حرام ہو جایا کرتی تھیں۔ جن کے جوشِ جہاد، جذبۂ صادق، یقینِ محکم اور عملِ پیہم نے ملک کو آزادی کی منزل کے قریب پہنچا دیا، لیکن مسلمانوں کی گمراہ کن قیادت کے صدقے میں ان انقلابی شخصیتوں کی زندگیاں محرومیوں کا مرقع ہو کر رہ گئیں۔ یہ لوگ جن کے دم سے کبھی قافلۂ آزادی رواں دواں تھا اب عبرت کی بھولی

بسری داستانیں بن کر رہ گئے تھے۔

ان پر آشوب ایام میں آزادی ہند کے قافلہ سالار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر جو کچھ گزری وہ فرزندانِ اسلام کی بہت بڑی بدنصیبی ہے جس کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کے حسینؒ کے امتحان کا دور تھا۔ استخلاص وطن کے لیے قرآن وسنت کی پیروی کرتے ہوئے انہیں کئی جاں کن راستوں سے گزرنا پڑا۔ باطل پرست قوتوں اور فرقہ پرست جماعتوں کے ہر سب وشتم، طعن وتعریض کا مقابلہ انہوں نے پامردی اور خندہ پیشانی سے کیا۔ وہ عمل وہمت کی ایک چٹان اور عزم وبلند حوصلگی کا ایک کوہ گراں تھے جن کو حادثاتِ زمانہ اور انقلاباتِ زمانہ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔

ان دنوں سیاست کی جن پرخار وادیوں سے حضرت مدنیؒ کو بار بار گزرنا پڑا اس کا ذکر مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں حضرت سے متعلق لکھے گئے خاکے میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ان کے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ اس ہنگامہ خیز دور میں حضرت مدنیؒ کی رائے اور سیاسی بصیرت عام مسلمانوں کی خواہش اور جذبات اور اس وقت کی مقبول قیادت کی سیاسی فکر سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں کی نئی لیڈرشپ نے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا متحرک اور مشتعل کر دیا تھا کہ ان میں کسی مخالف رائے کے سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ حضرت مدنیؒ کے خلوص، عزم اور احساس فرض نے اس کیفیت کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت سے کلمۂ حق کہنا اپنا فرض اور افضل جہاد سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفروں اور جلسوں میں وہ سب کچھ پیش آیا جو مولانا کی شخصیت، ان کی سابقہ خدمات اور ان کے علمی ودینی مقام کے بالکل شایانِ شان نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو مختلف مقامات پر پیش آ رہے ان واقعات کو مسلمانوں کے حق میں نامناسب سمجھتا تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس میں جب سید پور کے اسٹیشن کا واقعہ کسی اخبار سے پڑھ کر سنایا جا رہا تھا اس مجلس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب فرط تاثر سے رو پڑے۔ مشکل سے کوئی ایسا تھا جس کی آنکھیں نم نہ ہوں"۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کو زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد جو کچھ ملا وہ ہماری سیاسی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ انہیں اپنوں ہی کے ہاتھوں پسپا ہونا پڑا لیکن حق پرستوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ بقول آغا شورش کاشمیری:

> "امویوں نے اپنے دور میں ہاشمیوں کا خون حلال کر لیا۔ نتیجتاً ان کا سچا

تذکرہ ایک گھناؤنا جرم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پر منبر و محراب پر تبرّیٰ ہوتا رہا اور یہ سلوک........ مسلمانوں کا رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت سے تھا۔ ہر دور میں تاریخ اسی طرح مجروح ہوتی رہی، صداقتوں کو برسوں کی مسافت کے بعد جگہ ملی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے اس عہد کے مسلمانوں نے کیا سلوک کیا، شاہ عبدالعزیز کے پہنچے توڑ دیے، ان کے بدن پر چھپکلی کا تیل ملا، جس سے انہیں برص ہوگیا۔ آج دعوت و عزیمت اور فکر و نظر کی محراب میں ان کا نام گونج رہا ہے تو اس گونج کے پیدا ہونے میں پوری ایک صدی صرف ہوئی ہے، خوانین ہزارہ کی غداری سے سید احمد شہید ہوگئے تو ان کی سیرت تقریباً ایک صدی تک گرد و غبار میں دبی رہی۔ اعتراف و ستائش کے الفاظ گنگ ہوگئے۔ خود مسلمانوں نے ان کے خلاف گز بھر کی زبانیں دراز رکھیں۔ اب کہیں جا کے ان کا نام ابھرا ہے اور مسلمانوں نے تحریک آزادی کے ڈانڈے ان کی جد و جہد سے ملائے ہیں"۔

حالات کی سنگ دلی ایک بار پھر عود کر آئی۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخاب کے دوران امرتسر اور جالندھر کے ریلوے اسٹیشنوں پر ناعاقبت اندیش نوجوانوں نے حضرت شیخ الاسلام کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ جالندھر میں مفسدوں نے مولانا کی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور اسے پاؤں تلے روندا، ایک نے مولانا کی ریش مبارک کو نوچا دوسرے نے گال پر طمانچہ مارا حتیٰ کہ ان کے منہ پر تھوکا۔ حضرت کا تکیہ چھین لیا گیا، گندے نعروں اور گالی گلوچ کی بھرمار تھی۔ حضرت کے ساتھ ایک خادم تھا اس سے یہ سب برداشت نہ ہوسکا اس نے مزاحمت کی کوشش کی تو حضرت نے اسے منع کر دیا اور فرمایا:

"تم یہ سب نہیں دیکھ سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

اس وقت حضرت مدنیؒ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ جس طرح جگر گوشۂ رسول ﷺ کے قاتلوں میں سے کوئی بھی آخرت سے پہلے گناہوں کی سزا سے محفوظ نہ رہا تھا اسی طرح شمس الحق سے لے کر فضل محمد تک رقصِ ابلیس کرنے والا کوئی بھی مفسد خدا کے خوفناک قہر سے نہ بچ سکا اور آفاتِ سماوی ان پر نازل ہو کر رہیں۔ ایک بار یہ پھر ثابت ہو کر رہا کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو دکھی کرنے والوں سے کڑا انتقام لیتا ہے۔ ■

ہندوستان کا دستور

اور

مذہبی آزادی

یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں اور نظریات پر قایم رہی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کا دستور جمہوریت اور نامذہبی اصولوں پر وضع کیا گیا۔ یہ دستور ہندوستان کے ہر باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے اور بلا اختلاف مذہب وملت ہر ایک ہندوستانی کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر طبقے کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقاو تحفظ وترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں، جو اس سلسلے میں ہمارے اوپر عاید ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں پر غور کریں کہ ملی اور اجتماعی فرایض کیا ہیں اور ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے مآثر ومعابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کس طرح ملک کی تعمیر جدید میں اپنی اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔

(خطبہ صدارت جمعیۃ علماے ہند

حیدرآباد ۱۹۵۱ء)

ایک عظیم محبّ وطن

ایم۔ایم جلالی

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی مجموعۂ کمالات تھی۔ وہ نہ صرف دنیائے اسلام کے واجب التسلیم رہنما، علم حدیث وفقہ، ادب ومعانی، فلسفۂ ومنطق کے زبردست وتبحر عالم تھے بلکہ ہر ملک وہر قوم کی تاریخ انہیں از بر تھی یہی وجہ ہے کہ وہ سارے ہندوستان کے لیے بہ یک وقت بلا تفریق وامتیاز مذاہب وملل محبوب ترین رہبر اعظم تھے۔

حضرت نے آزادی وطن کی خاطر جو قربانیاں پیش کیں اور جس اولوالعزمی اور فراخ دلی سے اہل ہند کو بدیشی سامراج کے پنجوں سے چھڑانے کی تگ ودو کی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ ہر قوم، ہر جماعت اور ہر فرد وبشر کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت جنگِ آزادی کی صف اول کے رہبر اعظم تھے۔ وہ آزادی کا آفتاب تھے انہوں نے اپنی زندگی کو ملک کی آزادی کے لیے وقف کردیا تھا۔

حضرت کو سرزمین ہند سے قلبی محبت تھی، فطری انس تھا، حضرت کا نظریہ حبّ الوطنی دنیا کی تمام قوموں سے ممتاز تھا۔ وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں اپنا وطن تسلیم کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سوال نے جب بہت سے مسلمانوں کو باندازِ دگر مشتعل کیا اور مسلم لیگ کے نام پر ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہند کے ولولے پیدا کیے، وہ ایسا نازک وقت تھا کہ کانگریس نے بھی تقسیم ہند کی قرارداد منظور کرلی، مگر یہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جذبۂ حب الوطنی تھا کہ آپ نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی! مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے مدبرین اعظم نے مولانا کی حب الوطنی پر اظہار تعجب کیا اور آفریں کہا۔ یہ انہیں کا عطیہ ہے کہ آج تک مسلمانوں کے قلوب میں ہندوستان کی عظمت ومحبت دوسری قوموں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ راسخ ہے۔ مولانا

جس طرح ہندوستان کو ہندوؤں کا وطن سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ہندوستان کو مسلمانوں کے قدیم ترین وطن ہونے پر بھی یقین کامل رکھتے تھے۔

جب مطالبۂ پاکستان کا اختراع کیا گیا اور مسلمانوں کو انتقال وطن کی تلقین کی جانے لگی تو مولانا رشد و ہدایت کی شمع لے کر ان مسلمانوں پر مسلط ہو گئے جن کی گمراہ کن قیادت نے ہندوستان کے مسلم عوام کو قعر مذلت میں پھینکنے کا تہیہ کر لیا تھا، مولانا کی اعجاز بیانی و بلیغ الاثری نے حب الوطنی کا صحیح جذبہ قلوب عوام میں راسخ کیا۔ حضرتؒ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

> ''ہندوستان کی عظمت و فضیلت جو قرآن و احادیث و مؤرخین اسلام کی روایات سے ثابت ہے، ان کے زیر نظر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی ہندوستان سے بیگانگی نہیں اختیار کر سکتا، وہ سرزمین جو خلیفۃ اللہ کا سب سے پہلا مہبط ہو، جو انسانیت کا سب سے پہلا دار الخلافہ ہو، جو سرزمین آفتاب نبوت کا سب سے پہلا مشرق بن چکی ہو۔ جس بقعۂ مبارکہ پر روح القدس کا سب سے پہلے نزول ہو چکا ہو۔ صحیح معنوں میں وہی سرزمین مسلمانوں کا اصلی پاکستان ہے''۔

یہ الفاظ اکثر حضرت اپنی تقاریر وارشادات میں فرمایا کرتے تھے، حضرت کو جو محبت سرزمین ہند سے تھی وہ آخر تک رہی۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد یکساں طور پر حب الوطنی کا جذبہ حضرت کے دل میں باقی رہا، کانگریس میں حضرت کی شمولیت، آزادی کی تحریکوں میں آپ کی جانبازانہ شرکت ان کے اسی جذبۂ حب الوطنی کی آئینہ دار ہے۔

مولانا کے نزدیک ہندوستان کے باشندوں میں صرف مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا قدیم ترین آبائی وطن کہہ سکیں۔ مولانا نے اپنی ایک تصنیف میں جو ''ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل'' کے عنوان سے جمعیت علمائے ہند کی طرف سے ۱۹۴۵ء میں شایع کی گئی تھی اس کے دلائل یہ بیان کیے ہیں:

۱- سب سے پہلے انسان اور ہم سب کے مورثِ اعلیٰ حضرت آدم جو مسلمانوں کے سب سے پہلے پیغمبر ہیں اسی سرزمین پر تشریف لائے۔

۲- توسیع نسل انسانی کا آغاز سب سے پہلے اسی سرزمین پر نور اسلام سے ہوا۔

۳- اس کے علاوہ صدیوں تک پیغمبروں کا سلسلہ اسی سرزمین پر جاری رہا۔

۴- حضرت شیث اور نوح وغیرہ نے صدیوں تک اسی سرزمین پر نعرۂ توحید بلند کیا جسے جمہور مؤرخین مانتے ہیں۔

انھیں وجوہ کی بنا پر حضرت نے ہمیشہ مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ ہندوستان کی سرزمین سے محبت کریں یہ ان کا پاکیزہ وطن ہے، انہوں نے بسا اوقات ارشاد فرمایا:

''ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک وطن سے منتقل ہو کر دوسرے وطن کو چلے جائیں مگر مسلمانانِ ہندوستان کو یہاں سے منتقل ہونا ازبس مشکل ہے نہ وہ اپنی مساجد سے بے گانگی اختیار کر سکتے ہیں نہ اپنے مقابر سے، نہ اپنی زمینوں سے، نہ اپنے گھربار سے اور نہ ان میں اس قدر استطاعت ہے''۔

سرزمین ہندوستان ہی وہ مقدس سرزمین ہے جہاں رشد و ہدایت خداوندی، معرفتِ قربِ الٰہی، ونجاتِ اخروی اور فوز و فلاحِ ابدی کے حصول کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عہد و پیمان ہوا، سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ نور مقدس جو سب سے پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام کے صلب مقدس سے منتقل ہو کر اپنے اپنے زمانے کے بہترین آباء اور بہترین امہات کے ذریعے سے جملہ منازل طے کرتا ہوا، افق مکہ سے طلوع ہوا۔ اس لحاظ سے بجا طور پر حضرت نے فرمایا:

''نورِ محمدی ﷺ اور افضال سرمدی کا سب سے پہلا مطلع ارضِ ہند اور سب سے آخری مشرق حجاز ہے''۔

الغرض مذہبی، سیاسی، ملکی، وطنی ہر حیثیت سے زمین ہندوستان مسلمانوں کے لیے واجب الاحترام ہے اور یہی وہ نظریہ ہے کہ جس نے حضرت شیخ کی ذاتِ پاک صفات کو حیاتِ ابدی بخشی۔

وہ کبھی کشمکش اور تذبذب میں نہیں رہے۔ انہوں نے جس مسلک کو اپنایا، قرآن واحادیث کی روشنی میں اس کی صداقت کا جائزہ لیا اور مستقل مزاجی سے اس پر چلے اور عوام کو اس پر چلنے کی ہدایت کی۔ ایسے دور کش مکش میں بھی آپ نے جذبۂ حب الوطنی کو اپنے دل میں برقرار رکھا جب کانگریس ہی کے کچھ فرقہ پرست ذہنیت والوں نے آپ کے دل کو ٹھیس پہنچائی، انہوں نے اپنا راستہ کبھی نہیں بدلا اور کانگریس کا ساتھ آخر تک نہ چھوڑا۔ اصول کی پابندی، راست بازی، صداقت، عدل وانصاف کے موڑ پر بڑے بڑے رہنما کترا گئے۔ مگر آپ نے کبھی صحیح راستے سے روگردانی نہیں اختیار فرمائی، وہ اسی سرزمین مقدس پر پیدا ہوئے تھے۔ اسی سرزمین ہند کے مایۂ ناز اور قابل فخر رہنما بنے۔ اسی سرزمین کی محبت اور عظمت کا جذبہ لے کر زندگی کے بیش قیمت اوقات گزار دیے اور آخر میں اسی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے پردہ فرما گئے۔ خدا ان کے نقوش پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ ■

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

نامور صحافی، مشہور قلم کار اور ممتاز انشاء پرداز مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ نے حضرت مدنی رحمہ اللہ کے وصال پر جو ادارتی مضمون دار العلوم دیوبند کے ترجمان ''ماہنامہ دار العلوم'' میں تحریر کیا تھا وہ شریکِ اشاعت ہے مولاناؒ کا ایک طویل اور تفصیلی مضمون حضرت مدنی رحمہ اللہ پر بعد میں شائع ہوا لیکن اس تک ہماری رسائی نہ ہو سکی۔ یہ مختصر مضمون ہی بطور تبرک اس نمبر کی زینت ہے۔ (مدیر)

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

قارئین رسالہ اخبارات اور دوسرے ذرائع سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے حادثۂ رحلت کی تفصیلات معلوم کر چکے ہوں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اپنے دفتری نظام کی مجبوریوں سے ہم دسمبر کے رسالہ میں اس حادثۂ ہوش رُبا کی اطلاع نہ دے سکے، اور وجہ یہ ہوئی کہ جب یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا تو دسمبر کا رسالہ تیار ہو چکا تھا، ہم اس غیر ارادی فروگذاشت پر خود بھی متاسف ہیں اور اپنے حلقۂ احباب سے معذرت چاہتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ گذشتہ چار پانچ ماہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے مختلف معالجات سے کبھی کبھی افاقہ بھی محسوس ہوا مگر مرض بار بار عود کرتا رہا۔ سلسلۂ درس وتدریس اور اسفار بالکل بند تھے، ملاقاتوں پر پابندی تھی اور متعلقین ومتوسلین علاج کی دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ ۵؍دسمبر (جمعرات کے دن) ۱۲؍بجے دوپہر کے بعد حضرت مرحوم نے انتقال فرمایا اور چند منٹوں میں یہ جاں کاہ خبر دار العلوم سے نکل کر پورے شہر اور اطراف واکناف میں پھیل گئی ہر کس وناکس پر ایک سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی اور ہر شخص اپنی جگہ پر مغموم واشک بار تھا۔ انتقال کی خبر

سن کر پورا شہر آپ کے دولت کدہ پر اُمنڈ آیا اور سارے شہر میں دوکان داروں نے ہڑتال کردی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ سفر پر تھے مگر اتفاقاً اپنا سفر منسوخ فرما کر حضرت مرحوم کے انتقال کے نصف گھنٹہ بعد دیوبند پہنچ گئے۔

ہزاروں مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ تدفین میں کچھ تاخیر کی جائے کہ باہر سے آنے والے اصحاب نماز جنازہ اور دفن میں شریک ہوسکیں مگر تدفین میں عجلت کی گئی رات کو عشاء کے بعد جنازہ مکان سے باہر لایا گیا مجمع کا یہ عالم تھا کہ مکان کے سامنے لمبی چوڑی سڑک دور دور تک انسانوں سے پٹی پڑی تھی کافی دیر میں جنازہ دارالعلوم میں پہنچا جہاں دارالحدیث کے ہال میں جنازہ رکھا گیا۔ رات کو گیارہ بجے تک دہلی، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، رام پور، نانوتہ، گنگوہ سے آنے والے لوگوں کا انتظار کیا گیا اور ایک بجے رات کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی بڑی احتیاط کے ساتھ یہ اندازہ کیا گیا کہ نماز جنازہ اور تدفین میں ۲۵ رہزار کا مجمع ضرور تھا اگرچہ اطراف واکناف میں اطلاعات دینے کا کافی انتظام نہ ہوا تھا مگر قرب وجوار سے ہزاروں آدمی مختلف سواریوں سے بروقت پہنچ گئے۔

حضرت مولانا مدنیؒ کا حادثۂ انتقال پورے عالم اسلامی، پورے ہندوستان، سارے ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کا نقصان عظیم ہے افسوس ہے کہ ایک بلند حوصلہ مجاہد، حدیث وتفسیر کا ایک تبحر عالم، ایک شیخ وقت، تصوف وطریقت کا ایک رمزگاہ، علم ومعرفت کا ایک رازدار، لاکھوں مسلمانوں کا روحانی پیشوا اور ہزاروں فضلاء وعلماء کا استاذ اٹھ گیا، دارالعلوم کے در و بام اس المناک حادثہ پر اشک بار ہیں اور ملک اور بیرون ملک میں حضرت رشید وقاسم رحمہم اللہ کی اس یادگار کی جدائی پر غم واندوہ کا دور دورہ ہے فرط رنج وغم سے ہم سب کا یہ حال ہے کہ قلب مغموم ہے دل اداس اور آنکھیں خشک۔

ویراں ہے میکدہ خم وساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

حضرت مولاناؒ کے انتقال پر دارالعلوم دیوبند میں تین دن عام تعطیل رہی اور تینوں دنوں تمام اساتذہ وطلباء اہل شہر اور باہر سے آنے والے مہمان ختم قرآن کرتے رہے، ختم کے پہلے اجتماع میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے تقریریں بھی فرمائیں۔ دارالعلوم میں اور خود حضرتؒ کے دولت کدہ پر بیانات تعزیت اور تعزیت کیلئے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ اب تک صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ یوسف فوزان سفیر مملکت عربیہ، پنڈت پنتھ وزیر داخلہ حکومت ہند، مسٹر لال بہادر شاستری، حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر یوپی کے علاوہ سیکڑوں اصحاب کے تعزیتی بیانات دارالعلوم میں آچکے ہیں۔ انشاء اللہ ہم آئندہ رسالہ میں حضرت مرحوم کے متعلق متعدد مضامین شائع کریں گے۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

خطبات صدارت کی روشنی میں

مولانا محمد سالم جامعی

ایڈیٹر ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے علم وعمل، فکرونظر اور جہد مسلسل کے ذریعہ عالم انسانیت کو وہ نقوش عطا کیے جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی اس کا تقاضا بھی یہ ہی تھا۔ اس وقت ملک پوری طرح انگریزی سامراج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور آپ کے محترم استاذ حضرت شیخ الہندؒ انگریزی سامراج کی غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے اور ملک کو آزادی دلانے کے لیے پوری طرح سرگرمِ عمل تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ جو پورے طور پر خود کو اپنے محترم استاذ کے سپرد کر چکے تھے وہ استاذ محترم کی فکر سے خود کو بیگانہ رکھ پاتے۔ ۱۹۱۴ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی رومال تحریک شروع کی اس وقت حضرت شیخ الاسلامؒ مدینہ طیبہ میں حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ حدیث پاک کے درس کی بزم گرمائے ہوئے تھے، مگر جیسے ہی اپنی تحریک کو بال و پر عطا کرنے کے لیے ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے محترم استاذ کے استقبال اور ان کی تحریک کی پذیرائی کے لیے ہمہ تن تیار

ہو گئے، مگر افسوس کہ ریشمی رومال کی اس تحریک کا راز فاش ہو گیا جس کے نتیجہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کو گرفتار کر کے مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا اپنے استاذ محترم اور مربی کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہی تھا کہ باوجود اس کے کہ آپ کے خلاف کوئی جرم نہیں تھا، مگر آپ نے اپنے استاذ محترم سے جدا ہونا گوارا نہیں کیا اور آپ بھی عملاً تحریک حریت کے ان پروانوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے اس تحریک کے ذریعہ انگریزی سامراج کو اس کی زبان میں جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء تین سال سات مہینے کی سزا کاٹ کر مالٹا سے رہا ہو کر بمبئی پہنچے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد تحریک آزادی میں ایک نیا موڑ آیا۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آچکا تھا اور حضرت شیخ الہندؒ اس کے فکری رہنما قرار پاچکے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ اب تک جس مقصد کو قوتِ بازو سے حاصل کرنا چاہتے تھے اس کی جگہ اب ایسے اقدامات کو اہمیت دی جانے لگی تھی جن کی سیدھی ضرب انگریزی سامراج کی مالی واقتصادی پالیسیوں پر پڑے۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ترک موالات کی وہ تحریک ہے جس کے ذریعہ حضرت شیخ الہندؒ کی سربراہی میں جمعیۃ علماء ہند نے صاف صاف اعلان کیا تھا کہ:

> ''مسلمان کا انگریزی فوج میں شامل ہونا حرام ہے اور جن مسلمانوں کو غاصب برطانوی حکومت نے سرکاری خطاب، عہدے اور اعزازات دے رکھے ہیں انھیں فوراً واپس کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انگلستان سے مکمل تجارتی مقاطعہ کیا جائے نیز قومی تعلیمی اداروں میں کوئی سرکاری امداد نہ لی جائے اور سرکاری تعلیم اور عدالتوں میں مقدمات کا بائیکاٹ کیا جائے۔''

حکومت نے اس فتوئ کو ضبط کر لیا جس کے خلاف سول نافرمانی کی گئی اور فتوئ کو دوبارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس (۱۹۲۱ء) میں کیا گیا تھا۔ اس فیصلے کی روشنی میں ملک بھر میں ترک موالات کانفرنسوں کا پروگرام بنایا گیا جس کی ابتدا کراچی سے کی گئی۔ ترک موالات کی یہ ہی تحریک ہے جس نے حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کو اپنے محترم استاذ کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کا عزم بخشا۔ مقدمہ کراچی میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے جو ولولہ انگیز بیان دیا تھا وہ آپ کے عزم وحوصلہ، فکر وعمل اور جہدِ مسلسل کا آئینہ دار ہے۔

آپ نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ:

> ''اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں، حدیث کو مٹا

دیں اور کتب فقہ کو برباد کردیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا۔"

یہی وہ پرعزیمت بیان ہے، جس کی پاداش میں حضرت شیخ الاسلام کو ظالم وغاصب انگریزی مجسٹریٹ نے دوسال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے خصوصی جانشین شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ مالٹا میں قید وبند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے اس لیے ظاہر ہے جسمانی طور پر ان دونوں حضرات کی قیامِ جمعیۃ علماء کے وقت موجودگی ناممکن تھی، مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے قیام میں ان دونوں حضرات خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ کی فکری رہنمائی موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء مالٹا سے رہا ہوکر ہندستان واپس آئے اور دہلی میں نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا، اس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الاسلامؒ کا اسم گرامی ہی تجویز ہوا اس لیے کہ جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے محرک حضرات بالخصوص حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ خود حضرت شیخ الہندؒ کے اہم تلامذہ میں شامل تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد اگرچہ باضابطہ جمعیۃ علماء ہند کے مستقل صدر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ قرار پائے مگر حضرت شیخ الہندؒ سے خصوصی نسبت وتعلق کی وجہ سے حضرت شیخ الاسلامؒ بھی جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رکین کی حیثیت سے جمعیۃ علماء ہند سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ اپنی اولوالعزم صلاحیتوں اور جہد مسلسل کی وجہ سے جمعیۃ علماء ہند میں ایک اعلیٰ مقام بھی حاصل رہا۔ حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہٗ مسلسل بیس سال جمعیۃ علماء ہند کے باضابطہ عہدۂ صدارت پر فائز رہے مگر اپنی کسر نفسی کی وجہ سے کسی بھی اجلاسِ عام کی صدارت نہیں فرمائی بلکہ ملک کے منتخب اور یگانۂ روزگار حضرات علمائے کرام کو اجلاسِ عام کی صدارت سے سرفراز فرماتے رہے۔ انھیں منتخب اور یگانۂ روزگار شخصیتوں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بھی شمار ہے۔ حضرت مفتی اعظمؒ کے اصرار پر حضرت شیخ الاسلامؒ نے بھی جمعیۃ علماء ہند کے پانچویں اجلاسِ عام بمقام کوکناڈا (۳۱ر دسمبر ۱۹۲۳ء تا ۲ر جنوری ۱۹۲۴ء) کی صدارت فرمائی۔ اس کے بعد جون ۱۹۴۰ء میں عہدۂ صدارت سے سبکدوشی کے بعد شیخ الاسلام کو جمعیۃ علماء ہند کا باضابطہ صدر منتخب کیا گیا جس کے بعد تادم واپسیں (دسمبر ۱۹۵۷ء) آپ جمعیۃ علماء ہند کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔ آپ کے دور صدارت میں جمعیۃ علماء ہند کے آٹھ اجلاسِ عام منعقد ہوئے جن کی صدارت خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے فرمائی۔

تحریک آزادی میں جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابر بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ کے کارنامے ہندستان

کی تاریخ کا ایک انتہائی روشن اور تابناک باب ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد ان کے جانشین شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جس بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے ساتھ انگریزی سامراج کو للکارا اور اپنے فکر و عمل اور جہد مسلسل کے ذریعہ ملک کی تحریک آزادی کو ایک نئی سمت عطا کی اسے اگر جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسہائے عام کے ان کے خطباتِ صدارت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ نہ صرف ایک جید عالم دین اور مخلص باصفا انسان تھے بلکہ وہ تحریک آزادی کے ایک ایسے عظیم مجاہد بھی تھے جنھوں نے آزادیٔ ہند کی تحریک کو ایک نئی قوت بخشی۔ انھوں نے قومی اتحاد کے لیے جو لائحۂ عمل پیش کیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس پنجم بمقام کوکناڈا (۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ تا جنوری ۱۹۲۴ء) کے خطبۂ صدارت میں ملک کے اس وقت کے حالات پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا:

"..... جبکہ ہندستان، مسلمانوں کا دوسری قوموں کی طرح وطن ہے یہاں ہی ان کو رہنا اور بسنا ہے اور یہاں ہی جینا اور مرنا۔ یہاں ہی ان کو بود و باش اختیار کرنا ہے اور یہاں ہی توالد و تناسل کے ثمرات کو پھیلانا۔ یہاں ہی ان کو کھانا پینا ہے۔ اور یہاں ہی اسباب زندگانی کو پیدا کرنا اور ان کے حصول کی صورتیں عمل میں لانا۔ یہاں ہی ان کو خدا کی عبادت کرنا ہے اور یہاں ہی ہر قسم کی مادی اور روحانی ترقیاں کرنا ہے۔ پھر کیونکر احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کو ایک لحہ اور ایک سانس کے لیے ہندستان کی بہبودی اور اس کے قیود شاقہ سے آزاد ہونے سے غفلت کرنا اور سستی برتنا درست ہو سکتا ہے۔ اس غلامی سے جو نقصانات مالی اور ملکی اقتصادی اور معاشرتی وغیرہ وغیرہ ہندستان کے دوسرے باشندوں کو پہنچ رہے ہیں، وہی یا اس سے زائد مسلمانوں کو پہنچ رہے ہیں اس لیے سیاسی اور پولیٹکل حیثیت سے جس طرح اور قوموں کا فرض ہے کہ جلد از جلد غلامی کے جوؤں کو اپنے کندھوں سے اُتار کر ڈال دیں اسی طرح مسلمانوں کا بھی یہی فرض ہے۔ موجودہ حکومت نہ ہندستانیوں کے انسانی حقوق کی محافظ ہے نہ ملکی اور وطنی ضروریات کی متکفل، نہ مذہب کا احترام کرتی ہے نہ ان کی قومیت کا۔ نہ بیرون ہند ہندستانیوں کی کوئی وقعت شمار کی جاتی ہے۔ نہ اندرون ہند۔ نہ دیگر قومیں اور دوسری حکومتیں ہندستانیوں کو ان کی غلامی کی وجہ سے کوئی حقوق دیتی ہیں نہ برٹش گورنمنٹ ہندستان کی تجارت خیر خواہ ہے، نہ تعلیم کی نہ ان کی صنعت و حرفت کی پاسدار ہے نہ ان کے فقر و افلاس کی۔ نہ ان کی ترقی کی کوئی فکر ہے نہ ان کی زندگانی کی۔ ان وجوہ اور دیگر

ضروریات سیاسیہ کی بنا پر جن کا تذکرہ پہلے اشارۃً اور صراحتاً ہو چکا ہے ضروری ہے کہ ہندستان کے رہنے والے مسلمان ہندستان کی آزادی کی کوشش میں کسی طرح دریغ کو روا نہ رکھیں۔ دوسری قوموں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ ان سے آگے قدم زن ہوں اور ہر طریقِ عمل میں نہایت پختگی سے کام کریں۔''

ہندو مسلم اتحاد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''ہندستان کی آزادی کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان میں سب سے زیادہ اہم اور ارفع اور مفید تر ہندو مسلم اتحاد یعنی ہندستانی آبادی کا اشتراکِ عمل ہے چونکہ اس امر میں بہت سی بے چینیاں رونما ہو رہی ہیں اس لیے باوجود قلت وقت قدرے روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ عرائض سے معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی فرائض میں سے ہے کہ ہندستان کی آزادی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور گورنمنٹ کا جب تک کہ وہ اپنے مقاصد نہ منوالیں مقابلہ کرتے رہیں یہ فرض ان پر ہر حال میں ہے خواہ وہ تنہا ہوں یا ان کے ساتھ کوئی دوسرا فریق بھی ہو۔ البتہ ہر دو حالت میں طریق کار میں فرق ہو سکتا ہے کیونکہ ایک کام کو اگر دس آدمی مل انجام دیں گے تو اس کی اور صورت ہو سکتی ہے اور اگر ایک آدمی انجام دے گا تو اس کا طریق دوسرا ہوگا ساڑھے تینتیس کروڑ کا طریق مقابلہ دوسرا ہو سکتا ہے اور سات کروڑ کا دوسرا۔

چونکہ ہندستان مختلف المذاہب قوموں کا مسکن ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کے لیے خواہ وہ ترقی کے میدان میں گامزن ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ وہ آزادی اور سوراج کے لیے کوشاں ہوں یا نہ ہوں محض بود و باش اور امن و امان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسن معاشرت اور اخلاق حسنہ کو کام میں لائیں عالی ظرفی اور رواداری کے قانون کو پوری طرح ملحوظ رکھیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آیات قرآنی اس امر کے نہایت تاکیدی احکام بتلا رہی ہیں جن میں تمام دنیائے انسان کے ساتھ بلا تمیز مذاہب حسنِ اخلاق اور مکارم اعمال کی تاکید فرمائی گئی ہے۔''

اجلاس پنجم کے بعد آپ نے مستقل دور صدارت میں سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کے بارہویں اجلاس عام بمقام جون پور (۷ تا ۹ جون ۱۹۴۰ء) کی صدارت فرمائی۔ اپنے انتہائی اہم اور وقیع خطبۂ

صدارت میں ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے مسلمانوں کو حوصلہ بخشنے اور انھیں تحریک آزادی میں ہراول دستہ کا رول نبھانے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''محترم بزرگو! حالات موجودہ اور زیادہ مجبور کرتے ہیں کہ آزادی ہند کے لیے اپنی مساعی میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی عمل میں لائی جائے اور تمام خلق خدا کو عموماً اور اہل ہند کو خصوصاً اسی ذریعہ سے ہر قسم کے عذاب الیم سے نجات دلائی جائے، ہماری غلامی نہ صرف ہمارے لیے باعث مصائب و آفات ہے بلکہ بہت سی غیر ہندستانی قومیں بھی اس کی وجہ سے انتہائی تکالیف میں مبتلا ہیں۔

مسلمانان ہندستان کا کسی وقت میں آزادی کی جدوجہد سے گریز یا تکاسل کرنا نہ شرعاً جائز ہے نہ سیاسۃً نہ عقلاً درست ہے نہ نقلاً اور بحمد اللہ سمجھدار اور غیرت مند مسلمان اسی عقیدہ اور عمل کے پابند ہیں، مگر افسوس کہ ناعاقبت اندیش اور کم سمجھ مسلمانوں کے بعض اعمال اور اقوال سے دشمنان آزادی اور خود اغراض لوگوں کو موقع ملا کہ انھوں نے دنیا میں مشہور کر دیا کہ ہندستانی مسلمان ہندستان کی آزادی کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ وہ آزاد خواہ قوموں کے لیے رکاوٹ بن رہے ہیں، یہ شہرت بالکل غلط اور افترا تھی بلکہ ہندستان کے مسلمانوں کا بیدار طبقہ بلکہ اکثر افراد بالکل غلامی ہند کے مخالف اور آزادی پر جان دینے والے ہیں اور بار بار اس راہ میں تکالیف شاقہ برداشت کر چکے ہیں اور آئندہ کے لیے تیار ہیں، اس لیے نہایت ضروری تھا کہ ترقی پسند اور آزادی خواہ جماعتیں مجتمع ہو کر اعلان کریں کہ کسی طرح برطانوی غلامی کو ایک منٹ کے لیے بھی پسند نہیں کرتے، ہم آزادی کے چاہنے والے اور اس کے لیے ہر ممکن قربانی پیش کرنے والے ہیں، ہم پر یہ شرمناک افترا ہے کہ معاذ اللہ ہم غلامی کو پسند کرتے ہیں۔

آپ نے اجلاس جون پور میں بھی ہندو مسلم اتحاد کے موضوع کو فراموش نہیں فرمایا آپ نے اس سلسلہ میں زور دے کر فرمایا:

''ہم باشندگان ہندستان بحیثیت ہندستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو کہ اختلاف مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے، جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات ذاتوں اور صنفوں کے تباین، رنگوں اور

قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا۔ اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندستانی ہیں ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں، اس اشتراک وطنی کے فرائض سب پر یکساں عاید ہوتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ یا کم اموری نہیں ہوتی، ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے۔"

اجلاس جونپور کے بعد ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کا تیرہواں اجلاس عام لاہور میں ۲۰ رتا ۲۲ ر مارچ ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت بھی حضرت شیخ الاسلامؒ نے فرمائی۔ آپ نے ملک کی آزادی کے موضوع پر انتہائی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی آپ نے فرمایا:

"محترم بزرگو! یہی وہ مایوس کن صورت حال ہے جس سے آج ہم گزر رہے ہیں، تباہیوں اور بربادیوں کا ایک خوفناک سیلاب ہے جو بے پاؤں مشرق ومغرب سے ہندستان کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے، دوسری طرف برطانوی حکومت کا وہ یاس انگیز طرزِ عمل ہے جس نے ہندستان کے احساس میں مزید تلخیاں پیدا کردی ہے؛ لیکن ان مایوس کن حالات میں بھی ہم اپنی تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے باوجود اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھانے کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اگر تاریخ کے اس نازک ترین دور میں برطانوی شہنشاہیت کا مقام ناقابلِ تبدیل ہے، اگر مصیبت وابتلا کی اس کٹھن گھڑی میں بھی برطانوی مدبرین کی اس تاریک ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی، تو برطانیہ اور تمام دنیا کو یہ یقین کرلینا چاہیے کہ ہم اس کی اور اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک اپنی آزادی اور خودمختاری کے نصب العین کو فراموش نہیں کرسکتے، ہم اس جابرانہ تصور کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہیں، جو ہمارے نصب العین سے متصادم ہے، اور زندگی کی ہر اس فرصت میں جس میں ہمارے لیے اپنی منزل کی طرف سفر کرنا ممکن ہے، ہم اپنے نصب العین کی طرف قدم بڑھاتے رہیں گے۔"

اجلاس لاہور کے بعد جمعیۃ علماء ہند کا چودھواں اجلاس عام بمقام سہارنپور (۴ تا ۶ ر مئی ۱۹۴۵ء)

منعقد ہوا۔ آزادی سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کا یہ آخری اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں صدر اجلاس شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے آزادی کے حصول کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

''محترم بزرگو! اس غلامی کی لعنتوں سے نکلنا اور آزادی حاصل کرنا مسلمانوں کا فرض اور نصب العین ہے اور ہندو، سکھ، پارسی وغیرہ کا بھی فریضہ اور نصب العین ہے ہر ایک اپنے لیے جدوجہد کرتا ہے اور کرے گا کسی کا دوسرے پر احسان نہیں ہے تمام باشندگان ہند اس ملعون غلامی سے برباد ہو رہے ہیں۔ ہاں مسلمانوں کا فریضہ سب سے زائد ہے کیونکہ:

(الف) مسلمان برسر اقتدار تھے انگریزوں نے اقتدار اور حکومت مسلمانوں سے چھینی ہے۔

(ب) ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے صوبہ سرحد کے مسلمان آزاد قبائل غلام بنائے گئے اور بنائے جا رہے ہیں اور اب بھی ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

(ج) ہندوستان کی غلامی کی بنا پر مسلمانوں کے ملک افغانستان پر چار دفعہ چڑھائی کی گئی اور کوشش کی گئی کہ وہاں پر مسلم حکومت کو مٹا دیا جائے۔

(د) ایران پر سے آزادی کا پرچم اتار دیا گیا۔ بالخصوص اس جنگ میں آج تک وہاں انگریزی ہندستانی فوجیں موجود ہیں اور ایران کے آزاد ہونے میں کھنڈت ڈال رہی ہیں۔

(ہ) عراق و شام دونوں جگہوں میں انگریزی ہندستانی فوجیں بکثرت پڑی ہوئی ہیں اور بروقت دونوں کو تہدید کر رہی ہیں۔ اب بھی یہی منصوبے ہیں کہ شام اور لبنان کو پھر فرانسیسی انتداب میں دے دیا جائے حالانکہ ۳۲-۱۹۳۳ء میں اس کی مکمل آزادی اور عراق سے بے تعلقی کا اعلان ہو چکا تھا۔

(و) فلسطین کے مسلمانوں کو دبانے اور ہر طرح مجبور اور محروم الملکیت کر دینے کی صورتیں برابر جاری ہیں۔ یہودی لا لا کر بسائے جا رہے ہیں ملکیت اور ثروت کی حیثیت سے تو یہودیوں کا غلبہ ہو ہی چکا تھا۔ مردم شماری کی حیثیت سے مساوات ہونے میں تھوڑا سا ہی فرق رہ گیا تھا۔

(ز) حجاز، یمن، نجد، عمان بہر صورت صوبہ ہائے عرب بروقت برطانیہ کی تہدید میں آئے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگیاں تقریباً ہندستانی ریاستوں جیسی ہو کر رہ گئی ہیں۔

(ح) وفاق عرب کی اسکیم زیر نظر اور سایہ برطانیہ جاری ہے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں کیا عرب ممالک اور عرب اقوام حقیقی آزاد ہوں گے اور کیا چالاک ڈپلومیٹک برطانیہ ان کے لیے چین اور راحت اور آزادی کامل کی زندگی حاصل ہونے دے گا اور کیا اگر وہ چاہیں بھی تو اس کمزوری کے ساتھ جوان

میں جغرافیائی سمندری اور پیداواری اور اقتصادی حیثیت سے حاصل ہے وہ مکمل آزاد ہو سکتے ہیں۔

(ط) ممالک ترکیہ، مصر، سوڈان، الجیریا، ٹونس، لبیا وغیرہ کے مسلمان تمہاری غلامی کی وجہ سے بروقت خطرے میں ہیں جب بھی کوئی موقع ہوتا ہے ہندستان سے بے شمار فوج بے شمار رسد بے شمار ہتھیار لے جا کر انھیں کچل دیا جاتا ہے۔

(ی) تمہارے احتجاج اور پروٹسٹ پر کبھی دھیان نہیں دیا جاتا خواہ خلافت کے لیے ہو، ترکوں کے لیے ہو، مقامات مقدسہ کے لیے ہو، فلسطین کے لیے ہو یا دوسری جگہوں کی مسلم برادریوں کے لیے ہو۔ غلام کی آواز میں نہیں شمار ہوتی۔ آزاد قوم خواہ یونان ہی جیسی اقلیت والی کیوں نہ ہو، دنیا میں اودھم مچا دیتی ہے مگر غلام قوم خواہ تمام دنیا کی پانچواں حصہ ہی ہو اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ تمہارے مذہبی اور وطنی ہر دو قسم کے بھائی ایسٹ افریقہ ساؤتھ افریقہ کیپ کالونی، ماریشس جزیرۂ بحر ہند جنوبی وغیرہ میں بستے ہیں ان پر سخت سے سخت قانون پاس کیے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں مگر آپ کی آواز آپ کا پروٹسٹ کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ کیا اگر آپ آزاد ہوتے تو کیا آپ کی آواز اسی طرح غیر موثر ہوتی۔

بہرحال مذکورہ بالا امور اور ایسے اور بھی متعدد امور ہیں جو کہ مسلمان پر موجودہ محکومیت اور غلامی سے آزاد ہو جانا زیادہ تر ضروری اور لازم ہونے کو بتا رہے ہیں خود ہندستان میں موجود غلامی سے جس قدر ضرر مسلمانوں کو حاصل ہوا ہے اور حاصل ہو رہا ہے ہندوؤں کو نہیں ہوا۔ اگرچہ سب کے سب برباد ہوئے اور ہو رہے ہیں مگر مسلمان بہت برباد ہوا۔"

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا مگر جن حالات میں ملک آزاد ہوا بدقسمتی سے وہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے انتہائی صبر آزما ثابت ہوئے۔ ملک تقسیم ہو گیا اور پورا ملک فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن گیا۔ جس کے نتیجہ میں سرزمین ہند کے مسلمان ذہنی جمود اور احساسِ کمتری کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات اور مایوسی اور خوف کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک بار پھر حضرت شیخ الاسلام کا وجود مسلمانانِ ہند کے لیے ایک رحمت ثابت ہوا انھوں نے ایک بار پھر اپنے جوشِ عمل اور حسن کردار سے پژمردہ اور پراگندہ مسلمانوں میں صبر واستقامت اور عزم وہمت کی لہر دوڑا دی۔ آزادی کے بعد جمعیۃ علماء ہند اور اس کی قیادت کے سامنے مسلمانوں کے مسائل اور ان کی مشکلات خاص طور پر بازآبادکاری اور فرقہ وارانہ فساد جیسے مسائل منہ پھاڑ کر سامنے آئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی قیادت میں جمعیۃ علماء ہند نے ان مسائل ومشکلات کا مقابلہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کے قدم اُکھڑے ہوئے تھے، حضرت شیخ الاسلامؒ نے دیوبند کی جامع مسجد سے انھیں صبر واستقامت اور احساسِ کمتری سے باہر نکلنے کا پیغام دیا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے دیوبند کی جامع مسجد سے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''۱۵ر اگست کے بعد بہت بڑی حد تک ہم غیر ملکی حکومت کے جوئے سے آزاد ہو چکے ہیں مگر انگریزی سیاست اب تک ہمارے خلاف کام کررہی ہے۔ حکومت کی پرانی مشین اسی طرح موجود ہے اور حکومت کے کارندوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایاداروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے وطن کو فساد اور قتل وغارت گری کے جہنم میں جھونک دیا ہے ان کی سازشوں کے سامنے حکومتیں مفلوج اور ملک کے خیرخواہ بے بس ہو گئے ہیں۔ اب یہ تمھاری ہی طاقت ہے جو ان پر فتح پاسکتی ہے اگر تم حالات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لو اور اللہ پر بھروسہ کرکے فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہوجاؤ تو اپنے وطن اور عوام کو امن کی تباہی کے اس جہنم سے نکال سکتے ہو۔ عوام کی طاقت ان سازشوں کو ملیامیٹ کرسکتی ہے۔

مسلمانوں کو رحم وکرم کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''اسلام، محبت، رحمت، امن اور سلامتی کا پیغام ہے۔ اسلام ایک لمحہ کے لیے بھی اس درندگی کو نہیں برداشت کرسکتا۔ جو لوگ مذہب کے نام پر یہ درندگی پھیلا رہے ہیں وہ اسلام کو بدنام کررہے ہیں۔ اسلام اور قساوت ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔''

آپ نے قرآن پاک اور احادیث سے اس مضمون کے متعلق بہت سے شواہد پیش کئے پھر استقامت کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''آج خوف اور بزدلی کا جو عالم ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے گھروں میں بیٹھے ڈرتے ہو، راستہ چلتے ڈرتے ہو، اپنی بستیوں میں رہتے ہوئے ڈرتے ہو۔ کیا تم انھیں بزرگوں کے جانشین ہو جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آئے تھے جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو، یوپی میں تمھاری تعداد ۸۵ لاکھ سے زیادہ ہے۔ پھر تمھارے خوف کا یہ عالم کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جارہے ہو۔ کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھ لی ہے جہاں خدا کی گرفت سے بچ سکو گے وہاں تم کو موت نہیں پاسکے گی موت سے بچ کر کہاں جاسکو گے۔

میرے بھائیو اور عزیزو! موت ڈرنے کی چیز نہیں، ایک سچا مسلمان موت سے

کبھی نہیں ڈرتا، موت کی تمنا کو اسلام نے صداقت کا معیار قرار دیا ہے۔ کفار کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے۔ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ (موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو) اگر تمھیں اسلام کی سچائی پر یقین ہے تو موت سے تمھارا یہ خوف بے معنی ہے۔ الموت جسر یوصل الحبیب الی حبیبہ۔ موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے، پھر اسلام کے نام پر جان دے دینا موت نہیں زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں ہمیں ان کی زندگی محسوس نہیں ہوتی۔''

قرآن شریف اور احادیث سے شہادت کے مراتب اور فضائل بیان کرنے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

''اس لیے جبن اور خوف اپنے دل سے نکال دو، اسلام اور جبن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر واستقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو، کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو۔ اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو ان کو سمجھاؤ لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تمھاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو، مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔ اور اپنی عزت وحرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو یہ عزت اور شہادت کی موت ہوگی۔''

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ہی پیغام تھا جس نے ہزاروں ہزار لوگوں کو سرکاری کیمپوں سے بندھے ہوئے بستروں کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے اور واپس آنے کا حوصلہ دیا۔ آزادی کے فوراً بعد جمعیۃ علماء ہند کا پندرھواں اجلاس عام (اپریل ۱۹۴۸ء) سرزمین بمبئی پر منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ داروں کو آزادی کے بعد مسلم مسائل کے تعلق سے ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

''حضرات اراکین وحامیان جمعیۃ علماء اس اعلان کا یہ اثر ہمارے دماغوں پر ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ ہماری ذمہ داریاں کم ہوگئی ہیں اور ملت اسلامیہ کی خدمت کا جو بار جمعیۃ علماء کے دوش پر ہے وہ ہلکا ہوگیا ہے۔ بیشک دائرہ عمل میں ایک حد بندی ضرور ہوگی مگر محدود دائرۂ عمل بھی وہ وسعت رکھتا ہے جس کی تکمیل کے لیے آپ کو زیادہ سے زیادہ محنت کرنی ہوگی اور اگر آپ کی سعی پیہم میں کوئی فرق آیا تو عند الناس

آپ جواب دہ ہوں گے آج ہمارے سامنے بہت سے اہم مسائل درپیش ہیں جن کا تعلق براہ راست مسلمانوں کے مستقبل سے ہے۔

آج اسلامی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ ہے اگر حکومت مذہبی تعلیم کی ذمہ داری نہیں لیتی تو ہم کس طرح مسلمان بچوں کو مذہبی تعلیم سے آشنا کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرات اراکین اس پر توجہ فرمائیں اور ایسا لائحہ عمل مرتب کریں جو اسلامی تعلیم کا ضامن ہو۔

ایک مختصر اور کامیاب صورت یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کا ہر ممبر اشاعت تعلیم کو اپنا فرض تصور کرے اور عملی علمی یا مالی امداد کا ایک معتد بہ حصہ ان مکاتب و مدارس کے لیے وقف کر دے جو مذہبی تعلیم کے لیے قائم کئے جائیں۔

ہر ایک جمعیۃ علماء تعلیم و تربیت کو اپنا فرض تصور کرے اور اپنے حلقۂ اثر میں ابتدائی مکاتب اور شبینہ مدارس قائم کر کے اس فرض کو انجام دے یہ ظاہر ہے کہ خدام جمعیۃ کی کوششوں کی مکمل کامیابی کے لیے یہ شرط ہے کہ عام مسلمان بھی اپنی اولاد کے متعلق تعلیم و تربیت کے فرض کو محسوس کریں یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے کہ قرآن حکیم نے اولاد کی تعلیم و تربیت ماں باپ پر فرض قرار دی ہے۔''

ممبئی اجلاس کے بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سولہویں اجلاس عام کلکتہ میں منعقد ہوا جس کے خطبہ صدارت میں آپ نے فرمایا:

''جہاں تک ہندستان کے سیاسی حالات کا تعلق ہے کہ مسلمانوں کو غیر فرقہ وارانہ اور مشترک طریقۂ عمل کی دعوت دی جائے گی۔ جمعیۃ علماء ہند نے یہ فیصلہ کسی مرعوبیت یا خوف وہراس کی بنا پر نہیں کیا بلکہ آزادی اور ترقی ملک کے اسی نصب العین کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جس کی بنا پر وہ ۱۵ راگست سے پہلے سالہا سال جنگِ آزادی میں پیش پیش رہی تھی۔ اس وقت وطن کو اجنبی طاقت کے تسلط سے نکالنا وقت کا سب سے اہم کام تھا اور آزادی کے بعد فرقہ واریت کو ختم کر کے متحدہ قومیت کے تصور کو پختہ کرنا اور مشترک مفادات کے لیے سیاست کو کسی مشترک پلیٹ فارم کے حوالہ کر دینا وطن عزیز کی سب سے بڑی خدمت اور ملک کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔

لہٰذا جمعیۃ علماء ہند کا یہ مشورہ کہ جہاں تک ہندستان کے سیاسی حالات کا تعلق ہے

مسلمانوں کو غیر فرقہ وارانہ اور مشترک طریقۂ عمل کی دعوت دی جائے۔ نہ صرف انڈین یونین میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت ہے بلکہ وطن عزیز کی سب سے بڑی خدمت اور اس کی تعمیر جدید کے لیے سب سے زیادہ مضبوط بنیاد ہے۔"

فروری ۱۹۵۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارہواں اجلاسِ عام کلکتہ میں منعقد ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"بہت آسان تھا کہ جمعیۃ علماء ہند سیاست کا بھی دعویٰ کرتی رہتی اور جداگانہ سیاست کے عادی کروڑوں مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر لیتی مگر یہ مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی نہ ہوتی اس کے حقیقی معنی یہ ہوتے کہ زہر کے پیالے کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی جارہی ہے اور دودھ کی نمائش کر کے سم قاتل ان کے حلق کے نیچے اُتارا جارہا ہے ملک کی ایک خیر خواہ جماعت ہرگز ایسا نہیں کر سکتی تھی، کیا مشترک انتخاب کی موجودگی میں کسی اقلیت کیلئے یہ مفید ہو سکتا ہے کہ وہ سیاسی پلیٹ فارم جداگانہ بنائے؟ سیاست کا ابجد خواں بھی اس تصور کو لغو اور ابلہ فریب قرار دے گا اقلیت کے لیے ترقی کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی قابلیت اور اپنے کریکٹر کو بروئے کار لائے اور سیاست کے میدان میں دوسرے فرقوں کے ساتھ مشترک جدوجہد کر کے اپنے کردار اور اپنی استعداد و قابلیت سے برتری حاصل کرے۔ یہ نسخہ کیمیائے حیات ہے اس کے ذریعہ اقلیت زندہ رہ سکتی ہے اور اگر وہ اخلاق اور کریکٹر کے صحیح اصول کو مستعدی کے ساتھ سنبھالتی رہے تو اقلیت کے سر کا تاج اور پیشانی کا نور بن سکتی ہے۔"

اس کے بعد سترہویں اجلاسِ عام حیدرآباد میں ۱۹۵۱ء میں ایسے حالات میں منعقد ہوا جب حیدرآباد پولیس ایکشن کا شکار ہو چکا تھا، جس سے حیدرآباد کا مسلمان بری طرح پریشان تھا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا:

"بزرگانِ محترم! جمعیۃ علماء ہند کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی اور ملی نظم و ضبط، اپنے مذہبی شعائر، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب اور ملی آثار و روایات کی حفاظت کے ساتھ ملک کا اہم عنصر اور ایک مضبوط بازو بن کر رہیں اور خاموش وطن کے بہادر محافظ اور ترقی ملک کے جانباز علمبردار ثابت ہوں، علماء حق اور پیروان ملت بیضاء کے اس یقین اور اذعان میں کبھی بھی تذبذب نہیں آیا کہ مستقبل کی

تعمیر ہوا کرتی ہے، اگر یہ بنیادیں کھوکھلی ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت مستقبل کو روشن نہیں بنا سکتی۔ کیونکہ خالق انقلاب کا قطعی اور حتمی فیصلہ ہے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۱ء تک جمعیۃ علماء ہند کا بتیس سالہ دور۔ نہ صرف جمعیۃ علماء ہند بلکہ پورے ملک کے لیے انقلابی دور رہا ہے۔ اس ہنگامی اور انقلابی دور میں جس طرح جمعیۃ علماء ہند اپنے فرائض کو انجام دینے میں اپنی پوری ہمت و کوشش صرف کرتی رہی جو مذہبی اور ملی لحاظ سے اس نے اپنے ذمے لیے تھے ٹھیک اسی طرح یہ انقلاب آفریں دور کے ان تقاضوں کو بھی پورے ایثار۔ سرگرمی اور سرفروشی کے ساتھ پورا کرتی رہی جو ملک کا ایک عنصر ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے ذمہ عائد ہوتے تھے چنانچہ ایک طرف مذہب یا کسی مذہبی شعار کے متعلق جب بھی خطرہ پیدا ہوا جمعیۃ علماء ہند کے خدام سامنے آئے اور مخالف طاقتوں کے مقابلے کے لیے اپنے سینے کھول دیے اور دوسری جانب سامراجی بدیشی حکومت کے خلاف مجاہدانہ سرفروشیوں کو لبیک کہا۔"

فروری ۱۹۵۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارواں اجلاس عام کلکتہ میں منعقد ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"اس نازک صورت حال میں جو نظام خدا کے فضل و کرم سے جفاکش اور سخت جان ثابت ہوا جس کا شیرازہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے بحال رہا۔ وہ صرف جمعیۃ علماء ہند کا نظام ہے۔ جس کے مدبر رہنما راہ و رسم انقلاب سے واقف اور جادۂ ایثار و فدائیت کے منزل شناس تھے اور پیش آمدہ ہولناک حوادث و انقلاب کے مقابلہ کے لیے اپنے اندر جرأت حق رکھتے تھے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے نظام جمعیۃ علماء کے ہمدرد و باوفا رضاکاروں اور رہنماؤں نے محبت و استقلال۔ پامردی اور حوصلہ مندی سے ہنگامی حالات کا مقابلہ کیا اور اس دور پر آشوب کی ہر ایک فتنہ انگیز انگڑائی کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گئے۔

آج ہندیونین بالخصوص شمالی ہند کا چپہ چپہ شاہد ہے کہ جس طرح ہنگامی حالات کی ہلاکت بار گھٹائیں امنڈ امنڈ کر برسیں ایسے ہی نظام جمعیۃ علماء کے پرخلوص کارکن بھی فداکارانہ خدمات کے لیے سربکف نظر آئے اور فخر و مباہات نہیں بلکہ بطور تحدیث نعمت یہ عرض کرنا بالکل صحیح اور برمحل ہے کہ اس پرآشوب دور میں جس نے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں محسوس کر کے میدان خدمت میں قدم بڑھایا اور ہر قسم کی

مشکلات وخطرات کونظر انداز کر کے بے لوث خدمات انجام دیں وہ یہی جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند نظام ہے۔

تباہی اور بربادی کے ہولناک دور میں ستم رسیدہ اور خوفزدہ مظلوموں کی بروقت امداد پناہ تلاش کرنے والوں کو پناہ گاہ تک پہنچانا۔ ان کے جان و مال کی حفاظت اجڑے ہوؤں کو بسانے کی جدوجہد، اغواشدہ بچوں اور خواتین کی بازیابی پھران کے لیے سکون واطمینان کے ذرائع مہیا کرنا، سہمے ہوئے دماغوں سے خوف وہراس دُور کرنا۔

یاس وناامیدی کی تاریکیوں میں پرامید مستقبل کی مشعل جلانا احساس کمتری کے مریضوں کو حوصلہ اور عزم وہمت کے آبِ حیات سے سیراب کرنا، کسٹوڈین اور نکاسی جائیداد کے قانون آئین میں مداخلت اس کے خلاف احتجاج اور آئینی جدوجہد بالآخر اس کو خاتمہ کے قریب پہنچادینا۔

یہ دور انقلاب کے ہنگامی تقاضے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند نے ان کو پورا کرنے میں جان کی بازی لگائی اور اللہ کے فضل وکرم سے کامرانی اور کامیابی نے اس مبارک جدوجہد کا استقبال کیا۔ اور ہم پرامید ہیں آہستہ آہستہ یہ ہنگامی حالات ختم ہوجائیں گے اور بفضلِ خدا مسلمانانِ ہند اپنا صحیح موقف ومقام حاصل کرسکیں گے۔"

جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں اجلاس عام بمقام سورت اکتوبر ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوا۔ یہ جمعیۃ علماء ہند کا حضرتؒ کی زیرِ صدارت آخری اجلاس تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے انتہائی دل سوزی کے ساتھ مسلمانوں کے روشن مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا:

"وہ سیکڑوں ہزاروں علماء جنھوں نے دار ورسن کی عاشقانہ رسم، یا قید وبند کی سنت یوسفی زندہ کی (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام) کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ آزادی کے بعد ان کو جمہوریہ ہند کی صدارت کا خوشگوار فرض انجام دینا ہوگا یا کسی وزارت کا قلمدان یا کسی سرکاری محکمہ کی قیادت ان کے سپرد ہوگی انھوں نے جو کچھ کیا ہندستان اور بیرونِ ہند کے کروڑوں مظلوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں اور دیو استبداد کی پامال کردہ قوموں کی ہمدردی، فریاد رسی اور ان کی امداد کے لیے کیا۔ کیونکہ یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور آنحضرتؐ کے ارشاد مقدس کے مطابق یہ ساری مخلوق اللہ کی عیال اور اس کا کنبہ ہے۔ جس کو اللہ سے محبت ہوگی وہ اس کی

مخلوق سے محبت کرے گا۔ جو عشق مولا میں سرشار ہوگا وہ اپنی زندگی اس کی مخلوق کی فلاح و بہبود اور اس کی اصلاح و ترقی کے لیے وقف کردے گا۔

آج خدا کے فضل و کرم سے پورے ایشیا و افریقہ اور جزائر شرق الہند میں نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے یہ خادمانِ دین متین اپنے رب کے شکر گزار ہیں کہ ان کی اور ان کے بزرگوں کی ڈیڑھ سو سالہ خدمات بارآور ہو رہی ہیں۔ والحمدللہ۔

برادرانِ عزیز! یہی جمعیۃ علماء ہند جو آپ کے سامنے ہے، روشن مستقبل کا نقشہ پیش کرتے ہوئے دعوتِ عمل دے رہی ہے۔ آیئے اب آپ اپنے عمل اور کردار سے اس کو مضبوط بنایئے۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ کے تعلق سے آپ کی فکری و عملی جد و جہد کے چند نقوش پیش کیے گئے ہیں جن سے حضرتؒ کی مجاہدانہ شخصیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بہرحال بیسویں صدی ملک و ملت کے جن ممتاز ترین افراد پر فخر کرسکتی ہے ان میں سے ایک مایۂ ناز فردِ فرید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ' کا اسم گرامی بھی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام نے ملک و قوم پر اتنے احسان کیے ہیں کہ سرزمین وطن ان کی شکر گزاری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ آپ کا شمار صفِ اوّل کے ان قائدین میں ہوتا تھا جن کے طفیل برطانیہ جیسی جابر و قاہر طاقت کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے ملک آزاد ہوا۔ ایک عظیم المرتبت پیشوائے دین کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونکی، ان کے دل و دماغ تک اسلام کی حقیقی تعلیم کی سپرٹ پہنچانے کی زبردست کوشش کی اور مذہب کی اجتماعی تعلیمات کو مجاہدانہ شان سے اُجاگر کیا۔ آپ کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا جو خدا کی مخلوق کی خدمت کے لیے تو ریشم سے زیادہ نرم رہتا ہے۔ لیکن حق و باطل کے معرکہ میں فولاد سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مکاتیب شیخ الاسلام اور ان کا سیاسی پہلو

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (ولادت ۱۵۶۴ء) کے خطوط کے بعد حضرت شیخ الاسلام کے مکاتیب تصوف، طریقت، شریعت، دعوت وارشاد، تبلیغ واشاعت اسلام، احیائے دین، تزکیہ وتعلیم کتاب وحکمت، اصلاح عقاید ورسوم، قیام ملت اسلامیہ، اتحاد بین المسلمین اور وقت کے اہم دینی تقاضوں کے مضامین کا سب سے بڑا مجموعہ ہیں۔

لیکن وقت کے مسایل میں رہنمائی کے سلسلے میں حضرت مجدد اور حضرت شیخ الاسلام کے افکار میں زمانی فرق اور عہد کے اختلاف کی بناء پر ایک بین فرق بھی صاف نظر آتا ہے، حضرت مجدد ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ عروج کے مصلح ہیں، اس وقت مسلمانوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ۱۶۲۴ء میں حضرت مجدد الف ثانی نے انتقال فرمایا۔ حضرت کے جانشینوں میں اس شان کا کوئی بزرگ نہ تھا جو ان کی تحریک کو اس انداز سے آگے بڑھاتا، لیکن ان کی دعوتِ اصلاح وارشاد کی گرمی مدت تک ہندوستان کی فضا میں باقی رہی اور اس کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری بالکل سرد نہیں ہوئی۔

اٹھارہویں کے آغاز میں حضرت مجدد کی دعوت تجدید واحیائے اسلام کے نئے دور کا آغاز حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار کے نمود اور مساعی حسنہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تجدید واحیائے اسلام کی آخری کوشش تھی جو ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر اپنے انجام کو پہنچی تھی۔

تاریخ کے نئے دور کا آغاز قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں دار العلوم دیوبند کے قیام سے کیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج

غروب ہو چکا تھا، ہندوستان میں ان کی سلطنت کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا اور ان کی سیاسی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ملت اسلامیہ ہند ایک دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اب نئے دور کے تقاضے اس کے سامنے تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے اس نئے دور میں ملی زندگی کے خصایص کے تحفظ کے ساتھ اس کے قیام کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس کے اولین مدبر شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے جانشین شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ حالات نے مسلمانوں کو اس دوراہے پر کھڑا کیا تھا جہاں انہیں فیصلہ کرنا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے وسیع تر ملی مفادات کا تقاضا کیا ہے، آیا انہیں ملک کی اجتماعی زندگی میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے یا اپنے لیے کسی گوشۂ خلوت میں عافیت کی تلاش کرنی ہے؟

بلاشبہ کسی ایسے گوشے کا تصور نہایت خوش کن تھا جہاں مسلمان اپنی علمی، تہذیبی، دینی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اپنے لیے ایک کامل آزادانہ ماحول پیدا کرنے اور اپنے ذوق و فکر کے مطابق سیاسی زندگی کا نقشہ بنانے میں آزاد ہوں، لیکن ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلمان اور دوسری اقوام معاشرتی اور سماجی زندگی میں جس طرح گھل مل گئے تھے۔(1) اس سے انہیں الگ کرنا اور کسی ایک گوشے میں جمع کر لینا ممکن نہ تھا۔ خواہ اس بارے میں کتنے ہی بلند عزائم اور نیک خواہشات کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کے وسیع تر اجتماعی مفاد کا تقاضا تھا کہ وہ پسپائی اور فرار کی زندگی کا خیال دل میں لائے بغیر ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور ملی جلی زندگی میں اپنا مقام پیدا کریں اور ایک وسیع علاقے میں مسلمانوں کے مفادات اور اسلامی دعوت کے بہترین ثمرات اور ملک کے طول و عرض میں اسلامی زندگی کے نشانات، تہذیبی علامات، تاریخی آثار اور اپنے عظیم الشان علمی اور تاریخی اداروں اور مرکزوں کی وراثت سے دست بردار نہ ہوں، خواہ انہیں اس راہ میں وقت کی تلخ کامیوں کا سامنا کرنا پڑے۔

حضرت شیخ کے سامنے زندگی کے جو مسایل اور وقت کے جو تقاضے تھے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے لیے مسلمانوں کے دورِ عروج اور عہد اقتدار کاملہ میں ان کا تصور بھی ممکن نہ تھا، حضرت شیخ الاسلام نے دعووں کی بلند آہنگی اور ظاہری خوش نمائی کے مقابلے میں مسلمانانِ ہند کے وسیع تر اجتماعی مفاد کی راہ کو اختیار فرمایا، اگرچہ انہیں اس راہ پر چل کر شدید ترین مخالفتوں اور اپنوں اور بیگانوں کی نفرتوں کا ہدف بننا پڑا۔

---

(1) لیکن یہ بات سے تقاضا نہیں کی جا سکتی کہ مسلمانوں نے اپنے مذہبی اختیارات اور تہذیبی خصایص کو مٹا دیا تھا یا ان کی مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں بند ہو گئی تھیں یا دعوت و ارشاد کے تقاضوں اور اصلاح و اجتماع ملی کی ضرورتوں کو فراموش کر دیا تھا یا اجتماعی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی پہچان مٹ گئی تھی یا سو باتوں کی ایک بات کہ کہہ دیا جائے کہ مسلمان مسلمان نہیں رہے تھے۔ ایسا ہرگز نہ ہوا تھا۔

حضرت مجدد کی دعوت مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی زندگی کے قیام کی عظیم الشان تحریک تھی جس کے اثرات مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کی زندگی اور ان کی اصلاحی اور اسلامی تحریکوں پر صدیوں کے بعد آج تک موجود ہیں، لیکن جو دور حضرت شیخ الاسلام کو ملا تھا اس میں حضرت مجدد کی دعوت کے داخلی رخ ہی سے کام لیا جاسکتا تھا، ملک کی ملی جلی اور اجتماعی زندگی کے لیے اس میں کوئی رہنمائی نہ تھی۔ حضرت مجدد کی دعوت کا ایک پہلو کہ غیر مسلموں اور ہنود کو رسوا کرو، ذلیل کرو، انہیں قتل کرو، ان کی قوت مٹا دو، ان کا زور توڑ دو، انہیں سیاسی زندگی میں اقتدار سے الگ کر دو تا کہ وہ عزت کی زندگی سے محروم ہو جائیں اور سر اٹھا کر نہ چل سکیں، نہ جہانگیر و شاہجہاں کے دور میں قابل عمل ٹھہرا تھا، نہ عالمگیر کے عہد سعادت تک اس پر عمل کیا گیا اور نہ کیا جاسکتا تھا، حضرت شیخ الاسلام کے عہد کے تقاضے تو بالکل ہی مختلف تھے، اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے وہی لائحہ عمل درست تھا جس کی طرف حضرت شیخ الاسلام نے رہنمائی فرمائی تھی، مجھے یقین ہے کہ اگر اس دور میں حضرت مجدد بھی ہوتے تو اسی سلطان وقت اور اسکندر عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

جانشینی شیخ الہندؒ:

حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے عہد میں حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک کے سب سے بڑے رہنما تھے، ان کے سلسلۂ فکر میں اس روایت کی بڑی اہمیت ہے جو ان کے عہد کو حضرت شاہ صاحب کے عہد اور ان کی تحریک سے ملاتی ہے۔ اس روایت کی شخصیات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا مملوک علی، حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق وشاہ محمد یعقوب اور حضرت شاہ عبدالعزیز (رحمہم اللہ اجمعین) تھیں، یہ شخصیات مستقل بالذات بھی تھیں اور الگ الگ نظام شمسی کی مالک تھیں جن سے علم وفضل کے بہت سے ثوابت وسیارے وابستہ تھے، ایک دوسرے دائرے میں بھی حضرت حکیم الہند کی روایت موجود تھی لیکن تاریخی اور روایتی طور پر یہ سلیم کرنا پڑتا ہے کہ دار العلوم دیوبند کے قیام کے بعد تحریک ولی اللہی کا مرکز دہلی سے دیوبند منتقل ہو گیا تھا اور اسی سے متعلق علماء کی ایک جماعت اس روایت کی امین اور تحریک کی داعی تھی، بعد میں جب جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا اور حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی اور ان کے بعد حضرت شیخ الاسلام اس کے صدر ہوئے اور اس دائرے (دہلی مرکز) کے علمائے کرام نے بھی اس کے انداز فکر، نظام اور لائحہ عمل کو اختیار فرمالیا تو گویا ولی اللہی فکر کے مرکز دہلی کے انتقال دیوبند پر تاریخ کی مہر لگ گئی۔

بلاشبہ حضرت شیخ الہندؒ زندہ رہتے اور انہیں جمعیت علما کی رہنمائی کا موقع ملتا تو وہی اس نظام فکر کی

مرکزی شخصیت ہوتے لیکن حضرت کو زندگی نے مہلت نہ دی، حضرت مفتی اعظم کے ذوق علمی وصحت نے زیادہ دنوں تک جمعیت کی رہنمائی کی اجازت نہ دی، پھر بھی حضرت مفتی صاحب جمعیت علماء کی تاریخ کی ایک قابل احترام اور صف اول کی شخصیت تھے، جمعیت علماء کی رہنمائی کا سب سے زیادہ طویل عرصے تک حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کو موقع ملا، ان کا بواسطۂ شیخ الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ سے نہایت قوی تعلق تھا اس لیے وہ نہ صرف جانشین شیخ الہند تھے بلکہ اپنے وقت میں حضرت امام الہند محدث دہلوی کی وراثت فکری اور فلسفۂ عمرانی وسیاسی کے سب سے بڑے داعی اور رہنما بھی تھے۔

حضرت شیخ الاسلام کو نہایت طویل زمانے تک کامل یکسوئی کے ساتھ حضرت شیخ الہند کی صحبت اور تعلیم و تربیت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا تھا، وہ شیخ الہند کے ذوق ومزاج کے سب سے بڑے آشنا، ان کے افکار کے سب سے زیادہ واقف اور عزائم کے راز داں تھے، حضرت نے اپنے دور صدارت میں اور اس سے پہلے انہیں افکار وعزائم کے مطابق جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی فرمائی۔

حضرت شیخ الاسلام کا نظام فکر وعمل:

جمعیت علمائے ہند وقت کسی سیاسی تحریک یا جماعت کی طفیلی تھی، نہ کسی سے متاثر اور نہ حضرت شیخ الاسلام کے فکر پر وقت کے کسی سیاسی فلسفہ ونظام کی چھاپ تھی، جمعیت علماء کا پورا نظام فکر مستقل بالذات تھا، اس نے سیاسی زندگی کے میدان اور قومی وملی تحریکوں میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے اپنے غور وفکر کے نتیجے میں اس کی اپنی صواب دید پر تھا، حضرت شیخ الاسلام کی صدارتِ جمعیت کے بہت تھوڑے عرصے بعد ہی جمعیت کے نظام فکر وعمل اور حضرت کے وجود گرامی کا افتراق اور دوئی ختم ہو گئی تھی اور جمعیت کی صورت میں حضرت کے سیاسی، عمرانی، تعلیمی، دینی اور تہذیبی افکار کا ایک نظام اور لائحہ عمل نمایاں ہو گیا تھا یا جمعیت علماء کا نظام فکر وعمل میں متشکل ہو کر حضرت علیہ الرحمہ کی شخصیت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام نے کبھی کسی رجعت پرستانہ فکر وتحریک سے مفاہمت نہیں کی اور بغیر سوچے سمجھے وقت کی کسی انقلابی اور قومی تحریک کا ساتھ بھی نہ دیا۔ حضرت کے نظام فکر کا ذرا بھی غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر فکر اور عمل کا ایک دائرہ ہے اور ہر قسم کے کام ان حدود اور دائروں ہی میں انجام پاتے ہیں مثلاً:

۱- سب سے پہلے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے تقاضے اور ضرورتیں سر اٹھاتی ہیں، حضرت ان ضرورتوں کے مطابق مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ ابتدائی اسلامی مدارس کے قیام، تبلیغ واشاعت اسلام، تنظیم واتحاد بین المسلمین کے سرزمین ہند میں سب سے بڑے داعی اور مبلغ تھے، تاریخ کے

ایک دور میں متعدد حضرات نے نہایت جوش کے ساتھ اسلامی مدارس کے قیام، مناظرین کی تربیت تبلیغ واشاعت اور اتحاد و تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا، اس مقصد کے لیے جماعتیں اور انجمنیں قایم کیں، رسالے نکالے، مناظرین کے دستے تیار کیے اور اپنے اوقاتِ عزیز کو ان کاموں کے لیے وقف کردینے کے عزایم کا اظہار کیا، لیکن یہ تمام ولولے وقتی ثابت ہوئے، حضرت شیخ الاسلام کے نزدیک یہ کوئی کام بھی وقتی اور کسی خاص تحریک سے متاثر ہوکر کرنے کا نہ تھا، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور ان کے ملی تشخص کے قیام واستحکام کے لیے دائمی اور مستقل ضرورت تھے۔ جمعیت علماء کے نظام میں ان کے مستقل شعبے قایم تھے اور ۱۹۴۷ء تک جمعیت کی ۲۸ سالہ زندگی میں یہ شعبے کبھی اپنے رہنما کی عدم توجہ کا شکار نہ ہوئے، نہ ان کی سرگرمیاں ماند پڑیں؛ بلکہ ہر آنے والے دور میں نہایت زور وشور کے ساتھ ہر دایرے میں کام ہوتا رہا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے سب سے زیادہ کام کے آدمی پیدا کیے، سب سے زیادہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ بیدار کیا، سب سے زیادہ تبلیغی، اصلاحی لٹریچر مہیا کیا، اسلامی مدارس کے قیام میں سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور پورے ملک میں اسلامی مدارس کا جال بچھادیا۔ اس نے مناظرین اسلام کی تربیت کا خواہ کوئی مدرسہ نہ کھولا ہو، لیکن اسلام کی تبلیغ واشاعت اور فتنۂ ارتداد کے انسداد کے لیے سب سے زیادہ مخلصین اسی نے پیدا کیے اور سب سے زیادہ منظم اور نتیجہ خیز تحریک اسی نے چلائی۔ اسی طرح جمعیت علمائے ہند کے تمام بزرگ اور خورد اگرچہ اپنے معتقدات میں نہایت راسخ اور اپنے مکتبِ فکر سے نہایت قوی تعلق رکھتے تھے، لیکن اتحاد بین المسلمین کی سب سے اہم اور موثر تحریک جمعیت علمائے ہند ثابت ہوئی۔

۲-مسلمانوں کی ملی واسلامی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے داخلی امور کی انجام دہی کے ساتھ قومی اور دستوری سطح پر شریعت بل پاس کرانے، قاضی ایکٹ کے نفاذ اور اسلامی اوقاف کی تنظیم واصلاح کے لیے جو مردانہ وار جنگ لڑی گئی اور اس کا سہرا جمعیت علمائے ہند کے سر ہے اور جمعیت کی رہنمائی کا فخر سب سے زیادہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی کو حاصل ہے۔ اگرچہ حضرت نے اس پر فخر کا کبھی اظہار نہیں فرمایا۔

۳-قومی سطح پر اور ملک کی اجتماعی زندگی کے دایرے میں اسلامی عقاید وشعایر کے تحفظ کے لیے کوششیں کی گئیں، جمعیت علمائے ہند نے ہمیشہ ان تجویزوں اور قراردادوں کی مخالفت بھی کی جو کسی قومی یا غیر قومی جماعت یا کسی فرد یا حکومت کی طرف سے پیش کی گئیں۔ سول میرج کے بل اور شاردا ایکٹ کی اس بنیاد پر مخالفت کی گئی کہ اس سے اسلامی زندگی کی روایت، اس کا تشخص اور استحقاق مجروح ہوتا تھا، اور یہ شریعت اسلامی میں ایسی مداخلت تھی کہ اگر ایک مرتبہ اس کی اجازت دے دی جاتی تو پھر اس دروازے کا بند کرنا ناممکن

جاتا اور دشمنوں کو اسلامی فکر اور اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے ایک نظیر مہیا ہو جاتی۔

اسی طرح جمعیت علما کے اکابر نے جس کے سرخیل مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، ہر اس تجویز و تحریک کی مخالفت کی جو مسلمانوں کے ملی و اجتماعی مفاد اور اسلامی عقاید کے خلاف پائی گئی اور اس میں کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے تعلق اور اس کا احترام مانع نہ ہوا۔ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ناکافی یا خلاف پایا تو اس کی مدلل مخالفت کی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی خامیوں کو بتایا، واردھا تعلیمی اسکیم اور ودیا مندر کی اسکیم کو مسلمانوں کے دینی و تہذیبی افکار و روایات کے خلاف پایا تو اس پر تنقید کرنے میں زبان و قلم نے کوتاہی نہ کی، بندے ماترم کا قومی نغمہ اسلامی عقاید سے ٹکرایا تو اس کی قومی حیثیت تسلیم کرنے اور مسلمان بچوں سے اس کے بول کہلوانے سے صاف انکار کر دیا، حال آں کہ اس کا سخت سے سخت جملہ بھی شاعر اسلام کے اس مصرعے ''خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے'' اور اس جیسے بہت سے مصرعوں اور شعروں سے زیادہ سخت اور شرم ناک نہ تھا اور جب گاندھی جی کی پرارتھنا کے گیت یا ان کے پسندیدہ بھجن کے بعض جملوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ایک لمحے کے لیے بھی گاندھی جی سے تعلقات اس بات کے کہنے میں رکاوٹ نہ بنے کہ یہ ان کی اپنی پسند اور ان کا ذاتی فعل ہے اور ان کا احترام یہ کہنے میں ہرگز مانع نہ ہوا کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کے عقاید کے خلاف ہے اور کوئی مسلمان بہ قایمی ہوش و سلامتی ایمان اسے اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔

۴۔ ملی استحقاق کو منوانے کے لیے جمعیت علمائے ہند جس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام تھے، ہمیشہ سینہ سپر رہی، خواہ وہ محرم کے جلوس کی بندش ہو یا ذبیحہ گاؤ کی ممانعت یا کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی بات خواہ اسلام کے کسی حکم کے مطابق نہ ہو رہی ہو لیکن اگر مسلمانوں کا کوئی فرقہ اسے اپنے عقاید کا جز سمجھتا ہے اور کسی جانور کا ذبیحہ اسلام کی بخشی ہوئی آزادی اور اجازت کے مطابق ہو رہا ہے تو یہ فیصلہ کرنا کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہے مسلمانوں کا داخلی اور تہذیبی ملی اصلاح کا مسئلہ ہے، حکومت کو اس میں مداخلت اور حکم نافذ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ محرم کے جلوس کی اباحت اور کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام بھی اسلام کی تعلیم یا اس کے کسی جزیے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، ذبیحہ گاؤ کی بھی اجازت تھی بنی اسرائیل کے گائے کی طرح ذبح کا حکم قطعی نہ تھا، لیکن حکومت اس معاملے میں حکم نافذ کر کے جس دروازے کو کھول رہی تھی اس کے کھل جانے کے بعد اس کی دست درازیوں سے اسلام کا کوئی حکم قطعی بھی محفوظ نہ رہ سکتا تھا، یہ معرکہ جمعیت علمانے حضرت شیخ الاسلام کی صدارت میں سر کیا تھا۔

۵۔ قومی اور ملکی سطح پر جمعیت علمائے ہند اور اس کے اکابر نے ہر اس تحریک میں بھر پور حصہ لیا

جو ہندوستان سے برٹش استعمار کی جڑوں کو اکھاڑنے والی اور آزادی کی منزل کو قریب لانے والی ہو اور اس کے لیے کبھی کسی جانی و مالی ایثار سے دریغ نہ کیا، خواہ ترک موالات کا پروگرام ہو، بدیشی اشیا کے ترک یا کھدر کے استعمال کی دعوت ہو، سول نافرمانی یا ستیہ گرہ ہو یا ہندوستان چھوڑ دو کا اعلان جنگ ہو، یا کسی ریاست میں عوام کے مسایل میں رہنمائی کا مسئلہ ہو، جب بھی اس نے کسی تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو یہ اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ تھا اور اس کی اپنی صواب دید پر منحصر تھا، کسی جماعت کی تقلید سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہ ہوا، جمعیت علماء کا فیصلہ ہمیشہ اسی اصول پر مبنی رہا کہ اس کا تعلق نہ صرف ہندوستان کی آزادی اور ملک کے عوام کے اجتماعی مفاد سے تھا بلکہ مسلمانوں کا ملی اور اسلامی مفاد بھی اسی امر کا مقتضی تھا۔

۶- مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء کے وسط میں حضرت شیخ الاسلام ہندوستان تشریف لائے تھے، اسی وقت سے ملک میں چلنے والی تمام قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا، لیکن جب بھی کسی تحریک یا پروگرام میں کسی جماعت سے اشتراک عمل کیا تو اپنے تئیں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بالکل اس کے حوالے نہ کر دیا بلکہ اپنے جماعتی فیصلے کے مطابق، اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ مسلمانوں کے ملکی اور بیرون ملک کے مسلمانوں کے عمومی مفاد کے پیش نظر کیا، ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت ہمیشہ پیش نظر رہی لیکن ہمیشہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ، حضرت شیخ الہندؒ کی نصیحت کے مطابق!

۷- جمعیت علمائے ہند کے تمام ارکان اور حضرت شیخ الاسلام فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے اپنی تمام ذاتی اور جماعتی صلاحیتیں اور وسائل کو بروئے کار لائے، مسلمانوں کو نظم و ضبط اور تحمل کی تلقین کی، اپنی طرف سے کبھی آغاز نہ کرنے کی تنبیہ کی، لیکن مقابلے میں قدم پیچھے نہ ہٹانے کا بھی مشورہ دیا اور ہجرت کے مقدس نام پر بزدلانہ فرار کے مقابلے میں بہادرانہ موت کو ترجیح دینے کی تلقین کی، جو لوگ فساد میں مظلومانہ مارے گئے تھے ان کی موت کو شہادت کی موت قرار دے کر حالات کے مقابلہ و مقاومت کے لیے جذبہ پیدا کیا۔

۸- ملکی زندگی کے دایرے میں مسلمانوں کو اپنے فرض کا احساس دلانے کے لیے حضرت شیخ الاسلام کو نظریۂ قومیت کے حوالے سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن حضرت کی پوری زندگی اور اس کے معمولات اس کے گواہ ہیں کہ اس متحدہ قومیت کے قیام کے لیے نہ تو حضرت نے مسلمانوں کی علاحدہ تنظیم، اسلام کی تبلیغ، مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت کو نظر انداز کیا، نہ ان فرایض کی ادائیگی میں کبھی ایک شمہ کی کوتاہی واقع ہوئی، نہ حضرت کی وضع و قطع، معمولات روز و شب اوراد و اذکار، سحر خیزی و عبادت گزاری، درس حدیث، تعلیم و ارشاد، مراسلت اور اسفار و تقاریر کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت اسلامی میں کوئی فرق آیا بلکہ آپ نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا واحد راستہ یہ بتایا کہ صرف نام کے مسلمان نہ ہوں۔

عادات واطوار، سیرت وخصایل اور وضع وقطع سے بھی مسلمان نظر آئیں۔ ہمارے نزدیک تو حضرت کے نظریۂ متحدہ قومیت کا وہی مفہوم تھا جو حضرت کی وضع وقطع، شکل وصورت، آپ کے معمولات روز وشب اور ملی وظائف وخدمات میں آپ کے ذوق وانہماک سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تمام کارنامے حضرت شیخ الاسلام کے نظام فکر کے مطابق الگ الگ اور مختلف دایروں میں انجام پاتے رہے، یہی حضرت کی سیرت کے خصایص ہیں اور یہی جمعیت علماے ہند کے زریں کارنامے ہیں، حضرت کے خطوط، خطبات اور بیانات سے یہ نظام فکر اور کارنامے ثابت ہیں۔

۹- حضرت شیخ الاسلام کا نظام فکر صرف مسلمانوں کی ملی اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں ہی کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ جس طرح ہماری زندگی فرد سے خاندان، خاندان سے برادری اور سوسائٹی اور اس سے آگے ملکی اور قومی دایرے میں نمایاں ہوتی ہے اور قومی وملکی دایرے سے بلند ہو کر زمین کے زیادہ وسیع علاقوں اور خطوں کو محیط ہوتی ہے، مثلاً ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ اور ان وسیع علاقوں کے حالات ومسایل اور مشترکہ انسانی فلاح وبہبود کے تقاضے، انسانی فرایض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح ایشیا، یورپ اور افریقہ کی ارضی سطح سے اوپر کل انسانیت کی سطح نمودار ہوتی ہے اور متحدہ انسانیت کے تقاضے سامنے آتے ہیں، انسانی نقطۂ نظر رکھنے والے شخص کے لیے خصوصاً اس شخص کے لیے جو الخلق عیال اللہ کے عقیدے پر ایمان رکھتا ہو، ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ شخصی مفادات، خاندانی، جماعتی بہبود یا ملک یا اس سے اوپر کسی خاص براعظم یا خطۂ ارض کی فلاح وترقی کے نظریے پر اس کی سعی اور عمل کا قدم اور ذہنی وفکری ترقی کا سفر رک نہ جائے بلکہ وہ اس مقام سے بلند ہو کر تمام خلق اور کل نوع انسانی کی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات کے بارے میں سوچے۔

حضرت شیخ الاسلام کے نظام فکر کا یہ آخری نقطہ ہے، یہی انسانی اور یہی اسلامی اندازِ فکر ہے اور اس کو سامنے رکھ کر حضرت کے فکر کی بلندی اور سیرت کی عظمت کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ الاسلام نے مسلمانوں کی انفرادی زندگی میں تعلیم وتزکیہ کی ضرورت سے لے کر عائلی نظام کی اصلاح، ملک کی عام معاشرتی اور سماجی زندگی میں رہنمائی اور پھر ایک عالمی انسانی معاشرے (یونیورسل سوسایٹی) کی تعمیر تک انسانی زندگی اور اجتماع کی تمام ضرورتوں کو نظر میں رکھا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی کے علاوہ برصغیر کے سارے طبقۂ علما میں حضرت شیخ الاسلام واحد شخصیت ہیں، جن کی تحریرات، خصوصاً مکاتیب میں ایک عالمی انسانی معاشرے یا متحدہ انسانیت کا نہ صرف تصور ملتا ہے بلکہ حضرت نے ایسے واضح اشارے کیے ہیں جن کی رہنمائی میں عالمی انسانی معاشرے کا پورا نظام فکر وعمل مرتب کرلیا جاسکتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے مکاتیب تاریخی و سیاسی مباحث اور مذہب میں اس کے تمام علوم وفنون اور ان کے متعلقات کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں، تصوف وطریقت، اصلاح وتہذیب، تعلیم وارشاد، ذکر واذکار اور ادووظائف، مراقبہ ومجاہدہ کے مضامین الگ ہیں، کئی خطوط اسلامی زندگی کے خصائص اور اس کے اختیار کرنے کے فواید میں ہیں اور گویا کہ بصائر وعبر کا گنجینہ ہیں، فلسفے کا ذوق آپ میں نہ تھا لیکن مذہب وفلسفہ کی تفریق کے مطابق حضرت شیخ الاسلام کے وہ خطوط جو مذہب کے دفاع اور خدا کے وجود کے اثبات میں ہیں اور جن میں مذہبی عقاید سے استدلال کے بجائے عقلی دلایل سے کام لیا گیا ہے وہ بنیادی طور پر فلسفے کا مضمون بن جاتا ہے۔ حضرت نے مذہب کے دفاع میں جو طرز استدلال اور اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے، اس سے ایک جدید علم کلام کے اصول وضع کیے جاسکتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام عام معنوں میں مدبر نہ تھے یعنی ایسی شخصیت نہ تھے جو اپنے افکار کی تالیف وتدوین میں مصروف رہتی ہے اور جس کا فکر آفریں دماغ نت نئے نکتے پیدا کر کے دنیا سے تحسین وآفرین کا خراج وصول کرتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ایک خالص عملی انسان اور صاحب فکر سیاست داں تھے اور جن خطوط میں آپ نے سیاسی افکار ومسایل یا کسی قوم یا جماعت کی سیاسی تاریخ اور کردار کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، وہ وقت کے سیاسی مسایل اور حالات کے تقاضے کے حوالے سے ہے، نہ کہ محض فکر آفرینی کے شوق میں! اگر آپ کے دور میں وہ سیاسی حالات اور مسایل پیدا نہ ہوتے تو آپ کو چوں کہ مدبر بننے اور اپنی حیثیت کو ثابت کرنے اور منوانے کا شوق نہ تھا اس لیے کوئی سیاسی مسئلہ چھیڑنے کی یقیناً ضرورت پیش نہ آتی، البتہ ان خطوط اور حضرت کی بعض دوسری تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ معاشرت اور سیاست میں انسانی معاشیات کی کارفرمائی کے قائل تھے اور اس بارے میں وہ اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، نیز حضرت کی یہ خوبی تھی کہ وقت کے سیاسی مسایل کو تاریخ کے تعامل اور تناظر کی روشنی میں دیکھتے تھے اور اسی کے مطابق حال ومستقبل میں عام لوگوں، مسلمانوں اور وقت کی تحریکوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔

حضرت شیخ اسلام کے خطوط کی ایک اہم خوبی آپ کا شریفانہ رویہ ہے، خطوط میں آپ نے سخت سے سخت تنقید فرمائی ہے، لیکن اس میں ذاتی عناد کا کوئی شائبہ نہیں، آپ نے شخصاً کسی کی ذات کو مورد الزام نہیں ٹھیرایا اور نہ کسی کو کسی بات کے لیے متہم کیا ہے۔ بعض مقامات پر لہجے میں جھنجلاہٹ کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ اظہار خشمگی اپنے مخاطب سے ہے جو عام طور پر حضرت ہی کا کوئی مرید، معتقد یا شاگرد ہے، ورنہ معلوم ہے کہ ایک جماعت کے اصاغر واکابر نے حضرت کی شان میں کیا کیا گستاخیاں نہ کی تھیں، لیکن حضرت کی زبان سے ان کے لیے بھی کبھی کوئی درشت کلمہ نہ نکلا، بلکہ ہمیشہ کلمۂ خیر ہی فرمایا۔

حضرت شیخ الاسلام نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطوط لکھے، بلکہ جتنے تو چھپ چکے ہیں، بحسنِ ترتیب واشاعت خطوط کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا، پچاسوں مضامین و خطبات حضرت کی قلمی یادگار ہیں اور متعدد تصانیف آپ کے ذوق تالیف و تصنیف اور علم و فضل پر شاہد عدل ہیں اور بلند پایہ مصنف تسلیم کیے جانے کے باوجود آپ کو ادیب اور صاحب طرز تسلیم کیے جانے کی طرف ابھی کسی نقاد نے توجہ نہیں کی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ کی تحریرات اور تصنیفات کے موضوعات چونکہ سیاسی، مذہبی اور اسلامی دینی مسایل اور مباحث ہیں، اس لیے ادیبوں اور نقادوں نے توجہ نہیں کی اور وہ علماء اور فضلا جو حضرت سے عقیدت وارادات رکھتے ہیں، ان کی نظر میں اسلوب تحریر و نگارش کی حیثیت نہ صرف دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی ہے اس لیے ابھی یہ فیصلہ کرنے کا وقت نہیں آسکا کہ حضرت شیخ الاسلام صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز بھی ہیں۔

میں خود بھی اگرچہ اس انداز سے حضرت کی تمام تحریرات کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں لیکن جس حد تک غور کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت کا طرز نگارش جن عناصر سے مرکب ہے ان میں صحتِ زبان کے ساتھ عام فہم اور سادہ بول چال کی زبان خاص عنصر ہے۔

عبارت تعقیدِ لفظی سے پاک اور صاف و رواں ہے، اگرچہ فقہ تصوف وغیرہ کے مطالب پر مشتمل خطوط میں علمی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور کسی بھی علم و فن کی اصطلاحات عام لوگوں کے لیے کبھی عام فہم نہیں ہوتیں، اس کے سوا آپ کی تحریر میں مشکل پسندی کے رجحان کا پتا نہیں چلتا، آپ کو عربی زبان پر مادری زبان کی طرح قدرت تھی اور عربی ادب کی تمام شاخوں اور صنفوں پر آپ کو عبور حاصل تھا، فارسی دانی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ لیکن آپ کی اردو تحریر عربی و فارسی کی مشکل تراکیب، بعید از فہم تشبیہات و استعارات سے بوجھل اور فہم کے لیے دشوار نہیں۔ آپ نے جا بجا عربی فارسی اور بھاشا کے اشعار، جملوں اور مثلوں سے اپنے افکار و مطالب کی تفہیم کا کام لیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے پیش نظر ہمیشہ مکتوب الیہ اور مخاطب کی علمی اور ذہنی سطح رہی، آپ نے جس مستفسر یا مکتوب الیہ کو جس معیار کلام کا مستحق سمجھا، اسی کے مطابق اپنی تحریر کو لفظوں اور جملوں سے تالیف فرمایا، عربی کا حکمت آمیز مقولہ "تکلموا الناس علی قدر عقولھم" آپ کی تحریر کی علمی اور فنی سطح کو متعین کرتا ہے۔

مکاتیب شیخ الاسلام کی ایک اہم خوبی وہ ہے جو ادب کے اکابر کے کلام میں تسلیم کی گئی ہے یعنی از دل ریزد و بر دل خیزد۔ آپ کی تحریر کا تعلق چونکہ دل کے سچے جذبات، نیت کے اخلاص، طبیعت کے سوز، علم کی گہرائی، عقیدے کی پختگی، تاریخ کے حقایق اور دلایل کی محکمی اور فکر و فلسفہ کے مباحث کے بجائے ہر انسان کی زندگی کے روزمرہ کے معاشی اقتصادی، تعلیمی، سیاسی، اخلاقی اصلاحی تعمیری مسایل سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے

مضامین پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتے ہیں اگر چہ ہر قاری کا تاثر جدا ہوتا ہے کوئی آپ کے دل کے سچے جذبات اور اخلاص سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر طبیعت کا سوز اثر کرتا ہے کوئی آپ کے علم کی گہرائی، مطالعے کی وسعت اور دلایل کی محکمی سے مسحور ہوتا ہے اور کوئی حالات کی سنگینی وقت کے تقاضوں اور اپنے قومی وملی فرایض سے غفلت پر چونک اٹھتا ہے، یہ اثر کم و بیش ہو سکتا ہے، لیکن ایسا کوئی قاری نہیں ہو سکتا جو کسی پہلو سے کسی درجے میں بھی متاثر نہ ہو۔

مکاتیب شیخ الاسلام کے مطالعے کے اس نتیجے کو جو اس مضمون میں میں نے مرتب کر دیا ہے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ایک بیان پر ختم کرتا ہوں۔ یہ میرے مطالعے اور اس کے نتیجے کے لیے میرا استدلال بھی ہے۔ مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح حضرت مولانا (مدنی) کے مکتوبات بھی جو کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور جو سب کے سب بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، علم و فضل اور حکمت ربانی کا گنجینہ ہیں۔ وہ علوم شریعت و تصوف کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا خاص ذوق اور ان کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ بین الاقوامی سیاسیات حاضرہ اور علی الخصوص مشرق وسطی اور ممالک عربیہ کی سیاسیات پر بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے اور اس پر برابر غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ گزشتہ سال کلکتہ میں ناگا قبایل کا تذکرہ آگیا تو مولانا نے ان قبایل کی تاریخ اور ان کی جغرافیائی پوزیشن پر اس قدر عالمانہ اور مبصرانہ تقریر کی کہ سننے والے حیران رہ گئے''۔

مولانا اکبر آبادی نے اس اقتباس میں حضرت علیہ الرحمہ کی شریعت و تصوف تاریخ و جغرافیہ، عالمی سیاسیات، خصوصاً مشرق وسطی اور اسلامی ممالک کے سیاسی حالات پر بصیرت و نظر اور مطالعہ و تدبر کی جن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے مولانا کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام خوبیاں حضرت مرحوم کے مکتوبات سے ظاہر ہیں۔

خاکسار نے اپنے ذوق کے مطابق زیر نظر تحریر میں مکتوبات شیخ الاسلام کی سیاسی تاریخی اہمیت کا جایزہ لینا چاہا تھا، لیکن اب جب کہ اس منزل سے گزر چکا ہوں اور اپنی تحریر پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ تحریر صرف سیاسی تاریخی خصوصیات کے جایزے تک محدود نہیں رہ سکی۔ اس میں شریعت و طریقت، دعوت و ارشاد وغیرہ کے مضامین اور تحریر کی لسانی ادبی خصوصیات اور اس کے اسلوب بیان کی بحثیں بھی گو سرسری ہی سہی، نقد و

ے کے دائرے سے باہر نہیں رہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ بحثیں میرے دائرے و مقصد تحریر سے باہر
ں اور اسی لیے ان پر نقد و تبصرے کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ یہ محض اشارات ہیں اور اشارات مفصل اور جامع
ی کی جگہ نہیں لے سکتے۔ میرے لیے ممکن بھی نہ تھا کہ میں اپنے موضوع کے سوا دیگر خصوصیات پر بھی تفصیل
نظر ڈالتا۔ میں اس بات کا بھی ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے خاص موضوع کا بھی حق ادا کر سکا ہوں،
طوط کی سیاسی خصوصیات کا دائرہ بھی اس سے بہت وسیع اور ان کی افادیت کا پیمانہ بھی اس سے زیادہ بلند
جس کا میں اندازہ کر سکا ہوں اور جو کچھ بیان کر سکا ہوں! اس باب میں میری رائے یہی ہے اور اس پر مجھے
ار ہے کہ:

> ''شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے مکتوبات، برِ اعظم ہند پاکستان میں مسلم افکار و سیاسیات کے تاریخی سرمایے کا بڑا ذخیرہ اور تحریک آزادیٔ وطن میں مسلمانوں کے صحیح موقف کا سچا آئینہ ہیں''۔ ■

مکتوباتی ادب اور حضرت مولانا مدنیؒ

مولانا فاروق اعظم قاسمی
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو ادب میں افسانوی اصناف کے ساتھ ساتھ نثر کی بہت سی غیر افسانوی اصناف بھی ہیں۔ اس ضمن میں مقالہ، صحافت، خاکہ، انشائیہ اور رپورتاژ وغیرہ آتے ہیں۔ انہیں میں ایک مقبول صنف خطوط نویسی بھی ہے؛ گرچہ لوگوں نے اول الذکر غیر افسانوی نثری اصناف کے مقابلے مکتوب نگاری کو زیادہ اہمیت نہیں دی؛ تاہم اس کی نثری اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے اردو زبان کا دامن نہ تو علمی حوالے سے وسیع تھا اور نہ ہی لوگوں نے اس کے لیے اس طرح کی شعوری کوشش کی جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) کے بعد دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے دیگر اسباب وعوامل میں ایک بڑی وجہ مغل سلطنت کی دفتری زبان کا فارسی ہونا تھا۔ بقول خود غالب (۱۸۶۹-۱۷۹۶ء) دس سال کی عمر سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے یعنی ۱۸۰۶ء سے ان کی شاعری کی ابتدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود غالب کی دیگر تحریری ضروریات کی تکمیل فارسی زبان ہی سے ہوتی ہے۔

خطوط نویسی کی وہی روایت دنیا کی ہر زبان میں رہی ہے اور اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اردو میں اس صنف کی تاریخ پیدائش رہی ہے جو اردو صحافت کی ہے یعنی ۱۸۲۲ء میں اس کا آغاز ہوتا ہے۔ عبداللطیف اعظمی امتیاز علی عرشی کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

جہاں تک اردو مراسلت کا تعلق ہے، صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک سب سے پرانا خط جو ملا ہے وہ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ - ۶ دسمبر ۱۸۲۲ء کا نوشتہ ہے، اس کے

کاتب نواب حسام الملک بہادر ہیں جو کہ کرناٹک کے نواب والا جاہ بہادر کے چوتھے بیٹے ہیں اور مکتوب الیہ ان کی بڑی بھاوج نواب بیگم ہیں۔

(دور قدیم میں اردو خطوط پر نظر، عبداللطیف اعظمی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، ۱۹۵۷ء، ص:۱)

بہت ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی اردو میں خطوط لکھے گئے ہوں، اس سے قطع نظر اردو مکتوب نگاری کی مضبوط بنیاد خطوط غالب سے پڑی ہے۔ حالی کے مطابق غالب کی اردو خطوط نویسی ۱۸۵۰ء کے بعد ہوئی ہے اور غلام رسول مہر نے یکم دسمبر ۱۹۴۸ء کے لکھے ہوئے خط بنام جواہر سنگھ جوہر کو غالب کا پہلا اردو خط قرار دیا ہے۔

(غالب شاعر و مکتوب نگار، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص:۱۳۶)

بہر صورت ۴۸ ہو یا ۵۰ یہ تو یچ ہے کہ غالب نے تقریباً چالیس سال تک نثر میں فارسی زبان ہی سے کام لیا، غالب نے اپنی ضعیفی اور مجبوری کے تحت اردو میں خطوط نویسی شروع کی تھی اور کسی طرح بھی اس کی اشاعت کے روادار نہ تھے۔ کچھ تو ذاتی حالت کے افشا کے پیش نظر اور کچھ اپنی شاعرانہ شہرت و مقبولیت کے منافی سمجھ کر۔ منشی شیو نرائن آرام کو خطوط کی اشاعت سے منع کرتے ہوئے غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے۔

(اردو خطوں کا مطالعہ، ساحل احمد، اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۹۸ء، ص:۱۷)

بہر نوع مرزا کے شاگرد مذکور نے استاذ کی مرضی کے خلاف ''عود ہندی'' کے نام سے غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ۱۸۶۸ میں میرٹھ سے شائع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جب ان خطوط کو توقع سے زیادہ مقبولیت ملی اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تب کہیں جا کر غالب صاحب کو بھی ان خطوط کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس طرح سے غالب نے مکتوباتی ادب میں ایک مجتہد کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔

تاریخی و موضوعاتی استناد کے ساتھ زبان و بیان کے حوالے سے بھی اردو خطوط نویسی کا اپنا ایک الگ انداز اسلوب ایجاد ہوا۔ غالب نے مراسلے میں مکالمہ اور ہجر میں وصال کا لطف عطا کیا۔ ان خطوط میں مکتوب نگاری کے فن کی اہمیت کم اور مطلق اردو نثر کو سہل و سبک بنانا زیادہ اہم ہے۔ نثر کی اسی سادگی اور بے تکلفی نے آگے ناول و افسانے کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اردو نثر کو تکلف و تصنع سے پاک کرنے اور بے ساختہ و آسان بنانے میں مکتوبات کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن افسوس کہ مکتوباتی ادب کے ضمن میں جہاں غالب و اقبال اور شبلی و آزاد کا نام آتا ہے وہاں مدارس سے جڑے ان اساتذہ کو فراموش کر دیا جاتا ہے جو براہ راست اردو ادب کے خادم نہ سہی؛ لیکن اردو

زبان کی اشاعت وترویج میں انہوں نے اہم رول ادا کیا اور بالواسطہ اردو ادب کی خدمت بھی کررہے ہیں۔ اردو مؤرخین کا یہ رویہ انصاف کے خلاف ہے۔

ادب کا مفہوم ان کے نزدیک اخلاق سوزی ہے یا اخلاق سازی اسی کو اب تک یہ طے نہیں کرپائے ہیں۔ کبھی تو روشن خیالی کے نام پر رکیک وعامیانہ مواد کو بھی ادب میں گھسیڑنے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے اور کبھی اردو زبان وادب کی جڑ خانقاہ ومدارس ہی کو سرے سے کاٹنے کی کوشش کی جاتی ہے جہاں سے اردو زبان وادب کی کونپل پھوٹی، ''معراج العاشقین'' کو اردو ادب میں نثر کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے؛ لیکن اس بات پر کسی کو غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ آخر کتاب مذکور کا موضوع کیا ہے اور اس کے مشمولات کس نوعیت کے ہیں؟

اس مختصر وضاحت کے بعد اب قلم کو اپنے اصل موضوع کی طرف موڑا جاتا ہے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دیگر علمی، دینی وملی اور اصلاحی خدمات کے ساتھ ساتھ قلمی و تصنیفی خدمات بھی انتہائی قابل ذکر ہیں۔ دوسرے موضوعات سے قطع نظر ادبی حوالے سے ان کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو کم از کم ان کی تین کتابوں کو ادب کے زمرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ (۱) سفرنامہ شیخ الہندؒ س: ۱۹۲۱ء، (۲) نقش حیات، (خودنوشت اول ودوم، ۱۹۴۲ء)، (۳) مکتوبات شیخ الاسلام، (مجموعہ مکتوبات شیخ الاسلام) مرتب: مولانا نجم الدین اصلاحی، اوّل-چہارم: ۲۰۱۲ء۔

بر سبیل تذکرہ حضرت کی مکتوب نگاری کا جائزہ پیش خدمت ہے۔ قدیم زمانے سے علمائے دین اور مصلحین امت کا یہ معمول رہا ہے کہ انہوں نے مخلوق کے رشتے کو خالق سے جوڑنے کے لیے عملی طور پر جہاں عظیم کارنامے انجام دیے وہیں اپنے علوم ومعارف کی روشنی سے بھی انسانی ذہن ودماغ کو روشن ومنور کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے تحریر کردہ خطوط کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ جدید ذرائع کی فراوانی سے قبل اپنی بات کو دور تک پہنچانے کے لیے یہ خطوط ''ماس میڈیا'' کی حیثیت رکھتے تھے۔

اردو سے ذرا ہٹ کر گفتگو کریں تو مجدد الف ثانیؒ کے علوم ومعارف کا پورا ذخیرہ ہی ہم تک ان ہی خطوط کے ذریعے پہنچا ہے۔ ان کے علاوہ حضرت تھانوی ہوں یا علامہ گیلانی، حکیم الاسلام ہوں یا پھر مولانا منت اللہ رحمانی وغیرہ ہر ایک نے خطوط کے ذریعے قابل ذکر علمی واصلاحی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان میں سے چوں کہ ہر ایک کا ذریعہ تعلیم عربی وفارسی زبان رہا ہے اس لیے ان کی زبان وتحریر پر ان دو زبانوں کے اثرات فطری ہیں؛ تاہم ان کے خطوط کا تجزیہ کیا جائے تو زبان وبیان اور اسلوب کے لحاظ سے مکتوباتی ادب کا حصہ بنے جانے کے پورے طور پر مستحق ہیں۔ ارباب ادب کو تعصب وتنگ نگاہی سے بالاتر ہوکر اور کسی بھید بھاؤ سے کام لیے بغیر ان حضرات کے خطوط کو بھی مکتوباتی ادب کا حصہ بنانا چاہیے۔

حضرت مدنیؒ بیک وقت مدرس، محدث، مصنف، مفکر، صوفی اور مصلح ودانشور سب کچھ تھے۔ وہ درس

وتدریس کے ساتھ، قومی وملی مسائل کے حل کے لیے بھی آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے۔ ملک کی آزادی کی خاطر بے پناہ مشقتوں کو جھیل کر جیلوں کو بھی آباد کیا۔

ان کی بہت سی وقیع تصانیف میں ایک خطوط کا مجموعہ بھی ہے۔ مرتب مکتوبات کے مطابق ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ مولانا احمد حسین لاہرپوری نے اس کی طرف توجہ کی؛ لیکن ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ مکاتب شیخ الاسلام کے نام سے مولوی فرید احمد صاحب کا مرتب شدہ پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا، اسی طرح خطوط کا ایک مجموعہ مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری نے تیار کیا تھا جو مسودے کی شکل میں مرتب مذکور کے ہاتھ لگا، انہوں نے پہلی جلد میں اس کو بھی شامل کرلیا۔ زیرنظر مجموعے سے نہ تو طباعت اول کے سنہ کی وضاحت ہوتی ہے اور نہ ہی مطبع کا یقینی علم ہوتا ہے؛ البتہ پہلی جلد کے مقدمے کے آخر میں رمضان ۱۳۷۰ھ کی تاریخ درج ہے۔ اسی طرح مرتب کے دیباچے سے مطبع معارف اعظم گڑھ سے اشاعت اوّل کا ادھ جھل سا اشارہ ملتا ہے۔

زیرنظر چاروں مجموعے الجمعیۃ بکڈپو دہلی ۲۰۱۲ء سے شائع ہوئے ہیں۔

یہ چھ سو خطوط چار حصوں میں ایک ہزار تین سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد پر حکیم الاسلام قاری محمد طیب ؒ نے اور دوسری جلد پر مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مقدمہ تحریر کیا ہے اور یہ دونوں جلدیں حضرت مدنی کی حیات ہی میں شائع ہوگئی تھیں، تیسری اور چوتھی جلد پر خود مرتب کا مقدمہ درج ہے بقول مرتب ۱۹۴۹ء سے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور ۱۹۶۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ان میں بعض خطوط عربی زبان میں بھی ہیں، ایسے ہی جگہ جگہ قرآنی آیات، احادیث کے ٹکڑے اور فارسی عبارات بھی ملتے ہیں، ایسے تمام مقامات پر مرتب نے ترجمے کا اہتمام کیا ہے، جہاں خطوط کی تفہیم دشوار تھی وہاں تشریحی نوٹ اور حواشی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مرتب نے بڑی عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے خطوط کی ترتیب وتدوین کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

موضوعاتی حوالے سے ان خطوط میں بڑا تنوع ہے، یہ خطوط کتاب وسنت اور شریعت وطریقت کے ساتھ ساتھ تصوف وسلوک اور ملک کی ملی وسیاسی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ ان میں بیشتر خطوط جیل اور ریل میں لکھے ہوئے ہیں، خطوط ایک لائن کے بھی ہیں اور کئی کئی صفحات پر مشتمل ایک مقالے کی شکل میں بھی، یہاں بہت سی علمی گتھیوں کا حل بھی ہاتھ لگتا ہے اور جابجا تصوف وتزکیہ کے بہتے شفاف آبشار بھی نگاہوں کو تسکین بخشتے ہیں۔ ان مکتوبات میں غموں کے کانٹے بھی ہیں اور خوشیوں کے کھلتے پھول بھی۔

مکتوب الیہ میں ملک وبیرون ملک کے سیکڑوں نامور اور بے نام شخصیات موجود ہیں، مشاہیر علما میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، قاری محمد طیب قاسمیؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا محمد اویس ندوی، نگرمی، قاضی زاہد الحسینیؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ وغیرہ کے

نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح سیاست وادب سے تعلق رکھنے والے بھی ان کے مکتوب الیہ میں شامل ہیں ان میں مولانا آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا عبدالباری ندوی، اقبال سہیل اور پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان خطوط کا اکثر حصہ اسلامی علوم ومعارف اور تصوف وسلوک کی دقیق بحثوں پر محیط ہے۔ اسی کے ساتھ ملی وسیاسی مسائل پر غوروفکر اور ان کے حل کے راستے تلاشنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ خطوط چونکہ اندرون کو پرکھنے کا ایک مضبوط وسیلہ ثابت ہوا ہے اس لیے حضرت مدنی کو جتنا ان کے خطوط سے جانا جاسکتا ہے اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف مولانا علی میاںؒ یوں کرتے ہیں:

> مولانا کے مکتوب کا مجموعہ اس وقت تک مولانا کی شخصیت وسیرت، اصلی خیالات وافکار، حقیقی ذوق ومزاج اور دینی وعلمی خصوصیات کا سب سے زیادہ جامع مرقع ہے۔

(مقدمہ جلد دوم: ص: ۵۷)

خطوط سب سے ممتاز وصف بے ساختگی، بھرپور انداز میں یہاں موجود ہے۔ موضوعات سے قطع نظر اگر اس کے اسلوب وانداز اور زبان وبیان سے بھی بحث کی جائے تب بھی یہ خطوط پورے طور پر مکتوباتی ادب کی کسوٹی پر کھرے ثابت ہوں گے۔

حضرت کے ادبی مقام ومرتبے اور انداز نگارش کو مرتب کچھ اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> وہ (حضرت مدنیؒ) عربی کے ادیب، فارسی کے اداشناس اور اردو زبان کے نثار وانشاپرداز بھی ہیں اور اپنے مفہوم ومافی الضمیر کو بہترین الفاظ، فصیح وبلیغ عبارت میں ادا کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ سارے خطوط مسلمانوں کی ایک صدی کی جدوجہد آزادی کی ایک مکمل ومرتب تاریخ ہے۔ (پیش لفظ جلد اول ص: ۶۵)

اب نمونے کے طور پر خطوط کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں: مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> مزاج مبارک، کیا آپ مجھے بتلاسکتے ہیں کہ آر، سی، دت کی تاریخ اقتصادیات ہند کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے یا نہیں؟ اور پراسپرس برٹش انڈیا، مصنفہ ولیم ڈگبی کی تمام کتاب کا بھی ترجمہ ہوا ہے یا نہیں؟ اگر یہ دونوں مترجمہ ہوکر چھپ چکے ہیں تو کہاں سے ملیں گے، ثانی الذکر کے دوباب کے مترجم چھپے ہوئے اوراق میرے پاس ہیں۔

(جلد اول، مکتوب نمبر ۲۱)

ایک دوسرے خط میں ان ہی کو لکھتے ہیں:

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، لڑکیوں کا انعام سنت نبوی ہے، مبارک ہو! اللہ تعالیٰ صالحہ اور طویل العمر کرے آمین، یہی نہیں کہ فقط سنت ہے؛ بلکہ والدین کے لیے لڑکیوں کی خوشی اور دل دہی سے پرورش باعثِ نجات اخروی اور رفع درجات بھی ہے۔

(جلد اول، مکتوب نمبر ۵۴)

اپنے ایام اسیری میں مولانا عبدالباری ندویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

آپ اس واقعہ کو سن کر روئے...... میرے محترم! یہ نانی جی کا گھر نہیں اور نہ سسرال ہے، جہاں عزت، راحت، آرام، سکون کا خیال کیا جائے، یہ سجن (جیل خانہ) ہے اور اہل وطن کا نہیں، سات ہزار میل لینے والی اس قوم کا ہے جس سے نہ ہم کو مذہبی، نہ زبانی، نہ نسلی، نہ معاشرتی، نہ وطنی، کسی قسم کا اتحاد نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس قوم کو ہم سے کوئی ہمدردی کہاں ہو سکتی ہے اور وہ کسی ہندوستانی کی عزت یا رفعت کو کب پہچان سکتی ہے۔ (جلد اول، مکتوب نمبر ۸۰)

ایک مکتوب میں سفید فام انگریزوں کے مظالم اور ان کی عیاریوں کو واشگاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصاً اور تمام ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ عموماً وہ شرمناک معاملے کیے کہ وہ ہندوستان جو کبھی جنت نشاں تھا، جہنم نشاں بن گیا، وہ ہندوستان جو کہ دولت اور ثروت کا مرکز تھا وہ جہالت اور بدینی کا چٹیل میدان ہو گیا، وہ ہندوستان جو کہ تمام دنیا کا محتاج الیہ تھا وہ سب سے زیادہ مفلس، قلاش، مسکین، فاقہ مست، بے کمال، بے روزگار، گرانی اور پسماندگی کا شکار ہو گیا۔ (جلد دوم، مکتوب: نمبر ۴۴)

ایک خط میں اپنی پیاری بیٹی کو آسام سے لکھتے ہیں:

آج ۲۰ ر رمضان ہو گئے، کئی روز سے جھڑی لگی ہوئی ہے، تھوڑی دیر میں پانی برس رہا ہے، سورج عید کا چاند بنا ہوا ہے، مینڈکوں کے گانے سے فضا گونج رہی ہے، خشکی اور پیاس کا نام بھی نہیں، روزے نہایت آرام سے گزر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے تو کامیابی ہے۔ (جلد سوم، مکتوب، نمبر ۸۰)

ایک طالب علم کو مشورے کے طور پر خط لکھتے ہیں اور کس قدر معتدل انداز ہے ملاحظہ ہو:

میرے عزیز! مولانا صاحب تجربہ کار، ذی علم، پرہیزگار، وہاں کے نشیب و فراز سے واقف، تم سبھوں کے بڑے اور ہمارے خواجہ تاش ہیں، ہم میں اور ان میں قدرے

سیاسیات میں اختلاف ہے؛ مگر اور وجوہ سے وہ مجھ سے بالاتر ہیں۔ ان کی بات مانو اور مشورے سے، اتفاق واتحاد سے کام کرو! (جلد چہارم، مکتوب، نمبر ۱۳۷)

مشہور زمانہ رسالہ ''شمع'' دہلی کے منیجر علیم اختر صاحب کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

مزاج مبارک! ''نکہت گل'' (مجموعۂ کلام) نے مشام کو معطر اور دل ودماغ کو مسرور کیا۔ جزاکم اللہ خیرالجزاء۔

حسب ارشاد نشان زدہ اوراق پر خصوصی طور پر توجہ کی گئی، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنی رضا اور خوشنودی اور قبولیت سے نوازے اور مزید توفیق عنایت فرمائے آمین۔ (جلد چہارم، مکتوب، نمبر ۵۵)

حضرت مدنیؒ کے خطوط سے ماخوذ یہ چند اقتباسات ہیں، ظاہری بات ہے ان چند جملوں سے حضرت مدنیؒ کی شخصیت کا مکمل اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی مکتوباتی ادب کے حوالے ہی سے قدروں کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ تاہم انہیں او جھل نقوش کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ ان خطوط میں نپے تلے عام فہم الفاظ، الفاظ کا انتخاب پھر ان کا برمحل استعمال قابل دید ہے۔ یہاں فصاحت وبلاغت بھی ہے اور عمدہ تشبیہات بھی، مناظر فطرت کی منظر کشی بھی دلوں کو موہنے کا کام کرتی ہے۔ ان خطوط میں نصائح اور مشورے بھی ہیں اور نظریاتی اختلاف کے باوجود اپنے معاصرین کا مکمل احترام بھی ہے۔ ان مکتوبات میں تحقیق وتاریخ بھی ہے آزادی کی زبردست جدوجہد اور تحریک بھی۔

آج ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے نام وکام اور مقام ومرتبے سے قوم کی نئی نسل کو روشناس کرایا جائے اور حضرت کے علوم ومعارف کو مزید نکھار کر ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

آج ابنائے دارالعلوم دیوبند کو بھی اور برادران مدنی کو بھی انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اکابر واسلاف اور اپنے علمی وروحانی اجداد کے بتائے ہوئے خاکوں میں کتنا رنگ بھر رہے ہیں اور ان کے دیکھے ہوئے حسین خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے میں ہم کتنے سنجیدہ ہیں؟

ہم اپنے ان علم دوستوں سے بھی پرزور اپیل کرتے ہیں جو بغیر کسی صلہ وستائش اور امتیاز وتعصب کے عظیم فنکاروں کو فراموشی کے نعرے سے باہر نکالنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی عصری جامعات سے جڑے غیر جانبدار اسکالرز سے بھی میری التجا ہے کہ وقت کے اس عظیم علمی، روحانی اور ملی رہنما کے دینی، علمی، ملی اور سیاسی مقام ومرتبے کے تعین کے ساتھ لسانی وادبی مقام کے تعین کو بھی اپنی ترجیحات کا حصہ بنائیں، اس لیے کہ جو دوسروں کو فراموشی کے غار سے نکالتا ہے وہ خود ناقابل فراموش ہوجاتا ہے۔ خدا ہمیں ان پرانے چراغوں سے روشنی لے کر تاریکیوں سے مقابلے کی توفیق دے آمین۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحؒ

بحیثیت صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

مولانا قاری ابوالحسن اعظمی
صدر شعبۂ تجوید دارالعلوم دیوبند

کسی تعلیم گاہ کے نظام تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ وہ تغیر پذیر حالات میں وقت اور اس کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہو، اسی لیے حالات کے مطابق طریقۂ تعلیم میں تبدیلیوں کا تسلسل رہا ہے۔

دورِ اوّل کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم، حدیث، فقہ اور اشعار عرب کے ضروری اسباق ہوتے تھے۔

دوسری صدی میں تفسیر، نحو، صرف، اصول فقہ، لغت اور تاریخ کا اضافہ ہوا۔

پانچویں صدی میں امام غزالی کے علم کلام کی بنیاد پڑی، فلسفۂ یونان کی رد میں منطق وفلسفہ وجود میں آئے۔

۸۰۸ھ تک یہ نصاب رہا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے نصاب تعلیم کو اسی دور میں باقاعدگی ملی، فیروز شاہ تغلق (۷۹۰ھ) پہلے شخص ہیں جنھوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دی اور ۸۹۳ھ تک نصاب میں علوم عقلیہ کا تسلط قائم ہوگیا۔

اور پھر جب اکبر نے ''دین الٰہی'' کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی تو عقلی آزادی علماء سے عوام میں آگئی، یہی وہ زمانہ تھا جب حرمین سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ نے ''مشکوٰۃ الآثار اور مشارق الانوار'' کے درس کے ذریعے ایک روشنی پھیلائی۔

شاہ جہاں کے دور تک معقولیت کے اثرات چھائے رہے، عالمگیر اورنگ زیب نے فقہ کی تدوین میں علماء کو لگایا، عالمگیرؒ کے دور سے تعلیم سرکاری پابندیوں سے آزاد ہوئی اور ذاتی مدارس قائم ہونے شروع ہوئے۔

ملا قطب الدین شہید (۱۱۰۳ھ) نے ''سہالی'' کو مرکز علم بنایا، مگر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور کے آغاز تک نصاب تعلیم معقولات کے غلبہ سے نجات نہ پاسکا۔

ملا نظام الدین کے ہم عصر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) نے اپنا نصاب الگ بنایا، اس طرح کہ انہوں نے مروجہ نصاب کے اسلوب سے انحراف کیا۔

مراکزِ تعلیم

تیرہویں صدی ہجری میں تین مراکز علم معروف تھے: دہلی، لکھنؤ، خیر آباد، دہلی میں شاہ صاحبؒ کے نصاب کا اثر تھا اور حدیث وتفسیر پر زیادہ توجہ تھی، لکھنؤ میں علماء فرنگی محلی کی دلچسپیاں فقہ اور اصول فقہ تک محدود تھیں، خیر آباد کا موضوع منطق اور فلسفہ تھا۔ یہ سلسلہ سلطنت مغلیہ تک رہا۔

دار العلوم دیوبند

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ان تینوں مراکز کی علمی میراث دار العلوم دیوبند کو ملی؛ چنانچہ دار العلوم دیوبند نے اپنے نصاب تعلیم میں ان تینوں مکاتب فکر کی خصوصیات جمع کیں، جسے پڑھ کر تعمق، فکر ونظر میں گہرائی وگیرائی، بصیرت اور فی الجملہ تمام مروجہ علوم پر دسترس حاصل ہو جائے۔

دار العلوم دیوبند اور علم حدیث

دار العلوم دیوبند کا درسِ حدیث، دوسری درسگاہوں سے مختلف ہے، یہاں حدیث کی تلاوت اور محض ترجمہ پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے حدیث کے تمام پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں: مثلاً متعارض روایات میں تطبیق، ترجیح، یا تنسیخ کا عمل ہوتا ہے اور ان کے لیے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں، استدلال اور استنباط کے طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے، رجال حدیث زیر بحث آتے ہیں، روایت کا درجہ متعین کیا جاتا ہے۔ فقہی احکام بیان کیے جاتے ہیں اور ائمہ کے مسالک کی تفصیل سامنے آتی ہے اور آخر میں احناف کا مسلک، دلائل اور وجوہ ترجیح کا ذکر ہوتا ہے۔ دار العلوم دیوبند کا یہ ایسا معقول اسلوب درس ہے کہ ہند وپاک کے بیشتر مدارس میں اس کا اتباع کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دار العلوم دیوبند میں طریقہ درس حدیث، ولی اللہی طریقہ درس کی ارتقائی شکل ہے اور یہی وجہ تھی کہ علامہ رشید رضا مصری مرحوم حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے چند سوالات وجوابات کے بعد اس قدر متاثر ہوئے کہ بے ساختہ زبان سے نکلا: ''واللہ ما رأیتُ مثلَ ھٰذا الاستاذ'' (مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت از مولانا گیلانیؒ) اور پھر جوابی تقریر میں اس طریقہ تدریس پر اپنی پسندیدگی کا یوں اظہار کیا:

"لَو لَمْ أَرَ هٰذِهِ الْجَامِعَةَ الْعِلْمِيَّةَ، وَمِثْلَ هٰؤُلَاءِ الْأَعْلَامِ الْأَحْبَارِ لَرَجَعْتُ مِنَ الْهِنْدِ حَزِيْنًا".

(نفحة العنبر، ص: ۱۷۳، از بنوریؒ)

یعنی بخدا میں نے ان جیسا استاذ نہیں دیکھا؟ اور فرمایا: اگر میں دارالعلوم کو اور ان عظیم علماء کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس جاتا"۔

بواپسی اپنے جریدہ "المنار" میں دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

"مجھے سب سے زیادہ خوشی از ہر ہند دارالعلوم دیوبند دیکھ کر ہوئی"۔ (اشاعت ماہ شعبان ۱۳۳۰ھ)

حضرت شیخ الاسلام بحیثیت صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) کا درس حدیث حافظانہ، واعیانہ، محدثانہ اور تبحرانہ تھا، وفورِ علم اور درسِ حدیث میں اپنی نکتہ آفرینیوں کے عین عالم شباب میں خاص حالات کی بناء پر جب شاہ صاحبؒ یہاں سے ترکِ تعلق کر کے گجرات کی سرزمین سعادت آثار میں اپنے علوم وفنون کے دریا بہانے کے لیے ڈابھیل سے منسلک ہو گئے تو دارالعلوم کی انتظامیہ کے سامنے زبردست مسئلہ پیش آ گیا، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا عجیب وغریب اندازِ درس حدیث عالم آشکارا ہو چکا تھا، علمی دنیا آپ کے محققانہ اور تبحرانہ درس سے پوری لذت آشنا ہو چکی تھی، ایک ایسا خلا سامنے تھا جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، شاہ صاحبؒ کیا تھے؟ بالفاظ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ:

"اگر تم مجھ سے پوچھو کہ تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، ابن دقیق العیدؒ اور عز الدین ابن عبدالسلام رحمہم اللہ کو دیکھا تھا تو اگر میں تم سے ہاں کہہ دوں تو میں سچا ہوں؛ کیونکہ میں نے انور شاہ کو دیکھا تھا اور کیونکہ اگر انور شاہ اس دور میں ہوتے تو یہی ہوتے"۔ (بینات کراچی، بنوریؒ، صفحہ ۱۳۴)

ساتھ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کیساتھ اساتذہ کی ایک بڑی جماعت کے الگ ہو جانے سے مدرسہ کے لیے غیر معمولی اور نہایت نازک وقت آ پڑا تھا، ایسے نازک وقت میں مدرسہ کی گرتی ہوئی ساتھ اور ڈوبتے ہوئے نام کو کوئی ایسا ہی شخص بچا سکتا تھا جو اپنے وقت کا امام، تقویٰ اور شریعت وسنت میں مسلم اور فنافی العلم ہی نہیں؛ بلکہ پورے متحدہ ہندوستان میں معروف ومحبوب ہو۔ جب نگاہیں ایسی عظیم شخصیت کی تلاش میں اٹھیں تو مذکورہ صفات سے پوری طرح متصف ذاتِ گرامی حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ حضرت مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات پر عوام وخواص سب نے اتفاق کیا، اس وقت سلہٹ (اب بنگلہ دیش کا اہم شہر) میں حضرت مدنی کی علمی، تدریسی اور روحانی کمالات کے ساتھ ظاہری ترقیاں اور کامیابیوں کا شہرہ روز افزوں تھا۔ ان حالات میں جب

حضرت کے سامنے دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرسی اور مشیخیت حدیث کی پیشکش ہوئی تو حضرت نے اس خیال کیساتھ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے ہمیں جو امانت سپرد کی تھی اس کی ادائیگی کی صورت اور وقت آ گیا ہے۔ اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدین جو جہاد آپ کے حوالے کر گئے تھے اسے دیوبند ہی میں رہ کر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

حضرت مدنیؒ کے شرائط

لیکن چونکہ آپ کے پیش نظر محض تدریس اور صدارت انگریزوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد آزادی کے تقاضے آپ کے سامنے تھے، اس لیے آپ نے ارباب اہتمام کے سامنے حسب ذیل کچھ شرائط رکھے:

۱۔ سیاسی مسلک اور نظریات میں آزادی ہوگی اور مدرسہ کو کسی اختلاف واعتراض کا حق نہ ہوگا۔

۲۔ سیاسی سرگرمیوں اور تحریکات آزادی میں شرکت پر مدرسہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

۳۔ ہر ماہ ایک ہفتہ بلا کسی رخصت اور منظوری کے سفر ہو سکے گا اور اس کی تنخواہ وضع نہ ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند کو حضرت مدنیؒ جیسے صاحب عزیمت وجرأت، حامل شریعت وسنت اور مجاہد آزادی کی ضرورت تھی، دارالعلوم کے ارباب حل وعقد سے زیادہ حضرت کے مزاج، طبیعت اور نفسیات سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ہر پہلو پر غور کر کے ہی ان شرائط کو پیش کیا ہوگا؛ چنانچہ پورے انشراح وانبساط کے ساتھ یہ شرط منظور کر لی گئیں اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سرپرست دارالعلوم دیوبند کے مشورہ ہی سے حضرت مدنیؒ کا تقرر بعہدۂ صدر مدرسی عمل میں آیا۔

تجویز تقرر

آپ کی شرائط کو بہ انشراح صدر منظور کرتے ہوئے درج ذیل تجویز مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند تحریر کی گئی۔

''حضرت مولانا مولوی حسین احمد صاحب کا تقرر بعہدۂ صدر مدرس بمشاہرہ ۱۵۰ را ایک سو پچاس روپے ماہوار تاریخ کارکردگی سے مجلس شوریٰ کو منظور ہے۔ حضرت ممدوح کی اعلیٰ شخصیت اور علمی تبحر کے لحاظ سے مشاہرہ مذکورہ بالکل ناقابل ہے مگر حضرت ممدوح کی اخلاص نیت وخدمت دارالعلوم کے جذبات سے ہم کو توقع ہے کہ حضرت ممدوح اس کو منظور فرما کر مجلس شوریٰ کو شکرگزاری کا موقع دیں گے اور دارالعلوم کی حالت پر اپنی توجہات اور اخلاق بزرگانہ سے نظر التفات فرما کر حسبۃ اللہ پورے طور پر سنبھالنے کی کوشش فرمائیں گے جیسا کہ حضرت ممدوح کے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کا طریقہ عمل تھا۔

فقط

اشرف علی

۲۰ ررجب ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء

کمترین جمیل احمد، محمد مسعود احمد، محمد حسن مراد آبادی، محمد اشفاق، احقر محمد اسحاق عفی عنہ، محمد عبدالرحمٰن، مظہر حسین، بقلم خود۔ (یہ تھے شیخ الاسلام، ص: ۶۸)

ضروری وضاحت

کوئی سوچ سکتا ہے کہ ایک علمی اور تعلیمی ادارے میں ملازمت کے لیے اس طرح کی شرائط کی کیا ضرورت تھی؟ دراصل یہ خیال اسی کو آسکتا ہے جس کے علم میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کی اصل غرض وغایت نہ ہو۔

قیام دارالعلوم کی غرض

خوب واضح رہے کہ اسلامی حکومت کے خاتمہ پر عیسائیوں کی ہر قسم کی یلغار کا دوامی مقابلہ کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد دینی، علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ایسے مجاہدین پیدا کرنا تھا جو وقت کے مناسب حکمتِ عملی اختیار کرکے عیسائی حکومت کا خاتمہ کریں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عیسائیوں کے ناپاک قدموں سے سرزمین کو پاک کردیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند رقم طراز ہیں:

''۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی قومیت کی تخریب کے لیے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے میکالے کے روپ میں اٹھا اور ان کی مذہبی تخریب کے لیے جو دھارا پادریوں کی منظم تبلیغ یا آریوں کے منظم پرچار کی صورت میں بہا، اس پر بند لگانے کا کام صرف اس تعلیمی تحریک نے کیا جو حضرت نانوتویؒ کے روپ میں نمودار ہوئی، حضرت نانوتویؒ نے اٹھ کر اسلام کی تعمیر اور دفاع کے لیے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ پیش کیا، تلوار کے وقت تلوار سے، قلم کے وقت قلم سے اور زبان کے وقت زبان سے اسلام اور ملک وملت کی نادر روزگار خدمت انجام دی''۔ (مقدمہ سوانح قاسمی)

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

''مدرسہ دیوبند ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا گیا ہے''۔ (مقدمہ سوانح قاسمی)

شیخ الاسلام کی تشریف آوری کی افادیت

حضرت شیخ الاسلام کی تشریف آوری کے ساتھ وہ تمام خطرات، انتشار اور اضطراب وقتی جو وقتی طور پر پیدا ہوگیا تھا، ختم ہوگئے تھے اور موافقین ومخالفین کو جمعیتِ خاطر حاصل ہوگئی۔

صدارت و مشیخت دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت اور شیخ الحدیث کا منصب ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی تمام وجاہتیں اور اعزازات ختم ہیں، دارالعلوم کی بنیاد جب رکھی گئی تو خدا جانے وہ ساعت کتنی سعید تھی اور بانیان دارالعلوم کا کتنا خلوص تھا کہ اس منصب پر جو حضرات فائز ہوتے رہے وہ علم وعمل، جہد وایثار اور اخلاق وکردار کے لحاظ سے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور منتخب روزگار انسان ثابت ہوئے، ان کی سیرت وکردار علمی وعملی شان کو دیکھ کر بے اختیار سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرونِ اولیٰ میں پہنچ گئے ہیں۔

پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے حضرات شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، ان کے بعد علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی باری آئی تو ان کے بعد قرعۂ فال حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر پڑا، یہ سب حضرات اپنے اپنے وقت کے جامع الصفات انسان تھے۔ ان کے علم وتحقیق کو دیکھ کر جہاں غزالیؒ اور رازیؒ یاد آتے ہیں وہاں زہد وتقویٰ کو دیکھ کر امام احمد ابن حنبلؒ کا زہد وتقویٰ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سلوک وتصوف میں جنیدؒ و بایزیدؒ نظر آتے ہیں، جہد وایثار میں سید احمد شہیدؒ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

اس وقت کی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمالیا، اس وقت دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے زیادہ موزوں نہیں ہوسکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولاناؒ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا۔ (الفرقان لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۸ء)

ظاہری اور سطحی نظر میں تو یہ منصب ایک صدر مدرس اور شیخ الحدیث کا تھا، جس پر قدرت نے حضرت کو فائز ومامور فرمادیا تھا بنیادی اور حقیقی معنوں میں یہ وہ مقام تھا جس سے پورے ہندوستان؛ بلکہ تمام دنیا میں صحیح اسلامی اسپرٹ اور عقائد کی تبلیغ اور قیادت ہوتی تھی، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں:

''آپ کی شخصیت اس وقت دارالعلوم کے جس منصب پر فائز ہوئی وہ روایتی طور پر محض مدرسی کا عہدہ نہیں بلکہ ایک عمومی قیادت کا عہدہ رہا ہے، جس کی طرف رجوع عام ہوتا رہا ہے اور جس کے لیے ہمیشہ ایسی ہی شخصیتیں ہوتی رہی ہیں''۔ (مکتوبات شیخ الاسلام: ۳۵/۱)

شیخ الاسلام کی درسی خصوصیات

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ رقم فرماتے ہیں:

''صدارتی ذمہ داریاں حضرت شیخ الہندؒ کے ایک خاص تربیت زادہ عارف باللہ وحق آگاہ شخصیت یعنی

حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ کی جانب منتقل کی گئیں، دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ کا کافی وقت (تقریباً ۱۸ سال) مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں درس وتدریس میں گذرا، یہیں وہ رویائے صادقہ بھی پیش آئے کہ مرحوم نے رسالت مآب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس ارشاد پر کہ کیا مانگتے ہو؟ عرض کیا کہ جو کچھ پڑھ چکا ہوں، اس میں رسوخ کی دولت عنایت ہو"۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا اپنے علوم میں بے نظیر اور حدیث کی تدریس وتعلیم میں اسلاف کے صحیح جانشین تھے، دارالعلوم دیوبند جسے الامام الکشمیریؒ ایک نئے رخ پر ڈال چکے تھے اور جہاں کی تعلیمی کیفیات ایک خوشگوار انقلاب کی امین تھیں، آپ انہیں امتیازات وخصوصیات کو نبھانے کی کوشش فرماتے، اگرچہ اس راہ کی ان دشواریوں پر آپ مطلع تھے جو ایک جلیل القدر محدث کو پیش آسکتی ہیں۔ ترمذی شریف کے ابتدائی درس میں شیخ اسلامؒ نے خود فرمایا کہ:

"حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بے نظیر حافظہ اور یادداشت سے کام لے کر درس کا رنگ بدل دیا وہ اپنی تجر علمی کی بنا پر اس طرز کو خوب نبھاتے: لیکن ہم ایسوں کے لیے بڑی دشواریاں پیدا ہو گئیں"۔

اس اعتراف کے باوجود کسی حل طلب مسئلے پر آپ کی تقریر جامع ہوتی، حنفیہ کا استحکام، عہدی فتنوں کی تردید، حدیث مالہ وماعلیہ پر مفصل کلام، اکابر کے اقوال خصوصاً حضرت مولانا نانوتویؒ کے معارف وعلوم سے دلچسپی اور ان کے ترجمان تھے، حدیث کی اکثر کتابیں سامنے رکھتیں اور ضرورت پر کتابیں کھول کر جواب دیئے جاتے، طلبہ پر بے پناہ شفقت تھی اور ہر سوال خواہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو اس کا جواب دینے میں کوئی تکدر محسوس نہ فرماتے، تقریر میں بہت بسط اور کسی بھی مضمون کے تمام گوشوں کو واضح کر دینے کے عادی تھے"۔

(ماہنامہ الرشید کا دارالعلوم دیوبند نمبر: ۳۱۵-۳۱۶)

کتب حدیث میں بخاری وترمذی کی تخصیص

حضرت مولانا مدنیؒ کا اکتیس سالہ دور تدریس علوم نبویہ کی خدمت میں گذرا لیکن بطور خاص صحاح ستہ میں امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری اور امام ترمذیؒ (م ۲۷۹ھ) کی سنن ترمذی کو اپنے درس کے لیے منتخب فرمایا، صحیح بخاری کی وجہ انتخاب تو ظاہر ہے کہ وہ بالاتفاق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ رہا سنن ترمذی کا انتخاب تو اس کی چند خصوصیات ہیں جو بقیہ کتب صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔

خصوصیات سنن ترمذی

امام ترمذیؒ روایت کو بیان کرنے کے بعد اس کا درجہ بیان کرتے ہیں یعنی صحیح، حسن، غریب وغیرہ،

رُوات کے سلسلے میں جرح وتعدیل کرتے ہیں، اگر کسی راوی میں کوئی ضعف ہے تو اسے ذکر کرتے ہیں، احادیث میں اگر کوئی لفظ نادر اور غریب الاستعمال آتا ہے تو اس کے معانی کو بیان کرتے ہیں، روایات کے تعارض کو دور کرتے ہیں، اگر روایات میں فقہی الفاظ ہوں تو مذاہب اربعہ کو ذکر کرتے ہیں، وجوہ استدلال کو ذکر کرتے ہیں------اور ترمذی میں مکررات بہت کم ہیں، آخر میں کتاب العلل ہے----چونکہ ترمذی میں منافع بہت زیادہ ہیں اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر ہے، اس کے مؤلف شافعی المسلک ہیں اور علماء ہند حنفی ہیں اس وجہ سے ان روایات پر جو بظاہر حنفی مسلک کے خلاف ہیں مکمل بحث کرنی پڑتی ہے اور حدیث کو فقہی انداز سے پڑھانے کے لیے سنن ترمذی کے علاوہ کوئی کتاب نہیں ہے اس لیے سنن ترمذی کو بقیہ کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے، حضرت شیخ الہندؒ اپنے اسباق میں اکثر ترمذیؒ کو شامل رکھتے تھے----حضرت مدنیؒ نے بھی اسی لیے سنن ترمذی باقاعدہ اپنے درس میں رکھی۔

طریقۂ درس

کتاب وسنت کے علوم کے عظیم الشان آداب ہیں، جن کی رعایت ہر معلم کے لیے ضروری ہے، حضرت شیخ الاسلامؒ ان تمام آداب کی مکمل رعایت فرماتے ہوئے درس کا آغاز فرماتے، آغاز درس پر خطبہ مسنونہ کی تلاوت کرتے، قراءت حدیث کے بعد----اسناد حدیث کی تحقیق فرماتے، راویوں پر فن اسماء الرجال کی حیثیت سے بحث فرماتے ہوئے جرح وتعدیل فرماتے، موقعہ کی مناسبت سے رواۃ کے حالات بیان فرماتے، صحابہ کرامؓ میں سے اگر کسی کا نام آتا تو ان کی خصوصیات ذکر فرماتے۔ اس کے بعد متنِ حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھاتے کہ بخوبی ذہن نشین ہو جاتا، حدیث میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں ان کی لغوی تحقیق فرماتے، حدیث کے مراتب بیان فرماتے، حدیث پر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اس کی وضاحت کے بعد چند قوی اور مستند جواب دیتے۔ تعارض حدیث کو اس طرح دور فرماتے کہ یقین کرنا پڑتا کہ ان میں تعارض تھا ہی نہیں، ہر حدیث کا صحیح اور عمدہ محمل بیان فرماتے، اگر کوئی حدیث کسی جگہ مختصر آتی تو دوسری جگہ جو تفصیل آتی ہے، وہ بیان فرماتے۔ ترکیب نحویہ، تشریح مقامات، خصائص کتب، فن حدیث کی اصطلاحات کی تشریح، عللِ احکام امور شرعیہ کے عقلی ومشاہداتی دلائل، صحابی کی احادیث مرویہ کی تعداد، وجہِ تخصیص مذاہب، ائمۂ اربعہ، دیگر علوم وفنون کی اصطلاحات کی تشریح مع دلائل، تفسیر آیات، تشریح معجزات، مستند قصصِ انبیاء، ابحاث متعلقۂ ایمان، وجہ تسمیہ سورِ قرآنی، عصمتِ انبیاء، احوال ائمہ حدیث، سرائط معمول بہا محدثین، اثباتِ قدرتِ الٰہیہ، احادیث کے عنوان سے تحتِ عنوانِ احادیث کی مطابقت، شعبِ ایمان وغیرہ کو----مفصل بیان فرماتے، اگر کوئی

حدیث متعلق آتی تو تفہیم حدیث کے بعد اختلافات ائمہ بیان فرماتے اور ہر امام کے جملہ دلائل بالتفصیل بیان فرماتے اور سب سے آخر میں مذہب حنفی کو قوی دلائل سے مزین فرماتے اور دلائل کو مع حوالہ جات بیان فرماتے اور دیگر ائمہ کے دلائل کے چند قوی جوابات دے کر مذہب حنفیہ کو حدیث سے مطابق فرماتے تھے، اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ حنفی مذہب احادیث نبویہ کے بالکل مطابق ہے اور امام ابوحنیفہ کو تفقہ فی الدین میں دستگاہ کامل حاصل ہے۔

مراتب صحابہؓ، تابعینؒ و تبع تابعینؒ، فقہ حدیث، مذاہب محدثین، اسماء محدثین، رُواۃِ حدیث کے مساکن واوطان، انساب محدثین، کنیات صحابہؓ و تابعین و تبع تابعین، قبائل رُواۃ، محدثین کی عمریں، ان کی ولادت، وفات، القاب فی الاسانید، زیادۃِ الفاظ فقہیہ ------- اولاد صحابہؓ، علل احادیث، رُواۃِ شاذ، الفاظ غریبہ کی تشریح، طبقات محدثین، مغازی رسول صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جملہ لوازم درس حدیث کا آپ دوران درس التزام فرماتے تھے اور اس طرح آپ کا درس حدیث، کتاب وسنت اور اس کے جملہ متعلقہ علوم وفنون پر حاوی ہوتا تھا۔

درس کی خصوصیات

(۱) دوران درس کسی نبی کے اسم گرامی پر علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام فرماتے، کسی صحابی کا تنہا نام آتا تو رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر کے ساتھ آتا تو رضی اللہ عنہم فرماتے، ائمہ مذہب، علما و اولیاءِ سلف کا نام آتا تو بالالترتیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے، بشرطیکہ وہ اہل سنت والجماعت سے ہوں، اس پر خود بھی پابندی فرماتے اور طلبہ کو تاکید فرماتے تھے۔

(۲) دوران درس طلبہ جس قدر بھی سوالات کرتے آپ ان کے تسلی بخش جوابات عنایت فرماتے، یہ سوالات درس کے ساتھ غیر درسی بھی ہوتے تھے مگر آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے تھے، یہ آپ کے درس کی خاص خصوصیت تھی۔

(۳) کسی موقع پر اگر استشہاد کلام عرب کی ضرورت ہوتی تو آپ متعدد اشعار اور بے شمار عبارتیں کتب لغت کی بے تکلیف بیان فرماتے، اس موقع پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لغت و ادب کی کتابیں کھلی ہوئی ہیں اور آپ بے تکلف ان کو پڑھتے جا رہے ہیں۔

(۴) بخاری شریف کی آخری حدیث "کَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ الخ" کی تلاوت جب اپنے مخصوص لہجہ میں شروع فرماتے تو قلوب پر رقت طاری ہونے لگتی تھی اور آپ کی توجہ سے حاضرین زار و قطار رونے لگتے تھے، دل کانپ جاتا تھا اور لوگ توبہ و استغفار اس طرح کرتے تھے گویا کہ دربار خداوندی میں حاضر ہیں، آنکھیں اشک بار،

دل مضطرب، غرض ہر شخص ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا۔

(۵) دورانِ درس امر بالمعروف نہی عن المنکر، اعتصام بالکتاب والسنۃ کی تلقین ہمیشہ فرماتے، متعلقین کے عقائد، اخلاص واعمال کی اصلاح کے جو مواعظ ونصائح ضروری ہوتے سب کی تلقین فرماتے، چند حضرات اکابر کی تحریروں کا خلاصہ ملاحظہ کرتے چلیں:

مولانا عبدالحئیؒ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ بیان فرماتے ہیں:

''۱۳۴۶ھ میں حضرت العلامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے دیوبند کی مسند شیخ الحدیث سے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کا انتخاب کیا گیا، آپ نے ایسی قابلیت اور محدثانہ شان کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی کہ دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور مرکزیت بھی باقی وساری رہی اور مدرسہ پر عوام وخواص کا اعتماد برقرار رہا۔ تعلیم وتدریس کی خدمات کے ساتھ حضرت مدنیؒ سیاسی جدوجہد میں بھی اپنے بے مثال عزم وہمت کے ساتھ رواں دواں رہے اور مسلمانوں میں غیرت وحمیت نیز عزت نفس کی روح بیدار کی''۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند کی یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی یہ نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا------ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا-----''

آپ کے دورِ صدارت کی عظیم برکت

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی دلکش شخصیت کے بے شمار حسین پہلو تھے، وہ حضرت نانوتویؒ کے باکمال پوتے تھے، شرافت، وانسانیت، سراپا انکسار، پاک باطنی، علم وفضل، خطابت وتقریر، وعظ وتلقین، سادگی اور عجز وتواضع، دمِ گفتگو، حکیمانہ فصاحت وبلاغت--- غرضیکہ ان کی پُرعظمت شخصیت اعمال وکردار اور جلال وجمال کا ایک حسین امتزاج تھی، حضرت نانوتویؒ سے خاص نسبت کے ساتھ آپ کی گوناگوں خصوصیات اور کمالات کی بناء پر حضرت شیخ الاسلامؒ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے وجود کو دارالعلوم دیوبند کے لیے اس قدر ضروری سمجھا کہ جب تقسیم کے بعد بعض دیگر علماء کرام کی طرح حضرت قاری صاحبؒ بھی پاکستان میں مستقل قیام کی غرض سے تشریف لے گئے اور حکومت ہند نے بھی آپ کو تارکِ وطن قرار دے دیا تھا تو حضرت مدنیؒ نے آپ کو واپس بلوایا، جس کی مختصری کیفیت درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الاسلام نے اولاً مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ سے فرمایا کہ مولانا طیب صاحب کی واپسی کی اجازت حکومت سے حاصل کریں، مولانا نے ارباب حکومت سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ اب ان کی واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ ہر دلیل کے جواب میں حکومت یہ کہتی ہے کہ اگر ان کو اجازت دے دی گئی تو بڑے بڑے مسلم لیگیوں اور پاکستانیوں کے لیے دروازہ کھولنا پڑے گا، نیز بہت سے اصحاب رائے بھی واپسی کے خلاف تھے مگر حضرت مدنیؒ ایسی ہر تجویز کو سختی سے رد کرتے رہے۔ حضرت مدنیؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پاس خود جا کر ان سے باصرار کہا، مولانا آزاد ابھی انکار کرتے رہے، حضرت مدنیؒ کے تیور بدل گئے اور سختی سے فرمایا کہ ان کو ہر حال میں یہاں آنا چاہئے، ان کا وجود دارالعلوم کے مفاد میں ہے کہ وہ اس وقت واپس آجائیں، مولانا آزاد مرحوم نے مجبور ہو کر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو فون کیا اور حضرت مدنیؒ کے اصرار کے بارے میں تفصیل سے مطلع کیا، پنڈت جی نے فوراً کہا کہ آپ حضرت کو مطمئن کر دیں میں ابھی ان کی واپسی کے احکامات صادر کرتا ہوں۔

جب حضرت حکیم الاسلامؒ کی واپسی پر آپ کے اعزاز میں حضرت مدنیؒ کی زیر صدارت جلسہ ہوا تو حضرت مہتمم صاحبؒ نے اپنی تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

اور پھر فرمایا: کہ اب جب کہ میری واپسی کی ساری تدابیر مسدود ہو چکی تھیں، یہ محض حضرت مدنی مدظلہم کی مہربانی ہے کہ میں آج پھر یہاں حاضر ہوں۔

دنیا نے چشم خود دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہتی ترقیات حضرت مدنیؒ کی دور صدارت اور حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے دور اہتمام کی رہین منت ہیں، بلاشبہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی پاکستان سے واپسی حضرت مدنیؒ کی عظیم برکت بلکہ کرامت ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی علمی ترقیات

حضرت شیخ الاسلام کے زمانہ صدارت میں طلبہ کی تعداد میں دو گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا اور خاص دورۂ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہے، ۱۳۴۶ھ سے حضرت مدنیؒ کی وفات ۱۳۷۷ھ تک بتیس سال کی مدت میں آپ کے زمانہ صدارت میں چار ہزار چار سو تراسی (۴۴۸۳) طلبہ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، جب کہ حضرت مدنیؒ کے عہد صدارت سے پہلے فضلاء کرام کی تعداد دو ہزار سات سو اکیاون (۲۷۵۱) ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی توجہ سے متعدد نئے شعبے اور نئے درجات کھولے گئے، قرآنِ کریم کو عمدگی اور صحت و تجوید کے ساتھ پڑھنے پر زور دیا گیا اور خاص دورۂ حدیث کے طلبہ کے لیے تجوید، پارۂ عم کی مشق اور فوائد مکیہ کی خواندگی اس طرح لازم کی گئی کہ مدار سند ہوگئی، اس کے بغیر کسی کو سندِ فراغ نہیں مل سکتی۔

آپ کی درسی برکات

حضرت شیخ الاسلامؒ کا درسی انداز اور تقریر کا طرز بہت ٹھہرا ہوا ہوتا تھا، بہت ٹھہر ٹھہر کر ہر جملہ الگ الگ واضح انداز میں ادا فرماتے تھے، جس سے آپ کی مکمل درسی اور غیر درسی تقریر کو ضبطِ تحریر میں لانا بہت آسان ہوتا تھا۔ حضرت مدنیؒ ترمذی شریف کی جانب اس کی خصوصیات خاصہ کی بنا پر جس کا ذکر اوپر ہوا، بطورِ خاص توجہ دیتے تھے اور مفصل کلام فرماتے تھے؛ چنانچہ آپ کے لائق و فائق تلامذہ نے خوب خوب قلم بند کیا ہے۔

معارفِ مدنیہ

ترمذی شریف کی درسی تقریر کا ایک شاہکار نمونہ جناب مولانا محمد طاہر صاحب امروہوی مرحوم کی مرتبہ کتاب "معارفِ مدنیہ" ہے جو یومِ تصنیف سے آج تک طلبہ و اساتذہ کے لیے مرکزِ توجہ استفادہ بنی ہوئی ہے۔

المسک الذکی

اسی طرح حضرت مولانا سید خلیل حسین میاں صاحب دیوبندی کی مرتب کردہ تقریرِ ترمذی بنام "المسک الذکی" اسم با مسمیٰ ہے ابھی زیرِ طباعت ہے، اس کا کچھ حصہ طبع ہو چکا ہے، بلاشبہ تشنگانِ علم حدیث کے لیے ایک چشمۂ صافی اور نگاہوں کے لیے سرمۂ بصر بلکہ درِ نجف ہوگی۔ (دیگر اور تصانیف بھی ان کے ماسوا ہیں)۔

خلاصۂ کلام

"تاریخِ انسانی میں ایسی شخصیات کم ہوتی ہیں جو اپنے علم و دانش، فہم و فراست، اعمال و اقوال، افعال و کردار، جذبات و خیالات، ایثار و قربانی، عفو و درگذر اور علمی و عملی اور تدریسی خدمات اور تصنیفات و تالیفات کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ اور ان جیسی بہت سی خصوصیات اور صفات کی حامل ہوتی ہیں۔

ان خوبیوں اور صفات و کمالات کی حامل کچھ ہستیاں ہوتی بھی ہیں تو "وہ میدانِ جنگ میں قدم نہیں رکھ سکتیں، جو ہاتھ قلم چلاتے ہیں ان سے تلوار نہیں اٹھ سکتی، جو صفحۂ قرطاس اور میدانِ خطابت و مناظرہ میں حروف و الفاظ کے تیر و پیکان اور طنز و تعریض کی تلوار اور نیزے چلاتے ہیں وہ عرصۂ جدال و قتال میں تلواروں کی چمک دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتے ہیں"۔

لیکن دور آخر میں ہماری آنکھوں نے ایک ایسی شخصیت دیکھی جس کے علم وعمل، جہد اور جہاد اور مرجعیت کا غلغلہ تھا، وہ اسیر مالٹا، روضۂ اقدس کے پاس ایک مدتِ دراز تک علماءِ عرب کو درسِ حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دینے والے اور از ہر ہند دار العلوم دیو بند میں مسند حدیث شریف اور مقام صدارت کو ایک خاص انداز وطرز پر رونق بخشنے والے جانشینِ شیخ الہند حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ وبرد اللہ مضجعہٗ تھے۔ آمین!! ع

صحابی گو نہیں لیکن نمونہ تھے صحابی کے

ماخذ ومراجع

(۱) تصویرِ انور (۲) نقشِ دوام
(۳) حیات شیخ الاسلام (۴) چراغ محمد
(۵) تاریخ دار العلوم دیو بند (۶) یہ تھے شیخ الاسلامؒ
(۷) الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر (۸) ماہنامہ الرشید کا دار العلوم نمبر
(۹) مدنی واقبال نمبر

حضرت شیخ الاسلام بہ حیثیت شیخ الحدیثؒ

مولانا عبدالعلی فاروقی

مدیر اعلیٰ ماہنامہ "البدر"، مہتمم دارالعلوم فاروقیہ کاکوری، لکھنؤ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو ہماری اس فانی دنیا سے کوچ کیے ہوئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا۔ گردش لیل ونہار کے لئے یہ ایک ایسی طویل مدت ہے کہ اس میں ممکنہ طور پر دو نسلوں اور یقینی طور پر کم از کم ایک نسل کا تو خاتمہ ہو ہی جاتا ہے --- یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع وزرخیز ملک میں بھی اب حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست مستفیدین اور شاگرد خال خال ہی مل پاتے ہیں۔

اس طویل مدت کے دوران بلا مبالغہ درجنوں کتابوں، سیمناروں اور کانفرنسوں کے ذریعہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو عنوان بنا کر زبان وقلم نے اپنے اپنے فرض اور قرض دونوں کی ادائیگی کی۔ اس کے باوجود اگر آج بھی کچھ طالبان علم وہنر اور تشنہ کامان صحبت ودید یہ کہتے نظر آئیں کہ ؎

مجھے پینے دے، پینے دے، کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

تو اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کی عبقریت ہی نہیں ان کی مرجعیت ومحبوبیت کے نقوش کو نصف صدی کی گردش لیل ونہار بھی دھندلا نہ کر سکی اور اس چشمہ فیض سے سیرابی حاصل کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی کتاب زندگی کے عنوانوں میں ایک حسین عنوان "شیخ الحدیث" بھی ہے ــــــ

گو کہ ''شیخ الحدیث'' ہمارے اپنے عرف کے لحاظ سے بخاری شریف پڑھانے والے استاذ کو کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے شیخ الاسلام کے اپنے دور میں ان کے علاوہ متعدد اور ان سے پہلے اور بعد کے ادوار میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں ''شیخ الحدیث'' ہوئے ہیں بلاشبہ بجائے خود یہ بھی ایک ایسا شرف ہے، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ؏

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

لیکن اس کے باوجود حضرت شیخ الاسلامؒ جیسی عبقری اور کثیر الجہات شخصیت کا ذکر جب ہم ''شیخ الحدیث'' کی حیثیت سے کرتے ہیں تو کچھ ایسے ''امتیازات'' بھی ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں جنہیں ہم ''شیخ الاسلام کے درس حدیث کی خصوصیات'' کا عنوان دے سکتے ہیں۔

راقم الحروف جیسا کم سواد طالب علم اپنی بساط کو جانتے ہوئے بھلا یہ کیوں کر سوچ سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند ہی نہیں بلکہ مدینۃ النبی اور مسجد نبوی بلکہ جوار النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شارح حدیث کی درسی خصوصیات کو کما حقہ بیان کرے گا؟ مگر بات صرف اتنی ہے کہ ؏

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

تو آیئے دیکھنے، بھجنے اور پرکھنے والوں کے بیانات کی روشنی میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے درس حدیث کی خصوصیات پر ایک طالب علمانہ نگاہ ڈالیں — اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ا۔ حضرت شیخ الاسلام کے درس حدیث کی سب سے اہم، سب سے افضل اور امتیازی خصوصیت تو ان کا حرم نبوی کے اندر بیٹھ کر وہ درس اور انداز درس ہے، جس میں جذبات کی نہ جانے کن شدتوں کے ساتھ وہ کہتے تھے تال صاحب ھذہ الروضۃ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس شرف وفضلیت کو کیا عنوان دیا جائے کہ جذبات میں ڈوبی ہوئی ان کی اس والہانہ آواز کی ان کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی سماعت فرماتے تھے۔ محل درس کی نسبت سے اس درس اور اس کے مدرس کی خصوصیت ہی کیا کم تھی کہ اس پر مستزاد ملکوں ملکوں کے طلبہ کا وہ ہجوم جن میں کے متعدد اپنے اپنے وقت اور مقام کے اکابر واعاظم میں شمار ہوئے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے جو عشق اور والہانہ لگاؤ حضرت شیخ الاسلام کو تھا اس کا اثر نمایاں طور پر ان کے درس حدیث میں اس طرح نظر آتا ہے کہ طلبہ کے قلوب بے ساختہ کھنچنے لگتے تھے، شرح حدیث اور استنباط واستدلال سے قطع نظر محض ان کی زبان سے جن کانوں نے متن حدیث سن لی وہ پھر تا عمر اس کی لذت کو فراموش نہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ جس دن کتاب کا آخری سبق ہوتا تھا اس دن دارالعلوم کی

دارالحدیث آہوں اور سسکیوں سے گونج اٹھتی تھی۔

۳۔ دارالعلوم دیوبند میں تیس برس سے زیادہ مدت تک حضرت شیخ الاسلام نے درس حدیث دیا اور اس مدت میں بخاری شریف کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف کا درس بھی قائم رہا، بلکہ ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ عام روش سے ہٹ کر حضرت والا کو بخاری شریف سے زیادہ ترمذی شریف کے درس کا اہتمام ہوتا اور ان کا اپنا ''اصل رنگ'' ترمذی ہی میں زیادہ ظاہر ہوتا تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام بخاری کا درس دیتے اور اس کا حق ادا کرتے، لیکن صحاح ستہ میں ان کا اپنا انتخاب ترمذی شریف ہی تھی، جب کہ صحت واعتبار کے لحاظ سے بخاری کے مقابلہ میں ترمذی کا ترتیبی مقام نیچے ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اور اسی رعایت سے عام اساتذہ وشیوخ کا اعتنا بھی ترمذی کے مقابلہ میں بخاری شریف کی طرف زیادہ رہا۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ کے اس ارشاد گرامی کہ

''ترمذی میں بخاری ومسلم اور ابوداؤد تینوں کی اچھی خصوصیات جمع ہوگئی ہیں۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اس فرمان کہ

''ترمذی تمام کتب حدیث میں جامع ترین بلکہ بعض وجوہ وحیثیات سے تمام کتب میں سب سے بہتر ہے۔'' (بستان المحدثین) —— کی روشنی میں ترمذی شریف کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ پھر ترمذی شریف کی طرف خصوصی اعتنا کی ایک وجہ اس کی فقہی ترتیب بھی ہوسکتی ہے جو اسے صحاح ستہ کی دیگر کتب سے ممتاز کرتی ہے، غالباً یہی تمام وجوہات تھیں کہ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے درس حدیث میں بخاری شریف سے زیادہ ترمذی شریف میں کلام فرماتے تھے اور ائمہ اربعہؒ کے مسلکوں کو بیان کرنے کے بعد پورے زور اور قوت کے ساتھ مسلک حنفی کی راجحیت کا اثبات کرتے تھے۔

۴۔ حضرت مدنیؒ اگرچہ دارالعلوم کی اساسی فکر کی ترجمانی کرتے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فقہی مسائل اور پھر اس ذیل میں مسلکوں کا اختلاف اور مسلک حنفی کے لئے ترجیحی دلائل بیان کرتے تھے لیکن ان کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے مسلک حنفی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ دیگر ائمہ ان کے مسلک، اور ان کے دلائل کا ذکر اس انداز سے کرتے کہ ان کے احترام میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی تھی، جب کہ یہ اس دور کی بات ہے جب مسلک حنفی پر ہر چہار جانب سے منظم طور پر یلغار ہو رہی تھی اور امام ابوحنیفہؒ پر طعن وتشنیع کا بازار گرم تھا خصوصاً ''تقلید شخصی'' کی آڑ میں ایک جماعت اور اس کے علماء واکابر حنفیت کے ڈانڈے بڑی بے شرمی کے ساتھ شرک سے ملا رہے تھے۔ ان حالات میں حنفیت کا دفاع کرتے ہوئے بھی اعتدال واحترام کا دامن تھامے رہنا یقیناً حضرت شیخ الاسلامؒ ہی کے ظرف کی بات تھی۔

۵۔ چونکہ حضرت شیخ الاسلامؒ درس حدیث کے ذریعہ عزت وشہرت اور جاہ واحترام کے طالب نہ تھے بلکہ آپ کا منشا اللہ اور اس کے سچے رسول کی خوشنودی اور علوم نبوت کی اشاعت تھا اس لئے اپنے درس اور درسگاہ کو زیادہ سے زیادہ درس گاہ نبوت کے مماثل بنانے پر توجہ فرماتے تھے اور علم کے ساتھ ساتھ اپنے عمل وکردار سے بھی اس بات کا ثبوت فراہم کرتے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اور آپ کے مطلوبہ اعمال کی ترویج واشاعت ہی کے لئے یہ درس ہورہا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ کے ایک ممتاز شاگرد حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب علم وعمل کے اس حسین سنگم کا کچھ حال یوں بیان فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ جب باب السواک پڑھاتے تھے تو گھر سے مسواکوں کا بنڈل آتا تھا اور ہر طالب علم کو ایک مسواک دی جاتی تھی، یہ مسواک ملتی تھی تو اس کی تاکید تھی کہ ہمیشہ استعمال کرنی ہوگی۔''

اسی طرح جب بخاری میں زہریلے جانور کا زہر اتارنے کا قصہ آتا تھا کہ ایک صحابیؓ نے گاؤں کے چودھری کا زہر اتارا تھا اور وہ اتر گیا تھا تو ان کیساتھی لوگوں نے پوچھا کہ تم نے کیا پڑھا تھا؟ انہوں نے کہا کہ سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کردیا تھا۔ اس روایت پر شیخ تمام طلباء کو اس کی اجازت دیتے تھے کہ سورہ فاتحہ دعا شفاء کے لیے استعمال کرلیا کریں۔

شیخ جب کتاب المغازی پڑھاتے تھے تو ایک مجاہد کی طرح تقریر بھی کرتے تھے اور جہاد پر زور بھی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگ گھروں پر جاکر بھول جاتے ہو اور تین چیزیں یاد رہتی ہیں، لون، تیل، لکڑی۔ تم غلام ملک میں ہو اس میں جہاد کرنا تم پر فرض ہے۔ ایک ہندوستان کی وجہ سے تمام ممالک اسلامیہ غلام ہیں اور برطانوی سامراج اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے''۔ (ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دہلی، جون ۱۹۹۹ء)

۶۔ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے درس کے دوران اپنے طالب علموں کو مانوس، بیدار، تازہ دم اور مستعد رکھنے کے لئے بسا اوقات مزاح بھی فرمالیا کرتے تھے مثلاً کسی سونے والے طالب علم کو ''صدر النائمین'' یا ''رئیس النائمین'' کے نام سے پکار کر یہ حکم فرماتے کہ ''جائیے مٹکے سے منھ دھول کر آئیے'' اسی طرح وہ طالب علم تو بیدار ہو ہی جاتے دوسرے اونگھنے والے بھی پوری طرح ''باہوش'' ہوجاتے اور پوری درسگاہ کو ''نشاط نو'' کا سامان فراہم ہوجاتا ——— اور لطف یہ کہ درس حدیث کی مناسبت سے اس مزاح میں بھی مقصود اس سنت نبوی کا اتباع ہوتا جس کا حال مشہور صحابی رسول حضرت انسؓ نے یوں بیان فرمایا کہ کان یمازح اصحابہ ویخالطھم ویحادثھم۔

اسی طرح دوران درس حضرت شیخ بسا اوقات بہت برمحل اور مناسب حال اشعار پڑھا کرتے تھے اور یقیناً اس کے ذریعہ بھی اس سنت نبوی پر عمل کرنا ہوتا جس کا حال ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ کان یتمثل من شعر عبداللہ بن رواحہ ع

و یاتیک بالاخبار من لم تزود

حضرت کے ایک دوسرے نامور شاگرد حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب اپنے استاذ گرامی کے اس مشفقانہ انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''حضرت کا یہ انداز بے تکلفی بسا اوقات اتنا زیادہ ہو جاتا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس بات کے ذہول کا خطرہ ہو جاتا کہ یہی عظیم الشان اور جلیل القدر ہستی ہے جس کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے فضلائے روزگار سر جھکاتے ہیں، یہ سب کچھ سنت نبوی کی پیروی کے جذبہ کے ساتھ اس لئے بھی تھا کہ تا کہ طلبہ میں انبساط رہے اور تکلف ورعب کا حجاب استفادہ وسوالات سے مانع نہ بن جائے''۔ (شیخ الاسلام حیات اور کارنامے، ص ۱۸۸)

۷۔ اور حضرت شیخ الاسلام کے اس عمل کو بھی ہم ان کے ''خصوصی درس حدیث'' سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ جس کا حال ان ہی نامور شاگرد صاحب نے یوں بیان فرمایا ہے

''ایک روز راقم الحروف کے بخت نے یاوری کی کہ بالکل حضرت کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا موقع مل گیا، امام نے جب سورہ فاتحہ مکمل کی تو حضرت نے ''آمین'' اس طرح کہا کہ اس میں مختلف حدیثوں کے اندر وارد الفاظ ''خفض و جہر'' دونوں کی ایسی حسین آمیزش تھی جس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ حضرت اقدس دونوں پر عمل فرما رہے ہیں (یا دونوں میں تطبیق دے رہے ہیں) اور اسی سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ روایتوں کا یہ اختلاف جس نے معرکہ جیسی صورت مدتوں سے اختیار کر رکھی ہے (کہ دونوں طرف سے مستقل رسالے اور کتابیں ہی نہیں لکھی گئیں بلکہ جنگ وجدال تک کی نوبت آگئی) فی الواقع اختلاف ہے ہی نہیں بلکہ صرف تعبیر و بیان کا فرق ہے جو راویوں نے اپنی اپنی صوابدید اور فہم کے اعتبار سے اختیار کیا اور پھر وہ آگے بڑھ کر کچھ سے کچھ بن گیا''۔ (حوالہ مذکورہ، ص ۱۹۳)

۸۔ حضرت شیخ الاسلام صرف ایک شیخ الحدیث یا استاذ حدیث ہی نہ تھے بلکہ دوران تدریس بلا مبالغہ وہ ایک عظیم محدث اور حافظ حدیث نظر آتے تھے۔ وہ عمومی طور پر ہر حدیث کو اس کی پوری سند کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کرتے، گو کہ دوران تدریس متعدد کتابیں ان کے پاس موجود رہتیں، جو روزانہ گھر سے ان کے ساتھ آتی اور واپس جاتی تھیں اور کبھی کبھی حوالہ کے لئے یہ کتابیں کھولی بھی جاتی تھیں مگر متن حدیث یا اس کی سند کے لئے کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ تھی، اسی طرح مختلف دینی، سیاسی، معاشرتی اور عصری مسائل میں برمحل احادیث سے استدلال کرتے اور یہ شیخ کی وہ ادا تھی جس کے لئے وہ مشہور و منفرد تھے۔ ■

دیو بند کے سیاسی مکتب فکر کا اہم ستون

مولانا حسین احمد مدنیؒ (۱۸۷۹ء — ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ (صوبہ یوپی) پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی مولوی سید حبیب اللہ شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ بانگر مئو میں تعینات تھے۔ ابھی حسین احمد چھوٹے تھے کہ والد کا تبادلہ ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) ہوگیا۔ حسین احمد کی ابتدائی تعلیم کا مرحلہ یہیں طے ہوا۔ ذی قعدہ ۱۳۰۸ھ مطابق جون، جولائی ۱۸۹۱ء میں انہیں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۂ اسلامیہ دیو بند بھیج دیا گیا۔ وہ مولانا محمود حسن کے محبوب شاگرد تھے۔ لیکن ان کی اعلیٰ تعلیم کا مرحلہ طے نہ ہوا تھا کہ ان کے والد ماجد نے مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرلیا اور شعبان ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں وہ اپنے پورے خاندان کو لے کر عرب چلے گئے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے اس کے بعد سولہ سال مدینۂ منورہ میں بسر کیے۔ انہوں نے دیو بند ہی میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل بھی کرلی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے سلوک و طریقت میں خلافت بھی پائی۔

۱۹۱۵ء کے آخر میں مولانا محمود حسن عرب تشریف لے گئے تو مولانا حسین احمد مدنی مدینہ میں تھے اور مسجد نبوی میں حدیث پڑھاتے تھے۔ ابھی تک انہوں نے سیاست سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب مولانا محمود حسن نے انہیں بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اس طرح حسین احمد حدیث میں مولانا کے شاگرد اور تصوف میں ان کے مرید تھے، سیاسیات میں بھی ان کے شریک و معتمد اور تحریک کے اہم رکن بن گئے اور جب دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا کو برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے ایما پر مکہ کے گورنر حسین نے گرفتار کرلیا تو مولانا

حسین احمد نے بھی اپنے آپ کو حسین کی حکومت کے حوالے کر دیا کہ وہ مولانا محمود حسن کے شریک ہیں اور ان سے الگ نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ انہیں بھی گرفتار کر کے ان کے استاد مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۲۰ء کے اوائل تک قید رہے۔

۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد وہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے ایک پر جوش کارکن اور رہنما کی حیثیت سے ملک کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جو تحریک خلافت کے رہنما تھے۔ ان کی دعوت پر انہوں نے مدرسہ سلامیہ کلکتہ کا رخ کیا، جو ابھی حال میں قایم کیا گیا تھا۔ یہاں سے وہ سلہٹ چلے گئے جہاں ایک استاد کی حیثیت سے چھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اس کے بعد کے تیس سال انہوں نے دیوبند کی خدمت میں گزارے۔ اس زمانے میں جب کہ وہ تعلیمی کاموں میں مشغول تھے وہ تحریک آزادی میں بھی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔ اپنی سیاسی کارگزاریوں اور بدیشی حکومت کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید کیے گئے۔ گورنمنٹ کی ترغیب وتحریص، مسلم لیگ کی مخالفت، مخالف علماء کے حملے اور خود ان کی قوم کے بھرے ہوئے لوگوں کی گالیاں، کوئی چیز انہیں وطن کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کے راستے سے ہٹا نہ سکی اور سیاست میں انہوں نے ملک اور قوم کی خدمت کا جو پختہ اور پر جوش عقیدہ قایم کیا تھا اس میں ان کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔

حسین احمد اپنے لائق احترام استاد اور رہنما محمود حسن کے کہنے پر میدان سیاست میں آئے تھے، لیکن ان کی سیاست جذباتی نہ تھی۔ معاشرے کے مسائل اور حکومت کے بارے میں ان کا ایک اپنا نقطۂ نظر اور تصور تھا۔ یہ ان کے خطبات و تقاریر اور مضامین سے پوری طرح ثابت ہے، جو انہوں نے ہندوستان کی سیاست واقتصادیات اور بین الاقوامی امور پر لکھے ہیں۔

مذہبی معاملات میں ان کا علم گہرائی اور وسعت دونوں میں غیر معمولی تھا۔ لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ دینی علوم کے ماہر ایک مولوی نے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی طاقتوں کے اسلامی ملکوں سے تعلقات کے بارے میں کس طرح اتنی مستند اور کثیر معلومات فراہم کر لیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدینہ میں جو مسلم ممالک کا مذہبی مرکز ہے ان کی پندرہ سال سے زیادہ رہائش اور تین ساڑھے تین سال تک مالٹا کی قید و بند کے زمانے میں مسلم ممالک کے بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور یورپ یعنی جرمنی، آسٹریا، اٹلی وغیرہ ممالک کے لوگوں سے ملتے جلتے رہنے کی وجہ سے بین الاقوامی معاملات میں ان کی نظر بہت گہری اور معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں۔

محمود حسن کے برخلاف ان کے خیالات ان کے خطبوں، تقریروں اور ان کے پیروؤں کی تصنیفات اور تحریرات میں بکھرے پڑے ہیں۔ حسین احمد نے ایک کثیر مقدار میں اپنی تصنیفات اور تحریرات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں ان کے خیالات واضح طور پر درج ہیں۔

دوسرے اہم سنجیدہ ہندو اور مسلم مفکرین کی طرح حسین احمد بھی جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے، وہ انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد کے بنیادی اصول، دونوں رخ سے تھے۔ خواہ وہ مذہب کے راستے سے اندرونی طور پر اس ابدی روح کے بارے میں ہوں اور خواہ سیاست اور معاشیات و اقتصادیات کی راہ سے انسان کی زندگی اور فطرت سے ہم آہنگی کے بارے میں ہوں۔ ان کی تحریرات اور بیانات، (خطبات و تقاریر، خطوط) اور ان کی خودنوشت ''نقشِ حیات'') میں ان کے خیالات کا اور عمل سے ان کے رویے کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک مسلم اسکالر (عالم دین) کی حیثیت سے ان کا کامل یقین تھا کہ قرآن کلام الٰہی اور حدیث (یعنی پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات اور اعمال کا مجموعہ) انسانی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کے لیے اپنے اندر مکمل ہدایت و رہنمائی رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے مکمل ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ اس لیے نہ صرف اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات کو اس کے زیر ہدایت ہونا چاہیے بلکہ ان تمام امور کو بھی جن کا تعلق سماج، اقتصادیات، سیاست یا کلچر کے معاملات سے ہے، مذہبی ہدایات و تعلیمات اور اخلاقیات کے تحت لانا چاہیے۔ ان کے خیالات کے مطابق مذہبی، روحانی اور دنیوی معاملات میں کوئی تصادم نہ ہونا چاہیے۔

اس لیے سچا مسلمان وہ ہوتا ہے، جو خیالات کلام اور عمل سب میں احکام الٰہیہ کا مطیع ہوتا ہے اور کسی حکم کو جو اس کے مذہب کے خلاف ہو، ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی آزادی کسی دنیوی حکمران کے پاس رہن نہیں رکھ سکتا ہے، جس کا قانون اور جس کی گورنمنٹ کا مقصد یہ ہو کہ اسلامی تصورات، اسلامی طرز زندگی: اسلامی اقتدار اور مقتدرات کو تباہ و برباد کر دے۔

اس لیے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی پوری طاقت لگا کر ہندوستان سے برطانیہ کے اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ ان کی تقریروں اور تحریروں کے بے شمار حوالے دیے جا سکتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو پر جوش طور پر ابھارا گیا ہے کہ بیرونی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے اتحاد و تعاون سے غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔

اس اپیل کے ساتھ ہی ساتھ بغاوت کو حق بہ جانب قرار دینے کے لیے مفصل بیانات دیے گئے ہیں۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''نقش حیات'' (حصہ اول) کے ۳۷۶ صفحات میں سے تقریباً دو سو صفحات صرف اس بات کی تفصیل میں صرف کیے گئے ہیں کہ برطانوی ملوکیت کے کتنے تباہ کن نتائج ہوئے ہیں۔ ان میں

حسب ذیل باتیں قابل ذکر ہیں:

۱- باشندگان ہند کی اہانت، نسل اور قومی امتیازات برت کر اور اونچی ملازمتوں سے ان کو محروم کر کے۔

۲- ملک کی اقتصادی تباہی، مال گزاری کے نظام اور صنعت وتجارت کو برباد کر کے۔

۳- غلط نظام عدلیہ، جو مقدمہ بازی اور رشوت خوری کی ہمت افزائی کرتا ہے اور انصاف میں تاخیر اور بہت زیادہ خرچ کرانے کا ذمہ دار ہے۔

۴- قانون سازی کی کارروائیوں سے ہندوستان کو الگ تھلگ رکھنا اور

۵- بیرونی اقتدار کے سبب عامۃ الناس کے اخلاق کی گراوٹ۔

اسی تصنیف کے دوسرے حصے میں کافی اوراق اس تفصیل میں ہیں کہ کس طرح مغربی طاقتوں نے حکومت آل عثمان کے ساتھ معاملات میں سنجیدہ وعدوں کی خلاف ورزی کی اور فریب کاری سے کام لیا۔ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان تمام طاقتوں میں برطانیہ کا نامۂ اعمال سب سے زیادہ سیاہ ہے۔ ان واقعات سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ برطانوی اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقا اور اپنے مستقبل کی زندگی کے لیے برطانوی مملکت کو جو ایشیا اور افریقہ کی اقوام کے لیے ایک خطرہ ہیں، تباہ وبرباد کر دیں(۱)

لیکن مولانا مدنی کے خیال کے مطابق مسلمانان عالم کی نجات ہندوستان کی آزادی پر منحصر ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کے افکار پر مبنی ایک تحریک (اصلاح وجہاد) انیسویں صدی میں چلائی گئی جس کا پہلا دور ۱۸۳۱ء میں سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پر ختم ہوا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جس بے رحمی اور بربریت کا اظہار کیا گیا، اس نے جوش کو مدہم کر دیا اور تحریک کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کام مذہبی نقطۂ نظر رکھنے والوں کے دائرے میں دار العلوم دیوبند کے قیام نے اور قومی دائرے میں انڈین نیشنل کانگریس نے کیا، جس نے شروع ہی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور انتہائی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

مولانا حسین احمد یہ تسلیم کرتے تھے کہ کانگریس ہی طاقت چھیننے کا خاص آلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ان کو بہت اشتعال دلایا گیا، طعنے دیے گئے اور ان کی مخالفت کی گئی، لیکن ۱۹۲۰ء میں جو فیصلہ انہوں نے کانگریس کے نظام کی حمایت کا کیا تھا، اس کے بارے میں ان کے دل کے اندر کبھی شک اور تذبذب پیدا نہیں ہوا۔ خاص کر جب کہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی آخری منزل آزادی کامل ہے۔ ہندوستان کے مسائل کے بارے میں ان کے واضح رویے اور کانگریس کی حمایت کی بناء پر انہیں بہت سے اعتراضات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ان تمام مسائل میں جس مسئلے نے تلخ ترین جھگڑا کھڑا کیا وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو مذہبی اختلافات کے باوجود ایک متحدہ قوم بننا چاہیے تا کہ آزادی حاصل ہو اور سب کے فلاح و بہبود کی حکمت عملیوں کی کارروائیاں کی جاسکیں۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ زمانہ حاضرہ کی قومیں ملک کی بنیاد پر بنی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب کی بنیاد پر۔

اقبال نے یہ سمجھا کہ انہوں نے اس تصور پر حملہ کیا ہے کہ قومیت کی اصل اساس مذہب ہے اور جس قومیت کی بنیاد نسل، زبان یا رنگ ہے وہ ملعون ہے ان کے نزدیک ملک اور علاقائی بنیاد پر قائم قومیت اسلامی تصور کے خلاف تھی۔ انہوں نے ایک بیان میں یہ بحث کی کہ (مولانا) مدنی کے دعوے کی تائید اسلامی لٹریچر سے نہیں ہوتی، انہوں نے ان کے علم کو بھی ناقص بتلایا اور ایک قطعے میں ان کا مضحکہ بھی اڑایا۔

مولانا حسین احمد نے مجبوراً جواب لکھا۔ کیونکہ اقبال کے خیالات سے قومیت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام "متحدہ قومیت اور اسلام ہے"۔(۲)

اس رسالے میں بڑے عالمانہ انداز میں انہوں نے مسئلے کے دو پہلوؤں پر بحث کی ہے:

۱۔ قوم کے معنی اور اس کی تعریف اور یہ کہ قوم میں اور ملت میں کیا فرق ہے؟ اور

۲۔ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ وغیرہ اسلامی وتاریخی ماخذ اس بارے میں کیا بتلاتے ہیں؟

انہوں نے ابتدائی، متوسط اور حال تینوں زمانوں کے عربی لغات کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے لفظ "قوم" سے علاوہ اور معنوں کے جن میں وہ استعمال ہوسکتا، مراد مردوں اور عورتوں کا وہ گروہ ہے جو کسی مشترک مقصد کے لیے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کے لیے اپنے آپ کو پابند کرلیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ مقصد مذہبی ہی ہو۔

قرآن کا طرز کلام اس معنی کی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے خدا کے پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں، دونوں کو ایک قوم کہا ہے۔ مثلاً: محمد (ﷺ) اور قریش! قرآن میں ایک ایسے گروہ کا تصور بھی موجود ہے جو مختلف مذاہب کے لوگوں سے مرکب ہو۔ مثلاً پیروان عاد اور فرعون! لیکن پیغمبر اسلام (علیہ السلام) کی مثال اس معنی کی تائید میں سب سے زیادہ یقین دلانے والی شہادت ہے کیونکہ اپنی پیغمبری کے چودھویں سال محمد ﷺ نے مدینہ کے یہودیوں اور اپنے مسلمان پیروؤں کو اس بات پر متحد کیا اور دونوں نے اقرار صالح کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ بت پرست عربوں کے خلاف جو مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، جنگ کریں گے۔ شرائط معاہدہ یہ تھے کہ ہر فریق اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہوگا۔ لیکن بقیہ تمام معاملات میں یہودی اور مسلمان ایک قوم متصور ہوں گے۔

لفظ ''ملت'' کے بالکل مختلف معنی ہیں اس سے مراد صرف وہ گروہ ہوتا ہے جو مذہب اور احکام الٰہیہ (شریعت) کی بنیادوں پر منظم ہو۔ اس کا اطلاق ہر مذہبی گروہ پر ہوسکتا ہے۔ خواہ اس کے افراد کا مشترک مذہب کوئی بھی ہو۔ چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں سے مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ بلکہ غالباً وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ دیگر تصورات اس اتحاد کی زبردست تائید کرتے ہیں۔ مثلاً ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر ایک ہی نسل کی پیداوار ہیں۔ سیکڑوں سال سے ایک ملک میں رہائش نے ان میں یکساں رویہ اور طرز زندگی بنادیا ہے، وہ ایک مشترک زبان بولتے ہیں اور ان میں تاریخی روایات بھی مشترک ہیں۔ دونوں نے مل کر اپنا الگ الگ مذہب اور پرسنل لا قائم رکھتے ہوئے یکساں ادب، فنون لطیفہ اور موسیقی کو تعمیر کیا ہے۔ گاؤں اور شہروں میں وہ زندگی کے بے شمار مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ یہی حال اقتصادی امور، اسکولوں، کالجوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل بورڈوں اور قانون ساز اسمبلیوں کا بھی ہے۔

''ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے، جس کی بنا جناب رسول ﷺ نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک قومی ہوجائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں، ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے، بلکہ ہندوستان کی بسنے والی تمام قومیں، اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد رہیں، اپنے مذہبی رسم و رواج اور مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں، اپنے اپنے پرسنل لا اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرلے۔'' (۳)

اقبال نے اعتراض کے رخ سے جو قطعہ لکھا تھا اس کا یہ جواب دیا گیا ہے:

ترسم نہ رسی بکعبہ تو اے اعرابی   کایں رہ کہ تو میروی بانگلستان است

(اے عرب کے صحرانورد! مجھے خوف ہے کہ تو مکہ کے مقدس مقام پر نہیں پہنچے گا کیوں کہ تو نے جو راہ اختیار کی ہے وہ تو انگلستان کو جاتی ہے)

جہاں تک ابوالاعلیٰ مودودی کا تعلق ہے۔ حسین احمد نے ان کے مذہبی آرا کی مکمل طور پر تردید کی، جن کے متعلق انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سنیوں کے عقائد کے بالکل خلاف ہیں اور خارجیوں اور اسی قسم کے لوگوں کی صف میں آتے ہیں۔ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ مسلمان صرف ایک اپنی علیحدہ سوسائٹی کے اندر ہی رہ سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اقتدار میں شریک نہیں ہو سکتے، بالکل غلط اور نا قابل قبول ہے۔

دستور کے بارے میں کہ آزاد اور بلا تقسیم ہندوستان کا آئندہ دستور کیا ہو؟ مولانا مدنی ایک واضح رائے رکھتے تھے۔ حسب ذیل دفعات میں ان کا ملخص بیان کیا جا سکتا ہے۔ (۴)

۱- ہندوستان کی حکومت جمہوری ہوگی اور اس کا صدر عام انتخاب سے چنا جائے گا۔ وہ سب سے دافع آئینی افسر کے اختیارات برتے گا۔

۲- مرکزی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے، لیکن ان کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ مرکز صرف چند امور کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ دفاع، خارجی پالیسی رسل ورسائل، ٹرانسپورٹ اور مالیات، مابقیہ امور صوبوں کے دائرۂ اختیار میں ہوں گے۔ مذہبی امور کا تعلق بھی صوبائی حکومتوں سے ہوگا۔

۳- تعلیم ایک صوبائی مسئلہ ہوگا۔

۴- ہندوستان کی مشترکہ حکومت مسلمانوں کے مذہبی قوانین (شریعت) یا مسلمانوں کے قانون فوجداری کا نفاذ نہ کرے گی۔ یہ مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری ہوگی۔

۵- حکومت کا نظام مختلف فرقوں کے مل جل کر کام کرنے کی بنیاد پر ہوگا۔

حسین احمد مدنی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت کے نظام کے چلانے میں حصہ دار ہونے اور باہمی اتحاد کے معاہدے کے نفاذ سے مسلمانوں پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''مسلمان غیر مسلم قوم سے بھی تعلقات قائم کر سکتا ہے اور اسلامی برادری کی امداد واعانت کرتا ہوا، ان معاہدوں کی پابندی کرنے کا بھی جو اس نے غیر مسلم قوم کے ساتھ کیے ہوں، مکلف ہو سکتا ہے، بلکہ اس امر کا بھی مکلف ہوگا کہ اگر کوئی دفعہ اس معاہدے کی، جو اس نے کسی غیر مسلم قوم سے کیا تھا، اسلام کی عالمگیر برادری کی امداد و اعانت کے خلاف واقع ہو تو اس کو دفعہ کی پابندی کرنی ہوگی اور اسلام کی عالم گیر برادری کی اعانت سے اس وقت دست کشی کرنی ضروری ہوگی''۔ (۵)

حسین احمد نے مسلم لیگ کی سیاست کو اپنے اصول کی بنا پر جانچا اور ان کو نہ صرف مجموعی طور پر کل

ہندوستان کے لیے بلکہ مسلمانان ہند کے واسطے اور دنیا کے واسطے مضرت رساں پایا۔

انہوں نے مسلم لیگ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بتلایا کہ اس کی ابتدا ۱۹۰۶ء میں برطانوی افسران کی ترغیب پر آرچ بول (Archbold) پرنسپل ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کو درمیان میں ڈال کر ہوئی۔ لیگ کے کرتا دھرتا وہی لوگ تھے جنہوں نے ۱۹۰۶ء کے شملہ ڈیپوٹیشن کی تنظیم کی تھی جو مولانا محمد علی کے الفاظ میں ''ایک خود سپردگی کا کارنامہ تھا'' یہ گروہ اونچے طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اہل ثروت، مالکان آراضی، حکومت سے مراعات، مثل ملازمتیں اور خطابات وغیرہ طلب کرنے والے، ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا، جسے پبلک کا لیڈر یا مفاد عامہ کے لیے کام کرنے والا کہا جاسکے۔ پہلے پانچ سالوں میں مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنسیں زیادہ تر اظہار وفاداری، سیاسی ایجی ٹیشن کی مذمت اور گورنمنٹ کی حمایت وامداد کے مواقع فراہم کرتی رہیں۔

اس کے بعد ایک تبدیلی آئی کیوں کہ مسلمانوں کے حکومت سے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم نے مسلمانان ہند میں وسیع پیمانے پر غم وغصہ کی لہر دوڑادی اور لیگ کو مجبور ہو کر کانگریس کا انداز سیاست اختیار کرنا پڑا۔ ۱۹۱۸ء میں علما مسلم لیگ ایک بری تعداد میں اس کے اندر شریک ہوگئے۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے سالانہ جلسے میں ترکِ موالات کی تجویز منظور ہوئی تو لیگ خوف زدہ ہوگئی۔

۱۹۲۱ء میں لیگ نے قوم پرست سیاست سے ہٹ کر کانگریس کی مخالفت اور فرقہ وارانہ مفادات کی ترجمانی کا علم بلند کردیا۔

مولانا حسین احمد کا خیال یہ تھا کہ اس کے بعد آئندہ کچھ عرصے تک لیگ کا رویہ روز افزوں تخریب اور بربادی کا رہا۔ مسلم لیگ نے فرقہ وارانہ نفرت کی آگ کو مشتعل کیا، لوگوں کو تشدد پر اکسایا، انتقام کے فلسفے کی تبلیغ کی اور چنگیز خاں اور ہلاکو کی مثال پیش کی۔ سیاسی حقوق کے حصول کے لیے راست اقدام کا اعلان کیا، کانگریسی حکومت کی سخت مذمت کی اور جنگ کی دھمکی دی۔

مولانا مدنی نے لیگ کے دوقومی نظریے کو رد کردیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ اس سے عظیم مضرات کا غالب اندیشہ ہے۔ اگر ہندوستان تقسیم ہوگیا تو ملک کے داخلی اور خارجی دونوں امور میں سخت مضرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے لکھا:

> ''اس کے برعکس (یعنی تقسیم کی صورت میں) اگر یہ موضوعات دو مرکز کے ماتحت تقسیم کردیے جائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا دفاع، خارجہ پالیسی، رسل ورسائل وغیرہ ایک علیحدہ مرکز کے ماتحت دے دیے جائیں تو بحیثیت مجموعی ملکی وقومی نقصانات کے علاوہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچے گا۔ ان کی

وحدت فنا ہو جائے گی، اقلیت کے صوبوں میں ان کی سیاسی و اقتصادی حیثیت ختم ہو جائے گی اور اکثریت کے صوبوں کے مرکزی حکومت نا قابل حل داخلی و خارجی مصائب میں مبتلا ہو جائے گی۔ بحیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پسماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا، ۳۹-۴۰ فیصد غیر مسلموں کی منظم اور موثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستان مرکز کے وہ داخلی مسائل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآنہ ہو سکے گی اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی، جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملک سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا، مزید برآں یہ کہ حکومت اپنے وسائل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی، اس لیے اس ملک کے دفاع کو دولت مشترکہ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا۔ یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ کی سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گی''۔(۶)

اس سلسلے میں پاکستان کے بارے میں انہوں نے مزید لکھا:

''اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی موثر امداد کر سکے گی۔ بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کے تسلط کے خاتمے کے باوجود اسر نو پاکستان اور ہندوستان میں اس کا اقتدار قائم ہو جائے گا''۔(۷)

لیگ مسلمانوں میں جو خوف و ہراس وسیع پیمانے پر پھیلا رہی تھی، اس پر انہوں نے بڑے احتیاط سے غور و فکر کیا اور دکھلایا کہ کس طرح یہ سب باتیں وہم و قیاس سے تعلق رکھتی ہیں اور محض مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اس کو ثابت کیا کہ اگر اس دستوری معاہدے کا جائزہ لیا جائے جس پر کانگریس کے لیڈران نے علماء کے ساتھ مل کر آزاد ہندوستان کی گورنمنٹ کے بارے میں سمجھوتا کیا تھا تو ہر معقولیت پسند انسان کو یقین آجائے گا کہ اس معاہدے میں مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی مفاد کو پورے طور پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ان کی رائے میں:

"پاکستان کے ان یقینی نقصانات کے مقابلے میں وہ متوقع خطرات بالکل بے حقیقت ہیں جو ہندوستان کو ایک یونین کی صورت میں...... پیش آسکتے ہیں"۔(۸)

بدقسمتی سے عقل وبصیرت کی روشنی میں جو مشورہ دیا گیا تھا وہ جذبات اور تعصبات کے سیل رواں کو روک نہ سکا۔

علمائے دیوبند جنہوں نے تحریک آزادی ہند میں ممتاز اور نمایاں حصہ لیا تھا انہوں نے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی۔ جس کی غرض یہ تھی کہ چوٹی کے مسلم علماء وفضلائے ہند مذہبی اور سیاسی امور پر متفقہ رائے قائم کر سکیں۔ مولانا محمود حسن اس کے پہلے صدر تھے اور ۱۹۲۰ء کی کانفرنس میں جو دہلی میں ہوئی اپنے خطبۂ صدارت میں اس کا لائحہ عمل اور ان کارروائیوں کے اغراض ومقاصد ظاہر کیے ہیں۔

درحقیقت یہ جنگوں سے کھیلنے والے ایک قریب المرگ بوڑھے سورما کی اپنے ساتھیوں کے لیے ایک وصیت تھی کہ اس برسر حق جنگ کو جاری رکھیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ فتح حاصل نہ ہو جائے جو قربانیاں دیوبند اسکول کے عالموں اور جمعیت العلمائے ہند نے حصول آزادی کے مقصد کے لیے دیں، وہ تحریک آزادی ہند کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس مقصد کے لیے ان کے دل میں کتنی لگن تھی، اس کا مظاہرہ ان کی روزانہ زندگی میں ہوتا تھا۔ کوئی قربانی ایسی نہ تھی جو انہوں نے پیش نہ کی ہو یا پیش کرنے کے لیے تیار نہ رہے ہوں، خواہ مالی ہو یا اور کسی قسم کی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر کے اپنی پوری زندگی نوعمری سے موت تک ایک بہت ہی معمولی آمدنی، قوت لایموت پر بسر کر دی یہ لوگ کم کھانے اور تکلیف اٹھانے ہی کو راحت وآرام قرار دیتے تھے اور اکثر تو اس پر مجبور ہوتے تھے کہ نیم فاقہ کشی پر بسر کریں۔ ان لوگوں نے سالہا سال جلاوطنی کی زندگی بسر کی، کبھی تو خود اختیاری اور کبھی دیگر طور پر یا برطانیہ کے جیل خانوں میں گزاری۔ ان کو گالیاں دی جاتی تھیں، ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ زندگی کی معمولی آسانیاں ان کو فراہم نہیں کی جاتی تھیں اور قید خانے کے سب سے خراب کھانے پر ان کو رکھا جاتا تھا۔

محمود حسن، حسین احمد مدنی، عبیداللہ سندھی، ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے علماء نے ایک حرف شکایت زبان پر لائے بغیر ان سختیوں اور زیادتیوں کو برداشت کیا جو ان پر لادی گئی تھیں، ان کا انہوں نے یہ سمجھ کر خیر مقدم کیا کہ یہ سب، بنی نوع انسان اور خدا کی خدمت کی راہ کے لوازمات ہیں۔

اس دور میں مسلم افکار کی رفتار کا جائزہ لینے سے متعدد قابل لحاظ نتیجے نکلتے ہیں۔ کرزمن کے وائسرائے شپ کے زمانے میں ہندوستان کی سیاست کی ایک تیز کروٹ نمایاں ہے۔ جس کا نتیجہ:

۱- تو یہ ہوا کہ بیرونی حکومت کا جو خوف بیٹھا ہوا تھا، اس کی جگہ تنقیدوں اور مخالفتوں نے لے لی۔ شکریہ اور وفاداری کے جذبات سرد ہونے شروع ہو گئے اور باشندگان ہند کے دماغوں میں تلخی اور ذلت کا احساس

پیدا ہو کر یہ خواہش بھر گئی کہ شہنشاہیت کے چنگل سے بہر صورت رہائی حاصل کی جائے۔

۲- دوسرے مسلمان قوم جس کے جذبات کے ساتھ گورنمنٹ اس طرح کھیل رہی تھی کہ پہلے بنگال کو تقسیم کیا اور پھر چند سال بعد اس پر نظر ثانی کر کے اسے رد کر دیا۔ گورنمنٹ کے اس رویے سے مسلمانوں کے دماغوں میں تذبذب پیداہ وا اور وہ اپنے اعتماد اور اپنے وفادارانہ رویے کا محاسبہ کرنے لگے۔ یہ اور اسی کے ساتھ حکومت آل عثمان کو جس انجام تک پہنچا دیا گیا تھا، وہ بھی ان کے سامنے تھا، ان سب باتوں نے نہایت سختی سے سر سید احمد خاں کی پالیسی کی بنیادوں کو ہلا دیا، جس میں قریب نصف صدی تک مسلم فرقے کو بیم و رجا کی حالت میں حکمرانوں نے مبتلا اور ایک خواب آور موت کے گرداب میں پھنسا رکھا تھا۔ لیکن جب ہوا کا رخ بدلا اور قومی غیرت اور خودداری کا احساس ہوا تو ضمیر بیدار ہونے لگا۔

۳- تیسرے مسلمانوں کے ایک وسیع حلقے میں نہایت تیزی سے سیاسی شعور پھیلا اور اسی کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ ہندوستان کی آزادی جس طرح ہندوؤں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے اور یہ صرف ہندو مسلم اتحاد سے ممکن ہو سکتا ہے۔

۴- چوتھے قومی ایک جہتی کے بارے میں دو ایک دوسرے کے مخالف نظریے ابھرے ہندو اکثریت کا یہ خیال تھا کہ افراد کو اس طرح ایک دوسرے سے جوڑا جائے کہ ایک ایک رنگ سوسائٹی بن جائے۔ دوسری جانب مسلم اقلیت کا خیال یہ تھا کہ یہ یک جہتی فرقوں اور گروہوں کا ایک وفاق ہو، مذہبی بھی اور علاقائی بھی اور ہر ایک کو اپنے مذہب اور اپنے کلچر کو قائم رکھنے کی آزادی ہو۔

۵- پانچویں ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثریت کا نظریہ تقریباً ایک واحد سوسائٹی اور ایک واحد طرز کی حکومت کا تھا اور اکثریت اس پر راضی تھی کہ فرقوں کو اس طور پر مراعات دے کہ اقلیتوں کے مذہب اور کلچر کے تحفظ کی ضمانت ہو۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ مخصوص برتاؤ اس طور پر فرقوں کے ساتھ اگر کیا گیا کہ ان کو مخصوص حقوق اور مراعات دیے گئے تو یہ جمہوریت کے اصول "تمام شہریوں کو مساوات اور قوم کی یک جہتی" کے منافی ہوگا۔

۶- چھٹے جب کہ تمام مسلم جماعتیں اس پر راضی تھیں کہ مسلمانوں کی تنہا حیثیت کو تسلیم کر کے ان کے سیاسی، مذہبی، ثقافتی حقوق کی ضمانت دستور میں دی جائے۔ مسلم لیگ نے یہ رائے قائم کی کہ خواہ کیسی بھی ضمانتیں تحفظ حقوق کی دی جائیں۔ ایک متحدہ ہندوستان میں جہاں ہندو اکثریت میں ہوں گے، ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے گا۔ اس لیے اقلیتی مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو دو آزاد اور خود مختار حکومتوں میں بانٹ دیا جائیگا۔

اس کے خلاف مسلمانوں کی دوسری قوم پرور جماعتوں اور جمعیت العلماء ہند نے تقسیم ملک کی تجویز کی مخالفت کی، جو ان کے خیال میں ہندوستان کے لیے اور اس سے زیادہ مسلمانوں کے لیے مضرت رساں تھی۔

آخرکار مسلم لیگ جیت گئی۔ اس کی کامیابی تین وجوہ سے ہوئی:

۱- اول تو دولت اور اثر اس کے ساتھ تھے یعنی دولت مند مسلمانوں، زمینداروں اور تعلقہ داروں، راجوں مہاراجوں کے خاندان، بڑے بڑے تجار اور اعلیٰ مناصب کے پیشہ ور۔

۲- دوسرے اکثریتی فرقے کے لیڈر یا تو مسلمانوں کے خوف کے جذبات کی گہرائیوں کو ناپنے میں ناکام رہے یا اقلیتی مسائل کی پیچیدگیوں کے سمجھنے میں وہ ہندوستان کے مسائل کو برطانیہ کے مسائل کے مثل تصور کرنے کی جانب راغب تھے۔ جہاں کلچر کے اعتبار سے ایک متحدہ سوسائٹی ہے اور سیاسی اعتبار سے ایک وحدانی سوسائٹی، بدقسمتی سے مسلم لیگ اسے پسند نہیں کرتی تھی کہ مسلم فرقے کو اقلیت کی حیثیت دے، بلکہ یہ اکثریت سے برابری پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتی تھی جس نے ہندوؤں کے قدامت پرست طبقے کو ڈرا دیا۔

۳- لیکن سب سے اہم معاملہ جس سے ملک کی تقسیم ہوگئی حکومت کا رویہ تھا۔ گورنمنٹ نے مخالفین کانگریس مسلم لیڈران پر اپنی عنایت بے غایت اور سرپرستی میں اضافہ کر کے اور پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کے خوف میں اضافہ کر کے اور ہندو مسلمانوں کے اختلافات پر زور دے کر علاحدگی پسندی کے رجحانات کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس پروپیگنڈے میں سرکاری اور غیر سرکاری حضرات اور اینگلو انڈین پریس نے اہم کردار ادا کیا۔

حواشی

۱- مدنی، مولانا حسین احمد: نقش حیات، (حصہ دوم)، ص۱۰

۲- ایضاً: متحدہ قومیت اور اسلام- ہندوستان اور پاکستان سے اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۳- ایضاً: ص۴۸

۴- مدنی، مولانا حسین احمد، مکتوبات شیخ الاسلام (حصہ دوم): مکتوب ۳۳، ص۱۰۵-۹۵

اس مقام پر مرتب نے مولانا مدنی کے ایک طویل خط کا مفہوم انگریزی میں بیان کیا تھا۔ مترجم نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے تلخیص اور ترجمہ در ترجمہ کے اس عمل سے مولانا کا مفہوم غیر واضح اور مختلف ہو گیا بنا بریں مولانا کے مفہوم کو سمجھنے اور مولانا کے خیالات کے تفصیلی مطالعے کے لیے اس باب کے آخر میں مولانا کا مکمل خط بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ (ا-س-ش)

۵- ایضاً: متحدہ قومیت اور اسلام، ص۶۵ ۶- مکتوبات شیخ الاسلام، ص۱۰۱-۱۰۰

۷- ایضاً: ص۱۰۱ ۸- ایضاً: ص۱۰۱

ضمیمہ

مکتوب شیخ الاسلام

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف؟

والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا۔ مجھ کو گونا گوں مصروفیتوں کی وجہ سے اس قدر فرصت نہیں ہے کہ آپ کے سوالات کا تفصیلی جواب عرض کرسکوں، اگرچہ آپ کے سوالات تفصیل طلب ہیں، لیکن تنگی وقت کی بناء پر مختصراً جوابات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اسلام نے کسی صورت میں بھی غلامی پر قناعت نہیں کی، بہت نصوص سے دلالۃً اور صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا حکومت اور سربلندی ہے۔

۱- قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

"هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله و کفی بالله شهیدا."(۱)

۲- جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

الاسلام یعلو ولا یعلی۔(۲)

۳- شامی میں ہے:

و الملوک الذین یطیعونهم عن ضرورة مسلمون و لو کانت الاطاعة معن غیر ضرورة منهم فساق و اما طاعة الکفرة فذاک مخادعة (شامی: جلد۳، ص: ۳۶۶)(۳)

۴- اگر کسی اسلامی ملک پر کفار کا ہجوم ہو تو مسلمان پر ان کا دفع کرنا اور ان سے جہاد کرنا فرض عین ہو جاتا ہے اگر اس ملک کے مسلمان تساہل سے کام لیں تو یہی بتدریج تمام مسلمانان عالم پر فرض عائد ہو جاتا ہے (درمختار و حاشیہ ردالمختار: جلد۳، ص۳۰۶ و عالمگیری، جلد۲)

اس لیے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو کفار کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے احکام کفار کی نافرمانی سے لے کر جہاد بالسلاح تک جو ذریعہ مقاومت بھی ان کے امکان میں ہو، اس کو کام میں لائیں۔ مسلمانان ہند کی اجتماعی قوت اور ان کے موجودہ سیاسی احوال کے پیش نظر چونکہ ہندوستان کے علما اور تمام اہل الرائے حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت مسلطہ کے خلاف متشددانہ ذرائع سے جنگ کرنا مسلمانوں کی وسعت اور طاقت سے باہر ہے، اس لیے پرامن ذرائع ہی اختیار کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ لیکن اگر تنہا مسلمان اس قسم کی جدوجہد کریں تو ناکامی بدیہی ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کے سیاسی واقتصادی نقصانات بدیہی ہیں۔ اس لیے حکومت کے خلاف پرامن جدوجہد کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اس میں شریک ہوں، مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قائم ہوگا، اس کی تعمیر میں مسلم وغیرہ مسلم دونوں شریک ہوں گے۔ یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا، تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور موثر عنصر ہوگا، اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر ڈھال سکتے ہیں، ان ہی وجوہ سے آزادی کے بعد قایم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجودہ نظام کے مقابلے میں اہون البلیتین قرار دیا جاتا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے بطور اصول اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت سے متعلقہ سوالات کا جواب بہ ترتیب حسب ذیل ہے:

۱- ہندوستان کا آیندہ نظام جمہوری ہوگا، جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے معینہ عرصہ کے لیے ایک صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوتا رہے گا۔ صدر جمہوریہ کبھی مسلمان ہوگا، کبھی غیر مسلم ہوگا لیکن اس کو شاہانہ اختیارات حاصل ہوں گے۔

۲- مرکزی حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب اگرچہ کم ہوگا لیکن بنیادی آئین میں مسلمانوں کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں گے کہ مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی واقتصادی حقوق پوری طرح محفوظ رہیں گے اور مضامین جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے، وہ بہت ہی محدود ہوں گے، مثلاً دفاع، معاملات خارجہ، رسل ورسائل اور بعض محدود مالی اختیارات اس کے علاوہ تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل صوبوں کے اختیارات ہوں گے، اس لیے اس سلسلے میں قوانین شرعی کے اجراء کے نفاذ کا مسئلہ صوبائی حکومتوں سے متعلق ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی ایسے تحفظات دیئے جائیں گے کہ مسلمانوں کو اپنے قوانین اور اپنے قانون شخصی (پرسنل لا) پر عمل کرنے کی آسانیاں حاصل ہوں۔

۳- نظام تعلیم صوبوں کے تحت اختیار ہوگا۔ اس لیے مسلم اکثریت کے صوبوں پر تو آپ کا سوال عائد

ہی نہیں ہوتا۔[۴] اقلیت کے صوبوں میں بھی چونکہ مسلمان صوبوں کے نظام حکومت میں مختلف تناسب کے ساتھ شریک ہوں گے، اس لیے ان کو حق ہوگا کہ حکومت اپنی تعلیم کا انتظام کریں جس کی آزادی ان کو حاصل ہوگی۔ اگر نظام تعلیم اور تعلیمی نصاب مسلمانوں کے قومی و ملی مزاج کے مخالف نہ ہو، محض اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کلاسوں میں مسلم اور غیر مسلم طلبہ کے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، جب کہ تعلیمی اداروں کے باہر مختلف ادارہ ہائے حکومت و تجارت و صنعت میں مسلم و غیر مسلم کی شرکت موجود ہے اور شہری و دیہاتی زندگی میں ان کے اشتراک سے گریز ناممکن ہے، مسلمانوں میں خالص اسلامی تہذیب کی اشاعت اور غیر اسلامی اثرات کی مدافعت، نجی اصلاحی اداروں کے ذریعے عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

۴- ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک ملکی اور قومی سوال نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی ملی آزادی کا سوال ہے۔ انگریزی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد اعلی کلمۃ الحق کے وسائل اختیار کرنے کے لیے نہ صرف ہندوستان کے مسلمان موجودہ حالت سے بہتر حالت میں ہوں گے، بلکہ اسلامی ممالک کی غلامی کی زنجیریں بھی کٹ جائیں گی۔[۵] اسلام کے اجتماعی فرائض ادا کرنے کے لیے وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے زیادہ آزاد ہوں گے اور ہندوستان کے مسلمان رضا کارانہ حیثیت سے مؤثر امداد کریں گے۔ ہندستان کی مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی مؤثر نمایندگی، پورے ملک میں ان کی کثیر تعداد، مختلف صوبوں میں ان کی خود مختار حکومتیں اور ان صوبوں کی جغرافیائی حیثیت، مسلمانوں کی قومی و ملی خصوصیات اور ہمسایہ اسلامی ممالک سے ان کا مذہبی و سیاسی اتحاد و تعلقات اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی اسلامی مصالح سے متصادم نہ ہوگی۔

۵- بلاشبہ اسلامی قوانین ہی دنیا کے لیے حقیقی امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ حکومت میں ان قوانین کی حاکمیتِ مطلقہ قائم نہ ہوگی اور نہ حدودِ شرعیہ جاری ہوں گی، لیکن یہ خود مسلمانوں کا علمی و عملی فریضہ ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اسلامی قوانین کی یہ حیثیت تسلیم کرالیں: اہون البلیتین آخری منزل مقصود نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے لیے سعی و عمل کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے یہ راہیں بند نہیں ہو جائیں گی۔

۶- آپ کا یہ سوال تمام مغالطوں اور غلط فہمیوں کا سرچشمہ ہے، ہندوستان کا نظام حکومت خواہ ایک ہی یونین مرکزی کی بنیاد پر قائم کیا جائے، یا دو جداگانہ ریاستوں کے اصول پر بہرصورت مشترکہ نظام ہوگا، جس میں مسلم و غیر مسلم مختلف تناسب مگر برابر حقوق و اختیارات کے ساتھ شریک ہوں گے، محض عددی نسبت کے اختلاف سے ان کی مشترکہ حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔[۶] اس لیے مشترکہ نظام کو اسلامی نظام حکومت یا حکومتِ الٰہیہ نہیں کہا جاسکتا، جہاں تک صوبوں کے داخلی مسائل کا تعلق ہے، مرکز کی وحدت اور تعدد سے اس

میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، ایک مرکز کے ماتحت بھی صوبے اسی طرح خود مختار ہوں گے جس طرح دو مرکزوں کے ماتحت ان کو آزادی حاصل ہوگی، اس لیے اگر مسلمان چاہیں تو ایک یونین میں شریک رہتے ہوئے ان معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی مسائل میں اس حد تک اسلامی فکر کو بروئے کار لا سکتے ہیں، جس حد تک غیر قوموں کا اشتراک اس کو برداشت کر سکتا ہے، پاکستان کے مشرقی و مغربی منطقوں میں بہ ترتیب ۳۹ اور ۴۰ کی نسبت سے ایک منظم غیر مسلم اقلیت کی موجودگی کی وجہ سے خالص اسلامیت کو بروئے کار لانے میں جو مشکلات سد راہ ہوں گی وہ باخبر لوگوں سے مخفی نہیں ہیں۔ البتہ دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کرنسی اور بعض محاصل مالیہ کے بارے میں مرکز کی وحدت اور تعدد سے ایک فرق ضرور نمایاں ہوتا ہے، وحدت مرکز کی صورت میں یہ مضامین ایک ایسی یونین کے ماتحت ہوں گے جس میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ ۴۵ فیصد ہوگا، جو بجائے خود ایک اہم اور مؤثر تناسب ہے۔(۷) لیکن اس صورت میں ملک کی طاقت منقسم ہو کر کمزور نہ ہوگی اور خارجی دراندازی کا امکان کم سے کم ہوگا، ہندوستان کی اس مرکزی قوت سے غیر مسلم اقوام کی طرح ہندوستانی مسلمان اور ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک بھی مستفید ہوں گے، اس کے برعکس اگر یہ موضوعات دو مرکز کے ماتحت تقسیم کر دیے جائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا دفاع خارجہ پالیسی، رسل و رسائل وغیرہ ایک علاحدہ مرکز کے ماتحت دے دیے جائیں تو بحیثیت مجموعی ملکی و قومی نقصانات کے علاوہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچے گا، ان کی وحدت فنا ہو جائے گی، اقلیت کے صوبوں میں ان کی سیاسی و اقتصادی حیثیت فنا ہو جائے گی اور اکثریت کے صوبوں کی مرکزی حکومت ناقابلِ حل داخلی و خارجی مصائب میں مبتلا ہو جائے گی۔ بحیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پس ماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں کا خود مکتفی نہ ہونا(۸) ۳۹-۴۰ فیصد غیر مسلموں کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستانی مرکز کے وہ داخلی مسائل ہوں گے، جن سے حکومت عہدہ برآ نہ ہو سکے گی، اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی، جس کی وجہ سے اقتصادی مندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا مزید برآں یہ حکومت اپنے وسائل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی۔(۹) اس لیے ملک کے دفاع کو دولتِ مشترکہ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ کے سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا۔(۱۰) اپنی کمزوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی مؤثر امداد کر سکے گی، بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی، ہندوستان اور پاکستان

کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کے تسلط کے خاتمے کے باوجود از سر نو پاکستان و ہندوستان میں اس کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ پاکستان کے ان یقینی نقصانات کے مقابلے میں وہ متوقع خطرات بالکل بے حقیقت ہیں، جو ہندوستان کی ایک یونین کی صورت میں غیر مسلم اقلیت کی وجہ سے پیش آسکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان مسلمانوں کے لیے اہون البلیتین نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اہون البلیتین ہے۔(۱۱)

۷۔ ہندوستان دار الحرب ہے، وہ اس وقت تک دار الحرب باقی رہے گا، جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا، دار الحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیر ہمانے اپنے فتاوی میں اس موضوع پر جو بحثیں فرمائی ہیں، ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا، مزید تفصیلات کے لیے جامع الرموز: جلد ۳، کتاب الجہاد، شامی: جلد ۳، ص ۳۶-۳۳۵ اور فتاویٰ عالمگیری: جلد ۲ باب استیلاء الکفار وغیرہم ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ الف: دار الحرب میں غدر اور خیانت کے سوا ہر طریقے سے اہل حرب سے اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لے مباح ہے۔ اس لیے مسلمان اور حربی کے درمیان معاملہ سود پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ طرفین کا اصول ہے:

"لان الرباء لایجری بین المسلم و الحربی فی دار الحرب".(۱۲)

امام ابو یوسف کے نزدیک حربی کے ساتھ بھی سودی معاملات جائز نہیں ہیں، جو لوگ از راہ تقویٰ دار الحرب میں سود لینے سے اجتناب کرتے ہیں وہ امام ابو یوسفؒ کے اسی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن یہ تمام تفصیلات اسی صورت میں ہیں۔ جبکہ سود لینے والا مسلمان ہو اور سود دینے والا حربی ہو۔ مسلمان کا مسلمان سے سود لینا، یا غیر مسلم کو سود دینا متفقہ طور پر نا جائز ہے۔

ب: سرکاری بنکوں میں اور ان میں جن کے مالک غیر مسلم ہوں، روپیہ جمع کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس روپیہ سے وہ کاروبار کر کے مالی استفادہ حاصل کرتے ہیں اور اسی کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر صرف کیا جاتا ہے؛ لیکن جمع کرنے کے بعد اس کا سود نہ لینا اور اس کو بنکوں میں چھوڑ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ اس روپیہ کو جو بنکوں کے سود کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں صرف کر دینا چاہیے۔

عالمگیری میں ہے "و ما او جف المسلمون علیہ من اموال اہل الحرب بغیر قتال یصرف فی مصالح المسلمین".(۱۳) الخ (جلد ۲، کتاب السیر، ص ۲۱۸) تفصیلات کے لیے رد المختار:

جلد۳،ص ۳۴۵ اور شرح السیر الکبیر: جلد۳،ص ۱۴، ۱۷۸، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹، عالمگیری: جلد۲،ص ۲۱۰ وغیرہ ملاحظہ فرمائیے۔

ج: ہندوستان کی زمین نہ عشری ہے نہ خراجی۔ (۱۴)

و: استعانت بالمشرکین اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کے بارے میں مولانا محمد شفیع صاحب و مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی وغیرہما کی جانب سے جو فتاوی دیے گئے ہیں۔ (۱۵) ان کے جوابات بھی اخبارات اور مستقل رسائل کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جمیعت علمائے ہند کے دفتر سے یہ جوابی فتاویٰ حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مجملاً یہ ہے کہ جن لوگوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، انہوں نے حالات کا صرف ایک رخ نمایاں کیا ہے، بلاشبہ اگر مسلمانوں میں بذات خود قوت مقاومت موجود ہو اور استعانت بالکفار میں فتنے کا خوف نہ ہو تو استعانت صرف اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اسلام کا حکم ظاہر اور غالب رہے، جیسا کہ قائلین عدم جواز نہ تصریحات پیش کی ہیں، لیکن اگر مسلمانوں میں بذاتِ خود مقاومت (کی قوت) موجود نہ ہو اور ان کے لیے کوئی دوسری جائے پناہ بھی نہیں ہے تو اختیار اہون البلیتین کے اصول کے ماتحت بعض کفار کا مقابلہ بعض کفار کی استعانت سے جائز ہے کہ اسلام کا حکم ظاہر اور غالب رہے، جیسا کہ قائلین عدم جواز نے تصریحات پیش کی ہیں، لیکن اگر مسلمانوں میں بذات خود مقاومت (کی وت) موجود نہ ہو اور ان کے لیے کوئی دوسری جائے پناہ بھی نہیں ہے تو اختیار اہون البلیتین کے ماتحت بعض کفار کا مقابلہ بعض کفار کی استعانت سے جائز ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ (شرح السیر الکبیر: جلد۳،ص ۱۸۷) خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مفاد اور مصالح بھی پیش نظر ہوں تو ایسی استعانت بالکفار کے جواز میں شبہ نہیں ہے، چنانچہ شرح السیر الکبیر میں اس قسم کی جزئیات بکثرت بیان کی گئی ہیں۔

۱- الوقال اهل الحرب للاسراء فیهم قاتلوا معنا عدونا من المشرکین ......الخ (۹۱۶ کے ماتحت شارح سرخسی نے فرمایا فلا باس ان یقاتلوا معہم۔ شارح نے اس ورت مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، اس اعتراض کو بھی دفع کیا ہے، جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

۲- قال قیل کیف یسعهم هذا و فیه وة علی المسلمین لانهم اذا ظفروا بعدوهم فامنوا جانبهم اقبلوا علی قتال المسمین و ربما یا خذون منهم الکراع و السلاح فیقودون بها علی المسلمین، قلنا ذالک موهوم و مایحصل لهم من النجاة عن اسر المشرکین بهذا

القتال معلوم فيترجح هذا الجانب: . (صفحه ۴۳-۲۴۲) .

و ان كانوا في حزو بلد يخافون على انفسهم الهلاک فلا باس بان يقاتلوا معهم المشركين اذا قالو فخرجكم من ذالک لان في هذا القتال غرضاً صحيحا وهو دفع البلاء و الضرر الذى نزل بهم. (ص ۲۴۳) .

۴- ولو ان هل الحرب ارسلوا الاسراء خاصة ان يقاتلوا اهل الحرب اخرين و جعلوا لامير من الاسراء و جعلواله ان يكم بحكم اهل الاسلام و سلموا الهم الغنائم يخرجونها انى دارالاسلام فلا باس بالقتال على هذا اذا خافوهم اولم يخافوا لانهم يقاتلون و حكم الاسلام هو الظاهر عليهم و يكون الجهاد ذالک جهاد امنهم . (ص. ۲۴۷) .

جوازِ استعانت کی ان صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے مشرکین کے ساتھ ان شرائط پر اشتراکِ عمل کرنا کہ اس مشترکہ جدوجہد میں فتح حاصل کرنے کے بعد۔

۱- ملک کے نظام میں ان کا ایک موثر حصہ ہوگا۔

۲- مسلمانوں کا قانون شخصی (پرسنل لا) محفوظ ہوگا اور ان کو اس پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔

۳- مسلمانوں کے مذہبی ادارے، اوقاف، مساجد، مقابر وغیرہ محفوظ رہیں گے۔ ان کا کلچر اور تہذیب وتمدن محفوظ رہے گا۔

۴- گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مسلم اکثریت کی حکومتیں قائم ہوں گی، جو تمام داخلی معاملات، قانون سازی، نظام تعلیم، اقتصادی نظام کے قیام، معاشرتی اور تمدنی مسائل میں پوری طرح بااختیار ہوں گی، کیا مسلمانوں کے مفاد اور مصالح کے لحاظ سے مفید نہیں ہے؟ یہ مصلحتیں ومفادات ان اعراض سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ جن کی بناء پر استعانت بالمشرکین کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے ہندوستان کی (تحریک) آزادی (میں) غیر مسلم جماعتوں اور قوموں سے اشتراکِ عمل کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ واللہ اعلم والیہ یعول الحق وھو یہدی السبیل۔

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

حواشی

۱- وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر تاکہ اوپر رکھے اس کو ہر دین سے اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا۔

۲- سربلندی تو اسلام ہی کو ہے، کوئی اس پر حاکم نہیں۔

۳- اور وہ بادشاہ جنہوں نے غیر مسلم حکومت کی ضرورۃ اطاعت کرلی ہے مسلمان ہیں اور اگر ان کی اطاعت بلاضرورت کے ہوتو فاسق ہیں، لیکن کفار کی اطاعت سو یہ وقتی تدبیر ہے۔

۴- جتنا حصہ اس وقت پاکستان کہلاتا ہے وہ تب بھی قدرتی طور پر مسلم اقتدار کے ماتحت ہوتا، مزید برآں مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال بھی اسی اقتدار کے ماتحت ہوتا کیوں کہ یہ تمام علاقہ جو مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش اور پٹیالہ یونین پر مشتمل ہے۔ صوبۂ پنجاب کا حصہ تھا، جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس بنا پر پشاور اور کراچی سے سہارنپور تک مسلم اقتدار کے ماتحت آتا، کشمیر کا سوال بھی خود بخود حل تھا اس طرح بنگال کا صوبہ آسنسول تک جس میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے تمام اضلاع شامل تھے، آسام میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی لیکن مسلمان وہاں چونتیس فیصد تھے، باقی میں ہندو اور پہاڑی علاقہ کی اقوام شامل تھیں، ہندو بھی چونتیس فیصد تھے، یا پینتیس اور توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا، اسی بناء پر ۱۹۳۷ء میں سر سعد اللہ وہاں کے وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ یہی حال دہلی کا تھا۔ اس طرح نصف ہندوستان مسلمانوں کے زیر اقتدار آتا اور اس صورت میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نسبت بہت مضبوط ہوتی۔

۵- ہندوستان کی تقسیم سے اس مقصد کو بہت دھکا لگا یہ مقصد قریب قریب فوت ہوگیا، کیونکہ اول تو ہندوستان کی طاقت گھٹ کر نصف رہ گئی، پھر وہ بھی رات دن خود اپنے مسائل میں الجھی ہوئی۔ چنانچہ کشمیر یا نہروں کے پانی جیسے مسائل نے ہندو پاکستان دونوں کو ایک دوسرے کے برخلاف ایسی پیچیدگی میں مبتلا کردیا ہے کہ کسی دوسرے بین الاقوامی مسئلے پر اثر انداز ہونے کے بجائے یہ دونوں ملک دنیا کی بڑی طاقتوں کے رحم و کرم کے محتاج بن گئے ہیں۔

۶- علاوہ ازیں پاکستان ایسی نکیل ہے کہ دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت اگر اس کو تھامے رہے تو ہندوستان کا

اونٹ بدک کر کبھی بھی کسی دوسری طرف نہیں جاسکتا۔ یہ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے جب پاکستان کا تصور جنم لے رہا تھا اور تبادلہ آبادی کی بھیانک تصویر کسی کے خواب میں بھی نہیں آئی تھی، اب جب کہ پاکستان بن چکا ہے اور غیر مسلموں کا تناسب بھی وہاں قائم نہیں رہا تو کیا کوئی اس خالص مسلم اسٹیٹ کے متعلق دعوی کر سکتا ہے کہ وہاں اسلامی نظام حکومت یا حکومت الٰہیہ ہے۔ آج اس کے پرانے عقیدت مند بھی اس اعتراف پر مجبوں ہیں کہ پاکستان کا موجودہ نظام حکومت نہ صرف اسلام کے دامن پر تقدس پر بدنما داغ ہے، بلکہ موجودہ ملت اسلامیہ کے لیے بھی ننگ و عار ہے۔

۷- جمعیت علمائے ہند اور قوم پرور مسلمانوں نے جو فارمولا کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا اور اگست ۴۶ء کے اجلاس میں ک انگریس نے اس کو تقریباً منظور بھی کر لیا تھا اس کی اہم دفعات یہی تھیں (۱) صوبے آزاد ہوں گے (۲) چند موضوعات کے علاوہ باقی جملہ مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہوں گے (۳) مرکز میں نمایندگی اس طرح ہوگی ہندو ۴۵ فیصد مسلمان ۴۵ فیصد اور دیگر اقلیتیں ۱۰ فیصدی۔

۸- صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان۔

۹- جب کہ پاکستان بنے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں، اس پیشن گوئی کی صداقت کا مشاہدہ فرمایئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی اتقوا فراسۃ المومن فانہ یری بنور اللہ او کمال قال صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کیجیے۔ ترجمہ: مومن کی فراست اور دور اندیشی سے پرہیز کرو، وہ اللہ کے نور سے مستقبل کو دیکھتا ہے۔

۱۰- ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ عظیم (ثانی) نے برطانیہ کی جگہ امریکہ کو سیاست کا امام بنا دیا۔

۱۱- دنیا میں شاید ہی کوئی پیشنگوئی اس سے زیادہ سچی ثابت ہوئی ہو، کیسا اسی پر کہا جاتا ہے کہ علما سیاست نہیں جانتے؟

۱۲- کیوں کہ دار الحرب میں مسلم اور کافر کے درمیان سود کا حکم نہیں جاری ہوتا ہے۔

۱۳- کفار کے جن املاک پر مسلمان بغیر جنگ کے قابض ہو جائیں، ان کی آمدنی مسلمانوں کے مفاد عامہ پر صرف کی جائے گی۔

۱۴- عشری زمین ہونے کی ابتدائی پانچ صورتیں ہیں۔

(۱) اول یہ کہ کسی شہر اور گاؤں کے حربی کفار مسلمان ہو گئے تو وہ شہر اور گاؤں عشری ہوگا، یعنی ان کی اپنی تمام زمینوں کی پیداوار میں عشر (جو زکوۃ ہے) ادا کرنا ہوگا۔

(۲) دوم یہ کہ ملک عجم کے بلاد کو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کر لیا اور وہاں کی زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تو وہ بھی عشری ہوگی۔

(۳) سوم یہ کہ عرب کے بت پرستوں پر مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح پائی تو وہاں کی سب زمین عشری ہوگی۔ اگرچہ وہ زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کی جائے، کیونکہ جزائر عرب میں کفار کے قیام کی کوئی صورت نہیں ہے جوان پر خراج لگایا جائے۔

(۴) اسلامی مقبوضہ کی پرانی زمین جس پر کسی کا قبضہ نہ ہو، اس کو کسی مسلمان کا آباد کرنا اور عشری زمین سے قریب ہونا یا عشری پانی یا خراجی اور عشری دونوں پانی سے سیراب ہوتی ہو تب بھی عشری ہے،

(۵) کسی مسلمان نے اپنے گھر کی زمین کو باغ یا کھیت بنالیا تو اس پر بہر حال عشر واجب ہے بشرطیکہ سیرابی صرف خراجی پانی سے نہ ہوتی ہو۔

زمین کے خراجی ہونے کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) جب کفار کے ملک وبلاد کو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کر لیا، لیکن زمین مسلمانوں میں تقسیم نہیں ہوئی، بلکہ زمین ان ہی کافروں کی ملک میں چھوڑ دی گئی تو اس زمین پر مسلمانوں حاکم خراج مقرر کرے گا۔

(۲) کسی شہر، گاؤں یا ملک کے کافروں نے بغیر لڑائی وجہاد مسلمانوں کی اطاعت کر لی ہو اور صلح کر لی ہو تو اس صورت میں بھی ان مقامات کی زمین کافروں ہی کی ملک ہوگی اور اس پر خراج لگایا جائے گا، کتاب العشر والزکوۃ۔

۱۵- مولانا عبدالحق نافع مدظلہ نے ''نافع المجدی'' رسالہ میں فاضلانہ جوابات دیتے ہوئے، مدلسیس سے کام لینے والے مولویوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ ■

شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کا روحانی مقام

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

یہ بات مسلمانوں کی قومی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ میری یہ تنقید تلخ تو ہے مگر غلط نہیں ہے۔ جن لوگوں نے سلاطین وقت سے اختلاف کیا تو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر یا قتل کردیا یا محبوس کردیا اور جن افراد نے علماء سے اختلاف کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو دائرۂ اسلام سے خارج کردیا۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

۱- امام احمد بن حنبلؒ متوفی ۲۴۱ھ نے مسئلہ خلق قرآن میں مامون سے اختلاف کیا تو اس ظالم بادشاہ نے ان کو بے دریغ اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

۲- حارث المحاسبیؒ نے امام ابن حنبلؒ سے اختلاف کیا (علم کلام کی تعلیم کو جائز قرار دیا) تو امام صاحب نے انہیں فاسق اور گمراہ قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۲۴۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے کے ساتھ ایک آدمی بھی قبرستان تک نہیں گیا۔

۳- القادر باللہ عباسی حکمران متوفی ۴۲۲ھ کے عہد حکومت میں معتزلہ مورد عتاب رہے۔

۴- ۴۵۰ھ میں اشاعرہ پر حکومت کی طرف سے مصائب کا نزول ہوا۔ ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ نے انہیں گمراہ قرار دیا۔

۵- شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب ''حکمت الاشراق'' کو محض اختلاف رائے کی بنا پر علما نے واجب القتل قرار دیا، چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم سے مجبور ہو کر سلطان کے فرزند ملک الظاہر نے

۵۸۷ھ میں انہیں قتل کرادیا چنانچہ تاریخ میں ان کا لقب شیخ مقتول ہے۔

۶- امام ابورشد متوفی ۵۹۵ھ پر کفر کا فتویٰ عاید کیا گیا۔

۷- امام ابن تیمیہ نے شیخ اکبرؒ متوفی ۶۳۸ھ کو کافر قرار دیا۔

۸- امام ابن تیمیہ متوفی ۷۰۲ھ کو علمانے کافر قرار دیا اور انہوں نے قید خانے میں وفات پائی۔

۹- شیخ علائی کو علمانے کافر قرار دیا اور ان کے ایما سے سلیم شاہ سوری نے اس بے گناہ کو بڑی اذیت دے کر قتل کرادیا، یہ واقعہ غالباً ۹۵۵ھ/۱۵۷۱ھ میں رونما ہوا۔

۱۰- محمد ابن عبدالوہاب نجدی متوفی ۱۲۰۱ھ نے اپنے مخالفوں کو کافر قرار دیا۔ اس کے جواب میں ترکی شام اور ہندستان کے علماء نے ان کو اسی لقب سے نوازا (بعض کے نزدیک لفظ وہابی لفظ کافر سے بھی بدتر ہے)

۱۱- ہمارے زمانے میں بریلی کے ایک بزرگ (وفات ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ) نے بیک جنبشِ قلم تمام علمائے دیوبند کو دایرۂ اسلام سے خارج کردیا کیونکہ یہ حضرات مشرکانہ عقاید اور مبتدعانہ اعمال میں خان صاحب سے متفق نہیں تھے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری سے لے کر عصر حاضر تک کسی زمانے میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا۔ یہ متعصبانہ روش اور یہ تنگ نظری صرف عقاید تک محدود رہتی تو بھی ایک بات تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ بیماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہوگئی۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پرآشوب دور دیکھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیان مسلم لیگ ان تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلایل واضحہ اور براہین نیرہ کی بناء پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدار قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زرخرید کہا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنالیا گیا تھا۔ (جب ہوش رخصت ہوجاتا ہے اور صرف جوش کارفرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے) چنانچہ ہر شخص ببانگ دُہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' حال آں کہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لیے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت، نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت، اہل قرآن اور اہل حدیث، اہل فقہ اور اہل تصوف، بریلوی اور دیوبندی، سنی اور شیعہ (۱) احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص تھا۔ (۲)

---

(۱) بہ شمول اسماعیل آغاخانی (۲) اشارہ ظفراللہ خاں (قادیانی) کی طرف ہے۔

جس کے ہم خیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصور کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدار قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خان جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے

جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سر بلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہو گیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں۔

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے

کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہد اعظم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی مقام خان مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا خصوصاً ارکان جمعیۃ العلماء ہند ان کی نیت نیک تھی، وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدار قوم یا ہندوؤں کے زر خرید نہیں تھے۔ چنانچہ (سابق صدر) صدر مملکت پاکستان (محمد ایوب خان) نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "Friends not masters" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "بہت سے علماء نے قاید اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی۔ لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علمانے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ ضمیر فروش تھے، ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا"۔(۱)

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش، بلکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا کیونکہ ان کی ½ آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی

---

(۱) اس خیال سے مجھے کلیۃً اتفاق نہیں۔ (نسیم چشتی)

حکومت قایم ہو سکے گی کیونکہ لیگ کے ارباب حل وعقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن حامیان لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علمائے دین کے احترام، دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں۔

۱- جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قایدین سفر کر رہے تھے۔[۱] علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلبا نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلاف تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذاتِ خود خلافِ تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

۲- جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سید پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو حامیان لیگ کا ایک انبوہ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا، ان لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو گالیاں دیں اور جب حضرت موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرتؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پہلے اسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ (حیات شیخ الاسلام: ص ۷۰-۱۶۳)

میں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیے ہیں، تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اس زمانے میں حامیان لیگ کی ذہنیت ایسی ہو گئی تھی کہ جو شخص ان سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اسے کار ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقایق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی ان لوگوں کو روا داری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دایرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۶۷ء میں شایع ہوا تھا، مسلمانان پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر انہیں (جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ صدر ناصر عقاید کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی

---

(۱) اشارہ مولانا ابوالکلام سے بدتہذیبی کے واقعے کی طرف ہے۔ (ا-س-ش)

رہنے دینا چاہیے"۔

سبحان اللہ! آج اس درس اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہوسکتا ہے لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت سے (۱) اپنے پیارے میم شین سے پوچھتا ہوں کہ میں جب قوم پرور مسلمان (کانگریسی، جمعیتی اور احراری، زعمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ:

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کے ارکان تقسیم ہند کے حامی نہیں ہیں کیوں کہ وہ اسکو اپنی فراست مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے بہت مضر سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم لیگ کے پروپیگنڈے کے زیر اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور ان کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان ہی رہنے دینا چاہیے"۔

تو کون سا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا؟ یا ہوسکتا تھا؟ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا یہ عالم تھا کہ جب الجمعیۃ نے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا:

"گل دستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے"

(۱) میں نے اپنی اس حیثیت کو بطور سپر استعمال کیا ہے کہ کیوں کہ اس ملک میں یہ خیال روز بروز پختہ تر ہوتا جارہا ہے کہ ہم کو کامل آزادی، ہر بات کی آزادی حاصل ہو چکی ہے، اس لیے کسی شخص کو ہمیں نصیحت کرنے کا حق نہیں ہے، چنانچہ آج فجر کی نماز کے علاوہ ہر نماز کے وقت مسلمان پوری آواز کے ساتھ مسجد سے ملحق ہر ہوٹل میں فلمی گانوں کے ریکارڈ بجاتا رہتا ہے اور کراچی شریف سے لے کر لاہور شریف تک کسی مسلمان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ اس مسلمان سے کہہ سکے کہ اس شوروغل سے نمازیوں کی نماز میں اور مریضوں کے آرام میں خلل پڑ رہا ہے۔ اس عاجز نے اس مسئلے پر بہت غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو، مسجد کے پاس سے باجا بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے تو مسلمانوں کی نماز میں شدید خلل رونما ہوجاتا تھا لیکن پاکستان میں ۲۴ گھنٹے مسجدوں کے پہلو میں فلمی گانے سمع خراشی کرتے رہتے ہیں، مگر کسی کی نماز میں خلل نہیں پڑتا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ باجہ مشرف باسلام ہوگیا ہے۔ فینو اتوجروا

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علما لیگ میں نہیں تھے ان کی عظمت، وقعت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی۔ حال آں کہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرق ندامت میں غرق ہو جاتا ہوں مثلاً صرف ایک واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں مجھے انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں تقریر کی دعوت موصول ہوئی چونکہ یہ انجمن غیر سیاسی تھی اس کے جلسوں میں لیگی اور غیر لیگی ہر مکتب خیال کے مقررین مدعو کیے جاتے تھے چنانچہ دیو بند سے حضرت اقدسؒ اور شجاع آباد سے قاضی احسان احمد مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔

اس زمانے میں ذہنی کیفیت یہ تھی کہ میں غیر سیاسی جلسوں میں بھی ایسا موضوع اختیار کیا کرتا تھا جس کی تان بالآخر سیاست پر ٹوٹ سکے۔ مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کر سکوں۔(۱) چنانچہ یہاں بھی یہی کیا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد میرے دوست قاضی احسان احمد مرحوم میرے کمرے میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ:

> ''حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ جو آپ کی تقریر کے وقت اسٹیج پر تشریف فرما تھے، آپ سے ملنا چاہتے ہیں، نیز یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ میرے پاس چل کر آنا پسند نہ کریں تو میں خود آپ سے ملنے آسکتا ہوں''۔

یہ پیغام سن کر میں نے قاضی صاحب سے بلا تامل کہا کہ میرے اور مولانا کے سیاسی عقاید و افکار میں بعد المشرقین ہے، اس لیے اس ملاقات سے کوئی فایدہ مرتب نہیں ہوگا میرے محترم قاضی صاحب مرحوم یہ غیر متوقع جواب بے صواب سن کر خموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

آج ستائیس سال کے بعد میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ جس بات نے مجھے اس جواب پر آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کا اعلان مندرجہ اخبار احسان مورخہ ۲۸/ مارچ ۱۹۳۸ء تو میرے دماغ سے محو ہو گیا تھا یہ مصرع ہنوز ذہن نشین تھا کہ

''چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است''

اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت اقدسؒ سے گفتگو یا ملاقات دونوں باتوں کو میں اپنے

---

(۱) مثلاً انجمن مدرسۃ البنات جالندھر ایک غیر سیاسی انجمن تھی مگر میں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۳ء تک ہر سال اس انجمن کے پلیٹ فارم سے لیگ ہی کا پروپیگنڈا کیا، جس کی یاد اس زمانے کے سامعین کے دلوں سے ابھی تک محو نہیں ہوئی ہے۔

زعم باطل میں اپنے مرتبہ موہومہ سے فروتر سمجھتا تھا۔

میں نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ پاکستان میں جن لوگوں سے حضرت اقدس کا علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی مقام ابھی تک پوشیدہ ہے وہ سب اسی طرح شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں، جس طرح میں اس زمانے میں مبتلا تھا۔ چونکہ اللہ کے فضل وکرم سے مجھ پر حضرت اقدس کا روحانی مقام منکشف ہو چکا ہے اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے مسلمانوں کو یاد دلاؤں کہ علامہ مرحوم نے ان اشعار کو، جن کی وجہ سے حضرت اقدس کے روحانی مقام کے بارے میں مسلمانوں کو غلط فہمی ہوئی، کالعدم قرار دے دیا تھا، اگر ارمغان حجاز ان کی زندگی میں شایع ہوتی تو وہ یہ اشعار یقیناً حذف کر دیتے۔ اس کی تفصیل آیندہ اوراق میں ملے گی۔

باز آمدم بر سر مطلب، دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا کہ قاضی صاحب مرحوم دوبارہ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ حضرت اقدس فرماتے ہیں کہ گفتگو سے میرا مقصد اسی بعد المشرقین کو دور کرنا ہے۔ آپ نے گزشتہ شب اپنی تقریر میں بڑے یقین کے ساتھ یہ دعوی کیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت علی منہاج النبوۃ قایم ہوگی جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ پاکستان میں شرعی احکام کا نفاذ ہوگا، لیکن آپ نے اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں دی۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج مجھے یہ بتائیں کہ اس دعوے پر آپ کے پاس دلیل کیا ہے؟ قاضی صاحب مرحوم کی زبان سے حضرت اقدس کا یہ پیغام صداقت التیام سن کر میں مبہوت و ششدر ہو کر رہ گیا کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اپنے دعوے پر کوئی دلیل (معقول یا غیر معقول) نہیں تھی میری حالت ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ رہی کہ میں خداوندان لیگ پر "ایمان بالغیب" رکھتا تھا جو اعلانات اور دعاوی وہ لوگ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات میں قوم کے سامنے بلکہ دنیا کے سامنے کرتے رہتے تھے میں ان پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آتا تھا اور اپنی دعاوی کو اقبال کے کلام بلاغت نظام سے مزین کر کے اور کانگریس پر طنز و مزاح سے چٹ پٹا کر کے اپنی تقریروں میں بیان کر دیا کرتا تھا اور جب کبھی میرا ذہن مجھ سے یہ کہتا تھا کہ جو کچھ تو کہتا ہے اس پر تیرے پاس دلیل کیا ہے تو میں اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتا تھا کہ بھلا لیگ ہائی کمان کے سربرآوردہ ارکان جو قدوۃ القوم ہی نہیں بلکہ زبدۃ القوم بھی ہیں، جھوٹ بول سکتے ہیں یا اپنی بھولی بھالی اور نوے فیصد جاہل قوم کو دھوکا دے سکتے ہیں؟ چونکہ یہ امر ممکن الوقوع نہیں اس لیے منطقی اعتبار سے اس کا عکس صحیح ہوگا یعنی یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ برہان نہیں ہے بلکہ سفسطہ اور مغالطہ ہے جو میں اس زمانے میں اپنے نفس کو دیا کرتا تھا لیکن جماعتی تعصب انسان کو ایسا اندھا کر دیتا ہے کہ وہ حسن اور قبح میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ سفسطہ کو برہان اور مغالطے کو دلیل سمجھنے لگتا ہے۔

چنانچہ میں نے یہ غیر معقول بات کہہ کر قاضی صاحب مرحوم سے اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ جس طرح انہیں (حضرت اقدس کو) یہ یقین ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہرگز قایم نہیں ہوگی اسی طرح مجھے یہ یقین ہے کہ ضرور قایم ہوگی۔ اس لیے گفتگو بے کار ہے اور ملاقات بے سود۔ (۱)

"پاکستان میں اگر شروع ہی سے اسلامی نظریات و شعایر، اسلامی ضابطۂ حیات اور اسلام کے نظام مالیات و قانون کو اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی تو آج حالات یقیناً مختلف ہوتے اور کسی کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کہ ملک کے تمام دولت آفریں وسایل پر اور تمام تر دولت پر مٹھی بھر افراد کا قبضہ ہے"۔

اس معصوم تمنا کے جواب میں نصیر دہلوی کا یہ شعر مدیر نوائے وقت کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

خیالِ زلف میں شب بھر نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفس امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا اسی لیے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالت شان، للّٰہیت، بزرگی اور بارگاہ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے اس لیے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہار ندامت کرتا ہوں اور اس اعتراف گناہ کو اس نیت سے شایع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمالے اور میرے گناہوں کو معاف کردے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔

رَبِّ اِنّی ظلمت نفسی ظلماً عظیماً، لاغافر الذنوب الا انت فاغفرلی و ارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔ (آمین)

اکتوبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں لی مارکیٹ کراچی میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک کار میرے قریب آکر رکی اور اس میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ باہر نکلے اور میری طرف بڑھے۔ (۲) میں

(۱) کس کا قیاس صحیح نکلا اور کس کا غلط؟ اس کا کچھ اندازہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۶ رجون ۱۹۶۸ء کے لیڈر (اداریے) کے اس جملے سے بخوبی ہوسکتا ہے:

(۲) حضرت لاہوریؒ سے میرے تعلقات ۱۹۲۹ء میں قایم ہوئے تھے۔ تقریب کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایت اسلام نے علامہ اقبال مرحوم اور سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی نگرانی میں اشاعت اسلام کالج قایم کیا تھا اور کالج کمیٹی نے جس کے صدر محترم حضرت لاہوریؒ تھے، میرا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا تھا،

نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ حضرت نے حسب معمول مجھے معانقے سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو تم سے ایک ضروری گفتگو کرنی ہے۔ میں نے عرض کی بسرو چشم حضرتؒ نے ڈرائیور سے کہا کہ برنس گارڈن چلو۔ وہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اس کے بعد حضرتؒ مجھے ساتھ لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میرے میزبان نے کل مجھ سے کہا کہ ایک صاحب نے جن کا نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی ہے، ارمغان حجاز کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شان اقدس میں گستاخی بھی کی ہے اور ان اشعار کی شرح میں جو اقبال نے حضرت مدنی کے بارے میں لکھے ہیں، اقبال کے اس اعتراف کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس کے بعد ان اشعار کا وجود ہی کالعدم ہو چکا ہے"۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے ان سے کہا کہ میں شارح کو بخوبی جانتا ہوں انشاء اللہ لاہور پہنچ کر ان سے اس معاملے میں گفتگو کروں گا لیکن حسن اتفاق سے آج تم مجھے یہیں مل گئے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہاری توجہ اس طرح مبذول کروں اور تمہاری غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دوں۔

یہ سن کر میں نے معذرت آمیز انداز میں نیچی نگاہ کر کے عرض کی کہ "حضرت بلاشبہ مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ شرح لکھتے وقت میرا ذہن اس طرح منتقل ہی نہیں ہوا کہ علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تین ہفتے پیشتر اپنا بیان روزنامہ احسان میں شایع کر دیا تھا کہ حقیقت حال منکشف ہو جانے کے بعد اب مجھے مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں اشعار کالمعدوم کا مصداق ہو گئے اور ارمغان حجاز میں ان کے اندراج کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

میرے اظہار ندامت اور اعتراف تقصیر کے بعد حضرت لاہوریؒ نے مجھ سے دریافت کیا "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ حضرت میں آپ کو ۱۹۲۹ء سے جانتا ہوں اور آپ کو اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں شمار کرتا ہوں"۔

یہ سن کر فرمایا تو سنو! میں تمہاری بدگمانی دور کرنے کے لیے تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں اور میرے علم کی رو سے اس وقت روئے زمین پر کوئی شخص روحانیت، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے اعتبار سے حضرت

---

۱۵ میں کالج کے نظم و نسق کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور ہدایات حاصل کرنے کے لیے حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، جب بھی حاضر ہوتا تو حضرت لاہوریؒ اس عاجز سے کھڑے ہو کر معانقہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت موصوف نے اس وضع داری کو جسے میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں، تادم حیات نبھایا۔ کالج تو ۱۹۴۳ء میں اس لیے بند ہو گیا کہ جب جنگ عظیم کی بدولت میٹرک پاس کو سو روپے تنخواہ ملنے لگی تو بیس روپے ماہوار وظیفے پر کون نوجوان کالج میں داخل ہونا پسند کرتا، لیکن حضرتؒ سے میرے نیاز مندانہ تعلقات آخر وقت تک قائم رہے۔

اقدس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مدظلہٗ سے بڑھ کر نہیں ہے''۔

میں نے پوچھا'' آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی''؟

فرمایا'' میں حج کے مواقع پر خاصانِ حق کے اجتماع میں برابر شریک ہوتا ہوں ان سبھوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس وقت روے زمین پر حضرت موصوف کا جواب نہیں ہے''۔ میں سراپا حیرت بنا ہوا حضرت لاہوریؒ کی زبان سے حضرت مدنیؒ کی عظمت کا اعتراف سن رہا تھا۔ اس کے بعد حضرت موصوفؒ نے فرمایا '' حضرت مدنیؒ کی جوتیوں کا تلا بھی میری داڑھی سے زیادہ محترم ہے۔ بلاشبہ وہ اس زمانے میں اللہ کی ہستی کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہیں۔ چونکہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں اس لیے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ حضرت مدنیؒ کی شان میں تم سے جو گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں ان سے رجوع کرلو اور اللہ سے التجا کرو کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ اگر تم حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسی گستاخی کا ارتکاب نہ کرتے۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ تم پر حضرت اقدس کا مقام واضح کردے، تم اس بات پر غور کرو کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت اقدسؒ کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے اس کے باوجود ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور اپنی مجالس میں ان کی روحانی عظمت کا اعتراف کرتے تھے''۔

اس گفتگو کے بعد حضرت لاہوریؒ مجھے میرے مکان پر پہنچا کر اپنے میزبان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت کی اس تلقین کا اس سیہ کار پر ایسا اثر ہوا کہ دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ پردہ جو میرے اور حضرت مولانا مدنیؒ کے مابین حائل تھا، یک لخت ہٹ گیا اور ان کی عظمت کا ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل پر قائم ہوگیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں حضرت لاہوریؒ سے ۲۵، ۲۶ سال سے واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ جھوٹ ان کی زبان سے نہیں نکل سکتا اس لیے ان کی گواہی کے بعد پھر مجھے کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہی۔

مارچ ۱۹۵۷ء میں جب میں کراچی سے نقل مکانی کر کے لاہور واپس آیا تو زندگی میں پہلا انقلاب یہ رونما ہوا کہ حضرت لاہوری کی مجلس ذکر میں شرکت شروع کی۔ حضرت اس سیہ کار پر خصوصی توجہ فرماتے تھے یعنی مجلس ذکر میں اپنے بائیں جانب پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی تنہائی میں ملاقات ہوتی تھی تو بالالتزام شیخ الاسلام حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی کا تذکرہ فرماتے تھے، ان تذکروں کا میرے دل پر یہ اثر مرتب ہوا کہ چند ماہ کے بعد مجھے حضرت اقدسؒ سے وہ رابطہ قلبی پیدا ہوگیا جسے عشق سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

چنانچہ جب ۶، ۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو اخباروں سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت اقدسؒ کا وصال ہوگیا تو مجھ پر زندگی میں پہلی مرتبہ فراق کی کیفیت طاری ہوئی، میں اس زمانے میں مسجد شاہ چراغ میں ہر اتوار کو مثنوی کا درس دیا کرتا تھا اور اہل علم جانتے ہیں کہ مثنوی کا سارا تار و پود عشق اور فراق انہی دو چیزوں سے مرکب ہوا ہے اور کل مثنوی ان

دو ابتدائی شعروں کی تفسیر ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　از جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تامرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یعنی روح انسانی جو ازل سے محبوب حقیقی کے عشق میں مبتلا تھی، جب دنیا میں آئی تو فراق کی کیفیت سے دو چار ہو گئی۔ قصہ مختصر عشق اور فراق یہ مثنوی کے دو بنیادی تصورات ہیں اور اس کا قصر رفیع انہی بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے محبوب سے جدا ہو گیا ہوں۔ اللہ اکبر یہ کتنا عظیم الشان انقلاب تھا جو میرے ضمیر کی گہرائیوں میں رونما ہوا اور شخص جس سے مدتوں تک نفرت کرتا رہا تھا، وہی شخص اب میرا محبوب بن چکا تھا اور اسی لیے ان کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھ پر فراق کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

میں نے مثنوی کا درس ملتوی کر دیا اور مجلس میں یہ اعلان کیا کہ آیندہ مجالس میں حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی کا بیان کروں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہا۔ عام قارئین کی آگاہی کے لیے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت لاہوریؒ کی تلقین کی بنا پر میں نے نقش حیات اور مکتوبات شیخ الاسلام کا مطالعہ کر لیا تھا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک حضرت لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں حضرت موصوف نے اپنے ارشادات سے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے بڑی حد تک آگاہ کر دیا تھا۔ ان رشادات کی روشنی میں اگر ایک طرف مجھ پر حضرت اقدس کے کمالات روحانی سے آگاہی حاصل ہوئی تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ حضرت اقدسؒ انگریز کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن یقین کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت اقدس سے تعلق کی بدولت میرے دل میں بھی انگریزی زبان، انگریزی لباس، انگریزی وضع قطع اور انگریزیت سے زندگی میں پہلی مرتبہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوا، حال آں کہ میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال اسی لعنت میں گزار چکا تھا اور اکبر کا یہ شعر مجھ پر ہو بہو صادق آتا تھا۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے!

حضرت اقدسؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا اصلی دشمن ہندو نہیں انگریز ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس نگاہ سے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا تو اس ارشاد کی صداقت مجھ پر روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے اکبرالہ آبادی کو۔ انہوں نے ان شعروں میں کتنی سچی بات کہی ہے۔

زیادہ ان سے رہو محترز کہ ہندو سے   یہ خود ہی سوچ لو، دل میں اگر نہ کچھ گدھو

یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف   وہ چاہتے ہیں مسلمانی ہی ندارد ہو

اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تشریح سے بلاغت کا خون ہو جائے گا تو ختنے اور مسلمانی کے مفہوم اور ان دونوں میں فرق کو بھی واضح کر دیتا۔

حضرت لاہوریؒ کے وصال کے بعد زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ ذکر حبیب سننے کو کان ترس گئے۔ بالآخر ۱۹۶۴ء میں محترمی قاضی زاہد الحسینی مدظلہٗ کو اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ کیا اور لکھا کہ تبریز سے جدائی کے بعد دل کسی صلاح الدین کو ڈھونڈتا ہے۔ انہوں نے ازراہ لطف اس عاجز کو مشورہ دیا کہ خوش قسمتی سے حضرت اقدسؒ کے خلیفہ مجاز مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہٗ لاہور میں سکونت پذیر ہیں وہ تمہارے حق میں صلاح الدین بھی ثابت ہوں گے اور حسام الدین بھی۔

چنانچہ ۱۹۶۵ء میں اس عاجز نے سید صاحب موصوف سے رشتۂ ارادت وعقیدت استوار کیا اور استواری کے بعد یہ محسوس ہوا کہ نظامی مرحوم نے یہ مصرع میرے ہی لیے کہا تھا:

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید

جب میں نے اس بات کی اطلاع قاضی صاحب موصوف کو دی تو انہوں نے مجھے لکھا کہ اب جب کہ حضرت اقدسؒ کا مقام آپ پر واضح ہو چکا ہے اور آپ ان کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ گزشتہ زمانے میں آپ کے قلم اور آپ کی زبان سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدسؒ کی شان میں سرزد ہو چکی ہیں ان کا صدق دل سے اعتراف کیجئے اور توبہ نامہ شایع کیجئے تاکہ

۱- قیامت کے دن مواخذہ اور عتاب دونوں سے محفوظ ہو جائیں۔

۲- حضرت اقدسؒ کی توجہ اور ان کے روحانی فیض سے بہرہ ور ہو سکیں۔

۳- اور ان لوگوں کا بھلا ہو سکے جو عدم واقفیت کی وجہ سے آج بھی حضرت اقدسؒ کی طرف سے سوء ظن رکھتے ہیں جس طرح آپ خود عرصۂ دراز تک اس غلطی میں مبتلا رہ چکے تھے۔

دوسری مرتبہ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا:

"میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اکثر اوقات لوگ اہل اللہ کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے ہیں...... اللہ نے آپ پر خصوصی فضل فرمایا ہے اگر آپ صیانۃً للناس اس موضوع پر ایک مقالہ سپرد قلم فرما دیں جس میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ سے آپ کی نسبت کا ذکر بھی آجائے تو بڑا مفید رہے گا اور بہت سے لوگوں کا راہ نما ہو گا"۔

تیسری مرتبہ یکم اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا:

''آج ایک بہت پاکیزہ مجلس میں آپ کا ذکرِ خیر آ گیا اس لیے بطور یاد دہانی عرض ہے کہ ضرور ایک جامع مضمون اپنی انابت پر تیار فرمادیں۔ اس سے انشاء اللہ دوسروں کو بہت فایدہ پہنچے گا''۔

چوتھی مرتبہ ۱۲راپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا:

''آپ کے اس مضمون سے انشاء اللہ کئی بھٹکے ہوئے اور گستاخ ذہن انسانوں کو نورِ ہدایت مل جائے گا اور وہ سوء خاتمہ سے محفوظ رہیں گے''۔

پانچویں مرتبہ اپنے ۲۴راپریل ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

''کلام اقبال کی شرح میں جہاں جہاں جناب کا قلم حدودِ ادب سے تجاویز کر گیا ہے اگر فی الحال بہت جلد ان عبارتوں سے رجوع فرمالیں تو یہ بھی صرف بہتر نہیں بلکہ ضروری''۔

میں نے یہ اقتباسات درج کیے ہیں تاکہ قارئین پر یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ اس قدر تاکید کے باوجود میرا نفس اپنی گستاخیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتا تھا، قارئین غور کریں کہ اپنی غلطی کا اعتراف نفس پر کس قدر شاق گزرتا ہے، قاضی صاحب متوجہ کر رہے ہیں، مگر نفس ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا بلکہ مسلسل مجھ سے یہی کہتا رہا کہ اس اعتراف سے تیری کسی قدر سبکی ہوگی دنیا کی نظروں میں تو کسی قدر ذلیل ہو جائے گا۔ "وغیر ذالک من الخرافات"۔

اس عرصے میں ایک دفعہ بھی میں نفس کی گرفت سے آمادہ نہیں ہو سکا یعنی اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ جب قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے میرے مقرب بارگاہ بندے کی شان میں یہ گستاخی کس بناء پر کی تھی تو کیا جواب دوں گا؟ اور جب فرمائے گا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد کیا چیز تجھ کو اعترافِ گناہ سے روکتی رہی؟ تو کیا عذر پیش کروں گا؟ اور جب بھری محفل میں یعنی اللہ کی بارگاہ میں میری رسوائی ہوگی تو کیا وہ رسوائی اس دنیا کی سبکی یا تحقیر سے بدرجہا زیادہ نہ ہوگی!

سچ ہے ریت سے تیل نکالنا آسان ہے مگر نفس امارہ کے پھندے سے اپنے آپ کو نکالنا بہت مشکل ہے۔ انسان ضعیف الایمان جتنا دنیا والوں سے ڈرتا ہے اگر خدا سے اتنا ڈرنے لگے تو بلاشبہ فرشتہ بن جائے۔ سچ کہا ہے شیخ سعدی نے:

گروزیز از خدا بتر سیدے
ہم چناں کز ملک، ملک بودے

جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ میں مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہا ہوں اور وعدوں کے باوجود ایفائے وعدہ نہیں کرتا تو انہوں نے میری عاقبت سنوارنے کے لیے اپنے دینی ترکش سے آخری تیر نکالا، یعنی ۲۲ رمئی ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

''بہرحال آپ کی طرف سے فی الحال اگر چند سطور ہی خدام الدین میں آجائیں تو بہتر ہیں مثلاً ''شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ قدس سرہ العزیز کی شان گرامی میں میرے قلم اور میری زبان سے جو کلمات ناشائستہ صادر ہو چکے ہیں میں ان پر صدق دل سے نادم ہو کر رجوع کرتا ہوں اس پر تفصیلی مقالے کا انتظار فرمائیں''۔

یہ بھی فاستبقوا الخیرات کا مصداق ہو جائے گا، میں آپ سے بار بار اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ سالک کے اکثر مقامات شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف رک جاتے ہیں بلکہ لطائف بجھ جاتے ہیں''۔

جس وقت میں نے یہ آخری جملہ پڑھا تو مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے اس مصرع سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

تزلزل در ایوان شیطاں فتاد

دوسرے لفظوں میں اس فقرے نے میری خودی کو بیدار کر دیا، چنانچہ میں نے اپنی ہمت اور اپنے اختیار دونوں ہتھیاروں سے بیک وقت کام لے کر نفس سے کہا ''میری ہستی عبارت ہے لطائف سے نہ کہ تجھ سے اگر لطائف ہی بجھ گئے یعنی دل ہی مر گیا تو پھر وجودِ یوسف اور عدم یوسف دونوں یکساں ہو گئے! کیا تو نے اقبال کا یہ شعر نہیں پڑھا۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اے نفس! اگر میرا دل مر گیا تو پھر مجھ میں اور حمار میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ میں نے برسوں تیرا کہنا مانا اور حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے باوجود اعتراف گناہ نہیں کیا۔ لیکن اب میرے سامنے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے اس لیے تیرا کہنا ہرگز نہیں مانوں گا چونکہ میں اندھا تھا یعنی حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ نہ تھا اس لیے میں نے واقعی حضرت موصوفؒ کی شان میں اپنے قلم اور اپنی زبان سے گستاخیاں کی ہیں، میں غلط

پروپاگنڈے کے سحر سے مسحور ہوگیا تھا، حق اور باطل میں تمیز کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ الحمد اللہ کہ اس نے مجھے قبل وفات توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔

ان تفصیلات کے بعد اب میں سب سے پہلے اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے وفات سے پہلے مجھے توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ فرمایا اور اس کے بعد محترم قاضی زاہد صاح صاحب الحسینی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کار خیر پر آمادہ کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ! اے غافر الذنب وقابل التوب! اے غفور الرحیم لا الہ الا انت ولا قاضی الحاجات الا انت ولا غافر الذنوب الا انت ولا فاعل فی الحقیقت الا انت ولا موجود فی الحقیقت الا انت!

اے رحیم وکریم! میں اپنے گناہوں کا صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں، میری ساری زندگی نافرمانیوں میں بسر ہوئی ہے۔

واپس آمد بندۂ بگر یختہ　　　آبروے خود ز عصیاں ریختہ
بے گنہ نگزشت برمن ساعتے　　　با حضور دل نکردم طاعتے

اے ستار العیوب! میں بصمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تیرے مقبول بارگاہ اور برگزیدہ بندے شیخ الاسلام، مجاہد اعظم، قدوۃ العارفین، زبدۃ الکاملین، سیدی وشیخی وسندی ووسیلتی فی الدارین سید حسین احمد صاحب مدنیؒ قدس سرہٗ العزیز کی شان اقدس میں اپنے قلم اور اپنی زبان سے بڑی گستاخیاں کیں۔ میں اپنی اس نالائقی اور حماقت کو کسی پردے میں نہیں چھپانا چاہتا۔ علانیہ صاف لفظوں میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔

اے اللہ! میں اندھا اور جاہل اور ظالم اور احمق اور عقل وخرد سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے حرم نبوی میں بیٹھ کر چودہ سال تک دین کی تعلیم وتبلیغ کی اور ساری عمر اتباع رسول ﷺ میں بسر کردی تھی اسے مقام رسول سے بے خبر قرار دیتا رہا بلکہ اس کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان گستاخیوں پر فخر کرتا رہا......

اے اللہ میں ڈرتا ہوں اور سخت لرزہ براندام ہوں اس بات سے کہ قیامت میں جب حضور انور ﷺ کی نگاہ مجھ پر پڑے گی تو کہیں آنحضور ﷺ مجھ سے اس انداز میں خطاب نہ فرمائیں، اچھا تو تم ہو وہ گستاخ اور دریدہ دہن جس نے میرے اس عاشق صادق کی شان میں بے ادبی کی تھی جس نے میرے دین کی سربلندی کی خاطر اور میری محبت میں ساری عمر قید وبند کو دعوت دی اور طوق وسلاسل کو لبیک کہا! جس نے میری محبت میں میرے دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کیا اور تادم آخر کلمۂ حق کہا، جس نے میری خاطر مالٹا

میں مصائب جھیلے، جس نے میری محبت میں کراچی کا جیل کاٹا، جس نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے انگریز (علیہ ما علیہ) سے ٹکر لی، جس نے میری امت کی بہبود کے لیے دن میں قرآن وحدیث کا درس دیا اور رات میں دشمنان اسلام کے خلاف لسانی جہاد کیا۔

جس نے اسلام کی خاطر غیروں کے طعنے سنے اور اپنوں سے گالیاں کھائیں اور گالیاں کھا کے بے مزہ ہونا تو در کنار ان گالیاں دینے والوں کے حق میں دعائیں کیں، جس نے اپنی تمام متاع حیات مجھ پر نثار کر دی تو اس وقت میرا کیا حال ہوگا؟ کونسا آسمان مجھے پناہ دے گا اور کونسی زمین مجھے ٹھکانا دے گی؟

اے اللہ! حضور ﷺ کی اس نگاہ عتاب سے بچنے کے لیے میں اس دنیا میں ہر قسم کی ذلت اور رسوائی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

اے اللہ! میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں، میری لغزشوں، خطاؤں اور گستاخیوں کو معاف کر دے جو میں نے اپنے شیخ طریقت مخدوم ملت، محرم راز نبوت، واقف اسرار رسالت اور آشنائے مقام محمد (علیہ افضل التحیۃ والثناء) کی شان میں روا رکھی تھیں۔

اے اللہ! اپنے مقبول بارگاہ بندوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ تو ان کے وسیلے سے مجھ پر کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ بلکہ شیخ العرب حضرت مدنیؒ کی نسبت عالیہ سے حصہ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم. و تب علی انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ و عبدہ و رسولہ الکریم. ■

اسلامی تعلیمات کی روح

انسانیت اور اسلام کی روح یہ ہے کہ آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے، زیادتی کا بدلہ احسان سے اور ظلم کا بدلہ عفوودرگزر سے دیں۔ یہی سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے: صل من قطعک و اعف عمن ظلمک و احسن الی من اساء الیک" جوتم سے قطع تعلق کرے تم اس سے تعلق قائم کرو، جوتم پر ظلم کرے تم اسے معاف کردو، جوتمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو" مصائب کے طوفانوں اور مشکلات کے ہجوم میں اللہ تعالیٰ سے لحہ بہ لحہ تعلق مضبوط ہونا چاہیے اور صبر وضبط کا دامن نہایت مضبوطی کے ساتھ پکڑنا چاہیے۔ ضبط، تحمل، استقلال، عالی حوصلگی اور توجہ الی اللہ ایسی طاقتیں ہیں جن کے سامنے دنیا کی ہر طاقت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے اور شکست کھا جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار انہی طاقتوں سے امداد حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یا ایھا الذین آمنو استعینوا بالصبر و الصلوة". اے ایمان والونماز اور صبر سے مدد حاصل کرو! جذبات اور اشتعال کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان برائی کا بدلہ برائی سے، بلکہ ایک برائی کا بدلہ ہزاروں برائیوں سے دے، لیکن یہ کوئی علاج اور مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس طرح ممکن ہے آپ گردنوں کو جھکا دیں مگر دلوں کو فتح کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ برائی اس طرح ختم ہوسکتی ہے کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے۔ اگر چہ یہ بہت مشکل ہے، مگر قلوب کو اسی طرح مسخر کیا جاتا ہے اور حق کا مشن اسی طرح کامیاب ہوا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم و مایلقاھا الا الذین صبر و اوما یلقھا الا ذو حظ عظیم۔" برائی کا بدلہ ایسے اخلاق سے دیجئے جو بہت بہتر ہو، آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن سے آپ کی دشمنی ہے، آپ کے مخلص دوست بن گئے۔ مگر یہ بات صابر وشاکر لوگوں کو اور قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہاں! یہ ضرور خیال رہے کہ صبر، ضبط اور مکارم اخلاق کا مطلب بزدلی، خوف زدگی اور کمزوری نہیں ہے۔ صبر وضبط کا مطلب یہ ہے کہ انتقام کے مواقع ملتے ہوئے بھی شرافت، اخلاق، مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے۔

(خطبہ صدارت جمعیت علمائے ہند، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء) ■

ایک تاریخی تقریر

۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگامے جنہوں نے پورے پنجاب کو زیروزبر کردیا۔ مسلمانان دہلی کی نصف آبادی کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا۔ دہلی کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع ان فسادات کا نشانہ تھے۔ جن کا سیلاب مشرقی پنجاب کو تباہ کرکے ان اضلاع کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا، یہاں تک کہ جوالا پور اور دہرہ دون کو تباہ کرچکا تھا۔ لاکھوں پناہ گزیں (شرنارتھی) مشرقی پنجاب سے گزرکر ان اضلاع میں پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ صرف شہر سہارنپور تقریباً پچاس ہزار پناہ گزینوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا جو سرحدی علاقوں اور مغربی پنجاب سے تباہ ہوکر یہاں پہنچے تھے۔ جن کی ہر حرکت خوں آشام تھی اور جن کی پیاس صرف خون مسلم سے ہی بجھ سکتی تھی اور فرقہ پرست رہنماؤں کا یہ مطالبہ آگ پر تیل کا کام کررہا تھا کہ مشرقی پنجاب کی طرف دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع کو بھی مسلمانوں سے خالی کرایا جائے تاکہ پرشارتھیوں کے ان نقصانات کی تلافی ہوسکے جو سندھ اور فرنٹیر میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں۔ ضلع مظفرنگر اور میرٹھ کی حالت بھی اس کے قریب قریب تھی۔ مسلمانوں کا راستوں سے گزرنا موت سے کھیلنا تھا۔ ٹرین کے ذریعہ سفر کرنا تو درکنار اگر اسٹیشن پر کوئی مسلمان ہوتا تھا تو ٹرین آنے کے وقت اس کو بھی ہٹادیا جاتا تھا، کیونکہ ٹرینیں تباہ شدہ، نیم برہنہ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں اور جس قدر پرشارتھی ٹرینوں کے اندر ہوتے تھے۔ اتنے ہی ٹرینوں کی چھتوں پر بھی ہوتے تھے۔ ہر ایک ٹرین مرقع عبرت ہوتی تھی۔

حکومت نے حفاظت امن کے لیے جو کچھ انتظامات کیے وہ قابل قدر تھے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حالات اس کے قابو سے باہر ہوچکے تھے اور امن پسند برادران وطن کی خاموش ہمدردیاں قطرۂ شبنم کی طرح بے حقیقت بن گئی تھیں، یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر ضلع سہارن پور، مظفرنگر، میرٹھ اور دہلی سے مسلمانوں کا تخلیہ ہوجاتا تو پھر پرشارتھیوں کا سیلاب ہندیونین کے آخری کناروں تک پہنچتا اور پورے ہندیونین میں مسلمانوں کا نام ونشان ملنا بھی ناممکن ہوجاتا۔ اس نازک ترین وقت میں سفینۂ ملت کا بوڑھا ناخدا شیخ الاسلام حضرت

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت علمائے ہند اپنے خلوت کدے سے برآمد ہوا۔ درس گاہ کو چھوڑا اور ضلع مظفر نگر اور سہارنپور کے قصبات و دیہات کا دورہ کر کے مسلمانوں کو صبر و استقامت کا درس دیا، افسران حکومت کو بیدار کیا اور ان شکوک وشبہات کو دور کیا جو غیر مسلم قوم پرور اور کانگریسی کارکنوں کے دماغوں کو مسموم کر چکے تھے۔ اس دور میں آپ نے کیا درس دیا اور آپ کا پیغام کیا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی نامہ نگار ان کو قلم بند نہ کر سکا۔ صرف ایک تقریر قلم بند ہو کر شائع ہوئی ہے جو آپ نے دیوبند کی جامع مسجد میں فرمائی تھی اس کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''۱۵ راگست کے بعد بہت بڑی حد تک غیر ملکی حکومت کے جوے سے ہم آزاد ہو چکے ہیں مگر انگریز کی سیاست اب تک ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔ حکومت کی پرانی مشین اسی طرح موجود ہے۔ پرانی حکومت کے کارندوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے وطن کو فساد اور قتل و غارت گری کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ ان کی سازشوں کے سامنے حکومتیں مفلوج اور ملک کے حقیقی خیر خواہ بے بس ہو گئے ہیں اب یہ تمہاری ہی طاقت ہے جو ان پر فتح پا سکتی ہے اگر تم حالات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لو اور اللہ پر بھروسا کر کے فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے وطن اور عوام کے امن کو تباہی کے اس جہنم سے نکال سکتے ہو۔ عوام کی طاقت ان سازشوں کو ملیا میٹ کر سکتی ہے''۔

مسلمانوں کو رحم و کرم کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''اسلام محبت، رحمت، امن اور سلامتی کا پیغام ہے، اسلام ایک لمحے کے لیے بھی اس درندگی کو برداشت نہیں کر سکتا، جو لوگ مذہب کے نام پر یہ درندگی پھیلا رہے ہیں وہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں، اسلام اور قساوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے''۔

آپ نے قرآن پاک اور احادیث سے اس مضمون کے متعلق بہت سے شواہد پیش کیے پھر استقامت کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

''آج خوف اور بزدلی کا جو عالم ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ گھروں میں بیٹھے ڈرتے ہو، راستہ چلتے ہوئے ڈرتے ہو، اپنی بستیوں میں رہتے ہوئے ڈرتے ہو، کیا تم انہیں بزرگوں کے جانشین ہو، جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آئے تھے، جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا، آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو، یوپی میں تمہاری تعداد ۸۵ لاکھ سے زیادہ ہے پھر تمہارے خوف کا یہ عالم ہے کہ سر پر

پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جارہے ہو، کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھ لی ہے، جہاں خدا کی گرفت سے بچ سکو گے، جہاں تم کو موت نہیں پا سکے گی موت سے بچ کر کہاں جا سکو گے۔

میرے بھائیو اور عزیزو! موت ڈرنے کی چیز نہیں۔ ایک سچا مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا، موت کی تمنا کو اسلام نے صداقت کا معیار قرار دیا ہے، کفار کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے فتمنوا الموت ان کنتم صادقین ''موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو'' پھر اسلام کے نام پر جان دے دینا موت نہیں زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ ''جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں''۔ ہمیں ان کی زندگی محسوس نہیں ہوتی''۔

قرآن شریف اور احادیث سے شہادت کے مراتب اور فضائل بیان کرنے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

''اس لیے جبن اور خوف کو اپنے دل سے نکال دو، اسلام اور جبن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر و استقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو، کبھی فساد کی ابتداء نہ کرو، اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو ان کو سمجھاؤ لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ تمہاری تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو یہ عزت اور شہادت کی موت ہو گی''

وفاداری اور بے وفائی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''اس ملک کو تم نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ آیندہ بھی اس کو اپنے خون سے سینچنے کا عزم رکھو۔ یہی ملک کی حقیقی وفاداری ہے، اس ملک پر تمہارا ابھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے باشندے کا اور اس کی خدمت کی ذمہ داری تم پر بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کسی دوسرے شخص پر عاید ہو سکتی ہے۔ وفاداری کے اظہار کا جو ڈھنگ تم نے اختیار کیا ہے، وہ نہ مفید ہے نہ ضروری! آج اس ملک کے ساتھ اظہار وفاداری یہ ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دو، فرقہ پرستی کے جراثیم کا خاتمہ کرو، وفاداری کے پرانے طور طریقے اب بدل چکے ہیں۔ اب افسران حکومت یا حکومت کے ساتھ وفاداری کے کوئی معنی نہیں، جب تک اس ملک میں جمہوریت کا نام و نشان باقی ہے حکومت ہم خود ہیں، وزرائے، حکومت کو ہم نے اپنے ووٹوں سے منتخب کر کے

بھیجا ہے تاکہ وفاداری کے ساتھ ملک اور اہل ملک کی خدمت کریں، یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کے وفاداری اور ملک کے سچے خیر خواہ اور خادم ہیں۔ ہم کو ان سے باز پرس کا حق ہے، پھر اس غلامانہ اظہار وفاداری کا کیا مطلب''؟

''مختلف سمتوں سے مسلمانوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا جارہا ہے اور یہ سوال کچھ اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ گویا انڈین یونین میں مسلمانوں کو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ کسی غیر وفاداری کا نتیجہ ہیں، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا غیر وفاداری ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں نے کی ہے؟ ملک کی تقسیم سے پہلے بمبئی، بہار، گڈھ مکتیشر اور یوپی کے مختلف مقامات کے لوگوں نے جو دکھ اٹھائے ہیں وہ کسی غیر وفاداری کا نتیجہ تھے اور تقسیم کے بعد دہلی اور مشرقی پنجاب کی تباہی عوام کی کس بے وفاداری کا تھی وہ کیا غداری تھی جس کی سزا میں ان کو خانہ ویرانی اور تبادلہ آبادی کا تحفہ دیا گیا اور اگر یہ سب کچھ مسلمانوں کی غیر وفاداری کا صلہ تھا تو کلکتہ، نواکھالی، پٹرا، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو مصائب برداشت کیے ہیں وہ کس جرم کی سزا تھے۔ ملک کی تقسیم یقیناً زبردست نقصانات کا باعث ہوئی۔ لیکن اس کو غیر وفاداری کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر یہ غیر وفاداری کا معیار ہے تو منظور کرنے والوں پر بھی اس کی اتنی ہی ذمہ داری ہے، جتنی مطالبہ کرنے والوں پر عاید ہوتی ہے، قوم پرور مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی وہ کون سی فرقہ وار یا غیر فرقہ وار جماعت تھی جس نے برطانوی حکومت کے اس تحفے کو قبول نہ کیا ہو، جمعیت علمائے ہند کے رہنما آخری لمحے تک چیختے رہے کہ تقسیم منظور کر کے ملک کو تباہی کے جہنم میں نہ جھونکو، ہندوستان کا وہ کون سا وفادار تھا جس نے جمعیت علماء کی آواز کو سنا۔

تقسیم کے حق میں ووٹ دینا اگر غیر وفاداری کا معیار سمجھا گیا ہے، تب بھی میں پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام (الور، بھرت پور وغیرہ کے باشندوں) کا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں ان کو خانماں بربادی میسر آئی۔ یہ غریب تو ووٹ دینے کے بھی قصور وار نہ تھے۔ پھر ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام میں، کتنے لوگوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ آبادی کے دس فیصدی حصے کو مالی اور تعلیمی معیار کی بناء پر رائے دینے کا حق دیا گیا تھا۔ یعنی دس کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ایک کروڑ کو

رائے دینے کا حق حاصل تھا، اگر یہ تعداد متفقہ طور پر تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی۔ تب بھی مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ نہ ہوتا ایسا فیصلہ تو صرف رائے دہی بالغان کے اصول پر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتخابات میں ان تمام دفتری سازشوں اور مداخلتوں کے باوجود جو پچھلی حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے حامیان تقسیم کے حق میں کی گئی تھیں۔ تقسیم کی حمایت میں پینتالیس لاکھ ایک ہزار ایک سو چھپن ووٹ حال کیے گئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دس کروڑ مسلم عوام میں سے صرف ساڑھے چار فیصدی کی رائے کو کس طرح پوری قوم کے سر تھوپا جا سکتا ہے اور کس طرح اس کی وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

بلا شبہ ملک کے ساتھ وفاداری ملک کے ہر بسنے والے کا قومی فریضہ ہے لیکن اس وفاداری کا معیار کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں ہے۔ کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے اپنا خون نہیں بہایا۔ کیا مسلمانوں کے سوا سبھی لوگ ہندوستان کے وفادار رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسی کے خلاف آج جو کچھ کیا جا رہا ہے کیا وہ ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کرنا تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ اس موقع پر کسی مذہبی فرقے کی وفاداری کے سوال کو زیر بحث لانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ تباہی کے بنیادی اسباب کی طرف سے چشم پوشی کی جائے اور ملک کی رجعت پسند طاقتوں کے مقابلہ میں اپنی شکست اور بے بسی کے لیے اس سوال کو آڑ بنایا جائے۔ عوام کی موجودہ تباہی اور ملک کی پر امن ترقی کو روکنے کی ذمے داری صرف انہیں رجعت پسند طاقتوں پر ہے جنہوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر عوام میں منافرت پیدا کی اور اس نفرت کو اپنے مقاصد کا ذریعہ بنایا۔ یہ عناصر کسی ایک فرقے تک محدود نہیں تھے اس لیے کسی خاص مذہبی گروہ کی وفاداری پر شک وشبہ کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے"۔ ■

ایک خطبۂ صدارت

ناگپور کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۹ء میں

''۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کو ابھی پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے۔ وطن عزیز کی فضا میں تلاطم موجود تھا۔ طرح طرح کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے تاثرات، اس وقت ناگ پور کانفرنس میں حضرت اقدس نے جو خطبۂ صدارت (زبانی) ارشاد فرمایا وہ اگرچہ وقتی تھا، مگر افادیت کے لحاظ سے وہ گویا صحیفۂ لقمان تھا۔ جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اس سے ہمیشہ سبق لینا چاہیے۔ ذیل میں خطبہ ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:

''حضرات! جمعیت علمائے ہند کوئی نئی جماعت نہیں ہے جو پچھلے دو چار برس میں قائم ہوئی ہو بلکہ یہ وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے آزادیٔ ہند کی جدوجہد شروع کی تھی اس کی بنیاد ۱۸۰۳ء میں رکھی گئی تھی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آئے تھے جن کو بادشاہ دہلی نے ملازم رکھا تھا کہ وہ بنگال بہار اڑیسہ وغیرہ کی مال گزاری وصول کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے خود اس کا اقرار کیا ہے لیکن انگریزوں نے آہستہ آہستہ ایسی تدابیر اور حیلے اختیار کیے کہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور بادشاہ دہلی سے آہستہ آہستہ کچھ اختیارات حاصل کر کے انہوں نے اپنے پیمان اور وعدوں کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے شہنشاہ دہلی کو بالکل مجبور اور بے بس کر کے یہ لکھوالیا کہ آج سے

تمام ملک کا انتظام کمپنی کے سپرد ہوگا۔

ہندستان انگریزوں کی آمد سے پہلے نہایت خوش حال اور دولت مند ملک تھا۔ یہاں ضروریات زندگی اور سونے چاندی کی اس قدر افراط تھی کہ جس کی نظیر دنیا بھر میں نہ ملتی تھی۔ یہاں صرافوں کی دوکانوں پر سونے چاندی کے ایسے ڈھیر لگے رہتے تھے، جیسے کسی منڈی میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں ۱۷۷۲ء میں سونے کے ۲۰۰ سکے رائج تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں نو قسم کی اشرفیاں چلتی تھیں، جن میں سب سے بڑی اشرفی ایک سو دو تولے کی ہوتی تھی۔ اناج کی یہ کثرت تھی کہ ایک روپے کا چار من گیہوں ملتا تھا اور ایسا ہی دوسری ضروریات زندگی کا حال تھا۔

انگریز کی لوٹ مار:

انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد نہایت بھیانک اور ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان کو لوٹنا شروع کیا، آہستہ آہستہ حکومت پر قبضہ کیا۔ پھر بھاری بھاری ٹیکس لگائے، لگان اور مال گزاریاں مقرر کیں۔ تمام بڑے عہدوں پر انگریز افسروں کو مقرر کیا اور ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ درجے کی ملازمتیں دیں اور جابرانہ طریقوں سے ہندوستان کی تمام دولت وثروت کو لوٹ کر انگلستان پہنچادیا۔

ان بڑھتے ہوئے مظالم اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے حضرات علماء نے یہ محسوس کیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے جلد نہ نکالا گیا تو ہندوستانیوں کی تباہی و بربادی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر جلد غیر ملکی حکومت کو ہندوستان سے نکالیں، یہ فتویٰ آج بھی فتاوی عزیزیہ میں موجود ہے اور اسی پر جمعیت علمائے ہند کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اسی وقت سے آزادیٔ ہند کی تحریک شروع ہوئی ہے۔

جمعیت علما کے کارنامے:

جمعیت علما اس وقت سے برابر اپنی جدوجہد میں مصروف رہی۔ شروع میں اس کی تحریک خفیہ طور پر چلائی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں صوبہ سرحد کے اطراف میں مورچہ لگایا گیا جہاں چھ سال تک برابر انگریزوں سے جنگ ہوتی رہی۔ ۱۹۱۴ء حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴ء تک اسے اس حد تک پہنچادیا۔ اگر اس وقت کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ء میں کانگریس قایم ہوئی جو کسی ایک فرقے کی جماعت نہ تھی بلکہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی وغیرہ سب شریک تھے۔

سمجھ دار مسلمانوں اور علمائے کرام نے جو پہلے ہی سے آزادیٔ وطن کے لیے جدو جہد کر رہے تھے کانگریس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کو نکالنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں، ان میں سے بہت سوں کو پھانسیاں دی گئیں، کالے پانی کی سزائیں دی گئیں، سخت سے سخت قید میں رکھا گیا، لیکن وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہ گھبرائے۔ اگر تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو آزادیٔ وطن کی راہ میں کسی کی بھی قربانیاں اتنی نہیں ہیں جس قدر علماء کرام کی ہیں۔

انگریز کی آخری کوشش:

بہر حال ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی اس تحریک کو کامیاب ہوتا دیکھ کر انگریزوں نے آخری کوشش یہ کی کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا جائے بدقسمتی سے ہمارے بہت سے بھائی انگریزوں کے اس فریب کا شکار ہوئے۔ جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی بھیانک صورت میں رونما ہوا جس میں لاکھوں ہندو مسلمان قتل ہوئے۔ لاکھوں تباہ و برباد ہوئے، ہزاروں عورتوں کی عصمت دری ہوئی اور کروڑوں روپیہ کا مال لوٹا گیا اور برباد کیا گیا اور آج تک ان مصیبتوں سے چھٹکارا نہ ملا۔

آج کچھ بے وقوف کہتے ہیں کہ جمعیت علماء فرقہ پرست جماعت ہے۔ حال آں کہ میں نے آپ کو بتایا کہ جمعیت علما کوئی نئی جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ سے آزادی وطن کے لیے سب فرقوں کی مشترکہ جماعت کانگریس کے ساتھ قربانیاں دیتی رہی ہے اس نے بھی فرقہ واریت کو اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اس کے فارمولے، تجاویز اور ریکارڈ موجود ہیں، دیکھو اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تمام فرقے باہم میل جول کے ساتھ ملک کی خوشحالی کے لیے کوشش کریں اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہیں جیسے وہ انگریزوں کے آنے سے پہلے مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گھر، دکانیں، کھیت اور باغات کے معاملات لین دین، ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے تھے، ان میں باہم کوئی نفرت اور دشمنی نہیں تھی، بے شک بادشاہ اور رجواڑے لڑا کرتے تھے مگر وہ حکومتوں کی لڑائیاں ہوتی تھی۔ ان سب کی فوجوں میں سب فرقوں کے لوگ ہوتے تھے"۔

حضرت مولانا نے تقسیم کے بعد پیدا شدہ حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"محترم بزرگو! ہندوستان ہمارا وطن ہے، ہم اور ہمارے آباؤ اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مرے، ہم سب کو یہیں رہنا ہے، ہماری ترقی اور خوشحالی آپس کے اتحاد اور اتفاق سے ہو سکتی ہے۔ لڑائی ہمیشہ تباہی لاتی ہے۔ ہم بگڑیں گے تو ہمارا ملک بگڑے گا، ہم نبھتے ہیں تو ہمارا ملک بھی نبھتا ہے، ہم سب ہندوستانی ہیں اور ایک قوم ہیں، اس لیے ہم سب کو بھائی بھائی کی طرح محبت کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے۔ جیسے ہم پہلے رہا

کرتے تھے"۔

پریشانیاں جلد ختم ہو جائیں گی!

"مسلمانو! یہ ٹھیک ہے کہ آج تقسیم کے بعد ہماری حالت بہت نازک ہوگئی ہے اور ہمیں طرح طرح کی پریشانیاں درپیش ہیں، لیکن یہ سب پریشانیاں جلد ختم ہو جانے والی ہیں اور آخر ہم سب کو یہیں مل جل کر رہنا ہے۔ ہندوستان کی حکومت ہندو حکومت نہیں ہے وہ غیر مذہبی حکومت ہے، وہ سب فرقوں کو ان کے برابر حقوق دیتی اور دینا چاہتی ہے، اور یہی اس کا اعلان ہے، یہ ٹھیک ہے کہ نیچے درجے کے بعض افسر اور سرکاری ملازم اپنی الگ پالیسی چلاتے ہیں لیکن یہ اسی مشین کے پرزے ہیں، جو انگریز نے چلائی تھی، اور جس کے ذریعے وہ حکومت کرتا تھا۔ لیکن انگریز ہندوستان سے جا چکا ہے اس کا اثر بھی جو کچھ باقی ہے وہ جا کر رہے گا، اس لیے ہمیں گھبرانا اور بھاگنا نہیں چاہیے، بلکہ پورے صبر اور استقلال کے ساتھ اپنا وطن سمجھتے ہوئے یہیں رہنا چاہیے، کیا یہاں سے بھاگ کر کوئی تم کو مصیبتوں سے بچا لے گا؟ تم حیدرآباد بھاگ کر گئے تھے تو اس کا نتیجہ شرمندگی کے سوا کیا ہوا، اور آخر تم یہیں لوٹ کر آئے، اس لیے تمہیں بتاتا ہوں کہ اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ رہو گے، سچائی پر قایم رہو گے، سب کی بھلائی اور بہتری چاہو گے تو خدا تمہارے ساتھ ہوگا اور جس کے ساتھ خدا ہو پھر اس کو کسی چیز کا کیا ڈر ہو سکتا ہے؟"

آزمائش:

"تم مسلمان ہو، تمہارے باپ دادا تو موت کے خوف سے نہیں ڈرتے تھے کہ اس کی آرزو کیا کرتے تھے اور تم آج موت اور پریشانیوں سے ڈرتے ہو؟

اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم صبر اور استقلال کے ساتھ یہاں رہو گے اور سچائی کی راہ پر قایم رہو گے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ چونکہ قرآن کریم نے تمہیں بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ اس کے بعد اگر تم کہیں کسی ظالم کے ہاتھ سے مارے بھی جاؤ تو تمہیں اس موت سے ڈرنا نہیں چاہیے، چونکہ وہ شہادت کی موت ہوگی اور تم جانتے ہو کہ شہادت کی موت کا کتنا بلند مرتبہ ہے، جس کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی بار بار آرزو کی اور فرمایا میرا دل چاہتا ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، تو پھر کیوں تم ایسی موت سے ڈرتے ہو، مصیبتیں آیا ہی کرتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان والو تمہیں دنیا میں ہر طرح سے آزمایا جائے گا، لیکن اگر تم نے صبر کیا اور استقلال کے ساتھ سچائی کی راہ پر قایم رہے تو پھر تمہارے ساتھ خدا کی مدد ہوگی اور تمہارے لیے کامیابی کی خوشخبری ہوگی۔

جمعیۃ علماء کا نصب العین:

تقریر ختم کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا:

"بھائیو! یہی وہ تبلیغ اور تعلیم ہے جواب جمعیت علماء کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں کی جہالت، بے علمی اور مذہب سے ناواقفیت کو ختم کرنا چاہتی ہے اور اسی کے لیے برابر کوشش کر رہی ہے اگرچہ کچھ مالی مشکلات کی وجہ سے اور کچھ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے وہ ایسی کوشش نہ کرسکی جیسی ہونی چاہیے تھی، لیکن آپ حضرات کی مدد سے امید ہے کہ وہ پوری کوشش کرتی رہے گی۔ پس آج یہی مذہبی خدمات اور تعلیم کی ترویج اس کا نصب العین ہے۔ وہ چاہتی جابجا مدرسے اور نائٹ اسکول قایم کریں۔ دین کو پھیلائیں اور سب کو دین کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

اسی نصب العین کی طرف جمعیت علماء آپ کو بلاتی ہے، سیاسی نصب العین تو حاصل ہو چکا ہے، ملک بدیشی راج سے آزاد ہوگیا ہے، اب بھی جو سیاسی امور ہیں وہ جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ مشترک جماعت کے پلیٹ فارم سے انجام دیے جائیں گے اور ان میں مسلمانوں کو برابر حصہ لینا چاہیے، انہیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جمعیت علماء کے بھی ممبر بنیں اور کانگریس کے بھی تاکہ وہ سیاسی معاملات میں کانگریس کی راہ سے حصہ لے سکیں اور مذہبی خدمات میں جمعیت علماء کی راہ سے۔

و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین! ■

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے نام

جمیل المناقب محترم المقام دامت برکاتکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج سامی۔ باعث تصدیعہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اعتبار سے جو حالت ہے وہ جناب والا کے سامنے ہے۔ نوجوانوں میں لامذہبیت اور بے دینی جس رفتار سے روز بروز پھیلتی جارہی ہے، وہ دیندار حضرات کے دل میں نہایت درجہ تشویش پیدا کرنے والی ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی رہنمائی پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہوتا جارہا ہے جن کو اسلام اور اسلام کے مصالح اجتماعیہ سے نہ پوری طرح واقفیت ہے اور نہ ان کے دل میں دین اور ملت کی حقیقی بہی خواہی کا کوئی جذبہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جن خطرات اور اندیشوں کی بنا پر انگریزی تعلیم کی اجازت کی مخالفت کی تھی وہ ایک ایک کر کے سامنے آرہے ہیں نئے تعلیم یافتہ حضرات نہ صرف اسلامی اعمال واخلاق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں بلکہ اسلامی عقاید سے بھی دور نظر آرہے ہیں۔ ان کا یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ اسلام اور شریعت اسلامی موجودہ زمانے کی ضروریات اور مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے وہ اس زمانے میں قابل عمل نہیں۔ اسی عقیدے کی بناء پر وہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف قوانین بنواتے ہیں۔ اس وقت مسلم لیگ پر ایسے ہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں مسٹر جناح نے اسمبلی میں قانونی شادی کے بل پر تقریر کرتے ہوئے انہیں خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی وہ قرآن کو ایک فرسودہ کتاب کہتے ہیں جیسا کہ عنایت اللہ صاحب مشرقی نے لاہور اور امرتسر میں ظاہر کیا ہے۔

یامین خان صاحب نے ۱۹۳۲ء میں اسی قانون پر تقریر کرتے ہوئے اسمبلی میں کہا کہ یہ قانون اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے۔ حال آں کہ قرآن کا صاف صاف حکم موجود ہے کہ مسلمان مرد مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت مشرک مرد سے شادیاں نہ کریں۔ شریعت بل کو انہیں مسٹر جناح نے اسمبلی میں ترمیمات پیش کر کے تباہ کیا۔ خلع بل کی ایک دفعہ حذف کر کے اس کو شریعت اسلامی کے خلاف پاس کرا کر مسلمانوں میں ایک فتنہ عظیم کا دروازہ کھول دیا۔ قاضی بل کی مخالفت کی اور اس جذبے کے ساتھ مخالفت کی کہ اس سے مسلمانوں میں مذہبی علماء کا اقتدار قایم ہوگا، جس کا مٹانا ان کا اولین نصب العین ہے۔ غرض ایک نہیں بیسیوں

قوانین اسمبلیوں میں ایسے سامنے آئے ہیں جس میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں نے صراحۃ اسلامی احکام اور اسلامی تعلیمات کی مخالفت کی ہے۔ انہی مفاسد کا سدباب کرنے کے لیے دارالعلوم اور دوسرے مدارس عربیہ ہمارے اکابر نے قایم کیے تھے (قدس اللہ اسرارہم)۔ اسی لیے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے جمعیت علمائے ہند کو قایم فرمایا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء سے جمعیت علماء حضرت کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جدو جہد کررہی ہے۔ چنانچہ پچھلے انتخابات میں جمعیت علماء نے اسی شرط پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کریں گے جو تمام مفاسد کا تنہا علاج ہے اور تمام مذہبی معاملات میں جمعیت علماء کی رائے کا اتباع کریں گے۔ لیکن جمعیت علماء کی کوششوں سے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ان تمام وعدوں اور شرطوں کو پولیٹکل وعدے کہتے ہوئے نظر انداز کردیا جو ہم سے کی گئی تھیں اور نہ صرف جمعیت علمائے ہند بلکہ تمام علمائے دین کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ متعدد مقامات پر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں اعلان کیا کہ ہم نے عوام کو علمائے کی غلامی سے آزاد کردیا ہے۔ ہم نے علماء کا اقتدار مٹادیا ہے اور یہ ہماری کامیابی کی اولین منزل ہے۔ یہ اعلان طبقۂ علما کے خلاف ہی اعلان جنگ نہیں ہے بلکہ اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ غور تو فرمایئے کہ علماء کوئی نسلی گروہ نہیں ہے، جس کو مٹانے سے اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا بلکہ عالم تو وہی فرد کہلایا جائے گا جو اسلامی احکام اور شریعت سے باخبر ہے۔ اس کو مٹانے کے تو معنی یہی ہیں کہ اس طبقے کو مٹادیا جائے جو دینی احکام سے واقفیت رکھتا ہے اور قدم قدم پر ان بے سہارا یورپ زدوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتا رہتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علمائے مذہب کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے بعد اسلام، شریعت اور مذہب کو کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان لوگوں کے اس قسم کے دعاوی کے باوجود دو چار علماء بھی آج ان کی تائید کس طرح کر رہے ہیں۔ بہ ظاہر اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان حضرات علماء کے پیش نظر ذوات ہیں۔ اس لیے وہ علماء کی مخالفت کے عام دعووں کو ذوات ہی تک محدود سمجھتے ہیں یا ان کے سامنے مجبوریاں ہیں اور یا وہ اسی طرح ان یورپ زدوں کا فریب کھارہے ہیں۔ جس طرح کل ہم کو فریب دیا گیا تھا۔ حال آں کہ ان لوگوں کا صاف صاف اعلان ہے کہ ہمارے سوائے کوئی جماعت (یا فرد) آٹھ کروڑ مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق نہیں رکھتا۔

لیگ ہی تنہا وہ نمائندہ جماعت ہے جو مسلمانوں کی نمایندگی کرسکتی ہے، اسی دعوے کو ثابت کرنا چاہتی ہے۔ لیگ کے اس دعوے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے سوائے مسلمانوں کی کسی جماعت کا وجود تسلیم نہیں کرتی اور انتخابات میں لیگ کو رائے دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم بھی ان جماعتوں کے قتل کے محضر پر دستخط کرتے ہیں۔

اسی لیے جمعیت علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ انتخابات میں پوری قوت کے ساتھ حصہ لے کر اس چیز کو ثابت کرے کہ لیگ کے حلقے کے باہر دیندار مسلمان اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں اور ان کی جماعتوں کو بھی مسلمانوں کے مذہبی وسیاسی مسایل کے متعلق اسی طرح بولنے کا حق ہے، جس طرح لیگ کو ہے، اگر آج بھی وہ مصالح دینیہ واسلامیہ موجود ہیں جن کے لیے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ نے جمعیت علماء کی بنیاد رکھی تھی اور اگر آج اس کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے دیندار طبقے کی موجودگی کو ثابت کیا جائے تو ہم سب کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان انتخابات میں جمعیت علماء کی ہر ممکن امداد کریں اور لیگ کے اس دعوی ''انا ولا غیری'' کو غلط ثابت کردیں۔ میرے ناقص خیال میں تو یہ مسئلہ موجودہ حالات میں دوسرے تمام مسایل سے زیادہ اہم ہے اور میں اس کے لیے پوری بصیرت رکھتا ہوں۔

مصلحت دید من آن است کہ یاراں ہمہ کار

بگذارند و جم طرۂ یارے گیرند

مجھے نہیں معلوم کہ جناب والا میری رائے سے کہاں تک اتفاق فرماتے ہیں۔ تاہم یہ یقین ہے کہ اگر جناب والا اس کو موجودہ مسایل میں وقتی طور پر سب سے زیادہ اہم نہیں تو کم از کم اہم مسایل میں سے ضرور خیال فرماتے ہوں گے۔ اس لیے مودبانہ میری استدعا ہے کہ جناب والا جہاں تک ممکن ہو اس مہم میں جمعیت علماء کی امداد فرمائیں جو دیندار طبقے کی طرف سے لیگ کے خلاف جنگ کرنے کا بیڑا اٹھا چکی ہے۔ پنجاب کی بعض اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جناب والا کے بعض متوسلین پنجاب میں اور خصوصاً جالندھر کے اطراف میں لیگ کی پرزور حمایت کر رہے ہیں۔ اگر جناب اپنے متوسلین سے ایک عمومی اپیل فرمادیں کہ وہ ہر جگہ جمعیت علماء اور آزادی پسند جماعتوں احرار وغیرہ کی انتخابات میں امداد کریں اور مسلم لیگ کا کسی طرح ساتھ نہ دیں تو یہ جمعیت علما اور احرار وغیرہ کی بہت بڑی امداد ہوگی۔ جہاں پر جمعیت علماء کا نظام قایم نہیں ہے وہاں بھی لیگ کی مخالفت ضروری ہے۔ لیگ کے مقابلے میں دوسری جماعتوں کا ساتھ دینے سے بھی بالواسطہ جمعیت علماء ہی کی تائید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ لیگ کے سوا مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کا بھی وجود ہے۔

جناب والا کے ملاحظہ کے لیے میں اپنا ایک عریضہ جو رائے دہندگان کے نام لکھا گیا ہے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اس میں بالاجمال لیگ کے زعما وقایدین کی بعض کارگزاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت کچھ مواد فراہم کیا ہے، جو انشاء اللہ طبع ہونے پر وقتاً فوقتاً ارسال خدمت اقدس کروں گا۔ واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۹ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ : (۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

کی

خاکساری، بردباری اور تواضع کے مستند الفاظ وکلمات

مفتی محمد ساجد حنیف فاطمی

خلیفہ مجاز حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

حضرات اکابر سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے پیغامات اتحاد کو عملی جامہ پہنانے کی درخواست ہے

میں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تمام اہم خلفاء وتلامذہ اور افراد خاندان مدنی کے ذریعہ جو سبق حاصل کیا تھا، نیز حضرت شیخ الاسلامؒ کا قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ برن پور ضلع بردوان مغربی بنگال نیز اپنے والد مرحوم محمد حنیف صاحب نور اللہ مرقدہ واقف وبانی مدرسہ حسینیہ جے کے نگر سے ''تواضع'' کے متعلق جو تعلیم وتربیت حاصل کی تھی اس کو ان کے تمام اخلاف، متبعین، مسترشدین، محبین، اور متعلقین کو حوالہ کرنے کی سعادت عظمیٰ حاصل کررہا ہوں، اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے جملہ خلفاء ومجازین مرحومین وموجودین کے حوالہ اور واسطہ سے ہندوپاک وبنگ کے جملہ مسلمانوں بالخصوص حضرت مشفق اتالیق استاذ مکرم مولانا سید ارشد مدنی وشل حضرت الاستاذ جناب مولانا قاری محمد عثمان صاحب وحفید شیخ الاسلامؒ؛ اخی الصالح العزیز، جناب مولانا محمود اسعد مدنی زید مجدہم، اور دونوں طرف کی جمعیۃ کے عاملہ ومنتظمہ حضرات ممبران زید مجدہم ومحترم اکابر شوریٰ دارالعلوم دیوبند، ومظاہر علوم سہارنپور، ان سب کی خدمات عالیہ کے علاوہ مخدومی حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب زید مجدہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمتِ اقدس میں بھی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے

''پیغامات اتحاد''میں سے دوعدد پیش ہیں، اس قوی امید پر کہ یہ تمام اکابر مدظلہم حضرت مدنیؒ کے ارشاد فرمودہ ہدایات وپیغاماتِ اتحاد کو عملی جامہ پہنا کر حضرتؒ کے سامنے کل بروز حشر سرخ رو ہوں گے۔ان ارید الا الاصلاح مااستطعت وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کا پیغام اتحاد (۱)

حضرات اکابر دیوبندؒ کی طرح آپس میں اگر اتفاق واتحاد سے رہوگے اور منافرت وجاہ طلبی سے بچوگے تو خودبھی کامیاب ہوگے اور امت کوبھی کامیابی نصیب ہوگی۔ورنہ..............سوچواور سمجھو

''لوگوں کو اللہ سے ملاؤ، شیطان سے دور کرو، آپس میں اگر اتحاد واتفاق سے رہوگے منافرت اور جاہ طلبی سے بچوگے، ہرایک دوسرے کی مدد کرے گا اور ایک جان چند قالب بنے گا،جس طرح مولانا گنگوہیؒ،مولانا نانوتویؒ،مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ،مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ،مولانا محمد احسن صاحب نانوتویؒ قدس اللہ اسرارہم العالیہ تھے۔تو خودبھی کامیاب ہوگے اور امت کوبھی کامیابی نصیب ہوگی ورنہ محرومیت کا عظیم الشان خطرہ سامنے موجود ہے۔سوچو اور سمجھو۔

تم لوگ ہرگز امت محمدیہ کی خدمت انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ اپنے آپ کو شریعت کا پابند اور سنن نبویہ علی صاحبہا والصلوٰۃ والتحیۃ کا شیدا اپنے ظاہر وباطن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ نہ بناؤ گے لوگ بغیر اس کے آپ کی تقلید کس طرح کریں گے؟۔(مکتوبات جلد۴ صفحہ ۲۹۴۔۲۹۵۔مکتوب نمبر۱۳۷)

میرے پیارے بھائیو! مجھ کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا کہ اغیار نے شکایتیں کیں کہ مجامع عامہ میں پیٹھ کے پیچھے آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں یہ کس قدر عظیم الشان غلطی ہے اور آیا ایسی صورت میں آپ خدمت امت اور خدمت دین کرسکتے ہیں؟الخ

حضرت شیخ الاسلامؒ کا پیغام اتحاد (۲)

خاندان میں اتفاق واتحاد کی بابت ہرگز کوتاہی نہ کی جائے۔

''خاندا میں میل جول، اتفاق، اتحاد، ہونا بہت مفید اور ضروری ہے، اور جو سبیل باعزت میل جول کی ہو اس میں کوتاہی نہ ہونی چاہیے،..........ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۹رجمادی الاول ۱۳۷۴ھ (مکتوبات ج:۳/۹۸،مکتوب نمبر۱۸)

☆ سب کچھ ہونے کے باوجود شیخ مدنیؒ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے'' حضرت تھانویؒ۔

(مکتوبات:۲/۱۵۵، حاشیہ مکتوب نمبر ۳۷، سطر نمبر ۱۰)

☆ حقیقی تواضع وانکساری سے ہی عزت ملتی ہے'' حضرت مدنیؒ۔ (مکتوبات:۲/۱۷۱)

☆ دنیاوی مطاعم اور ملابس وغیرہ میں تلذذ سے بچئے، ہمیشہ سادہ اور موٹا جھوٹا کھانا کپڑا فرش وغیرہ اختیار کیجئے''

(مکتوبات:۲/۲۴۰)

☆ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بے پرواہ سرکار ہے، پھر کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں''۔

(مکتوبات:۳/۱۹۳)

قارئین کرام! حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنے مختلف مکتوبات گرامی میں میری تحقیق وتدقیق کے مطابق متفرق طور پر اپنی ذات وصفات کے متعلق جو تین سو سے زائد الفاظ وجملے استعمال کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، مگر اپنے معزز ومحترم حضرات قارئین کرام سے گزارش ہے کہ تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے نمبرات بعد میں پڑھیں، پہلے ایک طرف سے الفاظ وعبارات پڑھتے جائیں تو یہ زیادہ مفید ومثمر ہوگا، انشاء اللہ:

(۱) ظلوم (۲) جہول (۳) ننگ خاندان (۴) تن پرور (۵) نفس پرست (۶) نفس پرور (۷) نالائق (۸) ناکارہ (۹) روسیاہ (۱۰) واقعۃً ننگ اکابر واسلاف (۱۱) مثل سگ اصحاب کہف (۱۲) خاکسار (۱۳) عاجز (۱۴) بے بضاعت (۱۵) کم مایہ (۱۶) من نہ کردیم شما حذر بکنید (۱۷) بدنام کنندہ نکونامان (۱۸) بدھا ڈاکو (۱۹) غلط کار (۲۰) نقال (۲۱) پست ہمت (۲۲) محض روٹی کھانے والا (۲۳) نام کا بندہ (۲۴) گندہ (۲۵) میں کیا؟ میری دعا کیا؟ (۲۶) ننگ خلائق (۲۷) ناکام (۲۸) نامراد (۲۹) خالص سگ دنیا (۳۰) اپنی حالتوں پر شرمسار (۳۱) بدعمل (۳۲) بدنصیب (۳۳) سیاہ کار (۳۴) ارذل حیوانات سے بدتر (۳۵) سایۂ بوم (۳۶) تہی دستانِ قسمت (۳۷) سب سے برا آدمی (۳۸) بداحوال (۳۹) گریہ کناں (۴۰) سخت شرمندہ (۴۱) بدکردار (۴۲) ناہنجار (۴۳) گنہگار (۴۴) اشد الناس عذابا یوم القیامۃ (۴۵) اخسر الخاسرین (۴۶) سور اور کتے سے زیادہ نفرت کے لائق (۴۷) بناوٹ کرنے والا (۴۸) حضرت تھانویؒ کے سامنے طفل دبستاں (۴۹) ذا ورم (۵۰) غیر ضرم (سوجن کا موٹاپا، بغیر چنگاری کی آگ) (۵۱) قصیر الباع (۵۲) قلیل الفراغ (۵۳) راحت طلب (۵۴) سراپا قصوروار (۵۵) کم ہمت (۵۶) سراپا خطایا وتقصیرات (۵۷) افسوس کناں (۵۸) نادم (۵۹) اپنی محرومی پر افسوس کرنے والا (۶۰) من آنم کہ من دانم (۶۱) اَٹ پونجیے (۶۲) بجھے (۶۳) عیوب کا مجموعہ (۶۴) کمزوریوں کا انبار (۶۵) ناقص محفوظات (۶۶) ناقص علم (۶۷) ناقص معلومات (۶۸) دور افتادہ (۶۹) قابلیت فاسد (۷۰) استعداد کاسد (۷۱) کالے توے کی طرح جو کبھی روشن نہ ہوسکے (۷۲) نہ شگوفہ، نہ برگے، نہ ثمر، نہ سایہ

دارم (۷۳) عشق بتاں میں گرفتار (۷۴) زمزم پی کر بھی جگر کی آگ نہ بجھی (۷۵) نہ علم نصیب ہوا (۷۶) نہ عمل (۷۷) نہ فہم (۷۸) نہ فراست (۷۹) نہ حفظ (۸۰) نہ ذکاوت (۸۱) نہ تقریر (۸۲) نہ تحریر (۸۳) نہ معرفت (۸۴) نہ طریقت (۸۵) غرضیکہ ہر طرح ہاتھ خالی ہے (۸۶) ہر طرح کے وجوہ استحقاق سے محروم ہوں (۸۷) غیر مخلص (۸۸) ریاکار (۸۹) لوگوں کو دھوکہ دینے والا (۹۰) بدبخت (۹۱) بدنصیب (۹۲) بے ادب (۹۳) بدتمیز (۹۴) مثل خادم حضرت شیخ الہندؒ و مثل شاگرد حضرت شیخ الہندؒ (۹۵) میں خود سخت حیرت میں ہوں کہ حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ العزیز نے کس بنا پر اجازت و بیعت کا یہ معاملہ فرمایا؟ (۹۶) اور مجھ کو افسوس بھی ہے کہ لوگوں میں یہ امر (اجازت و بیعت) کیوں ظاہر ہوا؟ (۹۷) بڑوں پر سخت دھبہ ہوں (۹۸) محرومی کے سوا کوئی چیز میرے ہاتھ نہ لگی ہے (۹۹) طبعی تکاسل (۱۰۰) ذاتی ناقابلیت (۱۰۱) قسمت کی کوتاہی (۱۰۲) نفس کی شرارتوں کا ہر جگہ خوگر و پیکر (۱۰۳) واقعہ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں (۱۰۴) دارالعلوم دیوبند میں میرے ساتھ منتقمانہ جذبات کھیل رہے ہیں اور کھیلیں گے (۱۰۵) پردیسی (۱۰۶) کمزور (۱۰۷) اور نالائق کو نہایت آسانی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکالا (۱۰۸) اور ناک کی مکھی کی طرح اڑایا جاسکتا ہے (۱۰۹) میرا وجود خار (۱۱۰) اور زہریلا خار ہے (۱۱۱) ہم تو ساون کی جھڑیاں ہیں (۱۱۲) ہم اکابر و اسلاف کے طریقہ پر انشاء اللہ مرمٹیں گے (۱۱۳) ہم کو دارالعلوم سے نکالا جائے ہم خوش ہیں، رکھا جائے ہم خوش ہیں (۱۱۴) سب کی آنکھوں میں کانٹا حسین احمد ہے (۱۱۵) اب طبیعت اس ملازمت سے متنفر ہوتی چلی جاتی ہے (۱۱۶) خصوصاً ایسے ایسے مقدسین .... کے یہ احوال دیکھ کر (۱۱۷) میں کتنے مقدسین کی نگاہوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا رہا (۱۱۸) کچھ بعید نہیں کہ میرا تعلق ہی دارالعلوم دیوبند سے قطع کردیں (۱۱۹) لوگ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح اس کا پاپ کٹے (۱۲۰) اصل اصول فساد شیخ الہندؒ تھے، حضرت نانوتویؒ تھے اور اب حسین احمدؒ ہے (۱۲۱) دیوبند میں خصوصاً شیخ زادہ حضرات الا ماشاء اللہ پردیسیوں کو اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ ان کو وقعت دیتے ہیں اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے (۱۲۲) میری ظاہری معذوری تو ظاہر ہے باطنی حیثیت بھی نہایت گندی ہے (۱۲۳) میں تو علوم دینیہ پر اجرت لیتا ہوں اس لیے میرے جیسے شخص کو مرشد بنانا ہی غلط ہے (۱۲۴) میں ایک معمولی غریب آدمی ہوں ان سے رنجیدہ ہوکر ان کا کیا بگاڑ سکتا ہوں (۱۲۵) اہل دنیا ہم جیسوں کو تو اپنے جوتے کے خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتے (۱۲۶) میں ہرگز اس کے عشر عشیر کا مستحق نہ تھا اور نہ ہوں (۱۲۷) اخس الناس (۱۲۸) اجہل الناس (۱۲۹) بندۂ شکم (۱۳۰) اس کی دعا کا یہ حال کیوں کر ہوسکتا ہے؟ (۱۳۱) میں نے بے حد ظلم کیا ہے (۱۳۲) مجھ جیسے ناکارہ کے لیے اس قدر زیر باری اور تکلیف؟ (۱۳۳) میں جہالت اور بداعمالیوں کا مرکز ہوں (۱۳۴) نفس شیطان کا اڈا ہوں (۱۳۵) جاہل

(۱۳۶) قبیح ہواؤہوس ہوں (۱۳۷) بداعمالیوں (۱۳۸) بداخلاقیوں (۱۳۹) کسل مندیوں کی بنیاد ہوں (۱۴۰) میرا علم نہایت محدود (۱۴۱) اور بہت کم ہے (۱۴۲) حافظہ نہایت کمزور (۱۴۳) مجھ بہت ہی ناقص (۱۴۴) اخلاق واعمال بہت ہی گندے (۱۴۵) واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں صدارت دارالعلوم کی قابلیت نہیں ہے (۱۴۶) ہم جیسے ٹٹ پونجیے (۱۴۷) اور بہروپئے کو اس درجہ بڑھا رہے ہیں (۱۴۸) اللہ نے میری رذالتوں (۱۴۹) میرے معائب (۱۵۰) اور معاصی پر ستاریت کاملہ سے پردہ ڈال رکھا ہے (۱۵۱) ہم جیسے ٹٹ پونجیے تو اس قابل ہیں کہ ہم کو گوشۂ گم نامی میں رکھا جائے (۱۵۲) میں اکابر کا نالائق (۱۵۳) وناکارہ (۱۵۴) اور گستاخ خادم ہوں (۱۵۵) میں ہر طرح چھوٹا ہوں (۱۵۶) اور پھر نالائق وناکارہ کے علاوہ (۱۵۷) عبارت آرائی (۱۵۸) اور طریق تحریر سخت عاجز ہوں (۱۵۹) مجھ کو ہرگز زیبا نہیں کہ اس قسم کی بات زبان سے نکالوں (۱۶۰) قبل از وقت ایک نالائق وناکارہ کو ایسے احکام سے مکلف کرنا کیسی بے انصافی ہے؟ وغیرہ وغیرہ (۱۶۱) مجھ میں کوئی قابلیت کسی بزرگ کی جانشینی کی نہیں ہے (۱۶۲) مجھ کو نہ اپنے کو "محمودی" لقب رکھنا بھاتا ہے اور نہ رشیدی، نہ قاسمی، نہ امدادی اور نہ کبھی جرأت ہوئی (۱۶۳) میں اپنے بزرگوں کو تکلیف دینے والا ہوں (۱۶۴) راحت پہنچانے والا نہیں (۱۶۵) ننگ خاندان (۱۶۶) سیاہ کاری (۱۶۷) اور میری نامرادی کے لیے کھلے لفظوں میں "منادی" ہو رہی ہے کہ روسیاہ! تو ان سب بزرگوں کے لیے عار (۱۶۸) اور نہایت ناپاک عار ہے (۱۶۹) یہ ننگ خاندان تو بارگاہ رشیدی کا سب سے آخری اور سب سے چھوٹا غلام ہے (۱۷۰) اس روسیاہ خلائق کے لیے ایسے ایسے اونچے الفاظ استعمال کرنا "پشہ" کو "ہاتھی" کہہ کر استہزاء اور انتہائی استہزاء ہے (۱۷۱) بات بات اور قدم قدم پر چھچھورا پن (۱۷۲) غفلت (۱۷۳) معاصی (۱۷۴) بے حیائی اور بے شرمی اس کا شیوہ ہے جس نے اپنی گندگیوں سے خدا کی زمین اور تمام مخلوقات کو طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کر رکھا ہے (۱۷۵) ہم مدبروں اور ناکاروں (۱۷۶) حقیقی معنوں میں اسلاف کرام کے بدنام کرنے والے (۱۷۷) آرام طلب (۱۷۸) نفس کے بندے (۱۷۹) دنیا کے کتے واقع ہوئے ہیں (۱۸۰) اور واقعۃً بات بھی یہی ہے کہ میں ہر طرح نالائق (۱۸۲) وناقابل ہی ہوں (۱۸۳) میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ نالائق وناکارہ پاتا ہوں (۱۸۴) ہر طرح سے میرے اعمال ناقص ہیں (۱۸۵) میں بالکل تہی دست ہوں (۱۸۶) اور نالائق وناکارہ حقیقی (۱۸۷) بالخصوص ننگ اسلاف ہوں (۱۸۸) چاروں طرف سے محرومیت ہی محرومیت مجھے گھیرے ہوئے ہے (۱۸۹) میں ابتداء نہایت نفس پرست ہوں (۱۹۰) اعمال میں کاہل ہوں (۱۹۱) اپنی نفس پرستی (۱۹۲) کج ادائی (۱۹۳) بدنصیبی (۱۹۴) اور کسل مندی کی بناپر (۱۹۵) کورا ہی رہا (۱۹۶) میں اپنی حالت پر نفریں بھیجتا ہوں (۱۹۷) توجہ الی اللہ اور اصلاح نفس کی فرصت ہی نہیں ملتی (۱۹۸) ایسے نفس پرور

(۱۹۹) سگ دنیا کو کب بیعت وارشاد مناسب وجائز ہے؟ (۲۰۰) مجھے اہل وعیال کے مشاغل (۲۰۱) اور دین فروشی (۲۰۲) اور دنیا طلبی کا اس قدر انہماک ہے کہ بڑے بڑے دنیا داروں کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا (۲۰۳) مجھ سے بیعت ہونے والے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں (۲۰۴) ظاہر کو دیکھ کر فریب میں آجاتے ہیں (۲۰۵) اگر ان کو میری اصلیت اور حقیقت ظاہر ہو جائے تو یقیناً اس سے زیادہ مجھ سے نفرت کریں جتنی کہ وہ کتے اور سور سے کرتے ہیں (۲۰۶) میری گندگیوں کی لوگوں کو اطلاع نہیں ہے (۲۰۷) ہم کذلک فی الدنیا تعیش البہائم کے حقیقی مصداق ہیں (۲۰۸) میں ایک معمولی طالب علم ہوں (۲۰۹) میں ولی بزرگ (۲۱۰) قابل ارشاد (۲۱۱) صاحب کشف وکرامت نہیں ہوں (۲۱۲) تمام عمر لہو ولعب (۲۱۳) کھانے پینے (۲۱۴) سونے (۲۱۵) نفس پرستی (۲۱۶) دنیا طلبی میں (۲۱۷) مثل حیوانات وبہائم گذری ہے (۲۱۸) اس سے بڑھ کر دنیا طلبی کیا ہوگی کہ کتب دینیہ، حدیث شریف وغیرہ ''تنخواہ'' لے کر پڑھاتا ہوں (۲۱۹) اگر بالفرض آپ کو کوئی ایسا کامل الصفات نہ ملتا ہو تو ہم جیسے کے پھندے میں تو نہ پھنسے (۲۲۰) میں ہمیشہ کا نالائق (۲۲۱) اکھڑ (۲۲۲) دروزہ گر ہوں (۲۲۳) بے وقوف (۲۲۴) اور ناکارہ غلام ہوں (۲۲۵) حضرت نانوتویؒ کے خاندان کا خیر خواہ ہوں (۲۲۶) حسین احمد کی زندگی اور معیشت دار العلوم پر موقوف نہیں (۲۲۷) ہرگز ہر شخصی اور بالخصوص حسین احمد کے مفاد کو ترجیح نہ دیں (۲۲۸) نہ دار العلوم حسین احمد پر موقوف ہے (۲۲۹) اس کے جیسے نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہزاروں درجہ بڑھ کر آپ کی جماعت میں جو کہ اسلاف کرام کے دروزہ گروں کی جماعت ہے علماء کرام اور صلحاء عظام موجود ہیں (۲۳۰) مجھ کو جو کچھ اپنے اکابر سے پہنچا ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتا نہ چھوڑوں گا الا ان یشاء اللہ (۲۳۱) میں باوجود اپنی نالائقی دعا کرتا ہوں (۲۳۲) قوت حافظہ اور فہم کی بیماری میں تو خود مبتلا ہوں (۲۳۳) اس پر ایسے ناکارہ (۲۳۴) اور سگ دنیا کی خبر گیری؟ (۲۳۵) میں بدقسمت ہوں (۲۳۶) اور پھر ہر طرح ناقابل وناکارہ (۲۳۷) اور بہر حال میں ایک نالائق خادم ہوں (۲۳۸) آخر میں کیا کروں؟ کس طرح پڑھاؤں؟ اور کس طرح تمام اسفار کو انجام دوں؟ (۲۳۹) میں نے بہت کوشش کی کہ جمعیۃ کے صدارت میرے متعلق نہ کی جائے مگر کچھ شنوائی نہیں ہوئی (۲۴۰) سنا ہے کہ مودودیان بہت کیچڑ اچھال رہے ہیں حسبم اللہ (۲۴۱) ہماری تعلیمات تنخواہوں کی وجہ سے یقیناً محل نظر ہیں۔ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح کتاب لے کر پڑھاتے تھے؟ (۲۴۲) مجھ کو اس سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ نے ''مادحانہ کلمات'' لکھے ہیں (۲۴۳) کس قدر غضب کی بات ہے؟ (۲۴۴) افتراآت وسبّ وشتم کے سیلاب پر میں اس وقت بھی چپ تھا (۲۴۵) ابھی ابھی جلسہ بیت العلوم میں مجھ کو قطعی کافر وجہنمی قرار دیا ہے (۲۴۶) میں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں (۲۴۷) مجھ جیسے ناکارہ ونالائق کی طرف آپ کی نظر انتخاب غیر قابلِ تلافی خطا ہے

(۲۴۸) اور یہ قباحت سے خالی نہیں ہو سکتا (۲۴۹) اللہ تعالی بے نیاز اور بے پرواہ سرکار ہے پھر کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں (۲۵۰) میں ایک معمولی درجہ کا مسلمان ہوں (۲۵۱) گنہگار ہوں (۲۵۲) اسلاف واکابر کے لیے ہمیشہ ننگ وعار ہوں (۲۵۳) مجھ جیسے نالائق (۲۵۴) کم علم (۲۵۵) بے مایہ کے مکتوبات کا شائع ہونا انتہائی شرمناک ہے (۲۵۶) دوسرے بزرگوں کی ہمسری کا ادعا ہے (۲۵۷) اپنی انانیت کا مظاہرہ ہے (۲۵۸) حسین احمد کون چیز ہے؟ جس کے مکتوبات شائع کیے جائیں؟ (۲۵۹) اب اگر وہ مکتوبات مفید ہوں تو فمن اللہ اور غیر مفید ہوں تو ننگ اسلاف کرام سے اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے (۲۶۰) ہمارے جیسے ننگ اسلاف کے ملفوظات جمع کیے جائیں تو یہ مینڈکی کے لیے نعل تیار کرنا ہے (۲۶۱) ہم دنیا کے کتوں سے بجز نفس پرستی (۲۶۲) راحت طلبی (۲۶۳) نصوص کو خواہشات کے بوتے میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ (۲۶۴) یہ سراب سے عطش کے زاول کی امید باندھنا ہے (۲۶۵) اپنی ناقص یاد (۲۶۶) اور ناقص سمجھ سے کچھ لکھ دیتا ہوں (۲۶۷) مجھے اپنے نگرانِ اعلی جناب مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی نگرانی پر اعتماد رہتا ہے (۲۶۸) کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں کئی ہزار کتابیں عمدہ تھیں ان کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا (۲۶۹) اطراء مادح سے اجتناب ضروری ہے (۲۷۰) میری نا کارگی ونالائقی سے آپ ناواقف ہیں (۲۷۱) مخالفوں پر رد کرنے میں الفاظ سخت اور زوردار ہونے چاہئیں، اس نا کارہ ونالائق سے درگذر فرمائیں گے (۲۷۲) میرے ساتھ، میرے ساتھیوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہوا۔ اگر ہم جناب رسول اللہ ﷺ کے وارث ہیں تو ہم کو اس میں سے حصہ ضرور ملنا چاہیے (۲۷۳) میں بھی مطلق جاہل ہوں (۲۷۴) ''گدھے کا کھایا نہ پاپ نہ پون'' ہم تو اس قول مشہور کے مصداق ہیں (۲۷۵) ہم بندگانِ نفس وشہوات ہیں (۲۷۶) آپ بلا تامل میری عرائض پر تنقید واعتراض کریں (۲۷۷) ہمارے کھانے میں سوائے نفسانیت اور شہوت کی زیادتی کے اور کیا فائدہ ہے؟ (۲۷۸) میرے بارے میں آپ ہر تحریر میں ایسی جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں (۲۷۹) ہم تو اضع اور انکسار کے الفاظ اپنی زبان سے منافقانہ طریق پر لکھتے ہیں (۲۸۰) اس خط میں بھی جو کچھ آپ نے ''إمامُ المتقین علامۃُ المحققین حکیمُ العٰلمین'' لکھا ہے کیا یہ سب جھوٹ اور نفاق نہیں ہے؟ (۲۸۱) اگر میرا نفس امارہ خبیث ان الفاظ کی وجہ سے تکبر اور غرور میں مبتلا ہو گیا تو میں تو برباد ہونگا ہی مگر کیا آپ اس گناہ میں شریک نہیں ہونگے (۲۸۲) مجھ نا کارہ ونالائق کو دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں (۲۸۳) نہایت قوی اور مجرب عمل دفع سحر تیر بہدف مجھے بتادیں تو بہت بڑا احسان ہوگا میں خود عامل نہیں ہوں (۲۸۴) یہ آپ کی قدر افزائی ہے جو کہ میرے عیوب اور گناہوں سے عدم اطلاع کی بناء پر ہے (۲۸۵) ہم جیسوں سے بیعت کی درخواست کوئی معنی نہیں رکھتی (۲۸۶) میں اپنے نام پر ''ننگ اسلاف'' حقیقی طور پر لکھتا ہوں صرف رسمی بات نہیں ہے

(۲۸۷) اس زمانہ میں تو مریدوں کی تعداد زیادہ کرنے کے لئے ایجنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں وغیرہ غیرہ (۲۸۸) میرے جیسا ناکارہ ونالائق (۲۸۹) نامراد (۲۹۰) سگِ دنیا (۲۱۹) بندۂ شکم (۲۹۲) بدنام کنندۂ نکو ناماں، سے اگر آپ بیعت ہو گئے تو آپ کی راہ ماری گئی (۲۹۳) اگر آپ کو میری خرابیاں معلوم ہوتیں تو شاید آپ مجھ سے اس سے زیادہ نفرت کرتے جتنی کہ سور اور کتے سے کرتے ہیں (۲۹۴) ہم ناکارے کسی خدمت کے لائق نہیں ہیں (۲۹۵) مجھ جیسا ناکارہ ونالائق کس طرح جان سکتا؟ (۲۹۶) میں خود سخت نالائق وناکارہ ہوں (۲۹۷) ہم جیسے ناکارے ونالائق ایسی قابلیت کہاں رکھتے ہیں؟ (۲۹۸) میں تو ہر طرح گناہوں اور تقصیرات میں ملوث ہوں (۲۹۹) سخت ناکارہ ونالائق ہوں (۳۰۰) لوگ میرے عیوب وبدکاریوں سے ناواقف ہیں (۳۰۱) انتہائی سخت عذاب کا مستحق ہوں (۳۰۲) اگر لوگوں کو میری خیانتیں اور نجاستیں معلوم ہو جائیں تو مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگیں جتنی کہ سور اور کتے سے نہیں کرتے (۳۰۳) آپ کے حسنِ ظن نے میرے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے (۳۰۴) میری ہلاکت میں کوئی شک نہیں (۳۰۵) اگرچہ اپنی قابلیت کچھ نہیں ہے مگر ۔۔۔۔۔ (۳۰۶) نالائق (۳۰۷) وجاہل (۳۰۸) وناکام ہوں مگر آپ حضرات کا ہوں (۳۰۹) اور جب ایسے ایسے بڑوں کا یہ حال ہے تو ہم جیسے گنہگار (۳۱۰) دنیا کے کتے کس شمار میں ہو سکتے ہیں؟ (۳۱۱) میری عمر کا بہت بڑا حصہ اور یہ ایام محض لہو ولعب (۳۱۲) غفلتوں (۳۱۳) اور معاصی میں گزر رہے ہیں (۳۱۴) میں ایسا سگِ دنیا ہوں جس کے لئے پانچ سو روپے کے اس مقدار کو بھی کافی آپ بزرگ نہیں قرار دیتے (۳۱۵) باقی رہا یہ امر کہ حسین احمد کی وجہ سے مدرسہ دارالعلوم کے انعدام کا خطرہ ہے تو حسین احمد صرف ایک نوکر ہے جس کو ۔۔۔۔ (۳۱۶) اگر ایسی صورت میں یہ ذمہ دار حضرات ایسے خطرناک گنہگار شخص کو علیحدہ کر کے مدرسہ کو نہیں بچائیں گے تو ۔۔۔۔ (۳۱۷) میرے خلاف کیا کیا نہیں کیا گیا؟ اور اب بھی ہو رہا ہے (۳۱۸) میں ان حضرات ودیگر مدرسین اور اساتذۂ کرام کا احترام مثل اپنے اساتذہ کے کرتا ہوں (۳۱۹) مگر میں اس ''شرفِ نسبی'' کو سراسر غلط سمجھتا ہوں (۳۲۰) دوسرے حضرات مدرسین وملازمین کو حقارت سے دیکھنا وغیرہ رذالت وسفاہت دیکھتا ہوں (۳۲۱) میں کیا ان وجوہ کی بناء پر اپنی فوقیت دیکھ کر کارکنانِ دارالعلوم سے ''عدمِ مساوات'' کا دعویٰ کرنا درست سمجھ سکتا ہوں؟ (۳۲۲) کیا مجھ کو زیبا ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی طالبِ علم دارالعلوم سے افضل واعلیٰ سمجھوں؟ (۳۲۳) مگر اور وجوہ سے وہ مجھ سے بالاتر ہیں۔

ہم تواضع اور انکسار کے الفاظ اپنی زبان سے ''منافقانہ طریق'' پر لکھتے ہیں (حضرت مدنیؒ)

''آپ کو چاہیے کہ جھوٹ بولنا اور جھوٹی مدح سرائی کرنا چھوڑ دیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا: ''اُحْثُوا فِی فَمِ الْمَدَّاحِیْنَ التُّرَابَ'' بہت تعریف اور مدح سرائی کرنے والوں کے منہ خاک جھونک دو۔ ایک شخص دوسرے کی تعریف اس کے سامنے کی تو جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کَسَرْتَ ظَهْرَ اَخِیْكَ'' تم نے اپنے بھائی کی پشت اور کمر توڑ دی۔ ایک دوسرے شخص کو کسی کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو ارشاد فرمایا: ''کسی کی تعریف اور پاکیزگی اللہ تعالیٰ پر نہ کرو۔ اگر ضروری ہو تو یہ کہو کہ میرا گمان ہے کہ فلانا ایسا اور ویسا ہے۔ یعنی یقینی طور پر کسی کی پاکیزگی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، تمہارا کسی کے متعلق یقینی طور پر مدح سرائی کرنا اللہ تعالیٰ کے اوپر جسارت کرنا ہے۔ الغرض اسی قسم کی بہت سی حدیثیں مدح سرائی کی ممانعت میں وارد ہیں مگر آپ ہر تحریر میں ایسی جھوٹی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ اس خط میں بھی لکھتے ہیں کہ ''اِمَامُ الْمُتَّقِیْنَ عَلَّامَۃُ الْمُحَقِّقِیْنَ حَکِیْمُ الْعٰلَمِیْنَ'' کیا یہ سب جھوٹ نہیں ہے؟ آپ کو کیا معلوم میں کیسا ہوں اور آپ کو میرے عیوب اور بد باطنیاں جب کہ معلوم نہیں بلکہ صرف حسن ظن ہی ہے تو غایت مافی الباب آپ کو ''مولوی'' لکھ دینا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت ہو تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ اور اگر میرا نفس امارہ خبیث ان الفاظ کی وجہ سے تکبر اور غرور میں مبتلا ہو گیا تو میں تو برباد ہوں گا ہی۔ مگر کیا آپ اس گناہ میں شریک نہ ہوں گے؟ اب اس کی مکافات میں مجھ کو بھی چاہیے کہ میں آپ کو ایسے ہی القاب لکھا کروں۔ غور کیجیے کہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا؟ سورہ نجم میں فرماتے ہیں: هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اللہ تعالیٰ تم کو خوب جانتا ہے اس وقت سے جب کہ تم کو مٹی سے بنایا، اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں حمل تھے، تو تم اپنے نفوس کی پاکیزگی مت ظاہر کرو۔ وہی خوب جانتا ہے اس شخص کو جو کہ پرہیزگار ہو۔ سورہ نساء میں ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ' کیا تو نہیں دیکھتا ان لوگوں کو جو کہ اپنی پاکیزگی کا اظہار اور دعویٰ کرتے ہیں بلکہ اللہ جس کو چاہتا پاکیزہ کرتا ہے۔

میرے محترم! یہ طریقہ غلط ہے اور ہم لوگ بے سوچے سمجھے اس غلط طریقہ پر چلے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم میں غرور اور تکبر کا مہلک مرض روز افزوں ہو جاتا ہے۔ ہم تواضع اور انکسار کے الفاظ اپنی زبان سے منافقانہ طریق پر لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ذرہ بے مقدار ہیں، ہم عاصی گنہگار ہیں، ہم سب سے بدتر ہیں، ہم ناچیز ہیں، ہم فدوی ہیں، ننگ خلائق ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم کو اگر کوئی شخص جاہل یا بددین، یا گدھا، یا کتا، یا سور، یا بے ایمان، یا منافق، یا بدمعاش، یا چور، یا جھوٹا، وغیرہ کہہ دیتا ہے تو ہمارے غصہ کا پارہ اس قدر چڑھ جاتا ہے کہ مارنے اور مرنے: بلکہ اس سے بھی تجاوز کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، کیا یہ سب جھوٹ اور نفاق نہیں؟ اعاذنا اللہ وایاکم عنہا وعن امثالہا۔ (مکتوبات: ۳۰/۲، ۶۲-۶۳)

راقم الحروف اپنے معزز قارئین کرام کے لئے حضرت شیخ الاسلام کا ایک نہایت اہم مکتوب گرامی نقل کرتا ہے، تا کہ معلوم ہو تشتت وانتشار اختلاف وتفریق کے دور میں ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اور کن چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے؟

تصوف کا ضروری اور مضبوط اصول جو کہ نفس پر شاق بھی بہت ہوتا ہے یہ ہے کہ اپنے نفس کے ساتھ بد ظنی اور دوسرے کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اسی کے ماتحت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''معرفت خدا تعالی براں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند فکیف از اکابر دین'' اپنے نفس کے کید ومکر سے کسی وقت بھی مطمئن نہ ہونا چاہیے: ''فانك تعرف كيد الخصيم والحكم،، وما ابری نفسی ان النفس لامارة بالسوء الخ پورا خط مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول کے اندر ملاحظہ ہو۔ اس مکتوبات عالی کے شان نزول کے متعلق حیات شیخ الاسلام صفحہ ۲۷ ملاحظہ ہو والا نامہ کے اندر بالا فارسی فقروں کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت ایسے شخص کو نصیب نہیں ہوتی جو اپنے کو کافر فرنگی سے بہتر سمجھتے ے تو ہوئی عبارت مذکور کی ظاہری صورت لیکن جب ذرا گہرائی سے نصوص شرعیہ پر غور کیا جاتا ہے تو دو چیزیں ایسی ملتی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں جن میں سے ایک پستی کی کوئی حد نہیں اور دوسری کی رفعت وبلندی سے برتر کوئی مقام نہیں یعنی ایک تواضع اور دوسرے کبر۔

تواضع کے معنی فروتنی وعاجزی کرنا ارباب طریقت کے نزدیک تواضع نام انقیاد وفرمانبرداری اللہ سبحانہ وتعالی خوف ورجا کے ساتھ کرنا اور مقام عبودیت میں اپنے نفس کو بیچ سے نکال دینا اور مخلوق کے ساتھ انصاف سے پیش آنا جس کی علامت یہ ہے کہ اگر بندے پر غصہ کیا جائے یا اس کے خلاف کوی بات ظاہر کی جائے یا اس کا رد انکار کیا جائے تو وہ بندہ ہر ایک کو بخوشی قبول کر لے اسی لئے کہا گیا ہے کہ تواضع وخاکساری ایسی نعمت ہے کہ اس پر کوئی شخص حسد نہیں کرتا ہے اور اسی کے مقابل کو یعنی بڑائی اور بزرگ بننا ایسی مصیبت ہیکہ جس پر کوی شخص رحم کرنیکو تیار نہیں کیونکہ اپنے تئیں عالی قدر اور معزز خیال کرنا اور نفس پرور ہونا اپنے مقابل دوسروں کو ذلیل سمجھنا خودسری کرنا ایسے مذموم اوصاف ہیں کہ دنیا دشمن بن جاتی ہے چنانچہ سارا گھمنڈ دنیا ہی میں ناک کی راہ سے نکل جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو جو کچھ ہوگا وہ اللہ ہی بہتر جانے وجہ یہ ہیکہ عظمت وبزرگی کبریائی اور ہر طرح کی بڑائی اللہ تعالی کے مخصوصات میں سے ہے یہی کبر ذات باری کے ساتھ لگ جاتا ہے تو اس کی عظمت اور بڑائی کی کوئی تھاہ نہیں رہتی لیکن جب یہی کبر مخلوق کے اندر آجاتا ہے تو ساری بلندی کا مفہوم پستی

میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح تواضع کی نسبت ذات واجب الوجود کے ساتھ کرنا صحیح نہیں اور بندے کے لئے عین ایمان اور اسلام بن جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہم نقل کرتے ہیں جس سے تواضع اور کبر کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالی سے روایت ہے کہ آپ نے بر سر ممبر ارشاد فرمایا کہ اے لوگوں فروتنی کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو پس لوگوں کے ساتھ اللہ کے لئے تواضع کرے تو اللہ اس کا مرتبہ کرتا ہے، پس وہ اپنی نظر میں حقیر ہے لوگوں کی آنکھوں میں بزرگ ہے اور جو کوئی تکبر کرے پست کرتا ہے اللہ تعالی مرتبہ اس کا مرتبہ اس کا ایسا آدمی لوگوں کی آنکھوں میں حقیر ہے، اور اپنی نظر میں بزرگ ہے، بلکہ وہ خوار و ذلیل تر ہے لوگوں کے نزدیک کتے اور سور سے۔ (مشکوۃ بحوالہ بیہقی)

حدیث مذکور کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کبر بدترین گناہ اور شرک کے مرادف ہے، اور یہ جو صوفیہ نے فرمایا ہے کہ تمام عبادات کا سر مخالفت نفس ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تواضع کے پیدا ہونے میں جو چیز مانع ہوتی ہے ہے وہ محض نفس کی خواہشات پر عملدرآمد شروع ہوا، کبر، غرور، گھمنڈ نے اپنا ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر دیا، خوب بات فرمائی حضرت سری سقطیؒ استاذ جنید اور شاگرد معروف کرخیؒ نے بمعصیے کہ از شہوت خیز دامید آمرزش تواں داشت وآنچہ از کبر دامید مغفرت نیست کہ نافرمانی ابلیس از کبر بود و زلت آدم از شہوت۔

حضرت ابو ہاشمؒ جو سب پہلے لفظ صوفی سے موسوم ہوئے، اور جنہوں نے سب سے پہلے رملہ میں خانقاہ کی بنیاد رکھی، کوفہ کے رہنے والے تھے اور قیام گاہ شام تھی، فرماتے ہیں لقلع الجبال بالابرۃ ایسر من اخراج یبر من القلب یعنی سوئی سے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا بہت آسان ہے لیکن قلب سے کبر اور غرور کا نکلنا کارے دارد۔

قرآن مجید میں ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ. (بقرہ)

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر، سو کافی ہے اس کو دوزخ اور ف وہ بیشک برا ٹھکانہ ہے۔

ان معروضات کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ آج سب سے زیادہ جو جنس نایاب بلکہ کمیاب ہے وہ تواضع وخاکساری، وعاجزی اور فروتنی ہے، اور اس چیز کی سب سے زیادہ کثرت بہتات ہے وہ کبر اور غرور کی لعنت ہے۔ حضرت مسیح کی زبان میں جو زمین کا نمک ہیں، یعنی علماء اور مشائخ اور جن پر امت کی رہنمائی کے ساتھ خود شناسی اور خداشناسی کا اہم فریضہ عوام سے زیادہ عائد ہوتا ہے، ان میں اختلاف وشقاق، تفرق وتشتت (جو قرآن کی زبان میں ہے)، اس لئے امت کا شیرازہ پراگندہ اور اتفاق واتحاد اور کبر رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے،

اس لئے امت کا شیرازہ پراگندہ اور اتفاق واتحاد کی دولت رخصت ہو چکی ہے، جس کا اعتراف بلکہ عجیب وغریب انکشاف دادا پیر عارف باللہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

''اتفاق واتحاد کی جڑ تواضع ہے، گر ہر شخص دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھنے لگے جو تصوف کی تعلیم وتربیت کا لازمہ ہے، تو پھر نا اتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ نا اتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے افضل سمجھتا ہے اور اس سے بڑھنا چاہتا ہے۔'' (معاف)

حضرت حاجی صاحب'' جو فن کے امام ہیں، آپ کا یہ پیغام حق خصوصا تمام علماء ومشائخ کے نام وقت کا سب سے اہم پیغام ہے، اور عطر ہے اسلامی تعلیمات کا جس پر عمل کئے بغیر انسان ہونا محل بحث ہے۔ صوفی اور سجادہ نشین ہونا تو ممکن نہیں، یہ اور بات ہے کہ اپنی دوکانداری اور عزت رفتہ کے لئے بزرگوں کے شرف ومجد کو کیا جائے جیسا کہ مشاہدہ ہے، لیکن تواضع اور بے نفسی جو لازمہ تصوف وسلوک ہے، وہ خاصہ ہے امام العصر دامت فیوضہم کا نہ کہ عہد حاضر کے دوکانداروں کا: اپنے نفس کے ساتھ بدظنی اور دوسروں کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے، لہٰذا نہ زبان درازی چاہئے، نہ بداعتقادی۔

''تصوف کا ضروری اور مضبوط اصول جو کہ نفس پر شاق بھی بہت ہوتا ہے یہ ہے کہ اپنے نفس کے ساتھ بدظنی اور دوسروں کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے''۔

اسی کے ماتحت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''معرفت خدائے تعالی براں کس حرام ست کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند، فکیف از اکابر دین''۔

اپنے کید ومکر سے کسی وقت بھی مطمئن نہ ہونا چاہیے، فانک تعرف کید الخصم والحکم، وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء۔

پس جو حضرات پہلے سے معتقد علیہم ہیں یا جن کے افعال واقوال مسائل خاصہ کے سوا مرضی وپسندیدہ ہیں ان کے ساتھ بداعتقادی وغیرہ نہ چاہیے حسن ظن رکھنا چاہیے، ہمارے لیے مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین درس عبرت ہیں ممکن ہے کہ ان حضرات ہی کی آراء صحیح ہوں، اگرچہ غلبہ ظن یہی ہے کہ ہمارے آراء اور اعمال بالکل حق بجانب ہیں، لہٰذا نہ زبان درازی چاہیے نہ بداعتقادی بلکہ ان کے اور اپنے لیے دعا کرنی چاہیے۔ اللہم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ ذکر سے غافل نہ ہو جیے، وقت کو غنیمت جانئے، گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، آج کچھ کر لیجیے، کل کو کرنا ناممکن ہوا، جفاکش بنئے، آرام وراحت

آخرت کے لیے چھوڑیئے:

ناز پروردہ نعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ زنداں بلاکش باشد
من نہ کردیم شما حذر بکنید

واقفین پرسان حال سے سلام مسنون عرض کر دیجئے والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

اس کے علاوہ مکتوبات شیخ الاسلام ج:ا رمکتوب نمبر ۲۰ رص:۱۱۴، دفعہ:۵ کا بھی مطالعہ کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے

''مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ کو زوردار طریقہ پر لکھیے کہ وہ دیوبند جا کر صدر صاحب کو اپنے سحر بھرے کلام سے موم بنائیں اور آمادہ کریں کہ وہ تمام مخرجین طلبہ کو بلا استثناء داخل فرمالیں اور اپنے احکام کو واپس لے لیں، کیوں کہ انہوں نے حافظ محمد یوسف، اور مولانا حفظ الرحمن صاحب سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا اور نہ خارج کروں گا، اور طلبہ ان دونوں حضرات کے حکم کے پابند ہو گئے تھے اور اس وعدہ کو ان دونوں حضرات نے مجمع عام میں بھی طلبہ کو سنا دیا تھا، بہر حال مولانا بشیر احمد صاحب فوراً جائیں اور صدر صاحب کا غصہ ٹھنڈا کریں، اگر ایسا نہ کیا تو مولانا بشیر احمد صاحب کے کمالات دو کوڑی کے رہ جائیں گے''۔ والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہٗ ۱۶ رشوال ۱۳۶۱

کیا یہ مکتوب گرامی حضرت شیخ الاسلامؒ نے صرف مولانا بشیر احمد صاحب کے لیے لکھا تھا یا یہ مضمون ہم سب کے عمل کرنے کے لیے بھی ہے؟ کیا ہم لوگوں پر لازم نہیں ہے کہ اپنا غصہ ٹھنڈا کریں اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو کیا مولانا بشیر احمد صاحب کی طرح ہمارے کمالات بھی دو کوڑی نہیں رہ جائیں گے؟ آخر حضرت شیخ الاسلام کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لیے کیا رکشہ، تانگا، اور بیل گاڑی چلانے والوں سے امیدیں رکھی جائیں گی یا کہ خود ہم لوگوں کو ان ہدایات کی اتباع کرنی ہوگی؟ کیا ان دونوں حضرات اور ان کے متبعین نے ایک دوسرے سے انتقام نہیں لیا؟ اور ایک دوسرے کو جمعیۃ علماء ہند سے خارج نہیں کیا؟ اور طرح طرح کے نہایت سنگین اور دلوں کو چیرنے اور پھاڑنے والے شدید جارحانہ الزامات یہ سب کے سب شائع نہیں کئے؟ پھر بھی کمالات اور خوبیوں کے مالک ہم لوگ اپنے آپ کو سمجھ رہے ہیں تو کیا یہ ہمارے یہ کمالات تو کوڑی کے نہیں رہ گئے۔

نیز نقش حیات ج:اول، ۱۶۳ رص میں ہے: ''اگر چہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا

مگر منتقم حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہو گیا وللہ الحمد والمنہ۔

قارئین کرام۔ دیکھئے! حضرت شیخ الاسلام کی نظر تو "منتقم حقیقی" پر تھی، اس لیے کبھی بھی آپ نے کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا۔ مگر مجھے معاف کیا جائے اور میری یہ سچی بات برداشت کیا جائے کہ یہاں تو ماشاء اللہ شرعی حدود اور انسانی اخلاق و اقدار کو پامال کرتے ہوئے ایک دوسرے کی توہین اور انتقام کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا ان سب سے کبھی بھی دریغ نہیں کیا گیا، جن کی تفصیلات میں جملہ باتوں کو تاریخ نے سب کچھ منضبط و مرقوم کر لیا ہے۔ ہاں البتہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے جملہ اخلاف جسمانی و روحانی سے امید قوی کی جاتی ہے کہ وہ سب سے کے حضرت شیخ الاسلام کی سیرت و طبیعت پر چلتے ہوئے کم از کم اب سے اب تو کبھی کسی سے انتقام و توہین کا معاملہ نہیں کریں گے ان شاء اللہ اور جملہ معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے انشاء اللہ۔ اوصیکم ونفسی اولا بتقوی اللہ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی انتہائی بردباری و تواضع کا ایک عبرت ناک واقعہ

یعنی کسی گستاخ نے کہا کہ "تو اپنے باپ سے نہیں" تو فرمایا کہ میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کروں

"مولانا احمد علی صاحب کے صاحبزادہ مولوی حبیب اللہ صاحب دور حدیث میں شریک تھے۔ کسی گستاخ نے رقعہ بھیجا جس کا جواب امام العصر نے دوسری نشست میں نہایت نرم و شائستگی سے دیا اور فرمایا کہ کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا کہ "تو اپنے باپ سے نہیں" تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا اور ہر طالب علم غیض و غضب میں بھر گیا آپ نے فرمایا کہ:

"خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں، میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کروں فرمایا میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ محلہ الہداد پور کا رہنے والا ہوں اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں، خط بھیج کر، یا جا کر سمجھ لیا جائے"۔

العظمۃ للہ! بردباری کی انتہاء ہے اگر جی میں آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو سامنے رکھ لیا جائے جس کا مفہوم یہ کہ پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے اور نفس کو مغلوب کر دے۔ او کما قال علیہ السلام (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۵۵ جلد ۱)

سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے روایت ہے کہ یوپی میں میری تقریر تھی رات کو ۳ بجے تقریر سے

فارغ ہو کر لیٹ گیا بین الیقظ والنوم مجھکو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیروں کو دبا رہا ہے میں نے کہا کہ خیر مجھکو عادت بھی ہے کوئی دوست ہوگا، مگر اسی کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے۔ باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی ہے سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں۔ فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا کہ ہم نے اپنے لئے جہنم جانے کا خود سامان پہلے سے کیا کم کر رکھا ہے؟ آپ بھی ہم کو دھکہ دے کر جہنم بھیج رہے ہیں۔ شیخ نے جواباً فرمایا:

''آپ نے دیر تک تقریر کی تھی آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھکو سعادت کی ضرورت۔ ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا میں نے خیال کیا آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے؟''۔

سچ فرمایا گیا:

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال　　　که چوں سوار به منزل رسد پیاده شود

لذت آشنایان عشق جانتے ہیں کہ ہر کسی کو شوق لقاء ہے تو امام العصر کی طرح اپنے آپ کو اس راہ میں فنا ہونے اور مٹا دینے کی لئے تیار رہنا چاہیے، غرض چشم فلک نے دیکھا ہو لیکن اپنی جیسی ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں آنکھوں نے حضرت امام العصر سا بردبار، جفاکش، متواضع منکسر، بے نفس، پاک مشرب، بے غرض سلوک کرنے والا، اپنے اللہ پر پورا بھروسہ رکھنے والا مخلوق الٰہی کا بہی خواہ نہیں دیکھا

مضت الدهور وما اتين بمثله　　　ولقد اتى فعجزن عن نظرائه

(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۵۵،۵۶؍جلد اول)

اس ظلوم وجہول ننگ خاندان پر بے شمار نعمتوں کی بارش

''چونکہ ارشاد خداوندی ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ تحدیث اور اظہار نعماء اللہ کو واجب قرار دیتا ہے بناء بریں حسب مقام بعض امور کا ذکر نہ صرف مناسب ضروری خیال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی سے بے شمار اور عظیم الشان مادی اور معنوی نعمتوں کی اس ظلوم وجہول ننگ خاندان پر بارش فرمائی فللہ الحمد۔

من آن خاکم که ابر نو بهاری　　　کند از لطف بر من قطره باری

(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۷۶؍جلد اول)

''افسوس کہ اپنی تن پروری اور نفس پرستی ہمیشہ میدان عمل میں سد راہ ہوتی رہی

جس کی بناء پر ناقص رہا، ورنہ نعماء الٰہیہ نے کبھی بخل نہ فرمایا اور نہ حضرت مرشدی قدس سرہ العزیز کی توجہات اور حضرت شیخ الہند کی برکات نے افاضہ سے کوتاہی کی

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم | چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم
از نکتہ مقصود نہ شد فہم حدیثے | لادین ولا دنیا بیکار بماندیم

حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں اگرچہ زیادہ رہنا نصیب ہوا، مگر باوجود ان کی توجہات کے اپنی نالائقیوں نے گل کھلانے میں کمی نہ کی''

''غرض کہ میں اپنے اسلاف واکابر کیلئے ننگ وعار ہی رہا، اور حضرات اہل چشت اور دیگر مشائخ اہل طریق کا صحیح معنوں میں بدنام کرنیوالا تاہم مجھکو افضال خداوندی سے امیدیں ہیں کہ مثل سگ اصحاب کہف مجھکو اپنے اولیاء کرام کے فیوض سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمائیں گے اور اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں کہ دعوت صالحہ اور توجہات ہمم سے اس روسیاہ کی دست گیری فرمائیں گے والسلام، ننگ اسلاف حسین احمد ۱۳۰۶ھ (سلاسل طیبہ) (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱ے جلد اول)

''اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی خوشنودی ومحبت عطا فرمائے، یہ کچھ میرے ساتھ رہنے پر موقوف نہیں ہے اگر آپ کی خواہش ہے تو دیوبند قیام فرما کر ضروری مسائل اور مقامات حاصل کر سکتے ہیں مجھ خاکسار کے ساتھ رہنا چنداں مفید نہیں ہے مسلسل طویل سفر میں زندگی بسر ہوتی ہے طبیعت مردہ اور دل افسردہ ہے، خوشی باقی نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو سیدھے راستے کی توفیق دے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۹۰ ج اول)

ہم جیسے عاجزوں کے امکان میں دعاء کے سوا اور ہے ہی کیا؟

''باقی رہی دعاء، تو ہم جیسے عاجزوں کے امکان میں دعاء کے سوا اور ہے ہی کیا؟''

(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱۰۴ ج اول)

من نہ کر دم شما حذر بکنید

ہم جیسے ناکارہ ونالائق، بدنام کنندۂ نکونامان، ننگ اسلاف، کب مستحق ہیں؟

آداب شیخ کے بارے میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اور جو کچھ ''امداد السلوک'' میں تحریر کیا گیا ہے وہ حقیقی مشائخ اور اہل کمال کے لئے ہم جیسے ناکارہ ونالائق بدنام کنندۂ نکونامان ننگ اسلاف کب مستحق ہیں ہم تو اس شعر کے مصداق ہیں۔

نهارک یا مغرور سهو و غفلة — لیلک نوم والردی لک لازم

اے دھوکہ میں پڑے ہوئے تیرا دن غفلت وسہو میں گزرتا ہے — رات سونے میں لہذا تیری تباہی لازم ہے

وشغلک فیما لیس یغنیک مشغلة — کذلک فی الدنیا تعیش البهائم

بے کار اور فضول باتیں تیرا مشغلہ ہیں — دنیا میں بہائم اسی طرح رہا کرتے ہیں

ہاں آپ حضرات کی ادعیہ صالحہ سے اگر اصلاح ہو جائے اور ہم کسی لائق ہو جائیں جس طرح بڈھے ڈاکو کی اصلاح مریدوں کی دعوات اور توجہ سے ہو گئی تھی تو مضائقہ نہیں'' (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱۱۱ ج اول)

ہم جیسے نا کاروں کے لئے واجب التقلید ہے

''ایسے امور میں مجھ سے پوچھنا غلط ہے مذکورہ بالا دونوں حضرات اور آپ حضرات کی آراء ان امور میں ہم جیسے نا کاروں کے لئے واجب التقلید ہے۔

(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱۱۶ ج اول)

کسی ننگ اسلاف کی وجہ سے اسلاف پر تنقید نہیں کی جاسکتی

''ہر طریقے میں غلط کار نقال، پست ہمت روٹی کھانے والے نفس پرست نام کے بندے ہم جیسے ہوئے ہیں جس کی وجہ ظاہر بیں طریقہ پر حرف اعتراض زبان پر لاتا ہے مگر یہ غلطی ہے۔ کسی ننگ اسلاف کی وجہ سے اسلاف پر تنقید نہیں کی جاسکتی الخ''

(مکتوبات صفحہ ۱۲۲ ج اول)

اس نا کارہ، روسیاہ، بدنام کنندہ نکونا مے چند، کے لئے دعاء

''شجرہ ارسال خدمت کر چکا ہوں طریقہ ورد بھی عبارت سے سمجھ سکیں گے اس کے پڑھنے کے بعد محبت اغیار سے صفائی اور انوار معرفت سے قلب کی روشنی اور حصول رضا باری عزوجل کی دعا کریں اور اس نا کارۂ روسیاہ، بدنام کنندہ نکونا مے چند، کو دعاء کے ساتھ یاد کر لیا کریں کیا عجب ہے کہ خداوند کریم آپ بھائیوں کی دعوات صالحہ کی برکت سے اپنے فضل وکرم کے سایہ میں لے لے۔ گھر کی بیماری باعث تفکر ہے، دعاء کرتا ہوں خداوند کریم ان کو جلد صحت یاب فرمائے آمین۔ اور آپ کے دینی ودنیوی

مقاصد کے حصول کے لئے بھی دعاء کرتا ہوں کاش کہ بارگاہ رب العزت میں مجھ جیسے گندہ کی دعاء مقام قبولیت کو پہونچ جائے“۔(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱۳۸ ج اول)

”میں حسب ارشاد دعاء کرتا ہوں اور کروں گا اللہ تعالی کوئی سبیل مفید پیدا کر دے (مگر میں کیا؟ اور میری دعاء کیا؟) والسلام۔ ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ از سلہٹ خلافت آفس ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ۔(مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱۳۸ ج اول)

”محترم المقام! میں خود ہی ننگ خلائق، روسیاہ، ناکام، نامراد، سگ دنیا ہوں۔ مجھکو ہی اپنی حالتوں پر شرم آتی ہے، مجھکو کب سزاوار ہے کہ ان امور کا مستدعی رہوں جو کہ اہل اور اکابر کے شایان ہیں؟ آپ حضرات حسن ظن سے ایسے نالائق کی نسبت اچھا خیال رکھتے ہوئے انتہائی عقیدت کئے ہوئے ہیں شاید ان ہی امور کی بناء پر فضل الٰہی شامل حال ہو جائے علم جو کچھ ہے وہ بے سود عمل ہیں سو خراب

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دین مسلمانی نہم“

(مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۱۳۸ ج اول)

میں سگ دنیا، نفس پرست، ناکارہ، نالائق سیاہ روئی، سیہ کاری اور ارذل حیوانات سے بدتر، ہوں

”میرے محترم! اصلاح نفس کے لئے کسی سگ دنیا، نفس پرست، ناکارہ و نالائق کے پاس جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ پیاسا دریا کے قصد بیشک کرتا ہے۔ مگر آتش کا قصد نہیں کرتا در و دیوار سنگ و کہسار کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں اور میں سچا ہوں کہ میں اپنی سیاہ روئی اور سیہ کاری سے خود شرمندہ اور نادم ہوں اور بسا اوقات روتا ہوں۔ میری واقعی حالت اشخاص نفسانیہ سے بدتر ہونا تو درکنار ارذل حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

یظن الناس بی خیرا وانی
لشر الناس ان لم یعف عنی

مولانا محترم! اگر اس کمال کے اعلام و اکابر نہ بھی موجود ہوتے تب بھی مجھ جیسے سگ دنیا، بدنام کنندہ نکو ناماں، کی طرف نظر اٹھانا جائز نہ ہوتا۔

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ورہما از جہاں شود معدوم

پھر خیال اصلاح نفس ایک نفس پرور سے یا للعجب، اس سے یہ مقصد نہیں کہ آنجناب کو تشریف ارزانی فرمانے سے روکنا منظور ہے حاشا وکلا۔ جناب کا تشریف لانا سر آنکھوں پر ہے مگر اپنی حالت بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے بعض حضرات کو دھوکہ اس امر کا ہو رہا ہے کہ چند مقدس ہستیوں کی خدمت میں چونکہ اس کو زمانہ تک بار یابی کی نوبت رہی ہے اس لئے ضرور بالضرور لائق ہوگا مقدمہ اولی بیشک صحیح ہے مگر مقدمہ ثانیہ غیر لازمی ہے ونعم ما قیل،

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل

کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

والسلام

ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ از دیو بند ۱۷؍رجب ۱۳۴۶ھ آستانہ شیخ الہند مرحوم۔ (مکتوبات ۱۵۴؍۱۵۵ ج اول)

میں سب سے برا آدمی ہوں

''آنجناب کی اہلیہ محترمہ کی عنایات بھی آپ ہی کی عنایتوں کی ظلال ہیں۔ میری جو حالت ہے وہ تو ظاہر ہے۔

یظن الناس بی خیرا وانی

لشر الناس ان لم یعف عنی

لوگ میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں لیکن اگر وہ درگزر نہ کریں تو میں سب سے برا آدمی ہوں کیا عجب ہے احباب، اور بزرگوں کے حسن ظن اور عنایات ہی کی وجہ سے اللہ تعالی نجات کر دے۔ والسلام ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ از سلہٹ خلافت آفس ۲۰؍رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ۔ (مکتوبات ۱۶۵ ج اول)

میں اپنی بداحوالی، روسیاہی، ناکامی پر نہایت گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ ہوں

''میں نے حسب ارشاد حضرت مولانا دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے ارشاد پر اس وقت بیعت کر لی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بداحوالی، روسیاہی، ناکامی پر نہایت گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ ہوں۔

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرمالیا کریں نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعاء کی التجاء کر دیا کریں جو امر جناب نے مولانا عاشق الہی صاحب کی تحریر سے انتزاع کیا ہے عجب نہیں کہ وہ صحیح ہو مگر معصومیت تو سوائے انبیاء علیہم السلام کسی کے لئے نہیں۔ والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ از دیو بند ۲۰؍جمادی الآخر ۱۳۴۸ھ۔ (مکتوبات ص ۱۶۶ ج اول)

بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ آپ میری تعریف سے کلی پرہیز کریں، واللہ، ثم باللہ، تاللہ، میں اس قدر

نالائق، نابنجار، گنہگار، دنیا پرست، سگ دنیا اور بدکردار ہوں کہ......

"مجھے تو آپ سے یہ بھی شکایت ہے کہ آپ میری تعریف (جو کہ میرے نزدیک بالکل غیر واقعی ہوئی ہے اور انسان کو اپنا علم حضوری اور صحیح ہوتا ہے) دوسروں کے سامنے کیا کرتے ہیں میری دلی خواہش ہے جو کہ میں بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ اس سے آپ کلی پرہیز فرمائیں اگر آپ میرے واقعی عیوب ظاہر نہیں فرمائے یا خداوندی ستر کی وجہ سے واقعی میں آپ کو اطلاع نہیں ہے تو ان غیر واقعی مدائح کو تو زبان پر نہ لایا کریں اگر آپ کسی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو دوسروں کو تو ایسے ناخوش گوار گڑھے میں نہ ڈھکیلیں واللہ ثم باللہ ثم تاللہ میں اس قدر نالائق اور نابنجار، گنہگار، دنیا پرست، سگ دینا، اور بدکردار ہوں کہ اگر محض اپنے فضل وکرم سے اس غفار الذنوب، ستار العیوب نے کام نہ لیا تو اشد الناس عذابا اور اخسر الخاسرین میں ہوگا۔ فللہ الحمد علی حلمہ وعلی عفوہ بعد قدرتہ، میرا اپنے آپ کو "ننگ اسلاف" کہنا اور لکھنا واقعیت کی بناء پر ہے، کسرنفسی کی بناء پر نہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری برائیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ لوگ اس سے زیادہ نفرت کرتے جتنی سور اور کتے سے کرتے ہیں:

یظن الناس بی خیرا وانی
لشر الخلق ان لم یعف عنی

میں آپ سے پھر خدا اور رسول (علیہ السلام) کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ اس قسم کے خطوط اور تحریروں کو ہرگز اپنے یا کسی اخبار میں جگہ نہ دیں امارت کے لئے بہت سے اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں۔ مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب وغیرہ۔ میں ان حضرات کے دست مبارک پر بیعت امارت کرنے کیلئے تیار ہوں، اور انشاء اللہ حتی المقدور اطاعت کرونگا۔ خواب مبارک ہے اگر خداوند کریم اپنے فضل وکرم سے مجھے کچھ نوازے تو اس کا کرم ہے والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ از دیوبند ۱۹ ر جمادی الاول ۱۳۵۰ھ۔ (مکتوبات ص ۲۰۷ ج اول)

تھانہ بھون کی تشریف ارزانی کے متعلق مجھ روسیاہ و نالائق سے اجازت چاہنا عجیب بات ہے۔ میں تو خود ہی ناکارہ ہوں۔

"والا نامہ باعث سرفرازی ہوا تھانہ بھون کی تشریف ارزانی کے متعلق مجھ روسیاہ و نالائق سے اجازت چاہنا عجیب بات ہے میں تو خود ہی ناکارہ ہوں اور اس

امر کو ہمیشہ عرض کرتا رہا ہوں۔ بناوٹ اور کسر نفسی سے نہیں۔ بلکہ حقیقت الامر کی بناء پر۔ مگر میری عرض پر التفات نہیں کیا گیا اس سے بڑھکر کیا چیز خوشی کی ہو سکتی ہے کہ مقصد اصلی اور محبوب حقیقی کی بارگاہ اقدس تک رسائی ہو جو کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کی بارگاہ میں ارجی ہے اللہ تعالی آپ کو اپنی مرضیات سے نوازے آمین والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ از دیو بند ۹ رجمادی الثانی ۱۳۵۰ھ۔ (مکتوبات ص ۱۷۱ ج اول)

یہ ناکارہ تو حضرت دامت برکاتہم کے سامنے طفل دبستاں کی طرح ہے ان کی قابلیت وکمالات کے سامنے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

''آنجناب کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہوں واقعہ یہ ہے کہ یہ ناکارہ تو حضرت دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم واحترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہے ان کی قابلیت اور کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفل دبستاں کو افلاطوں سے ہو سکتی ہے، البتہ تحریک حاضرہ کے متعلق جو چیزیں وہاں سے شائع کرائی جاتی ہیں اور جو کچھ وہاں کے متوسلین گاتے ہیں وہ نہایت دلخراش ہیں میں مولانا کو اپنا معتقد اور اپنے اکابرین میں سمجھتا ہوں والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ۔ ۱۵رشوال ۱۳۵۲ھ از رسڑا ضلع بلیا۔ (مکتوبات ص ۱۷۴ر) ج اول

افسوس اس کا ہے کہ آپ حضرات نے نہایت ناکارہ اور نالائق کے ساتھ ''رشتۂ عقیدت'' وابستہ کیا ہے

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلاحات قلبیہ نہایت ضروری ہیں۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ آپ حضرات نہایت ناکارہ اور نالائق کے ساتھ ''رشتۂ عقیدت'' واسطہ کیا ہے۔

لقد استسمنت ذاورم

ونفخت فی غیر ضرم

حاشیہ ص ۱ر میں حضرت مولانا نجم الدین صاحب اصلاحیؒ نے اس کی تشریح وتفہیم یوں تحریر کی ہے یہ عربی کی ایک مثل ہے جس کے معنی ہیں کہ سوجن کو موٹاپا شمار کرتا ہون (حالانکہ وہ فربہی نہیں ہے) دوسرے فقرہ کے معنی ہیں کہ میں نے بے فائدہ کوشش اور وقت ضائع کیا گویا بغیر چنگاری کے آگ سلگانا چاہا۔ اللہ اکبر! اس خاکساری کی بھی کوئی انتہاء ہے اور آپ کو اس درجہ مٹادنیا کسی کے تصور میں آسکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

فنا بغیر بقا کا پتہ نہیں چلتا
خودی مٹائے نہ جب تک خدا نہیں ملتا

مجھکو خود اپنی حالت پر رونا آتا ہے اور نہایت زیادہ شرماتا ہوں کاش! احباب کی توجہات اور دعاؤں اور ان کے حسن ظن کی بناء پر نجات ہو جاتی۔ والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۱ر محرم الحرام ۱۳۴۸ھ۔ (مکتوبات ص ۷۶ ا ج اول)

اور بالخصوص ہم جیسے قصیر الباع، قلیل الفراغ راحت طلب اشخاص سے

''مسائل میں اعتقادی کو جگہ نہ دینی چاہئے بلکہ حتی الوسع اطمینان حاصل کرنا چاہئے اگرچہ تحریری میدان تنگ ہے اور بالخصوص ہم ایسے قصیر الباع، قلیل الفراغ راحت طلب اشخاص سے۔ والسلام ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ ۸ر ربیع الثانی ۵۰ھ۔

(مکتوبات ص ۱۸۷ ر ج اول)

میں ایک نالائق، عاجز، قصوروار، کم ہمت، سراپا خطایا و تقصیرات، ہوں

''والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، آپ کی محبت وعنایت آمیز الفاظ متجاوز ہیں۔

میں ایک نالائق اور عاجز شخص ہوں اپنی حالتوں پر افسوس کناں اور نادم ہوں مگر اپنی محرومی پر افسوس کرنے سے کوئی بھی اثر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمائے تو نجات اور کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم

چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم

محترما! ہم ہر چند قصوروار، کم ہمت ہیں، سراپا خطایا و تقصیرات، ہیں۔۔۔۔۔۔ جس قدر بھی ممکن ہو ذکر وفکر اور توجہ الی اللہ کو عمل میں لاتے رہئے۔ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ من نکردم شما حذر بکنید۔ والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۱۳ر رجب ۱۳۵۶ھ۔ (مکتوبات ص ۱۹۱ ر اول رص ۱۹۲ ر)

میں بذات خود نہایت نالائق، ننگ اسلاف، من آنم کہ من دانم، ہٹّو بچے، بچئے، بدنام کنندہ نکونامے، ہوں

خدا کی نعمت کا کفران نہ ہونا چاہئے اور ازدیاد کی فکر کرنی چاہئے، میں بذات خود نہایت نالائق ہوں، مجھ کو خود ان مشائخ کرام اور سلف صالحینؒ میں ان کی طرف اپنے آپ کو نسبت کرنے میں شرم آتی ہے جن کا میں متوسل ہوں اور یہی واقعی وجہ ہے کہ میں اپنے نام کے ساتھ صحیح طور پر ننگ اسلاف لکھتا ہوں اور اگر فضل وکرم خداوندی شامل حال نہ ہوا تو مجھ کو اپنی خلاصی سے ناامیدی ہے۔

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم

چند بر خود تہمت دینی مسلمانی نہم

یہ بھی بڑی وجہ ان میں سے تھی جن کی بناء پر میں نے بیعت میں پس وپیش کیا تھا اور میں اب بخوشی عرض کرتا ہوں کہ جس شخص کو آپ قابل پائیں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نہ صرف آپ کو بلکہ اپنے تمام دوستوں کو میرا مشورہ یہی ہے یہ میرا مقولہ کسی خفگی یا طعن وغیرہ کی بناء پر نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی ہے" من آنم کہ من دانم"۔ .... بہر حال فضائل رفاقت اور تاثیر صحبت کا عالم اسباب میں انکار نہیں کیا جا سکتا: "صحبۃ الشیخ ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ اور الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ" مشہور مقولہ ہے، مگر یہ ان مکمل اور افاضل کے متعلق جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور مکارم سے مالا مال فرمایا۔ ہم ٹٹ پونجیے، بھنگیے، بجز بدنام کنندہ نکونا مے چند ،اور کس قابل ہیں؟۔ والسلام۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ (مکتوبات:۱۹۶۔۱۹۷،ج:اول)

۱۵رذی الحجہ ۱۳۵۶ھ

یہ لازم ہے کہ میرے عیوب اور کمزوریوں پر متنبہ فرماتے رہیں

"آپ حضرات کی محبت ومودت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میرے عیوب سے چشم پوشی کریں بلکہ یہ لازم ہے کہ مجھ کو میرے عیوب پر اور میری کمزوریوں پر متنبہ فرماتے رہیں۔ "المومن مرآۃ المومن" بجز انبیاء علیہم السلام اور کوئی معاصی اور عیوب سے پاک نہیں اور انسان کو اپنے عیوب نظر نہیں آتے۔

وعین الرضاء عن کل عیب کلیلۃ
ولکن عین السخط تبدی المساویا

حبک الشیء یعمی و یصم. چونکہ انسان کو اپنے نفس کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے،اس لئے عیوب سے انسان اندھا ہی ہوتا ہے، اور اگر کچھ جانتا بھی ہے تو اس کو تاویلات رکیکہ وغیرہ سے کمال اتلاتا ہے، دوسروں کا فریضہ ہے کہ اس پر متنبہ کرکے اس کا ازالہ فرمائیں، نہ کہ اس کو چھپائیں اور دوسرے اس پر طعن وتشنیع کریں۔ حاشیہ امیں ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ بناؤ اور دوستی میں ہر عیب معمولی نظر آتا ہے،لیکن اختلاف ودشمنی کی آنکھوں میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ (مکتوبات ص:۱۹۹۔۲۰۱،ج:۱)

نوٹ: مرتب مکتوبات شیخ الاسلام حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی شارح نے ص:۱۹۹ میں المومن مرآۃ المومن کے تحت حاشیہ ص:۱ میں تحریر کیا ہے کہ ایک بہت ہی اہم چیز کی طرف حضرت نے تنبیہ فرمائی ہے جو ہمارے علماء اور صوفیا کی وہ کمی ہے۔ جس سے بہت کم لوگ محفوظ ہیں وہ یہ ہے کہ شیخ طریقت، استاذ، اور بڑوں کی محبت ومودت، بسا اوقات ان کے عیوب سے چشم پوشی پر مجبور کرتے ہیں۔ حدیث ہے کہ مومن مومن کے لیے آئینہ ہے،اور حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا ہدیہ یہ ہے کہ کوئی میرے عیب اور کمزوری سے مجھ کو مطلع

کرے تو پیر کی جو بات سمجھ میں نہ آئے یا واقعی اس کی کوئی کمزوری معلوم ہو تو تخلیہ میں ادب کے ساتھ اس کو صاف کرے اور اس کو ظاہر کر دے مگر خدا ناس کرے پیر پرستی کا کہ اس نے مسامحت و مداہنت کا دروازہ کھول دیا حضرت نے اس بدعت پر کاری ضرب لگائی اور اپنے متوسلین کو خصوصی اور دوسروں کو عمومی انتباہ دیا۔ الخ۔

(صفحہ ۱۹۹۔ حاشیہ ا، مکتوبات جلد:۱)

اپنی ناقص محفوظات اور ناقص علم کی بناء پر عرض کر رہا ہوں

میرے پاس اس وقت کتابیں نہیں اپنی ناقص محفوظات اور ناقص علم کی بناء پر عرض کر رہا ہوں والسلام۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۲۳ رجنوری ۱۳۴۴ھ۔ (مکتوبات:۳۔۲۷، ج:۱)

اس روسیاہ، ننگ اسلاف، کو دعوت صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں

اخلاص و تواضع و فروتنی کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں اور اتباع سنت نبویہ علی صاحبها الصلوۃ والتحیۃ میں ادنیٰ کوتاہی بھی روانہ رکھیں رزقنا اللہ وایاکم رضاہ فی الدنیا والآخرہ ووفقنا اللہ ایاکم لما یحبہ ویرضاہ آمین لوگوں کی اصلاح وتربیت میں کوشاں رہیں خواب بھی امید افزا ہے، اس روسیاہ، ننگ اسلاف، کو دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ ''کتاب صراط مستقیم'' اور ''امداد السلوک'' کو زیر مطالعہ رکھیں۔ والسلام ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ۔ (مکتوبات صفحہ ۳۴۴ جلد اول)

اس دور افتادہ، نالائق کی نالائقی، ہرگز ایسی ''عنایت'' کو متقضی نہ تھی

''سیدنا المحترم زادت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہم اس عنایت اور مہربانی کا شکریہ کس دل سے اور کس زبان سے ادا کروں؟ کہ ایام واوقات اجابت میں اس دور افتادہ، نالائق، کو دعوات صالحہ سے یاد فرماتے رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ اور مقاصد دارین میں کامیاب فرمائے۔ ان دعوات سے بڑھ کر اسلامی نقطہ نظر سے بھی اور واقفیت کے لحاظ سے بھی اور کوئی احسان کیا ہو سکتا ہے؟ فللہ الحمد والمنۃ فضل خداوندی سے امید ہے کہ یہ دعوات صالحہ رائیگاں نہ جائیں گی۔ میں بفضلہ تعالیٰ نہایت صحت وعافیت سے ہوں۔ بہت زیادہ مطمئن الخاطر ہوں۔ رمضان شریف بھی نہایت اچھی حالت اور اطمینان سے گذرا۔ کاش! اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازیں، حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کو خواب میں دو مرتبہ خلاف معمول نہایت شفقت اور محبت سے دیکھ چکا ہوں۔ میری نالائقی ہرگز ایسی عنایت کو متقضی نہ تھی۔ حضرت شیخ الہند کو بھی کئی مرتبہ دیکھا، کیا عجب کہ ان اکابر کی توجہ روحانی سے میری کچھ اصلاح ہو جائے،

دارالعلوم کے واقعات یقیناً بہت زیادہ دلخراش ہیں، اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے۔
آمین۔ والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد، ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ۔

(مکتوبات جلد اول صفحہ ۳۲۸)

میری قابلیت فاسد، استعداد کاسد ہے، میری بد قسمتی کا کیا علاج ہے؟ میں کالے توے کی طرح ہوں وغیرہ وغیرہ، غرضیکہ ہر طرح ہاتھ خالی ہے، وجوہ استحقاق مجھ میں کہاں ہے؟ بد بخت و بد نصیب حسین احمد ایسا نکلا کہ۔۔۔ طبعی تکاسل، ذاتی نا قابلیت، قسمت کی کوتاہی، نفس کی شرارتیں، مالٹا اور کراچی میں جس طرح سد راہ تھیں یہاں بھی ہمراہ ہیں۔

"محترم حضرات! میں نے آ کر آوردہ شدہ رسالوں کو دیکھا اور بہت زیادہ متاثر و محزون ہوا حالانکہ مجھ کو خوش ہونا چاہیے تھا۔ ان رسالوں کے ٹائٹل پر لفظ خلیفہ، جانشین خاص، کا میرے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ کس قدر ظلم، کذب اور افتراء ہے؟ جس کو آپ حضرات خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم کہ خلیفہ ہونا بغیر تخلیف ممکن نہیں ہے۔ پھر حضرتؒ نے کب اور کس وقت مجھ کو خلفیہ بنایا ہے؟ میں حضرتؒ سے بیعت بھی نہیں اس کو میں انکار نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اپنے کرم وعنایت سے میری ظاہری و باطنی رہنمائی فرمائی۔ ان کی صحبت سے مجھ کو ظاہری ہی فوائد حاصل نہیں ہوئے بلکہ میری باطنی حالت پر اس سے بہت بڑا اثر پڑا۔ بلکہ انہوں نے ایام مالٹا میں میری باطنی اصلاح پر مخفی طریقے پر توجہ مبذول رکھی۔ اور کیوں نہ رکھتے؟ میں ان کا ہی تھا اور ہوں۔ اگر میری قابلیت فاسد اور استعداد کاسد نہ ہوتی تو میں آج بے شک آدمی ہوتا۔ اور روحانی کمالات کا ایک گلدستہ نظر آتا مگر بد قسمتی کا کیا علاج؟

نہ شگوفہ، نہ برگے، نہ ثمر، نہ سایہ دارم
در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

جیسے کالے توے پر کتنی ہی روشنی ڈالی جائے تو اس کا روشن ہونا اور روشن کرنا ممتنع۔ اسی طرح مجھ جیسے ناکارہ و نالائق کی حالت واقع ہوئی ہے۔

کعبہ بھی گئے، پر نہ چھٹا عشق بتوں کا
زمزم بھی پیا، پر نہ بجھی آگ جگر کی

بقول شاعر! خرے عیسیٰ اگر بمکہ رود الخ۔۔۔ نہ علم نصیب ہوا نہ عمل نہ فہم نہ فراست ہاتھ آئی نہ حفظ

وذکاوت نہ تحریر آئی نہ تقریر۔ نہ معرفت ہاتھ لگی نہ طریقت۔ غرض کہ ہر طرح ہاتھ خالی ہے۔

هنيئا لارباب النعيم نعمهم
وللعاجز المسكين ما يتجرع

یہ افتراء مجھ پر نہیں، بلکہ حضرتؒ پر ہے۔ پھر آپ لوگوں نے کیوں اس کو جائز رکھا؟ ذرا خدا سے ڈریئے وہاں پر جانا ہے، وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا اگر خلافت یا جانشینی اور خصوصیت ایسے مقامات میں بغیر اعطاء شیخ ملتی ہوتی تو کسی شخص کو محل گفتگو بھی سکتی تھی۔ ہاں اگر کوئی جاہل کہے کہ یہ امور بوجہ استحقاق حاصل ہوئے ہیں تو اول فقط استحقاق بغیر عمل شیخ کہیں قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض ہو بھی، تو آپ خود انصاف کر کے کہہ دیں کہ وجوہ استحقاق مجھ میں کہاں ہیں؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ وجوہ خلافت اور جانشینی کسی طرح مجھ میں محقق نہیں۔ میرے لئے بس ہے کہ میرا حشر زمرۂ خدام میں ہو۔

مولاناؒ تلامذہ اور مریدین میں ایک سے ایک اعلیٰ موجود ہیں اور دنیا کو ان کی ذات سے فیض پہنچ رہا ہے۔ ان میں سے اصحاب قرابت حضرات بھی ہیں اگر بوجہ استحقاق کسی کو جانشینی اور خلافت ملتی تو ان کو ملنی چاہیے۔ افسوس صد افسوس حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے لئے لفظ خلیفہ خاص اور جانشینِ خاص نہ لکھا گیا۔ حضرت رائے پوری اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہما کے لئے نہ لکھا گیا۔ مولانا اشرف علی صاحب مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدہما کے لئے استعمال نہ کیا گیا۔ تمام عمر یہ اسلاف کرام ایسے عمل سے بھی پرہیز کرتے رہے۔ جو کہ موہم اس کا ہوتا۔

مگر بدبخت و بدنصیب حسین احمد ایسا نکلا کہ اس نے ہر طرح اپنے لئے ایسے الفاظ استعمال کرائے اور استعمال کرنے والے بھی وہ حضرات جن سے اس کو خاص تعلق ہے فوا اسفاہ۔ مہربانی فرما کر اس کی انسداد کی فکر کیجئے، جتنے ٹائٹل ہیں ان کو جلوا دیجئے، اور دوسرا ٹائٹل چھپوا کر جس میں فقط خادم کا لفظ ہو لکھوا دیجئے۔ میں نے جو کچھ تحریک میں حصہ لیا تھا ضرورتِ زمانہ و اسلام کی بناء پر اگرچہ ممکن ہے اور میری بداعمالیاں اسی کی متقاضی ہیں کہ میری حرکات بھی شہرت و جاہ طلبی وغیرہ کے لئے ہوں، وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ میں حقیقت میں کسی طرح ان امور کو بوجہ استخلاف و نیابت نہیں کرتا تھا۔ اعاذنا الله من اعمال تكون لغير وجهه.

اے میرے مقدس بزرگو! کہ آپ کو ان ہی الفاظ سے جو کہ واقع میں غلط اور کذب ہیں مقاصد میں کامیابی ہو سکتی ہے؟ کیا اگر آپ الفاظ مثل خادم حضرت شیخ الہند، یا شاگرد حضرت شیخ الہند تحریر فرمائیں تو وہ مقصد حاصل نہ ہوگا؟ میں عند اللہ اپنی برات کر چکا آئندہ آپ جانیں۔ اگر یہی عمل در آمد آپ حضرات کا رہا تو میں

جانتا ہوں کہ بہت جلد مجھ کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ اگر آپ حضرات مجھ کو اپنے میں سے ایک شمار کرتے ہیں اور ایسا ہی ظاہر معاملہ رکھتے ہیں تو خیر۔ ورنہ میں یہاں سے نکلتے ہی حجاز کی فکر کروں گا۔ میں خود اپنے نفسی افکار میں سخت مبتلا ہوں مجھ کو اپنی ہی خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی میں خود سخت حیرت میں ہوں کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز نے کس بنا پر یہ معاملہ فرمایا؟ اور مجھ کو افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ امر کیوں ظاہر ہوا؟

کاش! مولوی عاشق علی صاحب وغیرہ اس کا تذکرہ نہ فرماتے ایسی باتوں کی وجہ سے بڑوں پر سخت دھبہ ہوتا ہے ان کی وقعت نظروں سے گر جاتی ہے

سودا گشت ازسجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند بر خو د تہمت دین مسلمانی نہم

خدا نے تین ایسے برگزیدہ بندے، جو کہ حقیقی نائب ختم الرسل علیہ السلام تھے، مجھ کو دکھلائے۔ اور کم و بیش ان کی صحبت عطا ہوئی۔ مگر محرومی کے سوا کوئی چیز ہاتھ نہ لگی۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور اس قسم کی تشہیروں سے مجھ اور عالم کو گمراہ نہ کیجئے۔۔۔۔۔ ہم لوگ پردیسی ہیں سوچ لیجئے، قدم الخروج قبل الولوج قول بزرگاں ہیں ہمارے ناز بردار، ہماری قدر کرنے والے، ہمارا سرتاج ہمارے سروں سے اٹھ گیا ہے ہم بے باک یتیم رہ گئے ہیں، یتیم کی قوت اس کی ہمت اس کی پشت پناہی کی حالت آپ کو معلوم ہے۔ دیوبند میں خصوصاً شیخ زادہ حضرات الا ماشاء اللہ پردیسیوں کو اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ ان کو وقعت دیتے ہیں اس لئے ذرا سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم لوگوں سے ایک جماعت جیسے خوش اور بہی خواہ ہے تو دوسری اس کی خلاف بھی ہے۔۔۔ والسلام ختام، حسین احمد غفرلہ، از سابرمتی جیل احمد آباد گجرات۔

''آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا اور صحیح ہیکہ اس قسم کی فراغت کہاں نصیب ہوسکتی تھی؟ واقع میں بہت اچھا موقع ترقی اور کام کا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ طبعی وذاتی ناقابلیت، قسمت کی کوتاہی، نفس کی شرارتیں، مالٹا اور کراچی میں جس طرح سدراہ تھیں یہاں بھی ہمراہ ہیں

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را
سو دہ گشت ازسجدہ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دی مسلمانی نہم

مع ذلک اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوسکتا ہے کر رہا ہوں، الطاف ربانیہ کا شکر کرتا ہوں۔

من آں خاکم کہ ابر نو بہاری
کند ازلطف بر من قطرہ باری

اگر بروید از ہر موزبانم۔ادائے شکر لطفش کے توانم۔۔۔۔والسلام،ننگ اسلاف،حسین احمد غفرلہ۔
(مکتوبات جلد اول صفحہ ۲۲۹)

واقعہ یہ ہیکہ میں کچھ نہیں ہوں،میرے ساتھ چاروں طرف سے "منتقمانہ جذبات" کھیلیں گے اور کھیل رہے ہیں:

"۔۔۔۔واقعہ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں،جو کچھ فوائد ہوئے وہ حضرت کی جوتیاں کر رہی ہیں،اسلاف کرام رحمۃ اللہ علیہم کی توجہات میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے جو کہ قلوب اور نیات سے واقف ہے۔یقیناً سمجھ کی بات وہی ہے جو آپ نے استاذ ظہیر کی لکھی ہے آپ سب حضرات کو وہی اختیار کرنی چاہیے میرے ساتھ تو منتقمانہ جذبات چاروں طرف سے کھیلیں گے اور کھیل رہے ہیں مگر آپ حضرات کیوں چنے کے ساتھ پسیں!مجھ پردیسی،کمزور اور نالائق کو تو نہایت آسانی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکالا اور ناک کی مکھی کی طرح اڑایا جاسکتا ہے۔خصوصاجب کہ بہت سے قلوب میں زخم اور آنکھوں میں میرا وجود خار اور زہریلا خار ہو اس لئے اب دوستوں کو سمجھنا چاہیے اور کن فی حزب من علیا پر عمل کرنا چاہیے کہ" اینک ماہ پروین" کا سماں ہو ہماری فکر نہ کیجئے،ہم تو ساون کی جھڑیاں ہیں،ہم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کی جوتیاں سیدھی کرنے کی نعمت سالہا سال تک نصیب فرمائی ہے ہم اس طریقہ کو نہ چھوڑیں گے (ان شاء اللہ)ہم کو اللہ تعالیٰ نے در رشیدی وامدادی قدس اللہ اسرار ہما تک پہنچایا،ہم ان کے طریقے پر ان شاء اللہ مرمٹیں گے خواہ ذلت ہو یا عزت،اور تکلیف ہو یا راحت، کوئی دوست رہے یا دشمن بنے۔ہماری یہی دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ جن بزرگوں کی جوتیاں عطا فرمائیں ہیں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلائے اور مارے

ہم کو دارالعلوم سے نکالا جائے ہم خوش ہیں،رکھا جائے ہم خوش ہیں،رزق کا کفیل دارالعلوم نہیں۔اللہ تعالیٰ ہے۔سوکھی روٹی کہیں نہ کہیں سے دے گا۔

گورنمنٹ مجھ کو مسلمان ہند میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی ہیں میں اس کو اپنے لئے فخر سمجھتا ہوں میں ہر مصیبت جھیلنے کے لئے رضا باری تعالیٰ کے لئے تیار ہونا چاہتا ہوں۔

عزیزم ان احوال کی وجہ سے پریشان نہ ہو، واقعات حقیقیہ کو تاریخ وار قلم بند رکھو۔ اور صبر جمیل اختیار کرو۔ زبان کو بند رکھو اور آنکھوں سے دیکھو، کچھ نہ بولو، قدرت کو دیکھو کیا کرتی ہے؟ وہ بے نیاز اور بے پرواہ بھی ہے۔ اور سب سے زیادہ رافت اور رحمت والا بھی۔ اس کا ظاہری ہاتھ بھیسے، کچھ فکر مت کرو، کسی کو مت ستاؤ، واللہ معکم این ما کنتم۔

اگر واقعات اور افواہات ستایا کریں تو حضرتؒ کی زندگی کو یاد کرو اگر اس پر بھی قلبی سکون نہ حاصل ہو تو مزار پر جا کر تھوڑی دیر بیٹھ کر ایک دو پارے پڑھ کر حضرتؒ اور دوسرے بزرگوں کو بخش دیا کرو یہی بات مولانا محمد جلیل اور مولانا محمد اعزاز علی سے کہہ دو۔ اگر مولانا نافع گل صاحب آجائیں تو ان سے بھی یہی کہہ دو۔ یہی میری استدعا مولانا سلطان الحق صاحب اور منشی شفیع صاحب سے ہے سب کو زبان تھامنی، صبر جمیل کرنا، ادب کا لحاظ رکھنا اپنے فرائض میں مشغول رہنا، اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا، اپنے اسلاف کرام کے طریقے پر چلنا اور ان سے توسل رکھنا چاہیے، ان شاء اللہ خیبت اور خسران پاس نہ آئے گا، چند روزہ دنیا کیلئے زیادہ فکر مند نہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی اور ہماری امداد فرمائے اور اپنی رحمت خاص سے نوازے، آمین۔ اسکی آنکھیں بند نہیں ہیں، والسلام ،ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۱۱ رمضان ۱۳۶۱ھ۔ (مکتوبات جلد اول ۳۳۹ تا ۳۵۱)

(۱) حسین احمد کو یہاں سے نکلوایا جائے۔۔۔۔۔ (۲) حسین احمد کتنا بھی مخلص اور بے قصور ہو مگر۔۔۔۔

(۳) سب کی آنکھوں میں کانٹا حسین احمد ہے۔۔۔۔ (۴) خصوصاً ایسے ایسے مقدسین کے یہ احوال دیکھ کر

''محترم المقام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گورنمنٹ کا ہمیشہ سے، اور کارکنان مدرسہ کا عرصہ سے، اور جو لوگ ماحول اہتمام وصدارت میں کام کررہے ہیں ان کا بھی ہمیشہ سے یہی ارادہ اور جد جہد رہی کہ حسین احمد کو یہاں سے نکلوایا جائے اب ان کو موقع ہاتھ آرہا ہے اس میں انتقامی جذبات کام کررہے ہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز ہے، حضرت زکریا علیہ السلام کو آرہ سے چروا دیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کرادیا، سینکڑوں نہیں ہزاروں انبیاء موت کے گھاٹ اتروائے گئے، قرآن کی نص یقتلون الانبیاء بغیر حق اس پر دلالت کرتی ہے، حسین احمد کتنا بھی مخلص اور بے قصور ہو مگر ان انبیاء کے سامنے وہ مقدار بھی نہیں رکھتا جو ذرہ کو پہاڑ کے سامنے ہے۔

ادارۂ اہتمام ومدرسین کی یہ کشمکش اور خود غرضیاں اور لایعنی باتیں مجھ کو مجبور کرتی ہیں کہ اپنے دوسرے اصلی فریضہ کی طرف متوجہ ہوں اور اب آخری حصہ کے فریضہ کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں خرچ کرنے کا قصد کروں۔ میرے آقا حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کی یہی سنت ہے اور اسی پر مولانا احمد سہارنپوری مرحوم ومغفور کی قسم حضرت نانوتوی مرحوم مغفور آخری ایام میں گذران کرتے تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ آخری ایام میں

اسی کے عامل رہے۔ حقیقت میں ان حضرات کو آپ سے یا منشی شفیع صاحب یا مولانا جلیل صاحب مولانا نافع گل صاحب وغیرہ حضرات سے کاوش نہیں ہے سب کی آنکھوں میں کانٹا حسین احمد ہے۔ اور اسی سے سب کے جذبات مشتعلانہ ہیں کیوں نہ وہ اپنے لئے صورتیں سوچے؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید قوی ہے کہ قریبی ایام میں انقلاب حکومت کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ اس صورت میں ہماری سیاسیات کا مشغلہ بھی ختم ہو جائیگا۔ اب اللہ کی یاد میں بقیہ عمر گذارنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیشک ملازمت کے ترک میں آمدنی کی طرف سے خطرات پیش ہوتے ہیں مگر اس راستہ میں سلف صالحین کا طرز عمل اور روکھی سوکھی روٹی، فاقہ اور نیم گرسنگی کو اختیار کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ وہ اپنی رحمت وامداد سے اعانت فرمائے گا ہمارا خاندان امراء ونوابوں کا خاندان نہیں ہے، فقراء کا خاندان ہے اگرچہ زمینداری بڑے پیمانہ پر تھی مگر صرف آخر کی دو پشتیں دنیا دار گذری ہیں ورنہ باوجود زمینداری کے فقیرانہ طرز رہتا تھا اور ذکر وفکر مراقبہ وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ یہی بات میں نے والد صاحب مرحوم سے بارہا سنی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مجھ کو بروقت اس کے لئے تیار رہنا ضروری ہے اور اب طبیعت اس ملازمت سے متنفر ہوتی چلی جاتی ہے خصوصا ایسے ایسے مقدسین کے یہ احوال دیکھ کر۔ والسلام ننگ اسلاف حسین غفرلہ۔ (مکتوبات جلد اول ۳۳۳ تا ۳۳۴)

(نوٹ از راقم):

مکتوبات صفحہ ۳۶۱ میں حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی صاحبؒ کا حاشیہ مکتوب نمبر ۱۲۶ تا ۱۳۳ ار بے شمار حقائق کا انکشاف کر رہا ہے ایک ایک سطر پڑھنے کے لائق ہے مگر راقم الحروف بخوف طوالت اور موضوع کی مناسبت کی وجہ سے اس حاشیہ سے صرف اپنے مقصود (ترجمۃ الباب) کی ضروری عبارات نقل کرتا ہے اور حضرات قارئین کرام کو طویل حاشیے کیلئے اصل کتاب کی طرف مراجعت کی دعوت دیتا ہے حاشیہ کی سطر ۲۰ میں ہے۔

"حضرت امام العصر کا وجود گورنمنٹ کی نظروں میں سب سے بڑا روک تھا۔
اور اسی کے ساتھ کتنے مقدسین کی نگاہوں میں حسب بیان امام العصر "کانٹوں کی طرح کھٹکتا رہا" حتی کہ دیوبند کے بعض نادان دوستوں نے اس کانٹوں کو نکالنا چاہا اور گورنمنٹ کی پشت پناہی بھی ساتھ تھی، مگر جو وجود گرامی انقلابی سلطنت کرنے اور برطانیہ کے ڈیڑھ سو سالہ قصر استبداد کو ڈھانے کا بیڑا اٹھا چکا تھا بھلا آزادی ہند کا خاتم، ولی اللہی پرچم کو کس طرح سرنگوں ہونے دیتا؟ اور کس "مائی کے لال" کو ہمت تھی اس "شیر بیشۂ استقامت" کو برطانیہ کے نکلنے سے پہلے دار العلوم سے نکال سکتا

تھا"؟ (مکتوبات ص:۳۶۱ حاشیہ سطر ۲۰ تا ۲۴ جلد اول)

کچھ بعید نہیں کہ کارکنان دار العلوم دیوبند میرا تعلق ہی دار العلوم سے قطع کر دیں۔

"کچھ بعید نہیں کہ کارکنان دار العلوم دیوبند اس مرتبہ کی مہمانی جیل کے بعد میرا تعلق ہی دار العلوم سے قطع کر دیں، جہاں تک سنا جاتا ہے لوگ اس فکر میں ہیں کہ "کسی طرح اس کا پاپ کٹے واللہ اعلم" خیر اللہ تعالیٰ کو جو کچھ بہتر ہو اس کو ظاہر فرمائیں۔ آمین۔ والسلام، ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۱۷ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ۔

(مکتوبات جلد اول ص:۲۰۷ سطر ۱۵)

اصل اصول فساد شیخ الہند تھے، حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء تھے، اور اب حسین احمد ہے۔

اسی طرح کے ملازمین و مدرسین فقط جذبات ہی تو رکھتے ہیں اہل حل وعقد کی تشدد آمیز کارروائیوں سے ڈر کر اعلانیہ حصہ تحریکات میں نہیں لیتے تاہم ان کو اصل اصول فساد کہتے ہیں، اصل اصول فساد حسین احمد ہے جو کہ اعلانیہ تحریکات میں حصہ لیتا ہے اس کو نکالنا چاہے اصل اصول فساد شیخ الہند تھے جنہوں نے وہ کر دکھایا جس کو دیکھ کر بڑے بڑے قوی لوگ دنگ رہ گئے اصل اصول فساد حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء تھے جنہوں نے حقیقی تابعداری آیات جہاد کی، کی۔ اور اسی جذبے پر وفات پائی حضرت شیخ الہندؒ کی قلب میں چنگاری پیدا کر دیا۔ والسلام، ننگ اسلاف، حسین احمد، ۱۸ شوال ۱۳۶۱ھ۔ (مکتوبات جلد اول ص:۳۵۶)

میں ایک نالائق شخص ہوں، بجز حسن ظن احباب کوئی ذخیرہ نہیں ہے والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

(مکتوبات جلد اول ص:۳۶۹)

میری ظاہری معذوری تو ظاہر ہے باطنی حیثیت بھی نہایت گندی ہے۔

"بناء بریں میں سمجھتا ہوں کہ آنجناب حسب مرام کسی اور بزرگ کا قصد فرمائیں جو کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز سے روحانی اور جسمانی دونوں نسبتیں رکھتا ہو یا صرف روحانی اور متبع شریعت اور ماہر طریقت ہو، میری ظاہر معذوری تو ظاہر ہے باطنی حیثیت بھی نہایت گندی ہے اور پھر یہ اصلی مقصد جس کو آپ تلاش فرما رہے ہیں وہ مفقود ہے۔ والسلام۔ دعاہ گو قدیم، چراغ محمد غفرلہ، ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ۔ (مکتوبات جلد اول ص:۳۷۴)

"اگر آپ کا یہی خیال ہے تو نہایت افسوس کی بات ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو ان مشائخ کے لئے ہو سکتا ہے جو کہ محض توکل کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ذرائع

معاش سے خالی ہوں نہ کہ اس شخص کیلئے جو کہ سگ دنیا ہو، علوم دینیہ پر اجرت لیتا ہو اور اجرت بھی اتنی بڑی جو کہ تقریباً پانچ سو روپے ماہوار ہوتی ہے ایسے شخص کو مرشد بنانا ہی غلط ہے، کاش! آپ بجائے اس کے اپنے ذکر و شغل کی بلند حالتیں ذکر فرماتے تو بہت خوشی کی بات ہوتی دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد ۲۹ رمضان ۱۳۶۹ھ۔ (مکتوبات جلد اول ص: ۳۸۲)

''میں ایک معمولی غریب آدمی ہوں وہ ایک رئیس زمیندار ہیں میں ان سے رنجیدہ ہو کر ان کا کیا بگاڑ سکتا ہوں اور ان کی طبیعت پر میری کبیدہ خاطر ہونے کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ ان کی اہلیہ محترمہ بیچاری عورت ہیں عورتوں کو ضعف قلب کی وجہ سے کچھ اثر ہو جاتا ہے۔ بہر حال بابو صاحب ایک امیر آدمی ہیں اور وہ اپنے گھر خوش رہیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اپنی عزت میں خوش ہوں، میرا فریضہ ہے کہ ان کے لئے ان کے کنبہ کے لئے اور تمام امت محمدیہ کے لئے دست بہ دعا ہوں اللہ تعالیٰ سب پر رحم فرمائے اور سبھوں کو مقاصد دارین میں کامیاب فرمائے

حضرت مولانا! معلوم ہونا چاہیے اہل دنیا، روساء سرمایہ دار صرف مادیت اور اس کی قوت کے معترف اور دلدادہ اور پرستار ہوتے ہیں، ہم جیسوں کو تو وہ اپنے جوتوں کے خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ میرے تعلقات اہل ثروت سے نہایت ہی کم بلکہ تقریباً معدوم ہے، یہ لوگ نہ پیر کے ہوتے ہیں نہ فقیر کے۔ بہر حال جو کچھ پیش آنا تھا وہ آچکا ہے آپ کو بھی کبیدہ خاطر نہ رہنا چاہیے۔ (مکتوبات جلد اول ص: ۴۰۹)

''اہل سرائے میر نے مجھ نالائق کی بوقت حاضری جو کچھ عزت افزائی فرمائی ہے اس کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں، میں ہرگز اس عشر عشیر کا مستحق نہ تھا اور نہ ہوں اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور اطراع مادح سے بچائے۔

والسلام ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، از سہارنپور، جیل۔ (مکتوباب ج ۲/ص ۶۰)

ایک سگ دنیا، اخس الناس، اجہل الناس، بندۂ شکم، نفس پرور، کا یہ حال کیوں کر ہو سکتا ہے؟

''جن صاحب کے مرض دق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دعاء کا حکم ہے انشاء اللہ عمل کرونگا، مگر دعاء تیر قضا کو جب روکتی ہے کہ نبی یا ولی کی ہو ایک سگ دنیا، اخس الناس، اجہل الناس، بندۂ شکم، کا یہ حال کیوں کر ہو سکتا ہے؟

درویش نیست آنکہ نخسپد خور دچو خر
درویش سر حق بود از روح پاک تر

یہاں رات و دن یہی نفس پروری، اور شکم پروری کا مشغلہ ہے۔

یظن الناس بی خیرا وانی لشر الناس ان لم یعف عنی

والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ۔ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ۔ (مکتوبات ج۲ص ۶۶)

میں نے بے حد ظلم کیا ہے، مجھ جیسے ناکارہ کیلئے اس قدر زیر باری اور تکلیف؟

''میں نے بے حد ظلم کیا ہے اس لئے انشاء اللہ آئندہ کے لئے اب یہ حضرات کبھی اس کا نام نہ لیں گے، مگر آپ کا والا نامہ دیکھکر سخت تعجب ہوا جب کہ آئندہ کے لئے آپ حضرات ایسا پروگرام تجویز فرمار ہے ہیں اگر یہ میر طفل تسلی کیلئے ہے تو میں شکرگزار ہوں اور اگر واقعی ہے تو آپ کو مزید غور کرنا چاہئے مجھ جیسے ناکارہ کی وجہ سے اس قدر زیر باری اور تکلیف برداشت کرنا بالکل غلط اور غیر صحیح ہے''۔ (مکتوبات ج۲ص ۶۶)

اپنی بے بضاعتی، جہالت، بداعمالیوں کا مرکز، نفس وشیطان کا اڈا، مجھ جیسے ناکارہ، جاہل، متبع ہواؤ وساوس بداعمالیوں اور کسلمندیوں کی بنیاد، میرا علم نہایت محدود اور بہت کم، حافظہ نہایت کمزور، سمجھ بہت ہی ناقص اخلاق واعمال بہت گندے، واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں صدارت دارالعلوم کی قابلیت نہیں ہے، ہم جیسے ٹٹو نجیسے اور بہروپیے، کندۂ ناتراش

''مکاتیب کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی بے بضاعتی اور جہالت کی بناء پر ہے اس پر طرہ یہ کہ عملی حیثیت سے میں کورا ہی نہیں بلکہ بداعمالیوں کا مرکز بھی ہوں نفس اور شیطان کا اڈا ہوں۔ احباب اللہ تعالی کی پردہ پوشی کی بناء پر میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں اور معاذ اللہ ایسے ایسے القاب وخطابات کے ساتھ یاد فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ اور علماء امت کے لئے سزاوار ہوں نہ کہ مجھ جیسے ناکارہ، جاہل متبع ہواؤ وساوس، کندۂ ناتراش کے لئے۔ میں تو یقیناً میری خوش نصیبی ہے کہ ایسے ایسے اہل اللہ اور اکابر عظام کے در تک پہنچایا کہ وہ نہ صرف نمونۂ سلف تھے بلکہ فخر اسلاف کرام تھے مگر میں اپنی بداعمالیوں اور کسلمندیوں کی بناء پر خالی ہی رہا۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل۔ کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را۔

اللہ تعالی اپنا فضل فرماتے تو نجات کی امید ہے ورنہ انتہائی ہلاکت کا استحقاق ہے۔: از نکتہ مقصود نہ شد فہم

حکد یث۔ لادین ولادنیا بیکار بماندیم

(الف) میرا علم نہایت محدود اور بہت کم ہے اگر چہ حسن ظن اکابر کی بنا پر مجھکو صدارت دار العلوم کی جگہ دے دی گئی ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ مجھ میں اس کی قابلیت نہیں ہے حافظہ نہایت کمزور، اور سمجھ بہت ہی گری ہوئی اور ناقص ہے اخلاق اوس اعمال بہت گندے جن کو خیال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

(ج) خطوط کے لئے چونکہ فرصت بہت کم ہوتی ہے اور کثرت ڈاک کی بہت زیادہ ہے اس لئے خالی وقت کافی مقدار میں مکان پر نہیں ملتا۔ اس لئے سفروں میں چلتی ہوئی ٹرین میں اکثر لکھنا پڑتا ہے اس لئے مضامین میں غلطی کا احتمال بہت زیادہ ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر میں نہ کہا کہ کوئی فائدہ سمجھ میں نہیں آتا ہے، ان کا شائع ہونا اس دعوی کہ مراف ہے کہ ہم بھی ہیں "پانچ سواروں میں" مکاتیب حضرت مجدد قدس سرہ العزیز اور اس پایہ کے بزرگوں کے اس قابل ہیں۔ ہم جیسے ٹٹپونجیے تو اسی قابل ہیں کہ ہم کو گوشۂ گمنامی میں اس دار فانی میں رکھا جائے اور اس میں انتقال ہو جائے یہ تو آپ احباب اور بزرگوں کا حسن ظن ہے ایک بہروپئے کو آپ حقیقت کا درجہ دیتے ہیں اور اس کو اس درجہ و بڑھا رہے ہیں۔ پھر اگر ان کو آپ مفید سمجھتے ہیں کیجئے۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۲ ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ (مکتوبات ج ۲ ص ۷۰ر)

اللہ تعالی نے میری رذالتوں، معائب، اور معاصی پر ستاریت کاملہ سے پردہ ڈال رکھا ہے

"آپ نے حسن ظن سے جو اطرح مادح اختیار فرمایا ہے وہ بالکل خلاف واقع ہے

الا ان یتفضل اللّٰہ علی و جعل لی ظنون الاحباب واقعۃ فی نفس الامر . یظن الناس بی خیرا وانی لشر الناسان لم یعف عنی .

اللہ تعالی اپنی ستاریت کاملہ سے میری رذالتوں اور معائب، معاصی پھر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ احباب واغیار اس سے بھی زیادہ نفرت کرتے جتنی کرتے ہیں ونعم ماقیل۔ واسود مشفرۃ لصفتہ۔ یقال لہ انت بدر الدجی حاشیہ ص ار میں ہے یہ متنبی کا شعر ہے، جو کافور کی ہجو میں کہا گیا ہے۔ مفہوم یہ ہے جیسے حبشی کے موٹے ہونٹ اس کے تمام جسم کے آدھے کے برابر ہیں۔ خوشامد سے کہا جائے کہ تو تو چودھویں کا چاند ہے۔ وفقنا اللّٰہ وایا کم یحبہ و یرضاہ. والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ۔ ٹانڈہ ۵ر شوال ۱۳۷۱ھ (مکتوبات ج ۲ ص ۲۷)

اکابر کا نالائق و ناکارہ و گستاخ خادم

"میں خدا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ اس قید میں مجھکو ظاہری و باطنی بہت سے انعامات سے نوازا اور اگر

میں کس بدنصیب نالائق وکاہل نہ ہوتا تو اب تک بہت کچھ الطافات الیہ سے فیضاب ہو چکا ہوتا مگر اپنی بدقسمتی کا گلہ کس سے اور کیا کروں؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میرے لئے یہ قید رحمت ہی رحمت ہے اور پھر اگر خداوند کریم قبول فرمائے اور اخلاق ہو تو ہر ہر لمحہ آخرت کے لئے توشہ ہے .... میرے مخدوم ومحترم! آپ او ر دوسرے اکابر اپنے نالائق ب ناکارہ وگستاخ خادم کیطرف سے ادنی درجہ بھی غمگین ومتکدر نہ ہوں۔ اور اگر مقتضائے بشریت کوئی تذکرہ آجائے تو جب قول اکابر بمصیبے گرفتاریم نہ معصیبے۔ شکروثنا سے رطب اللسان ہو ں الخ۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۱۴ر رمضان المبارک بروز جمعہ"

میں ہر طرح چھوٹا ہوں اور پھر نالائق وناکارہ اور گستاخ کے علاوہ عبارت آرائی اور طریق تحریر سے بھی میں سخت عاجز ہوں

"مخدومہ! اگرچہ میں ہر طرح چھوٹا ہوں اور پھر نالائق وناکارہ مگر آپ کے مکارم اخلاق نے مجھکو گستاخ بنادیا ہے۔ اسی بناء پر میں ہمیشہ آپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا رہتا ہوں آپکی عمر عزیز اور جو ہر دار اوقات اکثر ایسے اور میں صرف ہوا کرکے اور ہو رہے ہیں۔ آپ ہوا کے ساتھ لڑتے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر جھگڑے مول لیتے اور اپنی جسمی طاقت اور قلبی جمعیت کو اس میں برباد کرتے رہے ہیں اور اب بھی وہی حال ہے پھر اس پر نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ دوسرا بوجھ ہے نہ معلوم آپ کب ان فضولیات سے احتراز کریں گے اور اپنے مستقبل کے فکر میں مشغول ہو کر قلب کی سلامتی کی فکر کریں گے مجھکو ہرگز زیبا نہیں کے اس قسم کی بات زبان سے نکالوں مگر آپ کے گونا گوں جنجالوں کو دیکھکر دل کو بیتابی عارض ہو جاتی ہے الدنیا ملعونہ وملعون مافیہا الا ذکر اللہ ومافیہا۔ الخ .... (مکتوبات ج ۲ر ص ر ۶۸)

اس پر بھی قدر معلوم کی ۶ طرف توجہ کروں تو عبارت آرائی اور طریق تحریر سے میں سخت عاجز ہوں یہ واقعی کیفیت ہے۔ آئندہ اگر کوئی بات سمجھ میں آ گئی تو حسب اطلاع باتیں قلمبند کرلونگا الخ۔ (مکتوبات ج ۲ر ص ر ۸۹)

قبل از وقت ایک نالائق وناکارہ کو ایسے احکام سے مکلف کرنا کیسی بے انصافی ہے؟ وغیرہ وغیرہ

مولوی قدرت اللہ دسرے کے کندھے پر بندوق چلانا چاہتے ہیں خود کیوں کام نہیں کرتے؟ عالم کو فیض پہنچانے سے ان کو کیوں انکار ہے اچھا مجھکو اس لائق بنوادیں پھر اس وقت ایسے احکام جاری کریں قبل از وقت ایک نالائق وناکارہ کو ایسے احکام سے مکلف کرنا کیسی بے انصافی ہے .... آپ اپنی بڑائی ثابت کر نے کے لئے بہت سی باتیں تکلفات کی لکھ رہے ہیں مگر میں ان سے دھوکہ میں نہیں آسکتا مجھ میں کوئی قابلیت کیسی بزرگ کی جانشینی کی نہیں ہے۔ بلکہ بخلاف اس کے اپنے بزرگوں سے انتساب میں بھی مجھکو سخت ندامت کا سامنا ہوتا ہے میں بجائے اس کے کہ انکے آثار قدم کا متبع ہوتا بلکہ آ کے خلاف عملی حالت دکھلا رہا ہوں اس لئے

بجز اس کے کہ ننگ اکابر کہوں اور نہ رشیدی نہ قاسمی نہ امدادی اور نہ کبھی اس پر جرات ہوئی ہاں خداوند کریم اگر اپنے فضل وکرم سے کوئی جرعہ ان کرام کے کاس معرفت واخلاص اور عمل وتقوی میں سے نصیب فرما دے تو اس وقت کوئی مضائقہ نہیں میں ان بزرگوں کا بدنام کرنے والا ہوں نیک نام کرنے والا نہیں، تکلیف دینے والا ہو ں تا حت پہنچانے والا نہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آمین.......... والسلام

حسین احمد غفرلہ ۲۰ ر شوال بروز سہ شنبہ از سابرمتی جیل احمد آباد گجرات۔ (مکتوبات ج ۲ ر ص ۱۹ ر ۲۹ ر)

ننگ خاندان، سیاہ کاری اور نامرادی کے لئے کھلے لفظوں میں منادی کرر ہے ہیں کہ اے روسیاہ! جو کلمات مدح وثنا اس روسیاہ ننگ خاندان کیلئے تحریر فرمائیں ہیں۔ بجز اس کے ان کو حسن ظن پر حمل کروں اور کیا کہ سکتا ہوں ہاں بارگاہ جل وعلا سے امیدوار ہوں کہ وہ کریم محض اپنے فضل کرم سے بزرگوں اور احباب اور کرم فرماؤں کے ظنون جمیلہ کو واقفیت کا جامہ پہنا دے۔

میرے بزرگ بیشک اللہ تعالی نے یہ انعام کیا اور جلیل القدر انعام کیا کہ بارگاہ امدادی اور بارگاہ رشیدی اور بارگاہ محمودی اور بارگاہ رحیمی قدس اللہ اسرارہم کی حاضری نصیب ہوئی نیز بارگاہ خلیل کی بھی خاک روبی حاصل ہوئی مگر کیا اپنی سیاہ کاری اور نامرادی کھلے لفظوں منادی نہیں کررہی کہ اے روسیاہ! تو ان سب بزرگوں کے لئے عار اور نہایت ناپاک عار ہے کیا ہمارے لئے ایسے بہت سے واقعات عبرت انگیز نہیں ہیں کہ مثل قاضی بہت سے بدقسمت بڑوں کے دیر تک پہنچ جاتے ہیں اور سوء بختی وہاں پر اپنا گل کھلاتا اور محروم خلص کردینا کا میں لاتی رہتی۔ تہی دستان قسمت چہ سود از رہبر کامل۔ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را۔ الحاصل مولانا، آپ بارگاہ رشیدی کے اولین خوشہ چینیوں میں سے ہیں اللہ تعالی نے اس بارگاہ کے باقی ماندہ خوشہ چینیوں میں جناب کو تقوی اور طہارت اخلاص عمل اور عبادات وغیرہ میں امتیازی حیثیت عطا فرمائی ہے جس کی بناء پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ موجودہ غلامان بارگاہ رشیدی میں آنجناب بے نظیر ہیں اور یہ ننگ خاندان تو اس بارگاہ کا سب سے آخری اور سب سے چھوٹا غلام ہے اس بارگاہ کے متقدین پر اپنے چھوٹوں اور متاخرین کی دستگری ضروری اور از بس ضروری ہوگی کاش وہ اپنے اس فرض کو پہچانیں اور کام میں لائیں۔

محترمہ! دعاء کا سخت محتاج ہوں۔ احب الصالین ولست منهم ۔ لعل اللہ یرزقنی صلاحا. میں بجز دعوات اور کس خدمت کے لائق ہوں خداوند کریم سے ملتجی ہوں کہ وہ منعم حقیقی جناب کے مقاصد دارین مکمل فرمائے اور چھلکتے ہوئے کنویں میں سے کچھ قطرات ہم ذہیوں کو بھی عطا فرمائے۔

و للارض کاس الکرام نصیب .... والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ (مکتوبات ج ۲)

روسیاہ خلائق، ننگ خاندان، بدنام کنندہ نکو ناماں، طفل مکتب، بات بات اور قدم قدم پر چھچھورا پن

غفلت و معاصی بے حیائی اور بے شرمی اس کا خاصہ غیر مفارقہ ہے

سیدنا المحترم زید مجدکم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، محترمہ ایہ طعنے دینے آپ کو مناسب نہیں ایک روسیاہ خلائق ننگ خاندان بدنام کنندہ نکوناماں کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا کیا برعکس نہند الخ کا مصداق، اور پشہ کو ہاتھی کہکر استہزاء اور انتہائی استہزاء نہیں ہے؟

کیا حضور لواء رشیدی ومحمودی ورحیمی وامدادی وغیرہ کے عملی وقلبی وروحی ہر طرح سے حامل نہیں ہیں کیا راتوں کو آپ نے تنگ نہیں کر دیا کیا مسجدوں کو آپ کے آباد نہیں کر دیا کیا اعتکاف رمضان اور اذکار واوراد کے مشاغل عالیہ آپ کے لوازمات ذاتیہ نہیں ہیں؟ کیا اسلاف اور بزرگوں کی نظریں آپ پر پڑی ہوئی نہیں ہیں؟ کیا ان کی صحبتیں اور دائمی مجلسیں آپ کے حصہ میں عرصہ ہائے دراز تک نہیں آئیں، علی ہذا القیاس اس قسم کی صد ہا نعمتوں سے آپ مالا مال نہیں ہوئے رہے ہیں؟ پھر آپ اس طفل مکتب کو (جس کی طفل کی حالت باوجود پنجاہ سالہ ہو جائے کے مفارقت گزیں نہیں ہوئی ہے بات بات اور قدم قدم پر چھچھورا پن لایعنی اور فضول عمل دن ورات اس کا شیوہ ہے غفلت اور معاصی اس کا عرض لازم ہے بے حیائی اور بے شرمی از رب العزت کا اس کا خاصہ غیر مفارقہ ہے۔ جس نے اپنی گندگیوں سے خدا کی زمین اور تمام مخلوقات کو طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کر رکھا ہے) ایسے الفاظ لکھتے ہیں کیا انصاف اسی کو کہتے ہیں کیا آپ کی ذرہ نوازی اور رحمت علی الصغار یہی ہے؟ بہر حال آپ کا فریضہ ہے کہ ایک آپ کا نیاز مند آپ کے بزرگوں کا نام لیوا تیہ ضلالت وغفلت میں سرگرداں اور پریشان ہیں اس کی ہمت عالیہ اور دعوات صالحہ سے خیر گری کریں باقی وہ تو گستاخ نیاز مند ہے ہی۔ اس کا تو فریضہ دعاء گوئی ہے ہی۔ مولانا محمد خلیل صاحب میرے ساتھ مشاغل قرآنیہ میں معین ہیں سلام مسنون عرض کرتے ہیں میں اس وقت دیو بند میں نہیں ہوں۔ اہل سلہٹ کے سخت اور پے درپے تقاضوں پر ایام تعطیل میں یہاں چلا آیا ہوں امیدوار ہوں کہ الطافہائے مربیانہ وک اس نالائق پر معطف رکھیں گے اور گستاخیوں کو معاف کر کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ ننگ اسلاف حسین احمد سلہٹ ۲۳ ررمضان ۱۳۴۷ھ (مکتوبات ج ۲ رص ۹۶ ر ۹۷:)

اور واقعہ بھی یہ کہ میں ہر طرح نالائق ونا قابل ہی ہوں

"اور واقعہ بھی ہے کہ میں ہر طرح نالائق ونا قابل ہی ہوں ت وجناب محمد اکو جی صاحب کٹھوری کو مجھ سے بیعت کی درخواست کرنا اور تقاضا کرنا اور وہ بھی غائبانہ بیعت کا یہ امور کہاں تک قرین قیاس ہیں آپ ان کی خیر خواہی فرمائیں اور صراط مستقیم ان کو دکھلائیں حضرت تھانویؒ اگرچہ وصال فرما گئے مگر ماشاء اللہ بیعت سے خلفاء چھوڑ

گئے ہیں گجرات سورت راندیر وغیرہ میں بھی ضرور بہت سے حضرات ہوں گے ان سے بیعت ہو جائیں ورنہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم موجود ہیں۔ وہ بھی بیعت فرمائے ہیں نیز حضرت میاں صاحب زید مجدکم وہاں تشریف فرمائیں ان حضرات سے بیعت کرا دیجئے غائبانہ کا جھگڑا تحریکات حاضرہ کا نجس جھگڑا ان جملہ امور سے بھی تحفظ ہوگا اور ایک ایسی لائق اور مکمل ہستی سے رہنمائی حاصل ہوگی جو ان آلودگیوں سے پاک وصاف ہے۔ در مجلس خود رامدہ ہمچو نے را۔ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۲۲ رشوال ۱۳۶۲ھ۔ (مکتوبات ص ۱۶۵ ج ۲)

حقیقی تواضع وانکساری سے عزت ملتی ہے

"آپ فرماتے ہیں کہ کسی عمل سے عزت وقار بخش دیتا ہے؟ جواب۔ حقیقی تواضع وانکساری اور کمزوروں کی خبرگری وہمدردی جو اللہ ہی کے لئے ہو۔ والسلام اعلم ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۲ محرم ر ۱۳۷۰ھ۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۱۷۱)

میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ نالائق ونا کارہ پاتا ہوں

"محترمہ! میں کب اس لائق ہوں؟ میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ نالائق ونا کارہ پاتا ہوں یہ کلام تکلفاو تصنعا نہیں ہے' واقعی ہے پھر کیا کیا جائے اور تو اور، حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز باوجود ہر قسم کے انتہائی کمالات کے اپنے آپ کو نالائق سمجھتے تھے اور ایسے ہی اعذار درخواست کنندگان بیعت کے سامنے کرتے تھے جس پر حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کو مندرجہ ذیل مکتوب لکھنے کی نوبت آئی جبکہ انھوں نے اپنی نسبت ایسے ہی کلمات لکھے تھے (ان کی فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے از فاطمی) "بندۂ عاجز کو اپنی نسبت ایسا ہی گمان کرنا چاہئے جیسا کہ ان مقبول بارگاہ خداوندی سے (یعنی آپ نے) تحریر کیا ہے کہ واقعہ یہ کہ اگر چہ اپنی دانست واعتقاد میں ہم اپنے دین وایمان اعتقاد واعمال کو بہتر اور لائق خیال کرتے ہیں لیکن نعوذ باللہ منہا۔ حضرت کردگار کے دربار عالی وقار کے ہرگز لائق وشایاں نہیں ہے ہر صورت اسی شکستہ وخستہ حالت میں اپنی کوتاہی کا اقرار کرتے ہوئے کریم ساز کیا آستانہ پر ہمیشہ پڑا رہنا

چاہئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ میں سبحانہ وتعالیٰ کے دربار کے لائق نہیں ہوں۔

(مکتوبات ج ۲ ص ۱۷۴)

میں بالکل تہی دست ہوں اور نالائق ونا کارہ حقیقی بالخصوص ننگ اسلاف ہوں

''مشکل یہ ہے کہ ایسی صورتیں مجھکو بھی درپیش ہیں بار بار دعاء کی اور رورو کر دعاء کی ان لوگوں کو مجھ سے پھیر دیا جائے میں بالکل تہی دست ہوں اور نالائق ونا کارہ حقیقی بالخصوص ننگ اسلاف ہوں مگر قبول نہیں ہوئی کیا کروں۔ یظن الناس بی خیرا وانی. لشر الناس ان لم یعف عنی۔ خدا جانے مستقبل میں کیا حشر ہو ہر طرف سے اعمال ناقص ہیں بیعت چاہتا ہوں کہ کچھ کروں اور ان اسلاف کرام قدس اللہ واسراہم کچھ نہ کچھ صحیح صورت بناؤں جن کا انتساب محض بفضل اللہ وکرمہ حاصل ہوا ہے مگر نفس امارہ اور شیطان اس دشواری گزار وادی میں آنے نہیں دیئے محرومیت ہی محرومیت چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۷۵ برس عمر کے گزر گئے مگر آج تک بھی کام ایسا نہیں ہو سکا جو کہ بارگاہ رب العالمین قبولیت سے لائق ہوتا۔ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔ جس اپنی شکایت اور حقیقت کہتا ہوں وہ الٹے ہی کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یوم تبلی السرائر میں کیا پیش کیا جائے۔ واسود مشفرہ نصفہ یقال لہ انت بدر الدجی۔ والسلام۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ از دارالعلوم دیوبند۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۱۷۹)

میں ابتداء سے نہایت نفس پرست ہوں اعمال میں کاہل ہوں اپنی نفس پستی کج ادائی بدنصیبی اور کسلمندی کی بناء پر کورا ہی رہا۔

''محترم المقام زید مجدکم........................السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واقعات ذیل دفعات ملاحظہ فرمائیں

(۱) میں ابتداء سے نہایت نفس پرست ہوں اعمال میں کاہل واقع ہوں تمام عمر گنا ہوں اور دنیا پرستی اور نفسانیت میں گزاری ہے۔ اب عمر ۷۰ برس سے تجاوز کر گئی ہے مگر توشۂ آخرت کچھ نہیں ہے ذخیرہ ذنوب نہایت عظیم الشان ہے ظاہری اسباب پر نظر کرتے ہوئے کوئی امید مغفرت نہیں ہے الا یتغمدنی اللہ بکرمہ وفضلہ۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں کچھ ہوں کلا واللہ اہل اللہ کے اوصاف جمیلہ اور احوال جلیلہ سے بالکل عاری اور خالی ہوں۔۔ سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم۔ چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہم۔ یہ واقعہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے فضل وکرم سے حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز اور حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہما العزیز کے دروں تک پہونچایا۔ اوران مقدسین کے جوتے سیدھے کرنے کی نعمت نصیب ہوئی۔ مگر اپنی نفس پرستی اور کج ادائی اور بدنصیبی اور کسلمندی کی بناء پر کورا ہی رہا۔

تھید ستاں قسمت راچہ سوداز رہبر کامل۔ خضراز آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را۔ اسی بناء پر اپنے آپ کو ننگ اسلاف لکھتا ہوں وہ لکھنا تکلفاً نہیں بلکہ حقیقت میں اپنے اسلاف کرام قدس اللہ اسرارہم کے لئے ننگ وعار ہی ہوں اپنی جگہ پر سخت شرمسار ہوں اپنی حالت پر نفرتیں بھیجتا ہوں لوگوں کا میری نسبت حسن ظن بالکل غیرواقعی ہے اگر اللہ تعالی اپنے فضل وکرم اور احباب کے حسن ظن سے مجھکو بخش دے تو یہ اس کا جود وفضل ہے ورنہ میں کسی کا نہیں ہوں

يظن الناس بی خيرا وانی . لشر الناس ان لم يعف عنی . آپ کا مجھ سے بیعت کرنا سخت غلطی تھا اور ہے۔ جبکہ مرشد کامل اور ہمہ وا صل مل رہا ہے ضرورت ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر اس سے بیعت ہوں اور اسی سے استفادہ فرمائیں۔ توجہ الی اللہ اور اصلاح نفس کیلئے فرصت ہی نہیں ملتی ایسے نفس پرور سگ دنیا کو کب بیعت وارشاد مناسب وجائز ہے۔

(۲) مختلف امور میں مبتلا ہوں سیاسیات میں میرا انہماک ظاہر وباہر ہے اور آج تک اس میں دامن ملوث ہے علوم ظاہرہ کا اشغال اس قدر ہے اور ہمیشہ سے۔ یہی رہا ہے کہ کوئی وقت اصلاح نفس اور بزرگوں کی تعلیمات پر عمل اور اشغال باطنیہ کا ملتا ہی نہیں اسفار اور لوگوں سے مخالطت او خط وکتابت وغیرہ کی اس قدر کثرت ہے جس کی وجہ سے توجہ الی اللہ اور اصلاح نفس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اہل وعیال کے مشاغل اور دین فروشی اور دنیا طلبی کا اس قدر انہماک ہے کہ بڑے بڑے دنیا داروں کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا تقریباً ۵۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ لے کر احادیث نبویہ کی تعلیم دیتا ہوں اور پھر اس میں بھی کس قدر کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اگر رحمت خداوندی نے دستگیری نہ فرمائی تو چھٹکارا ممکن نہیں۔ دودل بودن بجز بے حاصل نیست ہوتے ہوئے کیا کوئی کمال حاصل ہوسکتا ہے؟ عربی کا مقولہ ہے صاحب الصنعتين كذاب۔ ہم خدا خواہی وہم دنیائے دون۔ این خیال است ومحال است وجنون۔ ایسے نفس پرور سگ دنیا کو کب بیعت وارشاد مناسب ہے؟ صرف حضرات اکابر کے حکم پر بیعت کرتا ہوں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں۔ بیعت ہونے والے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں ظاہر کو دیکھ کر فریب میں آجاتے ہیں۔ اگر ان کو میری اصلیت اور حقیقت ظاہر ہو جائے تو یقیناً اس سے زیادہ مجھ سے نفرت کریں جتنی کہ وہ کتے اور سور سے کرتے ہیں۔ خداوند کریم نے پردہ ڈال رکھا ہے جس کیوجہ سے میری گندگیوں کی لوگوں کو اطلاع نہیں۔ خداوند کریم نے یوم تبلی والسرائر میں پردہ پوشی نہ فرمائی تو میرے برابر کو

ئی فضیحت ہونے والا نہ ہو۔

(۳) مولانا وصی اللہ صاحب منقطع الی اللہ ہیں۔ سب جھنجھوں کو چھوڑ کر صرف باطنی اشغال اور توجہ الی اللہ میں منہمک ہیں۔ حسب قاعدہ ایک کام کی مداومت اس میں کمال پیدا کر دیتی ہے۔ پھر ماشاء اللہ ان کو پیر و مرشد کے دربار میں مدتہائے دراز تک حاضر باشی اور ذکر و شغل کی نوبت نصیب ہوئی ہے۔ ذاتی حیثیت سے بھی کامل ہیں۔ ہم تو ایسے بدنصیب ہیں کہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو تقریباً ایک ماہ سے کچھ زائد مکہ معظمہ میں رہنا نصیب ہوا مگر شعائر حج کی مشغولی کی بناء پر اس وقت قلیلہ میں بھی روزانہ حاضری نہ ہو سکی۔ حضرت پیر و مرشد گنگوہیؒ کی خدمت میں البتہ کچھ رہنا نصیب ہوا تو محرومیت نے دامن چھوڑا۔

کذالک فی الدنیا تعیش البھائم .... ؎

بیعت ہونے کو میں نے اس وجہ سے بھی لکھا تھا کہ وہ آپ کو اپنا سمجھیں اور آپ کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں کیونکہ انسان کی طبعی بات ہے کہ اپنے کی طرف خصوصی توجہ کرتا ہے اور غیر جی طرف منسوب ہونے والے سے کچھ نہ کچھ غیریت ہی برتتا ہے مثل مشہور ہے" پرائے پوت کس نے پالے؟ والسلام۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ .... ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ۔ (مکتوبات ج ۲ ص ۱۸۴ تا ۱۸۷)

میں ایک معمولی طالب علم ہوں میں ولی بزرگ قابل ارشاد صاحب کشف و کرامت نہیں ہوں

"محترم المقام زید مجدکم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترمہ! سنی سنائی باتوں پر اعتماد نہ کیجئے میں ایک معمولی طالب علم ہوں میں ولی بزرگ قابل ارشاد صاحب کشف و کرامت نہیں ہوں۔ تمام عمر لہو و لہب کھانے پینے سونے نفس پرستی دنیا طلبی میں مثل حیوانات و بہائم گزری ہے اس سے بڑھکر دنیا طلبی کیا ہوگی؟ کہ کتب دینیہ حدیث شریف وغیرہ تنخواہ لے کر پڑھاتا ہوں۔ اور تنخواہ بھی معمولی نہیں تین سو روپے ماہوار بیشک فضل و کرم خداوندی ہے با کمال اہل اللہ کے جوتوں کے سیدھے کرنے کا شرف حاصل ہوا مگر حسب ارشاد۔ تہید ستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل۔ کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را۔۔

خالی ہی رہا۔ لوگ حسن ظن عمل میں لا رہے ہیں اور انہوں نے آپ کو بھی گمراہ کیا ہے۔ آپ کامل تارک الدنیا اللہ والے کو تلاش کریں۔ اور بالفرض آپ کو کوئی ایسا نہ ملتا ہو تو ایسے کے پھندے میں تو نے پھنسے۔

کس نیاید مزیر سایۂ بوم۔ رو ہما از جہاں شود معدوم۔

میرے بال سفید ہو گئے، اعضاء میں کمزوری بے حد آ گئی پچھتر سال سے زائد عمر ہو گئی مگر ہنوز روز اول ہے۔ قوت تمام گشت و بیاباں رسید عمر۔ ہمچناں در اول راہش فتادہ ایم۔ میں مخلصانہ و ہمدردانہ آپ کو لکھتا ہوں۔ آپ

کو ہر مقصود تلاش کیجئے۔ اور اس تگ و دو میں لگے رہے۔ اللہ تعلیٰ کامیاب فرمائیگا، ورنہ آپ معذور ہوں گے، آپ کو بوقت پیشی یہ عذر معقول ہوگا والسلام۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ۔ ۳ ذی الحجہ ۱۳۱۷ھ۔

(مکتوبات ج ۲ ص ۱۸۸:۱۸۹)

میں ہمیشہ کا نالائق خادم، اکھڑ دریوزہ گر ہوں، بے وقوف ناکارہ غلام ہوں، حضرت نانا توی" کے خاندان کا خیر خواہ ہوں۔ حسین احمد کی زندگی اور معیشت بھی درالعلوم پر موقوف نہیں۔

"میں ہمیشہ کا خادم ہوں، مگر نالائق۔ آپ حضرات بالخصوص حضرت نانوتویؒ قدس سرہ کے خاندان کا خیر خواہ ہوں مگر اکھڑ دریوزہ گر ہوں، مگر ناکارہ غلام ہوں، مگر بے وقوف۔ میری عین خواہش ہے کہ حضرتؒ کے اخلاف اس طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں، جس پر حضرتؒ چلتے رہے اور جس پر ہم دور افتادوں کو چلایا میں جب کہ ان اخلاف صدق میں سے کسی کو اس طریقہ سے دور اور خلاف پاتا ہوں تو بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ چونکہ زور کچھ نہیں اس لیے گھٹ کر رہ جاتا ہوں۔ اس لیے یہی اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ ہم سے کنارہ کش ہے۔ ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے میرا یہ کبھی بھی خیال نہیں ہے کہ معاذ اللہ خاندان قاسمی کو کوئی گزند پہنچے ارادہ و عمل تو درکنار۔ اگر کسی بات سے یہ انتزاع کیا جائے تو غیر صحیح ہوگا۔ بہر حال اس اجتماع میں بھی اور آئندہ میں بھی جو صورت حقیقی مفاد دارالعلوم اور ملت اسلامیہ کی ہوا سے اختیار فرمائیں، ہر گز ہرگز شخصی اور بالخصوص حسین احمد کے مفاد کو ترجیح نہ دیں، نہ دارالعلوم حسین احمد پر موقوف ہے اس کے جیسے نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہزاروں درجہ بڑھ کر آپ کی جماعت میں جو کہ اسلاف کرام کے دریوزہ گروں کی جماعت ہے علمائے کرام اور صلحائے عظام موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو تنکے سے کام لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے حضرت مولانا فخر الدین صاحب اور مولانا عبدالعدل صاحب حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کے شاگردوں میں سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ میں اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے مولانا احمد حسن صاحب امروہوی، دوسرے درجہ میں تھے اور حضرتؒ کی عنایت بھی اُن پر سب سے زیادہ تھی ہمارے آقا حضرت شیخ الہندؒ ان سب میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعہ جو کام لیا دہ ان میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہو سکا۔

آج فیض قاسمی عالم میں میزاب محموی سے جاری ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے تلامذہ میں شاہ محمد اسحاقؒ سب سے زیادہ بھی مشہور تھے مگر خاندان ولی اللّٰہی کا فیض اُن ہی سے جاری ہوا، بڑے مشاہیر علماء اوراذ کیاء دھرے رہ گئے بہرحال اللہ تعالیٰ دارالعلوم کا فیض چلانا چاہے گا تو ایک تنکے سے وہ کام لے گا جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا، حسین احمد کی زندگی اور معیشت بھی دارالعلوم پر موقوف نہیں، الا ان یشاء اللّٰہ۔

باقی جو کچھ میری سمجھ میں بہتری کا ذریعہ آئیگا عرض کرتا رہوں گا اپنے منشاء پر مجبور کرنا نہ میرا منصب ہے اور نہ کبھی ہوا اتفاقیہ الٰہی میں نہ تھا کہ میں شریک اجلاس شوال ہوتا اور بظاہر اس اجلاس میں بھی شرکت کی کوئی امید نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی اعانت فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ (مکتوبات: ۲/۲۰۴ تا ۲۰۸)

میں باوجود اپنی نالائقی دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مقاصد دارین میں کامیاب فرمائے آمین آپ بھی اس خستہ حال کو دعاؤں میں یاد رکھیں، والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، (مکتوبات: ج ۲/۲۳۰) ۲۰/ جمادی الثانی ۲۰/ جمادی الثانی ۶۲ ۱۳ھ

خاکساری اور تواضع کی تلقین دنیاوی مطاعم اور ملابس وغیرہ میں تلذذ سے بچئے ہمیشہ سادہ اور موٹا جھوٹا کھانا کپڑا فرش وغیرہ اختیار کیجئے۔ (مکتوبات، ج: ۲/۲۳۰)

''قوت حافظہ اور فہم کی بیماری میں تو میں خود مبتلا ہوں، نہ مولانا نانوتویؒ کی ذکاوت ہے، نہ مولانا انور شاہ صاحبؒ کا حافظہ ہے پھر ''خفتہ راخفتہ کے کند بیدار'' کا سماں ہے میں اس میں آپ کا سہارا کس طرح بن سکتا ہوں کوشش بلیغ جاری رکھئے۔

(مکتوبات، ج: ۲/۲۵۰)

اس پر ایسے ناکارہ اور ننگ دنیا کی خبر گیری؟

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ

''مبلغ ۵۰/ روپیہ مرسلہ آنجناب پہنچے، میرے محترم یہ تکلف بالکل بے موقع ہے میں بحمد اللہ ایک ایسی بڑی تنخواہ پاتا ہوں جو کہ ہم عصر معلمین کو عموماً نہیں ملی، آپ حضرات کو خود ہی بال بچوں کی پرورش کی ضرورت مجبور کرتی ہے اس پر ایسے ناکارہ، ننگ دنیا، کی خبر گیری اور اتنی بڑی مقدار سے امداد و اعانت کرنی اسراف کے درجہ تک ہوگی، میں امیدوار ہوں کہ کبھی ایسا نہ کیا جائے گا الخ۔ والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۲۹/ ذی قعدہ ۶۸ھ دیوبند

میں بدقسمت ہوں اور پھر ہر طرح ناقابل وناکارہ اور بہرحال میں ایک نالائق خادم ہوں

”والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، میرے محترم آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مجھ کو اور نہ کسی دوسرے کو اپنا جانشین بنایا ہے بلکہ میں تو اتنا بدقسمت ہوں کہ وصال کے وقت خدمت میں موجود بھی نہ تھا حضرتؒ نے دو ڈھائی ہزار اپنے شاگرد اور خدام چھوڑے ہیں اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔

مجھ کو حضرت کے خدام نے بھی نہیں منتخب کیا، اس لیے جانشین کہنا اور سمجھنا ایک غیر واقعی اور غلط امر ہے اور پھر ہر طرح نا قابل و نا کارہ ہوں، شاہ صاحب مرحوم، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحبؒ، مولانا سہول صاحبؒ، مولانا فخر الدین صاحبؒ وغیرہ حضرات اس کے احق تر ہیں۔

میں واقعی طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرا اپنے کو ”ننگ اسلاف“ لکھنا صرف واقعیت پر مبنی ہے، بہر حال میں ایک نالائق خادم ہوں الخ۔

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ ۲/ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ۔ (مکتوبات، ج:۲/ ۲۶۱)

آخر میں کیا کروں؟ کس طرح پڑھاؤں؟ اور کس طرح تمام اسفار کو انجام دوں

”سنولہ گھاٹ میں مجھ کو بار بار انتہائی مصروفیتوں کے باوجود کھینچا گیا اتنا بڑا ملک ہے ہر طرف مجھ پر حاضری کا تقاضا ہے دار العلوم کی تدریس بخاری و ترمذی میرے ذمہ ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دن بھی دیوبند سے باہر نہ جاؤں، تمام دورہ کا مدار صرف ان دو کتابوں پر ہے، دورہ میں ڈیڑھ سو سے زائد طلبہ ہیں ان تمام حالات کو جانتے ہوئے آپ مجھ پر ہر خط میں تقاضا کرتے ہیں، آخر میں کیا کروں؟ کس طرح پڑھاؤں؟ اور کس طرح تمام اسفار کو انجام دوں اور احباب کے تقاضوں کو پورا کروں اگر احباب سے یہ کہتا ہوں کہ دار العلوم سے استعفا دے کر علیحدہ ہو جاؤں تو بھی کوئی اجازت نہیں دیتا، اور اگر اپنی معذوری ظاہر کر دوں تو نہ معاف کیا جاتا ہے اور نہ گوارہ کیا جاتا ہے، اور آپ لکھتے ہیں کہ تو خفا ہو گیا۔

چیست یاراں طریقت بعد ایں تدبیر ما

میں نے بہت کوشش کی کہ جمعیۃ کی صدارت میرے متعلق نہ کی جائے مگر کچھ شنوائی نہیں ہوئی۔

شب تاریک، و بیم موج، و گردابے چنیں
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

ننگ اسلاف، حسین احمد سلہٹ ۶۳ھ

(مکتوبات، ج:۲/ ۲۷۳)

میں نہایت نالائق اور ناکارہ ہوں اپنی نالائقی، کم ظرفی اور نفس پرستی کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوں کہ مجھ سے بیعت کیا جائے

آپ کو معلوم ہے کہ میں نہایت نالائق اور ناکارہ ہوں نفس اور دنیا کی نجاستوں میں مبتلا ہوں، اگرچہ بفضلہٖ تعالیٰ مجھ کو اعلیٰ درجہ کے خدا رسیدہ اہل کمال اور خواص مقربین کے در تک پہنچنے کا شرف حاصل ہوا مگر میں نے اپنی نالائقی اور کم ظرفی اور نفس پرستی سے عمر کو ضائع کیا اور اسلاف کرام کو بدنام کیا ہے، میں اس قابل اپنی بداعمالیوں اور نالائقیوں کی وجہ سے نہیں ہوں کہ مجھ سے بیعت کیا جائے۔ فقط امتثالاً لامر الاکابر کرتا ہوں الخ۔

حسین احمد غفرلہ، از دارالعلوم دیوبند، ۲/ مارچ ۵۱ھ (مکتوبات، ج:۲/ ۲۷۸)

واقع میں، میں خطاوار ہوں، بہر حال قصوروار ہوں، نابکار اور سگ دنیا کو فراموش نہ فرمائیے

''واقع میں، میں خطاوار ہوں کہ آپ کو تعزیت نامہ نہیں بھیجا مگر مختلف ذرائع سے بار بار خبر پہونچتی رہی کہ آپ یہاں آنے کا ارادہ کر رہے ہیں اس لیے مجھ سے تقصیر ہوئی اور انتہائی عدیم الفرصتی اور بھی اس کی باعث بنی، بہر حال میں قصوروار ہوں اور معافی کا طالب الخ۔

دعوات صالحہ سے اس نابکار اور سگ دنیا کو فراموش نہ فرمائیے، خویدکم ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ از دارالعلوم دیوبند، ۲۱/ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ (مکتوبات، ج:۲۹۱ تا ۲۹۳)

مودودیان بہت زیادہ کیچڑ اچھال رہے ہیں حسبہم اللہ

''سنا گیا ہے کہ مودودیان کرام ''تجلی'' اور ''دعوت'' وغیرہ میں بندگان والا اور خدام پر بہت زیادہ کیچڑ اچھال رہے ہیں، حسبہم اللہ والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ

بانس کنڈی آسام، ۲۰/ رمضان المبارک ۷۵ھ۔ (مکتوبات، ج:۳/ ۱۰۰)

ہماری تعلیمات تنخواہوں کی وجہ سے یقیناً محل نظر ہیں، کیا حضور اکرم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح کتاب لے کر پڑھاتے تھے؟

محترم المقام زید مجدکم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والا نامہ کا جواب آج لکھ رہا ہوں، تقدیر کے مسئلہ میں جب بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو یہ حقیقت ملحوظ رہتی تھی کہ آپ سے یہ جبن اور بخل چھڑایا جائے آخر وہ فریضہ تبلیغ جو مسلمانوں پر عموماً اور اہل علم پر خصوصاً عائد ہوتا ہے اس کے ادا کرنے میں کیا یہ تقریر درجہ علیا نہیں رکھتی، بالخصوص جب کہ یہ بلا معاوضہ اور بلا

تنخواہ ہے، ہماری تعلیمات تنخواہوں کی وجہ سے یقینا محل نظر ہیں الا ان یرحم اللہ علینا مگر یہ تقاریر اگر بلا قصد معاوضہ ہیں تو یقیناً ہمارے لیے ذریعہ نجات ہیں اور امت کے لیے موجب اصلاح۔

رہا یہ شبہ کہ بعد میں عجب پیدا ہوتا ہے اور اسی بناء پر آپ اس کو پیش قرار دیتے ہیں، اور نہایت ناگواری کے الفاظ مصافحہ وغیرہ سے استخراج فرماتے ہیں، میرے لیے انتہائی تعجب خیز ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ذخیرہ کیا، یہی تقریریں اور خطب نہیں ہیں؟ کیا وہ ہماری طرح کتاب لے کر پڑھاتے تھے؟ الخ

(مکتوبات، ج:۳/۵۷)

آنجناب کا حسن ظن ہی امید نجات کا ذریعہ ہے ورنہ........

یظن الناس بی خیرا وانی

لشر الناس ان لم یعف عنی

سیدنا المحترم اعلی اللہ درجاتکم فی الدارین آمین السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، آنجناب کا حسن ظن ہی امید نجات کا ذریعہ ہے ورنہ واقعی حالت اور اعمال یاس ہی یاس کے موجب ہیں۔

گر بدیار و دبر آرد، دود کی کیفیت ہے امتثال حکم باعث شرف ہے اعانت بالدعوات الصالحہ کا متمنی ہوں الخ۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ بانس کنڈی کچھار آسام ۱۹/ رمضان المبارک ۷۵ھ (مکتوبات، ج:۳/۹۹)

مجھ کو اس سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ نے مادحانہ کلمات لکھے ہیں، کس قدر غضب کی بات ہے؟، وغیرہ غیرہ

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھ کو اس سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ نے ''مادحانہ کلمات'' لکھے ہیں اور آپ اس سے تغافل برت رہے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مادحین کے لیے کس قدر سخت کلمات فرمائے ہیں، اور ممدوحین کے لیے کس قدر خطرات ہیں جن پر آیات واحادیث روشنی ڈال رہی ہیں، اس سے آپکو بہت زیادہ اجتناب چاہئے اور سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ آپ اطراء مادح کرتے ہوئے ناجائز کلمات مثل خیر الاخیار ذات نور علی نور۔

قبلہ کعبہ حاجات وغیرہ استعمال کرتے ہیں، کس قدر غضب کی بات ہے؟ کہ جس چیز کو ہم دوسروں کے لیے ناجائز بتلائیں اور جس سے ہم دوسروں کو روکیں اسی کو خود عمل میں لائیں اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ الآیۃ ایسی باتوں سے سخت گریز کیجئے، هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ

اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ فَلَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی، الحذر الحذر خاتمہ کا حال معلوم نہیں جب تک خاتمہ علی الایمان نہ ہو جائے جب تک اشرف المخلوقات ہونا بھی صحیح نہیں۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۱۶،۱۱۷)

افترآت اور سب وشتم کے سیلاب پر خاموشی

''میں انتہائی درجہ میں عدیم الفرصت ہوں، اور اس قسم کے افترآت اور سب وشتم کا سیلاب کم وبیش (اس زمانہ سے جبکہ میں نے تحریکات وطنیہ اور ملیہ میں قدم اٹھایا ہے) برابر جاری ہے اس لیے ایسی باتوں میں وقت صرف کرنا اضاعت وقت سمجھتا ہوں۔

وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا الخ پر عمل پیرا رہتا ہوں، میں اس وقت بھی چپ تھا مگر آپ کے والا نامہ نے مجبور کیا کہ حقیقت واضح کی جائے اس لیے باوجود عدیم الفرصتی مختلف اوقات میں لکھ کر مندرجہ ذیل مضمون پیش کرتا ہوں اور تاخیر کی معافی کا خواستگار ہوں الخ۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۴۳)

ابھی ابھی جلسہ بیت العلوم میں مجھ کو قطعی کافر وجہنمی قرار دیا ہے میں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں

''مجھے تعجب ہے آپ والا نامہ میں میرے متعلق اس قدر حسن ظن کا اظہار فرما رہے ہیں اور آپ حضرات نے ابھی ابھی جلسہ بیت العلوم میں مجھ کو قطعی کافر وجہنمی قرار دیا ہے، خوشی خوشی میری تکفیر کی اشاعت فرمائی، میں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھ کو سنتِ رشیدی وقاسمی، ومحمودی وخلیلی واشرفی نصیب ہو رہی ہے ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے میری نسبت یہ ''الفاظ مدحیہ'' سے تخاطب وکلام؟ میری سمجھ سے باہر ہے۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۹/ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ (مکتوبات، ج:۳/۱۴۷)

میرے جیسے روسیاہ، اکابر کے لیے ننگ وعار، کوئی قابلیت نہیں رکھتا

''بالخصوص میرے جیسے روسیاہ تو بجز اس امر کے کہ ان اکابر کے لیے ننگ وعار کہا جائے اور کوئی قابلیت نہیں رکھتا، بنا بریں جب تک قاعدہ کے ساتھ محنت نہ کی جائے کس طرح کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ حالانکہ اس حالت میں بھی فضل وکرم خداوندی کی ازبس ضرورت ہے، یاس اور ناامیدی کسی طرح جائز نہیں، مردانہ وار قدم رکھنا چاہیے، کوشش جاری رکھئے، عادت الٰہی نہیں ہے کہ کسی کی جد وجہد کو ضائع فرمائے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۵/ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ (مکتوبات، ج:۳/۱۵۵)

یہ جملہ حضرات ہر قسم کے کمالات کے حاوی ہیں، مجھ جیسے ناکارہ ونالائق کی طرف آپ کی نظر انتخاب غیر قابل تلافی خطا ہے۔

''موجودہ مشائخ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا عزیز الرحمان صاحب مفتی مدرسہ دیوبند، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، یہ جملہ حضرات ہر قسم کے کمالات کے حاوی ہیں، بعض مسائل میں بعض حضرات کا مخالف ہونا دوسری بات ہے اس لیے ان بزرگوں میں سے استخارہ مسنونہ مکرر کر لینے کے بعد تعلق پیدا کرنا مفید اور ضروری ہے، میری عرض سابق کا مقصد یہی تھا کہ کم از کم قول الجمیل کی تعریف کے مطابق کوئی شیخ تلاش کریں، مجھ جیسے ناکارہ ونالائق کی طرف آپ کی نظر انتخاب کا اُٹھنا قباحت سے خالی نہیں ہوسکتا، بلکہ غیر قابل تلافی خطا ہے، حقیقت میں یہ ظاہری سجادہ نشین اکثر گمراہ کنندہ ہیں اور کسی طرح قابل بیعت نہیں، اسی لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے علی البصیرہ کام کیجیے، والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، از دیوبند آستانہ حضرت شیخ الہند۔'' ۲۸/رمضان المبارک۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۸۱)

میں سخت گنہگار ہوں اور نالائق ہوں

''مولانا محمد حسین صاحب سے آپ کیوں نہیں رجوع فرماتے؟ وہ صاحب علم وسیادت ہیں ان کے قول اور رائے پر اعتماد کیجیے، میں سخت گنہگار ہوں اور نالائق ہوں، مجھ کو دعوت صالحہ سے یاد فرماتے رہیں میں بھی آپ کے لیے دعاء کروں گا، والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ۔ ۱۱/شوال ۱۳۴۹ھ۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۸۴)

وہ بے نیاز اور بے پرواہ سرکار ہے، پھر کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں؟

''میں کوئی بڑا القاب نہ آپ کو لکھتا ہوں اور نہ میری عادت ہے، مدار بڑائی کا قبولیت خداوندی پر ہے، نہ عمر پر، نہ علم پر، نہ عمل پر۔

''پیا جس کو چاہے سہاگن وہی ہے'' ع تا یار کرا خواہد و کرا طلبد دوست

اگر اس نے قبول کر لیا تو زہے قسمت، ورنہ کچھ ٹھکانا نہیں، قبول کرے تو قراب الارض والسماء خطائیں اور معاصی ایک دم میں صاف ہو جائیں، بلکہ حسنات بن جائیں، اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ بِالْحَسَنَاتِ، نہ قبول فرمائے تو جبال حسنات ذرہ سے بھی چھوٹے ہو جائیں، بے نیاز اور بے پرواہ سرکار ہے،

پھر کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۹۳)

میں ایک معمولی درجہ کا مسلمان ہوں، گنہگار ہوں، مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اکابر کو بلا واسطہ حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے استفادہ کی نوبت آئی ہے۔۔۔۔

''محترم المقام زید مجدکم

میں ایک معمولی درجہ کا مسلمان ہوں، گنہگار ہوں، اس قسم کے معارف عظیمہ اور حقائق حالیہ سے مجھ کو کیا واقفیت ہو سکتی ہے؟

يظن الناس بي خيرا واني

لشر الناس ان لم يعف عني

مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی، مرزا مظہر جانجاناں، قدس اللہ اسرارہم وغیرہ اکابر کے اصول میں بے شمار ایسے دقائق درج ہیں جن میں ان اکابر کو بلا واسطہ حضور سرور کائنات علیہ الصلاۃ والسلام سے استفادہ کی نوبت آئی ہے مگر کسی نے اپنے مشائخ اور مرشدین سے رابطہ منقطع نہیں فرمایا اور اپنے متوسلین کو اپنے مشائخ سے ہی مربوط کرتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ آقائے نامدار علیہ الصلاۃ والسلام تک پہونچنا روگردانی عقوق اور انتہائی ناشکری ہے اگر والدین نے کسی بچہ کو پال کر اس لائق کردیا کہ بادشاہ کے دربار سے بلا واسطہ مستفید ہونے لگے تو اس کو والدین سے تعلق توڑنے کی اجازت دی جائے گی یا اور زیادہ شکر گزار والدین کا بننا پڑے گا؟، واللہ اعلم، والسلام۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ

(مکتوبات، ج:۳/۱۹۶، ۱۹۷)

میں ایک معمولی اور گنہگار بندہ ہوں، جو اسلاف کے لیے ننگ و عار ہی رہا۔

''آپ میری طرف سے کسی قسم کا فکر نہ کریں آپ کا بار بار تکلیف کرکے آنا اور اپنے کاروبار میں حرج ڈالنا میری طبیعت پر بہت زیادہ بار ہوتا ہے میں ایک معمولی اور گنہگار بندہ ہوں، جو اسلاف کے لیے ننگ و عار ہی رہا اس کے لیے اس قدر تکلیف اٹھانا بہت بے جا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر دے آمین۔ والسلام، ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۲۵/ شعبان، ۶۱، ۱۳۷ھ مراد آباد جیل۔ (مکتوبات، ج:۳/۲۰۳)

مجھ جیسے نالائق، کم علم، بے مایہ کے مکتوبات کا شائع ہونا انتہائی شرمناک ہے اپنی انانیت کا مظاہرہ ہے، حسین احمد کون چیز ہے، جس کے مکتوبات شائع کیے جائیں؟

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، والا نامہ مورخہ ۱۷/ جنوری، باعث سرفرازی ہوا مکتوبات کے متعلق میری رائے نہیں تھی مجھ پر بار ہا زور دیا گیا مگر میں نے انکار کیا، جس کے وجوہ متعدد تھے، جن میں بڑی وجہ یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ہمارے پاس حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے اکابر کے مکتوبات کا وافی ذخیرہ نہایت مفید اور کار آمد موجود ہے، اُن کے ہوتے ہوئے مجھ جیسے نالائق اور کم علم بے مایہ کے مکتوبات کا ہونا انتہائی شرمناک ہے اور ان بزرگوں کی ہمسری کا ادعاء ہے کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ اپنی انانیت کا مظاہرہ ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا حافظہ اور تبحر نہیں ہے، نہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم اور مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم کی ذکاوت ہے، نہ مولانا شبیر احمد صاحب کی حسن تقریر و تحریر اور علمیت ہے، نہ ان حضرات کا تبحر اور وسعت علمی ہے، پھر ان حضرات کے مکتوبات کا شائع ہونا اور میرے مکتوبات کی اشاعت کس قدر بے شرمی اور انانیت کی بات ہے؟ حضرت شیخ الہند حضرت نانوتویؒ حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کے مکتوبات کہاں ہیں؟ حسین احمد کون چیز ہے؟ جس کے مکتوبات شایع کئے جائیں؟ یہ عموماً لایعنی باتوں پر مشتمل ہونگے خصوصاً جبکہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اور کم مائیگی کی بناء پر جیلوں اور ریلوں میں لکھے گئے ہیں، کتابوں کے ذخائر کے استمداد سے خالی ہو اور پھر تحریک آزادی کے انہماک نے مختلف اطوار اور احوال کے اندر مبتلا رکھا ہو کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ایسا ذخیرہ عام لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے مکتوبات علیحدہ علیحدہ ہونے میں اور حالت ہے جو کہ کاتب اور مکتوب الیہ کے معاملات خصوصیہ اور وقتی واقعات پر مبنی ہوتی ہے، اور مجموعہ بصورت کتاب کی اور حالت ہے، مگر احباب نے کچھ نہ سنا اور جمع کر کے بغیر دکھائے ہوئے شائع کر دیا، میں اس کو غیر مفید اور ناچیز بلکہ مضر سمجھتا تھا اس لیے میرا منع کرنا اور ان کے زیادہ اصرار کا باعث ہوا، میری کم مائیگی ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی تھی بہر حال جو نہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا، مجھ کو بار بار یہی کہا گیا کہ اس سے لوگوں کو فوائد ہوئے اور ہوں گے واللہ اعلم، اب اگر وہ مفید ہوں تو فمن اللہ اور اگر غیر مفید ہوں تو ننگ اسلاف کرام سے اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے؟ (مکتوبات، ج:۳/ ۲۰۵)

''مجھ ناکارہ و نالائق کے ملفوظات جمع کرنے کا خیال غلط ہے، متقدمین اور اسلاف کرام کے ملفوظات کیا کم ہیں؟ جو ہمارے جیسے ننگ اسلاف کے ملفوظات جمع کئے جائیں اور مینڈکی کے لیے نعل تیار ہوں ہم دنیا کے کتوں سے بجز نفس پرستی، راحت طلبی، نصوص کو خواہشات کے بوتے میں ڈھالنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ (تم میں سے جو شخص نمونہ اور اسوہ بنائے وہ گزرے ہوئے (اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیونکہ جو شخص زندہ ہے ابھی وہ فتنہ سے محفوظ نہیں ہے جبکہ خیر القرون کے لیے یہ فیصلہ ہے تو ہمارے زمانہ کا کیا حال ہوگا؟ لوگ

اسلاف کرام کی کتابوں سے نفع اُٹھاتے ہی نہیں، نہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں ہم جیسے لغو اور بیکار کی کتابوں اور ملفوظات سے نفع اٹھانا سراب سے عطش کے زوال کی امید باندھنا ہے؟ اسلاف کی تصانیف کو شائع کرنا، اوران کی طرف توجہ دلانا، البتہ اضاعت وقت سمجھتا ہوں، پھر اس جگہ حسب ضرورت ذخیرہ کتب بھی نہیں ہے، جو کتابیں میرے پاس ہیں وہ ناکافی ہیں اپنی ناقص یاد اور ناقص سمجھ سے کچھ لکھ دیتا ہوں اُن کو درج ملفوظات کرنا کیا غلطی نہیں ہے؟ (مکتوبات، ج: اول/۲۳۶، ۲۳۷)

ناکارہ اس تحریک کا اٹھانے والا نہ تھا بلکہ محرک مرحوم کا نالائق وناکارہ خادم تھا

''آپ کو جو کچھ معلومات میرے خیال میں ہیں وہ بہت کم ہیں، بہر حال جو کچھ گزرا گزر گیا، درمیان ما و جانا، ماجرائے رفت، رفت

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ الآیۃ ناکارہ اس تحریک کا اُٹھانے والا نہ تھا بلکہ محرک مرحوم کا: لائق وناکارہ خادم تھا، میرا خیال ہے کہ ادائے خدمت میں، میں نے کوتاہی نہیں کی۔

نہ مرتے مرتے محبت سے منہ پھیرا کبھی میں نے
جفائیں سینکڑوں جھیلیں، وفا پر اپنی نازاں ہوں

میں ہمیشہ کوشاں رہا کہ اکابر کی شان میں گستاخی اور سوء ادبی کی نوبت نہ آئے، میرا خیال ہے کہ میں اس میں پوری طرح سے یا بڑے درجہ تک کامیاب رہا۔ واللہ اعلم، والسلام۔ حسین احمد غفرلہ، رجب ۱۳۷۳ھ (مکتوبات، ج:۳/ ۲۰۷)

مجھے نگران اعلیٰ جناب مہتمم صاحب کی نگرانی پر اعتماد رہتا ہے۔

''والا نامہ میں جو امور ذکر فرمائے گئے ہیں، ان کا علم مجھ کو بالکل نہ تھا، چونکہ میں عدیم الفرصت رہتا ہوں، اور اب ضعیف بھی بہت ہو گیا ہوں، اس لیے دارالعلوم کو دیکھنے کی نوبت بالکل نہیں آتی اور نگرانِ اعلیٰ جناب مہتمم صاحب کی نگرانی پر اعتماد رہتا ہے۔''

(مکتوبات، ج:۳/ ۲۲۱)

تاہم کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ کے بہت کچھ نوادر پر نظر ہے

''کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں کئی ہزار کتابیں عمدہ تھیں اُن کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا، اور نہ اب یاد ہے تاہم بہت کچھ نوادر پر نظر ہے۔ والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، دیوبند ۱۳۷۵ھ (مکتوبات، ج:۳/ ۲۲۱)

اطراء مادح سے اجتناب ضروری ہے

شب تاریک، وبیم موج، وگردا بے چنیں
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
والا نامہ ۱۵/ رمضان باعث سرفرازی ہوا، یاد فرمانے کا شکر گزار ہوں، اطراء مادح سے جتناب ضروری ہے۔

یظن الناس بی خیرا وانی
لشر الناس ان لم یعف عنی

اگر ستاریت خداوندی کا ظہور نہ ہوگا تو ہم سیاہ روؤں کا کیا حال ہوگا؟ فللہ الحمد والمنۃ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کو دنیا وآخرت میں مبذول فرماتا رہے، آمین۔ شاید آپ جیسے عنایت فرماؤں کا حسنِ ظن باعث نجات ہوجائے الخ۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ،

بانس کنڈی ضلع کچھار آسام مدرسہ عربیہ ۲۴/ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ (مکتوبات، ج:۳/۲۴۲)

میری ناکارگی ونالائقی سے آپ ناواقف ہیں، میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا عشر عشیر بھی نہیں رکھتا، مخالفوں پر رد کرنے میں الفاظ سخت اور زور دار ہونے چاہئیں، اس ناکارہ ونالائق سے درگزر فرمائیں گے۔

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ نے دلائل السنن والآثار کو مطالعہ کے لیے ماہ رجب میں ارسال فرمایا تھا، مگر میری ناکارگی ونالائقی سے آپ ناواقف ہیں، وہ زمانہ اخیر سال اور انتہائی مصروفیت کا تھا جس میں انتہائی عدیم الفرصتی ہوتی ہے، چنانچہ میں بالکل امتثال حکم نہ کرسکا، اور چونکہ مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور علم حدیث سے بہت زیادہ واقف اور اس کے ماہرین اعلیٰ میں سے ہیں ان کی اجل تصنیفات اس فن میں شائع ہوچکی ہیں، ''اوجز المسالک'' شرح مؤطا امام مالک'' کئی جلدوں میں چھپ کر شائع ہوچکی ہے، شرح شمائل ترمذی ''الکوکب الدری'' مجموعہ تقاریر ترمذی حضرت گنگوہیؒ بتحشیہ اور اس سے پہلے بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد میں پوری امداد تحریری وتخریجی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کے دے کر کتاب مذکور کی تکمیل کرچکے ہیں اس لیے جس قدر اس فن سے اُن کو واقفیت اور اس میں مہارت ہے میں تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں رکھتا اس لیے میں نے ان کی خدمت میں بھیج دینا ضروری اور انفع سمجھا الخ۔

آپ مخالفوں پر رد کرنے میں نہایت نرم الفاظ استعمال کرتے ہیں میرے خیال میں یہ نہ ہونا چاہئے، سب وشتم سے تو بچنا ضروری سمجھتا ہوں لیکن رد کرنے میں الفاظ سخت اور زوردار ہونے چاہئیں۔ امیدوار ہوں کہ تاخیر امتثال کو بنظر عفو دیکھ کر اس ناکارہ نالائق سے درگزر فرمائیں گے۔ والسلام

حسین احمد غفرلہ دیوبند ۲۷/صفر ۷۷ ۱۳ھ

میرے ساتھ، میرے ساتھیوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہوا، اگر ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں تو ہم کو اس میں سے حصہ ضرور ملنا چاہئے غیر مسلموں کے ساتھ محض اشتراک عمل ہے اس کی مثال

''میرے محترم! جو کچھ میرے ساتھ، میرے ساتھیوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہوا وہ ان معاملات کے سامنے جو کہ انبیاء ومرسلین بالخصوص ہمارے آقا علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام کے ساتھ کافروں نے کیا، ایسی نسبت بھی نہیں رکھتا جو ذرہ کو پہاڑ کے سامنے ہوتی ہے، اگر ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں، تو ہم کو اس میں سے حصہ ضرور ملنا چاہئے، وارث کو اگر مورث کے ترکہ میں سے کچھ حصہ ملتا ہے تو وہ اور اس کے احباب خوش ہوتے ہیں یا غیظ وغضب میں آتے ہیں؟۔

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ حصہ مل جائے، اور جس قدر بھی زیادہ حصہ مل جاتا ہے دوستوں کو زیادہ تر خوشی ہوتی ہے، اس لیے مجھ کو آپ کے ان کلمات پر سخت تعجب ہوا، آپ کو تو یہ چاہئے تھا کہ مجھ کو نصیحت فرماتے کہ یہ ورثہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل (سب سے سخت بلائیں اور امتحانات انبیاء علیہم السلام کے لیے ہیں، پھر درجہ بدرجہ اُن کے متبعین اور مشابہت رکھنے والوں کے لیے ہیں) ہرگز دل تنگ اور رنجیدہ نہ ہونا چاہئے، اور شکر کرنا چاہئے آپ الٹے اپنے غیظ وغضب اور رنج وافسوس کا اظہار کرنے لگے اور اس درجہ بڑھ گئے کہ پھانسی تک کے لیے تیاری ظاہر کرنے لگے۔

میرے محترم! میں اس میدان میں دنیا کے لیے نہیں اترا ہوں، میں جہاد بالکفار سمجھ رہا ہوں، اور دین اسلام کے لیے اس لڑائی میں داخل ہوں، غیر مسلموں کے ساتھ محض اشتراک عمل ہے، جس طرح چند مسافر ایک ریل کے ڈبہ میں سوار ہو جاتے ہیں اور دہلی کا ٹکٹ لیتے ہیں، کوئی دہلی میں دین پڑھنے کے لیے جا رہا ہے، کوئی دنیاوی علوم حاصل کرنے کے لیے، کوئی تجارت کے لیے، کوئی دوسرے مقاصد کے لیے، مگر ہر ایک چاہتا ہے کہ یہ گاڑی تیز چلے اور سفر اور اس کی ضروریات میں سب شریک اور کوشاں ہوتے ہیں ہر ایک کا معاملہ عالم القلوب والنیات کے یہاں حسب نیت ہوگا۔ (مکتوبات، ج:۴/۳۲) والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، یکم ذی قعدہ ۱۳۶۲ھ

میں مطلق جاہل ہوں، اگر آپ کے خلاف طبع میں نے کچھ لکھا ہو تو آپ بھی معاف کریں آپ نے تو کچھ بھی میرے خلاف طبع نہیں لکھا اور اگر کوئی بات تھی تو محض اظہار تعجب کے لیے تھی، ناراضی اس میں نہ تھی الخ۔ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، نینی جیل آلہ آباد۔ (مکتوبات، ج:۴/۴۴)

گدھے کا کھایا نہ پاپ نہ پُن، ہم بندگان نفس و شہوات ہیں، آپ بلا تامل میری عرائض پر تنقید اور اعتراض کریں۔

''دو مرتبہ آپ کے مرسلہ امرود الہ آبادی پہنچے، نہایت عمدہ تھے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میرے محترم! آپ خود تنگ کے دست ہیں، کیوں اس قدر خرچ کرتے ہیں، بقول مشہور، ''گدھے کا کھایا نہ پاپ نہ پُن'' ہمارے کھلانے میں آپ کا مال برباد ہوتا ہے اور کوئی ثواب نہیں، اس لیے کہ ہم بندگان نفس و شہوات ہیں، ہمارے کھانے میں سوائے نفسانیت اور شہوت کی زیادتی کے اور کیا فائدہ ہے؟ لہٰذا عرض ہے کہ آئندہ اس قسم کے اسرافات نہ فرمایا کریں، آپ تو اس قسم کے غلط حسن ظن سے بچیں۔

یظن الناس بی خیرا وانی

لشر الناس ان لم یعف عنی

نیز یہاں کتابیں میرے پاس موجود نہیں ہیں، اپنی سمجھ اور حفظ سے لکھتا ہوں اگر پسند نہ آیا کرے تو آپ بلا تامل میری عرائض پر تنقید اور اعتراض کریں جو کچھ سمجھ میں آئے گا عرض کروں گا، ہاں آپ کے الہ آباد میں بڑے بڑے علماء اور محققین ہیں ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ ہے اُن سے آپ علمی تحقیقات میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (مکتوبات، ج:۴/۴۶ر۴۷)

میرے بارے میں آپ ہر تحریر میں ایسی جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں، ہم تو اضع اور انکسار کے الفاظ اپنی زبان سے ''منافقانہ طریق'' پر لکھتے ہیں، جو کچھ آپ نے لکھا ہے کیا یہ سب جھوٹ اور نفاق نہیں ہے؟ نہایت قوی، مجرب عمل، دفع سحر کے لئے مجھے بتادیں

''آپ کو چاہئے کہ جھوٹ بولنا اور جھوٹی مدح سرائی کرنا چھوڑ دیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا احثوا فی فم المداحین التراب بہت تعریفیں اور مدح سرائی کرنے والوں کے منہ میں خاک جھونک دو، ایک شخص نے دوسرے کی تعریف اس کے سامنے کی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کَسَرْتَ ظهر اخیک تو نے اپنے بھائی کی پشت اور کمر توڑ دی ایک دوسرے شخص کو کسی کی تعریف کرتے ہوئے سنا، تو ارشاد فرمایا: کہ کسی کی تعریف اور پاکیزگی اللہ تعالیٰ پر نہ کرو، اگر ضروری ہو تو یہ کہو کہ میرا

گمان ہے کہ فلاں ایسا اور ویسا ہے، یعنی یقینی طور پر کسی کی پاکیزگی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، تمہارا کسی کے متعلق یقینی طور پر مدح سرائی کرنا اللہ تعالیٰ کے اوپر جسارت کرنا ہے، الغرض اسی قسم کی بہت سی حدیثیں مدح سرائی کی ممانعت میں وارد ہیں، مگر آپ ہر تحریر میں ایسی جھوٹی تعریفیں کرتے رہتے ہیں، اس خط میں بھی لکھتے ہیں، علامة المحققین، امام المتقین، حکم العالمین کیا یہ سب جھوٹ نہیں ہے؟ آپ کو کیا معلوم کہ میں کیسا ہوں؟ اور آپ کو میرے عیوب اور بد باطنیاں جبکہ معلوم نہیں بلکہ صرف حسن ظن ہی ہے تو غایت مافی الباب آپ کو مولوی لکھ دینا چاہئے، اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت ہو تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ اور اگر میرا نفس امارہ خبیث ان الفاظ کی وجہ سے تکبر اور غرور میں مبتلا ہو گیا تو میں تو برباد ہوں گا ہی، مگر کیا آپ اس گناہ میں شریک نہ ہوں گے؟ اب اس کی مکافات میں مجھ کو بھی چاہئے کہ میں آپ کو ایسے ہی القاب لکھا کروں، غور کیجئے کہ معاملہ کہاں تک پہونچے گا؟ سورہ نجم میں فرماتے ہیں هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى الله تعالیٰ تم کو خوب جانتا ہے اس وقت سے جب کہ تم کو مٹی سے بنایا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں حمل تھے تو اپنے نفوس کی پاکیزگی مت ظاہر کرو، وہ خوب جانتا ہے اس شخص کو جو کہ پرہیزگار ہو، سورہ نساء میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ کیا تو نہیں دیکھتا اُن لوگوں کو جو کہ اپنی پاکیزگی کا اظہار اور دعوی کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے، میرے محترم! یہ طریقہ غلط ہے اور ہم لوگ بے سوچے سمجھے اس غلط طریقہ پر چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم میں غرور اور تکبر کا مہلک مرض روز افزوں ہو جاتا ہے، ہم تواضع اور انکساری کے الفاظ اپنی زبان سے منافقانہ طریق پر لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ذرہ بے مقدار ہیں ہم عاصی گنہگار ہیں، ہم سب سے بدتر ہیں، ہم ناچیز ہیں، ہم فدوی ہیں ننگ خلائق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مگر ہم کو اگر کوئی شخص جاہل، یا بددین، یا گدھا، یا کتا، یا سور، یا بے ایمان، یا منافق، یا بدمعاش، یا چور، یا جھوٹا وغیرہ کہہ دیتا ہے تو ہمارے غصہ کا پارہ اس قدر چڑھ جاتا ہے کہ مارنے اور مرنے بلکہ اس سے بھی تجاوز کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، کیا یہ سب جھوٹ اور نفاق نہیں؟ اعاذنا اللہ وایاکم عنہا وعن امثالہا۔ (مکتوبات، ج:۳/ ۶۰ تا ۶۲)

مجھ ناکارہ و نالائق کو دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں، نہایت قوی اور مجرب عمل دفع سحر تیر بہدف مجھے بتادیں تو بہت بڑا احسان ہوگا میں خود عامل نہیں ہوں۔

''میرے پاس کوئی ایسا تعویذ نہیں ہے اور نہ میں خود عامل ہوں، کسی مرشد کامل کو تلاش کیجئے اور اس کی ہدایت پر مثل مردہ فی ید الغسال بن کر جد وجہد کیجئے تو ان شاء اللہ صفائی بتدریج حاصل ہوگی۔

دعا کرتا ہوں آپ بھی مجھ ناکارہ و نالائق کو دعوت صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں اگر عامل اس کے پاس

کوئی عمل نہایت قوی اور مجرب سحر کے دور کرنے کا علوی ہو اور اسی طرح سحر کو لوٹائے گا تو مہربانی فرما کر مجھ کو عطا فرمائیں، میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ علیٰ ہذا القیاس آسیب اور جن کو دفع کرنے کا قوی اور نہایت آزمودہ عمل عطا فرمائیں، میں صرف مسلمانوں کو نفع رسائی کے لیے یہ چاہتا ہوں، میں خود عامل نہیں ہوں، میرے پاس بہت سے مصیبت زدہ لوگ آتے ہیں، اگر بہدف ایسا عمل ہر دو کے لیے بتادیں تو بہت بڑا احسان ہوگا، اُن سے سلام بھی عرض کر دیجیے، نیز یہ بھی کہ اگر کسی کے مکان میں کسی نے جادو کی چیزیں دفن کی ہیں یا جادو یا ہانڈی وغیرہ بھیجی ہیں تو اُن کے دور کرنے کا قوی طریقہ کیا ہے؟ دفن کی ہوئی چیز کے معلوم کرنے کا مجرب طریقہ کیا ہے اس کو وہ بتلادیں، بڑا احسان ہوگا، تحریرات پر اپنا اور میرا نام نہ لکھا کریں، احتیاط کے خلاف ہے۔ (مکتوبات، ج:۴/۶۴)

والسلام ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ

یہ آپ کی قدر افزائی ہے جو کہ میرے عیوب اور گناہوں سے عدم اطلاع کی بناء پر ہیں، ہم جیسوں سے بیعت کی درخواست کوئی معنی نہیں رکھتی، میں اپنے نام پر "ننگ اسلاف" حقیقی طور پر لکھتا ہوں صرف رسمی بات نہیں ہے۔

"محترم! مشاغل کی کثرت، طبیعت کی کسل مندی، احباب کی آمد و رفت، اس باعث ہوتی ہے کہ جلد جواب نہ دے سکوں، میں آپ کے جذبہائے محبت کا شکر گزار ہوں، یہ آپ کی قدر افزائی ہے جو کہ میرے عیوب اور گناہوں سے عدم اطلاع اور حسن ظن کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں، الحمد للہ ومنہکہ اس نے پردہ پوشی کر رکھی ہے، وہ ستار العیوب ہے، ورنہ ہم جیسوں سے بیعت کی درخواست کوئی معنی نہیں رکھتی، میں اپنے نام پر "ننگ اسلاف" حقیقی طور پر لکھتا ہوں صرف رسمی بات نہیں ہے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ دوستوں کے ظنون حسنہ کو واقعی جامہ پہنادے جیسا کہ اس کے کرم وجود سے مستبعد نہیں ہے وہ قطرۂ ناچیز کو دریا اور ذرۂ خاک کو پُرنور سرتاپا کرنے والا ہے تو زہے نصیب۔

مگر چوں کہ شرم ز افشاند از خاک
سرد گر بگذارند سر ز افلاک

آپ میرے پاس ہونے کی درخواست فرماتے ہیں مہربان من! میں خود مصیبت میں مبتلا ہوں، اس کی تمنا کس طرح درست ہو سکتی ہے؟ والدین ماجدین آپ کو طلب علم کی اجازت نہیں دیتے، مصیبت میں مبتلا ہونے کی اجازت کس طرح دے سکتے ہیں؟، میں پہلے عریضہ میں عرض کر چکا ہوں کہ کسی متدین صاحب طریقت کو تلاش کیجیے، الٰہ آباد اور اس کے قرب و جوار میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہو سکتی، جب کوئی ایسا شخص ملے تو اسے بیعت کریں، اور خوب جانچ پڑتال کر کے بیعت ہوں فقط سُنی سنائی باتوں پر اور ظن وتخمین اور چکنی چوپڑی باتیں بتانے پر اعتماد نہ کریں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر شے نہ بایدداد دست

اور اگر کوئی قابل اور متدین شیخ طریقت نہ ملے تو اس کے ملنے تک انتظار کریں احکام شرعیہ پر مضبوطی سے قائم رہیں، بیعت ضروری اور فرض نہیں، نجات اخروی اس پر موقوف نہیں۔ (مکتوبات، ج:۳/۷۷)

والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

اس زمانے میں مریدوں کی تعداد زیادہ کرنے کے لیے ایجنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ، میرے جیسا ناکارہ و نالائق، نامراد، سگ دنیا، بندہ شکم، بدنام کنندہ نکوناماں، سے اگر آپ بیعت ہو گئے تو آپ کی راہ ماری گئی، اگر آپ کو میری خرابیاں معلوم ہوتیں تو شاید آپ مجھ سے اس سے زیادہ نفرت کرتے جتنی سور اور کتے سے کرتے ہیں۔ آدمی کی بھلائی و برائی کا پتہ کب چلتا ہے؟

بنے کیوں کر کہ ہے ہر بات اُلٹی
ہم اُلٹے، یار اُلٹا، بات، الٹی

''مخدوما! مریدوں کا زیادہ ہونا، اپنے نام لیوا اور تابعدار زیادہ سے زیادہ بنانا زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہدایت کرنے کی جد جہد عمل میں لانا مرشدان طرق اور اہل بیعت کا عظیم الشان مقصد ہے۔

اور اس زمانے میں تو اس مقصد کے لیے ایجنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں، پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، اور زیادہ تعداد مریدوں کی بنائی جاتی ہے، رجسٹروں میں اُن کے نام درج کئے جاتے ہیں، لہٰذا یہ تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہونی چاہئے کہ آپ اور آپ کے خاندان کے بہت سے مرد و عورت میرے مرید ہو جائیں، کم سے کم یہ تو فائدہ ضروری ہوگا کہ ہر طرف آپ لوگ میری تعریفیں کریں گے میرا نام مشہور اور روشن ہوگا، مجھ کو آمدنی ہوگی، اچھا اچھا کھانا وغیرہ ملے گا، نذر نیاز آئے گی، پھر میں کیوں انکار کر رہا ہوں؟ یہ آپ کی محبت ہی کی وجہ سے ہے، اسی وجہ سے اپنا نقصان کرتا ہوں، آپ اگر کسی کامل مرشد سے بیعت ہوں گے تو آپ کی وہ سچی رہنمائی کرے گا اور آپ کے دین و دنیا کی بھلائی ہوگی، اس سے آپ کو وہ فوائد حاصل ہوں گے جو کہ مقصود اعظم ہیں، میرے جیسا ناکارہ و نالائق، نامراد سگ دنیا، بندۂ شکم، بدنام کنندۂ نکونام ہے، اگر آپ بیعت ہو گئے تو اگر چہ میرا فائدہ ہی فائدہ ہے مگر آپ کی راہ ماری گئی آپ کے لیے ہر طرح سے نقصان ہی نقصان کا سامنا ہے، اس لیے میں آپ کے فائدہ کے لیے کہتا ہوں کہ آپ کسی متدین، واقف شریعت و طریقت، کامل بزرگ، کو تلاش کریں اور اس سے بیعت ہوں۔

آپ کہتے ہیں کہ میں نے سب کو دیکھ لیا ہے، کسی سے میری طبیعت بیعت ہونے کی نہیں چاہتی ہے

تو میرے محترم! آپ نے جن کو دیکھا، جن کی جانچ پڑتال کی، جن سے خط وکتابت ہوئی، انھیں میں تو خداوند کریم کے بندے منحصر نہیں ہیں، آپ تلاش کرتے رہیں ممکن ہے کوئی مرد خدا مل جائے اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری مشہور مقولہ ہے ممکن ہے کہ آپ کی پرکھ غلط ہو۔

پھر یہ عجیب بات آپ نے کہی کہ کسی سے بیعت ہونے کی طبیعت نہیں ہوئی تو اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ آپ کی طبیعت پر مدار ہے، جس کو آپ کی طبیعت بزرگ مانے، وہ بزرگ ہے، اور جس کو نہ مانے وہ بزرگ نہیں ہے، ماشاءاللہ کیا خوب طریقہ ہے؟

اللہ تعالیٰ تو صحابۂ کرام کو فرماتا ہے: عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (بسا اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرو گے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہوگی اور بسا اوقات تم کسی چیز سے محبت رکھو گے اور وہ تمہارے لیے شر ہوگی، اور آپ اپنی طبیعت کو برے بھلے کے اندازہ کے لیے ترازو بناتے ہیں؟۔

حضور! آدمی کی بھلائی بُرائی صرف سننے، دیکھنے، خط وکتابت تقریر وتحریر سے، نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اس کے پاس رہنے، معاملات کے غائرانہ طریقہ پر جانچنے، اس کے ساتھ معاملات کرنے، اس کے ساتھ سفر وحضر میں رہنے سے مدتوں میں پتہ چلتا ہے کہ ع خبث نفس نہ گردد بسالہا معلوم۔

امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) اہل اللہ سے خالی نہیں رہ سکتی، ہاں کم وبیش کا زمانہ اول وآخر میں فرق ضرور ہے۔

میری نجاست وخباثت نالائقی اور برائی سے آپ واقف نہیں ہیں البتہ میں کسی قدر واقف ہوں اگر آپ کو میری خرابیاں معلوم ہوتیں تو شاید آپ مجھ سے اس سے زیادہ نفرت کرتے جتنی کہ سور اور کتے سے کرتے ہیں۔

آپ میری چکنی چوپڑی باتوں کے دھوکے میں پڑ گئے، حالانکہ آپ سے مجھ کو مصاحبت اور مجالست کی کبھی نوبت نہیں آئی، دور دور سے آپ نے کبھی مجھ کو دیکھا ہے، مجھ کو تو آپ کی صورت تک یاد نہیں ہے، بہرحال میں نے جو کچھ آپ کو لکھا ہے وہ محض آپ کی خیر خواہی کے لیے لکھا ہے تاکہ جس دن يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ میں میری وہ بُرائیاں جن پر آج فضل وکرم خداوند سے پردہ ڈال رکھا ہے اور آپ جیسے عنایت فرما حضرات ناواقفیت کی وجہ سے حسن ظن کیے ہوئے ہیں اگر معاذ اللہ عدل خداوندی نے پردہ چاک کر دیا تو اس دن اُن کو دیکھ کر پشیمان نہ ہوں اور یہ نہ کہنے لگیں يَا لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (اے کاش! میں فلاں کو دوست نہ بناتا)

میرے محترم! میں نے حقیقت الحال واضح کر دی، آئندہ آپ جانیں اور آپ کا کام، میں یہ بھی واضح

کر دینا چاہتا ہوں کہ بیعت ہونا اسلام میں فرض نہیں ہے، اور اس پر نجات موقوف نہیں ہے کروڑوں مسلمان بیعت نہیں ہوئے کیا اُن کی بارگاہ الٰہی سے مغفرت نہ ہوگی؟ اس لیے آپ کو جلدی نہ کرنی چاہیے، کامل شریعت وطریقت کی تلاش میں رہیے، ہاتھ آجائے اور حسب شروط پائیں تو اس سے بیعت ہو جانا، ورنہ آقائے نامدار جناب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں سب کچھ ہے اسی میں مصروف رہیے جس قدر ممکن ہو اس کی تلاوت کیجیے آخرت میں اس کی شفاعت اور دنیا میں اس کی برکت نہایت بلند اور موثر ہے اللہ تعالیٰ اس کی برکتوں سے آپ کو اور ہم کو اور سب مسلمانوں کو نوازے آمین۔ والسلام۔ (مکتوبات، ج:۳/۷۷،۷۹)

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ،

ہم ناکارے کسی خدمت کے لائق نہیں ہیں

''ہم ناکارے کسی خدمت کے لائق نہیں ہیں، بجز دُعا اور کیا کر سکتے ہیں؟۔ والسلام

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۷/ رجب ۱۳۶۳ھ

''اس زمانہ کے قطب الارشاد اور مجدد کو میں نہیں جانتا، مجھ جیسا ناکارہ اور نالائق کس طرح جان سکتا ہے؟ ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ،

سلہٹ ۸/ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ

''پھر جناب شاہ صاحب کو آپ لوگوں نے غلطی میں مبتلا کر دیا ہے، وہ بیچارے مجھ کو کیا جانیں، میں خود سخت نالائق اور ناکارہ ہوں، اُن کو آپ وہاں کسی بزرگ سے مرید کرا دیجیے یا خود مرید کر لیجیے میں تو خود نااہل و ناکارہ ہوں۔ (مکتوبات، ج:۳/۱۱۸)

''اجازت کیلئے الہام اور کشف ضروری نہیں ہے، ممکن ہے بڑوں میں یہ پایا گیا ہو، مگر ہم جیسے ناکارے اور نالائق ایسی قابلیت کہاں رکھتے ہیں؟ (مکتوبات، ج:۳/۱۵۲)

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ،

میں تو ہر طرح گناہوں اور تقصیرات میں ملوث ہوں، سخت ناکارہ و نالائق ہوں یا لوگ میرے عیوب بدکاریوں سے ناواقف ہیں، انتہائی سخت عذاب کا مستحق ہوں اگر لوگوں کو میری خباثتیں اور نجاستیں معلوم ہو جائیں تو مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگیں جتنی کہ سور اور کتے سے نہیں کرتے۔

''میں بدنصیب تو مثل دیگر کمالات روحانیہ باطنیہ کشف و کرامات سے بالکل

خالی ہوں میں تو ہرگز ہرگز اس قابل نہیں ہوں کہ میں کسی کو مرید کروں اور کوئی میرے پاس اس کی خواہش لے کر آئے مجھ کو کیوں حضرت قدس سرہ العزیز نے اجازت عطا فرمائی وہ خود جانتے ہوں گے مگر میں تو ہر طرح گنا ہوں اور تقصیرات میں ملوث ہوں، سخت ناکارہ ونالائق ہوں لوگ مجھ سے حسن ظن رکھ کر میرے پاس آتے ہیں میرے عیوب بدکاریوں سے ناواقف ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل محض سے میری مغفرت نہ فرمائے تو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں انتہائی اور سخت عذاب کا مستحق ہوں، خداوند کریم کی پردہ پوشی کام کر رہی ہے، آپ بھائیوں کی دعاء خیر کا سخت محتاج ہوں، اگر لوگوں کو میری خباثتیں اور نجاستیں معلوم ہو جائیں تو مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگیں جتنی کہ سور اور کتے سے نہیں کرتے۔ والسلام ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، دیو بند ۲۹/ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ۔ (مکتوبات، ج:۴/۱۵۶)

آپ کے حسن ظن نے میرے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے، میری ہلاکت میں کوئی شک نہیں

''محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے محبت بھرے الفاظ میرے لیے بہت ہی زیادہ باعث ہمت افزائی ہیں کاش! اللہ تعالیٰ آپ کے حسن ظن کو جامۂ واقعیت پہنا دے وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز۔

میرے محترم! آپ کے حسن ظن نے میرے عیوب پر پردہ ڈالدیا ہے وہ آپ کو نظر نہیں آتے علام الغیوب بخوبی جانتا ہے، اگر اس نے اپنا فضل وکرم نہ فرمایا تو مجھ کو نجات کی بھی صورت نظر نہیں آتی، وہ ہی کریم کارساز آپ کا اور ہمارا والی اور منعم ہے۔ اور اسی کے رحم اور جود پر سہارا ہے، ہر دو جہاں میں اگر اس کی مہر اور عنایت ہے تو بیڑا پار ہے، ورنہ ہلاکت میں کوئی شک نہیں۔

سیّاں انکھیاں بھریاں بیری ملک جہاں
ملک جہاں کی اک مہر کی لاکھوں کریں سلام

والسلام

ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، ۷/ ذی الحجہ ۶۳ھ۔ (مکتوبات، ج:۴/۱۶۷)

اگر چہ اپنی قابلیت کچھ نہیں ہے مگر...... نالائق وجاہل ونا کام ہوں، مگر آپ حضرات کا ہوں

''اگر چہ اپنی قابلیت کچھ نہیں ہے مگر بزرگوں کی جوتیوں کے سہارے پر ان کا روبار کے انجام کا ارادہ ہے اس لیے عالی جناب کی توجہ اور ہمت کی اشد ضرورت ہے، مولانا محمد صدیق صاحب کی خدمت میں بعد از سلام مسنون یہی خواستگاری ہے،

نالائق و جاہل و ناکام ہوں مگر آپ ہی حضرات کا ہوں۔ (مکتوبات، ج:۴/ ۲۱۷)

اور جب ایسے ایسے بڑوں کا یہ حال ہے تو ہم جیسے گنہگار دنیا کے کتے کس شمار میں ہو سکتے ہیں؟

''اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہو اس پر انسان کو خوشی سے راضی رہنا چاہئے، ورنہ بہ مجبوری راضی ہونا پڑے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تو انبیاء علیہم السلام کو سر جھکانا پڑتا ہے اور بغیر ماننے کے چارہ نہیں ہوتا، اولیاء اللہ کو کون پوچھتا ہے؟، اور جب ایسے ایسے بڑوں کا یہ حال ہے تو ہم جیسے گنہگار دنیا کے کتے کس شمار میں ہو سکتے ہیں؟۔

مگر واقعہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے جبکہ بڑوں کی پیش نہیں جاتی تو ہم جیسے نالائق لوگوں کی بات کس طرح چل سکتی ہے؟ (مکتوبات، ج:۴/ ۲۶۸)

میری عمر کا بہت بڑا حصہ اور یہ ایام محض لہولعب، غفلتوں اور معاصی میں گزر رہے ہیں، مگر میں ایسا سگ دنیا ہوں جس کے لیے ۵۰۰ روپئے کے اس مقدار کو بھی کافی آپ بزرگ نہیں قرار دیتے

''محترم! میری علالت غیر معمولی نہیں ہے خصوصاً میرے جیسے شخص کے لیے جس نے عمر کا بہت بڑا حصہ گزار لیا ہے میں اس وقت ۸۱ واں سال عمر کا گزار رہا ہوں اگرچہ یہ ایام محض لہولعب غفلتوں اور معاصی وغیرہ میں گزر رہے ہیں۔

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمت دیں مسلمانی نہم

آپ نے جو تحفہ ارسال فرمایا ہے نہایت عظیم الشان احسان ہے مگر میرے محترم! آپ کو معلوم ہے کہ دار العلوم سے مجھ کو پانچ سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے، اس لیے تمام ضروریات کا پورا ہو جانا اور کسی قسم کی تنگ دستی پیش نہ آنا ضروری ہے۔

اتنی بڑی تنخواہ ہمارے بزرگوں اور اساتذہ کو کبھی نہیں ملتی تھی مگر میں ایسا سگ دنیا ہوں جس کے لیے اس مقدار کو بھی کافی آپ بزرگ نہیں قرار دیتے، بہر حال انتہائی شکر گزاری کے ساتھ آپ کا یہ معزز تحفہ قبول کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں آپ کا دینی اور دنیوی ہر قسم کا مقصد پورا فرمائے اور اپنی رضا اور خوشنودی سے نوازے۔ آمین ننگ اسلاف، حسین احمد غفرلہ، (مکتوبات، ج:۴/ ۲۸۲)

باقی رہا یہ امر کہ حسین احمد کی وجہ سے مدرسہ کے انعدام کا خطرہ ہے، تو حسین احمد صرف ایک نوکر ہے، جس کو اگر ایسی صورت میں یہ ذمہ دار حضرات ایسے خطرناک گنہگار شخص کو علیحدہ کر کے مدرسہ کو نہیں بچائیں گے تو......

''جو قصہ آپ سے خانقاہ کے طالب علم نے دار العلوم دیوبند کے متعلق بیان

کیا وہ اس کی نادانی ہے، اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو اس نادان کو خبر نہیں کہ دارالعلوم دیوبند پچاس برس سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا ہے، آج اس کی عمر سڑسٹھواں سال گزر رہا ہے، حضرت نانوتوی کے ارشاد سے سترہ سال زیادہ گزر چکے ہیں، خدا کے فضل سے ابھی تک مدرسہ نہایت آب وتاب سے زندہ ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ حسین احمد کی وجہ سے مدرسہ کے انعدام کا خطرہ ہے تو حسین احمد صرف ایک نوکر ہے، جس کو مہتمم، ممبران مدرسہ، سرپرست، سب کے سب علیحدہ کر سکتے ہیں، مدرسہ کا بچانا ان لوگوں کا اولین فرض ہے، اگر حسین احمد کے کسی فعل کی بناء پر مدرسہ خطرہ میں ہو تو اس پر فرض ہے کہ حسین احمد کو کان پکڑ کر ذلت اور رسوائی کے ساتھ نکال دیں، ان لوگوں کی ذمہ داری ہے، قیامت کو یہ سب جواب دہ ہوں گے، یہ سب حضرات اجتماعاً یا انفراداً کیوں نہیں حسین احمد کو علیحدہ کر دیتے؟ اگر ایسی صورت میں یہ ذمہ دار حضرات ایسے خطرناک گنہگار شخص کو علیحدہ کر کے مدرسہ کو نہ بچائیں گے تو یہی حضرات مدرسہ کے بگڑنے اور فنا ہونے کے باعث ہوں گے جو کچھ ذمہ داری ہوتی ہے وہ آقا پر آتی ہے ملازم پر نہیں آتی، آخر ممبر، سرپرست، مہتمم کس کام کے لیے ہیں؟۔

(مکتوبات، ج:۳/۲۸۹)

میرے خلاف کیا کیا نہیں کیا گیا؟ اور اب بھی ہو رہے ہیں، ان حضرات ودیگر مدرسین اور اساتذہ کرام کا احترام مثل اپنے اساتذہ کے کرتا ہوں۔ مگر میں اس "شرف نسبی" کو سراہنا غلط سمجھتا ہوں، دوسرے حضرات مدرسین وملازمین کو حقارت سے دیکھنا وغیرہ رذالت وسفاہت دیکھتا ہوں، میں کیا ان وجوہ کی بناء پر اپنی فوقیت دیکھ کر کارکنان دارالعلوم سے عدم مساوات کا دعویٰ کرنا درست سمجھتا ہوں؟

مجھ کو ہی دیکھئے! میرے خلاف کیا کیا نہیں کیا گیا اور اب بھی ہو رہا ہے، مجھ کو اگر دنیا اور مال کی فریفتگی ہوتی یا اب ہو تو آج میں کم از کم سات آٹھ سو روپے ماہوار پاتا ہوں، مجھ پر صدارت تدریس اور پرنسپلی کے عہدے مدارس عالیہ سلہٹ اور کلکتہ ڈھاکہ وغیرہ میں پیش کیے گئے اولین تنخواہ پانچ سو روپے پیش کی گئی، اور پچیس روپے کا اضافہ سالانہ تجویز کیا گیا، مگر میں یہاں پڑا ہوا ہوں۔

مولانا مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اگر عمر کا لحاظ کروں تو جس طرح میں ان حضرات سے پیش آتا ہوں نہ پیش آؤں میں ان حضرات ودیگر مدرسین اور اساتذہ کا احترام مثل اپنے اساتذہ کے کرتا ہوں، بحمد اللہ مجھ کو اللہ نے سادات حسینیہ میں پیدا کیا میرا آبائی خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے میرے خاندان کے لوگ اب تک پیری مریدی کرتے ہیں مگر میں اس شرف نسبی کو سراہنا غلط سمجھتا ہوں دوسرے حضرات مدرسین وملازمین کو حقارت سے دیکھنا یا ان کی برابری کا دعویٰ کرنا یا ان سے تعظیم چاہنا یا ان کی گرفتوں پر چیں بجبیں ہونا، رذالت

وسفاہت دیکھتا ہوں مجھ کو بحمد اللہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے یہاں کی گوشہ نشینی نصیب ہوئی، تعلیم وتلقین ان سے حاصل کی، قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد قدس سرہ العزیز کے در کی خاک روبی نصیب ہوئی، انہوں نے اپنے دست مبارک سے میرے سر پر عمامہ باندھ کر فرمایا یہ دستار خلافت ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز کی خدمت گذاری اور ان کی عنایات نصیب ہو مگر میں کہاں ان وجوہ کی بناء پر اپنی فوقیت دیکھ کر کارکنان دار العلوم سے عدم مساوات کا دعوی کرنا درست سمجھ سکتا ہوں؟ اور کیا ایسی صورت حال میں خدمات اسلامیہ انجام دے سکتا ہوں؟ اور کیا یہ امر مجھ کو رضوان باری عز وجل کے لئے اہل بنا سکتا ہے؟ مجھ کو بفضلہ تعالی بارگاہ نبوت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی دریوزہ گری اور حاضری سالہا سال تک نصیب ہوئی جس سے بہت سے بلکہ جملہ اراکین خدام دار العلوم بظاہر محروم ہیں مگر کیا مجھ کو زیبا ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی طالب علم سے بھی افضل واعلیٰ سمجھوں؟ اور ایسے معاملہ کا ان سے خواستگار رہوں؟، میں جانتا ہوں کہ یہ امور کیسے ہی عظیم الشان نظر خلق میں شمار کئے جاتے ہیں مگر عند اللہ اعتبار محض اس کی رضا کا ہے اور وہ بے نیاز ہے اور میں ہر وقت اس کے فضل وکرم (۲۱) خوشنودی کا سخت محتاج ہوں۔ (مکتوبات ج ۴ ص ۲۹۲، ۲۹۳)

میرے عزیزو! مولانا تجربہ کار، ذی علم پرہیز گار رہاں کے نشیب وفراز سے واقف تم سبھوں کے بڑے اور ہمارے خواجہ تاش ہیں ہم میں اور ان میں قدرے سیاسیات میں اختلاف ہے مگر اور وجوہ سے وہ مجھ سے بالا تر ہیں ان کی بات مانو، اور مشورہ سے اتفاق واتحاد سے کام کرو، میں ان کو کہہ آیا ہوں ان شاء اللہ وہ تم سبھوں کی مشفقانہ رہنمائی کریں گے۔ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ۔ (مکتوبات ج ۴ ص ۲۹۵) والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۶ / جمادی الاول ۱۳۶۰ھ

میرے محترم! ہم تو ایسی سب وشتم کے عادی ہو گئے ہیں سن کر کچھ تغیر نہیں ہوتا۔

رنج کا عادی ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے میں علحدہ ہوا ہوں ہر قسم کے سب وشتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوا ہوں، وہ کون سے الفاظ اور معاملات ہیں جو نہیں کئے گئے؟ نیز موصوف صاحب تو جب بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے ہی کیا کمی کر رہے ہیں؟ (مکتوبات ج ۳ ص ۱۳۸)

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.

شیخ الاسلام

ایک مثالی شخصیت

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا ایک ایسا مرکز بنا جس نے چہار سمتوں میں اپنے کاموں اور خدمات سے دنیا کو یہ باور کرایا کہ وہ دین کا ایک مضبوط قلعہ ہے اور جن بنیادوں پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا وہ لگ بھگ ڈیڑھ سو سال سے انہی کی بنیادوں پر قائم ہے اور یقین ہے کہ وہ تاقیامت اسی طرح باقی اور جاری رہے گا۔

اسی مرکز علم میں تعلیم کی سعادت میرا حصہ بنی دینیات کی تعلیم سے لے کر انتہائی تعلیم تک دارالعلوم دیوبند کی درسگاہیں، دارالعلوم کے اساتذہ، دارالعلوم کے در و دیوار زندگی کا حصہ بن گئے اور دارالعلوم کا مزاج و ذوق اس طرح ذہن پر غالب رہا کہ یہاں کی شخصیات اور یہاں کے افراد سے ذہنی قربت ہر لمحہ اور ہر وقت محسوس ہوئی جن اکابر دیوبند کا شعور کے عالم سے لے کر اس وقت تک خوب تذکرہ سنا اور جن کے حالات زندگی سامنے آتے رہے ان میں اکابر کا ایک طبقہ وہ ہے جنھیں نہ ہم نے دیکھا اور نہ جن کا زمانہ پایا اور ایک طبقہ وہ ہے جن کو قریب سے دیکھنے کے مواقع بار بار حاصل ہوئے کچھ سے قربت رہی اور کچھ کی عنایتیں اور شفقتیں زندگی کا حصہ بنیں۔ اس زمانہ میں جن لوگوں کا نام دارالعلوم کے اندر اور دارالعلوم کے باہر گونجتا اور گردش کرتا تھا ان میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا

یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندیؒ، حضرت مولانا عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امام المنطق والفلسفہ حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے نام شامل ہیں، جن کی حیات وخدمات کے اتنے منور اور روشن گوشے ہیں جن سے آنکھیں چکاچوند ہوئی جاتی ہیں اور دل ودماغ عقیدتوں سے لبریز ہوتا ہے۔

یہاں تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا مقصود ہے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد، نامور عالم، جنگ آزادی کے عظیم مجاہد، آزاد ہندوستان کے ممتاز قائد، اخلاص ووفا کا پیکر، جرأت وہمت کے کوہ گراں، صاف گوئی اور صاف بیانی کا مجسمہ، عاجزی وخاکساری کا نمونہ کل ملا کر یہ کہنا چاہیے کہ وہ مثالی انسان تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دین ومذہب اور قوم وملت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بیعت وارشاد اور سلوک وتصوف کی راہوں پر بھی ان کے تابندہ نقوش ثبت ہیں۔ دیکھا جائے تو بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ ایک وقت میں اتنی صلاحیتیں اور کمالات ودیعت فرماتے ہیں، ورنہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کسی ایک میدان کا شہسوار ہے تو دوسرے میدان میں اس کی کوئی شناخت نہیں، کوئی علم کے اعتبار سے متعارف ہے تو کوئی تقویٰ وطہارت کے اعتبار سے پہچانا جاتا ہے کسی کو لوگ اس بنیاد پر جانتے ہیں کہ انھوں نے جرأت وعزیمت کے کارنامے انجام دیئے اور کوئی اس لیے شہرت پا گیا کہ اس نے قید واسیری کی سختیاں برداشت کیں، لیکن آخر لمحہ تک ظلم کو ظلم ہی کہا ظالم کی زیادتیاں انھیں اس پر مجبور نہیں کر سکیں کہ وہ معافی طلب کریں یا اپنی جان بچانے کے لیے حاکم کے حکم یا مشورے کو خاطر میں لائیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر کراچی میں مقدمہ چلا جج کے سامنے آپ نے جس بہادری کے ساتھ بیان دیا اور جس صاف گوئی اور صاف بیانی کا ثبوت دیا پھر جیل کی سختیاں برداشت کیں، سیاسی گتھیاں سلجھائیں جلتے موضوعات پر اپنی سیاسی اور دینی بصیرت کا مظاہرہ کیا پھر یہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا کہ انھوں نے ہزاروں اسفار کیے مسلمانوں کو متحد رکھنے اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے جو جدوجہد اور انتھک محنتیں کیں وہ سب ان کی زریں زندگی کے جاذب نظر عنوانات ہیں۔ درس وتدریس میں مشغول انسان دوسرے کاموں کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال پاتا لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس انتہائی مشغولیت کے عالم میں بھی ثابت قدمی اور فعالیت کا ثبوت دیا اس کا بیان آج کی نسل کو عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن سچائی یہی ہے کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ لگن کے پکے اور اپنے مختلف امور کو انجام دینے میں اتنے مستعد تھے کہ یہ سب کچھ ان کے لیے نہایت آسان اور سہل تھا۔ وہ مثالی انسان اور شخصیت تھے اور بلاشبہ

پچھلی تاریخ کے بہت سے گوشے ان کی زندگی سے اس طرح وابستہ ہو گئے تھے کہ ان گوشوں کو ان کی ذات سے جدا کرنا ناممکن تھا۔ جو شخص بھی ان کا ذکرِ خیر کرے لازمی طور پر وہ تمام گوشوں پر نظر رکھے گا اور کسی گوشے کو چھوڑ کر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ کے ممتاز ترین شاگردوں کی فہرست اچھی خاصی ہے اور پھر یہ فہرست اس لیے بھی ممتاز ہے کہ جن صاحبان علم وفضل کے نام اس فہرست میں درج ہیں وہ خود ایک زمانہ اور ایک دور تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ دار العلوم دیو بند کے سب سے پہلے طالب علم تھے جنھوں نے انار کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ملا محمود کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اس طرح استاذ بھی محمود اور شاگرد بھی محمود یہ سلسلہ حضرت شیخ الہندؒ سے جاری ہوا اور ان کے نامور محمود شاگرد دنیائے علم کو میسر ہوئے حضرت شیخ الاسلام کا شمار بھی ان شخصیتوں میں ہوتا ہے جو خود تاریخ بناتے، تاریخ لکھتے اور تاریخ بن جاتے ہیں۔ اور جب تاریخ کا ذکر ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ تمام ہی گوشوں اور پہلوؤں کو سمیٹنا پڑتا ہے، جس کے لیے وقت بھی درکار ہے اور فرصت بھی------ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ کی مجلسوں میں حضرت شیخ الاسلام کا ذکر کافی تھا اور کوئی مجلس ہی شاید ایسی ہوتی ہو کہ جس میں اپنے محبوب استاذ کا تذکرہ نہ کرتے ہوں ان کی زبان پر شیخ الاسلام کی زندگی کے مختلف واقعات، مختلف ادوار جاری رہتے وہ بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اپنے استاذ گرامی کا نام لیا کرتے تھے، اور واقعات بیان کرتے تھے ان کے قلم اور زبان سے لکھے اور ادا کئے گئے حالات آج بھی ذہن میں تازہ اور باقی ہیں۔ شیخ الاسلام کی شخصیت کا نہ تو احاطہ مقصود ہے اور نہ ہی میرا قلم اس قابل ہے کہ ان کی خدماتِ جلیلہ کا حق ادا کیا جا سکے۔ برادرم مولانا اعجاز عرفی قاسمی کا اصرار اور اخلاص اس طرح پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہتا ہے کہ انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں مضمون کا حق ادا کرنے کا وقت نہیں یہ چند سطور اس بزم میں شرکت کی سعادت تصور کرتے ہوئے پیش خدمت ہیں۔ ■

مولانا حسین احمد مدنی کی

دینی وفکری بصیرت کے چند اہم نقوش

مولانا وارث مظہری

مدیر: ترجمان دار العلوم دیوبند

مولانا حسین احمد مدنی دور جدید کی ان چند اہم شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہندوستان کی دینی وعلمی اور سیاسی فضا پر اپنی شخصیت اور فکر کے نہایت گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ مولانا کی شخصیت کا امتیاز یہ ہے کہ مدرسے کے ماحول میں رہ کر بھی موجودہ دور کی سیاسی وسماجی نزاکتوں، پیچیدگیوں اور مسائل ومشکلات پر ان کی وسیع وعمیق نظر تھی اور وہ دور جدید کے تغیر پذیر سماج کے مطالبات کو سمجھتے اور اس کو تسلیم کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی فکر مجتہدانہ تھی، مقلدانہ نہ تھی۔ اس باب میں معاصر علما اور دینی شخصیات کے درمیان مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ کوئی بھی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی۔ خواہ علمی ودینی سطح پر ان کی خدمات کا دائرہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔

مولانا مدنی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں سیاسی سماجی انتشار اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور دوسری طرف عوامی سطح پر بے دینی پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا مدنی نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنا نشانہ بناتے ہوئے احسان یا تصوف کے حوالے سے عوام کا عملی رشتہ دین کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ اس وقت برصغیر کے تینوں ممالک: ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ان کے تلامذہ ومسترشدین کے قائم کردہ ادارے، جماعتیں اور تحریکات دین کی دعوت وتجدید کے عمل میں شب وروز کوشاں ہیں۔ دوسری طرف سیاست کے حوالے سے ان کے فکر وعمل کا مرکز ومحور ایک سطح پر ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد دیکھنا تھا اور دوسری

سطح پر مسلمانوں کے سیاسی واجتماعی وجود کو اس ملک میں قائم و مستحکم کرنے کی جد و جہد اور منصوبہ بندی کرنا۔

معاصر علما میں یہ مولانا ہی کی ذات گرامی تھی جو اللہ کی توفیق سے اس حقیقت کے ادراک میں کامیاب رہی کہ موجودہ دور میں قوموں کی تشکیل مذہب کے بجائے وطن کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اپنے اس واضح نقطہ نظر کی بنیاد پر مولانا مدنی دوسرے اصحاب علم اور دینی جماعتوں کے سربراہوں کی طرح کسی قسم کی تضاد پسندی اور تناقض فکر paradox کا شکار نہیں ہوئے اور آنے والے زمانے نے ان کے نقطہ نظر پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

آج مسلمانوں کی اکثریت اسی نظریے میں یقین رکھتی ہے۔ بصورت دیگر دنیا کے مختلف ملکوں میں بسنے والی چالیس فی صد مسلم اقلیت جس کی بہت بڑی تعداد ان غیر اسلامی ممالک کی شہریت اختیار کر چکی ہے، اس کے پاس اس کا کوئی نظریاتی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ خود پاکستان کے دوقومی نظریے کی بنیاد بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی ڈھ کر رہ گئی۔

حضرت مولانا مدنی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی عالمانہ جرأت و بے باکی ہے۔ اس کی مثال بھی فی زمانہ عنقا نظر آتی ہے۔ متحدہ قومیت کے ان کے اٹل موقف کے تعلق سے مخالفین کی بہت بڑی تعداد جن میں مولانا ابوالاعلی مودودی اور اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال جیسی شخصیات شامل تھیں، انہیں ان کے موقف سے سر مو ہٹا نہ سکیں۔

حضرت مولانا مدنی کے اس موقف نے دیوبند کی نظریاتی اعتدال و توازن نیز دیوبند کے حوالے سے اسلام کی شمولی فکر کو دنیا کے علمی و سیاسی حلقوں میں عام کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے سیاسی وجود کو اس سے تقویت حاصل ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اور علامہ اقبال کے ہم نواؤں میں سے جو لوگ بھی ہندوستان جیسے ملکوں میں مولانا مدنی کے اس موقف کے خلاف ہیں وہ ایک قسم کے فکری نفاق اور عملی دوہرے پن کے شکار ہیں۔

مولانا مدنی کی دینی و سیاسی بصیرت کے اور بھی اہم نقوش ہیں۔ جو عام نگاہوں سے مخفی ہیں۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا حسین احمد مدنی مغلیہ خاندان کے اہم بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کی اس سیاسی پالیسی کو جو اس نے عام ہندو عوام کے دلوں کو جیتنے اور انہیں مسلم حکومت سے قریب کرنے کے لیے اختیار کی تھی، نہایت ستائش کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کا یہ دوٹوک خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کو برہمن طبقے کی اس چال اور سازش کے توڑ کے لیے اقدامات کی توفیق نہ ہوئی جو اس نے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت و منافرت کی فضا قائم کرنے کے لیے کی تھی۔ یہ توفیق باضابطہ طور پر اکبر کو حاصل ہوئی۔ مولانا مدنی کے بقول محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہوا اور شنکر آچاریہ نے کوشش کی کہ ''عام مذہب ہند کو بدھ مذہب سے نکال کر برہمنی'' بنا دیا جائے۔ بدھ حکومتوں کی کمزوری کی بنا پر جو کہ

افغانستان، بلوچستان، سندھ، لاہور سے فنا کردی گئی تھی اور وسط ہند کے بھی بودھ رجواڑے محمود غزنوی کے پے در پے حملوں سے کمزور ہو گئے تھے۔ شنکر آچاریہ کو عوام پر زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ''برہمن جن کو بدھوں نے تقریباً دفن کر دیا تھا''، اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پس منظر میں وہ اکبر کی تجدد پسندی کو ستائش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ اکبر'' کو نفس دین میں کچھ غلطیاں کرنے والا'' تصور کرتے ہیں تاہم اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ اکبر کے اس قبیل کے اقدامات سے بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے۔ ان کا اصل اقتباس یہ ہے:

''پادشاہان اسلام نے اولاً اس طرف (برہمنوں کی ہندو مسلم منافرت کی کوششوں کا سد باب تاکہ اسلام بین مذہبی اختلاط اور ہم آہنگی کے ماحول میں فروغ پا سکے) توجہ ہی نہیں کی۔ بلکہ وہ تمام باتوں کا قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ مگر شاہان مغلیہ کو ضرور اس طرف التفات ہوا، خصوصاً اکبر نے اس خیال اور عقیدے کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا اور اگر اس جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی اور اسلام کے دل دادہ آج ہندوستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا بلکہ عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ مگر ادھر تو اکبر نے نفس دین اسلام میں کچھ غلطیاں کیں جن سے مسلم طبقہ میں اس سے بدظنی ہوئی اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے، ادھر برہمنوں کے غیظ و غضب میں اپنی ناکامی دیکھ کر اشتعال پیدا ہوا''۔ (مکتوبا شیخ الاسلام مکتوب:63 ص،178-170)

ہندوستان کے اکابر علما میں مولانا آزاد کے بعد یہ مولانا مدنی کی ہی ذات گرامی ہے جس نے ہندو مسلم اتحاد پر خالص مذہبی حیثیت سے اپنی مجتہدانہ فکر کی روشنی میں پوری شدت کیساتھ زور دیا اور اسے اسلام اور ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کا لازمی تقاضا تصور کیا۔ گویا آج ہندوں کے ساتھ مکالمے اور ان کے ساتھ بہتر تعلقات کی تشکیل پر جو بحث و گفتگو ہو رہی ہے، اس کی نظریاتی تائید مولانا مدنی کے بین مذاہبی ہم آہنگی سے متعلق افکار سے ہوتی ہے۔ وہ انگریزوں کو ''اکبر الاعدا، اقوی الاعدا اور اضر الاعدا'' تصور کرتے تھے کیوں کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو شدید نقصانات پہنچائے لیکن ان کے الفاظ میں ''بخلاف ہنود کہ یہ ہمارے پڑوسی ہیں اور پڑوسی اگرچہ کافر ہو، پڑوسی پر حق رکھتا ہے۔ کما ورد فی الحدیث۔ ان کے ساتھ ہمارا خون ملا ہوا ہے، رشتہ اور قرابت داری ہے یا آبا کے ساتھ یا جدات کے ذریعے سے، ان کے ساتھ ہندوستان میں ہم کو مجبور ارہنا اور در گزر کرنا ہے۔ بغیر میل جول جس قدر ممکن ہو۔ ہندوستان میں گزر کرنا عادت مستحیل ہے۔ اس لیے ضروریات زندگیہ اس طرف تخفیف ضرور پیدا کریں گی۔ انگریزوں سے ہم کو نہ یہ تعلقات ہیں نہ یہ مجبوریت''۔ (ایضاً)

مولانا مدنی کے خاندانی اور فکری وارثین، خواہ وہ ادارے ہوں یا افراد انہیں ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کرنے اور ہندو مسلم مکالمے کی روایت کو آگے بڑھانے پر توجہ دینا چاہیے۔ ہندو مسلم مکالمہ اور باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ملک کی دو موقر مسلم تنظیموں: مسلم پرسنل لا بورڈ اور جمعیت علماء ہند نے چند سال قبل اس جانب پہل کی۔ بعض ہندو تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ گفت وشنید کی راہیں ہموار ہوئیں، لیکن مسلمانوں کی طرف سے شدت کے ساتھ اس پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا۔ اس طرح یہ کوشش پہلے ہی مرحلے میں دفن ہو کر رہ گئی۔ لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ شدت پسندی کے نظریات رکھنے والی کسی مذہبی یا سیاسی تنظیم یا افراد کے ساتھ مکالمے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیوں کہ یہ بلا ضرورت انہیں اہمیت دینا ہے جو ایک اعتبار سے ان کے سامنے جھکنے کے مترادف ہے۔ حالاں کہ مکالمے کی ضرورت اصلاً امن پسند نہیں بلکہ شدت پسند افراد کے ساتھ ہی ہے۔ اس کا اصل نشانہ وہی ہیں۔

مولانا مدنی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو جوان کی عالمانہ ژرف بینی، فکری تعمق اور دینی تقاضوں کے عصری شعور سے تعلق رکھتا ہے ان کا یہ نقطہ نظر ہے کہ مدارس کے موجودہ نصاب کو زمانے سے ہم آہنگ کیا جانا چاہیے۔ مولانا کی فکر وشخصیت کا یہ پہلو اکثر لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ مولانا مدنی نے آج سے پون صدی پیشتر بنگال اور آسام کے مدارس کے لیے ایک نصابی خاکہ تیار کیا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ واضح موقف اختیار کیا ہے: ''ہم کسی طرح اس امر کو قابل عمل قرار نہیں دے سکتے کہ پرانی کتابیں اس وجہ سے ضروری ہیں کہ وہ اسلاف کی تصنیف کردہ یا اسلاف کے زیر تدریس رہی ہیں اور جدید تصنیف کردہ کتب صرف اس وجہ سے قابل ترک قرار دی جائیں کہ وہ زمانہ حال یا قریب کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ یا اسلاف نے ان سے نفع نہیں اٹھایا''۔ ان کے اس مکمل نصابی خاکے کو پاکستان کے حلقہ دیو بند کے مشہور عالم مولانا زاہد الراشدی نے اپنی کتاب دینی ''مدارس کا نصاب نقد ونظر کے آئینے میں'' (ص،108-101) میں نقل کیا ہے۔ اور مولانا مدنی کا مذکورہ بالا اقتباس اسی کے صفحہ 102 سے ماخوذ ہے۔ یہ نصاب مولانا مدنی کی وضاحت کے مطابق انہوں نے پورے ہندوستان کے مدارس کے لیے تیار کیا تھا۔ اس نصابی خاکے کے بعض نکات حسب ذیل ہیں:

- یہ نصاب تین حصوں پر مشتمل ہے: ابتدائیہ، ثانویہ، اور عالیہ۔ یہ تینوں حصے اپنے آپ میں اس اعتبار سے مکمل ہیں کہ کسی کی تکمیل کے بعد طالب علم دوسرے طریقہ تعلیم کو اختیار کر سکتا ہے۔ مولانا مدنی کے بقول اسکولوں اور کالجوں میں جا سکتا ہے۔ اور اس میں اس کی اس تعلیم کا مقصد فوت نہ ہوگا۔
- پانچ زبانوں کی تعلیم کی گنجائش اس نصاب میں رکھی گئی ہے۔ ایک صوبائی زبان، بنگلہ آسامی وغیرہ۔ اردو، فارسی، انگریزی اور عربی۔ عربی کے علاوہ تمام زبانوں کو زبان کی حیثیت سے پڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔

- تکنیکی یا حرفہ جاتی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے۔ چناں چہ طلبہ کو چرخہ چلانے، کپڑا بننے، لوہار کا کام کرنے، بڑھئی کام کرنے، سلائی، گھڑی سازی، جلد سازی، چمڑا رنگنے، وغیرہ کی تربیت دی جائے۔
- طلبہ جسمانی صحت کے لیے فن سپہ گری، پٹہ، گدکا، لکڑی وغیرہ کی تربیت کا بھی انتظام ہو۔
- تکمیلات کی سطح پر تکمیل فتاوی، اردو ادب، عربی ادب، فارسی ادب، انگریزی ادب، الجبرا، ہندسہ، ریاضی، طب، قدیم وجدید فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست۔
- ہر تین برس پر نصاب پر از سر نو اجتماعی غور وخوض کیا جائے۔

یہ چند نکات ہیں۔ جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مدنی مدارس نصاب ونظام کے تعلق سے کس قدر وسیع النظری کے حامل تھے۔

بہر حال یہ مولانا حسین احمد مدنی کی دینی وفکری بصیرت اور بلند نگاہی کے چند اہم نقوش ہیں۔ یہ عنوان زیادہ تفصیل کا متقاضی ہے راقم الحروف نے وقت کی کمی کی بنا پر صرف سرسری طور پر اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ■

تاریخ آزادئ ہند کے عظیم المرتبت جرنیل

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ڈاکٹر منور حسن کمال

G-5/A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

تاریخ بڑے کام کی چیز ہے۔ عین ممکن ہے کہ یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات میں مطابقت محض اتفاق ہو، لیکن تاریخ کے اوراق پلٹنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگرے ایک جیسے پیش آنے والے واقعات یقیناً کسی یک سوذہن کی اختراع ہیں، جن کا واحد مقصد ہے کسی کو چین سے بیٹھنے نہ دو۔ سلگتے ہوئے سوالات سے گھیرے رہو تا کہ اسے اپنے مستقبل کی طرف دیکھنے کا وقت ہی نہ ملے اور وہ شبانہ روز انہی سلگتے ہوئے سوالات کی گتھیاں سلجھانے میں لگا رہے۔

آزادی کے ۵۶ برس بعد بھی آزادی کے لیے اپنی جانیں نچھاور کرنے والی قوم حقیقی آزادی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی آزادی کے ایک ہیرو تھے مولانا سید حسین احمد مدنی۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۹۵۷-۱۸۷۹ء) ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے عظیم سربراہ تھے۔ انہوں نے تحریک خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دوران انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک عرصہ گزارنا پڑا۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ہمراہ ہندستان آئے، اس وقت ہندستان میں تحریکِ خلافت شباب پر تھی۔ وہ بھی سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ اگرچہ ابتدا سے ہی وہ شیخ الہندؒ کے شریک کار اور خفیہ تحریک کے رازدار اور معین و مددگار تھے، مگر یہ خفیہ کارروائیاں اس

وقت منظرعام پر آئیں جب وہ مالٹا سے رہائی کے بعد سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا، جو حکومت برطانیہ کے خلاف جاری تھی۔ انہوں نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ کیا اور عوامی جلسوں میں جوشیلی تقریریں کیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ ان کی ذات ہندستان کے لیے قدرت کا ایک عطیہ تھی۔ انہوں نے ایک قائد کی حیثیت سے ملک وملت کی آزادی کے لیے جو دلیرانہ جدوجہد کی اور زہد وتقویٰ اور صبر وایثار کو زادِ راہ بنا کر جس پامردی کے ساتھ تاج برطانیہ کو خاکستر کیا وہ تاریخ ہند کا ایک روشن اور تابناک باب ہے۔

جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تو انہوں نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی، جس کا ماحصل یہ تھا:

"موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کردے۔"

خلافت کانفرنس میں ان کی پیش کردہ تجویز شرکائے کانفرنس نے پاس کردی اور جب وہ اخبارات میں شائع ہوئی تو برطانوی حکومت کے ایوان لرزاٹھے۔ بعد میں اسی باغیانہ تجویز کی بنا پر ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں مولانا مدنیؒ کی گرفتاری کی افواہ پھیلی تو عوام مشتعل ہوگئے اور انہوں نے انگریز افسر کی قیادت میں دیوبند آنے والی مسلح پولیس پر حملہ کردیا۔ حالات قابو سے باہر ہوگئے تو سہارنپور سے مدد کے لیے گورکھا پلٹن بلالی گئی، جس نے پورے شہر اور مولانا مدنیؒ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرلیا۔ مولانا گھر سے باہر آئے، عوام کو پرسکون رہنے کی تلقین کی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔

اس تجویز کی پاداش میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علی جوہر اور بعض دوسرے سرکردہ افراد کی گرفتاری عمل میں آئی اور خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ مولانا مدنی کا جب بیان لیا گیا تو انہوں نے بے خوف وخطر صاف طور پر کہہ دیا:

"اگر مذہبی فرائض کا لحاظ واحترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کرلینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے۔ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان جان تک قربان کردینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔"

آخری جلسے پر بے ساختہ مولانا محمد علی جوہر نے مولانا مدنیؒ کے قدم چوم لیے، جو گویا اس بات کی شہادت تھی، میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔

۲۴ راکتوبر ۱۹۲۱ کو بی۔سی کینڈی ایڈیشنل کمشنر سندھ نے پہلے روز کی کارروائی ''خالق دینا ہال'' میں کی۔ یہ کارروائی اسی طرح چار روز تک جاری رہی۔ پانچویں روز یعنی ۲۸ راکتوبر کو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے بیانات لیے گئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ قوانین الٰہی اور قوانین انسانی میں بڑا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''قرآن کا قانون مسلمانوں کا قانون ہے اور اس پر عمل کرنا میرا اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔ میں نے کراچی ریزرولیوشن نمبر ۶ کی تائید اور حمایت اسلام کے احکامات کی روشنی میں کی اور میرا قرآن مجھے ایسا حکم دیتا ہے۔'' اس پر عدالت نے کہا کہ قرآن کا قانون ملک کا قانون نہیں ہے۔ اس کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنی نے تقریر کی اور خلافت کمیٹی منعقدہ کراچی کی قرارداد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا:

''اگر علانیہ یا خفیہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ انقرہ کے خلاف پھر جنگ شروع کی گئی تو کانگریس کے فیصلے کے مطابق ہم سول احکام کی نافرمانی شروع کر دیں گے اور جمہوریہ ہند کا اعلان کر دیں گے۔ گورنمنٹ ہم سے کہتی ہے کہ اگر تمہارے مقابلے پر کوئی لڑنے والا نہیں تو تم کو خود ہی اس میں لڑنا ہوگا، لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش ہوئی، تو ہمارا فرض ہوگا، بلکہ ہماری ذمہ داری ہوگی کہ کامل آزادی اور جمہوریہ ہند کا اعلان کر دیں۔ یہ کوئی ڈینگ نہیں ہے اور نہ کوئی مذاق ہے۔ ہمیں اس جرم میں خواہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے، خواہ گولی سے اڑا دیا جائے، اس تمام سوانگ میں، اس تمام ساز و سامان میں جج، جیوری اور سرکاری وکیل کو جانے دیجیے، بلکہ کرنل کو یا کسی اور شخص کی سرکردگی میں محض ایک گولی چلانے والی جماعت کو حکم دیجیے اور اس کھیل کو ختم کیجیے۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے بلکہ اسلام کے قانون کا اعلان ہے۔ اگر محض مذہبی قانون کا اظہار ایک مجرمانہ سازش ہے تو حکم دیجیے، مگر یہ حکم ہندوؤں اور عیسائیوں کے لیے بھی ایسا ہی ہوگا...... اس امر کا فیصلہ جج کر سکتا ہے، آپ (یعنی جیوری) نہیں۔ ایک عربی مقولہ ہے کہ خاوند صرف اپنی بیوی سے مشورہ لیتا ہے، لیکن بات اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ یہاں جج کی پانچ بیویاں ہیں۔ وہ آپ سے صرف مشورہ کرے گا، لیکن کرے گا وہی جو اس کی مرضی ہوگی۔ وہ آپ کے فیصلے کا پابند نہیں۔''

مولانا مدنی نے اپنے بیان میں درج ذیل نکات پر بحث کرتے ہوئے کہا:

''۱۸۵۷ء کے زمانے میں حکومت برطانیہ نے ہندستانیوں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لیے شاہی اعلان جاری کیا تھا، جو اطمینان بخش امیدوں پر مشتمل تھا۔ یہ اعلان ہندستان میں برطانوی حکومت کا سنگ بنیاد تھا۔ اس کے آخر میں لکھا تھا کہ حکومت ہندستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے مصروف عمل ہوگی۔ اپنے مقبوضات کو وسعت نہیں دے گی اور راجاؤں، نوابوں اور عامۃ الناس کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے اپنے وعدے پورے کرے گی۔ ہندستانیوں کے ساتھ باشندگان نوآبادیات ایسا سلوک روا رکھا جائے گا، باغیوں کو معافی دے دی گئی تھی۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ ہندستانیوں کو مذہبی آزادی دے دی گئی ہے۔ تاریخ اس امر کی مظہر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ان مذہبی جذبات کے باعث بغاوت رونما ہوئی، جو دنیا کے دیگر ممالک میں کالعدم ہیں۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندستانی مذہب کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے کیونکہ خدا کا بھی ارشاد ہے: روحانی مسرت کے سامنے دنیوی قاعدہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ مذہب بادشاہ کا قانون ہے کیونکہ اس برطانوی مدبر نے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان جاری کیا۔ یہ صرف ملکہ ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ دیوان عام اور دیوان خاص کی طرف سے بھی تھا۔ ایڈورڈ ہفتم اور شاہ جارج نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی۔ اس کا وہ حصہ جس میں مذہبی آزادی کا ذکر ہے، مظہر ہے کہ یہ خواہش نہیں کہ ہم اپنی رعایا کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہمارے مذہبی احکام کی پیروی کرے۔ کسی شخص کو اس کے مذہبی فرض کی انجام دہی سے باز نہیں رکھا جائے گا۔ قانون کی رو سے سب کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔ ہم اپنے افسروں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ عوام کی مذہبی آزادی میں مزاحم نہ ہوں۔ ورنہ وہ ہماری ناراضی کا موجب ہوں گے۔ اس کے بعد ہندستانیوں کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ شاہی اعلان ہے اور اس پر عمل کیا جائے گا۔''

مولانا مدنی نے کہا:

''جو قرارداد میں نے پیش کی، وہ قرارداد نہیں، بلکہ سب کا مذہبی فریضہ ہے۔

یہ تیرہ سو برس کا معاملہ ہے، کوئی نئی بات نہیں۔ اسے احتیاطاً قرارداد کہا جاتا ہے، کیونکہ اور فقرے بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ میں اپنے مذہب اور ہندو اپنے دھرم کو جانتے ہیں۔ یہ مذہبی معاملہ ہے اس کا فیصلہ کرنا لارڈ ریڈنگ کا نہیں بلکہ علما کا کام ہے۔ (اس کے) دو جزو ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ مذہبی اصول ہے (اول) قرارداد کے الفاظ اور (دوم) نفس مضمون (اور وہ) یہ ہے کہ پولیس کی ملازمت کرنا حرام ہے۔"

"حردام" ایک مذہبی لفظ ہے۔ ایسے سات الفاظ ہیں۔ "حرام" اسے کہتے ہیں جسے شریعت صاف طور پر منع کرے۔ "حرام" وہ فعل ہے جس کے ارتکاب پر قہر الٰہی نازل ہوتا ہے۔ زنا بالجبر مذہب کی رو سے حرام ہے جو شخص اس سے احتراز کرے وہ نیک کام کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے بعد قرآن اور حدیث میں قتل مسلم کی ممانعت اور اس کے احکامات پر روشنی ڈالی اور حرمت شراب اور حرمت قتل مسلم کا فرق بیان کیا۔ اس کے بعد حرمت ملازمت انگریزی کی توجیہ کی اور کہا: "مسلمانوں کے لیے ایسی ملازمت کرنا حرام ہے، جس میں مسلمانوں کو قرآنی حکم کی عدم تعمیل کے لیے کہا جائے۔"

اس کے بعد مولانا نے "متفقہ فتویٰ علمائے ہند" کا تذکرہ کیا اور کہا: "میں نے اس فتویٰ پر دستخط کیے ہیں جس پر پانسو (۵۰۰) علما کے دستخط ہیں اور عالم دین ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا میرا فرض ہے۔" اپنے بیان کے آخر میں مولانا مدنی نے کہا: "میں ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے۔"

۹۲/ اکتوبر ۱۲۹۱ء کو مقدمہ کی کارروائی میں پیر غلام مجدد سندھی، مولانا نثار احمد اور سب سے آخر میں مولانا شوکت علی کا بیان قلم بند ہوا۔ یکم نومبر ۱۲۹۱ء کو بی۔ سی کینڈی، جوڈیشیل کمشنر سندھ نے جیوری کی رائے لے کر مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ ارکان جیوری نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا تھا کہ تمام ملزمان بے قصور ہیں، لیکن جیوری کی رائے کے باوجود کمشنر مذکور نے ان عاملین قرآن کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا دیا اور جگت گرو شنکر اچاریہ کو بری کر دیا۔ جج مذکور نے اپنے مقصد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کا سوال اس مقدمہ میں بالکل داخل نہیں ہوتا۔ اگر ملزمان نے ملک کے مروجہ قانون کو توڑا ہے تو انہیں ملک کے قانون کے تحت سزا ملنی چاہیے۔ جج نے جیوری کے روبرو اپنے ایڈریس میں مکمل ایک گھنٹہ بیس منٹ لیے۔ اس کے بعد ملزمان کو سزا کا حکم سنایا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر کو زیر دفعہ ۱۱۵ے تعزیرات ہند مزید دو سال کی سزا کا حکم سنایا گیا، مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ پہلی سزا کے ساتھ ساتھ دوسری سزا کی مدت بھی شمار ہوگی۔ اس طرح کل دو سال کی سزا بھگتنی ہوگی۔

زندانیانِ حق نے اپنے علیحدہ پیغامات میں اہل وطن کو مخاطب کرتے ہوئے صبر واستقامت کی تلقین کی۔

اس سلسلے میں مولانا سید حسین احمد مدنی کا بیان لائق ستائش ہے:

''انسان فطرتاً آزاد ہے۔ بغیر آزادی کے کوئی انسان نہ اپنی انسانیت کا ثبوت دے سکتا ہے اور نہ وہ اپنے فرائض پورے کرسکتا ہے، جو خدا کی طرف سے اس پر عائد کیے گئے ہیں، جو آزاد نہیں وہ اپنی زندگی بے زبان گونگے جانوروں سے اچھی نہیں گزار سکتا ہے جن کو ہنکایا جاتا ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو مذہبی فرائض کے لیے آزاد کرائے، ورنہ اس کو اپنی قومی ہستی سے انکار کردینا چاہیے۔ میں تم لوگوں سے امید رکھتا ہوں کہ اس آزادی کو محفوظ رکھو گے اور پرامن طریقے سے اپنی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہو گے۔ تاکہ تمہاری قوم اور مذہب دنیا میں ترقی کرے، تاکہ تمہارا خدا تم سے راضی ہو اور تاکہ تمہاری آئندہ نسل غلامی کی لعنت سے نجات پاکر آزادی کے پھل کا مزہ اٹھائے۔ اس معاملے میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں اور صرف اس سے ڈرتا ہوں۔ خدا ہمیں صحیح راستہ دکھائے اور حق وصداقت میں ہماری مدد کرے۔''

تمھارا خیر خواہ

حسین احمد کراچی

یکم نومبر ۲۱

اسی طرح کے پیغامات مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد، پیر مجدد سندھی اور ڈاکٹر کچلو نے بھی دیے۔

شنکرا چاریہ نے رہائی کے بعد اخبار کے نمائندے کو اپنا پیغام دیا۔

اسیران خلافت کمیٹی نے قید سے اپنے اپنے پیغامات تمام ہندستانیوں، یعنی مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، یہودی اور مرد وخواتین کے نام روانہ کیے۔ اصل میں ان کا مقصد یہ تھا کہ اہل وطن ان کی سزا وقید سے پریشان نہ ہوں اور ملک کو آزاد کرانے کی پرامن جدوجہد جاری رکھیں۔

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو فیصلہ سنایا گیا۔ جیوری کے ارکان نے فوج میں بغاوت پھیلانے یا کسی فوجی کو ملازمت سے باز رکھنے کے جرم سے بری قرار دیا اور جج نے بھی اتفاق کیا۔ البتہ زیر دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ تعزیرات ہند مولانا مدنیؒ کو دو سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا اور چند دن بعد مولانا مدنیؒ کو سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔

دو برس کی قید بامشقت کاٹنے کے بعد رہا ہوئے تو سہارنپور آکر جامع مسجد میں تقریر کی، جس میں وطن کی محبت اور آزادی کی لگن تھی، فرقہ وارانہ فسادات پر قلبی رنج کے تاثرات تھے اور اتحاد کا پیغام تھا۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولا حسین احمد مدنیؒ

عربی زبان وادب کے حوالے سے

عبدالملک رسول پوری
جمعیۃ علمائے ہند، نئی دہلی

اس خاکسار کے نوک قلم میں اتنی سکت کہاں ہے کہ حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ جیسی یگانہ عالم اور نابغہ روزگار اور گوں ناگوں صفات کی حامل شخصیت پر کچھ رقم کرے۔ موصوف جہاں سر میں آزادی کا سودا سمائے انگریز دشمن متوالوں کے سرخیل تھے وہیں مسند درس وتدریس کے امام بھی، وہ ایک ایسے بے باک اور سچ گو شخص تھے جو حاکم وقت کی شیطانی جبلت سے بے خوف وڈر ہو کر برسر عام سچ بولا کرتے تھے، جو تواضع اور عجز وانکساری کا مجسمہ ایک ایسے انسان دوست شخص تھے دوسرے کے آرام کے لیے خود تکلیفیں برداشت کرنا جس کا شیوہ تھا، جو میدان تصوف وطریقت کی ایک مقتدر ومقدس ہستی، سیاسی انارکی کے دور میں صحیح رہنمائی کرنے والے زعماء ملت کے سرخیل اور قومی وملی خدمات کے ایک ممتاز رکن تھے۔

اسی شوریدہ فکری اور حضرت کے سوانحی درر نایاب کے انتخاب میں سرگردگی کے دوران خیال آیا کہ کیوں نہ موصوف کی عربی زبان وادب کی تئیں محبت اور ممتاز ادبی مہارت اور بے نظیر صلاحیت کے ذکر سے ہی اپنے قلم وقرطاس کو مزین کیا جائے۔

حضرت مدنیؒ اردو فارسی، اور ترکی زباں دانی کے ساتھ عربی زبان وادب کے رموز آشنا ایک ماہر

استاذ تھے۔ جن کو عربی زبان میں برجستہ تحریر و کتابت پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اور اہل سخن اور صاحب زبان عربوں کی طرح فصیح زبان میں گفتگو ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ایک طویل عرصہ تک حجاز مقدس میں قیام، عرب اساتذہ سے استفادہ نیز عرب طلبہ کی تعلیم و تدریس کے باعث ان کی زبان نہایت شستہ اور سلیس ہوگئی تھی۔ اجنبی اور پہلے سے نا آشنا شخص انھیں ایک خالص عرب تصور کیا کرتا تھا۔ حالاں کہ وہ لغت اور زبان کی نسبت سے ہندستان کے اسی شوریدہ خمیر سے پیدا ہوئے تھے، جہاں کی قدیم بولیاں اور زبانیں کسی بے ہنگم ساز کی طرح گوش انسانی پر گراں گذرتی ہیں۔

حضرت مدنی کی عربیت کے تعلق سے آپ کے مرید با صفا حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کا ادبی ذوق اور بے تکلف عربیت آپ اپنی مثال ہے۔ خالص عربی لب و لہجہ میں بولنا یہ آپ کا وہ امتیازی وصف ہے جس نے حجازی علما کو خاص طور پر متاثر کیا۔ (حاشیہ نقش حیات: ۲/۲۰۹)

حضرت مدنیؒ اور عربی زبان وادب کی تعلیم

قرآن وحدیث پرمبنی اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت مدنیؒ نے فن کی مختصر اور ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد عربی زبان وادب کی تعلیم اولاً تو دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ اور اپنے شیخ ومربی حضرت شیخ الہندؒ کے روبرو زانوے تلمذ تہہ کر کے حاصل کی۔ جہاں آپ نے ''مفید الطالبین'' اور ''نفحۃ الیمن'' جیسی مفید کتابوں کا درس حاصل کیا، بعد ازاں اسی مادر علمی میں مولانا عبد العلی صاحب سے منظوم ادب میں ''سبعہ معلقہ'' پڑھی۔ اور پھر بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اسی درس گاہ کے ایک اور جید عالم اور عربی کے پُرگو اور ممتاز شاعر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے زیر سایہ آپ نے نثری ادب میں مقامات حریری اور منظوم ادب میں دیوان متنبی کا سبق لیا۔ (نقش حیات: ۱/۶۴)

اس کے بعد جب آپ گہوارہ علم وادب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو علم وحکمت کے اس چشمہ آب حیات پر پہنچ کر تشنگی اور بھی مزید ہوگئی اور آپ نے اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور عربی زبان وادب کی مہارت پر عربی روغن گری کے لیے اپنے مشاغل سے چندے ساعت نکال کر از سر نو عربی زبان وادب کی تعلیم شروع کی۔ چناں چہ شہر نبوی میں اس وقت کے مایہ ناز استاذ اور مشاق ادیب شیخ عبد الجلیل برادہؒ سے عربی زبان وادب کی کتابیں پڑھیں۔ جیسا کہ نقش حیات میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

باقی اوقات میں مشاغل سلوک اور درس وتدریس کا سلسلہ میں نے جاری کرلیا تھا، نیز چوں کہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئیں تھیں اس لیے مدینہ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب الشیخ آفندی عبدالجلیل برادہؒ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں ہم تینوں بھائی پڑھتے تھے"۔ (نقش حیات ۱/۵۶)

مدینہ منورہ میں بہ زبان عربی درس وتدریس

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ نے اپنے استاذ اور مربی شیخ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کی نصیحت کہ "درس وتدریس کا سلسلہ کسی حال میں نہ ترک کرنا" پر عمل کرتے ہوئے، مدینہ منورہ آمد کے معا بعد ہی تدریسی سلسلہ شروع کردیا تھا۔ مسجد نبوی میں عالم اسلام کے عظیم المرتبت اساتذہ کے تعلیمی حلقے لگا کرتے تھے، اسی دوران کچھ ہندستانی اور عرب طلبہ نے آپ سے ابتدائی تعلیم کے لیے گذارش کی، آپ نے اس گذارش اور درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے مسجد نبوی میں اپنا حلقہ لگانا شروع کردیا، درسی مہارت اور علماء دیوبند کے جداگانہ اسلوب تعلیم کے باعث بہت جلد ہی طلبہ کی تعداد روز افزوں ہونے لگی اور آپ کے درس کا شہرہ بلند ہونے لگا۔ شہر نبوی اور نصاب تعلیم کے پیش نظر ذریعہ تعلیم یقیناً عربی زبان ہی تھی۔ طلبہ بھی عربی زبان ہی میں سوالات واستفسارات کیا کرتے تھے اور حضرت بھی عربی زبان ہی میں متون کی تشریح وتوضیح فرمایا کرتے تھے۔ البتہ سرزمین عرب اور عربی ماحول ومعاشرے سے میلوں دور ہندستان کی سنگلاخ بادیوں میں عربی زبان سیکھنے والے کو عرب کی سرزمین اور شہر علم وادب اور خصوصاً عرب وعجم کے فصیح ترین شخص کی مسجد اور درس گاہ میں اگر درس دینا پڑے تو ابتدائی مرحلے میں قدرے پریشانی اور مشکل کا سامنا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ چناں چہ تدریس وتعلیم کے ابتدائی ایام میں حضرت مدنی کو بھی ان مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ فرماتے ہیں:

"مدینہ منورہ پہنچنے پر بعض طلبہ ہندستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواست گار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصے تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی، اس لیے اشکال کا سامنا ہوا"

البتہ محنت کے سامنے ہر مشکل ہیچ ثابت ہوئی ہے۔ حضرت نے بہت تھوڑے سے عرصے میں زبان پر قابو پالیا اور مسلسل گفتگو اور تدریس کی وجہ سے بہت مختصر مدت میں آپ کی زبان صاف اور رواں ہوگئی۔ جیسا کہ رقم طراز ہیں:

اس تدریس سے مجھ کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو اور فقہ

وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں اور دوسرے یہ کہ زبان (عربی) صاف ہوئی'' (نقش حیات، ۱/ ۵۷)

اسی طرح ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

اس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی، ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں۔ عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہوگئی تھی۔ (نقش حیات: ۱/ ۸۹)

تدریسی امور، غلام ہندستان کے مظلومانہ حالات، تحفظ خلافت اور جنگ آزادی کے تعلق سے حضرت کی شب وروز کی مصروفیتوں اور ہمہ وقت کی مشغولیتوں نے حضرت کو عربی زبان وادب کے تعلق سے کوئی تصنیفی وتالیفی خدمات انجام دینے کا موقع ہی نہیں دیا؛ حضرت مدنی کی زندگی کے اکثر ایام سفر ہی میں گذرے، معاصرانہ حالات کے پس منظر میں آپ ہمیشہ پابہ رکاب ہی رہے اگر دیوبند تشریف آوری ہوئی بھی تو کہیں دوسرے سفر پر جانے کے لیے ہی، ایسے میں نہ تو یکسوئی حاصل ہوئی کہ کچھ تصنیفی کام کیا جائے، اور نہ ہی فرصت کے اوقات۔ چناں چہ بے پناہ علم اور اہل علم کی جانب سے آپ کی معترفہ صلاحیتوں کے باوجود غلام ہندستان کے سیاسی حالات پر مبنی چندے معدودے کتابچوں کے سوا کوئی وقیع کام نہیں ملتا ہے۔ البتہ مدینہ منورہ میں دوران قیام آپ نے اپنے اکابر کے دفاع اور مولانا احمد رضا بریلوی کے رد میں اردو زبان میں ''الشہاب الثاقب'' نامی ایک تحقیقی کتاب تحریر کی۔ ایسے ہی اخیر عمر میں متعلقین باصفا کے ازحد اصرار پر آپ نے ''نقش حیات'' کے نام سے اپنے سوانح حالات مرتب کیے جو کہ تذکرہ اور سوانح سے زیادہ ایک تاریخی کتاب محسوس ہوتی ہے۔ اردو زبان میں ان دوگراں قدر کتابوں کے علاوہ آپ نے عربی زبان میں حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد کے سلسلے میں حضور ﷺ کی جملہ احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جو ایک عرصہ دراز تک مدینہ منورہ کے ایک عزیز کے یہاں مخطوطہ کی شکل میں محفوظ رہا، بعد میں کافی عرصہ پہلے آپ کے صاحب زادے حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب کی کوششوں سے وہ مجموعہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے ہاتھوں اردو زبان میں ترجمہ ہو کے شائع ہوا ہے۔

عربی خطوط نگاری:

عربی زبان میں احادیث کی جمع وتالیف کے علاوہ حضرت مدنیؒ کی جو عربی تحریرات دستیاب ہیں ان میں آپ کے خطوط اور چند تقاریر ہیں۔

اسی طرح حضرت مدنیؒ نے عربی زبان کے مراسلاتی ادب میں بھی کافی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ عربی مراسلت کا ہندستان میں بہت زیادہ رواج تو دور شاید کہیں نام ونشان

بھی نہ تھا، البتہ حضرت شیخ الاسلام نے عربی داں حضرات سے مراسلاتی مخاطبت کے لیے عربی زبان ہی کو منتخب کیا؛ چناں چہ آپ کے مجموعہ مکتوبات میں جابجا عربی خطوط منتشر نظر آتے ہیں۔ ان مکاتیب کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے عربی خطوط کے تعلق سے سن وتاریخ کا ویسا خیال نہیں رکھا ہے جیسا کہ انھوں نے اردو خطوط کی ترتیب میں رکھا ہے۔ جس کے باعث مجموعہ مکتوبات میں دستیاب عربی خطوط میں اولین خط امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام موسوم ہے جو کہ حضرت نے موجودہ بنگلہ دیش کے شہر سلہٹ پہنچے کے بعد آسامی مسلمانوں کے تعلق سے وہاں کے زمینی حقائق سے آگاہ کرنے اور رفع شکوی کے لیے اس وقت کے عظیم سیاسی لیڈر کو لکھا۔ یہ ایک قدرے طویل خط ہے جس کی ابتدا عصر حاضر کی مراسلت کی طرح خطابی القاب سے ہوتی ہے۔ اور پھر خط کا مفصل مضمون شروع ہو جاتا ہے۔ خط کی لسانی اہمیت طے کرنے کے لیے ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

سيدنا المحترم! لازالت معاليكم في غايته من الارتقاء آمين.

غب إهداء السلام والتحية اللائقة للمقام فالمعروض على سيادتكم أن الداعي وصل سلهت فى الثالث من رمضان صباحا مع كل خير وسلامة وحيث أن المواصلات السلكية والكتابية إلى هذه الساعة منقطعة اقتضت الضروف والأحوال إرسال حامل العريضة إلى جنابكم السامى، فالمرجو من حسن ألطافكم أن لا تغفلوا عن الإسعاف.

توجمه: بعد ہدیہ سلام مسنون خدمت اقدس میں عرض ہے کہ خاک سار ۳ر رمضان المبارک کی صبح مع الخیر سلہٹ پہنچ گیا۔ چوں کہ برقیات ومراسلات کا سلسلہ منقطع ہے اس لیے حالات اس کے مقتضی ہوئے کہ حامل رقعہ کو جناب کی خدمت میں بھیجوں، مجھ کو جناب والا کے حسن اخلاق سے امید ہے کہ میری درخواست پر توجہ فرمائیں گے۔

اس کے بعد مرتب نے مولانا عبدالحق مدنیؒ کو لکھے ہوئے تقریباً دس عدد خطوط کو جمع کیا ہے، جس میں کچھ تو مختصر بقیہ کافی طویل ہیں، جو حجاز مقدس میں برپا ہونے والے انقلاب اور حالات مدینہ کا آئینہ ہیں۔ جن میں مدینہ منورہ اور قرب جوار کے سیاسی وسماجی حالات پر آپؒ نے کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بعض خطوط میں آپؒ نے میراث اور ہندستان کے دارالحرب ہونے اور نہ ہونے جیسے شرعی مسائل کے تعلق سے گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں جب کہ بعض دیگر سلوک وطریقت کے اوراد ووظائف پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح آپ نے نینی جیل سے مولانا مظفر صاحب دیوبندی کو بھی عربی میں دو خطوط ارسال کیے ہیں، جو کہ کافی مختصر اور صوفیانہ تعلیم و تذکیر اور بعض پند و نصائح کا مجموعہ ہیں۔ مکتوبات کی جلد سوم میں مکتوب نمبر ۴۴ حضرت مولانا اعزاز علیؒ استاذ دارالعلوم دیوبند کے نام موسوم ہے۔ ان کے عربی قصیدے کی ستائش میں آپؒ نے عربی زبان ہی میں داد و تحسین سے نوازا ہے، اور زورِ قلم کے اضافے کی دعائیں دی ہیں۔ اسی جلد میں مکتوب نمبر ۴۰، ۴۱ دونوں قاضی زاہد الحسینی پاکستان کے نام ہیں جو کہ تصوف کے مسائل پر مشتمل عربی زبان میں لکھے گئے ہیں جب کہ مکتوب نمبر ۴۷ حضرت نے اپنے بھتیجے مولانا سید حبیب محمود کو عربی زبان میں لکھا ہے۔ مکتوبات کی جلد چہارم میں مکتوب نمبر ۹۵/۹۶/۹۷ مولانا سید حامد میاں پاکستان کے نام عربی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

اسی طرح بہت سے دستیاب عربی خطوط حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی کی کوششوں سے مجموعہ میں جگہ پا گئے ہیں، جب کہ بہت سارے ابھی بھی غیر مطبوعہ شکل میں آپ کے متعلقین کے پاس محفوظ ہیں نیز جمعیۃ علماء ہند کے تابع امارت شرعیہ ہند کے ناظم مولانا معز الدین احمد گونڈوی کے پاس بھی محفوظ ہیں۔

اردو خطوط نگاری اور عربی اشعار

حضرت مدنی علیہ الرحمہ خط و کتابت کے دوران اپنی فکر کو مزید مستحکم اور مدلل کرنے کے لیے قرآنی آیات اور جوامع الکلم سے استشہاد کے ساتھ ساتھ عربی اشعار سے بھی استفادہ کیا کرتے تھے۔ ان اشعار کو برجستہ اور برمحل ایسے استعمال کرتے تھے جیسے کسی ہار میں گل بنفشہ کو پرو کر اس کے حسن میں اضافہ کیا جا رہا ہو۔

چناں چہ جب ہم ان کی تحریرات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں جا بجا عربی اشعار نظر آتے ہیں۔ مجموعہ مکاتیب میں مکتوب نمبر آٹھ میں ایک صاحب خیر کو ان کی پریشانی پر صبر کی تلقین کرتے ہوئے اولاً تو حدیث پاک سے استشہاد کرتے ہیں اور مابعد عربی زبان کے اشعار سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”کسی وقت میں بھی قلت میں قلق واضطراب آنے نہ دینا چاہیے اور نہ مایوس ہونا چاہیے:

أَلَا لَا يَيْأَسَنْ أَخُو الْبَلِيَّةْ فَلِلرَّحْمٰنِ أَلْطَافٌ خَفِيَّةْ
إِذَا اشْتَدَّتْ بِكَ الْبَلْوٰى فَفَكِّرْ فِيْ أَلَمْ نَشْرَحْ
فَعُسْرٌ بَيْنَ يُسْرَيْنِ إِذَا فَكَّرْتَهُ فَافْرَحْ

ترجمہ: مصیبت کے وقت کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے! کیوں کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم کی مہربانیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جب جب کوئی شدید مصیبت پیش آئے تو سورہ الم نشرح کی آیات میں غور کرنا چاہیے، اس میں عسر ”تنگی“ اور یسر ”فراخی“ کے الفاظ آ رہے ہیں۔

اسی طرح ان صاحب کی طرف سے حضرت مدنی کی از حد تعریف وتوصیف کی وجہ سے آپ نے فرمایا:
''آپ نے حسن ظن سے جو اطراء مادح اختیار فرمایا ہے وہ بالکل خلاف واقع ہے۔ الا أن يتفضل الله علي ويجعل لی ظنون الأحباب واقعة فی نفس الأمر:

يَظُنُّ النَّاسُ بِيْ خَيْرًا وَإِنِّي لَشَرُّ النَّاسِ إِنْ لَمْ يَعْفُ عَنِّي

اسی طرح بعض خطوط کے خاتمیہ میں آپ نے پند ونصائح پر مشتمل اپنے اقوال وافکار پر دلیل اور برہان کے طور پر عربی اشعار کا تذکرہ کر کے مخاطب اور سامع کے ذہن میں بات کو پیوست کر دیا ہے۔ چناں ایک عربی خط کے خاتمیہ میں ذکر کرتے ہیں:

إِذَا غَامَرْتَ فِيْ شَرَفٍ مَرُوْمٍ فَلَا تَقْنَعْ بِمَا دُوْنَ النُّجُوْمِ
فَطَعْمُ الْمَوْتِ فِيْ أَمْرٍ حَقِيْرٍ كَطَعْمِ الْمَوْتِ فِيْ أَمْرٍ عَظِيْمٍ

ترجمہ: جب کسی عظیم الشان مقصد کا ارادہ کرو تو ستاروں سے کم پر قناعت نہ کرو! کیوں کہ کسی حقیر کام میں موت کا ذائقہ کسی بڑے کام میں موت کے ذائقے جیسا ہی ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک مکتوب میں برائی کی مذمت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، برائی تو بالآخر برائی ہے چاہے کوئی شریف مکہ کرے یا ابن سعود۔ پھر اپنی بات کو مضبوط اور پختہ کرنے کے لیے مکتوب کے نہائی حصے میں عربی کے دو شعر نکل کرتے ہیں:

إِذَا مَا النَّاسُ جَرَّبَهُمْ لَبِيْبٌ فَإِنِّيْ قَدْ أَكَلْتُهُمْ وَذَاقَا
فَلَمْ أَرَ وُدَّهُمْ إِلَّا خِدَاعًا وَلَمْ أَرَ دِيْنَهُمْ إِلَّا نِفَاقًا

ترجمہ: اگر کسی عقل مند نے لوگوں کے معاملات کا تجربہ کیا ہے تو میں نے بھی لوگوں کو چکھ کر اور کھا کر تجربہ کیا ہے، میرا تو یہی تجربہ ہے کہ لوگوں کی دوستی مکر وفریب ہے اور ان کا دین داری ریا اور نفاق ہے۔

اس طرح عربی وفارسی اور اردو خطوط میں عربی کے اشعار جابجا بکھرے ہوئے ہیں اور تقریبا ہر خط اپنے اندر کسی نہ کسی عربی شعر کو سموئے ہوئے ہے۔ کہیں یہ محض ایک شعر اور کہیں دو اور کہیں دو سے زائد اشعار کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

البتہ جس وقت آپ الہ آباد کی نینی جیل میں پابند قید وسلاسل تھے کہ عید کی بہار آ گئی تو آپ نے عید کی خوشیوں کے تعلق سے عربی زبان کے مشہور شاعر متنبی کے ایک قصیدے میں حسب موقع قدرے ترمیم کر کے الہ آباد کے مولانا ابوالحسن حیدری کے نام لکھ کر اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اور ترمیم بھی اس طرح کی ہے کہ شعر کے عروضی وزن پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑا ہے۔ جس سے حضرت مدنی کی شاعرانہ صلاحیت اور علم

عروض سے آپ کی مناسبت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

عِیْدٌ بِاَیَّةِ حَالٍ عُدْتَ یَا عِیْدُ — بِمَا مَضٰی اَمْ بِاَمْرٍ فِیْكَ تَجْدِیْدُ

اَمَّا الْاَحِبَّةُ فَالْبَیْدَاءُ دُوْنَهُمُ — فَلَیْتَ دُوْنَكَ بِیْدًا دُوْنَهَا بِیْدُ

لَوْلَا الْعُلٰی لَمْ تَحُطْ بِیْ مَا اَحَاطَ بِهَا — سِجْنٌ وَلَا اَرْبَابُهُ السُّوْدُ

اِنِّیْ نَزَلْتُ بِكَذَّابِیْنَ ضَیْفُهُمْ — عَنِ الْقِرٰی وَعَنِ التَّرْحَالِ مَحْدُوْدُ

جُوْدُ الرِّجَالِ مِنَ الْاَیْدِیْ وَجُوْدُهُمْ — مِنَ اللِّسَانِ فَلَا كَانُوْا وَلَا الْجُوْدُ

نَامَتْ نَوَاطِیْرُ هِنْدٍ عَنْ ثَعَالِبِهَا — فَقَدْ بَشِمْنَ وَمَا تَفْنَی الْعَنَاقِیْدُ

اَمْسَیْتُ اَرْوَحَ مُثْرٍ خَازِنًا وَیَدًا — اَنَا الْغَنِیُّ وَاَمْوَالِی الْمَوَاعِیْدُ

مَنْ عَلَّمَ الْاَنْكَلُوَ الْغَرْبِیَّ مَكْرُمَةً — اَقَوْمُهُ الْجِلْفُ اَمْ آبَاؤُهُ السُّوْدُ

ترجمہ:

۱۔ یہ عید ہے اے عید تو اب کیا لے کر آئی ہے؟ کیا پہلے ہی جیسی چیزیں لائی ہے یا کوئی نئی بھی؟

۲۔ میرے اور احباب کے درمیان لمبے میدان حائل ہیں، اے عید کاش تیرے درمیان بھی بہت سے لمبے میدان حائل ہوتے کہ تو میرے پاس نہ آتی۔

۳۔ اگر میرے سامنے بلند مقصد نہ ہوتا تو میں ان ارباب جیل اور قید خانہ کے حصار میں نہ ہوتا۔

۴۔ میں ایسے جھوٹوں کے یہاں اترا ہوں جن کے مہمان کی نہ تو ضیافت ہوتی ہے اور نہ انھیں جانے دیا جاتا ہے۔

۵۔ لوگوں کی فیاضی ہاتھوں سے ہوتی ہے؛ لیکن ان کی فیاضی محض زبان سے ہے، خدا کرے کہ نہ ان کا اور نہ ان کی سخاوت وجود باقی رہے۔

۶۔ ہندستان کے باغبان لومڑیوں سے غافل ہو کر سو گئے، تو وہ انگوروں سے خوب سیر بھی ہو گئے لیکن انگور ختم نہ ہوئے۔

۷۔ میں ایسا مال دار ہو گیا ہوں کہ خازن اور ہاتھ دونوں کو کچھ کرنا نہیں پڑتا ہے، یعنی میں غنی ہوں اور میرے مال لوگوں کے وعدے ہیں۔

۸۔ انگریز کو کس نے شرف سکھایا؟ کیا اس کی اناڑی قوم نے یا اس کے بد بخت آبا نے۔

نقش حیات، مکتوبات اور حضرت کی دیگر تحریرات کا مطالعہ کرتے وقت برمحل عربی اشعار کے استعارات کے ساتھ ہی درج ذیل شعر حضرت کی نوک زبان رہتا تھا، اور وہ ہمیشہ اس کا ورد کرتے رہتے تھے:

يظن الناس في خيرا وإني　　　لشر الناس إن لم يعف عني

اسی طرح اردو حصے کے مکتوب نمبر ۱۷ میں ایک صاحب کے قرض حسنہ کے سلسلے میں چند اشعار رقم کرتے ہیں:

سَأَشْكُرُ عَمْرًوا إِنْ تَرَاخَتْ مَنِيَّتِي　　　أَيَادِيَ لَمْ تُمْنَنْ وَ إِنْ هِيَ جَلَّتْ
فَتًى غَيْرُ مَحْجُوبِ الْغِنَى عَنْ صَدِيقِهِ　　　وَ لَا مُظْهِرَ الشَّكْوَى إِذَا النَّعْلُ زَالَّتْ
رَأَى خُلَّتِي مِنْ حَيْثُ يَخْفَى مَكَانُهَا　　　فَكَانَتْ قَذَى عَيْنَيْهِ حَتَّى تَجَلَّتْ

ترجمہ: اگر میری موت نے مہلت دی تو میں عمرو کے ان احسانات کا شکریہ ادا کروں گا۔ جن پر اس نے احساس نہیں جتایا، اگر چہ وہ کتنے ہی بڑے تھے۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جو اپنے دوستوں سے اپنا مال روکتا نہ تھا (بلکہ ان پر اس کا مال نثار تھا) اور فقر و مصیبت کے وقت حرف شکایت زبان پر نہ لاتا صابر رہتا۔ اس نے میری حاجت مکان سے بھی معلوم کر لی جہاں سے کسی کو معلوم ہو سکتی تھی، پھر جب تک میری سوء حالی دور نہ ہوئی، اس کی آنکھوں کا تنکہ بنی رہی، یعنی اس کے دور کرنے کی فکر میں لگا رہا۔

آپ کی جملہ تحریرات خصوصاً مکاتیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ جانے اشعار آپ کے برنوک زبان پر رہا کرتے تھے، اور نہ جانے کتنے دواوین آپ کے حافظے میں محفوظ تھے، مجموعہ مکتوبات میں موجود کوئی بھی خط عربی تحریر اور خصوصاً عربی شعر سے خالی نہیں ہے، ہر صفحہ اور ہر مکتوب میں عربی اشعار نظر آتے ہیں، آپ نے حسب تقاضا کہیں ایک ہی شعر پر اکتفا کیا اور کہیں ایک سے زائد کبھی آپ خط کی پیشانی کو کسی عربی شعر سے مجلّی کر دیتے تھے اور کبھی خاتمیہ پر اختتامی مہر کی طرح عربی شعر کو ثبت کرتے تھے۔

عربی خطابت اور حضرت مدنیؒ

عربی تقریر و خطابت میں حضرت مدنیؒ کو درک اور کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ جیسا کہ ہم آپ کے تدریسی ایام کے سلسلے میں ماقبل میں ذکر کر چکے ہیں۔ آپ کی پر جوش اور ولولہ انگیز اردو تقاریر تو مردہ جذبات اور خوابیدہ جگر افراد کو خواب غفلت سے بیدار کر کے سیدھا میدان کارزار میں بھیج دیتی تھیں۔ اسی طرح عربی تقاریر بھی، فکری سانچہ تو ایک ہی تھا البتہ زبان میں تغیر ہو جاتا تھا تو آپ کو جس طرح اردو زبان و بیان میں مہارت تامہ حاصل تھی اسی طرح عربی بھی آپ کے گھر کی لونڈی اور جنبش انگشت کی رہین تھی۔ چناں چہ اپریل ۱۹۱۰ء میں جب مادری علمی دارالعلوم دیوبند میں پانچویں جلسہ دستار بندی کا انعقاد طے ہوا، تو انتظامی امور کی نگرانی ونگہداشت کے لیے جہاں مختلف صلاحیتوں کے حامل احباب کو مختلف قسم کی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں وہیں آپ کی

عربی وزبان وادب میں بے نظیر مہارت کی وجہ سے آپ کو یہ ذمہ داری تفویض کی گئی کہ جلسہ میں عربی تقریر کے لیے طلبہ کو تیار کریں اور ان کو عربی تقاریر کی مشق کرائیں۔ حضرت نے ذمہ قبول کرتے ہوئے نوآموز طلبہ کو اپنی تربیت سے اس طرح تراشا کہ وہ جواہر پارے کے طرح چمکنے لگے۔ اور عوام وخواص ہر ایک نے آپ کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کرلیا۔ فرماتے ہیں: ''میرے ذمے طلبہ کو عربی تقریر کرانے کی خدمت تعین کی گئی تھی، چناں چہ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف عنوانات پر تقریباً بارہ یا پندرہ طالب علم عربی تقریر کے ماہر ہو گئے تھے''۔ (نقش حیات: ۱/۱۶۷)

ان تقاریر کی بابت سوانح شیخ الاسلام کے مرتب لکھتے ہیں:

''جلسے کے انتظام میں حضرت کے ذمہ یہ خدمت کی گئی کہ طلبہ کو تقاریر اور خطاب کے لیے تیار کریں اور خود بھی مواعظ حسنہ سے حاضرین کو مستفیض کریں۔ چناں چہ جب نوعمر اور نوخیز طلبہ نے اعلی درجہ کی فصیح وبلیغ اردو اور عربی زبان میں تقریریں کیں تو سننے والے دنگ رہ گئے اور لاکھوں انسانوں کے مجمع میں ایسی خاموشی چھاگئی کہ سوئی گر جائے تو آواز سنائی دے''۔ (فرید الوحیدی/شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، ص:۱۶۲)

اسی جلسہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی عربی تقریر کے ساتھ حضرت مدنیؒ نے بھی سرور کائنات ﷺ کی افضلیت کے عنوان سے عربی میں تقریر کی۔ حضرت مدنیؒ کی شستہ زبان میں اس برجستہ عربی تقریر کی داد دیتے ہوئے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مجلّہ ''القاسم'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ تقریر ایسی فصیح اور پر زور تھی کہ فن ادب کے جاننے والے بھی متحیر تھے''

...... ''چناں چہ سید عبدالحق صاحب بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج نے خود کھڑے ہو کر عربی زبان میں تقریر کی اور فرمایا کہ'' ہندستان کے علما کی نسبت میرا یہ خیال تھا کہ درس وتدریس پر تو خوب قادر ہیں مگر عربی تقریر کی مہارت نہیں رکھتے۔ آج کی تاریخ کے تیسرے گھنٹہ میں میرا یہ خیال غلط ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ ہندستان کے علما اس میں بھی پورا ملکہ رکھتے ہیں''۔ (القاسم ماہ شعبان ۱۳۲۸ھ، ص:۳۲)

قیام مدینہ منورہ کے دوران جب آپ کے مشفق استاذ اور مربی شیخ حضرت شیخ الہندؒ نے تحریک ریشمی رومال کے تعلق سے حجاز مقدس کا قصد کیا تھا۔ وہ والیان سلطنت عثمانیہ جناب غالب پاشا اور انور پاشا سے ملاقات کے لیے ابھی مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھے، کہ جمال پاشا اور انور پاشا مدینہ منورہ تشریف لائے اور مفتی شہر شیخ مامون بری سے علمائے مدینہ سے پند ونصائح کی خواہش کا اظہار کیا انھوں نے شہر کے مشاہیر علما کو مسجد نبوی کے صحن مبارک میں جمع کیا جن سے یکے بعد دیگرے ان والیان سلطنت عثمانیہ نے تقاریر سنی۔ اس گراں

قدر موقع پر عالم اسلام کی سب سے بڑی حکومت کے ذمہ داران کے روبرو حضرت مدنیؒ نے عربی زبان میں تقریر کی اور اپنے شیخ کے مقصد عظمی کے پیش نظر جہاد کی ضرورت وفضیلت پر اپنے پر جوش اسلوب میں اس قدر مبسوط تقریر فرمائی کی کہ تحریک ریشمی رومال کی راہیں آسان ہوگئیں۔ ہر چہار جانب سے حضرت مدنی کی تقریر کی پذیرائی ہوئی اور دادو تحسین سے نوازی گئی۔ نقش حیات میں رقم طراز ہیں:

''پھر [تقریر کے لیے] مجھ کو حکم کیا گیا۔ مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی میں نے حسب مناسبت وقت فلسفہ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی ترقی اور بہبودی کے لیے جہاد عقلی طور پر ضروری ہے، اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے، اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا۔ یہ تقریر تقریبا آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی۔ اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے، بعد از تقریر سبھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا''۔ (نقش حیات: ۲/۲۷۶)

جلسہ دستار بندی کے دوران طلبہ دارالعلوم کو لکھ کے دی جانے والی عربی تقاریر اور خود حضرت مدنیؒ کی عربی تقریر نیز مسجد نبوی میں غالب پاشا کے حضور عربی تقریر کا ریکارڈ تو دستیاب نہ ہو سکا البتہ ان تقاریر کی خطابانہ شان اور ادبی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے حضرت والا کی ایک دستیاب عربی تقریر جسے آپ جمعہ کی نماز سے قبل بطور خطبہ پیش کیا کرتے تھے کافی ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ جوان دلوں میں جذبہ حریت وآزادی بیدار کرنے اور غلام جسموں میں روح حریت پھونکنے اور لہو کو گرمانے کے لیے اکسیر اور کیمیا کا درجہ رکھتا ہے۔

چناں چہ خدائے وحدہ لاشریک کی حمد وثنا اور آقائے دو جہاں ﷺ کی تعریف وتوصیف کے بعد فرماتے ہیں:

فيا أيها الناس! إلام هذا التناعش الفظيع ؟ ولم يزل القرآن العظيم ينبهكم. وإلام هذا التناؤم الشنيع ولم يبرح الدهر اليقظان يوقظكم. أما بان لكم أن الأمم قد تداعت عليكم تداعى الآكلة على القصعة، واجتمعت على أن تبلغ المسلمين و بلادهم فتمضغها مضغة. حتى ما تخشون الناس والله أحق أن تخشوه! وحتى ما تتولون الأعداء والله ورسوله أحق أن تولوه".

ترجمہ: اے لوگو! غور کرو! سوچو! یہ اونگھ، یہ نہایت خطرناک اونگھ اور غفلت تم پر کب تک طاری رہے گی؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن عظیم تمہیں مسلسل بیدار کر رہا ہے۔ تم پر کب تک یہ نیند چھائی رہے گی؟

جب کہ حالات زمانہ تمہیں مسلسل چونکا اور مہمیز کر رہے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ؟ دنیا کی مختلف قومیں تمہارے خلاف محاذ آرا ہوگئی ہیں۔ باہم متحد کاندھے سے کاندھا ملا کر تمہارے خلاف برسرِ پے کار ہیں اور دیمک کی طرح تمہارے وجود کو چٹ کر جانے کی فکر میں ہیں۔ پوری امت مسلمہ کو کچا چبا کر تمام عالم اسلام کو نیست و نابود کر کے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے درپے ہیں۔ اے مسلمانو! کب تک تم لوگ اپنے جیسے انسانوں سے ڈرتے رہو گے؟ حالاں کہ خوف کے لائق تو صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ذات ہی ہے۔ کب تک تم لوگ دشمنان خدا کے دوست بنے رہو گے حالاں کہ دوستی کے لائق صرف اور صرف اللہ رب العزت ہی کی ذات ہے۔

تھوڑا اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

أفطال عليكم الأمد كالذين من قبل ،فقست قلوبكم؟ أم زال عنكم الخشوع لذكر الله فتحجرت أفكاركم وعقولكم؟ ألا ترون أن من الحجارة لما يتفجر من الأنهار عن مخافة الله. وإن منها لما يشقق فيخرج منه الماء أو يهبط من خشية الله، أفحسبتم أن تتركوا أن تقولوا آمنا وأنتم لا تفتنون،.

درازی مدت اور طول طویل بعد کے باعث کیا سابقہ امتوں کی طرح آپ لوگوں کے بھی دل سخت ہوگئے ہیں؟ یا ذکر خداوند کے لیے مطلوب خشوع وخضوع مفقود ہوگیا ہے؟ جس کے باعث تمہاری عقل پتھر اگئیں ہیں؟ کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ خدائی خوف سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں، ان سے پانی کی نہریں نکل پڑتی ہیں، اور وہ خشیت خداوندی کے نتیجے میں پہاڑوں کی بلندی سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ کیا تم یہ سوچتے ہو کہ صرف ایمانی کلمہ پڑھنے سے تمہاری بخشش ہو جائے گی اور تم آزمائشوں میں نہیں مبتلا کیے جاؤ گے۔

پوری تقریر جذبات کو برانگیختہ کرنے والے پر جوش فقروں اور جملوں سے بھری ہوئی، جو حضرت مدنی کی عربی دانی کا ایک بین ثبوت اور آپ کی خطابانہ صلاحیتوں کی غماز ایک مایہ ناز شاہ کار ہے۔

سوئے ہوئے جوانوں کو بیدار کرنے، پژمردہ حوصلوں میں جہادی روح پھونکنے اور برسرِ پے کار مجاہدین کو مہمیز کرنے کے لیے جس طرح کے بھاری بھرکم اور پرشکوہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے زبان وادب کے رموز واوقاف سے مکمل آگاہ اور الفاظ کے وزن اور ان کے برمحل استعمال پر قادر ایک ماہر ادیب اور زباں داں ہی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مدنیؒ نے اپنی اردو عربی تقاریر سے ہند اور بیرون ہند اپنی خطیبانہ مہارت اور زبان وادب پر مکمل دسترس اور قدرت کے باعث ایسا کر دکھایا تھا۔

اسی طرح اَجل صحابہؓ کی تعریف وتوصیف پر مبنی جمعہ کا دوسرا خطبہ بھی ادبی انداز وبیان میں اپنی مثال

آپ ہے۔ حضرت مدنیؒ نے صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب اور امت سے ان کی تعظیم وتکریم کی طالب جملہ حدیثوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ صحابہ کی شان میں نذرانہ عقیدت کا ایک دلکش گل دستہ بن گیا ہے۔

عربی زبان وادب کی باریکیوں سے نا آشنا محض ایک مبتدی طالب علم میں کہاں اتنی سکت ہے کہ حضرت مدنیؒ جیسے ادیب کی تحریروں کا ادبی تجزیہ کرے؛ البتہ اسی خطبہ کی درج ذیل عبارت حضرت مدنی کی خطیبانہ شان اور ادیبانہ مہارت کی جس طرح غمازی کررہی ہے وہ قاری پر خود ہی عیاں ہوجائے گی۔ خدائے وحدہ لاشریک کی حمد وثنا کے بعد فرماتے ہیں:

فيا أيها الناس اتقو الله فى السرّ والعلن. وذروا الفواحش ما ظهر منها وما بطن. وحافظوا على الجمع والجماعة. ووطّنوا أنفسكم على السمع والطاعة. واعلموا أن الله أمركم بأمر بدأ فيه بنفسه ثم ثنّى بملائكة قدسه. ثم ثلّث بالمؤمنين من بريّة جنّه وإنسه. فقال:...... " إن الله وملائكته يصلون على النبى، ياأيهاالذين آمنوا صلّوا عليه وسلّموا تسليما"

اے لوگو! اللہ سے ڈرو! اپنے پوشیدہ ونہا اور ظاہر وواضح ہر طرح کے اعمال میں اللہ سے خوف کرو! اور ڈھکی چھپی اور واضح وکھلی جتنی بھی نحش خرافاتیں ہیں سب سے گریز کرو! جمعہ کی نماز اور جملہ پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کیا کرو! اور اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرماں برداری کا خوگر بناؤ! اور یادرکھو! کہ اللہ رب العزت نے تمھیں ایک ایسے خاص کام کا حکم فرمایا ہے۔ جس کا آغاز اس نے خود اپنی ذات سے کیا ہے، پھر فرشتوں سے کرایا ہے اور پھر انسانوں اور جناتوں پر مشتمل جملہ امت مسلمہ کو حکم فرمایا ہے۔ اور وہ حکم یہ ہے کہ خود اللہ رب العزت اور اس کے جملہ فرشتے آپ ﷺ پر درود وسلام بھیجتے ہیں تو اے ایمان والو تم بھی آقائے دو جہاں ﷺ پر درود وسلام کے نذرانے پیش کرو!

ان عربی خطوط اور اردو مراسلت میں برمحل وبرجستہ کثیر تعداد میں عربی اشعار کا استعمال اور اخیر میں عربی تقاریر اور پر جوش مجاہدانہ خطبات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مدنیؒ نہ صرف اردو زبان وادب کے ادیب تھے؛ بلکہ آپ کو عربی زبان وادب میں بھی یکساں مہارت اور عبور حاصل تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کا تصنیفی سرمایہ

ایک تجزیاتی تعارف

مولانا نایاب حسن قاسمی
سیتامڑھی بہار

انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کے سیاسی، علمی، تہذیبی وفکری منظرنامے پر جن قدآور شخصیات نے اپنے فکرونظر، جہدِ مسلسل اور جاودانہ تب وتاب کے گہرے نقوش مرتسم کیے اور ہم عصر ہندوستان سے اپنی گوناگوں خوبیوں، امتیازات اور خصوصیات کا لوہا منوایا، ان میں ایک انتہائی روشن وتابناک نام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بھی ہے، جنھیں ان کے قدردانوں نے بہ جا طور پر ''شیخ الاسلام'' اور ''شیخ العرب والعجم'' جیسے وقیع القاب سے نوازا، کہ اسلامی علوم میں ان کی گیرائی وگہرائی، بہ طور خاص علومِ حدیث میں ان کی متخصصانہ شان اور اس حوالے سے عرب وعجم کے وسیع تر دائرے میں ان کی خدمت وشہرت، ملکی وعالمی سیاست وتاریخ کے مدوجزر سے ان کی بصیرت مندانہ واقفیت، اسرار ورموزِ دینی کے معاملے میں ان کی تہ رسی ودوروں بینی، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ان کی بے پناہ قربانیاں اور اس راہ میں ان کی ضرب المثل جاں فروشی، بے خوفی اور جرأت وبے باکی، کسرِ نفسی، خلوصِ کامل اور ایثار جیسے نبویؐ صفات میں ان کی یکتائی وانفرادیت اسی کی متقاضی تھیں۔

بلاشبہ حضرت شیخ الاسلامؒ نہ صرف اپنی اُس عظیم الشان درس گاہ کے علمی فیضانات کے حسین پرتو تھے، جو اپنے قیام سے لے کر آج تک عالمِ اسلام میں دینی علوم کی خدمت اور اشاعت وترویج کے حوالے سے بین

اقوامی سطح پر متمیز شناخت رکھتی ہے؛ بلکہ وہ اس تحریکِ جہد وجہاد کے بھی جاں سپار رکن تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کی اولاد واحفاد سے شروع ہوئی اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجرِ مکیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، فقیہ النفس ومجاہدِ آزادی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے راستے ان تک پہنچی تھی، وہ اپنے وقت میں عظیم الشان عالمِ دین اور محرمِ اسرارِ نبوت بھی تھے، بے باک اور شعلہ بہ جاں مجاہد بھی، تصوف وسلوک کے امام بھی اور اخلاق واقدارِ اسلامی کے سب سے بڑے قدردان اور ان کا پیکرِ محسوس بھی۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یا تو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی سرگرمیوں میں گزرا یا دارالعلوم دیوبند کی مسندِ تدریس سے تشنگانِ علومِ نبوت کو سیراب کرنے میں یا پھر اپنے منتسبین ومعتقدین کی روحانی واخلاقی تربیت میں؛ یہی وجہ ہے کہ بے پناہ صلاحیتوں کے باوصف ان کی تصنیفی خدمات بہت کم ہیں، کہ ان کے قلم کو خاطر خواہ جولانیوں کا موقع ہی کب میسر آیا؟ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قلم سے جو بھی تحریریں معرضِ وجود میں آئیں، وہ نہ صرف علمی وتاریخی نکتہ طرازیوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں؛ بلکہ وہ ادبی ولسانی خوبیوں کے حسین شہ پارے بھی ہیں۔

مولانا کے رشحاتِ قلم میں خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' کے علاوہ ''اسیرِ مالٹا''، ''متحدہ قومیت اور اسلام''، ''مکتوباتِ شیخ الاسلام''، ''مودودی دستور وعقائد کی حقیقت''، ''ایمان وعمل'' اور ''سلاسلِ طیبہ'' ہیں، جب کہ جمعیتِ علمائے ہند کے مختلف اجلاسوں میں پیش کیے گئے صدارتی خطبات کا مجموعہ ''خطباتِ صدارت''، ترمذی شریف جلد اول کے درسی افادات کا مجموعہ ''معارفِ مدنیہ'' (مرتبہ: مولانا طاہر حسن امروہوی) اور بخاری شریف کی درسی تقریروں کا مجموعہ ''درسِ بخاری'' (مرتبہ: بحرالعلوم مولانا نعمت اللہ اعظمی، تلمیذ حضرت شیخ الاسلام ومحدث دارالعلوم دیوبند) بھی ہیں، جو گو باضابطہ آپ کے قلم سے نہیں نکلی ہیں، مگر انھیں بھی اس ذیل میں شامل کیا جاسکتا ہے، کہ وہ آپ ہی کے الفاظ ہیں، جنھیں تحریر کے پیراہن میں پیش کیا گیا ہے۔

۱- نقشِ حیات

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، پھر اسے یک جا کر دیا گیا اور اب یہ ایک ہی جلد میں دست یاب ہے، اس وقت سے لے کر اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن ہندوپاک کے مختلف مکتبوں سے چھپ چکے ہیں، یہ کتاب اپنے آپ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، یہ صرف مولانا کی سوانح

ہی نہیں؛ بلکہ اس وقت کی عالمی سیاسیات میں برپا ہونے والے ہیجانات کا علمی، منطقی و تاریخی تجزیہ بھی ہے، اس کو لکھنے کی وجہ آپ کے شاگردوں اور نیاز کیشوں کا غیر معمولی اصرار تھا، جو چاہتے تھے کہ خود آپ کے قلم سے آپ کے حالاتِ زندگی مرتب ہو کر آجائیں؛ تا کہ بعد والوں تک آپ کی زندگی کا درست تر نقشہ بھی پہنچ جائے اور وہ ان حالات سے بھی بہ خوبی واقف ہو جائیں، جن سے آپ، آپ کے استاذِ گرامی (حضرت شیخ الہندؒ) اور بیسویں صدی کے مسلمان گزرے اور ان کے سامنے ان قربانیوں کی بچی جھلکیاں بھی آجائیں، جو اسلامیانِ ہند نے آزادیِ وطن کی خاطر پیش کیں اور کسی بھی قسم کی بزدلی، کم ہمتی اور پس گردی کو آڑے نہ آنے دیا، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اس کتاب کے ''تعارف اور وجہِ تالیف'' کے تحت لکھتے ہیں:

''۱۹۴۲ء میں جب آپ نینی تال جیل میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو بعض خدام اور بے تکلف احباب نے آپ سے سوانحِ حیات قلم بند کرنے کی درخواست کی؛ تا کہ اس طرح اکابرِ امتِ مرحومہ کے اس اسوے کا بھی اتباع کامل ہو جائے، جس کو امامِ اعظم ابوحنیفہؒ، امام الحدیث احمد ابنِ حنبلؒ اور دوسرے مقدس اساطین نے اپنے اخلاف کے لیے یادگار چھوڑا ہے، اول اول آپ نے انکار کیا؛ لیکن جب عرض و گزارش نے اصرارِ پیہم کی شکل اختیار کر لی، تب مجبور ہو کر قلم اٹھایا اور اپنی زندگی سے متعلق چند صفحات لکھ دیے، مگر جنبشِ قلم جب اس موڑ پر پہنچی، جہاں سے وہ اپنے مقدس استاذ شیخ الطریقت حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کا رفیق بن کر میدانِ سیاست میں گام زن ہوا تھا، تو اس کے سامنے سب سے اہم اور وقیع یہ مسئلہ آیا کہ آخر شیخ الہندؒ اور ان کے رفقائے کار نے یورپین اقوام خصوصاً انگریزی اقتدار کی مخالفت میں سیاست کی پُر شور اور ہنگامہ آرا زندگی کیوں اختیار کی؟...... چناں چہ حضرت مصنف کے سامنے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ آیا، یہ پوری جلد، جو آپ کے سامنے ہے، اس کا بیش تر حصہ اسی سوال کا مدلل جواب ہے، دوسری جلد میں قطب العالم، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی سیاسی تحریک کے وہ گوشے، جو اب تک پردۂ خفا میں تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ بھی جن کو بے نقاب نہیں کر سکی تھی، ان کی نقاب کشائی کی گئی ہے''۔(1) اور خود صاحبِ سوانح نے بھی وجہِ تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے

''عرصۂ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانح عمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے، حسبِ موقع و سوال میں جواب دیتا رہتا تھا، بعض احباب نے مختلف اخباروں اور رسائل میں ان کو شائع بھی کر دیا، مگر افراط و تفریط اور زیادتی و کمی سے وہ مضامین خالی نہیں رہے اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں، جن کے تذکرے پر اصرار کیا گیا کہ صحیح واقعات قلم بند کر دیے جائیں، بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظر بندی کی نوبت آئی اور جب کہ میں نینی تال جیل، الہ آباد میں تھا، تو اس کی پرزور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تو تجھ کو بہت سی

مصروفیات سے نجات حاصل ہے، اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کر دینا چاہیے؛ کیوں کہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے تذکرے کے آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور مشعلیتِ راہ بھی ہے اور نعمائے الٰہیہ کی تحدیث کی عمدہ صورت بھی''۔(۲)

کتاب کے شروع میں آپ نے اپنے خاندان کے حالات بیان کیے ہیں، جن میں آپ کے خاندان اور سلسلۂ نسب کا بھی مفصل اور سیر حاصل تذکرہ ہے، پھر اپنی ابتدائی تعلیم کے واقعات، اس کے بعد دارالعلوم دیو بند میں حصولِ تعلیم کی تفصیلات اور اساتذہ کا ذکرِ خیر ہے، اس ذیل میں آپ نے ان تمام شخصیات کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے کسی نہ کسی عنوان سے آپ کو متاثر کیا۔

مولانا نے اس کتاب میں اپنے فن کی خاص رعایت کی ہے، اپنے تعلق سے لکھتے وقت ان نکات واحوال کو خصوصی طور پر مدِ نظر رکھا ہے، جو قاری کی نگاہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، سوانح نگاری اور بالخصوص خودنوشت سوانح نگاری ادب کی انتہائی نازک صنف مانی جاتی ہے، خودنوشت سوانح نگار کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماڈل بنا کر پیش نہ کرے، کہ اس کی تحریر خودستائی وخودنمائی کا مرقع بن کر رہ جائے؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے حادثات وواقعات کو بغیر کسی تحفظ کے جوں کا توں بیان کرے؛ تا کہ اس کی شخصیت کا واقعی سراپا قاری کے سامنے کھل کر سامنے آجائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے، تو نہ صرف یہ کہ اس فن کی روح کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے؛ بلکہ اس قسم کی سوانحِ حیات کسی اعتنا کے قابل نہیں سمجھی جاتیں، مولانا کو اس حقیقت کا کامل ادراک تھا؛ اس لیے آپ کے قلم کی روش پوری طرح فن کے مقتضیات کو پورا کرتی ہے، آپ کہیں بھی یہ ایہام بھی نہیں ہونے دیتے کہ سوانح نگار اپنے وقت کا ایک زبردست عالم، محدث، صوفی اور مجاہد ہے؛ بلکہ آپ اپنے کو ایک عام آدمی کی طرح پیش کرتے ہیں، جس کی زندگی کا آغاز ایسے ہی ہوا جیسے کہ دیگر لوگوں کی زندگی کی شروعات ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کے بچپن کے اس واقعے سے بہ خوبی ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

''مجھ کو ہوش وحواس جب آئے، تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا، بانگرمؤ (جہاں آپ کی پیدائش ہوئی تھی) بالکل یاد نہیں، والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم وتربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لیے والدِ مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے، ہر بچے کو، جب وہ چار برس کا ہو جاتا تھا، پڑھنے کے لیے بٹھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے اور یاد نہ کرنے اور کھیلنے پر خوب مارتے تھے؛ اس لیے مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے، جب اس عمر کو پہنچا، تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی، اس کے بعد سیپارہ پڑھنا پڑتا تھا، صبح ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے

کھانا کھا کر والدِ مرحوم کے ساتھ اسکول جانا پڑتا تھا، اسکول الہ داد پور سے تقریباً ایک میل یا اس سے کچھ زائد دوری پر ہے، اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانے میں خوب مار پیٹ کرتے تھے''۔(۳)

اس اقتباس سے حضرت کے گھر کے علمی ماحول اور والدین کی اولاد کی بہترین علمی واخلاقی تربیت سے غیر معمولی دل چسپی کا احساس ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول اور وراثت دونوں اثر انداز ہوتے ہیں؛ اس لیے اپنی سوانح اس انداز سے پیش کی کہ قاری کو معلوم ہو جائے کہ سوانح نگار کس حد تک وراثت کا منت کش ہے اور اس کی نشو و بلوغ میں کس حد تک ماحول اور گرد و پیش کی کارفرمائی ہے، یہ ذہن میں رہے کہ ماحول اور وراثت دونوں ایک حد تک ہم آہنگ بھی ہیں اور بہت حد تک ان میں ایک دوسرے سے بے گانگی بھی ہے، سوانح نگاروں کا ایک حلقہ وراثت کی زیادتیِ تاثیر پر زور دیتا ہے، جب کہ دوسرا حلقہ ماحول کو شخصیت کی تعمیر میں زیادہ اثر انداز مانتا ہے، اگرچہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ وراثت اور ماحول دونوں تعمیر و تشکیلِ شخصیت کے جوہری عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں؛ لیکن ان دونوں کے ساتھ خود شخصیت کے اندر بھی ایک خاص عنصر ہوتا ہے، جو خالص مذاقی یا انفرادی نوعیت کا ہوتا اور جس کے بغیر کسی بھی ذات کی تعمیر نقطۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی، یہی وہ مقام ہے جس سے اگر صاحبِ سوانح صحیح طور سے عہدہ برآ نہ ہو سکے، تو وہ اپنے راستے سے بھٹک جاتا اور پھر اس کا قلم مختلف وادیوں میں قلابازیاں کھاتا اور اس کی تحریریں افراط و تفریط کی تنگنائیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، مولانا نے اس مقام پر بھی فنی نزاکتوں کو مکمل طور پر محسوس کیا اور کہیں بھی اس فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے اور اپنے مخصوص اندازِ بیان میں اس منزل کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دل چسپیوں کا باعث بن گئی ہیں۔

شروع میں یہ عرض کیا گیا کہ ''نقشِ حیات'' صرف مولانا کے احوالِ زندگی کی دستاویز ہی نہیں؛ بلکہ یہ اس دور کی سیاسیات و معاشرت کی مشاہداتی، تجرباتی و مطالعاتی تاریخ بھی ہے؛ اس لیے جب ہم اس کتاب کے اس حصے کا مطالعہ کرتے ہیں، جس میں انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے، تو ہمارے سامنے اس وقت کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی بھرپور نقشہ کشی سامنے آتی ہے اور ان پر آپ کی گہری نظر کا بھی مکمل احساس ہوتا ہے۔

سوانح نگار اگر چاہے، تو کسی معمولی سے واقعے کو پھیلا کر اسے ایک مکمل کتابی شکل میں پیش کر سکتا ہے؛ لیکن یہ وصف کوئی پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا، ضرورت سے زیادہ تحریر کے پھیلاؤ سے پڑھنے والا اکتا جاتا ہے اور پھر اس کے لیے اس کتاب کو از ابتدا تا انتہا پڑھ ڈالنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے اور اگر اسے ختم کر بھی لیا جائے، تو قاری کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا اور اس کا دماغی ظرف جوں کا توں خالی رہ جاتا ہے؛ لیکن ''نقشِ حیات'' میں یہ

نقص کہیں بھی نہیں پایا جاتا، اس کے مطالعے سے قاری کے احساس وشعور میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ صاحب سوانح نے بڑے بڑے اور اپنے پہلو میں تاریخ کی تہ بہ تہ پرتیں رکھنے والے واقعات کو بھی انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں بھی کتاب کے مرکزی خیال سے انحراف کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، کتاب کے بعض حصوں میں ایسے تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، جو اپنے دامن میں دراز نفسی لیے ہوئے ہیں، مگر ان کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ طوالت بھی ان کے قلم کی ایک خوبی اور بیان پر ان کی مہارت کی واضح دلیل بن گئی ہے۔

> ''نقشِ حیات'' میں کہیں بھی کسی قسم کی پیچیدگی، انکاؤ اور الجھاؤ نہیں ہے، مولانا اپنی عملی زندگی میں خواہ شخصی ہو یا اجتماعی ومعاشرتی، جس طرح اجلے کیریکٹر اور شفاف وواضح کردار کے انسان تھے، ان کی زندگی کا ہر گوشہ ہر ناحیے سے کھلی کتاب کی مانند تھا، جسے ہر شخص بہ آسانی دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا، اسی طرح ان کی تحریریں بھی اپنے مظاہر اور معنویت کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، انہوں نے جس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا ہے، پوری باریک بینی، ژرف نگاہی اور آگاہی کے ساتھ اٹھایا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کے عمل وکردار کی طرح ان کی نگارشات میں بھی بھرپور سادگی اور وضوح ہے، محشر اعظمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:
>
> ''نقشِ حیات میں کسی جگہ الجھاؤ نہیں ملتا، مولانا نے عملی زندگی میں جس طرح ایک واضح، صاف اور متعین راہ اختیار کی تھی، ان کی تحریروں میں بھی وہی بات ملتی ہے، شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور ایک ہی شان نظر آتی ہے اور کہیں بھی کوئی ایسا موڑ نہیں ملتا، جہاں قلم نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہو اور ادائیگی مطلب کے لیے جن الفاظ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، وہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، مولانا جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اور جس مقصد کے لیے انہوں نے قلم کو جنبش دی، قاری اسے بہ خوبی سمجھ لیتا ہے، نہ کہیں کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل ہے، نہ کہیں شک کی کوئی گنجائش موجود ہے''۔(۴)
>
> ''نقشِ حیات'' مولانا کی ایسی تصنیف ہے، جس میں ان کا اسلوب نگارش ایک خاص انداز میں جلوہ گر ہے، جو بہت ہی سنجیدہ اور جامع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک طرح کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے، ذاتی تفصیلات وجزئیات عام طور پر ایسی ہوتی ہیں، جن سے بعض اوقات قاری اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے؛

اس لیے اپنی باتوں کو پیش کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، اگر بات اختصار طلب ہے، تو اس کو طول دینے سے گریز کرنا چاہیے اور اگر وہ تفصیل چاہتی ہے تو اسے پھیلا کر لکھنا چاہیے، مولانا کے زورِ قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ خالص ذاتی معاملات کی جزئیات میں قاری کو زیادہ دیر نہیں الجھاتے؛ بلکہ ''نقشِ حیات'' میں پیش کیا گیا ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ کسی نہ کسی خاص پسِ منظر کا حوالہ ہے، مثلاً جہاں پر انہوں نے اپنی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، وہ حصہ ان کی زندگی کے آئینے میں ہندوستان بھر کی سیاسی واجتماعی حالات کی عکاسی کرنے والا ہے، انہیں اس بات پر کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مطلب کو اس واضح انداز میں سمجھا دیتے ہیں کہ قاری کے ذہن ودماغ میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے احساس ووجدان میں تحریک کی شمع لو دینے لگتی ہے۔

''نقشِ حیات'' کا ایک اور اہم گوشہ یہ ہے کہ مولانا نے اس میں پیش کیے گئے ہر واقعے کو دلائل، شواہد اور مستند اعداد وشمار سے مبرہن کیا ہے؛ چناں چہ جہاں آپ نے انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے ہاتھوں ہندوستان کی تجارت ومعیشت ومعاشرت کی تاراجی کو بیان کیا ہے، تو اسے مدلل کرنے کے لیے خود انگریز مؤرخین کی تصانیف سے حوالے پیش کیے ہیں، اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس قلب ودماغ پر چھا جاتا ہے کہ صاحبِ کتاب کو تاریخ اور اس کے مآخذ سے حیرت ناک آگاہی ہے، مولانا جہاں مذہبی اور علمی معاملات میں جابہ جا قرآنی آیات اور حدیثی استدلالات کا مضبوط سہارا پکڑتے اور ان کے ارشادات کی روشنی میں اپنے موقف اور نظریے کی قوت ووقعت پر برہان قائم کرتے ہیں، وہیں تاریخی واقعات کے تذکرے اور تجزیے کے وقت اس فن کی امہاتِ کتب کے حوالے سے اپنا زاویۂ نگاہ پیش کرتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کسی بھی اعتبار سے شک وریب میں مبتلا نہ ہو؛ بلکہ اس کا ذہن یقین کی سرور بخشیوں سے سرشار ہو جائے، بہ قول محشر اعظمی:

''نقشِ حیات میں زیادہ تر انگریزی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے، جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا، اس کی دولت لوٹی اور پھر اپنے احسانات بھی جتائے اور ہر طرح اپنے عیب وجرم کو چھپانے کی کوشش کی، مولانا نے خود انہی کی

تحریروں سے انہیں بے نقاب کردیا اوران کی تمام قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ ثابت کردیا کہ انگریز ظالم تھے، انہوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں اپنی خوں خواری کا پورا ثبوت دیا۔“(۵)

خلاصہ یہ ہے کہ نقشِ حیات اپنے وقت کے ایک عظیم عالم ومحدث، تحریکِ آزادی کے کفن بردوش مجاہد اور شب زندہ دار زاہد کی سیر حاصل داستانِ حیات بھی ہے، جوانتہائی سادگی، سنجیدگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی بیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی ومعاشرتی نشیب وفراز کی سچی اور حقیقت نما تصویر بھی۔

۲۔اسیرِ مالٹا

یہ آپ کی اس وقت کی تصنیف ہے، جب آپ کا قلم جوان تھا، اس کے شروع کے صفحات میں حضرت شیخ الہندؒ کے امتیازی اوصاف وشمائل کو بہت ہی دل آویز اسلوب، انتہائی پرکشش طرز اور ایسے شیریں وسحر انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ قاری ان میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے، مثلاً شروع کے یہ چند جملے:

”اس نے بحرِ امدادی سے فیوضات حاصل کیے، مگر ڈکار نہ لی، اس نے قاسمی نہریں پی ڈالیں، مگر ہضم کرگیا، اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دھار بادلوں کو چوس لیا، مگر کبھی بے اختیار نہ ہوا، دعویٰ نہ کیا، شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا، شریعت کو نہ چھوڑا، عشق میں گھل کر لکڑی ہوگیا، مگر دم نہ مارا......“(۶)

چند صفحات تک تو یہی شاعرانہ سحر انگیزانہ اسلوب ہے، مگر پھر مولانا کا قلم بہ تدریج سادگی وسنجیدہ بیانی کی وادیوں میں اتر گیا ہے، کتاب کے بقیہ حصے میں تحریر کا یہ رنگ نہیں ہے، اس کتاب میں مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی کے نقطۂ آغاز سے لے کر مکۂ معظمہ کے سفر، وہاں تک پہنچنے اور پہنچنے کے بعد کی روداد، شریفِ مکہ کی آپ کے تئیں بدگمانی، پھر مکے میں محبوسی، وہاں سے مصر (جیزہ) کو روانگی اور مصر کی ایک ماہ کی اسارت کے بعد ۱۵رفروری ۱۹۱۷ء (۲۳رربیع الثانی ۱۳۳۵ھ) کو مالٹا کی روانگی، سفر کے احوال، مالٹا کی مدتِ محبوسیت میں شب وروز کی سرگرمیوں، حضرت شیخ الہندؒ کے سلسلۂ تدریس وترجمۂ قرآنِ پاک کے معمولات، حضرت کے دیگر رفقا مولانا حکیم نصرت حسینؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا وحید احمدؒ اور حضرت مدنیؒ کے شبانہ روز کے اشتغالات، مولانا حکیم نصرت حسینؒ کے سانحۂ ارتحال کی روداد، پھر تین سال کی اسارت کے بعد رہائی اور وہاں سے دیوبند تک آمد کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، تتمہ کے تحت کرنل اشرف بیگ، جو حکومتِ ترکی کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور ان کی اپنی ایک علیحدہ فوج تھی، جو خلافتِ عثمانیہ کے لیے کام کرتی

تھی، صنعاء یمن کے امام یحییٰ نے گورنر انور پاشا کو خط لکھا تھا کہ تم اشرف بیگ کو اپنی فوج کے ساتھ بھیج دو، میں اپنی اور ان کی فوج کے ساتھ مل کر شریف حسین (جس نے خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت کی اور پورے حجاز میں ترکی حکومت کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کر کے وہاں سے اس کا خاتمہ کروادیا) پر چڑھائی کروں؛ تاکہ اس سے اس کی اسلام دشمنی وانگریز وفاداری کا بدلہ لیا جائے؛ چناں چہ انور پاشا نے کرنل اشرف کو بھیج دیا؛ لیکن مدینے میں ہی انہیں اور ان کی فوج کو شریف حسین کے گرگوں نے دھرلیا، دونوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہوئی، بالآخر کرنل اشرف کی فوج پسپا ہوگئی اور انہیں گرفتار کر کے اسی جماعت کے ساتھ، جس میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقا تھے، مالٹا بھیج دیا گیا، مولانا مدنیؒ نے ان کا، ان کے خاندان کا اور مالٹا کے قیام کے دوران ان کے شریفانہ اخلاق ومعاملات اور حضرت شیخ الہندؒ کے تئیں ان کے غیر معمولی جذبۂ احترام وتکریم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، کتاب کے اخیر میں تقریباً سات صفحات میں حضرت شیخ الاسلامؒ کا بھی اجمالی تذکرہ شامل ہے، تذکرہ نویس محمد مبین خطیب ہیں۔

۳۔ مکتوباتِ شیخ الاسلام

یہ چار جلدوں پر مشتمل آپ کے خطوط کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے معتقد ومعتمدِ خصوصی مولانا نجم الدین اصلاحی نے مرتب کیا ہے، یہ مکتوبات متنوع معلومات کا گنجِ شایگاں ہیں اور ان سے آپ کی بلند وبالا شخصیت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے، یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ذات اسلامی فضائل اور دینی اوصاف کمالات کی جامعیت کے لحاظ سے اپنے دور میں ایک بے مثال شخصیت کی حیثیت رکھتی تھی، آپ اسلامی وعربی علوم وفنون، سلوک ومعرفت اور تصوف وسلوک کے ایک ناپیدا کنار سمندر تھے، قدرت نے آپ کے اندر علم وعمل کی جملہ خوبیاں جمع کردی تھیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مکتوبات میں ان کی جھلکیاں بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں، یہ خطوط وہ ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں اپنے مریدین، معتقدین، دوستوں، عزیزوں، رشتے داروں اور شاگردوں کو لکھے ہیں، ان خطوط کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک حصہ تو ان خطوط کا ہے، جن میں علمی، دینی یا معاشرتی سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، آپ کے دوست، اعزہ اور نیاز مند اکثر کسی نہ کسی مسئلے میں آپ کی رہ نمائی کے خواہاں ہوتے اور آپ کو خط لکھا کرتے تھے، آپ ان کے خطوط کو اولاً انتہائی توجہ سے پڑھتے اور پھر حسب حال انہیں ان کے سوالات کے جوابات لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے، آپ کے زیادہ تر خطوط ایسے ہی ہیں اور یہ بات بلا کسی شبہے کے کہی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کی علمیت اور وسعتِ نظری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ان خطوط کو دیکھ کر کوئی بھی انسان آپ کی معلومات کی کثرت

اور علم وفضل کی بے کرانی کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،ان میں تفسیر، حدیث، فقہ وفتاویٰ، علمِ کلام وعقائد، سلوک ومعرفت، تاریخ وسیر اور اقتصادیات واخلاقیات کے ٹھوس حقائق پر سیر حاصل اور بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور کمال تو یہ ہے کہ اکثر وبیشتر خطوط دورانِ سفر یا ایامِ اسیری میں انتہائی عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، مگر اس کے باوصف وہ مستقل مضمون اور علمی وتحقیقی شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی ایک اور خاص صفت، جس کا بار بار احساس ہوتا ہے، وہ ان کی بلا کی ذہانت ہے، عام طور پر مولانا آزادؒ کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ ان کو دینیات اور تاریخیات کے ساتھ بے شمار فارسی اشعار اور غزلیات نوک برزبان تھیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ مولانا آزادؒ کی ذہانت عجوبۂ روزگار تھی، جس کا اعتراف انہوں نے حداثتِ سن ہی میں مولانا حالیؒ، مولانا محمد حسین آزادؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے نابغہ اہلِ علم وقلم سے کروالیا تھا اور ان کے معاصرین کو بھی اس کا اقرار تھا، ایک موقعے پر اردو کے عظیم ادیب، ناقد اور شاعر ماہر القادری نے مولانا آزاد کا شناس نامہ متعین کرتے ہوئے بہ جا طور پر کہا تھا کہ:

''ابوالکلام ذہانت کا نام ہے''، وہ اپنی تقریروں کی مانند تحریروں میں بھی قرآنی آیات، احادیث اور دیگر عربی کتب کے حوالے، مفکرین اور دانش ورانِ عالم کے اقوال وآرا اور عموماً فارسی کے اشعار بے تکلف اور برملا استعمال کرتے، انہیں ایک خاص سلیقے سے برتتے اور اپنی تحریروں کو علمی وادبی ہر اعتبار سے انتہائی پرکشش اور جاذبِ قلب ونگہ بنادیتے تھے، یہ رنگ ویسے تو ان کی تمام تحریروں میں ہے، مگر ''غبارِ خاطر'' میں (جو قلعۂ احمد نگر کی نظر بندی کے عرصے میں لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے) خاصا گہرا ہے، جب ہم مولانا مدنی کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہانت بھی آزادؒ کے ہم قدم ہے، کسی بھی مسئلے پر لکھتے وقت آپ نے قرآن وحدیث کے منصوصات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے، مشائخ اور اولیاے کرام کے ملفوظات کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا ہے، جہاں کہیں کتابوں کے حوالے آئے ہیں، وہاں ان کی عبارتیں انہی کے الفاظ میں نقل کی ہیں اور بعض اوقات ان کے صفحے تک نوٹ کرتے چلے گئے ہیں، اسی طرح اشعار کے استعمال میں بھی مولانا مدنیؒ نہ صرف مولانا آزادؒ کے شریک ہیں؛ بلکہ یک گونہ ان پر فوقیت بھی رکھتے ہیں، وہ اس طرح کہ مولانا آزاد کے یہاں عام طور پر فارسی اشعار ہی ملتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر ایسے، جن میں رندی وخواری کا تذکرہ ہے؛ لیکن اس کے برعکس مولانا مدنیؒ کے خطوط میں فارسی کے ساتھ اردو کے بہترین اشعار اور غزل کے اشعار بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور صرف اسی قدر نہیں؛ بلکہ ہندی کے بھی نرم ونازک اور رسیلے اشعار خاصی تعداد میں ان کے خطوط میں موجود ہیں۔

مجموعۂ مکتوبات کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں، جو بالکل ذاتی اور نجی نوعیت رکھنے والے ہیں، ان میں

جہاں اس وقت کے سیاسی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور مولانا نے اپنے سیاسی نظریات کی وضاحت کی ہے، ہو سکتا ہے ہر پڑھنے والا اس سے متفق نہ ہو، کہ یہ ممکن بھی نہیں، مگر پھر بھی ان کی اس اہمیت سے مجال انکار نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے زمانے کے ''شیخ الاسلام'' کے افکار سیاسی کے بلاواسطہ ترجمان ہیں اور تاریخی دستاویز بھی۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ خطوط کسی بھی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں، جس میں اس کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے، کوئی بھی آدمی کسی کے ذروں وبُروں سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو، تو وہ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی بھی فیصلہ کن پوزیشن تک پہنچ سکتا ہے؛ کیوں کہ یہ وہ تحریر ہے، جو بغیر کسی بناوٹ اور سجاوٹ کے لکھی جاتی ہے؛ کیوں کہ خطوط نہ تو اظہار علم کا ذریعہ ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی ذات کو بلند آہنگ طریقے سے پیش کرنے کا وسیلہ؛ بلکہ یہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملات کے تئیں خطوط نگار کی بے ساختہ رائے کا اظہاریہ ہوتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ خطوط کے آئینے میں کوئی بھی شخصیت اپنے اصلی خط وخال سمیت منعکس ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے بھی اگر ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کا مطالعہ کیا جائے، تو پڑھنے والا مکتوب نگار کی مقناطیسی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بے ساختہ طور پر خود کو ان سے قریب ہوتا ہوا، ان کی جانب کھنچتا ہوا اور ان سے متاثر ہوتا ہوا پائے گا۔

جہاں تک ان خطوط کی زبان کا تعلق ہے، تو وہ عموماً انتہائی سادہ، رواں، سلیس، شگفتہ اور ہر نوع کی پیچیدگی سے مبرا ہے، یہاں تک کہ آپ نے جا بہ جا انگریزی کے الفاظ بھی جملوں میں اس خوبی سے کھپائے ہیں کہ قاری کے ذوق ووجدان کو اس کی اجنبیت نہیں کھٹکتی؛ بلکہ اسے ایک طرح کی چاشنی اور لذت کا لطف آگیں احساس ہوتا ہے، البتہ جہاں آپ نے کسی خاص علمی وباطنی مسئلے کی وضاحت کی ہے، وہاں قدرے خشکی پائی جاتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں؛ کیوں کہ وہ مکتوب جس میں خالص علمی، اخلاقی اور باطنی مباحث ہوں، انہیں مکمل طور پر ادبی آہنگ میں نہیں ڈھالا جا سکتا، کہ اس سے مکتوب نگار کے مقصودِ اصلی کے فوت ہو جانے کا دھڑکا پیدا ہو جائے گا اور اصل بات، جو وہ مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتا ہے، الفاظ کی رنگینیوں میں کھو جائے گی، محشر اعظمی نے غالب کے خطوط اور مولانا آزاد کے غبارِ خاطر سے مکتوباتِ شیخ الاسلام کا کا موازنہ کرتے ہوئے عمدہ تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مکتوبات کا کون سا اسلوب پسندیدہ ہے اور کون نہیں، یہ تو اپنے اپنے ذوق کی باتیں ہیں، کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی، بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا، کسی نے مولانا آزاد کی غبارِ خاطر اس وجہ سے پڑھی کہ اس میں ایک خاص قسم کی چاشنی ہے، الفاظ کی سجاوٹ ہے، جملوں کی خوب صورت ترکیب ہے اور خیالات کی

رنگینی کے ساتھ معلومات کا دریا موج زن ہے اور مکتوباتِ شیخ الاسلام کو اس وجہ سے پسند کیا جاسکتا ہے کہ اس میں خالص علمی وروحانی باتیں ہیں، ایسے خطوط جن میں صرف زبان وبیان کی خوبی ہو اور ان میں کوئی بنیادی خوبی نہ ہو، ان کے مطالعے سے قاری کو ایک لذت تو مل سکتی ہے، لیکن اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، ہمارے اس نقطۂ نظر پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، پھر خطوط ومکاتیب میں اس کا کیا سوال؟ تو یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے اور ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے؛ لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم دوسروں کے مکتوب کیوں پڑھتے ہیں؟ اور کسی کے مکتوب پڑھتے وقت ہمارے دل میں کیا خیال پیدا ہوتا ہے؟ وقت اور دماغ صرف کرنے کے بعد ہمیں کیا ملتا ہے؟ دوسروں کے مکتوب ہم اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان سے ہمیں کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو، جو تحریر ہمارا وقت اور دماغ لے کر بھی ہمیں کچھ نہ دے سکے، تو اسے پڑھنے کا کیا حاصل؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خطوط ومکاتیب الفاظ وتراکیب کا حسین مجموعہ تو ہوں، ساتھ ہی ان میں افادیت بھی ہونا چاہیے، مکتوباتِ شیخ الاسلام میں بیش تر مکتوبات ایسے ہیں، جو تعلیم وہدایت کے آئینہ دار ہیں اور کسی نہ کسی کے استبصار پر لکھے گئے ہیں، وہ خطوط، جن میں علمی، اخلاقی، فقہی اور باطنی مباحث ہوں، انہیں اس سے زیادہ رنگ نہیں دیا جاسکتا''۔(۷)

ان مکتوبات سے منتخب کرکے دو دگر مجموعے بھی مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک ''معارف وحقائق'' ہے، جسے حضرت مدنیؒ کے داماد اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے سابق مہتمم مولانا رشید الدین حمیدیؒ نے مرتب کیا ہے، اس میں تصوف وسلوک، فقہ، علمی حقائق، عملیات، اذکار وادعیہ، تعبیر الرؤیا، تاریخ، سیاسیات اور دیگر متفرق موضوعات سے متعلق منتخب تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے اور دوسرا ''فتاویٰ شیخ الاسلام'' ہے اور اس میں خالص فقہی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے، اس کے جامع ومرتب حضرت مدنیؒ کے نواسے اور ممتاز عالمِ دین وصاحبِ قلم مفتی محمد سلمان منصور پوری ہیں۔

۴۔ متحدہ قومیت اور اسلام

۸؍جنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں صدر بازار دہلی کے ایک جلسے میں مولانا مدنیؒ نے تقریر فرمائی، جس کا بڑا حصہ ۹؍جنوری کے روزنامہ ''تیج'' اور ''انصاری'' دہلی میں شائع ہوا، اس جلسے میں روزنامہ ''الامان'' (اس کے

مدیر مولانا مظہر الدین شیر کوٹی فاضلِ دیو بند تھے، جو پکے مسلم لیگی تھے) کا رپورٹر بھی موجود تھا، اس نے اپنے حساب سے اس تقریر کی رپورٹنگ کی اور اس کے بعد اسے ''الامان'' میں شائع کر دیا گیا، پھر اس سے ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' لاہور نے بھی نقل کیا اور یہ جملہ مولانا سے منسوب کر دیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں؛ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔

اُدھر علامہ اقبال، جو اپنے وقت کے بے مثال اسلامی شاعر اور مفکر تھے اور وہ بھی ایک عرصے تک قومی نظریے کی حمایت میں لکھتے، بولتے اور اس کی ہم نوائی کرتے رہے تھے، ان کی مشہور نظم ''ہمالہ'' اور ''ترانہ ہندی'' اسی دور کی یادگار ہیں، مگر جب انہوں نے یورپ کا دورہ کیا اور وہاں کی تہذیب، طریقۂ زندگی، سیاسی نظریات و افکار کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہاں سے واپس ہوئے، تو ان کا سیاسی نقطۂ خیال بدل چکا تھا، انہوں واپسی کے بعد قومی راہ نماؤں کو خطوط لکھے، اخبارات میں اپنے مضامین شائع کروائے اور مسلمانوں کو دو قومی نظریے پر ابھارنا شروع کر دیا اور چوا ، کہ اس وقت مسلم لیگ کا اساسی نظریہ یہی تھا؛ اس لیے علامہ اقبالؒ اسی کی حمایت و موافقت میں جٹ گئے، انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے شمال مغربی ہندوستان کی علیحدگی کی تجویز پیش کی اور اسے وطن کی معاشرتی مشکلات اور ہندو مسلم منافرتوں کا حل بتلایا، اس کے بعد ان کے افکار کی ساری توانائی اور تخیلات کی تمام تر بلند پروازیاں اسی خیال کو تقویت پہنچانے اور قوم پرست علما اور لیڈران پر پھبتیاں کسنے میں صرف ہوئیں۔

''الامان'' کے واسطے سے نقل شدہ خبر جب علامہ موصوف کو پہنچی، جو ان کے نظریے کے سخت خلاف تھی، تو انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ پر سخت تنقید کی اور اس کا اظہار اپنی ایک سہ بیتی میں یوں کیا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ای چہ بوالعجبی ست؟
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست
چہ بے خبر زمقامِ محمدِ عربیؐ ست
بہ مصطفیٰؐ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

علامہ اقبال کے یہ اشعار روزنامہ ''احسان'' میں شائع ہوئے، اس کے بعد پورے ملک میں ہنگامہ،

بے چینی اور خلش کا ماحول پیدا ہو گیا، جہاں علامہ اقبالؒ کے حامیین مولانا مدنیؒ کے خلاف زبان درازی و قلم درازی پر اتر آئے، وہیں خود حضرت کے متوسلین کی طرف سے بھی جوابِ آں غزل کے طور پر تحریروں اور بیانات کا اک سلسلۂ دراز شروع ہو گیا، جو کسی آن تھمنے کا نام نہ لیتا تھا، مولانا کی طرف سے وضاحتی بیان بھی شائع ہوا، جس میں آپ نے اپنی جانب منسوب کیے گئے جملے کی تردید کی تھی، اسی کے بعد اعظم گڑھ کے مشہور شاعر اقبال سہیلؒ نے بھی علامہ اقبالؒ کے خلاف انہی کی بحر میں ایک لمبی اور تیز و تند نظم کہی تھی، جس کے اشعار کچھ یوں تھے:

کسے کہ خردہ گرفت بر حسین احمد
زبانِ او عجمی وکلام در عربی ست
دروغ گوئی وایراد، ایں چہ بوالعجبی ست
درست گفت محدث کہ قوم از وطن ست
کہ مستفاد زفرمودۂ خدا ونبی ست
زبانِ طعن کشودی وایں نہ دانستی
کہ فرقِ ملت وقوم از لطائفِ ادبی ست
تفاوتے ست فراواں میانِ ملت وقوم
یکے زکیش ودگر کشوری ست یانسبی ست
خدائے گفت بہ قرآں "لکل قوم ہاد"
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی ست
بہ قومِ خویش خطابِ پیمبراں بہ نگر
پُر از حکایتِ "یاقوم" مصحفِ عربی ست
رموزِ حکمتِ ایماں زفلسفی جستن
تلاشِ لذتِ عرفاں زبادۂ عنبی ست
بہ دیوبند درآ گر نجات می طلبی
کہ دیو نفس سلحشور و دانشِ تو صبی ست
بہ گیر راہِ حسین احمد گر خدا خواہی
کہ نائب ست نبیؐ را وہم زآلِ نبی ست

خوش قسمتی سے ایک دردمند اور باشعور و ذی فہم مسلمان (جو عالمِ دین بھی تھے اور ادیب وصحافی بھی) جنہوں نے مصلحتاً اپنا نام طالوت (اصل نام عبدالرشید نسیم) رکھ لیا تھا، حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لیے حضرت مدنی کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس کا حضرت مدنی نے جواب دیا اور اپنی تقریر کا مدعا بہ وضاحت بیان کیا، پھر انہوں نے ان کے خط کا اقتباس علامہ اقبالؒ کی خدمت میں ارسال کیا، جس کو دیکھنے کے بعد علامہ موصوف نے اپنا تبصرہ واپس لے لیا اور فرمایا کہ: ''میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا...... مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں''۔(۸)

علامہ اقبال کا یہ اعتراف نامہ ''احسان'' کے علاوہ ۵ر مارچ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوا تھا، خیر! علامہ اقبال نے تو اپنی بات واپس لے لی، مگر ان کا وہ قطعہ ''ارمغانِ حجاز'' کے ترتیب کاروں نے نہ معلوم کن مصلحتوں کے تحت چھاپ دیا اور اب تک یہ سلسلۂ زبوں جاری ہے؛ حالاں کہ علامہ کے بعض دوستوں اور ماہرینِ اقبالیات کی یہ رائے تھی کہ اگر وہ ان کی زندگی میں چھپتی، تو یہ اشعار اس میں شامل نہ کیے جاتے، خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

''ارمغانِ حجاز'' اگر حضرت علامہ کی زندگی میں چھپتی، تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی''۔(۹)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی ''سرگزشتِ اقبال'' میں تحریر کیا ہے:

''اگر وہ ''ارمغانِ حجاز'' کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے، تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے، جن میں مولانا حسین احمد مدنیؒ پر چوٹ کی گئی تھی''۔(۱۰)

ماہرِ اقبالیات وشارحِ کلیاتِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''حقیقتِ حال سے واقف ہونے کے بعد علامہ نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور وہ اشعار محض اس وجہ سے ''ارمغانِ حجاز'' میں راہ پا گئے کہ اس اعتراف کے محض تین ہفتوں کے بعد علامہ وفات پا گئے اور انہیں یہ ہدایت دینے کا موقع نہ مل سکا کہ ان اشعار کو ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل نہ کیا جائے، اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ''ارمغانِ حجاز'' میں اس نظم کے ساتھ یہ صراحت کر دی جائے کہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد علامہ مرحوم نے ان اشعار کو کالعدم قرار دے دیا تھا، تو بہت اچھا ہو! کیوں کہ اس تصریح کی بہ دولت قارئین حضرتِ اقدسؒ کے خلاف سوءِ ظن سے محفوظ ہو جائیں گے''۔(۱۱)

مولانا حکیم فضل الرحمن سواتی نے بھی حافظ شیرازؒ اور مسٹر محمد علی جناح کے تعلق سے علامہ موصوفؒ کے ایرادات سے رجوع کی تفصیلات تحریر کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے۔(۱۲)

بر سرِ مطلب:

حضرت مدنی کا رسالہ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' اسی پسِ منظر میں تحریر کیا گیا ہے، حضرت نے اس بحث کے خاتمے کے بعد ارادہ کیا کہ اپنے نظریے کو واضح اور مدلل طور پر علامہ موصوف کے سامنے پیش کر دیں؛ تا کہ ان کے دل سے شبہات واشکالات کا کانٹا بھی نکل جائے اور انہیں اپنے ان تسامحات کا بھی ادراک ہو جائے، جو ان سے قوم اور ملت کی تشریح کے دوران سرزد ہوئے، کہ ناگاہ علامہ کے سانحۂ ارتحال کا حادثۂ جاں کاہ رونما ہو گیا اور آپ کے عزم وارادے پر اوس پڑ گیا، آپ نے رسالے کے آغاز میں لکھا ہے:

''بالآخر جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصدِ اصلی سے نقاب اٹھانا چاہتا تھا، ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے وصال کی خبر شائع ہو گئی، اس ناساز اور دل گداز خبر نے خرمنِ خیالات وعزائمِ افکار پر صاعقہ کا کام کیا، طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہو گئے، تحریر شدہ اوراق کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دینا ہی انسب معلوم ہوا''۔(۱۳)

مگر جن لوگوں نے اس بحث کو دیکھا اور سنا تھا، انہیں اس سے غیر معمولی دل چسپی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت مدنیؒ کی مفصل تحریر سامنے آئے؛ تا کہ صورتِ مسئلہ بے غبار ہو کر کے اطمینانِ قلب کا باعث ہو؛ اس وجہ سے آپ نے اس تعلق سے اپنی لکھی ہوئی تحریروں کو یک جا کر کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔

یہ کتاب متعلقہ مسئلے پر انتہائی مدلل اور محقق ہے، آپ نے پہلے تو قوم، ملت اور امت پر امہاتِ کتبِ لغت کی روشنی میں پُر مغز گفتگو کی ہے اور ان کے ادبی لطائف کو آشکار کیا ہے، اس کے بعد نبیِ پاکؐ کے طرزِ عمل سے متحدہ قومیت کے تصور کو ثابت کیا ہے، اس سلسلے میں آپ نے اس معاہدے کو بنیادِ تحریر بنایا ہے، جو آپؐ نے مدینہ پہنچنے کے بعد وہاں کے قبائلِ یہود سے کیے تھے، آپ نے اس کی چند دفعات کا ذکر کیا ہے، جن میں صراحت ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا مذہبی امور میں تو اپنے اپنے مذہب کا ہی پابند ہوگا، مگر ملکی، سیاسی اور جنگی امور میں سب ایک اور متحد ہوں گے اور ایک دوسرے کے حلیف، اس سلسلے میں آپ نے جمعیۃ علماے ہند کے اجلاس منعقدہ پشاور دسمبر ۱۹۲۷ء میں پیش کردہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خطبۂ صدارت سے بھی استدلال کیا ہے، جس میں انہوں نے بھی میثاقِ مدینہ کو متحدہ قومیت کی اساس قرار دیا تھا، اسی طرح گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء میں کی گئی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ کی اس معرکہ آرا تقریر کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مذہب کے معاملے میں میں اول، دوم اور آخر مسلمان ہوں اور سوائے مسلمان کے کچھ بھی نہیں اور جن امور کا تعلق ہندوستان سے، اس کی آزادی سے اور اس کی فلاح و بہبود سے ہے، تو ان

میں میں اول ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور آخر ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح سرسید مرحوم کی مختلف تحریریں بھی استشہاداً پیش کی ہیں، آپ نے انگریز مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ متحدہ قومیت کے نظریے سے اختلاف اور دوقومی نظریے کی بانگ بلند کرنا، یہ انگریزی تدبیر اور چال بازی کا نتیجہ تھا۔

یہ رسالہ گو ایک خاص پسِ منظر میں لکھا گیا تھا، مگر آج، جب کہ دوقومی نظریوں اور اسلامیت کی بنیاد پر حاصل کیا گیا خطۂ زمین تمام تر غیر اسلامی دھماچوکڑیوں کی آماج گاہ بن چکا ہے اور وہاں بسنے والی اسلامی نسل کا لحہ لحہ ہلاکتوں، بربادیوں اور بیش از بیش خطرات کے مایا جال میں گھرا ہوا ہے، اس کی وقعت وافادیت پہلے سے کئی گونہ بڑھ گئی ہے۔

۵۔ مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت

یہ دراصل ایک مکتوب ہے، جو آپ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک ایسے فاضل کو لکھا تھا، جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہو گئے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ جمہورِ امت اور جماعتِ اسلامی کا اختلاف محض فروعی ہے، اصولی نہیں ہے، اس مکتوب کو مکتبہ دارالعلوم نے خوبصورت کمپوزنگ کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کے شروع میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کا بصیرت افروز اور فصیح وبلیغ مقدمہ ہے، جس میں آپ نے مشہور حدیث شریف "تفترق امتي علی ثلث وسبعين فرقة الخ" کی روشنی میں صحابہؓ کے معیارِ حق ہونے پر انتہائی وقیع گفتگو کی ہے، آپ نے قرآن وحدیث کے استشہادات کی روشنی میں صحابۂ کرامؓ کی عدالت، معیاریت اور بالاتر از تنقید ہونے کو ثابت کیا ہے، اس کے بعد ۴۴ صفحے میں حضرت مدنیؒ کی تحریر ہے، جس میں آپ نے انتہائی سلجھے ہوئے اور سنجیدہ اسلوب میں جماعتِ اسلامی کے دستور کی دفعہ نمبر ۶: "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں نہ مبتلا ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو، اس کو اسی درجے میں رکھے" کا علمی، منطقی وتحقیقی تجزیہ کرتے ہوئے اس کو ماننے کی صورت میں اس پر مرتب ہونے والے خطرناک عواقب ونتائج پر سیر حاصل بحث کی ہے، آپ نے اعاظمِ رجالِ حدیث امام ابوزرعہ رازیؒ، حافظ ابن عبدالبرؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ ابنِ ہمامؒ اور ملا علی قاریؒ کے حوالے سے صحابۂ کرامؓ کے تئیں اہلِ سنت والجماعت کے متفق علیہ ومعتبر عقیدے کو واضح کیا ہے اور اسی ذیل میں آپ نے مولانا مودودی صاحبؒ کی ان فکری لغزیدہ پائیوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں، جو ان سے ان کی مشہور کتاب "تفہیمات" میں سرزد

ہوئی ہیں، اس کے بعد قرآنِ کریم کی ایسی نو آیتوں کو بہ طورِ استشہاد پیش کیا ہے، جن میں صراحتاً تمام صحابۂ کرامؓ کی تعدیل، توثیق اور ان کے فضائلِ عالیہ کا ذکر ہے، پھر بارہ ایسی صریح حدیثیں بیان کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے انفراداً یا اجتماعاً صحابۂ کرام کی ستائش کی ہے، اپنے بعد انہیں واجب الاتباع بتلایا ہے اور ان کے نقوشِ پا کو مشعلِ راہ بنانے کی تلقین کی ہے...... بلاشبہ یہ کتاب صحابہؓ کے حوالے سے مبنی بر حق عقیدہ رکھنے والوں کے اطمینانِ قلب کا ذریعہ اور انصاف پسند نفوس کی آنکھیں کھول دینے کا وسیلہ ہے۔

۶۔ ایمان و عمل مع اعتراضات و جوابات

یہ اصل میں بیس صفحات کا ایک رسالہ تھا، جس میں حضرت مدنیؒ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ وہ فرض عبادات کے تارک اور گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو قطعاً مسلمان نہیں سمجھتے اور اسے خارج از ایمان گردانتے ہیں، پھر آپ نے جمہورِ امت اور ائمۂ سلف کے اقوال و تحریرات کی روشنی میں مولانا مودودی کی تحریروں کا جائزہ لے کر ان کی متشددانہ قلم رانیوں سے مسلمانوں کو باخبر کیا تھا، کسی صاحب نے وہ تحریر مولانا مودودی تک پہنچادی اور انہوں نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" کے مارچ ۱۹۵۳ء کے شمارے میں مولانا مدنی پر یہ الزامات لگائے کہ انہوں نے میری تحریروں کے سیاق و سباق پر غور و تامل اور انصاف پسندانہ نظر ڈالے بغیر میرے بارے میں وہ رائے ظاہر کی ہے، جو انہیں نہیں کرنی چاہیے تھی، وہ تحریر آپ کی نظر سے گزری، تو آپ نے پھر مولانا مودودی کی تحریروں کا محاسبہ کرتے ہوئے خالص علمی و تحقیقی پیرایے میں اس عقیدے کو مبرہن و مدلل فرمایا کہ مرتکبِ کبیرہ اور تارکِ فرائضِ شرعیہ ایمان سے خارج نہیں ہے اور یہی تمام اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، جب کہ مولانا مودودی کی تحریریں مرتکبِ کبیرہ اور تارکِ فرائض کو ایمان سے خارج کرتی ہیں، جیسا کہ خوارج اور معتزلہ وغیرہ کا عقیدہ ہے...... یہ رسالہ اس کے باوجود کہ ایک عظیم الشان اختلافی موضوع پر لکھا گیا ہے (اور اسی وجہ سے اس میں جابہ جا قرآن و حدیث اور کبارِ مفسرین و محدثین کے اقوال سے استدلال کیا گیا ہے) مولانا کا اسلوب انتہائی سنجیدہ، ناصحانہ اور حق پژوہ قلوب کے لیے بے پناہ کشش رکھنے والا ہے۔

۷۔ مکتوبِ ہدایت

یہ بھی مکتبہ دارالعلوم سے شائع شدہ ہے، یہ تحریکِ جماعتِ اسلامی کے کسی بڑے عالم کو لکھا گیا ایک جوابی خط ہے، اس میں آپ نے مولانا مودودی کی تمام تر تحریروں کی روشنی میں ان کے فکری انحرافات، جمہورِ امت سے ان کے سوءِ ظن، کج رو فرقِ اسلامیہ سے ان کے خیالات کے قرب، اسلام کے معتد علیہ لٹریچر کے

ایک بڑے حصے سے ان کی بدگمانی اور قرنِ اول سے لے کر بعد تک کے بہت سے محسنینِ امت پر ان کے ذوقِ چھینٹا کشی کی نشان دہی کی ہے، اس میں دو دو گر فتاوے بھی شامل ہیں، جن میں یہی باتیں مزید تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہیں، ایک مفتی مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ کا فتویٰ بہ عنوان ''آئینۂ تحریکِ مودودیت'' اور دوسرا مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ (مفتی مظاہرِ علوم، سہارن پور) بہ عنوان ''کشفِ حقیقت'' ہے، ان دونوں میں مولانا مودودی کی تحریروں کے اقتباسات کی روشنی میں ان کی تحریک کی کج ادائی کو واضح کیا گیا ہے، اس میں مسئلۂ متعلقہ پر ایک مختصر فتویٰ مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کا بھی ہے۔

۸۔ الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب

اس کتاب میں حضرت مدنیؒ نے مسلکِ بریلویت کے بانی مولانا محمد رضا خان کی ان تلبیسات کا جائزہ لیا ہے، جو انہوں نے سرکردہ علماے دیوبند کے خلاف پھیلائیں اور ہندی مسلمانوں کو ان سے بیزار کرنا چاہا تھا، اس کا تفصیل آمیز اجمال یہ ہے کہ ۱۳۲۴ء (۱۹۰۶ء) میں انہوں نے ان علماے دیوبند کی طرف خالص کفریہ عقائد منسوب کر کے ایک تحریر تیار کی اور اس کی روشنی میں حرمین شریفین کے علما و فقہا سے فتاویٰ حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے حجاز کا سفر کیا، وہاں کے اکثر علمانے تو نہ صرف اس کی تصدیق کرنے سے صاف انکار کر دیا؛ بلکہ ان کے فسادِ نیت اور کج فہمی و علمی نارسائی پر ان کی خوب خبر بھی لی، مگر بعض سادہ لوح علمانے ان کی تصدیق بھی کر دی؛ چناں چہ واپسی کے بعد خان صاحب نے دو رسالے ''تمہیدِ شیطانی'' اور ''حسام الحرمین'' کے نام سے شائع کیے اور پورے ہندوستان میں یہ ڈھنڈورا پیٹنے لگے کہ علماے حرمین نے ان دیوبندی علما کی تکفیر کی ہے اور ان کے عقائد سے برائت کا اظہار کیا ہے، یہ محض اتفاق تھا کہ فراغت کے بعد سے حضرت مدنیؒ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے اور انہیں معلوم بھی ہو گیا تھا کہ مولانا احمد رضا خان یہاں آئے تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؛ چناں چہ جب وہ ہندوستان پہنچے اور دیکھا کہ خان صاحب کیا گل کھلا رہے ہیں، تو ان کے دجل و فریب کی قلعی کھولنے اور علماے دیوبند پر لگائے گئے ان کے بے سروپا الزامات کی تردید کے لیے آپ نے یہ رسالہ لکھا، اس رسالے کے دو باب ہیں: پہلے باب میں علماے حرمین سے فتویٰ لینے میں خان صاحب کے مکر و فریب کی تفصیلات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرا باب نو فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں علماے دیوبند پر لگائے گئے الزامات و افتراءات پر گفتگو کی گئی ہے، پہلی فصل حضرت نانوتویؒ پر لگائے گئے اتہامات کے تفصیلی تذکرے کو محیط ہے، دوسری فصل میں عقیدۂ ختمِ نبوت پر کلام کیا گیا ہے، تیسری فصل میں حضرت گنگوہیؒ پر لگائے گئے الزامات کا بیان ہے، چوتھی فصل میں مسئلۂ امکان و امتناع کی تنقیح کی گئی ہے، پانچویں فصل میں مولانا خلیل احمد

سہارن پوریؒ پر خان صاحب کی تہمتوں کا بیان ہے، چھٹی فصل میں مولانا سہارن پوری کی تصنیف "براہین قاطعہ" کی متعلقہ عبارت کے صحیح مفہوم کی نشان دہی ہے، ساتویں فصل میں مولانا سہارن پوریؒ پر لگائی گئی دوسری تہمت کا تذکرہ ہے، آٹھویں فصل میں حضرت تھانویؒ کے تعلق سے خان صاحب کی یاوہ گوئیوں کا محاسبہ ہے اور آخری فصل میں حضرت تھانویؒ کی تصنیف "حفظ الایمان" کی اس عبارت کی توضیح ہے، جس کو بنیاد بنا کر خان صاحب نے ان کے خلاف زبان وقلم کا بے محابا استعمال کیا تھا، پوری کتاب انتہائی محقق ہے اور اس کا لفظ لفظ حضرت مدنیؒ کے بے پناہ علم اور وسعتِ نگاہی کی منہ بولتی تصویر ہے۔

۹۔ سلاسلِ طیبہ

علمائے دیوبند شروع ہی سے نہ صرف علم وفضل کے اعتبار سے مقامِ ممتاز کے حامل رہے ہیں؛ بلکہ وہ تصوف وسلوک کے بھی امام رہے ہیں، بانیانِ دارالعلوم سے لے کر اس کے فضلا میں سے بیشتر نے اپنے اپنے وقت میں اس میدان میں بھی اپنی خاص شناخت بنائی اور جاہلانہ طریقت اور رسمی ولایت کا پرچار کرنے کی بہ جائے اس طریقت وولایت کی نمایندگی کی ہے، جس کا سرا نبی پاک ﷺ تک پہنچتا ہے، حضرت مدنیؒ بھی اپنے وقت کے باکمال صوفی اور ولیِ کامل تھے، آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں تھی، آپ کو بیعت وخلافت حضرت گنگوہیؒ سے حاصل تھی، "سلاسلِ طیبہ" میں آپ نے صوفیا کے چاروں طریقوں (قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی) کے اوراد واشغال اور ان کے منظوم شجروں کو طالبین وسالکین کی آسانی ورہ نمائی کے لیے یک جا کردیا ہے۔

۱۰۔ حضرت مدنی کا ایک انتہائی تحقیقی مقالہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اور ان کی آمد کے بعد ہندوستان کی تعلیمی حالت پر ہے، اس میں محقق ومستند اعداد وشمار کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اور مغلیہ دورِ حکومت میں ہندوستان کی تعلیمی حالت انتہائی بہتر؛ بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے لیے باعثِ رشک تھی، یہاں تعلیم گاہوں کی کثرت، حصولِ علم کے دیگر وسائل وذرائع کی بہتات اور علم وعلما کا دور دورہ تھا، خواہ دینی ومذہبی علوم ہوں یا عصری وپیشہ ورانہ علوم ہر ایک میں یہاں کے باشندے یکہ تاز ہوا کرتے تھے؛ لیکن جب انگریزوں کے ناپاک قدم اس ملک پر پڑے، تو جہاں انھوں نے سیاسی ومعاشی اعتبار سے اس کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی شیطانی تدبیریں کیں، وہیں یہاں کے باشندوں کو فکری وعلمی طور پر اپاہج بنادینے میں بھی اس عیار ومکار قوم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی، ہوسکتا تھا کہ یہ بات بہت سے "اسکالروں" اور "دانش وروں" کو اوپری معلوم ہو؛ اس لیے آپ نے اپنی بات کو خود انگریزی مصنفین کی تحریروں سے مدلل کیا ہے اور ان کے بیانات کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ انگریزی سامراج نے کس طرح اس ملک کا علمی وفکری استحصال

کرنے کی سازشیں رچیں؛ تاکہ ہندی قوم ذہنی وفکری اعتبار سے مفلوج ہوجائے اور ذلت واستعباد کی زندگی پر راضی ہوکر حصولِ آزادی کے شعور سے بیزار ہوجائے، یہ مقالہ حضرت مدنی نے ۱۹۴۳ء میں تحریر کیا تھا، جب کہ جدوجہد آزادی پورے شباب پر تھی، اسی زمانے میں اسے ایک رسالے کی شکل میں مجلسِ قاسم المعارف دیوبند نے چھاپا تھا، پھر یہ نایاب ہوگیا تھا، اتفاق سے اس کا ایک نسخہ کہیں سے عالم اسلام کے معروف عربی وارد و ادیب وصحافی مولانا نور عالم خلیل امینی کو ہاتھ لگ گیا، انہوں نے اس کی غیر معمولی اہمیت ووقعت کو محسوس کیا اور اس کو عربی کے قالب میں ڈھال کر اولاً دار العلوم دیوبند کے عربی مجلہ ماہ نامہ ''الداعی'' میں قسط وار شائع کیا، پھر ان کی تحریک وترغیب پر شیخ الہند اکیڈمی نے اسے ''الحالة التعليمية في الهند قبل الاستعمار الانجليزي وفيما بعده'' کے نام سے بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ چھاپا ہے اور یہ مکتبہ دار العلوم دیوبند میں دست یاب ہے۔

حضرت مدنیؒ کے مختلف بکھرے ہوئے مقالات اور چند ایک تقریروں کا بھی مولانا امینی نے ''بحوث في الدعوة والفكر الاسلامي'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے اور وہ بھی اکیڈمی سے طبع شدہ ہے۔

حواشی

۱۔ (ص:۴-۵، مطبوعہ: مکتبہ دینیہ، دیوبند)

۲۔ (ص:۷)

۳۔ (ص:۴۴)

۴۔ (روزنامہ الجمعیۃ، ''شیخ الاسلام نمبر'' ص:۱۷۲)

۵۔ (ایضاً ص:۱۷۳)

۶۔ (ص:۸، مطبوعہ: مکتبۃ الفضل، دیوبند)

۷۔ (روزنامہ الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۷۴)

۸۔ (پروفیسر یوسف سلیم چشتیؔ، اقبالؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۸۳)

۹۔ (الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، بہ حوالہ: اقبال ریویو، جنوری ۱۹۶۹ء، ص:۶۷)

۱۰۔ (ص:۴۷۵)

۱۱۔ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی، اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، مشمولہ: الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۸۳)

۱۲۔ (ڈاکٹر اقبالؒ کی چند تنقیدات وترجیعات، مشمولہ: الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۸۵-۳۹۰)

۱۳۔ (ص:۶، مطبوعہ: مجلسِ قاسم المعارف، دیوبند)

تحریک آزادی میں

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا حصہ

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، پٹنہ

تحریک حریت و آزادی میں علماء ہند نے ہراول دستہ کے طور پر کام کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب کہا ہے، ''دنیا کی تاریخ میں عام طور پر مذہبی لوگوں نے ہر آنے والے انقلاب اور آزادی کا راستہ روکا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال مختلف ہے، یہاں کے علماء نے انقلاب اور آزادی کیلئے ہراول دستہ کے طور پر کام کیا ہے۔''

۱۸۰۳ء میں ہندوستان کی آزادی ختم ہورہی تھی اور انگریزوں کی حکومت قائم ہورہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف کسی میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ ٹھیک اسی وقت حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا۔ ساتھ ہی آپ کے داماد حضرت مولانا عبدالحیؒ نے اعلان کیا ''دہلی سے کلکتہ تک انگریز کے خلاف جنگ کرنا خدائی فیصلہ ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ علماء کی جماعت نے ہندوستان کی آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے کارنامے تاریخ آزادی کے اہم باب ہیں۔ ہندوستان کے علماء جنہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں.... حضرت شیخ سید احمد شہیدؒ، مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا امام بخش صہبائی شہیدؒ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، مفتی صدرالدین خاں آزردہؒ، حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا منیر احمد شہیدؒ، مولانا احمداللہ مدراسیؒ، مولانا عبداللہ صادق پوریؒ، مولانا عنایت علی صادق پوریؒ، مولانا ولایت علی صادق پوریؒ، مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ، مولانا محمد سجاد بہاریؒ، شیخ الہند محمود حسنؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد منصور میاں انصاریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ کے نام خاص طور قابل ذکر ہیں۔ انہیں میں سے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے، جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ میں قصبہ بانگر مئو میں ہوئی۔ آپ کا آبائی وطن موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے۔ ۱۳۰۹ھ میں جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی، آپ کو دیوبند حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ حضرت شیخ نے آپ کی تعلیم وتربیت شروع کی۔ تعلیم وتربیت سے فارغ ہو کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہو گئے۔ ۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد محترم نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیت اللہ کے لئے ہجرت کا ارادہ کیا، تو آپ بھی ان کے ساتھ حجاز تشریف لے گئے، اور وہاں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں رہ کر مزید تربیت حاصل کی۔ پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اور حضور ﷺ کے جوار میں رہ کر فیوض وبرکات حاصل کئے، اور حرم نبوی میں درس وتدریس شروع کیا۔ آپ کا حلقہ درس روز بروز ترقی کرتا رہا۔ آپ صحاح ستہ کے علاوہ تفسیر اور فقہ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد سے درس شروع ہو کر عشاء کے بعد تک جاری رہتا۔ آپ کی شہرت عرب سے نکل کر دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ اور شیخ کے خطاب سے مشہور ہو چکے تھے۔

حضرت شیخ مدنیؒ نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور حضرت شیخ الہندؒ کے مشن کو تکمیل تک پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ آپ سچے محب وطن تھے۔ آپ ہر چیز اپنے ملک ہی کے پسند کرتے تھے۔ اگر کوئی بہترین صابن جو باہر کا ہوتا، آپ کی خدمت میں پیش کرتا، تو آپ اس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیتے۔ اگر مصلی بدیسی کپڑے کا ہوتا تو اس پر نماز نہیں پڑھتے تھے۔

حضرت شیخ مدنیؒ ہندوستان کی آزادی کا فریضہ مسلمانوں پر سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ اور اس کے لئے دلائل پیش کرتے تھے۔ چنانچہ تحریر فرماتے تھے، اگرچہ یہ فرض تمام ہندوستانیوں کے لئے ہے مگر مسلمانوں پر یہ فریضہ سب سے زیادہ ہے، چند وجوہ سے۔

(الف) ہندوستان مسلمانوں کا حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آبائی وطن ہے۔

(ب) مسلمان کو مرنے کے بعد بھی اسی سرزمین سے نفع اٹھانا ہے۔

(ج) ہمارے پیغمبر خاتم النبیین ﷺ سے پہلے یہاں بہت سے پیغمبر گذرے ہیں۔ ان سب کا دین اسلام ہی تھا۔ اگرچہ لوگوں نے اس میں تحریف وتبدیلی کر دی ہے۔

(د) انگریزی حکومت نے اس ملک کو مسلمانوں سے چھینا ہے۔

(ہ) اس ملک کی آزادی سے قرب وجوار کے اسلامی ممالک مثل یاغستان، افغانستان، ایران وغیرہ بہت سے مصائب وخطرات سے محفوظ ہو جائیں گے۔

(و) مقامات مقدسہ اور دیار عرب مصر، شام، فلسطین، سوڈان، شمالی ہند وغیرہ جن میں اسلامی آبادی ہے۔

اور ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے یہ سب غلامی کی بیڑوں میں جکڑے گئے ہیں، آزاد ہوسکیں گے۔

حضرت شیخ مدنیؒ ہندوستان کی آزادی کے متوالے تھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت آپ نے ہر موقع پر کی۔ تقریر و تحریر اور مجلسوں میں انگریزوں کے خلاف بیان آپ کا خاص موضوع ہوتا۔ حضرت شیخ الہند کو جب قید کر کے مالٹا میں بھیجا گیا تو حضرت شیخ مدنی بھی جیل گئے۔ ریشمی رومال تحریک کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری مکہ میں ہوئی۔ ریشمی رومال تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ترکی، ایران اور افغانستان میں اتحاد قائم کر کے ایک اجتماعی حملہ کرایا جائے۔ اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔ اسی سازش میں حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ حضرت مدنی بھی تھے۔ ۱۹۱۷ء کو جمعہ کے دن عدالت میں پیشی ہوئی۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں ''مجھ کو کچہری میں بلایا گیا اور مجھ سے بیانات لیئے گئے، چونکہ میں ہمیشہ سے فضول گو اور کثیر الکلام ہوں، میں نے زمین آسمان کے قلابے بہت ملائے۔ میرا بیان دو دن تک وہ لکھتا رہا۔ اور بار بار کہتا رہا کہ تم لوگوں کی نسبت ہمارے کاغذات میں تو باتیں پھانسی کی ہیں۔ مگر تم اقرار نہیں کرتے۔ آخر ثبوت فراہم نہیں ہوسکا۔ لہٰذا پھانسی سے نجات ملی اور مالٹا جانے کا حکم ہوا۔ اور ۱۵ر فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ جو سیاسی اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا۔ تین سال کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن آپ کو رہا کیا گیا۔ اور سرکاری نگرانی میں سیدی بشر میں ۱۸ر انھارہ روز اور عدلیس میں پونے دو ماہ قیام کرتے ہوئے ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے۔ اس طرح تین سال سات مہینے قید کے بعد رہائی ملی۔

پھر ۱۹۲۱ء میں حضرت مدنی کو کراچی جیل میں قید کر دیا گیا۔ ۲۹ر ستمبر کو کراچی جیل سے سیٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں لایا گیا۔ سیٹی مجسٹریٹ کا اجلاس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ تحریری بیان کا آخری جملہ تھا، اگر لارڈ ویڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں، حدیث کو مٹا دیں، اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔ بس کیا تھا مولانا محمد علی نے جزاک اللہ کہا اور بڑھ کر قدم بوسی کیا۔ پھر پورے مجمع نے جزاک اللہ اور مرحبا کہا۔ آپ کو اس لئے گرفتار کر کے کراچی جیل میں بھیجا گیا تھا، چونکہ آپ نے انگریزی حکومت میں پولس اور فوج کو حرام ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ ۹/۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کانگریس کا اجلاس ہوا، جس کی ایک تجویز میں پولس اور فوج کی ملازمت کو حرام قرار دینے کی تجویز تھی۔ یہ تجویز اس اجلاس کی چھٹی تجویز تھی۔ اس کو حضرت شیخ مدنی نے پیش کیا۔ مولانا محمد علی نے اس کو پڑھ کر سنایا اور کہا کہ یہ جلسہ کی کاروائی کا لب لباب ہے۔ پیر غلام مجدد نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر کچلو، مولانا نثار احمد اور مولانا شوکت علی نے اس کی تائید میں تقریریں کیں۔ تجویز کو فتویٰ کی شکل دی گئی، جس پر پیر غلام مجدد، مولانا

حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد نے دستخط کیے۔ جس کے نتیجہ میں دفعہ ۱۲۰ (ب) ۱۳۱ اور دفعہ ۵۰۵ تعزیرات ہند کے تحت گرفتار کر کے کراچی جیل بھیج دیا گیا۔ ۲۶ ر ستمبر ۱۹۲۱ء سے کراچی میں مقدمہ شروع ہوا۔ ۲۹ ر ستمبر کو فرد جرم لگا کر مقدمہ سیشن کے سپرد کیا گیا۔ ۲۹ ر ستمبر جس میں آپ کا بیان نقل کیا جا رہا تھا، آپ نے تقریر شروع کردی، تو آپ سے کہا گیا کہ تحریری بیان داخل کردیں۔ چنانچہ آپ نے تحریری بیان داخل کردیا۔ جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ مسلمان ہونے کے حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں قرآن مجید کے تمام ٹکڑوں، حرفوں اور کلمات پر ایمان رکھوں۔ حضرت محمد ﷺ کے فرمودہ احکام پر یقین رکھوں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی دنیوی طاقت قرآن مجید کے کسی حرف یا محمد ﷺ کے کسی حکم سے اس کو روکے، تو وہ نہ رکے۔ بلکہ ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ قرآن کے تمام احکام پر یقین کرے اور عمل کرے۔ پھر آپ نے انگریزی فوج میں ملازمت کے حرام ہونے پر دلائل پیش کیے۔ اور اخیر میں آپ نے فرمایا، اگر لارڈ ویڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں، حدیث شریف کو مٹادیں اور کتب فقہ کو برباد کردیں، تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔ مقدمہ ۲۴ ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو پیش ہوا۔ ۲ ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو دو سال کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اور آپ کو کراچی جیل میں قید کردیا گیا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی مرادآباد جیل کی اسارت بھی ہے۔ جمعیت علماء ضلع مرادآباد نے ۲۳/ ۲۴/ ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو قصبہ بچھراؤں میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس میں حضرت مدنی نے بھی شرکت کی۔ آپ نے جو تقریر کی، اس میں وہی باتیں بیان کیں جو عام طور پر بیان کرتے تھے۔ مگر چونکہ حکومت کی پالیسی بدلی ہوئی تھی، لہٰذا آپ کی تقریر کی نوٹ حاصل کرنے کے لئے خاص انتظام کیا گیا۔ اور مقدمہ مرتب کرکے وارنٹ کر دیا گیا۔ دیوبند میں گرفتار کرنا خطرناک تھا۔ اس لئے ۲۴ ر جون ۱۹۴۲ء کی رات میں جب آپ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ تلہری اسٹیشن پر پولیس سب انسپکٹر آپ کے پاس آیا اور گرفتاری کا وارنٹ پیش کردیا۔ رات کو سہارن پور حوالات میں رکھ کر صبح کو مرادآباد روانہ کردیا۔ اور مرادآباد جیل میں قید کردیا۔ ضمانت کے لئے بہت کوششیں کی گئیں، مگر تمام کوشش بے فائدہ رہی۔ اسپیشل مجسٹریٹ نے ۱۸ ر ماہ قید اور پانچ سو روپے کا جرمانہ کا حکم سنایا۔ اور اے کلاس کی سفارش کی، اس طرح ۲۵ ر جون ۱۹۴۲ء سے ۸ ر اگست ۱۹۴۲ء تک حضرت مدنی مرادآباد جیل میں تنہا رہے، پھر دوسرے حضرات بھی آگئے۔ اس طرح ۶ ر ماہ تک مرادآباد جیل میں رہے۔ ۶ ر ماہ کی سزا ۱۴ ر جنوری ۱۹۴۳ء میں ختم ہونے والی تھی، مگر اس کے ۴/ ۵ دن پہلے ہی ڈیفنس آف انڈیا رول کے تحت آپ کو غیر محدود عرصہ کے لئے نظر بند کردیا گیا۔ اور وہیں آپ کو رکھا گیا، اے اور بی کلاس کے نظر بند قیدیوں کی تمام رعاتیں بھی ختم کردی گئیں۔ جو کتب بینی یا خط و کتابت کے سلسلہ

میں حاصل تھی، چنانچہ نہ تو آپ کو کوئی خط مل سکتا تھا اور نہ کسی کو خط لکھ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی اخبار آپ کے پاس پہنچتا تھا، اور نہ کوئی کتاب رکھنے کی اجازت تھی۔ پھر اپریل ۱۹۴۳ء میں ۳ر کتابوں کے رکھنے کی اجازت ملی۔

کئی مہینے کے بعد ایک مہینہ میں ایک خط لکھنے کی اجازت ملی۔ اور ۱۹۴۴ء میں لکھنے پڑھنے کی وہ تمام رعایتیں مل گئیں، جو قانوناً آپ کو ملنی چاہئے تھیں۔ پھر جنوری ۱۹۴۳ء میں آپ کو نینی جیل الہ آباد میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں آپ ۱۹ر مہینہ جیل میں رہے، اس طرح ۲۴ر جون ۱۹۴۲ء سے ۶ر اگست ۱۹۴۴ء تک یعنی دو سال دو مہینہ دو دن آپ جیل میں رہے۔ آپ نے جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے جو خدمت انجام دیا وہ تاریخ آزادی کا اہم باب ہے۔

اس طرح ۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک ہندوستان آزاد ہوا۔

حضرت شیخ مدنیؒ تقسیم کے خلاف تھے جمعیت علماء پلیٹ فارم سے آپ نے ہندوستان کے تقسیم کی سخت مخالفت کی اس کے باوجود بھی جب ملک تقسیم ہوگیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔

ہندوستان کی آزادی میں حضرت مدنی نے بے لوث خدمت کی۔ دوسرے لیڈروں کی طرح انہوں نے اپنی خدمت کا کوئی ادنیٰ قیمت بھی وصول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب صدر جمہوریہ کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب عطا کیا گیا تو اس کو قبول کرنے سے معذرت کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ یہ ان کے اسلاف کے شیوہ کے خلاف ہے۔

آج ہم آزاد ہیں۔ ہندوستان کی آزادی میں شیخ مدنی کی قربانی مثالی رہی ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ حضرت مدنی اور ان جیسے مجاہدین آزادی کو یاد رکھے اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ان مجاہدین آزادی کے کارناموں کو ہر زبان میں شائع کر کے انہیں بہترین خراج عقیدت پیش کریں۔

حضرت شیخ مدنیؒ علمی شخصیت سے حامل تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے۔ ان کی شخصیت صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ شیخ العرب والعجم تھے۔ اس اعتبار سے حکومت کو چاہئے تھا کہ ان کے نام پر کوئی علمی کام کیا جاتا۔ کوئی یونیورسیٹی حضرت شیخ کے نام سے موسوم کی جاتی۔ کسی یونیورسیٹی میں آپ کے نام سے کوئی لائبریری قائم کی جاتی۔ اس طرح کے علمی کام کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر کے ان کے خدمات کا اعتراف کیا جاتا تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کے مقابلے میں کہ حکومت نے ان کے لئے یادگار کے طور پر یادگاری ٹکٹ جاری کیا ہے۔ اس یادگاری ٹکٹ کے جاری کرنے کے لئے حکومت ہند قابل مبارک باد ہے۔ لیکن اس کی بھی ضرورت ہے کہ مزید ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ اور ان کے نام پر کوئی ادارہ قائم کیا جائے تا کہ حضرت شیخ مدنیؒ کا مزید علمی فیض جاری وساری رہے۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

کی تواضع وانکساری

مولانا حمید اللہ قاسمی

معاون مدیر ماہنامہ "نقوش اسلام" مظفرآباد، سہارنپور

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ ہمارے اکابر میں سے بلند پایہ عالم دین، درویش خدامست بزرگ، صوفی باصفا، سیاسی رہنما اور جامع حیثیت کے مالک تھے، ان کی زندگی کے شب وروز میں، شخصیت کے ایک ایک پہلو میں، افکار کے ہر نکتے اور سیرت وکردار کی ہر جھلک میں، گفتار کے ایک ایک بول میں، عمل کے ایک ایک قدم میں ہمارے لئے ہزاروں عبرتیں، لاکھوں بصیرتیں اور عمل کے لئے لاتعداد مثالیں ہیں، بالفاظ دیگر وہ لوگ جو اللہ کی زمین پر اللہ کی بندگی، عبادت، انابت، عاجزی اور انکساری کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور ہزاروں انسانوں کے دلوں میں اپنی شرافت، محبت، اخوت اور مؤدت کے پھول کھلا جاتے ہیں، وہ اپنے مریدوں، شاگردوں، رشتہ داروں، احباب ومتعلقین کی یادوں اور دعاؤں سے کبھی محو نہیں ہوتے، ایسے ہی حضرت مدنی اپنی زندگی میں بھی مخدوم ومطاع تھے اور اس دنیائے فانی سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی اپنے عملی آثار وافکار اور علم وعمل کے میدانوں میں ہمارے لئے ایسے روشن نقوش چھوڑ گئے، جن میں ہماری رہنمائی کا بہترین سامان ہے، حضرت مدنی کے افکار وافادات اور حالات وواقعات کا مطالعہ ہمارے ذہن وفکر کی جلا، سیرت کی تعمیر، اخلاق کی تہذیب اور زندگی کے ہر موڑ کے لئے بہترین نمونہ ہے، غرضیکہ مولانا مدنی کی زندگی کا ہر گوشہ اور ہر پہلو اجاگر کرنے کے لائق ہے، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو بیان

کرتے ہوئے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ رقمطراز ہیں:

''حضرت اقدس مولانا الحافظ الحاج سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیو بند کی ذات ستودہ صفات بھی ہے، جو اپنے مخصوص فضائل وکمالات کے لحاظ سے بلاشبہ ایک فرد منفرد ہستی ہے، آپ نہ صرف عالم دین ہی ہیں بلکہ عارف باللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی ہیں، آپ کا علم عارفانہ، عمل مجاہدانہ اور اخلاق درویشانہ ہے، متضاد احوال ومقامات کو ایک دامن میں لئے ہوئے ہیں، ایک ہی وقت میں آپ دارالعلوم دیو بند جیسے مرکز علم ودین کی مسند تدریس کے نشین بھی ہیں، جن کے اردگرد سینکڑوں طلبہ زانوئے ادب تہہ کئے نظر آتے ہیں، اسی آن آپ جمعیۃ العلماء اور سیاسی اسٹیج کے مسند نشین بھی ہیں، جن کے دائیں بائیں ہزاروں مجاہد صفت انسانوں کا جھمگٹ لگا ہوا ہے اور پھر اسی ایک وقت میں آپ اپنے ریاضت کدہ میں خانقاہ نشین بھی ہیں، جن کے چہار طرف سینکڑوں ذاکروشاغل اور راہ باطن کے جویا افراد کا ہجوم ہے اور آپ کی جامع ذات ہے کہ ایک طرف آپ اپنے عالمانہ وقار ونکتہ سنجی سے، دوسری طرف مجاہدانہ جوش واقدام پسندی سے اور تیسری جانب عابدانہ تواضع وانکساری سے ہر دائرے کے طالبوں کی پیاس بجھا رہے ہیں اور ہر میدان میں آپ کی ہمت مردانہ اس طرح یکسانی کے ساتھ کام کر رہی ہے کہ کسی ایک میدان کی تگ وتاز دوسرے میدان سے بے التفات نہیں ہونے دیتی، غرضیکہ شریعت، طریقت اور سیاست جیسے متضاد رخ، مقامات کی سیر اور ان میں بیک وقت ان تھک عروج آپ کی ہمت مردانہ کا ایک عملی شاہکار ہے''۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اور بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، وہیں تواضع وانکساری جیسی اعلیٰ صفت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، علم وکمال اور تصوف میں بلند مقام پر پہنچ کر بھی نہ بدلے، بات چیت میں، رہن سہن میں، نشست وبرخاست اور کھانے پینے میں کوئی فرق نہ آیا، یہی کرامت اور تواضع وانکساری انہیں عنداللہ مقصود ومطلوب تھی: ؎

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں

اس زمین پست نے کیا کیا سماں پیدا کئے

حضرت مدنی کی تواضع وانکساری کے متعلق حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے کہ جب حضرت مدنی آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ اسٹیشن پر شرف زیارت کے لئے گئے، حضرت کے متوسلین میں سے ایک صاحبزادہ محمد عارف دیو بند تک ساتھ گئے، ان کا بیان ہے کہ ٹرین میں ایک غیر مسلم جنٹل مین جس کو قضائے حاجت لاحق ہوئی، وہ رفع حاجت کے لئے گیا اور الٹے پاؤں بادل ناخواستہ واپس آ گیا، حضرت مدنی سمجھ گئے، فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کیں اور لوٹا لے کر پاخانہ میں گئے اور اچھی طرح

صاف کردیا، اور ہندو دوست سے فرمانے لگے کہ جایئے پاخانہ تو بالکل صاف ہے، نوجوان نے کہا حضرت! میں نے ابھی دیکھا ہے، پاخانہ بالکل بھرا ہوا ہے، چنانچہ مولانا مدنی کے کہنے کی وجہ سے اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا، بہت متاثر ہوا اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا، یہ حضور کی بندہ نوازی ہے، جو سمجھ سے بالاتر ہے، مولانا احمد علی لاہوریؒ مزید فرماتے ہیں کہ "اسی طرح کسی دوسرے موقعہ پر جب حضرت مدنیؒ نے ٹرین میں پائخانہ صاف کردیا تھا تو اتفاق سے اسی ڈبہ میں خواجہ نظام الدین تونسویؒ موجود تھے، جب یہ عمل دیکھا تو اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ یہ کھدر پوش کون ہے؟ جواب ملا کہ یہ حسین احمد مدنی ہیں، تو خواجہ صاحب بے اختیار ہو کر حضرت مدنی کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے، حضرت نے جلدی پاؤں چھڑائے اور پوچھا کیا بات ہے؟ تو خواجہ صاحب نے کہا کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا، اگر آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید سیدھا جہنم میں جاتا، حضرت نے فرمایا میرے بھائی! میں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا ہے، اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کردیا تھا اور صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا، جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے آیا تو دیکھا کہ حضور صلی ا. رعلیہ وسلم بہ نفس نفیس اپنے دست مبارک سے بستر کو دھو رہے ہیں، یہ دیکھ کر وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔ (بیس بڑے مسلمان)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی کی تواضع وانکساری کے متعلق مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک شیخ الاسلام حضرت مدنی کا جو مقام ہوگا، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے؛ لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں، وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ حضرت مدنی کو حاصل تھی، دار العلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے، ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع وعریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد، اور فدائی، ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت وسیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام، ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع وانکساری اس قدر تھی کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو، وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کردینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لئے مضر ہو"۔

مزید فرماتے ہیں کہ سن ۱۳۴۳ھ کی بات ہے کہ میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا، ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا، اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی) نے شرکت فرمائی تھی، حضرت مدنی بھی تشریف لائے تھے، مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کے منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کھانے کا انتظام میرے والد صاحب نے اپنے یہاں کر رکھا تھا، جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا، اس لئے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا، اور سب حضرات سواری ہی سے آئے؛ لیکن حضرت مدنیؒ نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیازمند کو بطور راہنما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے، حالانکہ گرمی کا موسم تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا، فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا، سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی، دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور حضرت سے ان کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا، حضرت مدنی سے درخواست کی کہ حضرت! میرے گھر پر چل کر چائے پیجئے، مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو عجیب سی معلوم ہوئی، لیکن حضرت نے بغیر کسی عذر و معذرت کے قبول فرمالیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔ (سوانح حضرت مدنیؒ صفحہ ۱۵۸/۱۵۹ مطبوعہ جامعہ ابوہریرہ، پاکستان)

حضرت مدنی کی تواضع وانکساری کے متعلق مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دیوبند کے قریب کسی گاؤں میں میری تقریر کا پروگرام تھا، رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا، ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھ کو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیروں کو دبا رہا ہے، میں نے کہا خیر مجھ کو اس کی عادت بھی ہے، سوچا خادم ہوگا، مگر اسی کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے، باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جارہی ہے، سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں، فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا، حضرت! کیا ہم نے اپنے لئے جہنم میں جانے کا خود سامان پہلے سے کیا کم کر رکھا ہے، کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں، شیخ نے جواباً فرمایا کہ آپ نے دیر تک تقریر کی تھی، آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھ کو سعادت کی ضرورت، ساتھ ہی نماز کا وقت بھی قریب تھا، میں نے خیال کیا آپ کی نماز چلی نہ جائے، تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی؟۔ (مکتوبات جلد اول صفحہ ۴۲)

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں سادگی تواضع وانکساری اور فروتنی کے چشم دید حالات مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے سحر انگیز قلم سے یوں تحریر فرمایا ہے: "مولانا کی بزرگی کے قائل خوش عقیدہ

حضرات جس بنا پر ہوں اپنی نظر میں تو ان کی بڑی کرامت ان کا ایثار، تواضع، انکساری اور بے نفسی ہی ہے، علم وفضل، فقر ودرویشی کی بحثوں کو چھوڑیئے لیکن جہاں تک ....

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا ۞ خاکساری اپنی کام آئی بہت

اس شعر کا تعلق دیکھنے والوں کی نظر میں اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں اور محمد علی جوہر نے یہ شعر تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے حق میں کہا تھا؛ لیکن صادق مولانا مدنی رحمہ اللہ پر لفظ بلفظ آ رہا ہے:

ان کا کرم ہی انکی کرامت ہے ورنہ یہاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

دوسروں کو کام لینے میں شاید وہ لطف نہ آتا ہو جو مولانا مدنی کو دوسروں کا کام کر دینے میں آتا تھا، گھر پر آ کر ملئے تو آپ کے لئے کھانا اپنے ہاتھ سے جا کر لائیں، آپ کے لئے بستر خود بچھادیں، سفر میں ساتھ ہو جائے تو دوڑ کر آپ کے لئے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگے کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کریں، جبکہ آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کا بستر بچھائیں، آپ کے لئے لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں، تین دن کے قیام دیوبند میں یہ روایتیں مشاہدہ بن کر رہ ہیں"۔ (نقوش وتاثرات ۲۲)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع وانکساری کے متعلق مولانا عبداللہ صاحب فاروقی لاہوریؒ (خلیفہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہ) فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں حضرت شیخ الہند دیوبند میں مقیم تھے، اور مولانا حسین احمد مدنی مدینہ طیبہ میں رہا کرتے تھے، اس زمانہ میں احقر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گیا اور مولانا مدنی کے یہاں قیام فرمایا، ایک روز جب کہ میں حضرت مدنی کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو واپسی میں مولانا کا جوتا اٹھالیا، مولانا اس وقت تو خاموش رہے؛ لیکن دوسرے وقت جب ہم لوگ نماز پڑھنے گئے اور نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے واپس ہونے لگے تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا مدنیؒ صاحب میرا جوتا اپنے سر پر رکھے ہوئے جارہے ہیں، میں پیچھے پیچھے بھاگا، اس پر مولانا نے بھی تیز چلنا شروع کر دیا، میں نے بہت کوشش کی کہ جوتا لے لوں، مگر نہیں لینے دیے، میں نے کہا، خدا کے لئے سر پر تو نہ رکھیے، فرمایا عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے، میں نے عہد کرلیا، تب جوتا سر پر سے اتار کر نیچے رکھا۔ (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۱۸۷)

حضرت مدنی کی خاکساری وانکساری کے متعلق مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند کے بعض اساتذہ سے کہا کہ عرصہ ہوا ہمارا تھانہ بھون جانا نہیں ہوا، اور حضرت تھانویؒ کی زیارت کو دل چاہتا ہے، چنانچہ حضرت مدنی اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ تھانہ بھون

روانہ ہوئے، اتفاق سے گاڑی رات گئے تھانہ بھون پہنچی اور یہ حضرات ایسے وقت خانقاہ کے دروازے پر پہنچے کہ خانقاہ بند ہو چکی تھی، ان حضرات کو یہ معلوم تھا کہ خانقاہ کا نظام اوقات مقرر ہے، اس لئے نہ اس نظام کی خلاف ورزی مناسب سمجھی اور نہ حضرت تھانویؒ کو رات گئے تکلیف دینا پسند آیا، چنانچہ حضرت مدنی اپنے رفقا سمیت خانقاہ کے دروازے کے سامنے چبوترے ہی پر لیٹ کر سو گئے، حضرت تھانویؒ فجر کی اذان کے وقت جب اپنے مکان سے خانقاہ کی طرف تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ لوگ چبوترے پر لیٹے ہوئے ہیں، اندھیرے میں صورتیں نظر نہ آئیں، چوکیدار سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا، قریب پہنچ کر دیکھا تو حضرت مدنی اور مولانا اعزاز علی جیسے حضرات تھے، حضرت تھانویؒ اچانک انہیں دیکھ کر تو مسرور بھی ہوئے اور اس بات کا صدمہ بھی ہوا کہ یہاں پہنچ کر اس حالت میں انہوں نے رات گزار دی، چنانچہ ان سے پوچھا کہ آپ حضرات یہاں کیوں سو گئے؟۔

حضرت مدنی نے فرمایا ہمیں معلوم تھا کہ آپ کے یہاں ہر چیز کا نظم مقرر ہے، خانقاہ اپنے مخصوص وقت پر بند ہوتی ہے اور پھر نہیں کھلتی، حضرت تھانویؒ نے فرمایا، خانقاہ کا تو نظم بلاشبہ یہی ہے: لیکن غریب خانہ تو حاضر تھا، اور اس پر تو آپ جیسے حضرات کے لئے کوئی پابندی نہ تھی، حضرت مدنی نے فرمایا ہم رات گئے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا، اس طرح یہ حضرات ایک دو روز رہ کر واپس تشریف لے آئے، حضرت والد صاحب یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص اس اہلیت اور اس تواضع وخاکساری کی مثال پیش کر کے دکھائے۔(اکابر دیوبند کیا تھے؟صفحہ ۸۴)

تواضع وانکساری کا وصف آپ میں اس قدر نمایاں تھا کہ ہر واقف کار اس کا مشاہدہ کرتا تھا، اپنے اسم گرامی کے ساتھ ننگ اسلاف لکھنا تواضع کی دلیل تھی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ''من تواضع للہ رفعہ اللہ'' جس نے اللہ تعالی کی خوشنودی کے لئے تواضع اختیار کی، اسے اللہ تعالی رفعت عطا فرماتے ہیں، اس پر پورا پورا عمل تھا، خصوصاً مہمانوں کے ساتھ تو یہ معاملہ اس قدر عجیب تھا کہ خود مہمان بھی برداشت نہ کر سکتا تھا، مہمانوں کے ہاتھ دھلانے، ان کے جوتے سیدھے کرنے، اگر مہمان رات کو رہا، تو اسکے پاؤں دبانے بلکہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کا خود اپنے مبارک ہاتھوں سے اہتمام اور التزام فرمایا کرتے تھے، سندھ کے عظیم روحانی اور سیاسی راہنما جے ایم سید نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا کہ: ''بندہ پر تقصیر چند رفقاء کے ہمراہ دیوبند حاضر ہوا، اور حضرت مدنی کے یہاں قیام فرمایا، جب واپس آنے لگے تو حضرت مدنی ہم تمام ساتھیوں کے جوتے اپنے ہاتھوں سے سیدھے کئے'' اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے جی ایم سید صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

الغرض مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب ایک عظیم المرتبت عالم، محدث اور فقیہ ہونے کے باوجود خدمت لینے کے بجائے خدمت کرتے تھے، ریل کے سفر میں شدید سردی کے موسم میں بھی خود وضو کرتے ہیں اور پھر اسٹیشنوں پر اتر کر رفقاء کے لئے لوٹے میں پانی بھر کر لاتے اور پاؤں دبا کر بیدار کرتے تھے، پھر وضو کرنے کی ہدایت فرماتے تھے، عام طور پر علماء اپنے مزاج کی یبوست اور غیر ضروری سنجیدگی کی وجہ سے بدنام ہیں، مگر عالم اسلام کی اتنی بڑی شخصیت اپنے چھوٹوں کے کام کرنے پر مسکراتی رہتی تھی، انسان علمی، عملی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی حیثیت سے جس قدر بھی بلند ہو ممکن ہے؛ لیکن سیرت و کردار کی بلندیوں کی نشانی اور علامت، تواضع، انکساری، کسر نفسی اور اپنے نفس سے بدظنی ہے، حضرت مدنی کی زندگی بے نفسی، بے غرضی اور اخلاص سے عبارت تھی، مندرجہ بالا چند واقعات سے اندازہ ہوگا کہ حضرت مدنی کتنے متواضع اور منکسر المزاج تھے، آپ کے اندر تواضع و انکساری کا اتنا غلبہ تھا کہ کبھی ممتاز جگہ بیٹھنا پسند نہ فرماتے اور امتیازی شان کو کبھی پسند نہ فرماتے، یہی وہ چیزیں تھیں جس سے حضرت مدنی تمام اکابر میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی فکر کو پروان چڑھانے کا جذبہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

"آزادیٔ ہند اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی قید و بند"

مولانا ندیم اختر قاسمی

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا نام محتاج تعارف نہیں، مولانا حسین احمد مدنیؒ اس شخصیت کا نام ہے جو علم وعمل اور شریعت وطریقت کے جامع پیکر تھے۔ ایک طرف وہ اتباع سنت، اخلاق نبوت، سیرت صحابہؓ اور اسوۂ اکابر کا سر چشمہ تھے تو دوسری طرف جدوجہد آزادی کے لیے کوشاں، حب الوطنی، قومی خدمت اور جذبۂ حریت سے سرشار تھے، سادگی اور حق گوئی ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھا، شیخ الاسلام نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اس قدر شاندار اور اہم ہیں کہ انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی اور تحریک آزادی میں وہ کئی بار جیل بھی گئے؛ لیکن اس کے باوجود بھی ان کے عزم وارادے میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔

اسارتِ مالٹا اور اس کے اسباب

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم بظاہر دو رقیب ملکوں کی جنگ تھی۔ روس، فرانس اور جرمنی کی رقابت پرانی تھی۔ برطانیہ فرانس کا مددگار تھا۔ ترکوں نے جرمنی کی حمایت کا اعلان کیا تو وہ بھی جنگ میں شریک ہوگئے۔ ایک طرف فرانس، روس اور برطانیہ ہوگئے۔ ان کو اتحادی ملک بھی کہا جاتا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے، ترک ازخود جنگ میں داخل ہوئے ہیں ہم نے انہیں مجبور نہیں کیا ہے اور ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جدہ، مکہ اور مدینہ منورہ اور بغداد وغیرہ پر بمباری نہیں کریں گے؛ لیکن یہ اس کا ظاہری رخ تھا حقیقت کچھ اور تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کے تمام مقبوضات

آپس میں تقسیم کر لیے جائیں گے۔(۱)

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اس وقت مدینہ منورہ میں تھے؛ لیکن شریف مکہ کی رعیت نہ تھے، برطانیہ یا حکومت ہند کے ملازم بھی نہ تھے؛ لیکن شریف حسین اور اس کے عمائدین بے نظری اختلاف تھا، عربوں میں ترکوں کے خلاف جذبات پیدا کر دیئے گئے تھے؛ لیکن باشندگان مدینہ منورہ آخر تک ترکوں کے وفادار رہے اور ان کی وفاداری کا راز وہ اعتماد تھا جس کا محور حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ اور ان کے وہ رفقاء تھے جو اس جنگ کے بنیادی مقصد سے واقف تھے۔ شریف حسین حاکم مکہ نے ترکی حکومت کے خلاف انگریزوں سے مل کر بغاوت کر دی۔

شریف حسین نے ترکی حکومت کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرایا، شیخ الہندؒ کی طرح حضرت مدنیؒ بھی ترکوں کو کافر نہیں کہتے تھے اور ترکوں کے خلیفۃ المسلمین اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ انگریزوں، انگریزی چیزوں اور یورپین تہذیب سے آپؒ کو نفرت تھی۔ یہی نظریات شریف حکومت کی نظر میں باغیانہ تھے۔ جن کی بناء پر حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ اور ان کے رفقاء کو رفیق زنداں قرار دیا گیا۔(۲)

مکہ مکرمہ میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا، وہاں سے ان کو جدہ لے جایا گیا اور پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا گیا۔ سیاسی قید خانہ میں رکھے گئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو تمام حضرات حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا عزیز گلؒ مولانا حکیم نصرت حسینؒ اور مولانا وحید احمد مدنیؒ کو مالٹا روانہ کر دیا گیا اور ۲۹ ربیع الثانی کو جزیرہ مالٹا میں پہنچ گئے اور تقریباً ۳ سال وہاں قید رہے۔(۳)

مالٹا سیاسی اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا اور جہاں صرف ایسے قیدیوں یا ایسے فوجی افسروں کو رکھا جاتا تھا جو بہت خطرناک اور اپنے خیالات پر نہایت سخت اور پختہ ہوتے تھے اور کسی بھی طرح کا لالچ ان کو ان کے مقاصد سے ہٹا نہیں سکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مفادِ ملت کے لیے آپؒ کی انتھک جدوجہد، خلوص، ایثار، صداقت، حق پرستی اور بلند ہمتی نے آپ کو شیخ الہندؒ کا سچا جانشین قرار دیا تھا۔ دوسروں کو حتیٰ کہ معاندین ومخالفین تک کو بھی نقصان کے بجائے نفع پہنچانے کی کوشش کرتے تھے؛ چنانچہ مالٹا کی جیل میں بھی آپؒ کے ساتھی قیدیوں میں ''سیتارام جی سوکل'' بھی ایک قیدی تھے جو آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''بھائی - بھائی برابر ہیں یہ کہتے ہوئے بہتوں سے سنا ہے؛ لیکن برابری کا برتاؤ صرف مولانا کو کرتے

---

(۱) اسیران مالٹا حضرت مولانا محمد میاں صاحب ص:۱۳۰

(۲) اسیران مالٹا۔ مولانا محمد میاںؒ ص:۱۳۲

(۳) روزنامہ الجمعیۃ دہلی خصوصی شمارہ شیخ الاسلام نمبر ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء اشاعت دوم ۲۰ جولائی ۱۹۹۸ء ص:

ہوئے دیکھا۔ کھانا پکاتے وقت باورچی، باورچی رہتا تھا اور آپؒ مالک؛ لیکن کھانا کھاتے ہوئے باورچی اور مالک ایک ہوتے تھے، یہی نہیں صرف ایک پاؤ گوشت مولانا کو ملتا تھا؛ لیکن کھانے کے وقت جو بھی آکر بیٹھ جاتا اپنے ساتھ ہی کھلاتے تھے۔ تندرستی گرنے لگی تو میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ مولانا اپنا کھانا تقسیم کردیتے ہیں اس لیے تندرستی گرتی جارہی ہے تو انہوں نے پہلے تو یہ کہا کہ میں کیا کروں قاعدہ تو یہی ہے ان کو صرف پاؤ بھر گوشت مل سکتا ہے؛ لیکن دوسرے دن آکر وزن کیا اور تندرستی گرتے ہوئے دیکھ کر پاؤ بھر گوشت اور بڑھا دیا۔ اس کے مطابق مولانا کا خرچہ بڑھ گیا اور لوگ بھی کھانے میں شریک ہونے لگے"۔(۱)

الحاصل آپ مالٹا کی جیل میں تقریباً ۳ رسال رہے، آپؒ نے قرآن کے حفظ کی دولت اسی اسارت گاہ میں حاصل کی، آپ کی غیر محدود سیاسی معلومات کا ذخیرہ بھی اسی مالٹا جیل کا اندوختہ ہے۔

بالآخر ۲۲ ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے شیخ حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود الحسن اور باقی رفقاء کے ساتھ مالٹا سے رہا کیے گئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تحریک خلافت اور تحریک استخلاص وطن شروع ہو چکی تھی۔(۲)

مقدمۂ کراچی اور حضرت مدنیؒ کی اسارت

مالٹا کی جیل سے رہا ہو کر حضرت نے یہ محسوس کیا کہ ملت اسلامیہ کی بدبختی اور مصیبت کے اس سیاہ ورق کو الٹنے کی ضرورت ہے اور ضرورت ہے کہ اس پنجۂ فولادی اور دستِ ستم گر کو موڑ دیا جائے، لہٰذا صحیح راستہ یہی ہے کہ اس کلائی پر ضرب لگائی جائے اور اس بازو کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کردیا جائے؛ چنانچہ آزادیٔ ہند آپؒ کے نزدیک ملتِ اسلامیہ اور اسلامی اقوام و ہندوستانی مسلمانوں کی رہائی کا واحد ذریعہ تھی۔

تحریکِ ترکِ موالات کا اہم واقعہ کراچی کا وہ مقدمہ ہے جو زیر دفعہ ۱۲۰ر۱۳۱ر۵۰۵ حضرت شیخ الاسلام، مولانا محمد علیؒ جوہر، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو مرحوم، مولانا نثار احمد کانپوریؒ اور جگت گروسوامی کرشن ترتیہ (شنکراچاریہ)، پیر غلام سندھیؒ پر چلایا گیا۔ بناء مقدمہ وہ تجویز تھی جو حضرت مدنیؒ نے آل انڈیا خلافت کانفرنس (منعقدہ ۸، ۹، ۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء) میں پیش فرمائی تھی۔ اس تجویز کا حاصل یہ تھا موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشیں کردے۔ مولانا محمد علیؒ جوہر و دیگر حضرات

---

(۱) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، ایک سیاسی مطالعہ، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری۔ ص: ۸۰

(۲) حیات شیخ الاسلامؒ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی۔ ص: ۳۲

اس کی تائید و اشاعت کے الزام میں ماخوذ تھے۔[1]

آل انڈیا خلافت کانفرنس میں تجویز پیش کرنے کے بعد آپ اور آپ کے رفقاء کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے؛ چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت مدنیؒ کو گرفتار کرلیا گیا۔ ۲۶ ستمبر سے مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ مولانا محمد علیؒ جوہر کا بیان ۲۸ ستمبر کو لیا گیا اس کے بعد حضرت مدنیؒ کا بیان لیا گیا۔ وہ بیان اتنا بے باکانہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہرؒ نے بڑھ کر آپؒ کے قدم چوم لیے[2]؛ چنانچہ وہ بیان ''کلمۃ حق عند سلطان جائز'' کا مصداق تھا آپ نے کھلے الفاظ میں یہ عدالت میں کہا تھا کہ ''ایک مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان کا قتل کرنا بغیر کسی جرم کے ناجائز اور حرام ہے اور چونکہ مسلمانوں پر ہی گولی چلانے کے لیے فوج کا استعمال کیا جارہا ہے۔ لہٰذا میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ برطانوی فوج میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا حرام ہے۔ (موازنہ قانون و مذہب ص: ۲۱۱)

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا اسیر اور جیوری کے ارکان نے فوج میں بغاوت پھیلانے یا کسی فوجی کو ملازمت سے باز رکھنے جرم سے مزین کو بری قرار دیا اور جج نے بھی اس سے اتفاق کیا؛ البتہ زیر دفعات ۵۰۵ اور ۱۰۹ ارتعزیرات ہند حضرت شیخ مدنیؒ اور آپؒ کے تمام رفقاء کو دو۔ دو سال قید با مشقت کا حکم سنایا گیا۔ حضرت مدنیؒ کو سابرمتی جیل اور دوسرے حضرات کو دوسری جیلوں میں بھیج دیا گیا۔[3]

دو سال کے بعد حضرت مدنیؒ اور دیگر حضرات رہا ہوئے قید کے دوران آپؒ جیل سے ہی لوگوں کو مکتوب لکھ کر ارسال فرماتے رہے اور ان کو دلاسہ دیتے رہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھو؛ چنانچہ رہا ہونے کے بعد رہا ہونے والوں کے بڑے۔ بڑے جلوس نکالے گئے دہلی میں جس شان و شوکت سے مولانا محمد علیؒ جوہر اور مولانا شوکت علیؒ کا جلوس نکالا گیا کہا جاتا ہے کہ چشم دہلی نے اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں دیکھی تھی۔ مگر شیخ الاسلام جیسے روحانی تاجدار کی شان ہر ایک جلوس سے مستغنی اور ہر نمائش سے بلند و بالا تھی۔

تحریک سول نافرمانی اور حضرت مدنیؒ کی گرفتاری

حضرت شیخ الاسلام جس طرح دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات اور احسان و سلوک کے خانقاہی نظام کے روح رواں تھے اسی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت بھی آپؒ کے اندر کوٹ۔ کوٹ کر بھری ہوئی تھی؛ کیونکہ

---

(۱) حیات شیخ اسلام حضرت مولانا محمد میاںؒ دیوبندؒ۔ ص: ۳۱-۳۰

(۲) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، خصوصی شمارہ شیخ الاسلام نمبر ۱۵ ارفروری ۱۹۵۸ء اشاعت دوم ۱۰ رجولائی ۱۹۹۸ء ص: ۹

(۳) حیات شیخ اسلام مولانا سید محمد میاںؒ۔ ص: ۵۱

حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت شیخ الہندؒ کے سچے جانشین اور ان کی فکر ولی اللہی کے سچے امین تھے۔ آپ کے یہاں انگریز کی مخالفت صرف سیاسی نہ تھی؛ بلکہ آپ کو عقیدے کے طور پر بھی اس ظالم اور خونخوار حکومت سے سخت نفرت تھی۔ اس لیے دوسرے سیاسی افراد کی طرح نہ تو حکومت کے ساتھ میٹنگ کرتے تھے نہ ان کی دعوتوں کو قبول کرتے تھے، نہ لندن کا سفر اور نہ انگریزوں کی گول میز کانفرنسوں میں شرکت فرماتے تھے۔

حضرت اور حضرت کے رفقاء کار بلکہ پوری جمعیۃ علماء ہند ان بے غرض، بے لوث اور بے خوف علماء کرام کی حمایت جنہوں نے زندگی کے سارے سکھ چین، دنیاوی عیش عشرت، دنیا کے سب راحت و آرام غرض سب کچھ ملک وملت اور قوم کی فلاح و بہبودی اور ملک کی آزادی کے لیے قربان کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی طرح حضرت مدنیؒ بھی انگریز حکومت سے سخت نفرت کرتے تھے وہ برطانیہ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون، ان کے کونسلوں کی ممبری اور ان کی حکومت کی وزارت کو نہ صرف بے فائدہ اور ضیاع وقت سمجھتے تھے؛ بلکہ قومی مصالح کے لیے ناجائز اور حرام تصور کرتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے چوتھے اجلاس (منعقدہ لاہور) میں یہ تجویز پاس کی تھی کہ برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے۔ ایسی ہی سرگرمیوں کے پیش نظر ۱۹۳۲ء میں کانگریس کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کو بھی حکومت نے خلاف قانون قرار دے دیا، جمعیۃ نے اس کے خلاف تحریک سول نافرمانی چلائی جس کے مفتی کفایت اللہؒ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند، ڈکٹیٹر اوّل اور مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند ڈکٹیٹر دوم تھے۔(۱)

یہ سب حضرات اپنی۔اپنی باری پر قانون شکنی کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ حضرت ڈکٹیٹر سوم تھے؛ چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق حضرت مدنیؒ سول نافرمانی کے لیے دیوبند سے روانہ ہوئے؛ تاکہ دہلی پہنچ کر نماز جمعہ کے بعد دہلی میں بیان کر سکیں۔

گورنمنٹ کی نگاہ میں حضرت کی سول نافرمانی اور تقریر کی اہمیت زیادہ تھی، خطرہ یہ تھا کہ آپؒ کی آواز پر لاکھوں مسلمان؛ بلکہ ہندو بھی گرفتاری دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور صورت حال حکومت کے قابو سے باہر ہو جائے گی؛ چنانچہ جیسے ہی ٹرین حضرت کو لے کر روانہ ہوئی تو دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر ہی مسلح گارڈ نے پوری گاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ افسران نے گرفتاری کا وارنٹ پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وارنٹ میرے اوپر تعمیل نہیں ہو سکتا؛ چونکہ حکومت نے گرفتاری کا فیصلہ کر رکھا تھا اسی وقت دوسرا وارنٹ گرفتاری جاری کرایا گیا۔ یہ حضرت کی تیسری قید تھی جو ایک یا ڈیڑھ ہفتہ جاری رہی پھر حکومت نے سب کو آزاد کر دیا۔(۲)

---

(۱) چراغ محمد مرتب قاضی محمد زاہد الحسینی، طباعت ۱۹۹۴، ص:۱۹۸

(۲) چراغ محمد مرتب قاضی محمد زاہد الحسینی، طباعت ۱۹۹۴، ص:۱۹۹

۴۲ء میں خلافِ حکومت تقریر حضرت مدنیؒ کی گرفتاری

رہا ہونے کے بعد ایسا نہیں ہے کہ حضرت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے؛ بلکہ انگریزوں کی مخالفت اور نفرت میں اور شدت آگئی، ہندوستان کو برطانوی ظلم واستبداد سے بچانا اور اس کو آزاد کرانا آپؒ کا مقصد اصلی بن گیا تھا اور اس مقصد کے لیے اس قدر سفر کیے جس کی نظیر نہیں ملتی، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ سال کا قریب۔ قریب نصف حصہ سفر ہی میں گزرتا تھا اور حصول آزادی کے لیے وہ قربانیاں دیں جو شاید ہی کوئی دے سکے۔

حضرت مدنیؒ کی تقریر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ واقعات اور خود برطانوی تحریرات سے حکومت برطانیہ کی مخالفت ہوتی تھی محض الفاظ کی بارش نہ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کی تقریر حکومت برطانیہ کے خلاف ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی اور سامعین کے قلوب میں راسخ ہوجاتی تھی اس لیے حکومت برطانیہ آپ کو بڑا خطرناک آدمی سمجھتی تھی اور آپؒ کی روک تھام کے لیے بروقت تدابیر کرتی رہتی تھی مگر آپ کسی حال میں رکنے اور جھکنے والے نہ تھے اور کسی بھی طاقت سے ڈرنے والے نہ تھے۔

۲۵ر اپریل ۱۹۴۲ء کو مراد آباد کے قصبہ بچھراؤں میں ضلع جمعیۃ علماء کی کانفرنس تھی اس میں تقریر کرتے ہوئے حضرت مدنیؒ نے برطانیہ کی ناانصافیوں اور ظلم وزیادتی کا تذکرہ کیا؛ چنانچہ اسی تقریر کی بناء پر حضرت کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ ۲۴ر جون ۱۹۴۲ء کو رات کے ایک بجے صوبہ پنجاب کی ایک اتحاد کانفرنس میں شرکت کے لیے حضرت مدنیؒ دیوبند سے جھنگ کے لیے روانہ ہوئے گاڑی تیسرے اسٹیشن پر پہنچی تھی کہ پولیس آفیسر وارنٹ لیے ہوئے ڈبے میں داخل ہوا اور جب گاڑی چل پڑی تو وارنٹ پیش کردیا۔ اگلے اسٹیشن سہارنپور پر حضرت کو اتار لیا گیا اور پہلی ٹرین سے مراد آباد جیل پہنچا دیا گیا۔[1]

۲۹ر جولائی ۱۹۴۲ء کو مسٹر آصف علی کا مراد آباد پہنچے؛ تقریباً چار گھنٹے اپیل میں بحث کی مگر جج نے تاریخ فیصلہ ۱۳ر اگست مقرر کی اور ۱۳ر اگست سے پانچ روز قبل مشہور تحریک کوئٹ انڈیا شروع ہوگئی۔[2] اب حضرت کی رہائی کا سوال تو دور کی بات مقدمہ کی کارروائی کا سوال بھی ختم ہوگیا۔ ملک کے سارے لیڈروں کے ساتھ حضرت پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ جاری کردیا گیا اور ادھر کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کے لوگوں کی نئی کھیپ مولانا حفظ الرحمنؒ صاحب اور حافظ ابراہیم وغیرہ بھی جیل میں پہنچ گئے۔ حضرت مدنیؒ کو غیر معینہ مدت کے لیے نظر بند کردیا گیا۔ کوئٹ انڈیا کی تحریک کے بعد سارے ہی لیڈران مرکزی جیلوں میں رکھے گئے تو حضرت

(۱) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ فرید الوحیدی۔ ص: ۵۰۳

(۲) حیات شیخ الاسلام مولانا سید میاں صاحب۔ ص: ۱۳۳

مدنیؒ کے لیے بھی الہ آباد نینی جیل منتقلی کے احکام آگئے۔

مختصر یہ کہ ۱۹۴۳ء کے ختم ہوتے۔ ہوتے ادھر تو کوئٹ انڈیا کی تحریک کمزور پڑنے لگی اور ادھر جنگ کی صورت حال کے ساتھ۔ ساتھ برطانیہ کی پالیسی بھی تبدیل ہونے لگی اب کانگریس اور سیاسی قیدی آہستہ۔ آہستہ چھوڑے جانے لگے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رہائی کی خبریں بھی سنائی دینے لگیں، ایک دن ۲۶ راگست ۱۹۴۴ء کو اچانک حضرت کو اطلاع دی گئی کہ آپ کو رہا کر دیا گیا ہے اور آپ جلد از جلد باہر چلے جایئے۔(۱)

اس بار کل دو سال دو ماہ جیل میں رہے اور رہائی کے ۱۰ دن بعد مختلف جگہوں پر ہوتے ہوئے دیو بند پہنچے اور اپنی علمی وسیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے؛ لیکن آپ کی تحریک آزادئ وطن جاری رہی؛ چنانچہ جب انگریزوں نے دیکھا کہ اب اور زیادہ ہندوستان پر حکومت نہیں کی جا سکتی تو آخر کار انہیں ہندوستان چھوڑ کر جانا ہی پڑا؛ لیکن جاتے۔ جاتے تقسیم ہند اور پاکستان کا فتنہ چھوڑ دیا۔ حضرت مدنیؒ نے اور بہت سے علماء حضرات نے بھی اس تقسیم کی سخت مخالفت کی کہ یہ ایک طرح سے ہندوستان کی نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی سازش ہے اور اس سے مسلمانوں کو ہی نقصان ہوگا اور اس معاملہ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے لوگوں نے انہیں گالیاں بھی دیں اور انہیں بہت برُا بھلا کہا۔ اور آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت مدنیؒ نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔

حاصل یہ کہ حضرت مدنیؒ نے ملک وملت کے لیے اور آزادی کی جدوجہد میں جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ فراموش نہیں کی جا سکتی ہیں وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی قربانیاں اور پوری زندگی ہمارے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔ ■

---

(۱) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (فرید الوحیدی۔ ص:۵۳۰)

دارالعلوم دیوبند کا ایک جگمگاتا ستارہ

مولانا حسین احمد مدنیؒ

مولانا عمران عاکف قاسمی

85، ڈیگ گیٹ، گلپاڑہ، بھرت پور (راجستھان)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں.....

''کبھی بچپن میں ایک قصہ پڑھا تھا کہ ''بالشتیوں'' کے دیس میں کسی طرح ہماری دنیا کا ایک انسان پہنچ گیا تھا۔ ایک عرصے تک وہ ان کے لیے خوف ودہشت اور تعجب وحیرت کا سامان بنا رہا۔ اس کی شخصیت ایک عرصے تک ان کے لیے ایک معمہ اور اس کی بلندی' خود اس کے ایک آزمائش بنی رہی۔

ہم کو پتا نہیں کہ بالشتیوں کی یہ بستی کہاں بستی ہے؟ بظاہر ایک افسانہ نویس کی انشاپردازی اور نازک خیالی سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں' لیکن اگر آپ نظر غائر تر سے دیکھیں گے تو یہ خود ہماری اس انسانی بستی کا ایک واقعہ نظر آئے گا جس پر افسانے کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اگر انسان صرف جسم کا نام ہے اور اس کی بلندی وبرتری کا معیار اس کا قدوقامت اور طول وعرض نہیں بلکہ انسان اس پیکر وقالب کا نام ہے جس کے اندر ''انسانی حقیقت

وشخصیت" پائی جاتی ہے اور اس کی بلندی و برتری کا معیار وہ امتیازی اوصاف اور اخلاق، سیرت و کردار ہے جس کی بنا پر انسان کو حیوانات اور دوسری مخلوقات پر شرف وفضیلت حاصل ہے اور جن کے بغیر انسان محض منطق کا "حیوان ناطق" ہو کر رہ جاتا ہے' تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہماری اس دنیا میں زیادہ تر "بالشتیے" ہی بستے ہیں اور بالشتیوں کی اس بستی میں کبھی کبھی کوئی بھٹکا بلند قامت مسافر آ جاتا ہے جس کی بلند شخصیت' بلند مقاصد وعزائم' بلند اخلاق وسیرت ان کوتاہ قامت' کوتاہ فکر انسانوں کے لیے ایک چیستان اور خود اس کی زندگی ان کے درمیان ایک آزمائش ومجاہدہ بن کر رہ جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی مسافرت کے دن پورے ہوں اور وہ اپنے دیس اور اپنے ہم سروں کے پاس واپس نہ چلا جائے۔"

یہ ہے ہمارے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کا مختصر اور جامع ترین تعارف' واقعی آپ ہم بالشتیوں کی دنیا میں ایک اعلا حیثیت' بلند وقامت' نیک مقاصد اور اونچے عزائم کی بدولت عجوبۂ روزگار تھے جنھیں لوگوں نے پہچاننے میں کوتاہی کی۔ آپ نے ایک ایسے وقت میں قوم وملت کی ہر محاذ پر باگ ڈور سنبھالی جب وہ پوری طرح تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی اور کسی بھی پل گرنے والی تھی۔ مادیت پرست اور مال ودولت کے دلدادہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کی زرین تہذیب وتمدن نیز حب الوطنی کا جذبہ بھی چھین لیا تھا' حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اپنے ہی اپنے ملک کو لوٹنے لگے۔ ایسے وقت میں آپ نے حب الوطنی کی شمع جلائی اور وطن عزیز کو مغربی سامراج واستعمار کے چنگل سے چھڑانے کے لیے انگریزوں کی مخالفت کا بگل بجایا جس کی پاداش میں متعدد بار قید وبند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے مگر جذبۂ جہاد آزادی کو سرد نہیں ہونے دیا اور نہ ہی ضمیر فروشوں میں شامل ہوئے۔ انھیں سر کٹانا منظور تھا مگر جھکانا نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت ایسی نہیں ہے جس کا دو لفظوں میں تذکرہ کر دیا جائے' نہ ہی آپ کی حیثیت کسی ایک فرد اور شخص کی حیثیت تھی بلکہ معاصرین اور بعد کے لوگوں کا احساس ہے کہ آپ فرد واحد ایک انجمن' ایک جماعت اور ایک عہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے کارنامے ہندوستان سمیت عالم کے چپے چپے پر بکھرے ہوئے ہیں جنھیں یکجا کرنا ایک عظیم ترین کام ہے تاہم ہمت بجُز آپ کی حیات وخدمات' سیاسی زندگی' علمی کمالات' انتظامی صلاحیتوں، معاصرین سے ربط وتعلق اور ملک وقوم کی خاطر آپ کی قربانیاں جیسے پہلوؤں کے مختصر تذکرے کا عزم ہے۔

حیات' ابتدائی حالات اور کارنامے

"نقش حیات' اور دیگر تذکروں کے مطابق وہ 19 شوال المکرم مطابق 1879 میں تقریباً 11 بجے شب (درمیانی دوشنبہ یا سہ شنبہ) کا عمل تھا جب آپ نے اس دنیائے آب و گل میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کا خاندان اول سے آخر تک اسلامی تہذیب وتمدن' اقدار وروایات اور حمایت اسلام کے ساتھ ساتھ وطن اور قوم کے تئیں ہمدردی ومحبت کے احساس سے سرشار تھا' آپ کی پرورش بھی ان ہی خطوط کے مطابق ہوئی۔ آپ کے خاندان میں بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی تھا اور آپ کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ راشد تھے۔ آپ کو محض 13 سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خدمت میں پیش کردیا گیا جہاں آپ نے 7 سال کے عرصے میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف بیعت بھی حاصل کرلیا۔

آپ کے حافظہ اور علوم پر دسترس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا کہ محض 7 سال کے عرصے میں آپ علوم وفنون کے جامع بن گئے۔ علوم وفنون پر اس قدر دسترس اور کمال کے باوجود میں آپ عاجزی وانکساری کی ایک نادر مثال تھے' آپ کے خلوص اور ادائے اخلاص کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ایک صاحب قلم آپ کے جذبۂ خلوص پر اس طرح خامہ فرسائی کرتے ہیں:

"آپ میں جہاں دیگر اوصاف تھے وہیں ایک وصف "اخلاص" بھی تھا جسے اخلاقیات کے ماہرین "جوہر سیرت" کا عنوان دیتے ہیں، جیسا کہ جوہر اخلاص دادو تحسین اور ستائش کی تمنا سے بے پرواہ ہوتا ہے' آپ اس کی زندہ مثال تھے...... آپ بے غرض تھے۔ بے لوث آپ نے قوم وملت کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ جب آپ نے تحریک آزادی میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے دل کو غرض وصلے سے پاک کیا تاکہ لالچ کی کوئی تلوار آپ کے عزائم کو کاٹ نہ سکے۔ وہ حیدرآباد (دکن) کی رشوت ہو یا کسی سرکاری مدرسے (مثل مدرسہ عالیہ' کلکتہ) کی پرنسپل شپ کی پیش کش ہو یا جامعۃ الازہر (مصر) کے منصب بلند کا لالچ۔ حالات کی سنگینی کا خوف ہو یا خاندان کے مستقبل کا اندیشہ ہر خوف وحزن سے آپ نے دل کو پاک کرلیا تھا۔ اگر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں کوئی مقام قبول کیا یا جمعیۃ علماء ہند کے عہدۂ صدارت کو منظور کیا تو صرف کسی کو آگے بڑھتے اور ذمے داری کا بوجھ اٹھاتے نہ دیکھ کر' اسلام اور

مسلمانوں کی خدمت کا میدان خالی پاکر اور غلام ملک میں استعمار و استبداد کے عذاب سے سسکتی انسانیت کو نجات دلانے کے لیے صرف اپنے اسلامی اور انسانی فرض کی خاطر قدم آگے بڑھائے تھے۔" (شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ایک سیاسی مطالعہ)

آپ کی سیاسی زندگی

وہ 1331ھ کا زمانہ تھا جب مولانا حسین احمد مدنی کا تیسرا سفر مدینہ منورہ تھا کہ دوران سفر جنگ عظیم اول کی خبر گرم ہوگئی۔ آپ اس کا حال خود اپنی سوانح 'نقش حیات' میں اس طرح لکھتے ہیں:

"......بہر حال آخر 31ھ میں بطور حج بدل حجاج کے جہاز میں واپسی کا سامان کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ عظیم (اول) شروع ہو چکی تھی مگر ترکی اور برطانیہ کے درمیان ابھی تک اعلان جنگ نہیں ہوا تھا' اگر چہ خبریں گرم تھیں۔ اسٹیمر میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی اور آب دوز و جنگی جہازوں کے خطرات سے ہمیشہ ظاہر کیے جاتے تھے ---- بہر حال جنگ کا آغاز ہو گیا اور اس جنگ نے میری سوانح حیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یعنی "سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلے میں عزم انقلاب۔" جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سر چشمہ بھی حضرت شیخ الہند کے وہ افکار و خیالات تھے اور وہ جذبات تھے جو عرصہ دراز سے ان کے سینۂ پر نور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے اور جن کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دیں تھیں۔" (نقش حیات:178)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا سیاسی میدان میں آنے کا شاندار استقبال کیا گیا اور آپ کے عزم و استقلال سے ہزاروں لوگوں نے امن و انصاف اور آزادی کے تعلق سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ نے روایتی سیاسی بازی گروں اور لیڈران کی مانند وعدے کر کے بھلا دیا ہو بلکہ ہر گام اور ہر مقام پر آپ نے اپنے 'فرض' کو یاد رکھا۔ آپ کسی بھی جگہ وقت کے تھپیڑوں اور آندھیوں کے آگے نہیں جھکے بلکہ بعض مرتبہ تو برطانیہ عظمیٰ کے سورج تک کو بجھانے کے عزائم سے بھی پیچھے نہیں رہے۔ آپ کی اس اولوالعزمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نامور عالم دین اور خطیب بے مثال مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اپنے مقالے "صاحب عزیمت سیاسی رہنما" میں تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے بڑا ہو کر نہیں نکلتا' البتہ بڑا آدمی بننے کی قابلیت وصلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے' پھر جو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال وہمت سے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے------ حضرت مدنی کی زندگی پر اگر نظر ڈالی جاتی ہے تو عزم واستقلال اور ہمت وحوصلے کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں-------1968 کے خونی ہنگامہ خیز حالات میں جب ہر شخص کو اپنی پڑی تھی اور مسلمانوں کے لیے کوئی جائے امن نظر نہیں آرہی تھی آپ مکمل عزم واستقلال کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے گھروں میں واپس جانے کی تلقین کررہے تھے---- آپ ایک آہنی دیوار بن کر سہارنپور کی سرحد پر جم گئے تھے۔''

(شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی' ایک سیاسی مطالعہ:82)

صرف یہی ایک مقام نہیں تھا جب آپ نے بے مثال عزم وہمت اور حوصلوں کا مظاہرہ کیا بلکہ ہر اس مقام پر آپ اعلان حق وعزم کرتے نظر آئے جہاں دوسروں کو صرف اپنی پڑی تھی اور جہاں مسلمانوں کو نیز وطن عزیز کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی' وہ چاہے جنگ آزادی اور تحریک آزادی کا مرحلہ ہو یا مسلمانوں کے ہندوستان میں وجود وبقا کا مسئلہ' وہ ترک موالات تحریک ہو یا تحریک خلافت' آپ ہر میدان میں سربکف نظر آتے تھے۔اس جدوجہد میں کئی مرتبہ قید وبند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے۔آپ کی اسارت کے باعث غیر نہیں بلکہ اپنے ہی لوگ ہوتے تھے چنانچہ آپ کی پہلی گرفتاری اور مالٹا کی اسارت کا باعث شریف مکہ بنا تھا جس نے انگریزوں کی حمایت کرتے ہوئے ترکی کے خلاف بغاوت کردی۔یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ حضرت شیخ الہند اور متعدد رفقا کے ساتھ مکہ اور ترکی کے تعلقات کی ڈور مضبوط کرنے کی کرنے کی مہم میں مصروف تھے اور اس کے لیے 'تحریک ریشمی رومال' چلائی جارہی تھی۔شریف مکہ کا یہ اقدام خلافت ترکی کے بہی خواہوں کے لیے عذاب ثابت ہوا چنانچہ وہ تمام لوگ جو خلافت اسلامیہ کی بقا اور تحریک خلافت سے وابستہ تھے' انگریزوں کے دام گرفتاری میں آگئے۔شریف مکہ نے بزعم خود ایک زرین موقع سمجھتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن سے ترکی کے خلاف کفر کے فتوے پر دستخط کرنے کا حکم دیا مگر آپ نے اس سے یکسر انکار کردیا' جس کی پاداش میں 23 صفر المظفر 1335ھ میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے تمام رفقا کو گرفتار کرلیا گیا۔

گرفتاری کے بعد کچھ دنوں تک ان حضرات کو جدہ میں رکھا گیا' اس کے بعد مصر روانہ کردیا' جہاں انھیں الگ الگ کوٹھریوں میں بند کیا گیا اور ایک ہی احاطے میں اس طرح رکھا گیا کہ ایک دوسرے ملے اور صورت دیکھے ہفتوں گذر جاتے تھے۔ان سے الگ الگ بیان لیے جاتے۔اس طرح کی قید وبند نے

ان کے ذہنوں میں پھانسی کے خیال کو پختہ کر دیا تھا مگر "بسا آرزو کہ خاک شوذ" کے مانند انگریز ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہ کر سکے لہٰذا ان سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور انھیں مالٹا بھیج دیا گیا جو اس وقت فوجی اور سیاسی قیدیوں کا مرکز تھا۔ مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام اپنے رفقا کے ساتھ ہندوستان واپس آ گئے۔ ہندوستان آنے کے کچھ عرصے بعد حضرت شیخ الہند داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ آپ کے انتقال سے جدوجہد آزادی کو زبردست جھٹکا لگا مگر آپ کے شاگردوں اور حضرت شیخ الاسلام نے اسے زیادہ دیر تک محسوس نہیں ہونے دیا بلکہ اب تو تن من دھن سے میدان جدوجہد آزادی میں کود پڑے تھے۔ اب 'آرام حرام' تھا' تحریک خلافت اور تحریک استخلاص وطن زور پکڑ چکی تھی۔ شیخ الاسلام اور آپ کے رفقا نے ان تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی اپنی قدرت کے مطابق نمایاں کارنامے انجام دیے۔

تحریک آزادی کی جدوجہد میں جہاں آپ گرفتار ہوئے وہیں اس سرفروشی کی پاداش میں مقدمات کا سامنا بھی کیا۔ چنانچہ آپ پر سب سے پہلا مقدمہ دفعہ 120 و 131 و 505 کے تحت کراچی میں چلا گیا اور اس کا باعث آپ کی وہ تجویز تھی جو آپ نے 'آل انڈیا خلافت کانفرنس (منعقدہ کراچی' بتاریخ 8-9-10 جولائی 1921) میں پیش کی تھی۔ تجویز کا حاصل یہ تھا کہ "موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا نیز دوسروں کو بھرتی ہونے کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں تک پہنچا دے۔" (روداد خلافت کانفرنس' کراچی: 50)

علمی کمالات

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے جہاں جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور تاج برطانیہ کے زوال کے لیے قابل قدر کارنامے انجام دیے' وہیں آپ علم و عمل میں بھی اپنی الگ شان رکھتے تھے۔ آپ کے علمی کمال اور علوم و فنون پر دسترس کا لوہا سب نے تسلیم کیا۔ چنانچہ آپ کے ایک معاصر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے آپ کی اس عظمت اور شان کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> "حضرت شیخ الاسلام ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ اپنے وقت کے بے مثال محدث تھے۔ درس و تدریس اور تحقیق حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ بہت بڑے فقیہ تھے۔ انھیں نہ صرف فقہ کے مسائل از بر یاد تھے بلکہ فقہ و حدیث میں ان کا درجہ ایک مجتہد کا تھا۔ وہ مفسر بھی تھے اور معانی کی گہرائی میں اتر کر قرآن مجید کے بصائر و حکم اور مسائل و احکام کی تشریح و تفسیر بھی کیا کرتے تھے۔"
>
> (شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی' ایک سیاسی مطالعہ: 88)

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہند جہاں جہاں بھی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ قائم کیا آپ کے علم وکمال کو سراہا گیا' مدینہ منورہ میں تو آپ کی ایک الگ ہی پہچان اور شان تھی اور شاگردوں کا ایک جم غفیر۔ آپ خود مدنی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے 'نقش حیات' میں رقم طراز ہیں:

''طلبا کا ہجوم اس قدر رہوا کرتا تھا کہ دوسرے مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی' بعض علما ایسے بھی تھے جن کے یہاں پہلے پہل بہت رجوع تھا مگر بعد میں کم ہو گیا اور ان کے طلبا میرے پاس آنے لگے۔ یہ سب برکتیں ان مقدس ذات کی تھیں جن کی جوتیاں اٹھانے کا شرف مجھے حاصل۔'' (نقش حیات: 28-127)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبا کے نزدیک آپ کا کیا مقام تھا۔ وہ مقام جس کا ادراک واحساس کر کے وہ اپنے ہم زبان علما کی مجلسوں کو چھوڑ کر آپ کے حلقہ ہائے درس میں شامل ہوتے تھے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب آپ کے علمی کمالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شیخ الاسلام اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وادب کے علم بردار تھے اور آپ کی ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک کے باہر ہزاروں علما اس امانت کے امین بن گئے جو اس مرکز علم وفن (دار العلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی۔ آپ متعدد ماہر فن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث' فقہ وتفسیر' ادب وخطابت' منطق وفلسفہ' کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اسے دنیا صدیوں قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔'' (شیخ الاسلام معاصرین اور عقیدت مندوں کی نظر میں: 17)

دوران درس وتدریس جہاں آپ نے دیگر علوم متداولہ کا درس دیا وہیں احادیث رسول کی تدریس کے لیے آپ نے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ' بخاری شریف اور سنن ترمذی کا انتخاب کیا اور ایک عرصے تک ان کتابوں کا درس دیتے رہے۔ آپ کے درس کی خصوصیات کو الفاظ کی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا، آپ کا درس ہمہ جہت ہوتا تھا اور امام ترمذی کے خاص اسلوب، روایات کو بیان کرنے کے بعد ان کا درجہ بیان کرنا، صحیح وحسن، غریب الاستعمال کی تشریح، تعارض بین الحدیث کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ فقہ الحدیث اور مسائل کا استخراج واجتہاد نیز مسالک فقہیہ کا اشارۃً تذکرہ آپ کے ذوق کے عین مطابق تھا۔ اسی طرح امام بخاری کے ابواب وتراجم کی ترتیب اور ان کا روایت سے تعلق' رواتوں کا انتخاب' ایمان وایقان میں نقص وزیادتی کی دلچسپ بحث' فرق باطلہ کا رد وتعاقب اور اذکار واخلاص سے متعلق احادیث کا اجتماع آپ کے مزاج کے

مطابق تھا اور آپ کے لیے ایک ایسی شاہراہ جس پر آپ بلا خوف وخطر چلے جاتے تھے۔ آپ کا درس اس قدر جامع ہوتا تھا کہ تلامذہ کے ذہنوں سے مختلف قسم کے اعتراضات' سوالات اور مشکلات خود بخود مٹ جاتیں تھیں' چنانچہ آپ کی اسی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نسیم احمد فریدی رقم طراز ہیں:

"آپ کے درس حدیث میں قرآن کے معانی بھی حل ہوتے تھے' سیرت نبوی کے گوشے بھی نمایاں ہوتے' فقہ کے مسائل بھی سمجھائے جاتے ---- معانی وبیان سے آگاہ جاتا تھا۔ اسمائے الرجال اور علم لغت سے بھی شناسا کیا جاتا' تاریخ وفلسفہ سے بھی تعلق پیدا کیا جاتا۔" (ماہنامہ الحرم میرٹھ: حضرت مدنی نمبر: 61)

یہ تھی آپ کے علمی کمال کی ایک ہلکی سی جھلک' آیئے اب آپ کی انتظامی صلاحیتوں وکمال کا جائزہ لیا جائے۔

انتظامی صلاحیتیں:

جہاں آپ علم وکمال اور درس وتدریس میں یگانۂ روزگار تھے وہیں آپ انتظامی امور میں بھی یکتائے عصر تھے۔ آپ کے انتظام اور امور کو ان کے اوقات میں انجام دینے کی ادا نے بہت سے لوگوں کو اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو لوگ مینجمنٹ اور انتظام میں خود کو بڑا سمجھتے تھے انھوں نے محسوس کیا کہ وہ آپ کے آگے بونے ہیں۔ آپ کے انتظام اور امور کی انجام دہی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی فرماتے ہیں:

"......درس وتدریس کا کام بھی ہو رہا ہے' تصنیف وتالیف کے فرائض بھی انجام پا رہے ہیں' تزکیہ قلب اور تصفیہ باطن کا درس بھی جاری ہے اور ان سے بڑھ کر قوم وملت کی عملی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں' اگر ایک طرف مرکز علوم کی صدر نشینی کے فرائض انجام دے رہے ہیں تو وہیں دوسری طرف جمعیۃ علمائے ہند کی مسند صدارت بھی محروم نہیں ہے......نیز اسی لمحے میں آپ خاندان کے بہترین مربی ومنتظم' بچوں کے جاں نثار پدر بزرگوار' رشتے داروں کے بہترین خیر خواہ اور پورے گھر کے ہر دل عزیز بزرگ تھے۔" (ماہنامہ الحرم میرٹھ: حضرت مدنی نمبر: 61-62)

معاصرین سے ربط وتعلق

گوناگوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ آپ کے معاصرین سے بلا اختلاف مذہب وملت اور فکر وخیال' بہترین اور گہرے تعلقات تھے جو ایک کامل 'انسان' کے لیے ضروری عنصر ہوتا ہے۔ آپ اپنے خول میں

بندر بنے والے انسان نہیں تھے اور نہ ایسے عالم' جو اپنے علاوہ سب کو ناری' جہنم کا ایندھن ور کافر سمجھتے ہیں' بلکہ آپ ہر مکتبہ فکر کے اکابروں سے تعلق و ربط اور مراسلت و مکالمت جاری رکھتے تھے یہاں تک کہ غیر مسلموں سے بھی آپ کے برادرانہ تعلقات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مقدمہ کراچی اور قید و بند کے متعدد مواقع پر آپ کے رفقا میں برادران وطن کے نام بھی ملتے ہیں۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور آپ کے تعلقات و روابط سے کون ناواقف ہے' حالانکہ دونوں کے عقائد و خیالات میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا مگر فکر و احساس ایک تھا جس نے آسمان اور زمین کو ملا دیا اور وہ ایک سلسلے کی کڑی معلوم ہونے لگے۔

آپ کا احساس تھا کہ جنت و دوزخ اور نجات و عقوبت کا فیصلہ تو اللہ پاک ہی فرمائیں گے اور آپ حضور پاک ﷺ کی ہدایت کہ' اللہ پاک اپنے فضل سے ہی مغفرت فرمائیں گے' پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اس لیے دارالامتحان 'دنیا' میں بزعم خود اپنی 'نجات' فیصلہ نہ کر کے اللہ و رسول کے بتائے ہوئے خطوط پر چلنے کی سعی کامل کرتے تھے اور انسانوں سے بہتر تعلقات' میل جول اور سلام و کلام بھی' آپ کے معاصرین نے برملا اس کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کی دل کھول کر تعریف کی ہے جو علما کے مابین 'تعصب' کے ناسور کے دور میں ایک عظیم ترین بات تھی۔

امیر جماعت اسلامی' ہند مولانا ابواللیث اصلاحی سے آپ کی مراسلت اس قدر تھی کہ اس کے لیے مستقل طور پر ایک کتاب وجود میں آگئی۔ اس مراسلت میں طرفین کے مابین افہام و تفہیم اور فروعی مسائل سے قطع نظر ملی و قومی مسائل کا تذکرہ ہے نیز طرفین کی سعی و کوشش کی ہر دو جانب سے حوصلہ افزائی و خوب سے خوب تر کرنے کی ترغیب و رہنمائی بھی ہے۔

ملک و قوم کی خاطر آپ کی قربانیاں

آپ کا عہد شباب ہندوستان کی جد و جہد آزدی کا دور ہے اس وقت آزادی کی تحریک مکمل طور پر تیز ہو چکی تھی۔ غالب پاشا اور شریف مکہ کی بغاوت کے نتیجے میں گرفتاری کے بعد تو آپ کے اندر وطن کی خاطر مرنے مٹنے کا جذبہ بہت ہی شدت سے پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے درس و تدریس اور ملی و قومی خدمات کے ساتھ وطن کی خاطر قربان ہونے کا ولولہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ آپ کی وطن سے محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسلم لیگ کی ایما پر بڑے بڑے سیاست داں تقسیم وطن کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے آپ نے سب سے الگ متحدہ قومیت کا نعرہ دیا اور تقسیم کو تباہی سے تعبیر کیا۔ آپ کی حب الوطنی اور وطن پر قربان ہو جانے کے جذبے کا تذکرہ کرتے ہوئے ایم ایم جلالی لکھتے ہیں:

''حضرت نے آزادی وطن کی خاطر جو قربانیاں پیش کیں اور جس اولوالعزمی اور فراخ دلی سے اہل ہندو کو بدیشی سامراج کے پنجوں سے چھڑانے کی تگ ودو کی وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں جلی حرفوں سے لکھی جائیں گی ہر قوم کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ جنگ آزادی کی صف کے رہبر اعظم تھے۔''

آپ کی ہندوستان سے محبت کا تذکرہ ایم ایم جلالی اس طرح کرتے ہیں:

''حضرت کو سرزمین ہند سے قلبی محبت تھی' فطری اُنس تھا' آپ کا نظریہ حب الوطنی دنیا کی تمام قوموں سے ممتاز تھا' وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں اپنا وطن تسلیم کرتے تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک پر جب ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہند کے ولولے پیدا ہوئے اور ہندو پاک کے تقسیم کا مکمل تیاریاں ہو چکی تھیں نیز کانگریس نے بھی تقسیم ہند کی قرارداد تسلیم کر لی اس وقت تن تنہا حضرت مدنی علیہ الرحمہ تھے جنھوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کا مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے برملا اعتراف کیا (مگر چونکہ قرارداد پاس ہو چکی تھی اور وائسرائے ہند اس پس دستخط کر چکا تھا جس کا مٹنا محال تھا...... پھر آپ کے لاکھ نہ چاہتے ہوئے ملک تقسیم ہو گیا اور آپ کلیجہ خون کر کے رہ گئے۔) (شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی' ایک سیاسی مطالعہ: ۱۱۱)

ملک تقسیم ہو گیا اور مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے۔ ایشیا کے جغرافیائی نقشے میں دو بلکہ تین ملکوں کا اضافہ ہو گیا۔ اپنے اپنے نظام' قانون' اصول اور ضابطے بن گئے' ایک ہی ملکوں میں سرحدیں قائم ہو گئیں' ایک گھر کے بیچ آہنی دیوار بن گئی ہے جسے پھلانگنا جرم اور دراندازی تصور کیا جانے جاتا ہے...... مگر حضرت مدنی زندگی کی آخری سانس تک متحدہ ہندوستان اور متحدہ قومیت کا تقاضا کرتے رہے' اکھنڈ بھارت' کا مطالبہ کرتے رہے' اسے آپ کی عظیم تر ہندوستان کے تئیں ہمدردی' خلوص اور محبت نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

وطن کی آن پہ جو مٹ گئے قربان جو ہوئے
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

ایک نظر میں

(مولانا) شیر محمد امینی
بانی و مہتمم: مدرسہ ابی بن کعب گھاسیڑا ضلع میوات

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے والد ماجد کا نام مولانا حاجی شاہ سید حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنیؒ تھا، آپ کی ابتدائی تعلیم ٹانڈہ، ضلع فیض آباد میں ہوئی، چونکہ آپ کے والد کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا، اس وجہ سے آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہوئی، قاعدہ بغدادی والدہ محترمہ کے پاس پڑھا۔ سورہ فاتحہ سے والنّٰس تک والدہ محترمہ تعلیم دیتی رہیں اور اس کے بعد سے آخر قرآن تک والد محترم سے پڑھا۔ اس کے بعد فارسی پڑھی پھر اسکول میں داخل ہو گئے اور حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، جغرافیہ، تاریخ، ساحت عملی اور اردو، فارسی وغیرہ زبانوں کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم میں ۱۲ر سال کی عمر میں بہت مہارت حاصل کر لی۔

اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور شیخ الہند مولانا سید محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ کی مسجد کے سامنے والی کوٹھی کے کمرہ میں مقیم ہوئے اور حضرت شیخ الہند کے فرمانے پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے میزان الصرف شروع کرائی۔ اس طرح سے آپ کی عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔

آپ نے صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دارالعلوم دیوبند میں رہ کر علمی استفادہ، ماہرین اساتذۂ

کرام سے کیا، آپ نے اوقات مدرسہ کے علاوہ خارج اوقات میں بہت سی کتابیں اساتذہ سے پڑھیں اور بہت محنت وتوجہ سے تعلیم حاصل کیا، اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذۂ کرام نے اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں، چنانچہ شیخ الہندؒ باوجودیکہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث رئیس تھے اور آپ کے درس میں اونچی اونچی کتابیں رہتی تھیں، لیکن آپ کو حضرت شیخ الہندؒ نے ابتدائی کتابیں بھی پڑھائیں اور اکثر کتابیں باوجود مصروفیات کے خارج اوقات میں پڑھائیں۔ آپ ہمیشہ امتحان میں اعلیٰ اور نمایاں نمبروں سے پاس ہوتے رہے۔

آپ نے ساڑھے چھ سال کی مدت میں دارالعلوم دیوبند میں سترہ (۱۷) فنون کی سڑسٹھ کتابیں پڑھیں، آپ کے مشفق اساتذۂ کرام میں سے حضرت شیخ الہند مولانا سید محمود الحسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد ذوالفقار علیؒ، حضرت مولانا خلیل احمدؒ، حضرت مولانا حکیم محمد حسنؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، حضرت مولانا غلام رسولؒ، حضرت مولانا منفعت علیؒ، حضرت مولانا الحافظ احمدؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ اور حضرت مولانا صدیق احمدؒ وغیرہ تھے۔

۱۳۱۶ھ میں جب کہ آپ اکثر کتب درسیہ سے فارغ ہو چکے تھے، تو آپ کے والد محترم نے مدینہ منورہ کے سفر کا ارادہ کیا چونکہ آپ کی بعض کتب ادبیہ باقی رہ گئی تھیں، اس وجہ سے آپ سفر کے لئے تیار نہ تھے، لیکن مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد، باوجود انتہائی مشغولیت کے آپ نے ادبیات کی باقی ماندہ کتب کی تکمیل مدینہ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب فضیلۃ الشیخ آفندی برادہؒ سے کی۔

اس زمانہ میں حرم شریف مسجد نبوی ﷺ میں اکثر ماہر حدیث علماء کرام اعزازی طریقہ پر درسِ حدیث دیتے تھے۔ چنانچہ عرب اور ہندوستان کے طلباء کی پیہم خواہش پر آپ نے مسجدِ نبوی ﷺ میں درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کیا۔ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ سے شوال ۱۳۱۸ھ تک آپ کا حلقۂ درس ابتدائی پیمانہ پر رہا۔ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں آپ ہندوستان تشریف لائے اور محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد آپ کا حلقۂ درس وسیع ہو گیا۔ اور طلباء کا ایک جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ چنانچہ جب حصول تعلیم کے لئے جدوجہد کرنے والے مشرق وسطیٰ افریقہ، چین اور جزائر کے تشنگانِ علوم کا اس قدر ہجوم ہوا کہ حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ آپ کا علمی حلقہ وسیع ہوتا رہا تو لامحالہ دیگر علماء میں رشک ورقابت پیدا ہوئی۔ آپ کے حلقۂ درس پر علماء کی نظریں اٹھیں اور تنقیدات کا ارادہ کیا گیا۔ مگر ان لوگوں کو اس ارادہ میں کامیابی نہ ملی، چونکہ آپ کی تعلیم جید اور ماہر اساتذہ کے ذریعہ ہوئی تھی اور پھر آپ کو قدرت نے دماغ وذکاوت اور حفظ کا وہ اعلیٰ درجہ عطا فرمایا تھا کہ جس کی نظیر خود آپ ہی تھے۔ نیز آپ کوئی سبق بغیر مطالعہ کے نہ پڑھاتے تھے اور دن

ورات کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف تین گھنٹے آپ آرام فرماتے اور بقیہ وقت درس ومطالعہ میں گذرتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حجاز میں ایسی عزت و جاہ عطا فرمائی جو ہندی علماء کو کیا بلکہ یمنی، شامی اور مدنی علماء کو بھی حاصل نہیں تھی، اور آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ اور آپ کو ۲۴ رسال کی عمر میں شیخ الحرم اور شیخ العرب والعجم کے معزز القاب کے ساتھ سرفراز کیا گیا۔

۱۳۴۶ھ میں خداوند قدوس نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو دارالعلوم دیوبند کی رفیع مسندِ علم پر مستقل طور سے جلوہ افروز فرمایا اور دارالعلوم دیوبند نے آپ کی سرپرستی میں جو علمی ترقی کی وہ ظاہر ہے۔ دارالعلوم کی مسندِ علم پر دوسرے اکابر علماء، محدثین عظام جلوہ افروز رہے اور اس دور میں بھی دارالعلوم کے دارالحدیث میں حدیث کی شمع روشن ہوئی، اور اس پر جان نثار پروانے آئے اور انہوں نے اپنی جان شمعِ حدیث پر نثار کی، لیکن خدا گواہ ہے کہ اس مدنی محدث نے جب شمعِ حدیث روشن کی تو اس پر اس قدر پروانوں کا ہجوم ہوا اور دارالحدیث، علم وعرفان کے تابناک ستاروں سے اس قدر جگمگایا کہ دیوبند کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے مستقل طور پر ۳۱ رسال کا یہ عرصہ دارالعلوم میں علوم نبویہ کی خدمت میں گذارا۔

درسِ حدیث کے علاوہ دارالعلوم کے انتظامی اور تعلیمی وتبلیغی امور کو بھی حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک کام کی پوری نگرانی ہوتی تھی۔ دارالعلوم کی ترقی اور عروج وفروغ میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور اسلام کی جو علمی یادگار آپ کی سپردگی میں دی گئی تھی، اس کو بامِ عروج پر پہنچایا اور دنیا میں اس کے نام کو روشن کر دکھایا۔

آپ ۲۸ رسال دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے منصب پر فائز رہے۔ اس دوران جس انہماک اور سرگرمی کے ساتھ آپ نے اپنی ذمہ داری کو پورا فرمایا، اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔ دارالعلوم کے قیام میں اسباق میں تساہل تو در کنار، سفر میں بھی ہمیشہ درس کی فکر لاحق رہتی تھی۔ اور کوشش ہوتی تھی کہ جلد از جلد دیوبند پہنچ کر سبق پڑھایا جائے۔ اور جب بھی ہر قریب وبعید سفر سے واپسی ہوتی، اور درس کا وقت ہوتا، اسی وقت سبق کا اعلان ہو جاتا تھا۔ اور درس شروع ہو جاتا۔ نہ کوئی تکان محسوس ہوتی تھی اور نہ اضمحلال کا کوئی اثر ظاہر ہوتا تھا۔

شیخ الاسلام کے زہد وتقویٰ کا یہ حال تھا کہ جتنے دن پڑھاتے تھے، اُس کے علاوہ ایک دن کی بھی تنخواہ لینا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مدرسے کے سلسلے میں سفر کرنا پڑا مگر سوائے خواندگی ایام تعلیم کے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ حضرت فرماتے: جن ایام میں میں نے پڑھایا ہی نہیں تو ان ایام کی تنخواہ کیسی۔ تنخواہ تو پڑھانے کی ملتی ہے۔

حضرت شیخ نے مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد سے جمعیۃ علماء ہند کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا

شروع کر دیا تھا اور اخیر میں تو کئی برس سے جمعیۃ علماء ہند کے مستقل صدر رہتے تھے۔ یہ صدارت بھی خطبہ صدارت پڑھ دینے والی صدارت نہ تھی بلکہ اس صدارت کی ذمہ داری کا آپ کو پورا احساس تھا اور اسی احساس نے جمعیۃ علماء ہند کو ایسے نازک دور میں بھی سنبھالے رکھا جب کہ خود اپنے اس کا وجود ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے، اس دوران جو سیاسی کارنامے جمعیۃ علماء ہند نے آپ کی سرگرمی میں انجام دئے، انھی کی بدولت آج عالمِ اسلام میں مسلمانانِ ہند کا سر بلند و بالا ہے۔ اگر حضرت مدنیؒ کی ہستی سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر سرگرم نہ رہتی تو کس کو معلوم ہوتا کہ اس تحریکِ آزادی میں مسلمانانِ ہند کا پورا حصہ ہے، جس کی بنیاد خود مسلمانوں نے ڈالی اور اپنی جانبازیوں اور سرفروشیوں سے اس کو منتہی تک پہنچایا۔ ہندوستان میں کوئی مسلم یا غیر مسلم سیاسی سرگرمیوں اور ملکی قربانیوں اور جانبازیوں میں حضرت مدنیؒ کو فراموش نہیں کر سکتا ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ اس مردِ مجاہد نے تحریکِ آزادی میں وہ کام انجام دیا جس کو بڑی جماعت بھی انجام نہ دے سکتی تھی۔

سادگی اور بے تکلفی بھی انسانی اعلیٰ جوہر ہے جو انسانیت سے آراستہ کرتا ہے۔ حضرت مدنیؒ سادگی اور بے تکلفی میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ اس ظاہری عزت واقتدار کے باوجود اپنی درویشانہ شان اور بوریہ نشینی کو برقرار رکھنا اور سنت نبوی ﷺ کے موافق سادگی کے ساتھ زندگی گذارنا صرف آپ ہی کا عالی حوصلہ تھا۔ یہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ حضرت مدنیؒ کا لباس، وضع قطع، رہائش، بود و باش سب لطیف اور سادہ تھا اور سنت نبوی ﷺ کا بہترین نمونہ تھا۔ آپ سنت کے موافق چمڑے کا تکیہ استعمال فرماتے تھے۔ اور چمڑے کا گول دسترخوان استعمال ہوتا تھا، جس پر ہمیشہ ایک سالن ہوتا تھا اور دائرے کی شکل میں دس بارہ آدمی دسترخوان کے اردگرد بیٹھ کر ایک ہی برتن میں ساتھ کھاتے تھے ان میں سے ایک حضرت بھی ہوتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ صبح کو ناشتہ چائے کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا اچار ہوتا تھا۔ یہی حضرت کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہمانوں کا۔ حضرت مدنیؒ کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوقِ خدا کو آپ کا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا اور آپ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔ اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنیؒ وقار و تمکنت کا کوہِ طور یا کوہِ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا ہیبت وجلال چہرہ مبارک پر عیاں تھا۔ باوجود کہ حضرتؒ ہنس ہنس کر باتیں فرماتے تھے مگر دل اندر سے لرزتا رہتا تھا۔ انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع وانکساری میں مضمر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ یہی تواضع وانکساری اصلی شانِ عبدیت ہے۔ حضرت مدنیؒ بھی تواضع اور انکساری کا ایک مجسمہ تھے۔

آپ ہمیشہ اپنی ضرورتوں کو اپنے پاس سے پورا فرماتے تھے۔ اور اس معاملے میں بہت سختی برتتے تھے

اور جو ہدایا دوسروں کی طرف سے آتے تھے، بے دریغ ان کو رفقاء پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ یہ ایثار وقربانی حضرت کو شاید ورثہ میں ملی تھی۔ جن طلبہ کا دارالعلوم سے وظیفہ نہیں ہوسکتا تھا، ان طلبہ کے اخراجات کی خود آپؒ کفالت فرماتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ ہی شان تھی، جس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں، جن کو کبھی حضرت کے آستانہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ روزانہ کم وبیش چالیس مہمان حضرت کے دسترخوان پر ہوتے تھے، جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے ہوتے تھے۔ حضرت ہر ایک کا پورا پورا اعزاز واکرام فرماتے تھے اور نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذیذ اور مزیدار ہوتا تھا۔ حضرت دونوں وقت کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے تھے جو مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ کھانے میں کسی قسم کی تفریق نہ ہوتی تھی۔ جو ہوتا تھا سب کے لئے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز پکوائی جاتی تھی تو سب مہمانوں کے لئے یکساں پکوائی جاتی تھی۔ یہ فیاضی اور مہمان نوازی بھی حضرت مدنیؒ کی خاندانی خصوصیات میں شامل تھی۔ حضرت مدنیؒ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی بہت سی صفات مرضیہ سے بڑے بڑے حصے نصیب فرمائے تھے۔

حضرت مدنیؒ قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ و شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ ومجاز تھے۔

شیخ الاسلام کی پہلی شادی موضع قتال اعظم گڑھ یوپی میں ہوئی تھی، جن سے دو لڑکیاں ہوئیں، پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد حضرت مدنیؒ کی دوسری شادی قصبہ بچھرایوں ضلع مراد آباد یوپی میں قاری حکیم غلام احمد صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے دو صاحبزادے اخلاق احمد اور اشفاق احمد ہوئے۔ ان اہلیہ کے انتقال کے بعد شیخ الاسلام کی تیسری شادی، دوسری اہلیہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی، جن سے دو بچے ہوئے ایک صاحبزادہ اسعد (فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ) دوسری صاحبزادی ماجدہ خاتون۔ حضرت شیخ الاسلام کی چوتھی شادی حضرتؒ کے چچازاد بھائی سید بشیر الدین صاحب مرحوم کی منجھلی لڑکی سے ہوئی، جن سے دو صاحبزادے ہوئے۔ ایک ارشد (حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ العالی) اور دوسرا صاحبزادہ محمد اسجد (مولانا سید اسجد مدنی صاحب حفظہ اللہ) اور پانچ صاحبزادیاں ہوئیں۔

حضرت مدنیؒ اپنے علم وفضل، زہد وورع، اخلاص وتقویٰ، تواضع وانکساری، صبر وتحمل، مروت، سیر چشمی، فیاضی، جود وسخا، مہمان نوازی، بلندیٔ اخلاق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق میں سنت کے پیرو اور صحابۂ کرام کے نمونہ تھے۔

شیخ الاسلام کی حیاتِ مقدسہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ ہندوستان کے اس جمہوری ملک میں ہم ایک سچے اور وفادار محبِ وطن کی زندگی گذاریں، ملکی فرائض و مفادات میں تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھیں مگر اس طرح کہ ہمارا قدم جادۂ شریعت پر مضبوطی سے قائم ہو اور ہمارے افعال و اعمال اس تہذیب کے قائم اور زندہ رکھنے میں مصروف رہیں جس کو محبوب رب العالمین ﷺ نے پیش فرمایا ہے اور جس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے ''جس کو رسول تمہارے سامنے لائے اس کو لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ''۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں بڑے نڈر واقع ہوئے تھے۔ یہ ان کا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کی جماعت میں بڑے بڑے اربابِ جبر و دستاران کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ، مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء، جمعرات کے روز قبل از وقت ۲ر بجے حضرت شیخ الاسلام کا وصال ہو گیا۔ ان کی موت سے شریعت و طریقت کی عظمت مٹ گئی۔ علم و عرفان کی بزم سونی ہو گئی۔ سلوک و تصوف کی خانقاہ اجڑ گئی اور عزم و استقلال کے بلند منارے زمین کے برابر ہو گئے۔

پس شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کی اصل یادگار یہ ہے کہ ان کے کارناموں کو زندہ اور برقرار رکھا جائے اور ان کے مقاصدِ زندگی کو فروغ دیا جائے، جن پر انہوں نے اپنی جانِ عزیز قربان کی۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ
کا
اتباعِ سنت اور خلوصِ خلق

مولانا عبداللہ عثمانی
محلہ گدیواڑہ، دیوبند

مشروع وضع قطع، درمیانہ قد، سانولا رنگ، یہ سادگی کا پیکر شخص دارالعلوم کے دارالحدیث کی مسند سے درس میں مشغول ہے تو وطن عزیز کی خاطر ہزاروں میل دور سنگینوں کے زیر سایہ مالٹا کی قید میں بھی قال اللہ اور ارشادِ رسول کی صدائیں بلند کرنے میں مصروف ہے، جس کو عالم اسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام سے جانتی ہے، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۷ء) کی پوری زندگی، قرآن کریم، احادیث مقدسہ کی تعلیمات اور احیاء اسلام کی سربلندی کی شبانہ روز کوششوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تحریک حریت کی زبردست جدوجہد میں گزری، آپ عبادت وریاضت، زہد وتقویٰ اور پیکر حق وصداقت تھے آپ کی شخصیت اعلیٰ ایمانی، انسانی اخلاقی اور روحانی خصوصیات کا مجموعہ تھی، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی ہشت پہلو ذات گرامی مثل آفتاب سارے عالم کے لیے فیض رساں تھی انھوں نے عالم دین اور ایک مجاہد وطن کی حیثیت سے جو زندگی بسری کی ہے اور جو نقوش چھوڑے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری امت کے لیے چراغ راہ ہیں ہم یہاں حضرت کی زندگی کا خاص وصف، اسوۂ رسول کا اتباع اور خلوص خلق پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

حق تعالیٰ نے علمی اسوہ قرآن عزیز کی صورت میں اور عملی نمونہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل

میں مرحمت فرمایا چناں چہ آپ کی پوری زندگی قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے مطابق ہے نیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدس کا مکمل متن قرآن حکیم ہے لہٰذا قرآن پاک آپ کی شرح حیات کے بنا سمجھ میں نہیں آسکتا اور نہ ہی سیرت رسول قرآن پاک سے جدا کر کے معتبر ہوسکتی ہے اس بارے میں متعدد آیات بطور استدلال پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً: لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃ. ترجمہ: درحقیقت تم لوگوں کے لیے رسول اللہ کی ذات میں عمدہ نمونہ موجود ہے۔

الغرض حضرت مدنیؒ کا یہی وصف ان کو ہر معاملات میں معزز و محترم بناتا ہے اور یہی دُرِّ نادران کے کمالات کا سرتاج ہے، آپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنت کو بھی نظر انداز نہیں کیا، بہت سی احادیث کا مطلب ان کے عمل و کردار سے ذہن نشیں ہوتا تھا، آپ کی مجاہدانہ زندگی صحابہ کرامؓ کی یاد تازہ کردیتی تھی ان کی متفکرانہ خاموشی (کان رسول اللہ ﷺ الاخوان۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے) کا نظارہ پیش کرتی تھی، تقاریر میں، سہل و عام فہم جملوں کا رُک رُک کر بولنا سنت قولیہ کی ادائیگی تھی، مہر فاطمی کے علاوہ کسی دیگر مہر پر نکاح نہیں پڑھاتے تھے، اور اس پر سختی سے مصر تھے لباس میں اصحاب رسول کی مفلسی پسند تھی، ہاتھ کا کتا ہوا اور بنا ہوا کھدر زیب تن فرماتے، آنے جانے کے وقت اہل مجلس کے کھڑے ہونے کو اپنے لیے اچھا نہ سمجھتے۔ لاتقوموا کالاعاجم عجمیوں کی طرح کھڑے مت ہو کا احیاء بھی شامل تھا، گھر کے دسترخوان پر سدا مہمانوں کی رونق رہتی، مہمانوں کی تواضع از خود فرماتے اور انکی آمد سے نہایت خوشی محسوس کرتے، جس کی نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی، الحمدللہ یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے کھانا بالکل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح بیٹھ کر کھاتے تھے لقمے چھوٹے چھوٹے لیتے، مہمانوں کے خیال سے سب کے بعد تک کھاتے رہتے جب کہ خوراک بہت کم تھی تنہا پلیٹ میں نہ کھاتے تھے، دوستوں کو بھی اس میں شریک کرتے، کھانے کے بعد برتن کو بالکل صاف کرلیتے، مسجد میں داخل ہوتے وقت ہمیشہ داہنا پیر رکھتے نکلتے وقت پہلے بایاں پیر نکالتے مگر جوتے میں پہلے داہنا پیر ہی ڈالتے، کھانے کی کبھی برائی نہ کی، کبھی تنہا کوئی چیز نہ کھاتے تھے اور نہ پیتے تھے غرض سنت نبویؐ انکی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کا ایک ممتاز کمال ان کا خلوص ہے حضرت کا یہ ایک ایسا گن ہے کہ جس کا اعتراف ان کے مخالفین ومعاندین نے بھی کیا ہے اسیران مالٹا میں مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کے حوالے سے یہ روایت بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ کی زیر صدارت دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس ہو رہا تھا پہلی ملاقات ہوئی اس وقت آپ حضرت شیخ الہند کے مخلص خادم تھے میری نگاہ میں آپ کے یہی دو خصوصی وصف ہیں، اخلاص وجذبہ خدمت آپ بارگاہ امدادیہ سے فیضیاب ہوئے اور دربار رشیدی سے

فیوض حاصل کیے ابتداء تا آخر حضرت شیخ الہند سے کسب کمال کیا، غرض ہر طرح دولت اخلاص سے بھرپور اور بادۂ عشق سے مخمور ہو گئے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس دریا کا ایک پیالہ بھی ضبط کرنا مشکل ہے (حضرت مدنی) سارے سمندر چڑھائے ہوئے ہیں پھر بھی ضبط موجود ہے کیا مجال ہے کہ ساغر چھلک جائے، حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد یہ ''جذبۂ خدمت'' مخلوق خدا کی طرف منتقل ہو گیا تمام مخلوق خدا آپ کی مخدوم تھی اور آپ سب کے ہمدرد و خیر خواہ خادم ایک بار حضرت مولانا الیاسؒ نے حضرت مدنی سے فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے دعا فرمائیں تو تیز لہجہ میں حضرت مدنی نے فرمایا کہ کیوں کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں؟ یہی وہ سطوتِ عامہ تھی جو انبیاء اور رسولوں کو عطا ہوئی ہے اور ان کے بعد ان کے حقیقی جانشیں اور نائبوں کو دی جاتی ہے، حضرت مدنیؒ نے اپنے جس عمل سے لوگوں کے دلوں میں سربلندی حاصل کی وہ بھی خلوص و اخلاق کا نمونہ تھا، مسلم لیگی آپ سے شدید نفرت کرتے مگر آپ نے کبھی ان کے حق میں بددعا نہیں کی اور نہ ہی بھدے الفاظ استعمال کیے معروف کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم نے حضرت کے صبر و تحمل کی شہادت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بسا اوقات مسلم لیگی مجاہدوں کے حلقوں میں حضرت مولانا کے قتل کے منصوبے بھی بنائے گئے اور حافظ ابراہیم کے انتخاب میں مولانا کے ایک عزیز لیگیوں کے ہاتھوں زخمی ہو گئے مگر حسین احمد کی زبان سے کبھی اُف نہ نکلی اور اس نے ان حضرات کے حق میں صرف ہدایت کے لیے خدا سے دعائیں مانگیں مجھے آزمائش کی ان گھڑیوں میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا عزم و استقلال ان کا سکون و صبر، ان کا بے مثال تحمل ہمیشہ یاد رہے گا میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک ہم نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا حال صرف کتابوں میں پڑھا تھا اب بلالؓ و عمارؓ کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حضرت مدنی کے خلوص و محبت کے ہزارہا مشاہدین آج بھی حیات ہیں اور ان کے عہد میں بھی تھے اسی سلسلہ میں مولانا قاضی ظہور الحسن صاحب سیوہارویؒ کے درج ذیل شواہد بھی قابل مطالعہ ہیں، بنگال کے سفر میں حضرت جو ایک جگہ لوگ سخت گستاخی سے پیش آئے اور اخبارات میں اس کا چرچہ ہوا تو چودھری مقبول الرحمٰن خان سیوہاروی نے ان لوگوں کی ہجو میں ایک نظم لکھی جس میں ان لوگوں کے لیے کچھ بددعائیں بھی تھیں یہ نظم انھوں نے مجھے بھی دکھائی اور مجھ سے بھی مشورہ کیا پھر اس کو صاف کر کے میں نے اشاعت کے بجنور کے لیے ایک مشہور اخبار مدینہ میں بھیج دیا جب وہ شائع نہ ہوئی تو میں نے مولوی مجید حسن کو بطور شکایت خط لکھا مولوی صاحب نے جواب دیا کہ جب وہ نظم یہاں پہنچی حضرت دفتر میں تشریف فرما تھے ہم نے ان کو سنائی حضرت نے فرمایا اس کو شائع نہ کیا جائے اس لیے ہم اس کو درج اخبار نہیں کر سکتے اگلے مہینہ میں حضرت سیوہارہ تشریف لائے تو میں نے کہا کہ آپ نے ہماری نظم کو شائع ہونے سے کیوں روک دیا۔ فرمایا کہ

بھائی صاحب میرے ساتھ جس کسی نے جو کچھ کیا ہے یا آئندہ کرے گا میں سب کو معاف کر چکا ہوں آپ میری وجہ سے کسی کو برا بھلا نہ کہیں نہ کسی کے لیے بددعائیں کریں ایک بار حضرت سیوہارہ میں مقیم تھے باہر کا کوئی شخص آیا اور اس نے کچھ باتیں کیں اور آخر کار سخت کلامی پر اتر آیا حضرت مدنی سنتے رہے اور مسکراتے رہے بالآخر وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

ایسے واقعات سے نہ صرف حضرت مدنیؒ کے ظرف وروشن ضمیری کا پتہ چلتا ہے بلکہ سرزمین ہند کا سر بھی فخر سے بلند ہوتا ہے کہ اس کی مٹی نے اس پائے کے افراد کو بھی جنم دیا ہے، آج وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف اور اکابرین کے عمل وکردار سے باخبر ہوں اور ان کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی میں زندگی کے منزلوں کو تلاش کریں۔ ■

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

(۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۷ء)

عظیم فکری رہنما اور متحدہ قومیت کے معمار

عظیم اللہ صدیقی قاسمی

ایک قومی نظریہ کے بانی اور متحدہ قومیت کے علم بردار، جمعیۃ علماء ہند کے سابق صدر، مرجع خلائق، قطب العالم شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمات کے اعتراف میں ۲۹ راگست ۲۰۱۲ء کو جیسے ہی ڈاک ٹکٹ کا اجرا ہوا، ڈاک ٹکٹ جاری کرتے ہوئے مرکزی وزیر مواصلات کپل سبل نے ان کی عظمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم ایک ایسی شخصیت کو یاد کررہے ہیں، جن کو یاد کرتے ہوئے آج ہمارا سر فخر سے اونچا ہے، مولانا حسین احمد مدنیؒ تاریکی میں ایک روشن چراغ تھے، یہ تاریکی ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے وقت پھیلی تھی، اس وقت ان چند لوگوں کی ضرورت تھی جو ہمیں اس تاریکی سے نکال سکے، مولانا مدنی ان ہی چند تاریخ ساز لوگوں میں سے تھے، انھوں نے باد مخالف کی پروا کیے بغیر بٹوارا کی مخالفت کی، انھوں نے کرپس مشن کی مخالفت کی، وہ مالٹا کے قیدی بھی تھے،، کپل سبل نے کہا کہ آج جب ملک پھر تاریکی میں ہے، آج پھر مولانا مدنی کی فکر کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم عہد کریں کہ مولانا مدنی کی روشنی کو آگے بڑھائیں گے اور اس دیش کو ایسا بنائیں گے کہ اس دیش میں صرف پیار ہے، یہ دیس انسانیت کی مثال بن جائے۔

کپل سبل نے ایسا نہیں ہے کہ جذبات کی رو میں آکر یہ بات کہی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کے چاہنے والے اور ان سے محبت کرنے والے دنیا کے گوشے گوشے میں بستے ہیں، ان کا ذکر کہیں بھی آجائے ایسا لگتا ہے کہ سر خود بخود عقیدت میں جھک جارہا ہے۔ وہ نہ صرف لاکھوں کے مرشد تھے، بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں ان کی محبت وعقیدت کا طوفان موجزن رہتا تھا، ان کے اشارے پر برصغیر میں انقلاب بپا ہوجاتا تھا، خود ان کی ہستی اپنے آپ میں ایک انقلاب تھی۔ حضرت مدنی کی کرشماتی ذات اور باوقار شخصیت ایسا نہیں ہے کہ

عقیدت مندوں کے لیے ہی کرشاتی تھی بلکہ گاندھی، نہرو اور بڑے بڑے ممالک کے حکمراں، سفراان کے سامنے جبیں نیاز کرتے تھے، ڈاک ٹکٹ جاری کرتے ہوئے کپل سبل نے جس عقیدت اور ملک کی قربانی میں ان کے نمایاں رول کا ذکر کیا، اس سے سرکاری طور پران کی خدمات پر مہر ثبت ہوگئی۔ یقیناً حضرت مدنیؒ کا نام مادر وطن کی آزادی کی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے نقش ہے، وہ ۱۹۴۰ء سے تاعمر ۱۹۵۷ء تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔ ان کی پوری زندگی لیلائے وطن کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی اقدار وروایات کے تحفظ کے لیے وقف تھی، وہ گاندھی جی، جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کے افکار ونظریات کے حامی اور ان وطن پرستوں کے سرپرست تھے، حضرت مدنیؒ کی جمعیۃ علماء نے جو پہلے فیصلہ کیا وہ گاندھی اور نہرو کے لیے نقش حیات بن گیا اور وہی فیصلہ بعد میں کانگریس کرتی تھی، جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام حیدر آباد میں منعقد ایک کانفرنس میں مرکزی وزیر غلام نبی آزاد نے کہا کہ سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے ہی مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا، اس کے دس سال بعد کانگریس نے اعلان کیا، ملک چھوڑو تحریک ۱۹۴۲ء اور تحریک عدم تعاون کا اعلان جمعیۃ علماء نے اس وقت کیا جب دیگر جماعتیں ایسا ہونا محال سمجھتی تھیں۔ (جمعیۃ کانفرنس حیدرآباد ۵/جنوری ۲۰۱۲ء)

حضرت مدنیؒ ۱۸۸۹ء میں اتر پردیش کے اناؤ ضلع کے تحت واقع گاؤں بانگرمئو کے ایک مشہور علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد سید حبیب اللہ ۱۸۹۹ء میں مدینہ ہجرت کر گئے، چنانچہ ان نام کے آخر میں ''مدنی'' کا اضافہ ان کے والد کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ سے اسی تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زندگی ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پیدا شدہ بدامنی اور احساس ذلت کی چھاؤں میں گزری تھی، یہ تاریخ کا انوکھا تضاد ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کا جسے آخری چنگاری سمجھا جارہا تھا، وہی شمع آزادی کو فروزاں کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

اٹھارہ سو ستاون کی ناکامی کے بعد دیوبند آندولن کی چنگاری سلگنے لگی، جس کے تحت جو طبقہ پروان چڑھا، اس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ ابھر کر سامنے آئے، ۱۸۸۵ء میں ایک برطانوی شہری نے انڈین نیشنل کانگریس قائم کیا، سرسید احمد خاں نے اسی دوران مسلمانوں میں جدید تعلیم فروغ دینے کے لیے علی گڑھ میں ادارہ قائم کیا، مولانا مدنی نسبتاً ایک الگ ماحول اور مختلف سماجی حالات میں پروان چڑھے تھے، جس میں ایک ہندستانی اور مسلمان کی حیثیت سے، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ان کا مقصد قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مشترکہ اقدار وروایات کو درپیش چیلنج کا سد باب تھا، ایک انقلابی رہنما ہونے کے سبب انھیں بیرونی چیلنجوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں غیر ملکی حکمرانوں کے عتاب بھی برداشت کرنے پڑے۔ جہاں وطن میں برطانوی حکومت سب سے بڑی دشمن تھی وہیں فرقہ پرست عناصر سے مقابلہ اور قومی اتحاد کی حفاظت اہم مسئلہ تھا، جہاں

ایک طرف غیر ملکی سامراج سے مقابلہ تھا جو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا تو دوسری طرف وہ عناصر تھے تو فرقہ پرستی کو فروغ میں مشغول تھے، ان حالات میں ہندو مسلم اتحاد کا علم اٹھائے رکھنا ایک چیلنج سے بھرا عمل تھا، لیکن مولانا مدنیؒ اپنے مشن و موقف سے پل بھر کے لیے بھی نہیں دور ہوئے۔

دار العلوم دیو بند سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا کی زندگی اجمالی طور پر دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، اقتصادی حیثیت سے وہ تنگی کے شکار تھے، پھر بھی اللہ پر مکمل بھروسہ تھا، ان کی فکر پر تصوف کے سلسلوں کا اثر تھا، وہ معاش کی غرض سے تعلیم و تعلم سے جڑے اور قلیل عرصے میں ہی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حدیث کے مقبول استاذ ہو گئے، جو نہ صرف ان کی ضرورت زندگی کی تکمیل کا سبب بنا بلکہ اس کی وجہ سے ان کی شہرت وعزت میں چار چاند لگ گیا۔ حجاز میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی سے قربت حاصل ہوئی اور جلد ہی ان کے معتمد خاص بن گئے، اسی تعلق کے سبب وہ مالٹا کے جیل میں ان کے ساتھ قید کیے گئے، وہ تمام آزمائشوں اور دشواریوں میں حضرت شیخ الہند کے شریک رہے اور مضبوطی کے ساتھ ان کے ساتھ جمے رہے۔

زندگی کا دوسرا دور مالٹا جیل سے رہائی کے بعد وطن واپسی کے بعد شروع ہوا، یہ دور درحقیقت حضرت شیخ الہند کی نگرانی میں جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے بعد شروع ہوا، یہ دور ان کے لیے ایک نیا کردار لے کر آیا، یہ مظاہروں اور احتجاجوں کا دور تھا جس میں مختلف شکل میں آندولن اور بارہا جیل جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

تحریک عدم تعاون اور خلافت تحریک کا عہد ایک ہی ہے، ان دونوں تحریکوں میں قومی اتحاد کا مظاہرہ ہوا جس میں ہندو مسلم اتحاد کا ایک نادر مظاہرہ نظر آیا، اس اتحاد کا ایک اثر یہ ہوا کہ ظالم حکمرانوں کی راتوں کی نیند اڑ گئی، لیکن صد افسوس یہ دونوں تحریکیں جو بڑے جوش وخروش سے شروع ہوئی تھیں، جلد ہی اپنا اثر کھو بیٹھیں، کچھ دنوں بعد ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس نے مولانا مدنی جیسے محب وطن لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیا اور ان کے سامنے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو نقصان پہنچانے والی طاقتوں سے نمٹنے کا ایک چیلنج آ کھڑا ہوا حضرت مدنیؒ نے ان نفرت کی بنیاد پر قائم عداوتوں کو سامراجی طاقتوں کی سازش قرار دیا اور اس کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے مکمل جد وجہد شروع کر دی۔ قابل ذکر ہے کہ حضرت مدنی پوری زندگی اس نظریہ پر کاربند رہے کہ وطن پرستی ایک بنیادی فکر ہے اور وطن دوستوں میں اس جذبہ کو مستحکم کرنے کے لیے اجتماعی کوشش ہونی چاہیے، اس کے لیے جہاں انھیں مبارکباد ملی وہیں مخالفوں نے جم کر نشانہ بنایا، جہاں پھولوں کی سیج سے ان کا استقبال ہوا، وہیں انگارے بھرے طوق بھی ان کے گردن میں ڈالے گئے۔

مولانا مدنی کی ذات مرنجان مرنج خوبیوں کی حامل تھی، جہاں وہ عظیم فکری رہنما، ماہر تعلیم اور علوم حدیث کے ماہر تھے، وہیں دن کے مجاہد اور شب زندہ دار تھے، جمعیۃ علماء ہند کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۴۰ء سے

۱۹۵۷ء تک جس بالغ نظری سے انھوں نے ملک وملت کے مسائل کے لیے جدوجہد کی وہ قابل تعریف اور لائق ستائش ہے، مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے مولانا مدنی کے ایک قومی نظریہ کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے
''مولانا مدنی کا ماننا تھا کہ مذاہب کے اختلاف کے باوجود ملک کے سبھی شہریوں کو متحدہ قوم میں ڈھلنا چاہیے تا کہ ملک حقیقی آزادی حاصل کر سکے اور ایسی پالیسیوں پر چل سکے جس سے سبھی کو بھلا ہو''
۱۹۲۰ء کی دہائی میں ملک میں کئی تبدیلیاں آئیں، نئی قیادت ابھر کر سامنے آئی، ۱۹۲۹ء کی لاہور کانفرنس میں پنڈت نہرو نے کانگریس کی صدارت سنبھالی، سبھاس چندر بوس دوسرے ابھرتے ہوئے لیڈر تھے، اسی دوران حضرت مدنیؒ نے ملک بھر میں دورے کر کے متعدد جلسوں میں ہندو اور مسلمانوں سے ایک ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی اپیل کی۔ ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی تحریک چلی تو جمعیۃ علماء کے لوگوں نے پورے ملک میں بڑی تعداد میں گرفتاریاں دیں، اس تحریک کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور انگریز حکمراں مختلف قانونی تبدیلیوں کے اعلان پر مجبور ہوئے۔ ایکٹ ۱۹۳۵ء لایا گیا جس کے تحت منتخب ریاستی سرکاریں قائم کرنے کی تجویز تھی، اس دور میں مسلم لیگ ابھری اور اس نے کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ سیٹوں کے بٹوارے کا سمجھوتا کیا، لیکن یہ سمجھوتا وقتی ثابت ہوا، لیگ کے صدر محمد علی جناح دوقومی نظریہ کے تحت مسلمانوں کے لیے الگ ملک کا مطالبہ پیش کر بیٹھے، دوقومی نظریہ نے کانگریس اور مسلمانوں کے سامنے یہ چنوتی کھڑی کردی کہ کس طرح مسلمانوں کے لیے الگ ملک کے مطالبے کا مقابلہ کیا جائے اور ملک کی تقسیم کے بغیر آزادی کا مقصد حاصل کرلیا جائے، کانگریس اور جمعیۃ نے اس دوقومی نظریہ کو سختی سے مسترد کردیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہندستان کے سبھی شہری ایک قوم کی طرح ہیں۔
مسلم لیگ کے اس نظریہ اور مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم کے مطالبہ کی مخالفت اور اس سے پیدا شدہ چیلنجز کا مقابلہ کرنے کا سب سے زیادہ کریڈٹ مولانا مدنیؒ کو جاتا ہے انھوں نے اس کی مخالفت اس وقت بھی ترک نہیں کی جب کانگریس کی پوری قیادت (مولانا حفظ الرحمٰن وچند دیگر کو چھوڑ کر) سبھی نے اس نظریہ کو تسلیم کرلی اور اپنے اجلاس میں کانگریس نے تقسیم وطن پر مہر لگادی، حضرت مدنیؒ کا مستحکم نظریہ تھا کہ موجودہ دور میں قوم وطن سے بنتی ہے مذہب سے نہیں، ایک ہی جغرافیائی حد میں رہنے والے افراد سے وطن بنتا ہے چاہے ان کے مذاہب مختلف ہوں۔ مولانا نے ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے پختہ شرعی دلائل کی روشنی میں اپنے اس نظریے کو درست قرار دیا، جس کی وجہ سے ڈاکٹر اقبال سے نوک جھونک بھی ہوئی، لیکن آخر میں علامہ اقبال نے ہی اپنی رائے کے لیے افسوس ظاہر کیا۔ حضرت مدنیؒ ان رہنماؤں میں سے تھے، جنھوں نے ہمیشہ سامراجی طاقتوں کی مخالفت کی، اسی طرح مسلم لیگ کے نظریے کے بھی مخالف رہے، یہ فخر صرف حضرت مدنی کو حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے سائمن کمیشن کی مخالفت کی، اس کے بعد کانگریس کی تجویز آئی، اسی طرح مولانا مدنی نے سب

سے پہلے مسودہ قانون پر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی جس میں شہریوں کے اختیارات کا ذکر تو تھا مگر اقلیتوں کے حقوق کا کوئی ذکر نہیں تھا، انھوں نے اقلیتوں کے ساتھ انصاف اوران کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔

اصلی کھیل تو آزادی سے قبل ۱۹۴۰ء کی دہائی میں کھیلا گیا، کرپس مشن نے ۱۹۴۲ء میں ہندستان کا دورہ کیا اور ریاستوں میں نئے انتخابات اور مرکز میں قانون سازی کی باڈی تشکیل دینے کی تجویز رکھی، لیکن کانگریس اور جمعیۃ نے ان تجویزوں کو مسترد کردیا، مولانا مدنیؒ نے خاص طور سے یہ واضح کیا وہ ملک کی مکمل آزادی سے کم کسی تجویز پر راضی نہیں ہیں، جس کے سبب ۱۹۴۲ء میں ان کو گرفتار کرلیا گیا، کچھ دنوں کے بعد رہائی ملی مگر پھر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا، اگست ۱۹۴۴ء تک جیل میں قید رہے، اس کے بعد انھوں نے ملک کی تقسیم پر مصر مسلم لیگ سے مقابلہ کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۴۵ء میں ایک مسلم پارلیمانی بورڈ قائم کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ملک کے سیاسی بحران کے حل کے لیے برطانوی حکومت نے ایک کابینی مشن بھیجا، خاص بات یہ ہے کہ اس مشن نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، مذہبی آزادی اور وفاقی حکومت کے قیام کی جمعیۃ علماء ہند کی تجویز کی تائید کی، لیکن بالآخر مشن بھی ناکام ہوگیا، اس کے بعد پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے، حالات اس وقت مزید نازک ہوگئے جب ملک کی تقسیم کا مطالبہ کررہی مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان کردیا، اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن کمیشن آیا اور باقی تو سب تاریخ کا حصہ ہے۔

مولانا مدنی کا سفر یہیں ختم نہیں ہوا، ان کے پاس ٹھہر کر سانس لینے کیلئے وقت نہیں تھا، تقسیم نے اہل وطن پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیا، قتل عام اور خونریزی کے مہیب سیلاب میں غرق ہندستان کے مصیبت زدوں کے زخم پر مرہم رکھنے کیلئے مولانا مدنی کا دست آگے آیا، یہ جہد آزما جتن اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ زندگی نے آخری سانس نہ لی۔

انھوں نے ملک کے لیے قربانی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر دی تھی، جب ۱۹۵۲ء میں ہندستان کا جمہوری عمل مرتب ہوا اور بابو راجندر پرساد ہندستان کے پہلے صدر جمہوریہ بنے، اس وقت صدر جمہوریہ کی طرف سے سب سے بڑا پدم بھوشن اوارڈ خدمات کے اعتراف میں حضرت مدنی کو دیا گیا (اس وقت یہی سب سے بڑا اعزاز تھا، پدم بھوشن نہیں تھا) جس وقت یہ اطلاع حضرت مدنی نے معتمد خاص نے ان کو دی تو، تو حضرت نے پوچھا یہ کیا ہے، تو قاری اصغر علی صاحب نے بتایا حضرت یہ آپ کی ملکی خدمات کا اعتراف ہے۔ جو آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں برطانوی عہد میں سرانجام دی تھی۔ تو اس وقت حضرت مدنی نے کہا کہ قاری صاحب یہ اعزاز بصد خوشی واپس کردیجئے اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں لکھ دیجئے کہ ملک کے لیے قربانی ہم نے اس لیے نہیں دی تھی، میں اس سے بے نیاز ہوں، میں اپنے ملک کا آج بھی خادم ہوں اور کل بھی رہوں گا۔ ان الفاظ کے ساتھ وہ اعزاز واپس کردیا، جو صدر جمہوریہ کے قریب رہتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ لوگ

اعزاز کے حصول کے لیے کیا کیا نہیں کرتے ہیں مگر حضرت مدنی وہ زاہد تارک الدنیا تھے کہ یہ اعزازات ان کے ٹھوکرے میں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز پر حکومت میں لرزہ طاری ہوجایا کرتا تھا، جب امرت بازار پتریکا کے ایڈیٹر نے شان اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کی تو حضرت نے حکومت کو للکارا تو تاریخ گواہ ہے کہ خود لال بہادر شاستری جو نہرو کے بعد ہندستان کے وزیر اعظم بنے، حضرت کے قدموں پر آگرے اور حضرت جی ہم نے آج رات اس کے ایڈیٹر کو گرفتار کرلیا، اب آپ ناراض نہ ہوں۔ یہ درست ہے کہ ملک کی تقسیم کو روکا نہ جاسکا، لیکن مسلم لیگ کے لیے یہ فتح خون میں لت پت تھی، تقسیم اور قیام پاکستان سے صرف تین روز قبل مسٹر جناح نے اہل وطن کے نام جو پیغام دیا اس میں خود اپنے نظریے کی تردید اور اپنے گناہوں کا اقرار موجود ہے، انھوں نے نئے ملک کے شہریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ نسل، دھرم، علاقائیت اور لسانی تفریق کو بھلادیں اور اپنے آپ کو صرف پاکستان سمجھیں۔ (پاکستان اسمبلی مورخہ ۱۱راگست ۱۹۴۷ء) مولانا مدنی کی زندگی میں ایسا تضاد نہیں تھا، وہ اپنے نظریات، قول وعمل میں سچے اور عہد کے پابند تھے، انھوں نے تقسیم ہند اور ملک کی آزادی کے سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا اس کے پابند رہے اور نہ کبھی کسی کے دباؤ یا مصلحت کوشی کے نذراسے قربان ہونے دیا، یہاں ہم ان کے بیان کا ایک حصہ پیش کرتے ہیں تا کہ اہل نظر خود جائزہ لیں کہ ان کی سوچ کس قدر مستحکم اور درست تھی:

''متحدہ قومیت سے میری مراد وہی قومیت متحدہ ہے کہ جس کی بنا جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی یعنی ہندستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندستان اور متحد الوطن ہو نے کے ایک قوم ہوجائیں اور اس پردیسی قوم سے جو وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کررہی ہے، جنگ کرکے اپنے حقوق حاصل کرلیں اور اس ظالم اور بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں، یہ بات اہم ہے کہ دوسرے کے مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ تمام ہندستان کی بسنے والی قومیں مذہبی اعتقادات، اخلاق واعمال میں آزاد ہیں، اپنے مذہبی رسم ورواج، مذہبی اعمال واخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور امن امان قائم رکھتے ہوئے اپنے مذہب کی نشرو اشاعت بھی کرتے رہیں، اپنے پرسنل لا اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں، نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست وگریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جدوجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرلے''۔ (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۳۲)

یقیناً تاریخ کے آئینے میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کی شخصیت ایک کٹر مذہبی، سادہ لوح، پارسا صفت اور اپنے عہد کے ایک عظیم ہندستانی اور باعمل مسلمان، ہزاروں انسانوں کے مربی اور بڑے مہمان نواز کے طور پر یاد کی جاتی ہے اور ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردہ سے انساں نکلتے ہیں

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے اخلاق

مفتی عقیل احمد

استاذ حدیث جامعہ حسینیہ راندیر، سورت

اتباع سنت وتواضع

۱۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم نے حضرت کوناشتہ کیلئے مدعو کیا فوراً حضرت نے دعوت قبول فرمالی۔

۲۔ دارالحدیث جاتے ہوئے اوپر ایک کمرے میں ایک بنگالی طالب علم رہتا تھا، حضرت کا گزرنا دارالحدیث کی طرف اسی راستہ سے ہوتا تھا، ایک مرتبہ یہ طالب علم بیمار ہوگیا، حضرتؒ درس سے واپسی میں اس طالب علم کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اس کی خیریت دریافت فرمائی۔

تہجد، آہ وزاری اور معمولات اوّابین

حضرتؒ کا معمول تھا کہ تہجد اور دوابین کسی حالت میں بھی قضا نہیں ہوتی تھی خواہ سفر ہو یا حضر، بسا اوقات مدارس کے منتظمین اپنے سالانہ جلسوں میں مدعو کرتے تھے جلسہ کبھی دس بجے کبھی گیارہ بجے ختم ہوتا، اس کے بعد ملاقاتی حضرات کا ہجوم رہتا، جب تمام لوگ چلے جاتے تب حضرتؒ آرام فرماتے سردی کا موسم ہو یا گرمی کا آخر شب جب تمام اہل خانہ گہری نیند میں ہوتے حضرتؒ اٹھ کر لوٹا لیتے استنجاء کے لیے تشریف لے جاتے پھر وضوء کرتے اگر گرمی کا موسم ہوتا تو باہر کہیں ورنہ کمرے ہی میں مصلی بچھا کر نماز کی نیت باندھ لیتے اور جتنی رکعتیں پڑھنی ہوتیں پڑھ کر بیٹھ جاتے اور ذکر شروع کرتے پھر جب مشاہدہ الٰہیہ میں استغراق کی کیفیت طاری ہوئی تو روتے، آہ وزاری کرتے اور رومال سے آنسو پونچھتے رہتے۔ مرحوم قاری محمد میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرتؒ تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر پہلے دعاء مانگتے پھر مصلی پر استغفار کرنے کے لیے بیٹھ جاتے، تسبیح

ہاتھ میں ہوتی، جیب میں سے رومال نکال کر آگے رکھ لیتے، اگلدان قریب رکھ لیا کرتے اس وقت رونے کا منظر بار ہا دیکھنے میں آیا ہے وہ کسی اور وقت نہیں آیا، آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں مسلسل جاری رہتیں جس کو آپ رومال سے صاف کرتے اور استغفر الله الذی لااله الا هو الحی القیوم واتوب الیه جھوم جھوم کر پڑھتے جاتے کبھی کبھی اور بھی کلمات پڑھتے بعض اوقات اسی کرب و بے چینی کے عالم میں فارسی یا اردو کا کوئی شعر بھی پڑھا کرتے فجر کی نماز تک یہی معمول رہتا۔

اپنے نفس کے ساتھ بدظنی اور تواضع

حضرتؒ کو جب سے گھٹنوں کی شکایت ہوئی، سجدہ سے یا مقعدہ سے اٹھ کر قیام کرنے میں تکلیف ہو گیا تھا، دونوں ہاتھوں کے سہارے سے بہ مشکل کھڑے ہوتے تھے، ایک دفعہ فرمایا، یہ مجھے اس کی سزا ملی کہ میں جب کسی کو ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے اس کے تکلیف پر غصہ آتا اور اعتراض ہوتا تھا، یہ مجھے اس کی سزا ملی۔

صبر و تحمل

ایک عرصہ سے حضرت کے گھٹنوں میں درد اور ضعف چلا آ رہا تھا، حضرت کو اس کی وجہ سے سیڑھیوں پر چڑھنے میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی حضرتؒ نے جناب حضرت مہتمم صاحب مفتی قاری محمد طیب صاحبؒ سے فرمایا کہ دارالحدیث تک جو کہ اوپر کی منزل ہے لفٹ لگوا دیجئے فلاں صاحب کلکتہ والے اپنے خرچ سے لگوانے کے لیے تیار ہیں آپ کی اجازت درکار ہے۔ مہتمم صاحبؒ نے فرمایا: لفٹ لگوانے میں نو درے کی ایک درسگاہ چلی جائے گی آخر لفٹ نہ لگ سکی پھر کبھی نہیں کہا نہ کبھی شکایت کی۔

سب سے زیادہ صبر و تحمل کی مثال وہ ہے جس کے تصور سے بھی دل کانپتا ہے یعنی ۱۹۸۷ء کے حادثہ جانکاہ سے جو ظلم و ستم گستاخیاں، دل آزاریاں کی گئی مسلمانوں کی طرف سے پیش آئیں جن کا تصور کسی دشمن سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو دوست تھے جانی دشمن ہو گئے اور آپ کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ان دنوں میں حضرتؒ کا صبر و تحمل اور رضا و تسلیم کا جو منظر آنکھوں نے دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔

ڈاڑھی منڈانے پر غصہ

حضرتؒ کو ڈاڑھی منڈانے پر غصہ آتا تھا اور آپ پر اس عظیم سنت کے احیاء کا ایک حال طاری تھا کیونکہ ڈاڑھی مردوں کے لیے اسلامی شعار کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ڈاڑھی کو اسلامی یونی فارم اور واجب العمل قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اس عمل کو بلا تحدید مسلمانوں کے لیے امتیاز قرار دیا جائے جو کہ ان کا

مخصوص شعار اور یونی فارم ہے نہ منڈوانا جائز ہوگا، نہ خشخشی رکھنا، نہ چھوٹی رکھنا۔ (ڈاڑھی کا فلسفہ ص:۳۹)

اگر کوئی بے ڈاڑھی والا حضرت کی خدمت میں کسی غرض سے حاضر ہوتا تو آپ اس کی وہ مٹی پلید کرتے کہ الامان الحفیظ مگر جونہی اس کی زبان پر توبہ کا لفظ آیا تمام غصہ اور غضب کافور اور رحم و کرم سے دل بھر جاتا، فرماتے: کہو! کیا چاہیئے؟ سچی توبہ کرتے ہو؟ پھر چند مخلصانہ نصیحتیں فرماتے: پھر جو اس کی ضرورت ہوتی پوری فرماتے۔

ایک دفعہ لڑکوں نے درس حدیث میں پرچہ لکھ کر سوال کیا کہ کافر آتے ہیں تو آپ ان کے ساتھ بڑی خندہ روئی سے ملتے ہیں اور مسلمان ڈاڑھی منڈے آتے ہیں تو اتنے خفا اور غضبناک ہوتے ہیں؟ اول تو فرمایا: یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس میں آپ کو دخل دینے کا کیا حق؟ پھر ارشاد فرمایا کہ: ہمارا غصہ تو کیا چیز ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی خلاف شرع امر کو دیکھتے تو اتنے غضبناک ہوتے کہ کوئی وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ بغض و غضب فی اللہ ہے جتنا جس کا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی اس کو دیکھ کر غصہ بھی زیادہ آئے گا۔

مصائب پر صبر و رضا

ایک مرتبہ ٹانڈہ کے سفر میں ٹرک سے اکبر پور جا رہے تھے بدقسمتی سے رات کا وقت تو تھا ہی تھکے ہوئے بھی خوب تھے ٹرک ایک نالے میں گرا، خدا کا شکر الٹ نہ گیا ورنہ سلامتی نہیں تھی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس کو نکالنے میں لگا مستورات الگ پریشان، حضرت ایک چارپائی پر بیٹھے رہے احقر (بایزید محمد رشید) قریب پہنچا اور تکلیف کا ذکر کیا تو فرمایا: مقدرات الٰہیہ ہیں۔

دنیا کی راحت اور زحمت یکساں

ایک مرتبہ کلکتہ سے سرائے میر آئے، کلکتہ میں خان بہادر صاحب نے بڑی تواضع کی تھی اپنی کوٹھی پر ٹھہرایا تھا یہاں جو آئے تو کسی چیز کا ٹھکانا نہ تھا، نہ بستر، نہ کوئی انتظام نہ ہی آدمی، ایک کمرہ ملا جس میں ایک چارپائی گرد و غبار میں اٹی ہوئی اور نیچے سردیوں میں کبھی بچھی ہوئی گھاس جو پھینک دی گئی تھی اور اس پر پرانی مٹی اور غبار سے بھری ہوئی دری پڑی ہوئی تھی تھکے ہوئے تو تھے ہی سوئے تو کھٹملوں نے دھاوا بول دیا۔ احقر نے سب گھاس اور دری باہر پھینک دی اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی ایک دو طالب علم میزبان بن کر آئے کہا چائے لائیں؟ ہم نے کہا: اچھا لاؤ! خدا جانے حضرت نے کیا سمجھ کر فرمایا کہ: بہت تیز بنا کر مت لانا۔ مگر جب وہ لائے تو وہ اتنی تیز اور کڑوی تھی پینا مشکل تھا۔ دودھ منگوا کر اس میں ملایا تاہم پینے کے قابل نہ ہوئی احقر کو طیش آ رہا تھا مگر حضرت کے چہرہ مبارک پر ایک شکن بھی نہیں تھی اور نہ بشاشت و خندہ روئی میں ادنیٰ فرق، گویا ابھی خان بہادر صاحب کی کوٹھی میں ہی ہیں۔

خلاف شرع امور سے رنجیدگی

آسام کے لوگ حضرتؒ پر دل وجان سے فدا تھے، نئے نئے مرید جو حضرتؒ کے مزاج سے واقف نہیں ہوتے آکر قدم مبارک کو بوسہ دینا چاہتے۔ حضرت دھکا دیکر ہٹا دیتے اور فرماتے: کیا کرتا ہے؟ پھر ہاتھ بڑھا کر فرماتے: لو مصافحہ کرو اور فرماتے: یہاں کے پیروں نے ان کی عادت خراب کی ہے، وہ ہم کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دنیوی شہرت وعزت سے بیزاری

حضرت کی مقبولیت پر بعض علماء غبطہ کرتے تھے۔ سورت کے سفر کا واقعہ ہے۔ دہلی کے چند دوسرے علماء بھی ہم رکاب ہو گئے تھے، ان کی شہرت کے لحاظ سے وہ بھی توجہ اور رجوع خلق کے حق دار تھے، اگر تنہا آئے تو بہت کچھ آؤ بھگت ہوتی مگر شاید ان کو گمان بھی نہیں تھا کہ سورج کے سامنے چاند کو کوئی نہیں دیکھے گا، لوگ جوق در جوق آگئے اور حضرت سے مصافحہ کر کے بیٹھ جاتے، ان کے پاس کوئی جاتا بھی نہیں اور پوچھتا بھی نہیں، ظاہر ہے کہ اس حالت کا اثر ان کے قلوب پر ہونا لازمی تھا حضرت نے اس کو محسوس فرمایا: لوگوں سے فرماتے: وہاں وہاں جاؤ! مگر کون سنتا؟ اس حالت میں حضرت کی زبان مبارک پر عربی کا یہ شعر جاری ہوا

ماذالقيت من الدنيا واعجبها — انی بما انا باك منه محسود

یعنی رجوعات خلق سے رو رہا ہوں اور پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں اسی چیز میں مجھ سے حسد کیا جاتا ہے۔ اور پہلا مصرعہ کبھی وضوء کرتے وقت درد اور دنیا سے بیزاری کی حالت میں پڑھتے تھے۔

کسی تکلیف سے تنگ دل نہیں ہوتے تھے

اس سفر کے دوران کوسمبا میں فجر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے، واپسی میں مسجد کا دروازہ جو خاصہ بلندی پر تھا اس پر سے پاؤں مبارک پھسلا اور آپؒ زمین پر گر پڑے پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں — وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

دنیوی تعیش سے بیزاری

راندیر میں بڑے پر تکلف دستر خوان بچھائے گئے اور نفیس کھانے لائے گئے مولانا ابراہیم مرحوم کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: اذهبتم طيبا تكم فى حياتكم الدنيا۔

کج بحثی پر صبر وتحمل اور مسائل میں توسیع

ایک دفعہ حضرت، حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں تشریف رکھتے تھے کسی نے بطرز نکتہ چینی بات چھیڑی۔

ان دنوں دار العلوم میں اذان کے واسطے لاؤڈ اسپیکر لگے تھے اور اذان ہونے لگی تھی۔ حضرتؒ نے فرمایا: حرمین میں اس پر نمازیں ہوتی ہیں کیا سب نمازوں کو فاسد کہہ دیا جائے؟

مسائل میں مسلک

مسائل میں حضرت کا مسلک عامۃ المسلمین کے حق میں رخصت اور توسیع پر مبنی تھا؛ چنانچہ

۱۔ حضرتؒ چندوں میں ارباب ثروت پر دباؤ ڈالنے اور اثر و رسوخ کو کام میں لانے کو درست؛ بلکہ بہتر فرماتے تھے، اس میں غرباء اور خدام دین کا فائدہ ملحوظ تھا۔

۲۔ جلسوں میں رنگین کاغذوں وغیرہ سے زینت کو مباح فرماتے کیونکہ یہ بات لوگوں کے اور کام کرنے والوں کے طبعی امتزاج اور شوق انگیزی میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔

۳۔ مکہ مکرمہ میں ہمارے یہاں کے ایک عالم نے ڈرائی کلیننگ کا مسئلہ دریافت کیا۔ فرمایا: دھوبی سب شرعی طریقے سے کپڑوں کو پاک نہیں کرتے تاہم فقہاء دھوبی کے ہاں سے آئے ہوئے کپڑوں کو پاک کہتے ہیں۔

شفقت اور دل داری

ایک ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی کہیں مشرقی یوپی میں رہتے تھے مگر مظفر نگر کے کسی مِل میں کام کرتے تھے دونوں حضرتؒ کے شیدائیوں میں سے تھے، وہ جب کبھی مظفر نگر سے اپنے وطن جاتے تو حضرتؒ کی خدمت میں حاضری دیتے، اور بڑی مٹھاس اور سادگی سے کہتے، حضرت! ہمارے یہاں کب چلئے گا؟ حضرت کو بھی ان کے ساتھ محبت اور تعلق تھا فرماتے: جب اس طرف آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔

ایک مرتبہ دوران سفر ریل میں ایک اسٹیشن پر کوئی صاحب سوار ہوئے اور حضرت سے درخواست کی کہ آنے والے اسٹیشن پر ہمارے مکان پر نکاح خوانی ہے آپ تشریف لاکر نکاح پڑھا دیں۔ حضرت نے عذر کیا ہم حالت سفر میں کیسے ریل سے اتر جائیں؟ پھر ہمارے ساتھ سامان ہے کچھ ساتھی بھی ہیں۔ مگر وہ مانتے نہیں خدام کو اس پر غصہ آیا اور ملامت کی مگر پر مانتے نہیں۔ آخر حضرت نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے کہنے پر اس اسٹیشن پر سب لوگ سامان کے ساتھ اتر گئے۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی سواری نہیں، وہ کہتے کہ حضرت! بہت دور ہے، سب لوگ پیدل سامان اٹھائے چل رہے ہیں مگر ان صاحب کا گاؤں آہی نہیں رہا تھا، خدام تھک کر چور اور غصہ میں چل رہے ہیں؛ مگر حضرت کی پیشانی مبارک پر بل نہیں آیا۔ حضرت کی کرامت ظاہر ہوئی اچانک ایک فیل بان ہاتھی لئے ظاہر ہوئے اور کہا کہ سب سوار ہو جائیں۔

حضرت کا تحمل بے مثال تھا۔ تکلیف برداشت کرنا، مشقت اٹھانا حضرت کے لیے بہت آسان تھا۔ ■

ایک تاریخ مکتوب

حضرت شیخ الاسلام کے سانحہ وفات پر

دارالعلوم دیوبند کا حال ایک عینی شاہد کی زبانی

مفتی مرغوب الرحمٰن
جامعہ دارالقرآن، احمد آباد

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند جمعیۃ علمائے ہند خلق خدا کی نظر میں مقبولیت کے کس اعلیٰ مقام پر فائز تھے؟ اس کا کچھ اندازہ درج ذیل مکتوب سے لگا سکیں گے۔ مکتوب نگار حضرت مدنیؒ کی وفات کے وقت دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے حضرت مدنیؒ کی وفات، اور عظیم جنازہ کا منظر اور دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہر شخص کے تائثرات کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا۔ بلاشبہ یہ مکتوب بزرگوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص حضرت مدنیؒ کے تلامذہ و متوسلین اور معتقدین کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہے۔ اسی غرض سے اسے فکرِ انقلاب کی خصوصی اشاعت بیاد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ میں شائع کیا جارہا ہے، ہم اپنے کرم فرما، مدیر فکرِ انقلاب کے ممنون و مشکور ہیں کہ موصوف کی کرم فرمائی سے فکرِ انقلاب کے قارئین تک یہ مکتوب پہنچانے کی مجھے سعادت میسر ہورہی ہے۔

حضرت الاستاذ زید معالیکم .... السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خدمت عالیہ میں عرض ہے کہ خادم بخیریت ہے خدا کرے کہ آپ بھی بعافیت ہوں، اس کے قبل ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ غالبًا ملا ہوگا۔ آپ کا روانہ کردہ گرامی نامہ عظیم کے پاس آیا، ان کی زبانی معلوم ہوا! لیکن ابھی پڑھنے کو نہیں ملا، بہر حال آپ کو اس حادثہ عظیم کا علم ہو چکا ہے حالات بھی اخبارات اور ریڈیو سے معلوم ہو چکے ہونگے، پھر بھی خادم کچھ لکھتا ہے، حضرت کی طبیعت اس ہفتہ میں ہلکی تھی، لوگوں کو اطمینان ہو گیا تھا؛ چنانچہ فرید الوحیدی صاحب نے بدھ کے دن ۱۱ر جمادی الاول کو شام کے وقت کہا اور تاکید کی کہ اگر تم خط لکھو تو سلام کہنا اور حضرت کی طبیعت بالکل اچھی ہے لکھ دینا، ۱۱ر جمادی الاول کو حضرت مولانا فخر الدین صاحب نے مہمان خانہ میں حضرت سے ملاقات کی حضرتؒ نے دوران گفتگو فرمایا کہ ''میرے حق میں دعاء فرمائیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم اور فضل عطا کیا ہے'' اور فرمایا ''میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ذریعہ نجات بن سکے'' یہ کہہ کر حضرت اس قدر روئے لگے کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے، مولانا فخر الدین صاحب بھی خوب روئے، اس کے بعد قاری اصغر علی صاحب نے دونوں حضرات کو علیحدہ کیا، حضرتؒ کی تمنا تھی کہ ''سردا'' پھل کھاؤں اور چاہتے تھے کہ بس یہی کھاؤں، یہاں کہیں نہیں ملا تو لاہور فون سے خبر کی گئی۔ وہاں سے آیا اور حضرت نے کھایا ۱۲ر جمادی الاول کو ۱ر بجے بیٹھے تھے، عورتوں اور مردوں کو کچھ نصیحتیں فرمائی'' بڑوں کا خیال رکھنا چاہئے، جو چھوٹوں کے ساتھ رحم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ شفقت کرتا ہے۔ ان بچوں کی تم ہی کفیل ہو خیال کرنا، میں نے تم لوگوں کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا'' اس کے بعد عورتوں نے شوربہ پیش کیا اس کو پی لیا۔ اس کے بعد مولوی اسعد سے فرمایا کہ مجھ کو کچھ سردی معلوم ہو رہی ہے، آنکھ سے دھندلا پن معلوم ہو رہا ہے۔ مولوی اسعد صاحب نے کہا کمزوری سے یہ بات ہے، اس کے قبل بھی ایسا ہوا تھا، پھر حضرت اندر کمرے میں تشریف لے گئے، اور چادر اوپر ڈال کر سو گئے، اور اسی حالت میں روح پرواز کر گئی اور افسوس کہ اس وقت کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا اور نہ کسی کو اس کا خیال تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ مولانا کے گھر میں حضرت کے بدن پر ہاتھ ڈالا اور کیا دیکھا کہ بدن بالکل ٹھنڈا ہے اور کچھ سختی معلوم ہو رہی ہے فوراً گھر کے لوگوں کو آواز دی سب لوگ گئے مولوی اسعد صاحب اور فرید الوحیدی وغیرہ سب جمع ہو گئے اور حکیم اور ڈاکٹر آ گئے، ڈاکٹر سورج پرکاش نے بتلایا کہ روح پرواز کر چکی، پونے تین بجے کا وقت تھا تمام دار العلوم میں آہ وزاری مچ گئی، عجیب کیفیت تھی کبھی زندگی میں ایسا منظر نہیں دیکھا بعض لوگوں نے خیال کیا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ بالکل صحیح ہے، ۱۵۶ر کاریں اور لاری ۵۴ر تھی تقریباً ۵ر ہزار آدمی فوراً یہ خبر سنتے ہی جلال آباد سے روانہ ہوئے، دہلی سے پوری ٹرین مسلمانوں سے بھری ہوئی بلکہ لٹک کر آدمی آئے، غیروں کو گاڑی میں سوار ہونے نہیں دیا، میرٹھ، مظفر نگر، چرتھاول وغیرہ سے ۳۰ر ہزار سے

زیادہ آدمیوں نے حضرت کی زیارت کی اور نمازِ جنازہ پڑھی، دارالحدیث تحتانی میں حضرت کو رکھا گیا، نماز کے وقت حضرت مدنیؒ کو مولوی بشیر احمد صاحب کی درسگاہ میں رکھا گیا جہاں پر حضرت مغرب کی نماز ادا کیا کرتے تھے، ہندؤں نے بھی زیارت کی بہت جلدی کرتے تھے ۱۲ ربجکر ۴۵ رمنٹ پر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، پورا ہال اور درسگاہ اور اوپر دارالحدیث بالکل بھرا ہوا تھا، قدم رکھنے کی جگہ نہیں تھی، جس طرف نظر پڑتی لوگوں کی آنکھوں سے آنسوں جاری دکھائی دیتے، دیہات کے لوگ کافی آگئے تھے بڑی مشکل سے جنازہ میں ہاتھ لگانے کا شرف حاصل ہوا۔ اور مٹی بھی بمشکل ملی، ۳ ربج کر ۱۵ رمنٹ پر تدفین سے فراغت ہوئی اور فاتحہ پڑھ کر واپسی ہوئی، تدفین کے بعد کئی ہزار آدمی آئے اور نماز جنازہ سے محروم رہے مولوی اسعد صاحب کو اللہ نے صبر دیا، بہت ہمت سے کام لیا انہوں نے دوسروں کو سمجھایا، جمعرات کو ختم (ایصال ثواب) فوراً ہوا اور اس کے بعد جمعہ کے دن ختم ہوا سنیچر اتوار کو تمام دفاتر بند رہے اور تمام طلبہ اور آنے والے مہمان حضرات اور ملازمین اور چپراسی غرضیکہ بچے بچے دونوں وقت ختم کلام میں شرکت کی، ۱۶ ر کو مدرسہ کھلا لیکن ابھی تک اساتذہ درس دینے کی تاب نہیں رکھتے، دو چار اسباق ہوتے ہیں، ہر ہر استاذ نے اپنی اپنی طرف سے ختم کرایا۔ اس کے علاوہ ہر ہر صوبہ اور ملت والوں نے ختم کا انتظام کیا بہار والوں نے الگ کیا اسی طرح یوپی کی طرف سے اور آسام، سہلٹ اور مدراس، ممبئی وغیرہ سب نے کیا، حضرت مدنیؒ کا مزار شیخ الہندؒ کے پہلو میں داہنی جانب ہے، حضرت کا چہرہ بالکل منور تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپ ہنس رہے ہیں، شیخ الحدیث صاحب بار بار یہی فرماتے رہے کہ مسکرا رہے ہیں، بالکل یقین نہیں ہوتا تھا صورت نظروں سے نہیں بھولتی، بالکل نظروں کے سامنے ہے، حضرت مولانا فخر الدین صاحب نے ۱۶ ر تاریخ کو سبق شروع کر دیا، دل کمزور ہے اس قدر رو رہے تھے کہ چہرہ سرخ ہو گیا، جب درس کے لیے آئے اور حضرت مدنیؒ کی جگہ پر بیٹھے تو اس قدر تمام طلبہ اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب روئے کہ دارالحدیث گونج اٹھی، روتے جاتے تھے، اور حاضری لیتے جاتے تھے، ابھی تک یہی حالت ہے، جب ایک طالب علم جنکا نام ''حسین احمد'' ہے، آیا تو نام لینا مشکل ہو گیا اور روتے روتے سب کا بُرا حال ہو گیا، حضرت مدنیؒ کی چند نصیحت آخری سبق ختم ہونے کے بعد ہم لوگوں کو مولانا نے سنائی اور فرمایا کہ یہ ایسا غم ہے جو ایک دن اور دو دن کا نہیں ہے؛ بلکہ زندگی بھر کا ہے، حضرت کی تمنا تھی کہ اگر چہ میں اس قابل نہ رہوں کہ درس دے سکوں؛ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آخری وقت تک میرے کانوں میں یہ آواز ---- قال اللہ قال الرسول کی آتی رہے، بہر حال بخاری شریف ختم کرنا ہے۔ حضرت کی بخاری شریف کی تقریر ایک ماہ تک مشین کے اندر ریکارڈ ہے اب لوگ اس کو سنتے ہیں بالکل حضرت کی آواز ہے۔ اور یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں۔ ایک یادگار ہے، لوگوں کو باب السواک پر مسواک تقسیم نہ ہو سکی، کیونکہ اس باب کو مولانا فخر الدین صاحب نے

پڑھایا تو ہم لوگوں نے اندر حضرتؒ سے کہلوایا کہ ہم لوگوں کو مسواک ملنی چاہیے، تو حضرتؒ نے اندر سے کہلایا کہ مدینہ کی مسواک ابھی اتنی نہیں ہے جو تم لوگوں کو کافی ہو، وہ میرے پر قرض، آنے پر ادا کر دونگا، وفات کے بعد کل مولوی اسعد صاحب نے تقسیم کرائی۔ اب حضرت کی جگہ خالی ہے، سب مجلس شوریٰ کے ممبروں کو فکر ہے کہ کس کو اس جگہ پر جانشین کیا جائے کوئی نظر نہیں آتا، سب ہی لوگ پریشان ہیں مہتمم صاحب پریشان ہیں، تمام بزرگوں کی توجہ اس وقت دارالعلوم پر ہوگئی ہے، حضرت رائے پوری زندگی میں حضرتؒ سے اس مرتبہ مل کر پاکستان گئے اور شیخ الحدیث آئے ہوئے ہیں اور مولوی یوسف صاحب (امیر تبلیغ) برابر تشریف لا رہے ہیں، دعائیں ہو رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کا کوئی سچا جانشین اور قائم مقام بنا دے، حضرت کے مزار پر ہجوم لگا رہتا ہے، ابھی تک لوگ بکثرت آ رہے ہیں، مولوی اسعد صاحب اسی طرح خانقاہ اور کھانے پینے کا انتظام فرما رہے ہیں غازی پور سے بھی دو وفد آئے، مکہ معظمہ سے تار آیا، اور اسی طرح افریقہ اور غیر ممالک سے کافی تار آئے، مودودی صاحب کا بھی تار آیا، جمعہ کے دن ۷۵ تار آئے، اور سنیچر کو ۶۳ رسے زیادہ تار اور تار اس قدر آ رہے ہیں، جس کی انتہا نہیں، اور تمام لوگ آ رہے ہیں، دیکھنے کو بیٹھا ہے۔ حضرت مدنیؒ کا خیال تھا کہ میرے خلیفہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ جو آج کل پاکستان میں ہیں، بخاری شریف پڑھا رہے ہیں، وہ شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، پاکستان میں ہونے کی وجہ سے مجبوری ہے ورنہ زندگی میں انہیں کو اپنی جگہ پر رکھنے کا خیال تھا، اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یہ مکتوب نگار نے اپنی معلومات کے اعتبار سے لکھا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا شیخ الاسلامؒ نے اپنی حیات ہی میں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو مدرسہ شاہی مراد آباد سے بلا کر اپنی جگہ پر مامور کر دیا تھا اور آں موصوف تاعمر اس گراں قدر ذمہ داری کو انجام دیتے رہے۔ ■

شیخ الاسلام

ارباب فضل وکمال کی نظر میں

اسعد مختار
سکریٹری آل انڈیا علماء حق، نئی دہلی

ناقابل فراموش شخصیت

(شیخ الاسلام) مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں ان کی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اس قدر شاندار ہیں کہ ہم انہیں فراموش نہیں کر سکتے۔ ابھی ان کی عمر چھوٹی تھی کہ ان کے والد فیض آباد سے حجاز چلے گئے تاکہ زندگی کے آخری دن مدینہ منورہ میں بسر کر سکیں۔ یہ بھی ان کے ہمراہ چلے گئے جو لوگ حجاز چلے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے گزارے کے لیے اوقاف پر اعتماد کرتے ہیں لیکن ان کے خاندان نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے بساطی کی دکان کی اس سے خاندان کا خرچ چلایا اور اسی حالت میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان آئے مگر پھر مدینہ منورہ چلے گئے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ اس وقت ان کا سیاست سے تعلق نہ تھا۔

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حجاز گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شریفِ مکہ برطانیہ سے مل کر بغاوت کا انتظام کر رہا تھا۔ ان کی موجودگی میں بغاوت کا نعرہ بلند ہوا۔ اسے مولانا محمود حسن برداشت نہ کر سکتے تھے۔

کسی طرح یہ خبر سنی گئی کہ وہ (حضرت شیخ الہندؒ) بغاوت کے خلاف ہیں۔ شریف حسین نے انہیں جدہ لاکر برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ ان کی گرفتاری ہوئی تو مولانا حسین احمد مدنی نے اکیلے رہنا پسند نہ کیا اور انہوں نے بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ مالٹا میں دونوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی اور مولانا

محمود حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ وہاں سے وہ ہندوستان آئے۔ کچھ دن بعد کلکتہ کی جامع مسجد میں ایک نئے مدرسہ کھولا تا کہ عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلبہ کو کالج چھوڑنا پڑا تھا، ان کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ اس مدرسہ میں مولانا حسین احمد مدنی مدرس اول رہے، اور وہاں کام کرتے رہے لیکن وہ سیاسی جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور سرگرم پارٹ ادا کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنے تئیں آزادی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کانگریس تحریک میں انہوں نے مردانہ وار حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں سہیں اس سے بھی زیادہ وہ مصیبتیں تھیں جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں انہیں پیش آئیں۔

۴۶-۱۹۴۵ء میں جب الیکشن ہوا تو انہوں نے کانگریس کی طرف سے دورہ کیا اور اپیل کی کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں۔ ان کی انتہائی غیر شریفانہ طریقہ سے مخالفت کی گئی۔ ضلع ہبلی کے مقام پر تو ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ریلوے پولیس نے مداخلت نہ کی ہوتی تو جان کا خطرہ تھا۔ لیگیوں نے عوام کو دھوکا دے کر مذہبی پاگل پن کو اجاگر کیا اور جب عوام میں پاگل پن آ جائے تو اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لیکن مولانا مدنی پہاڑ کی طرح جمے رہے اور ان کی استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے یوپی کا دورہ کیا وہاں بھی بعض مقامات پر پتھر پھینکے گئے لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے۔ انہوں نے جو روش اختیار کر لی تھی اور جسے ایمان سمجھتے تھے اس پر قائم رہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ

زریں کارنامے

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی اور ان کے زریں کارناموں کے لیے بڑے بڑے دفتر بھی ناکافی ہیں سب سے پہلے میری ملاقات حضرت مدنی مرحوم سے ۱۹۱۴ء میں حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں ہوئی تھی اس وقت مرحوم مدینہ منورہ میں درس دیا کرتے تھے یہ وہی زمانہ ہے جب جرمنی کی پہلی جنگ شروع ہوئی تھی اور ترکی جرمنی کا حلیف تھا میرے دہلی واپس پہنچنے کے کچھ دن بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر جو کچھ ہوا وہ کم و بیش عام حضرات کو معلوم ہے۔

شریف مکہ کی بغاوت، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا حسین احمدؒ اور دیگر رفقاء کی گرفتاری اور مالٹا میں نظر بندی پھر ان بزرگوں کی مالٹا سے ہندوستان واپسی اور تحریک آزادی کی سرپرستی کچھ دنوں کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی علالت اور ڈاکٹر انصاری رحمۃ اللہ علیہ کی کوٹھی پر رحلت، حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہٗ کا تحریک آزادی میں انہماک علی برادران ڈاکٹر کچلو وغیرہم کے ہمراہ کراچی کی عدالت میں مقدمہ اور دو دو سال کی قید کے بعد جیل کی زندگی، جیل سے رہائی کے بعد حضرت شیخ مدنیؒ کی بار بار گرفتاری،

لیگیوں کے خطرناک حملے، غرض ان واقعات کی تفصیلات ایسی نہیں جن کو تھوڑے وقت میں منضبط کیا جاسکے۔ تاریخ لکھنے والے جب ان حالات کو مفصل لکھیں گے تو یہ آنے والی نسلوں کے لیے درسِ حیات کا بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔ ان تمام مجاہدات کے بعد ان کی وہ تعلیمی خدمات جوانہوں نے دارالعلوم دیوبند میں انجام دی ہیں اور اس اندرونی خلفشار کے زمانہ میں جب کہ دارالعلوم کی حیات خطرے میں تھی دارالعلوم کی سرپرستی فرما کر دارالعلوم کو سنبھالا اور بچایا ہے۔ حضرت شیخ کا یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی عظمت وصداقت کا صلہ دربار رسالتؐ سے تو مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو ملے ہی گا؛ لیکن دارالعلوم کے درودیوار اور وہاں کی خاک کے پاک ذرے بھی مولانا مدنیؒ کے خلوص پر قیامت کے دن شہادت دیں گے اس تمام دینی اور وطنی خدمات کے باوجود ان کی ریاضت اور عبادت اور کشف وکرامت کے حالات وہ حضرات بخوبی جانتے ہیں جنہوں نے رمضان شریف کی راتیں حضرتِ اقدس کی خدمت میں رہ کر گزاری ہیں یا جن کو جیل خانے کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں ان کے ہمراہ رات بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے میں ایک دورافتادہ اور علم وعمل کی روشنی سے محروم اس پر کیا لب کشائی کرسکتا ہوں صرف اتنا ہی عرض کرسکتا ہوں جو ان کی خبر وفات پر میں نے عرض کیا تھا اور جن الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام آزادیٔ وطن کے جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم وعمل اور زہد وتقویٰ اور ایثار وقربانی کے مجسم پیکر اور اخلاق وانسانیت کا سب سے بلند وبالا مظہر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے جن کا سایہ ہم بدقسمتوں کے سر سے اٹھ گیا اور ہم کو یتیم ولاوارث کرگیا جس کا ہمسر اور مثیل وعدیل صدیوں میں بھی میسر آنا مشکل ہے اللہ تعالیٰ ان کو مقامِ صدق میں ملیک مقتدر کے قریب سے نوازے اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ

مبارک باسعادت شخصیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کی ذات ستودہ صفات نہ صرف ہندوستان کے لیے؛ بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک بے بدل سعادت تھی قدرت الٰہی کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ فساد وفتن سے معمور اس دنیا میں انسانی سوسائٹی کی اصلاح وارشاد، تنبیہ ورہنمائی کے لیے ہر صدی وقرن میں مصلحین اور ریفارمر پیدا ہوتے ہیں جن کی پوری زندگی اصلاح وخدمت کے لیے وقف ہوتی ہے اور جو اپنے عمل وکردار کے لحاظ سے عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند وبرتر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت ان مصلحین ومرشدین کی صف میں بھی بہت بلند موقف وامتیاز کی حامل تھی حق تعالیٰ نے آپ کو علم وعمل، اعلیٰ کردار اخلاق، عزم واستقلال اور ہمدردی خلائق کے وہ

تابناک جوہر عطا فرمائے تھے جو صدیوں کے بعد ہی کبھی کسی انسان کو عطا ہوتے ہیں۔

حضرت موصوف کی پاکیزہ زندگی کا پورا مرقع آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وطن عزیز پر کس طرح انہوں نے جان چھڑکی اور اس کی خاطر کس طرح جان کی بازی لگا کر جہاد حریت کی رہنمائی فرمائی پھر نصف صدی سے زیادہ علم وارشاد کی مسند رفیع پر متمکن رہ کر کس طرح لاکھوں تشنگان دین کو فیوض و برکات سے نوازا، اپنی اصلاح ظاہری و باطنی کے لیے جن انسانوں نے حضرت شیخ کا دامن تھاما۔ کیا ان کی تعداد کا بھی کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ کتنی مبارک وباسعادت تھی وہ شخصیت جس کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہونے والوں کی تعداد لاکھوں سے گزر کر کروڑوں تک پہنچ چکی ہے جو دُنیا کے گوشہ گوشہ تک پھیلے ہوئے ہیں ایک ایسی جامع صفات مقدس، انوار و برکات کی حامل شخصیت کا ہم سے رخصت ہو جانا۔ اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

عزیمت و ہمت کا مقام بلند حضرتؒ کا بے مثال استقلال و استغناء

حضرت کی ذات اقدس نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ دوسرے ممالک میں بھی مشہور و معروف ہے دنیائے اسلام تسلیم کرتی ہے کہ حدیث و تفسیر، دینی علوم، زہد و تقویٰ ارشاد و سلوک اور مکارم اخلاق میں آپ کی شخصیت بے نظیر تھی جس ہستی کا علم اتنا وسیع مرتبہ اتنا بلند اور شخصیت ایسی برگزیدہ تھی لاکھوں انسان اس کے سامنے نذر عقیدت پیش کر رہے تھے اس کے سامنے ایسے مسئلے آئے اگر وہ عوام کے رجحانات کی پیروی کرتا تو کروڑوں گردنیں اس کے سامنے جھک سکتی تھیں۔ اگر وہ خاموش رہتا تو اپنے ارادت مندوں کی نظر میں اور اونچا ہو سکتا تھا؛ لیکن اس نے حمایت حق اور اپنے ضمیر کی آواز کو بلند کرنے میں نہ اعزاز و احترام کا خیال کیا اور نہ برگشتگی عوام کا خوف اس کے پائے عزیمت میں کوئی جنبش پیدا کر سکا۔ یہی عزیمت و ہمت اور حمایت حق و صداقت کی مردانہ جرأت تھی جس نے کبھی اس کو مالٹا میں نظر بند کیا اور کبھی کراچی اور سابرمتی کے جیل خانوں میں محبوس، جب دو قومی نظریہ کے شور سے فضائے ہندوستان پُر آشوب تھی تو اس نے خود اپنوں کی اکثریت کے خلاف وہ کیا جو اس کے نزدیک حق تھا جو اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ اس نے مسلم لیگ کی بھی مخالفت کی اور جب انڈین نیشنل کانگریس نے مجبور ہو کر ملک کا بٹوارا تسلیم کر لیا تو یہی حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے کہ جمعیت علماء ہند کے صدر کی حیثیت سے آپ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے تنبیہ فرمادی کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی ایسے فیصلہ کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو اپنے پہلو میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت و تباہی اور کروڑوں نسانوں کی پریشانیوں کا مستقبل لیے ہوئے ہو۔

آپ نے سامراجی طاقت کو مٹانے کے لیے اس ہمت وجرأت سے جان کی بازی لگائی کہ آپ کے عزم واستقلال کی حرارت نے دوسروں میں بھی گرمی پیدا کی تاکہ صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ وہ تمام ممالک جو سامراجی پنجہ میں گرفتار ہیں غلامی سے نجات پائیں اور اس قابل ہوں کہ اپنا مستقبل خود بنا سکیں۔ افسوس میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے میں نذرِ عقیدت پیش کرسکوں۔

جہادِ آزادی کے برگزیدہ رہنما

بیسویں صدی ملک وملت کے جن چند ممتاز ترین فرزندوں پر فخر کرسکتی ہے ان میں سے ایک مایۂ ناز فرد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہٗ بھی تھے حضرت شیخ الاسلام نے ملک وقوم پر اتنے احسان کیے ہیں کہ سرزمین وطن ان کی شکرگزاری سے عہدہ برآنہیں ہوسکتی۔ آپ کا شمار صفِ اول کے ان قائدین میں ہوتا تھا جن کے طفیل برطانیہ جیسی جابر وقاہر طاقت کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے ملک آزاد ہوا۔ ایک عظیم المرتبت پیشوائے دین کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونکی ان کے دل ودماغ تک اسلام کی حقیقی تعلیم کی سپرٹ پہنچانے کی زبردست کوشش کی اور مذہب کی اجتماعی تعلیمات کو مجاہدانہ شان سے اجاگر کیا۔ آپ کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا جو خدا کی مخلوق کی خدمت کے لیے تو ریشم سے زیادہ نرم رہتا ہے؛ لیکن حق وباطل کے معاملے میں فولاد سے بھی زیادہ سخت ہوجاتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرت مولانا کی شخصیت نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پورے ایشیا کے لیے موجبِ افتخار تھی آپ کا شمار دنیائے اسلام کے چند گنے چنے رہنماؤں میں ہوتا تھا آپ کی ہستی میں خلوص وشفقت عظمت ووقار حلم وعفو، عزم وہمت، عجز وفروتنی، صبر واستقلال غرضیکہ شریعت وطریقت کے تمام جوہر کچھ اس طرح یکجا ہوگئے تھے کہ ایک فرد میں ان خصوصیتوں اور کمالات کا اجتماع مشکل ہی سے ہوتا ہے آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگی کی خصوصیات کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔

حضرت مرحوم ''دارالعلوم دیوبند'' اور ''جمعیۃ علماء ہند'' کے ولولوں اور امیدوں کا آخری سہارا تھے آپ کی رحلت سے یہ دونوں مرکز یتیم ہوگئے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہٗ کے بعد دارالعلوم کی علمی اور مذہبی عظمت وشان آپ ہی کے دم قدم سے قائم تھی۔ کم وبیش ۳۵ سال تک اسلامی دنیا کے اس مرکز کے صدرنشین رہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے عہد میمنت میں دارالعلوم کی شہرت میں غیرمعمولی اضافہ ہوا اور مسند رشد وہدایت تو اس شان سے بچھی کی دیوبند کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ ایک ہی

وقت میں شیخ وقت بھی تھے اور محدث بے بدل بھی آپ کی غرباء پروری اور مہمان نوازی کی بدولت دیو بند کا چھوٹا سا قصبہ ''گلزار ابراہیم'' معلوم ہوتا۔

جن حالات میں ملک آزاد ہوا تھا بدقسمتی سے وہ یہاں کے مسلمانوں کے لیے صبر آزما ثابت ہوئے تاریخی حقائق پر تعصب چھا گیا جنگ آزادی کے بڑے بڑے رہنماؤں کو نظر انداز کیا جانے لگا تنگ نظری کی تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں سرزمین ہند کی عام مسلم آبادی جمود ذہنی اور احساس کمتری کا شکار ہوگئی بدلے ہوئے حالات اور مایوسی وخوف کی ان گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں حضرت شیخ کا وجود خاص طور پر رحمت ثابت ہوا اور انہوں نے اپنے جوش عمل اور حسن کردار سے پژمردہ اور پراگندہ مسلمانوں میں صبر واستقامت اور عزم وہمت کی لہر دوڑا دی، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کی زندگی کا یہ خاص مقصد اور مشن ہو گیا تھا۔ اس کے لیے پُر صعوبت سفر بھی کرتے تھے جہاد آزادی کے اس بے باک اور برگزیدہ ترین رہنما نے نہ صرف یہ کہ اپنی جدوجہد اور خدمات کا صلہ نہیں چاہا؛ بلکہ اس کی پرچھائیں سے بھی دور رہے وہ انوری کے اس قطعہ کے حقیقی مصداق تھے

چہار چیز شد آئین مردم، ہندی — کہ مردم ہندی زیں چہار نیست بری
یکے آنکہ طبعی چودست گاہ بود — بہ نیک نامی آں را بخشش وبخوری
دودیگر آنکہ دل دوستاں نیازاری — کہ دوست آئینہ باشد چواندرونگری
سہ دیگر آنکہ زباں وانگاہ گفتن زشت — نگاہ داری تا وقت عذر غم نخوری
چہارم آنکہ کسے کو بجائے تو بد کرد — چوعذر خواہد نام گناہ از ونبری

بے شبہ وہ اول درجہ کے سخی تھے کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے کوئی بڑی اور ناز یبا بات کبھی ان کی زبان سے نہیں نکلی انہوں نے بُرا چاہنے والوں کی خطاؤں سے درگزر فرمایا۔ اس کارخانہ رنگ وبو کے کام تو بہر حال چلتے ہی رہیں گے مگر اس مرد مجاہد اور عابد وزاہد کی جدائی سے اس پر جو ویرانی اور پژمردگی چھائی ہے وہ دور نہ ہو سکے گی۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

عظیم المرتبت شخصیت

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمہ کی خدمات جلیلہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ چمکیں گی آپ کا حلقۂ درس جس کی ابتدا گنبد خضراء کے زیر سایہ اُس مسجد اقدس سے ہوئی تھی جس کے ذروں کو بھی وہ تابانی حاصل ہے کہ آفتاب کی کرنوں کو شرما دے جس درس کے فیض سے پہلے حجاز ویمن، مصر وشام، افغانستان

وترکستان کے تشنہ لبانِ علم سیراب ہوئے پھر اس کے چشمے مشرقی بنگال اور آسام سے جاری ہوئے اور آخر میں ۳۳ سال تک دارالعلوم دیوبند کے بحر محیط سے اس کی موجیں لہراتی رہیں آپ کی وفات سے یہ مسند ایسی خالی ہوئی ہے کہ دوبارہ اس کا مزین ہونا دشوار ہے یہ صحیح ہے! لیکن اس کے ساتھ ساتھ روحانی سلسلہ جو سیاست کی سنگلاخ وادیوں کو بھی روحانیت کے ترشح سے شاداب کر رہا تھا اس میں بھی ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا بھرنا مشکل ہے یہ ایسی شخصیت تھی جس کے لیے اگر ایک طرف عربی مدرسے اور ان کے طلبہ رو رہے ہیں تو دوسری طرف خانقاہیں اس موت پر گریہ کناں ہیں۔ میں نے مولانا مرحوم کی بہت قریب سے زیارت کی میں نے حضرت کو انتقال سے چند دن پہلے بھی دیکھا میں جیل میں بھی مہینوں ساتھ رہا۔ اس عظیم المرتبت شخصیت کے متعلق کیا کہوں اللہ اللہ اخلاق میں اگلوں کا نمونہ تھے سخاوت میں حاتم وقت تھے۔ دستر خوان وسیع کے مالک تھے انکسار تو رگ میں بھر دیا گیا تھا میرے ساتھ کیسی شفقت کرتے تھے کیا کہوں اس محبت کے میدان میں بھی وہ واقعی شیخ الہندؒ کے صحیح جانشین تھے۔ آہ! وہ اُٹھ گئے! لیکن اپنی مثال نہ چھوڑی رب اکرم ان کی قبر کو انوار رحمت سے بھر دے۔

مولانا شاہد فاخریؒ

ذکر شیخ

شاعر انقلاب علامہ انور صابری

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی وفات سے علمی دنیا میں جو صفِ ماتم بچھی ہے اس سے ان کی عظیم شخصیت، بے مثال ایثار پیشگی اور لازوال روحانی بلندیوں کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

وہ اپنی (۸۱) اکیاسی سالہ زندگی میں علم، عمل، تقویٰ، اخلاق، مجاہدات اور عارفانہ حیات کے اعتبار سے جامعیت کاملہ کے مالک تھے۔

وہ ایک ہی وقت میں سپہ سالار بھی تھے، رضا کار بھی، درویش حق پرست بھی تھے اور محدث باکمال بھی۔ خوددار، غیور و فقیر بھی اور دولت اخلاق نبوی کے امیر بھی تھے اور عزم و شجاعت کے میدان میں بیباک وجواں رعنا بھی، مذہبی پیشوا بھی تھے اور سیاسی راہنما بھی، باعتبار عمر ضعیف و سنجیدہ مزاج بھی تھے۔

ان کے قریب رہ کر ان کی زندگی کے شب و روز کا جائزہ لینے والے انہیں قرونِ خیر کی یادوں کا زندۂ جاوید مجسمہ سمجھنے پر مجبور تھے، دوستوں کے ساتھ التفات و محبت کا سلوک کرنا بہت آسان ہے؛ لیکن دشمنوں کو خلوص کا یقین دلا کر گلے لگا لینا نہایت مشکل ہے۔ حضرت مولانا مدنیؒ میں یہ عادت کریمانہ طبیعت ثانیہ کا درجہ پا چکی تھی استغناء ان کا طغریٔ امتیاز تھا۔ لاکھوں ارباب دولت عقیدت کے معاملہ میں خدمت زر کی کوشش کرتے تھے مگر اس گدائے کوئے رسول علیہ السلام کی بے نیازی انہیں اپنے ارادوں سے ہمیشہ روکتی تھی۔

بچپن افلاس اور فاقہ کشی کے جس ماحول میں پلا تھا جوانی میں بھی وہی رفیقِ عمر رہا بڑھاپے میں افلاس کی ادا بدستور رہی؛ البتہ فاقہ کشی سے تنگ آ کر رخصت ہو چکی تھی۔

میرے مطالعۂ شیخ کے (۳۵) پینتیس سال اس بات کے شاہد ہیں کہ اولیاء اللہ کی خصوصیات کا جو تذکرہ کتب تاریخ میں پڑھا کرتا تھا مولانا نے مرحوم ان خصوصیات کے عدیم النظیر نمونہ تھے۔ اشغال و اذکار کی

تکمیل کے بعد روح پاکیزہ اور دل انوار و تجلیات الٰہیہ کا مرکز بن چکا تھا چشم مبارک میں بادہ عرفان کا سرور اور ہونٹوں پر ارباب عشق کی پر کیف مستی ہر وقت متبسم رہتی تھی لب ولہجہ کی شیرینی کوثر و تسلیم کی لطافتوں کو سمیٹے ہوئے تسخیرِ قلوب کے سامان مہیا کرتی تھی۔

مولانا نے میخانہ "امداد" کے جرعات معرفت جس "رشید الفطرت" ساقی کی جام نظر سے نوش فرمائے تھے اس کا پرتو آخری سانس تک چہرہ اقدس کی بلائیں لیتا رہا۔ علم و عمل کا مقام محمود بارگاہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل حاضریوں نے عطا کیا۔ نانا کے زمانہ ہجرت کا نقشہ آنکھوں میں جمائے ان کے والد ماجدؒ نے ہندوستان سے ہجرت کی تو یہ فرزندِ باسعادت شرف معیت کا مالک رہا اور اپنے خاندانی کاروانِ مہاجرین کے ہمراہ وہیں پہنچا جہاں سے نسبی قربِ نبوت کا تعلق باپ دادا کے تخلیقی اجزاء میں پیوست ہوا تھا۔ مدینہ پہنچ کر حرم پاک کی جالیوں کے سامنے نانا کی باتوں کو عوام کے گوش گزار کرنے میں کئی برس بیتے بعض دینداروں نے یہ بھی دیکھا کہ مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث کی ساعتیں محبوب و محبت کے وصالِ کامل کے نظارے بھی دیکھتی تھیں اور بسا اوقات جالیوں کا ہر حجاب یوں اٹھ جاتا تھا گویا کوئی پردہ درمیان میں حائل ہی نہیں ہے جب ہندوستان میں برطانوی استعمار نے عرصۂ حیات تنگ کیا اور غریب ہندوستانیوں کو توپوں کے دہانے کا ناشتہ بنا کر عام اسلامی دنیا کو غلام بنانے کی تدابیر بروئے کار آنے لگیں تو حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے اپنے ہم مزاج لوگوں کے مشورے سے ایک مضبوط و مستحکم بنیادی انقلاب کا خاکہ تیار کیا اور ہندوستان کے باہر افغانستان روس اور ترکی اور عرب ممالک کے ذمہ دار ارباب فکر و نظر سے تعاون کی راہیں نکالیں اور اس تحریک کو پروان چڑھانے کا سوال دماغ میں لیے سفر حجاز اختیار کیا مولانا مدنیؒ وہیں قیام پذیر تھے۔ باشفقت استاد کی صدا پر شاگرد رشید نے لبیک کہا۔

نتائج وہی نکلے جن کی توقع تھی یعنی چند اپنوں کی نوازش نے انکشاف راز کر دیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو مالٹا کے دور دراز مقام پر اُن رفقاء کے ساتھ جن میں مولانا مدنی بھی شامل تھے مدتوں نظر بندی کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں صبر و تحمل اور حصول رضامندی خدا کا یہ دور جسمانی کلفتوں کے آغوش میں روحانی عظمتوں کے اسباب مہیا کرتا رہا۔

جب رہائی نصیب ہوئی تو ترکی مبتلائے معصیت تھا ہندوستان میں بھی جنگ آزادی کا وہ تخم صالح شیخ الہندؒ کے دستِ مبارک سے زمینِ وطن میں بویا گیا تھا کافی بھر چکا تھا گاندھی جی اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے ممبئی کے ساحل پر شیخ الہندؒ اور گاندھی جی میں "ماضی و حال" کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور مستقبل کے لیے نیا نظریہ کار تجویز کیا گیا مسئلہ خلافت کے سہارے ہندوستان اور ممالک اسلامیہ کے مابین ایک خاص رابطہ اتحاد کی بنیاد ڈالی گئی۔

حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی دوران میں فردوس آشیاں ہو گئے اور جانشین اعظم حضرت

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے کاندھوں پر خدمت وطن کا بار عظیم رکھا گیا مولانا رحمۃ اللہ علیہ پورے طور پر تجربہ کار زعیم اور ذی ہوش وذی شعور رہبر تھے انہوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں حریت کا آواز بلند کیا اور مشہور مقدمۂ کراچی کے فیصلہ حلقِ زنداں تک یہ آواز گونجتی ہی رہی حکومت جابرہ افرنگیہ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر محبان وطن کو قید وبند کے آرام سے آشنا کیا اور دار وگیر کی منتقمانہ پالیسی کے اظہار میں انصاف کو بالائے طاق رکھ کر ہر وہ ظلم روا رکھا جو طاغوتی قوتوں کا پیشۂ حیات ہوتا ہے۔

صرف خدائی طاقت کے سامنے جھکنے والے انسانوں کی صف اولیں میں مولانا مدنی کا نام زیادہ اہمیت رکھتا ہے انہوں نے ہر دعوت ستم کو سنا، آفات کو برداشت کیا اور صفحات تاریخ کے لیے وہ سرمایہ چھوڑ دیا جو قوموں کے کردار کو روشن اور قابل تقلید بنانے کا سبب ہوتا ہے، بزودہ جیل سے آزاد ہو کر شیخ کبیر نے شاگردوں اور حلقہ بگوشوں کے تزکیۂ نفس اور تبلیغ علم کا کام انجام دیا ۱۹۳۰ء تک وہ ایک ایسے گروہ کثیر کو تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو دینداری اتقاء اور پرہیزگاری کے اوصاف کے آئینہ دار رہ کر عمل کی نئی سیاسی کروٹ ملک کا سرفروش ثابت ہوا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیانی عرصہ میں وہ دیوبند کی صدارت تدریس پر جلوہ افروز ہو چکے تھے جس میں بیٹھ کر انہوں نے لاکھوں تشنگان نبویہ کی پیاس بجھائی اور لاتعداد اہل ایمان کو عرفان کی چاشنی سے واقف کیا۔

۱۹۳۹ء کے بعد یہ بلبل مدینہ قفس مرادآباد میں بند کیا گیا برطانیہ کے خلاف جذبۂ عناد میں کمی نہ آئی تھی اور نہ آئی، ہر وقفہ قید عشق ومعرفت کے نئے نئے انوار روح پر منکشف کرتا رہتا تھا تقسیم وطن کے غیر قدرتی نعروں کے مقابلے میں انہوں نے جو کچھ کیا اس میں بھی حب وطن اور اللہیت کی روح کارفرما تھی۔

ادھر چند سالوں سے تو زندگی ہمہ تن علم وعرفان بن گئی تھی کوئی گوشۂ وطن ایسا نہیں جہاں جوق در جوق سلسلۂ ارادت کی توسیع نہ ہوئی ہو جنوبی ہند، بمبئی، گجرات، مدھیہ پردیش، یوپی، بہار، بنگال، آسام، راجپوتانہ میں مریدوں کا شمار قبضۂ تحریر سے باہر ہے۔

افسوس ہے کہ ۱۲۹۶ھ میں جو آفتاب علم وعرفان طلوع ہوا تھا وہ ۸۱ سال کے بعد ۱۳۷۷ھ میں غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس وقت نظروں کے سامنے اندھیرا ہے تلاش وتجسس کے بعد بھی اجالے کی صورت نظر نہیں آتی گو مولانا کا جسم اطہر سپرد خاک ہو چکا ہے، لیکن ان کا روحانی فیض قیامت تک زندہ رہے گا۔

مولانا کی روحانیت کے نقش ثانی آپ کے صاحبزادے میاں مولوی اسعد سلمہٗ موجود ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ عظیم باپ کے عظیم فرزند ثابت ہوں گے۔ سیاسی عملی اور مذہبی خدمات کے لیے جمعیۃ علماء کافی ہے جمعیۃ علماء کا آغاز شیخ الہند کی منشائے عمل کا رہین منت تھا اور اس کی باعظمت حیثیت جانشین شیخ الہند کی سدا مشکور رہے گی۔ ■

علم وھدای ت کے آفتاب

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ

مولانا خلیل الرحمٰن برنی، بنگلور

چند اوصاف وکمالات

حضرت مدنی قدس سرہٗ کی شخصیت جامع کمالات تھی، آپ کے بعد آپ کی مثال کہیں نظر نہیں آتی، جس طرح علوم وفنون میں آپ اپنے زمانے کے غزالی ورازی تھے، اسی طرح آپ میدان طریقت اور خانقاہ وتصوف کے جنید وشبلی تھے۔ آپ ایک ہی وقت میں شیخ وقت بھی تھے اور محدثِ وقت بھی، اس کے علاوہ بے شمار اوصاف وکمالات قدرت نے آپ کی ذات میں ودیعت فرمائے تھے، اس مختصر سی تحریر میں سب کا احاطہ دشوار ہے، چند ملاحظہ ہوں:

اتباع سنت

حضرت مدنی کی پوری زندگی اور ہر ہر پہلو میں اتباع سنت کا رنگ نمایاں تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر طرز عمل کیا تھا، مرض وفات میں جب آپ بیٹھ نہیں سکتے تھے اور تکیہ کا سہارا لگایا جاتا تھا اسی حالت میں جبکہ آپ تکیہ کا سہارا لگائے ہوئے تھے، کھانا سامنے لایا گیا اور حاضرین نے کہا کہ آپ اس طرح ٹیک لگا کر کھانا تناول فرمالیں، تو فرمایا کہ بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیک لگا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔ پھر تکیہ ہٹا کر آپ نے کھانا تناول فرمایا۔ (تا شیخ الاسلام ۳۰۲)

شب بیداری وتہجد گذاری

حضرت مدنیؒ قدس سرہٗ دیگر معمولات کے ساتھ تہجد کے بھی بڑے پابند تھے۔ آپ کا یہ خوبصورت معمول سفر وحضر دونوں میں جاری رہتا تھا۔ رمضان کے علاوہ عام دنوں عموماً چار رکعت ادا فرماتے تھے۔ پہلی دو رکعت مختصر اور بعد کی دو رکعتیں طویل ہوتی تھیں۔

تہجد کی نماز میں تقریباً ڈیڑھ دو پارے تلاوت فرماتے تھے۔ قرأت کرتے وقت نہایت خشوع وگریہ طاری رہتا، اور سینہ مبارک سے ایسے کھولتے ہوئے گرم سانس نکلتے، جن کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت نگاہوں میں پھر جاتی۔ (ماخوذ از مآثر ۳۰۵)

تواضع وانکساری

تواضع وانکساری حضرت مدنی قدس اللہ سرہٗ کی وہ نمایاں خصوصیت ہے کہ معاصرین مشائخ میں سے کوئی اُن کا اِس خصوصیت میں شریک وسہیم نہیں ہے۔ آپ ایشیا کی سب سے عظیم دینی درسگاہ کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین تھے، اس کے علاوہ قومی وملی راہنماؤں کے سرخیل اور ایسے شیخ طریقت تھے جن کے لیے ہزاروں معتقدین دیدہ ودل فرشِ راہ کرنے کے لیے اپنی سعادت سمجھتے تھے ایسے محترم ومکرم اور علم وعمل کے پیکر اگر تواضع وانکساری کے حامل ہوں تو یہ اُن کے کمال تقویٰ اور کمال زہد کی بہت مضبوط دلیل ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تواضع کو شیخ الاسلام کے امتیازات میں شمار کرایا ہے۔

صبرواستقامت

آپ کی زندگی حادثوں اور مصائب کی آماج گاہ تھی۔ ابتلا وآزمائش کا سلسلہ عمر بھر رہا؛ لیکن جبین صبر واستقلال پر کبھی شکن نہیں آئی، بڑے بڑے جگر پاش حادثات ومصائب آئے مگر سب پر ایسا صبر کیا کہ اس کی مثال ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے۔

خدمت خلق

ملکی سطح پر جو خدمات حضرت مدنیؒ نے انجام دیں اور اس راہ میں جو مصائب اور اذیتیں آپ نے جھیلیں وہ بس آپ ہی کا حصہ تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تاریخ اسلام میں جن اساطین علم نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے محیر العقول کارنامے انجام دیے ہیں،

اُن میں علماء دیو بند کا نام سرِفہرست ہے یہ تمام حضرات مسلم اہل علم میں سے تھے، اُن میں سے ہر ایک یگانۂ روزگار اور علم وعمل کا جامع تھا۔ اخلاص، تقویٰ وطہارت اِن کی خصوصیت تھی۔ اُن کے دل محبتِ الٰہیہ کی گرمی سے معمور تھے جبکہ احیائے دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُن کی زندگی کا مقصد تھا۔ اُن میں کا ہر ایک جہاں علم حدیث کے اتھاہ سمندر کا غوطہ خور تھا وہیں معقولات کی باریکیوں اور دقائق کا عارف کامل بھی تھا۔ علم وعمل کے وسیع میدان کے اِن شہسواروں میں ایک واضح نام شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ قدس سرہٗ کا بھی ہے۔ آپ کی شخصیت نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پورے عالم کے لیے موجب افتخار تھی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ جامع خصائل اور متنوع علمی کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ بے انتہا بلند اخلاق وکردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔ قوم ملت کے لیے بے لوث اور بے غرض قربانیاں دینے والی یہ عظیم شخصیت دارالعلوم دیو بند کے شیخ الحدیث اور ہندوستانی علماء کی قابل جماعت جمعیۃ علمائے ہند کے صدر محترم بھی تھے۔ آپ کی ہستی میں خلوص وشفقت، عظمت ومحبت، حلم ووقار، عزم وہمت، عجز وفروتنی، صبر واستقلال، علم وعمل غرضیکہ شریعت وطریقت کے تمام جوہر کچھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ ایک فرد میں اِن خصوصیتوں اور کمالات کا اجتماع مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر حضرت صحابۂ کرام کی زندگی کی خصوصیات کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ آپ ایک ہی وقت میں شیخ کامل اور سرتاج اولیاء بھی تھے اور فقیہ العصر ومحدث بے بدل بھی۔ اسی کے ساتھ قافلۂ حریت کے میرِ کارواں اور سرمایۂ ملت کے بالغ نظر نگہبان بھی تھے۔ ■

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات

محمد مکرم بن الحاج مطلوب حسن قادری ندوی
مدرسہ دار العلوم قادریہ سلیم پور سہارنپور

مرکز تحریک آزادی از دلّی تا دیوبند

حضرت اورنگزیبؒ کے نااہل جانشینوں یا شاطر فرنگی کی شاطرانہ چالوں یا ہندوستان ہی کے نفاق پیشہ ننگ تاریخ انسانوں کی منافقانہ سازشوں کے نتیجہ میں چھن چھنا گئی اور ہندوستان اپنے اقتدار سے محروم ہو کر کلیۃ ایک غیر ملکی اقتدار کے آہنی پنجے میں پہونچ گیا تو صورت حال کی مرثیہ نگاری الامام الشہیر بولی اللہ الدہلوی اور ان کے خانوادہ کے ان ارباب ہمت کے حصہ میں آئی جنکی بلند تاریخ سے صفحات روزگار ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ شاہ صاحب کے حساس دل ودماغ اور ان کے علم ریز قلم نے جو کچھ کیا اور لکھا اسکی تفصلات الحمدللہ ضائع ہونے نہیں پائیں آج بھی اس عزیمت کے جلی وخفی عنوانات کو دیکھنے والے بسہولت دیکھ سکتے ہیں مصلا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کی سیادت حضرت سید احمد شہیدؒ کا سفر جہاد شاہ اسماعیل شہیدؒ کی فاقت مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ کی سنائی ایک حقیقت ہے جسکی تردید ممکن نہیں ایک واقعہ ہے جسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ اسی خانوادہ شرافت ونجابت کے خوشہ چینوں میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا قاسم النانوتویؒ اور قطب الہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں جنھونے دلی کے اسی مدرسہ فکر میں مجاہدانہ زندگی کے طور وطریق کی تعلیم حاصل کی اور جب دلّی پر فرنگی تسلط کی بنا پر اس مرکزی شہر میں بیٹھ کر لگی ہوئی آگ کی چنگاریاں اطراف وجوانب میں پھیلنا ممکن نہ رہیں تو یہ دونوں داعی حق اس امانت کو لیکر ضلع سہارنپور کے مشہور قصبہ دیوبند میں پہونچ گئے

گویا کہ حریت پسندی استخلاص وطن غیر ملکی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ بے اختیار اچانک دلی کی سرزمین سے دیوبند کی جانب منتقل ہو گیا اور اپنی خاص مساعی جمیلہ کو جنکا تمامتر تعلق ملکی آزادی کا حصول تھا علم و دانش کے حسین نقاب کے تحت جس انداز پر شروع کیا گیا اسکی پوری داستان دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے ایک ہمہ گیر تحریک کی بنیاد نئے تقاضوں کے مطابق جس انداز پر کی اور اس کاروان جہاد کو برابر پیش قدمی کے لئے جو سپہ سالار اعظم دیا اسکا نام نامی مولانا محمود الحسن المعروف بہ شیخ الہندؒ ہے فرق اتنا ہے کہ دماغ حضرت نانوتوی کا تھا اور آپ ہی کا فکر لیکن نئے حالات نئے ماحول اور نئی فضا میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان آتشیں جذبات کو انگیٹھیوں میں مستور رکھنے کے بجائے شعلے ان دل و دماغ میں بھی منتقل کرنا شروع کر دیے جو ابتک فرنگی ظلم و استبداد کی شدید گرفت کی وجہ سے کسی طشت از بام جدوجہد کا تصور نہیں کر سکتے تھے یہ آپ ہی کا کارنامہ کہ آپ کی دامن تربیت سے صرف فخر روزگار دانشمند تیار نہیں ہوئے بلکہ وہ حریت پسندی و جہادِ آزادی کے سرفروش قافلہ کے قافلہ سالار بھی تھے علامہ انور شاہ کشمیری مولانا عبید اللہ سندھی مفتی کفایت اللہ علامہ شبیر احمد عثمانی اپنے استاذ کے باغیانہ خیالات و سیاسی افکار سے حد درجہ متاثر تھے ایک اہم نام شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کا بھی ہے جنہوں نے آگے چل کر آپ کی تحریک کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

دارالعلوم درحقیقت خانوادہ ولی اللہی کی وہ امانت تھی جسے دلی کے مکتبہ فکر سے قریبی رابطہ رکھنے والوں نے بعض اہم مصالح کے پیش نظر دیوبند منتقل کر دیا تھا اور جس پر علم و دانش کا نقاب بظاہر ڈال دیا گیا تھا لیکن وہ بباطن ایک ایسا معکر تھا جسکی مشین پوری تیزی کے ساتھ برطانوی اقتدار کے خلاف مسلسل پرزے ڈھال رہی تھی یہی نہیں بلکہ دیوبند کے قریب و جوار اور اسکے مضافات میں جو خانقاہیں تعمیر باطن کا کام کر رہی تھی ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ آزادی وطن تک خفیہ بیعت جہاد بھی لی جاتی تھی۔ (نقش دوام انظر شاہ کشمیریؒ۔ ص ۱۰۵،۱۰۶)

دیوبند کا احسان انسانی دنیا پر

مغربی یوپی (سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ) کو برصغیر میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔ تحریک آزادی نے سالہا سال سفر کیا اسے ٹیپو سلطان شہیدؒ جیسے غیور مجاہدین بھی ملے اور سید احمد شہیدؒ اور آپ کے اصحاب فضل و کمال عظیمت و استقلال کے پتلے علماء و صلحا بھی ملے، کبھی اسے دلی نے اپنے گلے سے لگایا اور کبھی لاہور، پشاور اور بالاکوٹ نے اس کا سیکڑوں شہروں نے استقبال کیا اور خوش آمدید کہا مگر اس کی تمنا بر نہ آئی اس کی ایک بہت ہی اہم اور خاص بات ہے جو ایک تاریخی مقام کی حیثیت رکھتی ہے یہ بات سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ ضمیر کی کتنے ہی غیرت و حمیت سے سرشار ہوں، حوصلہ مندی اور جانثاری سے بھرپور ہوں مگر اسے جستجو رہتی ہے

ایک ایسے خمیر کی جو شجاعت و بسالت ہمت و پامردی، عزیمت و استقلال، مکمل اطاعت و انقیاد، خود سپردگی جیسی صفات جس کا خاصہ ہو مغربی یوپی وہی خطہ ہے جو ایسے خمیر سے مزین ہے جو اخلاص وفا، ایمان و ایقان کے جذبوں سے سرشار اور اپنی دینی غیرت و حمیت اور اسلام کے دفاع اور اس کے بقاء کیلئے اپنے تن من دھن کو مکمل جانثاری کے ساتھ قربان کرنے کی جسارت رکھتا ہے۔ مغربی اتر پردیش کا ضلع سہارنپور تحریک آزادی کی وہی منزل بھی تھی اور تعبیر بھی جس کا مرکزی نقطہ اتصال دیوبند ہے۔ اس مستقر سے دنیا کو وہ نورانی و عرفانی غذا پہنچی جس کی گواہی نیل کا ساحل بھی دیتا ہے اور خاک کا شغر بھی، کلسائے یورپ، صحرائے افریقہ بھی اس کے ثناخواں ہیں! کیونکہ یہاں کے خمیر سے وہ لوگ اٹھے جن کی اذانوں کو ملا و مجاہد کی اذان کہنا حق بجانب ہے کیونکہ صرف آزادی ہی ایک واحد نصب العین نہیں تھا بلکہ مستقبل میں ملت اسلامیہ ہند خصوصاً اور عالم اسلام کی عام طور پر کشت ویراں کو یہاں سے دینی و روحانی آبیاری بھی مشیت ایزدی تھی۔

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ

انگریزوں سے نفرت و عداوت اور ملک کی آزادی سے غیر معمولی شغف اور اس کے اخلاص میں سب سے اہم ناموں میں ٹیپو سلطان کے بعد شیخ الہند حضرت محمود حسن دیوبندیؒ کی شخصیت بہت ہی نمایاں و ممتاز نظر آتی ہے۔ اس کی تیسری مثال بجا طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ہے جو حضرت شیخ الہند کے سچے اور عاشق زار اور مخلص ترین جانشین تھے۔

ایک گوشہ نشین درس و تدریس میں منہمک اصلاح و ارشاد تزکیہ نفوس تصنیف و تالیف جیسے مقدس امور اور مشاغل کا عادی یک بیک سیاست کے میدان میں آجائے یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں بلکہ اس عزم بالجزم کے پیچھے تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔

آپ سیاست میں کس طرح آئے؟ شیخ الاسلامؒ کی تحریر ہے "اس جنگ عظیم نے سوانح زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی سیاست سے میرا تعلق اور برطانوی سامراج کے مقابلہ میں عزم انقلاب جس طرح میری علمی زندگی کا منبع فیض شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تھے ایسے ہی سیاسی زندگی کا سرچشمہ بھی حضرت شیخ کے وہ افکار و خیالات اور وہ جذبات تھے جو عرصہ دراز سے حضرت شیخ کے سینۂ پُر نور اور ضمیر روشن میں پرورش پا رہے تھے۔ جس کی چنگاریاں اس جنگ عظیم نے بھڑکا دی تھیں" گویا حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہند کے دینی و علمی جانشین ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست و امارت کے بھی سچے اور مخلص جانشین تھے آپ کے نظر مسلمانوں کی تاریخ ماضی پر بھی تھی اور مستقبل کے خدشات بھی محسوس فرما رہے تھے اسی لئے

آپ خون جگر سے استخلاص وطن کی آبیاری میں لگ گئے ۔ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت ورفاقت اور صحبت و تربیت نے آپ کے اس رنگ کو اور شوخ کر دیا تھا۔

شیخ الاسلامؒ جیسا خطاب آپ کے جذبات احترام اور عظمت افکار کی کسی حد تک تسکین اور دل جوئی کا سامان فراہم کرتا ہے آپ کے علم وعمل کی بات ہو یا شریعت وطریقت کی آپ کی حیثیت مجمع البحرین اور سنگم کی ہے، اگر ایک طرف آپ متبع سنت، مکارم اخلاق سے متصف، سیرت صحابہ اور اسوۂ اسلاف کا سرچشمہ تھے تو دوسری طرف آپ جذبات حریت، قوم وملت کی بہی خواہی، حب وطن مواسات خلق غمگساری ملت جیسی عظیم الشان صفات کے بھی حامل تھے۔

آپ ہی کی فراست مؤمنانہ تھی کہ آپ ۴۰ سال تک مسلسل تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے، آپ نے فرنگیوں کی سفاکی کا بچشم خود نظارہ کیا تھا، ہندوستانی مسلمان اور ان پر مصائب وآلام سے آپ اچھی طرح واقف تھے، آپ استقامت واستقلال اور عزم بالجزم کا فولادی پیکر لیکر اٹھے اور وطن عزیز کی آزادی اور فرنگیوں کی پامالی کو اپنا نصب العین بنایا کیونکہ یہ وہ لائحۂ عمل تھا جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی کیونکہ ملک کی عبرت خیز حالت اور انگریزوں کے جبر وتشدد نے آپ کے جگر کی شوزش اور قلب کی حرارت کو مزید گرما دیا تھا۔

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب افسانوں میں

آپ صرف ہندوستان کے حالات سے ہی نہیں تڑپ رہے تھے بلکہ عالم انسانیت کیلئے آپ کا دل دھڑکتا تھا، دولت آل عثمان (سلطنت عثمانیہ) پر انگریزوں کی یورش کی بات ہو یا افریقہ وایشیا کی قوموں پر ان کی چیرہ دستیاں پورے عالم پر انگریزوں کے ظلم وجور نے آپ کی بے چینی کو تیز تر کر دیا تھا یہی وہ اہم اسباب تھے کہ آپ مسند درس وتدریس کے ساتھ ساتھ سیاست وامارت کی بھی پاسبانی کرنے لگے۔

صبر واستقلامت اور عزیمت واستقلال

ایک دور وہ آیا جب آپ کی سیاسی رائے اور بصیرت اس وقت کی مقبول قیادت اور سیاسی فکر سے بالکل الگ تھلگ تھی، مسلم لیگ کا اس وقت زور بھی تھا اور شور بھی، مسلم لیگ سیاسی طور پر ملک کی تقسیم کی حامی تھی اور آپ کی رائے اس کے برعکس تھی، آپ نے تقسیم کے خطرات اور نقصانات بیان کئے اس کے لئے ملک کے چپہ چپہ کا سفر کیا لیکن اسوقت مسلمانوں کے جذبات اتنے متحرک اور مشتعل تھے کہ ان میں کسی مخالف رائے سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی، یا وہ کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنے اور اس کے نشیب وفراز پہ سوچ کی کیفیت ہی میں نہیں تھے حضرت کے خلوص عزم اور احساس فرض نے اس کیفیت کو جو

ایک واقعہ اور حقیقت تھی تسلیم کرنے اور اس کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور اس کی کھل کر مخالفت کی اور انہوں نے اپنے عقیدہ اور رائے عامہ کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت کے سامنے کلمہ حق کو اپنا فرض اور افضل الجہاد سمجھا جس کے نتیجہ میں آپ کے ساتھ سفروں، جلسوں، اشتہارات واخبارات میں آپ کے خلاف وہ سب شائع ہوا جو آپ کی علمی ودینی شان اور آپ کے سیاسی مقام کے بالکل منافی تھی۔

میراساز اگرچہ ستم رسیدہ زخم ہائے عجم رہا　　وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا میری عربی رہی

اس کے باوجود آپ نے کسی سے کسی طرح کا انتقام نہیں لیا حتی کہ آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اسی دیکھ کر اور سن کر اچھے اچھے لوگوں کی آنکھوں سے آنسوں بہہ پڑے۔ پھر وہ زمانہ آیا جن لوگوں نے مسلمانوں کو بھڑکایا تھا وہی لوگ اپنی بسی بسائی دنیا میں چلے گئے اور مسلمانوں کو تن تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک مشہور مفکر اور مؤرخ کی زبانی ''آخر وہ دور آیا جن لوگوں نے مسلمانوں کے جذبات میں یہ تحریک پیدا کی انکو بے یار ومددگار چھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں چلے گئے، مسلمانوں میں سخت مایوسی، مستقبل سے ناامیدی اور اپنے بارے میں بے اعتمادی اور احساس کمتری، دنما تھا، ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، ہر شخص ایک یتیمی اور کسمپرسی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اب مولانا اور اس کے رفقاء کی جماعت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی مستقبل کی طرف سے اطمنان اپنے وطن میں رہنے اور ناساز حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کرنے کی تبلیغ کی۔ شمالی ہندوستان اور بالخصوص یوپی (جو ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہنی، علمی اور سیاسی مرکز ہے) کے مسلمانوں کے قسمت اور ان کے قیام کا انحصار یوپی کے مغربی سرحدی اضلاع (سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ) کے برقرار رہنے اور مسلمانوں کے اپنی جگہ قائم رہنے پر تھا، سہارنپور جو یوپی اور مشرقی پنجاب کا درمیانی ضلع ہے اکھڑ جاتا تو مسلمانوں کا کسی ضلع میں باقی رہنا مشکل تھا، سہارنپور اور اس کے متصل اضلاع میں مقامی حالات اور مشرقی پنجاب کے قرب کے وجہ سے ترک وطن اور انخلاء کی طاقت ور تحریک وترغیب اور رجحان پایا جاتا تھا، علمائے دیوبند سہارنپور کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے ترک وطن کی تحریک وترغیب کا سختی سے مقابلہ کیا اور اس کو دینی سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے اقدام قتل کا مرادی بتلایا اور مسلمانوں کے روکنے اور ان کے قدم جمانے کی سخت جدوجہد کی اس میں بھی مولانا بہت بڑا حصہ تھا خود ان کے قیام نے پھر ان کی ایمان آفریں تقریروں نے ان اضلاع کے مسلمانوں میں دینی روح اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا، ترک وطن کا سلسلہ رک گیا''۔ (ملخصا پرانے چراغ سید ابوالحسن علی ندوی ص (۱۰۰ تا ص ۱۲۰)

جامع الصفات الحسنہ

غیرت وحمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا

جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کرتی ہی تھی، اور یہی آپ کو سدا جوان، متعدد سرگرم رکھے ہوئے تھی، اور اسی نے سیکڑوں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش وولولہ کے ساتھ پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے اور الفاظ نہیں ہیں بلکہ شرارے ہیں، جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں یہی حمیت تھی جو کسی منکر شرعی اور خلاف سنت فعل کو دیکھنے کی روادانہ ہی تھی اور جس کی حرارت اور آنچ آس پاس بیٹھنے والاں کو اکثر محسوس ہوتی جن لوگوں نے آپ کے اس جذبہ پہچان لیا وہ سمجھ گئے کہ حمیت آپ میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ بعض اوقات اس سے غلط فائدہ اٹھا لیتے اسی طرح مولانا کی شرافت ومروت سے جو آبائی درثہ اور سادات کرام کا شیوہ ہے، بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھا کر آپ کے مخلص محبین اور نیازمندوں کے لئے شرمندگی کا باعث بنتے اور اپنی اغراض براری کر کے اپنی ہوشیاری اور موقع پرستی کا ثبوت دیتے اور مولانا کی ذات کو نقصان پہونچاتے مولانا حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) علمی وسیاسی حیثیت سے جس قدر بلند ہوں مجھے اس سے انکار نہیں، لکھنے والے ان گوشوں پر لکھیں گے لیکن میرے خیال ناقص میں ان کی جو حیثیت سب سے زیادہ روشن، ممتاز اور مسلم تھی، وہ ان کی انسانی بلندی ہے علمی دنیا ممتاز شخصیتوں، وسیع النظر اور متبحر عالموں سے خالی نہیں، ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے، انھوں نے اپنی بلند نظری سے ملک کی آزادی سے جو توقعات قائم کی تھیں، اور اپنی فطری شرافت، اور نفس کی پاکیزگی سے اس ملک کی اکثریت کے متعلق جو اندازے لگائے، وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے اور ان کو زبان، کلچر، مذہبی تعلیم اور پرسنل لا کے تحفظ کے بارے میں (جس کی کانگریس کے منشور اور ہندوستان کے دستور نے ضمانت کی تھی) آخری عمر میں جو مایوسی ہوئی اور ان کو اپنی سیاسی جدوجہد کے رفیقوں اور جیل کے ساتھیوں کے متعلق (صاحب اختیار واقتدا ہو جانے کے بعد) جو تلخ اور دل شکن تجربے ہوئے آج ان کو خواہ زبان پر نہ لایا جاسکے، مگر آنے والے مورخ کے قلم کو ان کے اظہار سے روکا نہیں جاسکتا، مگر جو چیز ہر شک وشبہ اور سہر بحث ونزاع اور ہر اخلاف سے بالاتر ہے، وہ ان کی بلند سیرت ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا، اور ان کو اخلاقی وطبعی بلندی کے اس مقام پر پہونچلو یا تھا، جس کے متعلق دور اول کے عرب شاعر نے کہا ہے......

هجان الحی کالذهبِ المصفّٰی صبلیحة دیمة یجنیه جان

قبیلہ کے شریف سردار ایسے کھرے سونے کی طرح ہیں، جو کسی بارش کی صبح کو زمین سے اٹھا لیا جائے اور صاف کر لیا جائے۔ جوانی کی بہترین طاقتیں، اور قلب ودماغ کی پوری توجہات اور ہمت قلبی، انگریزی

حکومت کے مقابلہ اور انگریزوں کے اخراجات پر صرف ہوئی، جس کیلئے شیخ الہندؒ کی صحبت اور تجربہ و مطالعہ نے آپ کو تیار کیا تھا، جب نیا انقلاب ۴۷ء اپنے نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے ساتھ آیا تو وہ عمر کے انحطاط، قویٰ کے اضمحلال اور مصروفیتوں کی زیادتی کا زمانہ تھا، اور عام طور پر یہ خیال غالب تھا کہ مسلمانوں کا اس ملک میں کسی نہ کسی طرح رہ جانا ہی ایک بڑی کامیابی اور فتح مندی ہے، اب یہ ان لوگوں کی خدمت کا زمانہ ہے جو اس انقلاب کے دور اس اثرات سے واقف ہیں اور علمی وفکری طور پر اس کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہیں اور علمی وفکری طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (ملخصاً پرانے چراغ سید ابوالحسن علی ندوی ص (۱۰۰ تا ص ۱۲۰)

نظیر بے نظیر

اگر تاریخ اقوام کا مطالعہ کیا جائے اور اس میں اپنے ملکوں اور قوموں کو آزاد کرانے والوں کی فہرست مرتب کی جائے اور یہ جائزہ لیا جائے کہ آزادی کے بعد ان قائدین اقوام اور مجاہدین تحریکات آزادی نے حصول آزادی کے بعد کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا ہو یا کسی اور طرح کا معاوضہ نہ لیا ہو شاید ایسی مثال نہ ملے۔ لیکن شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی شخصیت ایک ایسی مثال پیش کرتی ہے، جس کی کوئی نظیر نظر نہ آئیگی۔

ملک کے آزاد کرانے اور اسکی آزادی سے ممالک اسلامیہ کے آزاد ہونے کی سبیل پیدا کرنے اور اس سب کے علاوہ اور شاید اس سب کے برابر اپنے اسلاف اور بزرگوں بالخصوص اپنے مربی و محبوب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے اتباع واطاعت کا جذبہ کام کر رہا تھا، اس کے علاوہ کسی مادی منفعت اور ذاتی مصلحت کا تصور اور خطرہ اختیاری قائم ہوا تو وہ اپنے اصلی کام (درس وتدریس اور تزکیہ ارشاد) میں ایسے مصروف اور سیاسی جدوجہد کے میدان سے ایسے کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا کام ختم ہو چکا ہو، صف اول کے قائدین میں میرے خیال میں تنہا وہ ایک شخص تھے، جنہوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی اور وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا یہاں تک کہ جب ان کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے صاف معذرت کر دی، اگر چہ ان کی طبعی تواضع وانکساری نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ ان کے اسلاف کرام کے شیوہ و مسلک کے خلاف ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے دامن اخلاص پر خفیف سے خفیف داغ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اس فیصلہ نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دین میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا ایک ثمر

نہ صرف سیاسی جدوجہد بلکہ انہوں نے اپنے کسی جوہر، کسی کمال، کسی متاع اور کسی ہنر کی کوئی قیمت نہیں۔

آپ کی ذات ایسے صفات کاملہ کا مجموعہ تھی جس میں دین و دنیا کا سبق واضح طور پر نظر آئیگا۔ مخالف حالات سے پنجہ آزمائی اور باطل کے خلاف ہمت کرنے کی جسارت آپ کی حیات میں مضمر ہے۔

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

مولانا اعجاز عرفی قاسمی کا یہ ''اعجاز عرفی'' ہو گیا کہ وہ مختلف عبقریات اسلام شخصیات پر خصوصی دستاویزات شائع کرتے رہتے ہیں اب اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی شیخ الاسلام نمبر آپ کے سامنے ہے جو آج کے ناواقفیت اور عصبیت کو کم کرنے مفید اور موثر ہوگا مسلمانوں کو بھی اس سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہونگی اور انکے علم و واقفیت میں اضافہ ہوگا اور اس احساس کہتری کا بھی کچھ مداوا ہوگا جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں اس دور میں رونما ہو رہا ہے جو انکے لئے جائز نہیں وہ نہ صرف اس ملک کے باعزت شہری اور قدیم باشندے ہیں بلکہ چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ انکے معمار وطن ہونے کی شہادت دیتا ہے یہ خصوصی دستاویز سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہے۔

قافلہ میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں
ایک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

علم

شاعر انقلاب علامہ انور صابری

نظر تلاش میں ہے اس بزرگ انسان کی

دلوں کو جس نے عطا کی بصیرتوں کی حیات
ملی تھی جس کو مشیت سے عارفانہ صفات

حدیث سرور عالم محمد اسرار
کلامِ حق کا مجسم مفسرِ آیات

ازل سے جس پہ ہوئے منکشف بپے الہام
علومِ سید کونینؐ کے رموز ونکات

کلام جس کا لب مصطفٰیؐ کا آئینہ
دلیل رحمت دارین جس کی تھی ہر بات

اصولِ شرع کی پابندیوں میں گم ہو کر
دکھائی جس نے زمانے کو غم سے راہ نجات

دل امام بخاریؒ کا پرتوِ کامل
زفرق تابہ قدم ترمذیؒ خوش اوقات

امینِ دولت اقراء تھا جس کا سینہ پاک
جبیں سے جس کی نمایاں تجلی عرفات

مزاج دان نبوت، اداشناسِ رسول
قرونِ خیر کے مظہر تھے جس کے احساسات

شبیہ کہئے جسے حُسن روئے ایماں کی

■ ■ ■

فرمان

شاعرانقلاب علامہ انور صابری

نظر تلاش میں ہے اس امامِ عرفان کی

نگاہ زاد جمالِ خدا کہیں جس کو
شعورِ باب دلِ مصطفیٰ کہیں جس کو

رشیدؒ دیدۂ امداد کی مراد کمال
حریم رشد کی شمع ضیا کہیں جس کو

گدائے کوچہ صابرؒ فقیر در گہ حق
متاعِ سلسلۂ اصفیا کہیں جس کو

جو اک اشارۂ دلکش سے کھولدے سینہ
وہ خضر معرفتِ کبریا کہیں جس کو

چھلک سکا نہ کبھی جس کا جامِ ضبط حیات
حرم کا پیر مغانِ وفا کہیں جس کو

علیؓ کی جان ولایت حسینؓ ثانی وقت
شہید عشق شہ کربلا کہیں جس کو

چراغ خانۂ عشق، آفتاب عرش سلوک
نمازِ شوق کا سب مقتدا کہیں جس کو

جہاں جنوں ہو ادب دشمنِ وقار بشر
وہاں خرد کے لیے آسرا کہیں جس کو

خبر جسے ہو طریقت کے سر پنہاں کی

■ ■ ■

سیاست

شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری

نظر تلاش میں ہے اس زعیم دوراں کی

سمجھ چکا تھا جو انداز گردشِ ایام
سحر کے واسطے جس نے مٹائی ظلمتِ شام

وطن نواز عناصر کا پیکر ترکیب
نمازِ قافلہ عزمِ زندگی کا امام

جسے مرتب آئین حُریت کہیے
عمل کی بزم میں جس کا بہت بلند مقام

شریک سلسلۂ کار خدمتِ محمودؒ
انیسِ خلوتِ زندانِ کلفت وآلام

بنائے وجہِ شکست سیاست افرنگ
مجاہدوں کے لیے رُوح ارتباط نظام

لہُو سے جس نے بڑھایا فروغ گلشنِ ہند
ہے جس کے خون سے رنگین حدیقۂ اسلام

بتایا فرقہ پرستی کو جس نے دنیا میں
بلا دلیل ثبوت تباہی اقوام

پڑھایا جس نے یہ درس کتاب آزادی
کہ آدمی کی غلامی ہے آدمی پہ حرام

بڑھائی آبرو ہر سمت حکمِ یزداں کی

■ ■ ■

اخلاق

شاعر انقلاب علامہ انور صابری

نظر تلاش میں ہے اس زعیم الاحسان

جو میہماں کے لیے فرشِ راہ بن جائے
ادا ادا میں شرافت کا ڈھنگ سکھلائے

نگاہ جس کی ہو مخلص، مزاج خلقِ تمام
مرّوتوں کا عمل زندگی کو سمجھائے

وہ جس کی مجلسِ اقدس میں باہمہ فیضاں
خدا کے فضل کے رہتے ہوں رات دن سائے

وہ جس کو دیکھ کے جویائے بادۂ عرفاں
سراغ منزلِ مقصود خود بخود پائے

ہو جس کا حُسنِ تبسم بہشت زارِ قلوب
کلامِ بزم، محبت کے پھول برسائے

ہو جس کی بزم طرب گاہ احترام عوام
ہجومِ غم سے بھی دل نہ جس کا گھبرائے

سکوں نصیب ہوں ارواحِ بیکساں جس سے
وہ رنگ روئے مروت جہاں نظر آئے

اسی کے پاس مجھے لے کے چل خدا کے لیے
جو خود تڑپ کے مری زندگی کو تڑپائے

یہی ہے شرح تلاشِ نگاہِ ارماں کی

▪▪▪

رباعیات

ذکرِ شیخ الاسلامؒ

شیخ العرب والعجم، بطلِ حریت، قائدِ تحریکِ آزادی، ولیٔ کامل

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ، سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

نتیجۂ فکر: ولی اللہ ولی قاسمی بستوی

استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

ضلع نندوربار، مہاراشٹر

حضرتِ مدنی حسینؔ احمد تھے اک مردِ جلیل
پاسباں ان کا رہا ہر موڑ پر ربِّ جلیل
زندگی ان کی فدا تھی دینِ حق کے واسطے
عاشقِ رحماں تھے وہ، محبوبِ باری کے خلیل

حضرتِ مدنی حسینؔ احمد تھے علّامِ زماں
اور تھے عہدِ رواں کے پارسا، پیرِ مغاں
خوشنما، خوش رنگ وزریں وہ شگفتہ پھول تھے
ناز فرماتا تھا جن پر گلشنِ ہندوستاں

مدتوں وہ نور ہے شیخ الحدیثِ دیوبند
مادرِ ہندوستاں کے وہ تھے ابنِ ہوش مند
وہ رہے ہیں قائدِ آزادیٔ ہندوستاں
وہ فرنگی آسماں پر بارہا ڈالے کمند

ان کی ہیبت سے فرنگی کا صنم خانہ ہلا
بحرِ ملت، بحرِ دیں، ان کا تھا کاشانہ قلعہ
عالمِ روحانیت کے وہ تھے دانائے سُبُل
سالکوں کو معرفت کا ان سے پیمانہ ملا

مسجدِ نبوی میں وہ دیتے رہے درسِ حدیث
عہدِ نو کے تھے مثالی ماہرِ علمِ حدیث
طبقۂ مودودیت پر تھے وہ قہرِ آسماں
نام سے ان کے تھا لرزاں فرقۂ اہلِ حدیث

حریت کے راستے کے قافلہ سالار تھے
خرمنِ برطانوی پر برقِ شعلہ بار تھے
دوستوں کے حق میں تو ریشم کی صورت تھے لطیف
دشمنوں کے واسطے وہ بے اماں تلوار تھے

ان کی ہستی ہوگئی ہے نازشِ تاریخ وسَن
ناز فرماتا تھا ان کی ذات پر چرخِ کہن

شیردل ، مردِ مجاہد ، غازیٔ کردار تھے
ہند میں زندہ کئے وہ قصۂ دار و رسَن

سینہ تانے توپ کے آگے کھڑے تھے بے خطر
آئے تھے اسٹیج پر سر سے کفن وہ باندھ کر

سر ہتھیلی پر لئے جاتے تھے مقتل کی طرف
دستِ قاتل میں مچلتے تھے وہ خنجر دیکھ کر

عزم و استقلال کے تھے شیخ وہ کوہِ گراں
پھیر لیتی تھیں وہ جس کو دیکھ کر رخ آندھیاں

بکریوں کی بھیڑ میں وہ تو رہے شیرِ یزَ
سامنے آنے سے کتراتی رہیں افرنگیاں

رزم گاہوں میں ہوا کرتے تھے وہ تیغِ رواں
پیش فرماتے رہے وہ زورِ حیدر کا سماں

وہ جسے لے کر چلے تھے قائدانہ رول میں
منزلِ مقصود تک پہنچا دیئے وہ کارواں

ان کی سانسوں سے بپا ہنگامِ دار وگیر تھا
ان کا ہر ہر لفظ دشمن کے لیے شمشیر تھا

تا دمِ آخر رہا ہے سینے میں عزمِ جواں
سرنگوں ہمت کے آگے ان کے، چرخِ پیر تھا

مختصر کہ ، تھے حسینِ وقت اک زندہ ولی
جن کی زیرِ رہنمائی ہم کو آزادی ملی

جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے اے خدا
صدق دل سے یوں دعا گو ہو گیا تیرا ''وَلی''

نظم

ذکرِ شیخ الاسلام

نتیجہ فکر: ولی اللہ ولی قاسمی بستوی

شیخِ اسلام ، شیخِ جہاں ، شیخِ فن
جن کی ہستی پہ اب تک ہے نازاں وطن

جان و دل سے فدا تھے وطن کے لئے — بہتریں باغباں تھے چمن کے لئے
بابِ زرّیں تھے تاریخ و سُن کے لئے — شیخِ کامل تھے اہلِ زمن کے لئے
گرم ان سے سیاست کی تھی انجمن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

تھے فدا خالقِ ذوالمننِ کے لئے — ایک مصلح تھے دورِ فتن کے لئے
موجِ علمی تھے گنگ و جمن کے لئے — اور سرخیل تھے اہلِ فن کے لئے
ان کی عظمت پہ قرباں ہے چرخِ کہن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

ان کے دل میں فروزاں تھی یادِ خدا — لب پہ ہر آں رہا ہے وردِ صلِ علیٰ
ملک و ملت کی خدمت تھے کرتے سدا — اور تقویٰ بدن کے لئے تھا عبا
عشقِ رحمان سینے میں تھا موج زن
شیخِ اسلام ، شیخِ جہاں ، شیخِ فن

ان کی ہیبت سے انگریز لرزاں رہے — نام سن سن کے اغیار ترساں رہے
وہ حوادث میں پھنس پھنس کے شاداں رہے — ان کے رستے سے طوفاں گریزاں رہے
یادِ مولیٰ کی دل میں لگی تھی لگن
شیخِ اسلام ، شیخِ جہاں ، شیخِ فن

ان کے عزم و ارادے کی تلوار سے — ظلم مٹتا گیا سارے سنسار سے
سامنے جو بھی آتے تھے خونخوار سے — بچ نہ پاتے تھے وہ بے اماں وار سے
صدق دل سے وطن کی تھے کرتے جتن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

ان کے جود و سخاوت کے گلزار سے — ان کے حسنِ عمل اور کردار سے

ان کے اخلاق و عادات و اطوار سے
ان کے جذبات و اخلاص و ایثار سے
خوشہ چیں سب رہے ساکنانِ وطن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

اسوۂ مصطفائی تھا کردار میں
سچ نمایاں رہا ان کی گفتار میں
ان کا چرچا رہا بزمِ اغیار میں
فصلِ گل تھے وطن کے چمن زار میں
ان کی الفت کا ظاہر رہا بانکپن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

مسندِ درس کو ان سے زینت ملی
نیک خو ہیں جنہیں ان کی نسبت ملی
ان سے بیعت کی جن کو بھی عزت ملی
ان کو روحانیت کی ہے دولت ملی
وہ رہے ہیں حوادث میں بھی خندہ زن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

قصرِ بدعت پہ تھے ایک برقِ تپاں
شیعیت کے لئے خنجرِ بے اماں
سر پہ مودودیت کے تھے کوہِ گراں
ان سے تھا دم بخود فتنۂ قادیاں
ذات ان کی رہی اک بھری انجمن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

وہ سیاسی، مدبر، خرد مند تھے
مالٹا قید خانے میں وہ بند تھے
جنگ کے معرکے ان سے دوچند تھے
ان سے انگریز کے ناطقے بند تھے
وہ فرنگی چمن پر تھے شعلہ فگن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

فیض ان کا رہا مثلِ بحرِ رواں
ان کی ہر سانس تھی موجۂ بیکراں
ان کی مجلس رہی نازشِ کہکشاں
حریت کے رہے رہبرِ کارواں
وہ زمانے میں تھے قاسمِ علم و فن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

اے خدا! سرخرو شیخِ اسلام ہوں
تیری رحمت سے وہ نیک انجام ہوں
ہے ''ولی'' کی دعا دور، آلام ہوں
روزِ محشر لئے ہاتھ میں جام ہوں
باغِ فردوس میں ہوں ہمیشہ مگن
شیخِ اسلام، شیخِ جہاں، شیخِ فن

باب تنظیم

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی

اشاعتی خدمات

حقانی القاسمی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندوستان میں احیاء وتجدید دین کیلئے جن کوششوں کا آغاز کیا تھا، انہیں منزل دیوبند کے وسیلے سے ملی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے انقلابی تجدیدی افکار کے ذریعہ ہندوستان کی سرزمین میں جو روح پھونکی ہے دیوبند نے اسی روح کی ترسیل تمام علاقوں میں کی۔ اسی طرح ولی اللہی فکر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور ہندوستان اس اسلامی فکر سے آشنا ہوا جو دراصل مساوات انصاف پر مبنی ہے۔ ولی اللہ تحریک کے فروغ میں دیوبند کو عالمی سطح پر شناخت میسر ہے۔

دیوبند نے برصغیر میں مختلف ذریعوں سے اسلامی احیاء کا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے مختلف ادارے، تنظیمیں اس سلسلے میں مصروف ہیں، دیوبند فکر کا ایک ترجمان آل انڈیا تنظیم علماء حق بھی ہے، جس نے بہت مختصر مدت میں قومی سطح پر اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کی ہے اس کے مقاصد میں جہاں جدید تقاضوں کے پیش نظر دینی مدارس، علمی مراکز اور عصری مکاتب کا قیام، مسلمانوں میں اعمال صالح، اخلاق حسنہ کی تعلیم وتربیت صحیح اسلامی عقائد کا فروغ، ملک کے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد و ہم آہنگی شامل ہیں وہیں اس کا ایک مقصد تحریروں کے ذریعہ ان افکار کا ترویج اشاعت بھی ہے، جن سے مسلمانوں کا اجتماعی روحانی ضمیر بیدار ہو۔ چنانچہ تنظیم نے اس تعلق سے اپنی کوششیں تیز کردی ہیں اور اشاعتی محاذ پر بھی یہ نہایت سرگرم ہے۔ تنظیم کو اس

بات کا احساس ہے کہ لٹریچر کے ذریعہ انسانی ذہن وشعور میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ تنظیم نے اپنا ایک نشرواشاعت کا شعبہ بھی قائم کیا ہے۔ جس کے تحت سہ ماہی ''حسن تدبیر'' جیسا موقر اور معتبر رسالہ شائع ہورہا ہے۔ سہ ماہی حسن تدبیر کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے اپنے دستور العمل کے مطابق اکابرین اہل حق کے فکر وعمل کی ترویج واشاعت کا کام بخوبی پورا کیا ہے چنانچہ اس تعلق سے حسن تدبیر نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی پر ایک دستاویزی شمارہ شائع کیا اور مولانا تھانوی کی حیات وخدمات کے حوالہ سے معتبر تحریریں شامل کیں۔ مولانا تھانوی کے افکار کو عام کرنے کے لئے اس شمارے کا ایک حصہ بھی مختص کیا گیا اس طرح حکیم الامت پر شائع ہونے والے کسی بھی رسالے کا یہ سب سے ضخیم اور اہم شمارہ ہے اس سے مولانا تھانوی کے تئیں لوگوں کی دلچسپی بڑھی۔ حکیم الامت کے علوم ومعارف کو عام کرنا بھی تنظیم کے منشور کا ایک حصہ تھا اس اعتبار سے اس نے یہ کام بھی کردکھایا۔ حکیم الامت کے بعد دوسری بڑی شخصیت جن کے اثرات ہمہ گیر ہیں وہ ہیں مولانا قاری محمد طیب حکیم الاسلام۔ سہ ماہی ''حسن تدبیر'' نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب پر ایک دستاویزی نوعیت کا خصوصی شمارہ شائع کرکے دیوبند کے اس نابغہ کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا بلکہ قاری محمد طیب کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں سے ان قارئین کا بھی تعارف کرایا جو ان سے کماحقہ واقف نہیں تھے۔ حکیم الاسلام کے بعد ''حسن تدبیر'' کا ایک خاص شمارہ محدث عصر مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کی حیات وخدمات پر محیط تھا دیوبند کے اس ادیب لبیب اور بے بدل خطیب کے حوالے سے یہ واحد ضخیم اور دستاویزی شمارہ تھا جس میں مولانا انظر شاہ کشمیریؒ جیسی عبقری شخصیت کی ملی، دینی، تصنیفی خدمات سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی اس طرح ''حسن تدبیر'' نے سلسلہ دیوبند کے ان تینوں اکابر کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل تحسین وتبریک ہے۔ ''حسن تدبیر'' نے اوقاف سے متعلق بھی ایک شمارہ شائع کیا جو یوں بھی اہمیت کے حامل ہے کہ آج اوقاف کی جو صورت حال ہے، اس سے بہت کم لوگ آگاہ ہے۔ ''حسن تدبیر'' کے شمارے اپنے محتویات اور مشمولات کے اعتبار سے بھی ذہن وفکر کے نئے دریچے کھولتے ہیں اور ہمارے منجمد احساس کو مرتعش بھی کرتے ہیں۔

تنظیم نے حسن تدبیر کے علاوہ بھی اپنی اشاعتی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں اور اس ذیل میں ''ذکر حرمین'' ''پیام رسالت'' ''الفرید المنضد علی شرح موطا امام محمد'' ''دار العلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ'' ''ریتو کے شہر میں'' قابل ذکر ہیں۔

اول الذکر کتاب ''ذکر حرمین'' مولانا محمد اعجاز عرفی کی کتاب ہے جو اس لحاظ سے نہایت اہمیت اور معنویت کی حامل ہے کہ اس میں حرمین شریفین کی اہمیت کے ساتھ ساتھ تعمیر کعبہ کی تاریخ اور بعد کے ایام میں حرمین شریفین میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ ''پیام رسالت'' میں حسن

کردار اور حسن معاملات کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ جب کہ الفرید المنضد میں دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا فریدالدین قاسمی نے حنفی اسلامی قانون کے مجموعہ موطا امام محمد کے ایک حصے کا ترجمہ اور تشریح کر کے طلبہ کے لئے آسانی پیدا کردی ہے۔

تنظیم علماء حق کی اشاعتی خدمات یقینی طور پر اس بات کا واضح اشارہ ہیں کہ یہ تنظیم متحرک ہے اور اس کی فعالیت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ تنظیم کے تفاعل اور حرکیت کا ثبوت وہ تمام مطبوعات ہیں جو وقتاً فوقتاً تنظیم کے زیر اہتمام منظر عام پر آتی رہی ہیں اور یہ اشاعتی سلسلہ یوں بھی قائم ہے کہ خود آل انڈیا تنظیم علماء حق کے صدر مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی علم وادب کا نہایت شستہ اور شائستہ ذوق رکھتے ہیں اور تنظیم کے دستور العمل کے تئیں مخلص اور وفادار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قومی، ملی، دینی اور تعلیمی صلاح وفلاح کی کل ہند تحریک آل انڈیا تنظیم علماء حق کا یہ اشاعتی سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو یقیناً آنے والے دنوں میں عالمی سطح پر اس تنظیم کی اپنی ایک منفرد شناخت ہوگی اور اسے دیگر تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ اعتبار و وقار بھی حاصل ہوگا۔ ■

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی

روشن خدمات

عابد انور

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ذہنی اور فکری جمود کو توڑا اور خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اسی تحریک کا ثمرہ ہے کہ ہندوستان میں اسلامی فکر کی ایک درخشاں روایت ہے، مگر آج اسلامی فکر کے ساتھ جو معاندانہ رویہ ہے ایسے میں ہماری ملی تنظیمیں ہی ہیں جو کسی حد تک ولی اللہی فکر کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

ایسے نازک حالات میں مسلم تنظیموں کا وجود بے حد اہم ہو جاتا ہے۔ مسلم تنظیمیں تو بہت ہیں لیکن اس تنظیم کا کردار اہم ہوتا ہے جو ایسے علاقوں کا انتخاب کرے جہاں وسائل کی قلت ہو تنظیم کا دروازہ دور دراز سے آنے والے طلباء، علماء اور مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ تنظیم علماء حق ان صفات سے متصف ہے۔ آل انڈیا تنظیم علماء حق کے زیر اہتمام ملی و قومی مسائل پر سیمنار، مذاکرے اور مباحثے اس کا ثبوت ہیں۔ تنظیم میں ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کی تشریف آوری اور ان کی طرف سے سند توصیف تنظیم علماء حق کی معتبریت کی دلیل ہے۔ امیر شریعت امارت شرعیہ بہار، واڑیسہ وجھارکھنڈ، مولانا سید نظام الدین، مولانا سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند، مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری، مولانا رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمان اعظمی، مولانا نور عالم خلیل الامینی، استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا آفتاب عالم ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، اور الحکمۃ امدایہ مکہ مکرمہ، مولانا عبدالکلام قاسمی مبلغ دارالعلوم دیوبند اور بہت سے

اصحاب وفضل وکمال نے اپنے تاثرات لکھ کر تنظیم کے تئیں حسن ایقان میں اضافہ کیا ہے۔

تنظیم علماء حق بین المسالک تفہیم وافہام کی کوشش کرتی رہتی ہے تاکہ مسلمانوں کا جو وقت بین المسالک تنازعہ میں ضائع ہو رہا ہے وہ دیگر تعمیری کاموں میں استعمال ہو سکے۔ تنظیم کا حسینی مزاج بھی اس کے تئیں اعتبار واستناد کی فضا ہموار کرتا ہے، اس تنظیم نے دیار جور میں جو راستہ دکھایا ہے اس راستے پر چل کر قوم کو منزل مل سکتی ہے۔

قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی قیادت میں آل انڈیا تنظیم علماء حق ملت کے تئیں اپنے فریضے کو انجام دینے میں مصروف ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم بن کر تمام طبقوں میں یکساں مقبول ہے۔

تنظیم جہالت دور کرنے کے لئے درجنوں مدارس ومکاتب کی سرپرستی کر رہی ہے اور اس کے تحت علم کی روشنی وہاں پھیل رہی ہے جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

تنظیم نے اشاعت دین، امت مسلمہ اور مسلم نوجوانوں میں بیداری پیدا کرنے، مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور ان میں دینی فکری، سیاسی، سماجی شعور پیدا کرنے کے لئے تصانیف وتالیف کا بھی سہارا لیا ہے۔

یہ تمام لوگوں تک پہونچنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مولانا اعجاز عرفی قاسمی تصنیف وتالیف کا بہترین ذوق رکھتے ہیں اور اہل علم کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے کثرت سے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ شعر وشاعری کا بھی عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ پندرہ روزہ ''دریافت'' بردوان اور سہ ماہی ''وقار'' کلٹی بردوان جیسے اہم رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری بھی بخوبی انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ''ذکر حرمین'' مومن کی معراج اور اسلام کا اہم رکن زکوۃ قابل ذکر ہیں۔ ان دنوں سہ ماہی ''حسن تدبیر'' کی ادارت کر رہے ہیں۔ سہ ماہی حسن تدبیر نے مختصر عرصے میں ناقابل فراموش، تاریخی، دستاویزی شمارے شائع کئے ہیں۔

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی مطبوعات:

ذکر حرمین:

مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی پہلی کتاب ''ذکر حرمین'' مسلمانوں کے لئے نہایت قیمتی تحفہ ہے کتاب میں حرمین شریفین کی فضیلت واہمیت اور تاریخ تعمیر کعبہ، حجر اسود، عہد نبوت، عہد امارت اور بعد کے دنوں میں حرمین شریفین میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی پوری تفصیل موجود ہے۔

پیام رسالت اصلاح معاشرہ کا پیغام:

اس میں منتخب احادیث کا ترجمہ اور اس کی تشریح ہے۔ جس میں مکارم اخلاق، حسن کردار اور حسن

معاملات سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔

الفرید المنضد علی شرح الموطا لامام محمد:

مولانا موطا امام محمد حنفی اسلامی قانون کا مجموعہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا فریدالدین قاسمی نے موطا امام محمد کے ایک حصہ کا نہایت آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ایسی تشریح کی ہے جو طلباء اور عوام الناس دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

دارالعلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ:

یہ کتاب اردو کے نوجوان صحافی، صاحب طرز ادیب اور منفرد نقاد حقانی القاسمی کی تصنیف ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں دیوبند کی ایک نئی شناخت کی جستجو اور فضلاء دارالعلوم دیوبند کی صحافتی، تنقیدی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

رینو کے شہر میں: یہ کتاب تصنیف کر کے حقانی القاسمی نے وطن کی مٹی کا قرض ادا کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے اس میں پورنیہ کمشنری کے تمام ادیبوں، صحافیوں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ پورنیہ کمشنری کے لئے بہترین خراج تحسین ہے۔ اس کتاب میں جہاں انہوں نے پرانے قلمکاروں کو جگہ دی ہے وہیں نئی نسل کے صحافی، ادیبوں اور شاعروں کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً چار سو صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ یقیناً حقانی القاسمی نے اس علاقے کی مٹی کے ذرے کو آفتاب بنایا ہے۔ یہ کتاب اس علاقے کے عظیم فکشن رائٹر پھنیشور ناتھ رینو کو بھی بہترین خراج عقیدت ہے۔

حکیم الاسلام نمبر:

سہ ماہی حسن تدبیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنا پہلا خصوصی شمارہ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب پر شائع کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا بہترین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں قاری طیب کی زندگی وخدمات کے تمام گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تمام بڑے قلمکاروں کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ یہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکیم الامت نمبر:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی پر ہندوستان میں شائع ہونے والا ضخیم دستاویز ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کو بالکل فراموش کردیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ان کی تصنیفات لوگوں کے دل ودماغ میں قندیل کی طرح روشن ہیں، لیکن ہندوستان سے سیکڑوں کی تعداد میں نکلنے والے رسالے میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ حقانی القاسمی نے عصری تعلیم یافتہ لوگوں میں مولانا تھانوی کو ایک ادیب، ایک نقاد کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ پاکستان میں مولانا تھانوی پر بے شمار کام ہوا ہے لیکن ہندوستانی علماء نے انہیں تقریباً فراموش کردیا تھا۔ مولانا اعجاز قاسمی نے مولانا اشرف علی تھانوی کے افکار وخیالات اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ اسی کوشش کے تحت سہ ماہی حسن تدبیر کا حکیم الامت نمبر شائع کیا گیا جس کی پوری علمی دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ اس خصوصی نمبر کے لئے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں نے مضامین لکھے۔ اس کا اجراء ایک کانفرنس میں مولانا تھانوی کے جانشین مولانا نجم الحسن تھانوی نے کیا۔

محدث عصر نمبر:

حکیم الامت نمبر کی رسم اجراء کے پروگرام میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ حسن تدبیر کا اگلا خصوصی شمارہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نمبر ہوگا اور اس کی تیاریاں بھی شروع کردی گئی تھیں لیکن ان کے صاحبزادے مولانا انظر شاہ کشمیری کی اچانک موت کی وجہ سے ارادہ بدل دیا گیا اور مولانا انور شاہ کشمیری کے بجائے مولانا انظر شاہ پر خصوصی شمارہ شائع کیا گیا۔ یہ نمبر سب سے ضخیم ہے۔ اس میں بھی بڑے بڑے قلمکاروں کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ مولانا انظر شاہ کشمیری پر یہ ایک بہترین دستاویز ہے۔ محدث کبیر مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ پر خصوصی نمبر کے لئے کام چل رہا ہے۔ ■

آل انڈیا تنظیم علماء حق کے صدر دفتر میں تشریف آوری پر ملک کے مشاہیر کے وقیع تاثرات

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری اور بہار واڑیسہ اور جھارکھنڈ کے امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین صاحب تنظیم کے صدر دفتر میں تشریف لائے اور معائنہ رجسٹر پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس عظیم ادارے کے مرکز میں حاضری کا موقع ملا تنظیم کے تعلیمی پروگرام اور اس کی نگرانی میں چلنے والے اداروں کی تفصیل دیکھی اور اس ادارے کے دوسرے تعلیمی اور اصلاحی پروگرام کی تفصیلات کا علم ہوا بڑا اچھا کام ہے اور سارے اکابر علماء کی سرپرستی اس ادارے کو حاصل ہے میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس اصلاحی تعلیمی ادارے کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچائے اور مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی صلاحیتوں اور ادارے کی برکات سے امت مسلمہ کو فیض یاب کرے! آمین

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے سابق استاذ اور جامعہ ام سلمہ کے ناظم مولانا آفتاب ندوی تنظیم کے دفتر میں اپنی تشریف آوری پر تحریر فرمایا کہ مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی سے پہلے سے تعارف ہے مگر تنظیم کی سرگرمیوں. مکاتب کی نگرانی ان کی اعانت اور دوسرے میدانوں میں ان کے کارناموں سے اندازہ ہوا کہ مولانا کو اللہ نے بڑی خوبیوں سے نوازا ہے، قوت عمل ایسی کہ مسلسل محنت اور طویل اسفار کے باوجود دیکھئے تو ہشاش بشاش اور آنے جانے والوں کا ہر وقت استقبال کے لئے تیار ہیں مختصر مدت میں دہلی جیسے شہر میں تنظیم کے لئے باقاعدہ ایک آفس کا نظم مولانا کی فکرمندی اور اپنے کام میں خلوص اور لگن کی دلیل ہے امید ہے کہ مولانا اعجاز عرفی قاسمی مدظلہ کی قیادت میں یہ تنظیم ملت کی مفید خدمات انجام دیگی اس طرح کے عزائم رکھنے والوں کا ہر طرح کا تعاون

کیا جائے۔

ترجمان دیوبند کے ایڈیٹر اور ملک کے مشہور صاحب قلم مولانا ندیم الواجدی کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے دار العلوم دیوبند کے فضلاء میں ایک سے بڑھ کر ایک فعال مخلص اور ہمہ جہت شخصیتیں پیدا کی ہیں بسا اوقات جب ان کے کارنامے مشاہدے میں آتے ہیں یا کہیں کچھ ان کے بارے میں پڑھنے یا سننے کو ملتا ہے تو بے اختیار سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے ایسی ہی شخصیتوں میں سے ایک ہیں ہمارے مخلص دوست اور عالم حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی موصوف دار العلوم دیوبند کے نوجوان فضلاء میں سے ہیں لیکن اپنی ہمہ گیر جدوجہد سے انہوں نے صف اول کے علماء میں اپنا مقام بنالیا ہے۔

اس تنظیم کا دائرہ کار دہلی کے علاوہ بہار و بنگال، جھارکھنڈ اور اتر پردیش کے دور افتادہ قصبات اور شہروں تک وسیع ہے اللہ تعالیٰ حضرت مولانا اعجاز عرفی کا عزم جواں اور حوصلہ بلند رکھے وہ تن تنہا ایک بڑا ادارہ بن کر کام کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی بدولت آج علم دین کی شمع روشن ہے جو تاریکی میں اجالے بکھیر رہی ہے۔

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب کے خلیفہ مجاز، مجلس دعوت الحق ہردوئی کے حضرت مولانا عبد الرؤف سنسار پوری نے معائنہ رجسٹر میں ارقام فرمایا کہ تنظیم علماء حق دہلی کے صدر دفتر میں حاضری کا موقع ملا اور مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی سے ملاقات ہوئی اور تنظیم کی ملی خدمات سے واقفیت ہو کر مسرت ہوئی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تنظیم کو شرور و فتن سے محفوظ رکھیں اور ترقیات سے نوازیں۔

مشہور داعی اسلام حضرت مولانا کلیم صدیقی نے معائنہ رجسٹر پر اپنے مبارک کلمات اس انداز میں ثبت فرمائے کہ ایک زمانے سے تنظیم علماء حق اور اس کے کارناموں کی تفصیلات سامنے آرہی ہے احقر کی خواہش تھی کہ تنظیم کے دفتر کی زیارت کی سعادت حاصل کرے یہ دیرینہ خواہش پوری ہوئی مولانا اعجاز عرفی قاسمی کو اللہ تعالیٰ نے جو کام کا سلیقہ عطاء فرمایا ہے وہ ہر آدمی خصوصاً خدام دین کے لئے سیکھنے کی چیز ہے اس تنظیم کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور ہم سب کے لئے قابل قدر ہے اللہ تعالیٰ اس کو مزید ترقیات سے ہمکنار فرمائے۔

جامعہ مظاہر العلوم (وقف) سہارنپور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عثمان غنی اور دار العلوم (وقف) دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا فرید الدین قاسمی کے مشترکہ تاثرات حسب ذیل ہیں۔ 31/3/2008 کو تنظیم علماء حق کے صدر دفتر میں حاضری کا موقع ملا جس تنظیم کے بانی مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی ہیں جو نہایت فعال اور متحرک انسان ہیں موصوف کی فعالیت و تحریک سے مختلف ارباب قلم کی تخلیق معرض وجود میں آئی جو موصوف ہی کا امتیاز ہے نادار طلباء کے ساتھ ہمدردی اور ملی مسائل کی خاطر تگ و دو آنجناب کی خاصیت ہے

آپ کے حسن کردار اور حسن اخلاق سے بڑی تعداد مانوس ہے نیز آپ کی فیاضی بھی بحمداللہ لائق صد تحسین ہے۔
دارالعلوم دیوبند کے قاری ابوالحسن صاحب اعظمی جوفن تجوید پر سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کا تاثر یہ ہے کہ ہر دور میں علماء حق نے امت مسلمہ کا حقیقی اور قائدانہ رول ادا کیا ہے اسی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر تنظیم علماء حق کا قیام عمل میں آیا اس تنظیم کو مؤثر بنانے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کرنے کے لئے کسی تجربہ کار اور مضبوط شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے مجھے امید ہے کہ مولانا اعجاز عرفی قاسمی اس کے لئے بہتر ثابت ہونگے بلاشبہ یہ خاصان خدا کی دعاؤں اور مولانا اعجاز عرفی قاسمی کا کمال بلکہ توفیق خداوندی کا مظہر ہے کہ تنظیم علماء حق کی خدمات اور مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی جدوجہد کو سراہتے ہوئے ان مشاہیر علماء کرام میں حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی، حضرت مولانا سلمان صاحب ناظم جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی، حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب گجرات، حضرت مولانا اسرار الحق قاسمی، حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی، مفتی عبدالخالق سنبھلی، مولانا اصغر امام مہدی سلفی، حضرت مولانا سید جلال الدین عمری اور دیگر بہت سے علماء کرام ہیں۔ ■

PROLOGUE

Azhar Waqar

The Muslims all over the world today, are victims of torments and troubles. The Ummah is grappling with numerous problems and afflictions. Muslim minorities are being butchered and pushed to the edge of the cliff everywhere. Concerted and sustained efforts are being made to wipe out our mosques and places of worship completely. Our Madrasas and centers of learning that had been the hot bed of nationalist activities in the pre-Independence era are being undeservingly classified as breeding grounds for terrorism. Further, the descendents and clan-members are termed as traitors in their own land. The Muslim community is being subjected to brutal assaults. In the continuance of a hate campaign against the Muslims, the media has played an 'indispensable' role by portraying a skewed image of the Muslims. The word "Muslim" seems to have been made synonymous with tyranny and violence. A comprehensive all-out plan is being chalked out to implicate them with different types of accusations in the pretext of fake incidents and inconceivable stories. The whole country is determined to be pained in just one colour - saffron. A planned motive is underway to erase and eliminate the Islamic identity and its relics and individual efforts to seek protection from the hate trade and zealous campaigns launched by the zealots become highly ineffective in a democratic set-up. Thus, arises the need for a collective struggle in a constitutional and democratic framework. In the quest of giving this concept of struggle a practical shape, the organization All India Tanzeem Ulama-e-Haq has come into existence. It is proactively keen upon rendering its aims and objectives in a committed manner with the good wishes of its members and well wishers, besides by being energized with their continuous support and prayers.

"The prevailing situation in the country has compelled the Ulama to come out of the Madrasas and monasteries and take over the reins of leadership of the

Muslims. Obviously, it calls for a base, platform or organization to exist under whose banner the individuals may pool up." Allah, the Almighty has chosen Maulana Mohmmad Ajaz Urfi to established an organization for dissemination the message of Allah, which would comprise Ulama and intellectuals. Therefore, an organization by the name, "All India Tanzeem Ulama-e-Haq" was founded. It is based in Delhi and a large number of scholars are being attached with it. By Allah's grace, the All India Tanzeem Ulama-e-Haq has rendered unparalleled services in a very short span of time. Today, nearly 45 schools and 19 Madrasas are functioning all over the country under its able supervision. Under the far-sighted leadership of Maulana Mohammad Ajaz Urfi Qasmi, these institutions are being well-guided and nurtured financially, academically as well as constructively.

By the grace of Allah, the All India Tanzeem Ulama-e-Haq has its own headquarters in Delhi, where adequate arrangements have been made for the boarding and lodging of the Ulama visiting the place from different parts of the country. Scholarships and stipends are being given to the students, studying in madrasas and universities.

The Islamic history of India is illuminated hv such immense contributions like the academic endeavors of Shah Waliullah after the decline of the Mughal empire, the Fatwah of jehad issued by Shah Abdul Azeez, the great sacrifices made by Ulama during the struggle for independence under the leadership of Shaikh-ul-Hind as well as their vital contributions and constructive efforts for the progress and betterment of the Millat and the country during the post-Independence era. The present situation beckons them once again. The scholars need to re-dedicate themselves and go on a war footing to maintain harmony in the Millat and a peaceful atmosphere in the country in the midst of a highly virulent communally charged environment. They are required to comprehend the need and vitality of this organization and come forward to enrich and strengthen this organization for welfare and betterment, so that its impact can be felt amongst the common people, a sense of belongingness and sensitivity towards the cause of the Ummah may arise and we may be able to succeed, at least to some extent, in weaning away our future generations from the concepts of infidelity and notions of polytheism. (Ameen!)

AIMS & OBJECTIVES OF TANZEEM ULAMA-E-HAQ

- Education of the Holy Quran with "Tarteel and Tajweed";
- Dissemination of the holy Traditions of the Prophet (SAW);
- Dissemination of the true Islamic beliefs which form the basis of the ideology of "Ahl-e-Sunnat-wal-Jammat";

- Establishment of religious madrasa, academic institutions and modern schools in view of the contemporary challenges.
- To impart education and training for instilling good moral values and positive spirit amongst the Muslims.
- To strive for abolition of non-Islamic rites and rituals prevalent in the society by introducing reforms.
- To thwart the onslaught of the ideologies of the movements having nefarious designs against the Muslims.
- To preach and spread the ideologies and activities of greet Ulama-e-Haq of yore.
- To popularize the esteemed thoughts and ideology of the great source of enlightenment, Hazrat Maulana Ashraf Ali ThanviR.
- To safeguard the religious Madrasas and Milli institutions from onslaughts and attacks.
- To take due care of the needy Ulama and poor students and to arrange scholarships for them.
- To provide moral support and extend all kinds of financial help possible to the orphans, widows and people affected by different calamities.
- To establish contacts with the justice-loving citizens and to bring about cohesion and consensus among people belonging to various groups in the country.

A Reliable Voice

Tanzeem Ulama-e-Haq has been rendering wholehearted service with utmost silence in a particular area for a considerably long period of time. By the grace of the Almighty, a lot of work was carried out. Looking at the developments, when a few far-sighted people analyzed its multidimensional impact, they asked Moulana Mohammad Ajaz Urfi Qasmi is a person having a spiritual temperament, a Sufi by heart, a successful businessman, a well-wisher with hospitality deep embedded in him, handsome as well as virtuous, a man of great love and humility with no desire for leadership at all, a person with a deep rooted ambition to serve the mankind, one who is fully-resolved to fulfill his tasks and accomplish his mission without getting diverted by criticism, a person with a soft heart and kind soul who goes all-out to the poor and the needy, a staunch follower of Sunnah, spending nights in the remembrance of the Almighty and above all a human being par excellence. Somehow, by Allah's grace, he became ready to take the task ahead head-on and came out in the battlefield. We thank Allah for the same.

He arranged for an office in a suburb of Delhi for the organization and set forth on his mission with renewed zeal. Many a Madrasas, which had been closed, started functioning after the respected Maulana came to the scene, while the Madrasas on shaky grounds started getting sustenance and became alive

and agile. By the grace of Allah, the Spartan and striving life as well as the purity and genuineness of the approach of respected Maulana Ajaz Urfi shall deliver results Insha Allah. We pray Allah to make this organization an instrument of uniting and integrating our scattered and dispersed existence into a composite whole.(Aameen)

Wassalam
Syed Abul Kalam Qasimi
HeadPreacher
DarUloom Waqf
Deoband-247554

Impressions and Recommendations of Celebrities

Maulana Mohd. Salim Qasmi
Rector, Darul Uloom (Waqf),
Deoband.

" It is the duty of the right thinking people, who believe in justice,democracy and communal harmony to come forward and strengthen the hands of Maulana Mohammad Ajaz Urfi Al-Qasmi by contributing their might to the Tanzeem-Ulama-e-Haq."

Maulana Muzaffar Husain Al-Mazahiri
Administrator-cum-Custodian
Madrasa Mazahir-ul-Uloom(Waqf)
Saharanpur

" Tanzeem Ulama-e-Haq is an esteemed organization for the propagation of Islam, dissemination of Islamic teachings and yeoman services for the community and the nation I earnestly appeal to the entire Ummah to extend their wholehearted financial as well as moral support to the Organization."

Maulana Fuzail Ahmad Qasmi
General Secretary, Markazi Jamiat-e-Ulama-e-Hind
Member Court- Aligarh Muslim University, Aligarh

" Allah, the Almighty, has blessed Maulana Mohammad Ajaz Urfi Qasimi to lay the foudation of an organization of Ulama and intellectuals, to disseminate the Message of Allah. By the grace of Almighty, such an organization, was subsequently, established by the name of " All India Tanzeem Ulama-e-Haq" having its head office in Delhi. A large number of Ulama are associating themselves with the noble cause... The ever-increasing magnitude requires the

attention of generous people to extend their valuable co-operation to the organization."

Mufti Shakeel Ahmed Sitapuri,

Dar-ul-Uloom Islamiah, Basti

" The General Secretary of Tanzeem Ulama-e-Haq is well-known amongst the Deoband-Circle for his polite manners and civility. May Allah bliss him and his organization. May Allah divert the attention of philanthropists academic luminaries towards the Organization."

Maulana Mohammad Arshad Farooqui

Faculty, Mazahir-ul-Uloom(Waqf),

Saharanpur

" Maulana Ajaz Urfi, the General Secretary, besides being an active and agile man is one of the favorite disciples of Maulana Syed Anzar Shah Masoodi and the confidante of Maulana Mohammad Salim. Moreover, Hazrat Maulana Hakim Akhtar Sahib (Pakistan) has chosen him as his spiritual successor. It was, in itself, a rare gesture shown by the revered Maulana. May the Allah strengthen this movement so that it thwarts the onslaught of the people having nefarious designs against Islam and the Muslims.

AN EARNEST APPEAL

Kindly do spend a few moments for the deprived and oppressed millat. Do try to understand the preciousness of the situation.

Join us, be a part of this selfless movement. Please, extend your wholehearted moral as well as financial co-operation to the movement.

ARISE, AWARE AND ACT

Since any procrastination could be fraught with irreparable damages.

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ (REGD.)

Q-25, Alsamad Road, Batla House,Jamia Nagar, New Delhi - 25

Tele-fax: 011-26985943

A/C No.: 004601053825, ICICI Bank

دکتور رفرقان مہربان علی المدنی کی تالیف:
"توحید وسنت کے لئے قربانیوں کی ایک جھلک"
پر تبصرہ

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی
صدر آل انڈیا تنظیم علماحق دہلی

الحمد للہ ربّ العالمین والصلوٰة والسلام علی امام الأنبیاء والمرسلین وخاتم النبین وعلیٰ آله وصحبه اجمعین. امابعد.

مولانا ڈاکٹر فرقان مہربان علی المدنی ہندوستان کے جید اور باوقار عالم دین ہیں۔ انہوں نے اپنے وقت کے نامور علمائے دیوبند کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے، طالب علمی کے زمانے میں بھی ان کا شمار دارالعلوم کے چیدہ، سربرآوردہ، ممتاز اور متحرک طلبہ میں ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں شہید علم وجستجو اور قتیل فن وتحقیق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کی رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی ان کے اندر حصول علم کا شوق دوآتشہ رہا اور اس شوق اور علمی تشنگی کے احساس نے انہیں اس قدر مہمیز کیا کہ وہ گلشن علم وادب مکہ اور مدینہ کی سرزمین میں فروکش ہوگئے۔ وہاں سے انہوں نے اعلی تعلیم (پی ایچ ڈی) کی نہ صرف ڈگری حاصل کی، بلکہ اپنی تمام علمی وتحقیقی اور تصنیفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، اپنے نوک قلم کی جولانی بھی دکھاتے رہے۔ ان کی یہ جولانی قلم عربی اور مادری زبان اردو، دونوں میں جاری رہی۔ یہ سلسلہ اب بھی بڑے اہتمام اور پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ وہ قصہ قدیم وجدید کو دلیل کم نظری باور کرتے ہیں، یہی سبب ہے کہ قدیم وجدید ہی نہیں، بلکہ موجودہ سائنٹفک عہد کے جدید ترین مراجع ومصادر پر بھی ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ فاضل مصنف کی طرح ایک کامیاب اور باکمال مدرس، وسیع المطالعہ اہل قلم اور مقبول ومحبوب مقرر کو ان اوصاف کا مجموعہ ہونا ہی

چاہئے۔ اب تک ان کے زرخیز قلم سے درجنوں علمی اور تحقیقی شاہکار طبع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں اور ہندو بیرون ہند خصوصاً عالم عرب کے علمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں سے تحسین و تبریک پر مشتمل کلمات وصول کر چکے ہیں۔ مولانا کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات کو اس قابل رشک جذبے کے ساتھ قلم و قرطاس کے حوالے کرتے ہیں کہ نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پروا۔ بسا اوقات حق گوئی کا مرحلہ آگ کے دریا کو عبور کرنے کے مترادف ثابت ہوتا ہے، مصلحتیں دامن تھام لیتی ہیں، حالات کی ستم ظریفی راستہ روک لیتی ہے، لیکن مولانا فرقان مدنی نے حق کے برملا اظہار میں مصلحتوں، ذاتی مفادات اور منہ بھرائی جیسے مروجہ امراض سے اپنے قلم کو آلودہ ہونے سے بچائے رکھا ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''توحید و سنت کے لئے قربانیوں کی ایک جھلک'' بھی مولانا فرقان مدنی کے اشہب قلم سے نکلنے والے دستاویزی مضامین اور تحقیقی نگارشات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مشمولات کا تعلق مبارک و مسعود سرزمین سعودی عرب اور وہاں کی دعوتی و اصلاحی تحریکات اور وہاں کے دین پسند مصلحین سرگرم عمل دعاۃ مجددین علمائے اسلام کی خدمات سے ہے۔ دراصل اس کتاب کی تالیف کا خاص محرک سعودی عرب کے اٹھارھویں صدی کے نامور مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ/۱۲۰۶ھ-۱۷۰۳ء/۱۷۹۲ء) کے خلاف ہندوستان کے مبتدعین اور اہل تشیع کی طرف سے کئے جانے والے وہ بے بنیاد اور تعصب آمیز اعتراضات اور افتراءات ہیں، جن کے مدلل اور مبرہن جوابات اس کتاب میں موجود ہیں۔ اسی طرح یہ مضامین بعض مسلم دشمن سیاسی حلقوں کی طرف سے سعودی عرب اور عالم اسلام کے دین پسند حلقوں کے اوپر لگائے جانے والے ان الزامات کے جواب بھی ہیں کہ عربی مدارس اور وہاں کی جامعات میں انسانیت مخالف اذہان پرورش پا رہے ہیں، وہاں کی حکومت نہ صرف دہشت پسند اذہان، بنیاد پرست افکار اور انتہا پسندانہ نظریات کو محفوظ پناہ گاہ دیتی ہے، بلکہ وہ ان کی مالی، اخلاقی اور سیاسی مدد میں بھی کسی تذبذب کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ زیر نظر کتاب میں صحیح اسلامی عقائد کی تشریح، شرک و بدعت کی وضاحت، سعودی عرب کی توحید و سنت اور رد بدعات کے میدان میں خدمات اور باطل فرقوں کی طرف سے اہل سنت والجماعت پر بے جا اعتراضات کا بھی اسلامی میزان میں نوٹس لیا گیا ہے۔ مولانا فرقان مدنی نے خاص طور سے مصلح وقت شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی خالص قرآن و سنت پر مبنی اصلاحی تحریک کا تاریخی اور تحقیقی جائزہ لیا ہے، جس پر بی جے پی کے ایک لیڈر رام جیٹھ ملانی نے ایک کانفرنس (منعقدہ ۲۰ نومبر ۲۰۰۹ء) میں یہ الزام لگایا تھا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے دہشت گردانہ ذہنیت پیدا کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ جس الزام کے نتیجے میں اس کانفرنس سے سعودی عرب کے سفیر عالی جناب فیصل حسن طراز نے بھی واک آؤٹ کر دیا تھا۔ حالانکہ رام جیٹھ ملانی کے

اس الزام کے جواب میں ہندستان کے اسلام پسند حلقوں، ملی تنظیموں اور تعلیمی اداروں کی طرف سے زبردست احتجاج کیا گیا تھا، مذمتی قراردادیں پاس کی گئی تھیں، لیکن یہاں کے بدعتیوں اور شیعہ حضرات نے سعودی عرب اور شیخ نجدی کی صاف ستھری شبیہ کو مجروح کرنے کے لئے رام جیٹھ ملانی کے بیان کی تائید میں آسمان سر پر اٹھالیا اور اپنے ذاتی اور عقائدی اختلافات کی پرخاش میں اندرون خانہ اس قدر تہہ وبالا اور بے تاب ہوتے رہے کہ خدا کی پناہ۔ علمائے اہل سنت کی تشویش کو صحیح قرار دیتے ہوئے مولانا فرقان مدنی نے بھی برصغیر کے اردو اخبارات میں اس کے جواب اور سعودی عرب کی خدمات کے اعتراف میں مضامین لکھے تھے۔ مولانا فرقان مدنی کے پاس سعودی عرب کے سیاسی حالات اور وہاں کے اسلام پسند حلقوں کے ساتھ طویل رفاقت کا تجربہ رہا ہے۔ اس لئے بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ تجربات کی روشنی میں لکھا ہے۔ دیدہ، شنیدہ پر سبقت لے جاتا ہے۔ چوٹ سیدھی پڑی اور ڈکتور فرقان کی ان تحریروں کے منظر عام پر آنے کے بعد مخالف خیمے میں نہ صرف ہل چل مچ گئی، بلکہ انہیں اپنی بے لگام اور فتنہ پرداز زبان پر لگام لگانی پڑی۔ جب سارے حالات تازہ تھے، یہ کتاب منظر عام پر آگئی تھی، لیکن اب جب کہ کتاب کی دوبارہ اشاعت کا موقع آیا، مولانا موصوف نے اپنے وسعت مطالعہ اور دستیاب مصادر ومراجع کی روشنی میں نہ صرف شیخ محمد بن عبدالوہاب کے حالات زندگی اور اصلاحی وتجدیدی میدانوں میں ان کے نقشہائے رنگارنگ کو حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے، بلکہ کتاب وسنت کے فروغ اور امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے حوالے سے سعودی حکومت نے جو لازوال کارنامے انجام دیے ہیں، ان پر بھی تاریخی حوالوں سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جس طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے کتاب وسنت کے اتباع اور اس کی عالمی دعوت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا، اسی طرح فاضل مصنف نے بھی انہی خطوط پر اسلام کی داعیانہ تعلیمات اور سعودی عرب کی دعوتی خدمات اور قرآن وسنت کی اشاعت میں اس کی گراں قدر کوششوں کو سراہنے اور اسلام کا صحیح تصور عالم انسانیت کے سامنے پیش کرنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔

اس ضمن میں انہوں نے بہت سے دوسرے علمی تحقیقی بڑے مفید مقالے بھی شامل کتاب کردیے ہیں، جن میں صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور دوسرے علمائے سلف کے عقائد کے بارے میں بھی اعتدال پسندانہ اور محققانہ معلومات سپرد قرطاس کی ہیں۔ کتاب کے چند اہم عنوانات یہ ہیں: ''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ولادت: ۱۱۱۴ھ وفات: ۱۱۷۶ھ) کی اتباع کتاب وسنت کی تاکید اور تعصب فی التقلید کی مذمت'' (ص ر ۴۷) ''توحید وسنت کے نشر میں محدث البانی کا شیخ محمد بن عبدالوہاب، سعودی علماء اور سعودی حکومت کی خدمات کا اعتراف'' (ص ر ۱۲۰) ''سعودی حکومت نے ہمیشہ دنیا کو امن وسلامتی کا پیغام دیا ہے''

(ص/۱۲۱) ''سعودی عرب کے بارے میں افتراپردازی کا جواب'' (ص/۱۳۵) ''توحید وسنت اور امن و سلامتی کے نشر کے لیے سعودی حکومت کا قیام'' (ص/۱۹۷) ''مشہور امریکی مؤرخ لوتھرپ اسٹورڈ کے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے زمانے کے حالات اور ان کی اصلاحی تجدیدی تحریک کے بارے میں منصفانہ اور حقائق پر مبنی تأثرات'' (ص/۲۲۴) ''رسول اکرم ﷺ کی نافرمانی ہلاکت کا باعث ہے'' (ص/۲۳۹) ''تقلید کے بارے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کا معتدل موقف'' (ص/۳۶۵) سے ہی مولانا کے وسعت مطالعے اور اس کتاب کی اشاعت کے تعلق سے ان کی جدوجہد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے بیش تر مشمولات میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو آشکارا کیا گیا ہے کہ کتاب کا شان نزول ان کی شخصیت کے تعلق سے مخالفین کی بدتمیزی اور اہل سنت والجماعت کے خلاف فرقہ پرستانہ ذہنیت کی حمایت تھا۔ ''بات سے بات نکلتی ہے'' کے مصداق، درمیان میں سعودی عرب کی خدمات اور علمائے ہند اور رہنمایان ہند کا سعودی حکومت کے ساتھ برادرانہ اور خیر سگالی پر مبنی تعلقات کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

حالاں کہ یہ اخباری مضامین ہیں، مگر اس میں بھی مولانا نے حوالوں کا التزام کیا ہے، جو ان کے محققانہ عرفان، ان کی صدق مقالی اور استناد پر مبنی اسلوب کی غمازی کرتا ہے۔ کتاب کے مضامین اور بدعات و شرکیہ خرافات کی تردید میں لکھے گئے ان کے مضامین میں وہی دینی جذبہ، فکری صالحیت، نظریاتی اعتدال اور اسلامی جوش نظر آتا ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریروں اور ان کے جذبۂ ایمانی سے مترشح ہوتا تھا۔ کتاب وسنت کے دامن کو مضبوطی سے تھامنے کی جو دعوت شیخ نجدی نے دی تھی، اسی دعوت کا نمایاں نقش فاضل مصنف کے دعوتی مشن پر مرتسم ہے۔ انہوں نے علمی، سیاسی، حالات حاضرہ، احادیث و قرآن، تاریخی واقعات، بین الاقوامی ہنگاموں غرض جس مضمون پر بھی اپنے قلم کو حرکت دی ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہندی نژاد ہونے کے باوجود ان کی عربی تحریروں پر خالص عربیت کا گمان ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ ہنر طویل ریاضت اور ذہنی مشقت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ بے غوطہ زنی اتھاہ سمندر سے گنج و گہر کیسے میسر آ سکتا ہے؟

پوری کتاب ۷۰۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، طباعت بھی دیدہ زیب ہے، کاغذ بھی نسبتاً معیاری ہے۔ کتاب کی ضخامت کا سبب یہی ہے کہ فاضل مصنف نے اکثر مضامین کو عربی کا قالب بھی عطا کر دیا ہے، تاکہ علمائے سعودی عرب اور حکمائے سعودی عرب بھی اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلانے والے ان نام نہاد مسلمانوں کی ہرزہ سرائیوں سے واقف ہو سکیں۔ جن میں شیعہ حضرات اور اہل بدعت پیش پیش ہیں۔ فی زمانہ کتاب کے مشمولات کی افادیت اور اسکی ہمہ گیریت کی بنیاد پر امید کی جاتی ہے یہ کتاب علم پرور اور سعودی دوست حلقوں میں انشاء اللہ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

جامعہ مدنیہ سبل پور پٹنہ

تعارف، خدمات، عزائم

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد دہلی اجڑی، اور اس کی سیاسی بساط الٹ گئی، تو دہلی کی مرکزیت بھی ختم ہوگئی اور اسلامی شان وشوکت کا چراغ گل ہوگیا، چنانچہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے، اوران کی ملی شیرازہ بندی کیلئے ۱۸۶۶ء میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، اوران کے رفقاء خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن، اور حاجی محمد عابد صاحب نے دہلی کے بجائے دیوبند میں چھتہ مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم دیوبند کے نام سے ایک اسلامی درسگاہ قائم فرمایا۔ اس کے قیام کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھ گیا۔

صوبۂ بہار: دیگر صوبوں کی طرح صوبہ بہار میں بھی ہزاروں مدارس اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، جہاں پر قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں گونجتی ہیں، اور امن وامان کا درس دیا جاتا ہے، یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ نہ صرف دین کے داعی اور مبلغ ہوتے ہیں؛ بلکہ پورے ملک میں خیر خواہی، ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انہیں مدارس وجامعات میں۔ صوبہ بہار کا مشہور ومعروف علمی ومرکزی درسگاہ جامعہ مدنیہ سبل پور پٹنہ بھی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ کی صدارت میں انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں صوبائی سطح پر تعلیمی بورڈ کو متحرک وکامیاب بنانے کے لئے ایک جمہوری کنونشن منعقد ہوا، جس میں کافی غور وخوض ہوا، مزید کارآمد بنانے اور صوبہ بہار میں تعلیمی ترقی اور تعلیمی بیداری لانے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کو ریاستی، دینی، تعلیمی بورڈ بہار وجھارکھنڈ کا صدر منتخب فرمایا۔ آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت فدائے ملت کے ایماء واشارہ پر صوبہ بہار کے تمام اضلاع کا دورہ کیا، اور نونہالوں کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کے لئے مکاتب ومدارس کا سلسلہ قائم فرمایا۔ ۱۹۸۷ء میں پہلا مکتب دفتر جمعیۃ علماء بہار عالم گنج میں حضرت امیر الہند فدائے ملت سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ کے دست مبارک سے شروع کیا گیا، جس کے معلم اول اپنے برادر

عزیز حافظ محمد سالم صاحب اپنے شاگرد حافظ محمود حفظ الرحمٰن چمپارنی کو فی سبیل للہ تعلیم وتربیت کیلئے مامور کیا یہ دونوں ہی پاپیادہ اور سائیکل سے جاکر تعلیم دیا کرتے تھے، تقریباً سو ۱۰۰ ارطالب علم محلّہ سے دینیات حاصل کرنے کیلئے آتے تھے۔ شہر پٹنہ جو علم وادب کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود یہاں پر اکابرین دیوبند کے مطابق کوئی علمی، ومرکزی ادارہ نہیں تھا، جس کی ضرورت کافی دنوں سے محسوس کی جارہی تھی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا، عالم گنج میں مکتب کا افتتاح کے وقت حضرت مولانا سید اسعد صاحب نوراللہ مرقدہ سے گذارش کی ''کہ پٹنہ میں ایک دینی ادارہ ہونا چاہیے'' آپ نے فرمایا: ''ابھی نہیں، پٹنہ کی زمین خشک ہے''۔ حضرت فدائے ملّت کا دورہ صوبہ بہار کے ضلع گیا شیرگھاٹی میں تھا، مولانا محمد قاسم اپنے تلمیذ مولوی طاہر کے ساتھ حضرت مولانا قاری فخرالدین سے سفارش کے لئے گیا روانہ ہوئے اور تقریباً ۱۱ ربجے رات مدرسہ قاسمیہ پہنچے، حضرت قاری صاحب مدرسہ کے برآمدہ میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، سلام ومصافحہ کے بعد قاری صاحب نے پوچھا ''کھانا کھالئے ہو؟ تو مولانا نے کہا: جی۔ قاری صاحب نے دریافت کیا؛ کس غرض سے آئے ہو؟ مولانا نے کہا؛ میرا جی چاہتا ہے کہ شہر پٹنہ میں ایک دینی ادارہ قائم کیا جائے، قاری صاحب نے برجستہ کہا؛ کہ بڑے بڑے اکابر نے یہ سوچا تھا'' یہ کہتے ہوئے فرمایا؛ بتاؤ اکابر کون تھے؟ مولانا نے کہا: ''عطاء اللہ شاہ بخاری'' تو آپ نے فرمایا: بے وقوف! عطاء اللہ شاہ بخاری ہمارے اکابر ہیں، اور آگے بڑھو، مولانا خاموش تھے، پوچھا سلم العلوم کے مصنف کون تھے؟ مولانا نے کہا؛ مولانا محب اللہ بہاری، قاری صاحب نے کہا؛ انہوں نے بھی ارادہ کیا تھا؛ لیکن نہیں ہوسکا، میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اللہ نے یہ کام تمہاری (مولانا کی) قسمت میں رکھا ہے، یہ کام تم سے لے گا؛ مولانا نے عرض کیا دعاء کریں، اور دعاء لے کر تقریباً ڈیڑھ بجے سلام ومصافحہ کرکے واپس ہوئے دوسرے دن اخبار میں دیکھا کہ حضرت کا انتقال ہوگیا ہے ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' بہت افسوس ہوا، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطاء فرمائے۔ پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دامت برکاتہم نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم سے مشورہ کیا، تو مولانا موصوف نے فرمایا؛ اگر مدرسہ قائم کرنا ہے تو اس کے لئے کم ازکم ۱۶ رکٹھہ زمین ہونی چاہئے، انکے حکم پر حضرت نے اس کے بعد جگہ کی تلاش شروع کردی، گردش لیل ونہار کے بعد حضرت مولانا دامت برکاتہم کی نگاہ مقام ''سبل پور'' میں ایک پچاس کٹھہ زمین پر پڑی، جو ویران پڑی ہوئی تھی، گائے، بیل، بھینس، کا مسکن تھا، غلاظتوں کا انبار تھا، اس کے نگراں '' جناب جسٹس خلیل احمد مرحوم اور جناب جمیل احمد مرحوم ایم ایل اے'' کے صاحبزادگان جناب سمیع احمد صاحب اور انجینیر امیرالدین صاحب ہیں۔

حضرت مولانا کی ملاقات موجودہ محافظ ونگراں جناب سمیع احمد ابن جناب جمیل احمد مرحوم ایم، ایل، اے سے

ہوئی۔ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اپنے نیک ارادے کو ظاہر کیا، تو انہوں نے فوراً بلا چوں و چرا پوری بشاشت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے زمین مولانا کے حوالے کردی:

"کہ آپ کا میرے اوپر احسان ہے نہ کہ میرا احسان آپ پر"۔

چند ماہ کے بعد جب انجینئر امیر الدین ابن محترم جسٹس خلیل احمد صاحب اور ان کے بھائی، بہنوں سے ملاقات ہوئی، جامعہ مدنیہ کے قیام اور زمین کے حصول کا تذکرہ ان کے سامنے کیا گیا، اسی نشست میں ان تمام حضرات نے بھی جامعہ کے قیام کی تصدیق فرمائی، اور خوشی کا اظہار کیا، اور زمین کلی طور پر تمام حضرات کے مشورہ سے مولانا کی تحویل میں آگئی۔ واضح رہے کہ ان کے آباواجداد نے اپنی اولاد کے نام ۱۹۰۴ء میں یہ وصیت نامہ لکھا تھا کہ اس سرزمین پر مسجد، مدرسہ اور سرائے خانہ کی تعمیر ہوگی۔ اگر میری اولاد تعمیر نہ کر سکے تو عوام کو اختیار دیا جاتا ہے کہ میری اولاد سے زمین لے کر مدرسہ، مسجد اور سرائے خانہ کی تعمیر کریں۔ بحمد اللہ ان کی وصیت کو اللہ نے قبول فرمایا اور حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ذریعہ اس وصیت کو پورا فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا دامت برکاتہم نے صوبہ بہار کی راجدھانی پٹنہ میں معروف و مشہور اور معیاری درسگاہ دار العلوم دیوبند اور اکابرین دار العلوم دیوبند کے نہج پر بنام "جامعہ مدنیہ سبل پور" اپنے مربی حضرت مولانا "سید ارشد مدنی" دامت برکاتہم استاذ حدیث دار العلوم دیوبند کے دست مبارک سے بنیاد ڈالی۔ جس میں حضرت قاری سید محمد عثمان صاحب استاذ حدیث دار العلوم دیوبند اور دیگر علماء کرام شریک تھے۔ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بانی جامعہ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے صرف دو سو روپے سے کام شروع کیا، ۱۹۹۰ء میں ۸ر بچوں سے (جن کے والدین بھاگلپور کے فساد میں شہید ہو چکے تھے) حضرت مولانا شاعون احمد قادری کی مبارک دعا پر جامعہ میں تعلیم کا آغاز فرمایا۔ آج یہ اظہار کرتے ہوئے بیحد مسرت ہو رہی ہے کہ الحمد للہ اس وقت جامعہ میں ۵۰۷ر طلبہ ۴۰ر اساتذہ کی زیر نگرانی دینی تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ جن کے طعام و قیام اور دیگر ضروریات کی کفالت جامعہ مدنیہ کرتا ہے۔ جن کے سالانہ اخراجات آڈٹ رپورٹ کے مطابق Rs:72,00000=00 روپئے ہیں۔ فنڈ کچھ بھی نہیں، شہر پٹنہ کے ہمدردان قوم و ملت کی معاونت اور توکل علی اللہ ہی اس کا سرمایہ ہے۔

جامعہ اور خدماتِ جامعہ: جامعہ کے بانی و سرپرست حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دامت برکاتہم استاذ حدیث مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ و صدر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ بہار ہیں۔ جامعہ کی تاسیس ۳ر اپریل ۱۹۸۹ء میں بدست حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی دامت برکاتہم استاذ حدیث دار العلوم دیوبند ہوئیں۔ حضرت مولانا سید قاری محمد عثمان صاحب دامت برکاتہم استاذ حدیث دار العلوم

دیو بند، دیگر علماء کرام اور شہر کے معزز اشخاص شریک تھے۔۱۹۹۰ء میں حضرت مولانا شاہ عون احمد قادری کی مبارک دعاء سے ۸؍بچوں (جن کے ماں باپ بھاگل پور کے فساد میں شہید ہو گئے تھے) کے ذریعے تعلیم کا آغاز وافتتاح ہوا، ۞ جامعہ کے تحت مختلف مکاتب بھی چل رہے ہیں۔

جامعہ سے ہر سال ۵۰؍طلباء حفظ قرآن مکمل کرتے ہیں۔

۱۹۹۶ء میں آل بہار مسابقۃ القرآن الکریم زیر اہتمام جامعہ مدنیہ سبل پور سرزمین بہار میں پہلی بار ہوا۔ جس کو حضرت مولانا غلام محمد وستانوی رئیس الجامعہ اشاعت العلوم اکل کوا نے ''شاہی مسابقہ'' کہا۔۱۹۹۷ء میں شعبہ دینیات کیلئے توکل علی اللہ ۲۰؍کٹھہ زمین کا پلاٹ دس پختہ کمرے کے ساتھ خریدا گیا۔۲۰۰۲ء میں ''مدنی مسجد'' (بیادگار شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ) کی بنیاد رکھی گئی، دوسری منزل کی چھت کی ڈھلائی ہو چکی ہے، فنیشنگ کا کام جاری ہے، اور تیسری منزل کا بھی پروگرام ہے، اہل خیر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔۲۰۰۳ء میں آل بہار مسابقۃ القرآن الکریم زیر اہتمام جامعہ مدنیہ سبل پور سرزمین بہار میں دوسری بار ہوا۔۲۰۰۳ء ہی میں ''سہ ماہی ندائے قاسم'' (بیادگار حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) کی اشاعت کا آغاز کیا گیا۔ بے پناہ مقبولیت اور قارئین کی اصرار پر اپریل ۲۰۰۹ء سے ''ماہ نامہ'' کردیا گیا۔ سالانہ زرتعاون ۱۵۰؍روپے رکھا گیا ہے۔ حضرت مولانا اور ان کے رفقائے کار کی جدوجہد وکاوش سے طلبہ کی رہائش کیلئے ۵۰؍پختہ کمرے، وضوخانہ، بیت الخلاء، باتھ روم کی تعمیر ہوئی۔ ۴؍عدد بورنگ، ۲؍ہینڈ پیپ، ۶؍عدد بڑے پلاسٹک پانی ٹنکی اور ۳؍جنریٹر اور ایک دوسرے صاحب خیر نے باہر سے آنے والے مہمانوں کی سہولت کیلئے ایک AC؍روم کا انتظام کیا۔ جامعہ مدنیہ سبل پور کے زیر نگرانی صوبہ بہار بالخصوص ضلع پٹنہ کے اطراف وجوانب میں مدارس ومکاتب کا قیام عمل میں لایا گیا۔ حضرت مولانا موصوف کی زیر صدارت تقریباً ۳؍سو دینی تعلیمی بورڈ کے شبینہ وصباحی مکاتب قائم کیے گئے۔ جامعہ مدنیہ سبل پور پٹنہ کے سہ ماہی وسالانہ امتحانات حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند، جناب مولانا محمد احمد صاحب ناظم تعلیمات مدرسہ ثانویہ دارالعلوم دیو بند اور مولانا محمد علی صاحب استاذ دارالعلوم دیو بند کی نگرانی میں ہوتے رہے۔ حضرت مولانا قاسم صاحب کی محنت سے قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ پر مشتمل ۱۵؍سو کتابیں ۲؍لاکھ کی لاگت سے خریدی گئیں، اور بانی جامعہ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اپنی ذاتی کتابوں میں سے ایک الماری کتابیں جامعہ کو وقف کیں۔ طلباء کی عصری تعلیم کیلئے جناب سنجیو کمار صاحب سکریٹری تکشیلا ایجوکیشنل سوسائٹی نے ۲۲؍عدد کمپیوٹر اور ایک جنریٹر کا انتظام کیا، اور کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے ۲؍ٹیچر بھی مقرر کردیے گئے ہیں۔

"فکر انقلاب" کی خصوصی اشاعت

شیخ الاسلام نمبر

پر

ھدیہ تبریک

منجانب

جناب وسیم صدیقی، مودی نگر

حاجی محمد سلیمان عرف راجا، ویلکم، سیلم پور دہلی

حاجی محمد انصار، خان مارکیٹ دہلی

جناب زیڈ احمد چھمن، دہلی

جناب احسان احمد، جامعہ نگر دہلی

حاجی محمد عثمان، ایشیا مارکیٹنگ، کارپوریشن دہلی

تعارف وخدمات

جامعہ حسینیہ مدنی نگر کشن گنج بہار

بانی ومہتمم حضرت اقدس الحاج مولانا محمد غیاث الدین صاحب قاسمی خلیفۂ مجاز فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحبؒ

جامعہ حسینیہ مدنی نگر کشن گنج بہار جس کی بنیاد بیادگار شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ ۲۸ر شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۷ء بروز منگل زیر سرپرستی فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہ العزیز رکھی گئی، الحمد للہ اکابر علماء کرام اور بزرگان دین کی دعاء نیم شبی اور توجہات کی بدولت آج یہ ادارہ صرف ۱۶ر سال کی قلیل مدت میں علاقہ کشن گنج کا مثالی ادارہ بن چکا ہے۔

جہاں اس وقت ۶۵۰ر طلبہ کرام دار الاقامہ موجود ہیں، جن کی تعلیم وتربیت، علاج ومعالجہ اور دیگر ضروریات کی کفالت مدرسہ کررہا ہے۔ ادارہ کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی وجہ سے الحمد للہ علاقہ بھر اور قرب وجوار کے اضلاع سے بھی طلبہ کشاں کشاں یہاں پہونچ کر اپنی علمی تشنگی بجھا رہے ہیں، اور اس قلیل عرصہ میں ۴۵۰ر طلبۂ کرام نے یہاں چشمۂ صافی سے حفظ قرآن کریم کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ جن میں سے ۱۵۰ر حفاظ کرام کے سروں پر اکابر علماء کرام کے ہاتھوں سے ۴ر۵ر اپریل ۲۰۰۵ء میں دستار بھی باندھی گئی تھی، اور اب تقریباً ۳۵۰ حفاظ کرام کے سروں پر ہندوستان کے اکابر علماء ربانیین کے ہاتھوں سے ۲۳ر۲۴ر مارچ کو انشاء اللہ دستار باندھی جائے گی۔

الحمد للہ جامعہ کی طرف روز اول ہی سے مقتدر اکابر علماء اور صلحاء عظام کا رجوع رہا ہے، اور اب تک کی قلیل مدت میں ملک کے تقریباً تمام ہی اکابر علماء کرام کا جامعہ میں ورود مسعود ہو چکا ہے، جن سب کے صرف اسماء

گرامی کے اندراج کے لئے ایک مستقل کتابچہ کی ضرورت ہے، اور ان ہی اکابر کی دعائیں ہیں کہ ادارہ نے اس قلیل عرصہ میں تعلیمی اور تعمیری ہر دو سمت میں ایسی محیر العقول ترقی کی ہے کہ کوئی بھی اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرسکتا ہے۔ بالخصوص جامعہ میں مکمل صحت وتلفظ کے ساتھ قرآن کریم کی تعلیم کا خاص انتظام والتزام کیا جاتا ہے، بنابریں طلبہ کی اتنی بڑی تعداد جامعہ میں داخلہ کی خواہش لے کر پہونچ جاتی ہے کہ ادارہ کو اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کرتے ہوئے ان میں سے اکثروں کو بادل ناخواستہ واپس کردینا پڑتا ہے، اس لئے اکابر علماء کرام کے مشوروں سے ۱۳ر کمروں پر مشتمل ایک دار القرآن کی تعمیر کی گئی ہے، جس کی چھت اور پلاسٹر کا کام بحمد اللہ مکمل ہو چکا ہے، تاہم ابھی بھی کھڑکی، دروازہ اور رنگ وپینٹ کا کام باقی ہے، علاوہ ازیں اس کے اوپر درجات عربی وفارسی کی درسگاہوں کی تعمیر اور طلبہ کے پینے اور دیگر ضروریات کے لئے ایک بڑے پانی کی ٹنکی کی اشد اور فوری ضرورت ہے، اور طلبہ کے لئے مستقل مطبخ نہ ہونے کی وجہ سے کافی دشواریاں پیش آرہی تھیں اس لئے ۱۶ر دسمبر ۲۰۱۲ء بروز اتوار کو جامعہ میں طلبہ کے طعام اور مطبخ کے لئے ایک ڈائنگ ہال کی بنیاد رکھی گئی ہے جس پر ایک بڑا صرفہ ہے، ادارہ میں آمدنی کا کوئی متعین ذریعہ نہیں بس توکل علی اللہ اکابر کی دعائیں اور مخلصین کے تعاون سے یہ تمام تر خدمات انجام دیے جاتے ہیں۔

کشن گنج اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ ہے، مگر یہاں دینی اور بنیادی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے باطل فرقے پنپنے اور اپنے بال وپر پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جس سے یہاں کی عوام اور بھولے بھالے لوگوں کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، اور وہ بے دینی اور بد دینی کے سیلاب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ادارہ ہر گھر تک دینی پیغام پہونچانے اور لوگوں کو صحیح افکار وعقائد سے روشناس کرانے کے لئے ایک سہ ماہی رسالہ "**ندائے حسین**" بیادگار شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ بھی نکال رہا ہے جس کا اجراء الحمد للہ ۷ار جون ۲۰۱۲ء بروز اتوار کو جامعہ میں کیا گیا تھا، اب تک الحمد للہ اس کے تین شمارے بڑی کامیابی کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں، اور اب جامعہ میں منعقد ہونے والے اجلاس دستار بندی مطابق ۲۳ر ۲۴ر مارچ ۲۰۱۳ء کے موقع سے اس رسالہ کا خصوصی شمارہ "تاریخ کشن گنج" نمبر نکالنے کا عزم کیا ہے جو کم وبیش ۴۰۰ر صفحات پر انشاء اللہ مشتمل ہوگا۔

تعلیم وتربیت کا شاہکار مرکز

جامعہ خدیجۃ الکبری للبنات

بہار کا ضلع کشن گنج مسلم اکثریت کے لحاظ سے نمایا ہے ساتھ ہی جہالت و پسماندگی غربت وافلاس میں بھی قابل ذکر ہے یہی وجہ ہے کہ تمام باطل طاقتیں نت نئے انداز میں یہاں کی جہالت زدہ عوام خصوصا صنف نازک میں محنت کر رہی ہے معمولی اور چند ٹکوں کا لالچ دیکران کے ایمان ویقین کا سودا کرنے میں لگی ہوئی ہے ایسے میں خالص بچیوں میں تعلیم وتربیت دینی شعور وآگہی اسلامی تہذیب وتمدن اور کلچر وثقافت کی بقا کے لئے جامعہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات ہمہ تن مصروف ہے:

جامعہ کا مدت قیام گرچہ طویل نہیں ہے تاہم اس نوعمری ہی میں اس نے نورانی قاعدہ مع تجوید، حفظ وقرات، اردو پرائمری، عربی وفارسی درجات کے ذریعہ بہترین کارکردگی دکھا کر علاقہ میں روشن مستقبل کا نشان راہ بتا رہی ہے ذی استعداد وتجربہ کار معلمات کے زیر نگرانی یہ ادارہ تعلیم کے ساتھ ساتھ عمدہ تربیت میں بھی رواں دواں ہے:

لیکن جامعہ کے پاس اسباب وسائل کی کمی کی وجہ سے کوئی پختہ عمارت نہیں ہے باوجود اس کے گھاس پھوس کی جھوپڑپٹی میں توکل علی اللہ پر طالبات کے قیام وطعام کے ساتھ اپنے تعلیمی سفر میں منہمک ہے مدرسہ کا سالانہ صرف تخمیناً ۳۰۰۰۰۰ لاکھ روپیہ ہے جو اہل خیر حضرات اور مدرسہ کے خدام کے تگ ودو سے بمشکل تمام تکمیل کو پہونچ پاتا ہے علاوہ ازیں مدرسہ کی اراضی پر مستقل تعمیر کا مسئلہ بھی درپیش ہے

مخیر ان قوم وملت وہمدردان علوم نبوت سے پرخلوص تعاون کی اپیل ہے:

مولانا مرشد اکرامی قاسمی
بانی ومہتمم جامعہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات چوری پٹی کشن گنج بہار فون: ۸۰۸۴۷۵۱۵۵۳

مشرقی دہلی کا عظیم علمی اور دینی مرکز

ملت اسلامیہ کی بقاو تحفظ کا ضامن، مسلم تہذیب وتمدن کا امین، علوم نبوت کا پاسبان اور عظمت اسلام کا نشان

مدرسہ زینت القرآن



شعبہ تحفیظ القرآن، شعبہ تجوید وقرأت، شعبہ درس نظامی، شعبہ پرائمری، اور حکومت ہند سے منظور شدہ شعبہ کمپیوٹر ڈپلوما کورس، شعبہ خطاطی، گرافک اور ڈیزائننگ، دوسالہ عربی کا ڈپلوما کورس، ایک سالہ اردو زبان ڈپلوما کورس۔

اس مدرسہ کی خدمت کے جلی عنوانات ہیں

ماسٹر محمد سلیم انصاری

مہتمم مدرسہ زینت القرآن۔B-291 ویلکم سلیم پور دہلی۔53۔موبائل: 9818358685

فون نمبر: 011-22827513

بیادگار داعی امت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ خلیفہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

جامعہ اسلامیہ عربیہ گلزار قرآنیہ

یہ جامعہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالبان علوم نبوت کا ایک عظیم ادارہ ہے جہاں حفظ و تجوید، عربی و فارسی اور عصری علوم کی تعلیم ہوتی ہے جہاں طلباء کی ایک کثیر تعداد کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی رہائش، خوراک اور دوسری انسانی ضرورتوں کا کفیل بھی جامعہ ہی ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ آج یہ جامعہ حضرت مولانا محمد احمد قاسمی کے اہتمام میں علاقہ غازی آباد کا عظیم دینی، علمی، اصلاحی مرکز اور سرچشمہ علم و عرفان بنکر مسلسل شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ سینکڑوں علماء وحفاظ اور خادمان دین کی جماعت اس سے فیضیاب ہوکر ملک کے دور دراز گوشوں تک اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

شعبہ عالمیت، شعبہ تحفیظ القرآن، شعبہ ناظرہ، شعبہ تعمیر و ترقی، شعبہ دعوت و تبلیغ یہ تمام شعبے طلباء کے لئے مصروف عمل ہیں۔

تمام برادران اسلامی سے اس جامعہ کی پر خلوص اعانت کی درخواست ہے

مولانا محمد احمد قاسمی فون 01232-277504 موبائل 09997631749

مہتمم جامعہ اسلامیہ عربیہ گلزار قرآنیہ کلچھینہ، ضلع غازی آباد، یوپی (انڈیا)

دین ودانش اور تعلیمی بیداری کا ایک عظیم محور اور ایک اصلاحی خانقاہ

جامعۃ الاصلاح نور الاسلام

دارالافتا، دارالقضا کے قیام کے علاوہ بہت جلد دورحدیث کا بھی آغاز ہورہا ہے، فی الحال کمپیوٹر سینٹر اور آٹھویں تک عصری علوم کی تعلیم کا ایک عظیم مرکز بنکر یہ جامعہ مصروف عمل ہے

علم نبوت کی ترویج واشاعت کا ایک علمی مرکز فقہ وتفسیر اور علوم اسلامی کے متعدد شعبے جامعہ کی خدمات کا جلی عنوان ہے اور مفتی خان محمد کی عالمانہ کوششوں کا وہ اسلامی تربیت گاہ ہے جہاں قوم کے بچے شاہین بنائے جاتے ہیں۔ پرائمری درجات، حفظ وتجوید اور عربی وفارسی کے شعبے طلباء کی خدمت میں مصروف ہیں اور ان کو اسلامی فکر اور توحید خالص کے سانچے میں ڈھالنا جامعہ کا عظیم نصب العین ہے، مستقبل قریب میں دورحدیث کا پروگرام بھی ہے ملت کے نونہالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے درسگاہوں اور کمروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری جس کے تکمیل کے لیے مخیر حضرات کی اعانت کی سخت ضرورت ہے۔

مفتی خان محمد قاسمی موبائل 9312553508
بانی مہتمم جامعۃ الاصلاح نور الاسلام
زیر نگرانی
متحدہ انجمن اصلاح المسلمین جامع مسجد نوری F6 سلطان پوری

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا قائم فرمودہ صد سالہ شہرۂ آفاق

مدرسہ امدادالعلوم

برصغیر ہندوپاک کے علمی وروحانی اور تعلیمی وتصنیفی خدمات کے قدیم واہم ترین مراکز میں سے ایک نہایت ـــ پایہ اور باوقعت مرکز خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون اور اس ملحق وملصق مدرسہ امدادالعلوم ہے۔

۱۳۱۵ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب کے ایماء اور منشاء کے مطابق توکلا علی اللہ خانقاہ امدادیہ میں رونق افروز ہوکر مسجد کی مرمت اور مدرسہ کی توسیع کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور تھوڑی ہی مدت میں مرشد ومسترشد کی حسن توجہ سے اس مدرسہ میں خوب وسعت ہوگئی، خانقاہ بھی نہایت آباد و پُر بہار رہی اور اس کے فیوض وبرکات اور فوائد واثرات سے ایک عالم فیض یاب ہوا۔

اپنے شیخ کی ہدایت وتربیت کے نتیجہ میں حضرت والا تھانویؒ نے جس طرح اپنی ذات کے لئے استغناء اور توکل اختیار فرمایا تھا اسی طرح اپنے مدرسہ کی بنیاد بھی خالص توکل پر رکھی، چندہ وغیرہ کی تحریک سے احتراز فرمایا چنانچہ نہ آج تک مدرسہ کا کوئی محصل یا سفیر ہے نہ مروجہ رسید کا دستور، چندہ دہندگان کی فہرست شائع کی جاتی ہے نہ اشتہار اپیل کے رواجی طریقے اپنائے جاتے ہیں بلکہ اکابر کے مذاق ومسلک سے واقف محبین ومخلصین کے ذریعہ بغیر کسی تحریک وکوشش کے جس قدر آمدنی ہوتی ہے اسی کے مطابق اخراجات اور تمام نظام رکھا جاتا ہے، آمدنی زائد ہوتی ہے تو کام بڑھادیا جاتا ہے اور کم ہوتی ہے تو گھٹادیا جاتا ہے بفضلہٖ تعالیٰ اب تک اسی طرز پر یہاں کا نظم قائم ہے۔

اس سال بھی ماشاء اللہ سواسو (125) سے زائد بیرونی امدادی طلبہ مدرسہ میں رہ کر حفظ وناظرہ، اردو، دینیات کے علاوہ فارسی اور عربی سوم تک تعلیم حاصل کررہے ہیں جن کے لئے مدرسہ میں مطبخ اور وظیفہ کا معقول نظم ہے اور حتی المقدور دیگر سہو ـــ فراہم کرنے کی سعی رہتی ہے مقامی بچوں کی بھی ایک بڑی تعداد تعلیمی اوقات میں پڑھنے کے لئے آتی ہے۔ مدرسہ میں بہ ۱۸ مدرسین وملازمین کا عملہ مصروف کار ہے الحمدللہ خیر وخوبی کے ساتھ معمول کے مطابق کام ہورہا ہے۔

مولانا نجم الحسن تھانوی مہتمم مدرسہ امدادالعلوم وخانقاہ امدادیہ اشرفیہ
تھانہ بھون ضلع مظفرنگر یوپی پن 247777 فون: 01398-233343

دہلی کا مشہور علمی

دینی اور اسلامی ادارہ

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے الحاق شدہ

الجامعۃ الاسلامیہ العربیہ

قاسم العلوم

تعلیم و تربیت کے ساتھ بدعت و رسومات کے بیخ کنی اصلاح معاشرہ اور عوام الناس کے اندر دینی شعور و خیال کی بیداری نئی نسل کو علمی و آگہی کے میدان میں آگے بڑھانا قرآن کی تحفیظ اور عربی فارسی اور پرائمری درجات کی تعلیم مدرسہ کا نصب العین ہے۔ دینی اور اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ عصری علوم سے بھی طالبانِ علوم نبوت مزین کیے جاتے ہیں۔ تین سو ضرورت مند طلبا کی خوراک و پوشاک اور دوسری انسانی ضرورتوں کا کفیل مدرسہ ہے۔اس جامعہ کے سالانہ اخراجات تقریباً 25 لاکھ روپے ہیں

اسلئے ملت کے اصحابِ خیر سے خصوصی تعاون کی اپیل ہے

مولانا مفتی **ظہور الدین** قاسمی موبائل: 9213128650

مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ العربیہ قاسم العلوم

مسجد فدائی خاں، ۱۳۰/سی، دو ویکا نند پوری، سرائے روہیلہ، دہلی ۱۱۰۰۰۷

Ph: 23693860

دین ودانش اور علم وعمل کا ایک عظیم اور قدیم مرکز

مدرسہ فیض ہدایت رحیمی

علم نبوت کی ترویج واشاعت کا ایک علمی مرکز فقہ وتفسیر اور علوم اسلامی کے متعدد شعبے مدرسہ کی خدمات کا جلی عنوان ہے اور مولانا جان محمد صاحب کی عالمانہ سرپرستی کا وہ اسلامی تربیت گاہ ہے جہاں قوم کے بچے شاہین بنائے جاتے ہیں۔ پرائمری درجات ،حفظ وتجوید اور عربی وفارسی کے شعبے طلباء کی خدمت میں مصروف ہیں اور ان کو اسلامی فکر اور توحید خالص کے سانچے میں ڈھالنا مدرسہ کا عظیم نصب العین ہے، دور حدیث کی تعلیم کا بھی معیاری انتظام ہے۔ ملت کے نونہالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے کتب خانہ اور دارالحدیث اور پانی کی ٹینکی کی سخت ضرورت ہے۔ جس کے اخراجات کا تخمینہ تقریباً 46 لاکھ روپے ہیں جس کی تکمیل کے لیے مخیر حضرات سے اعانت کیا پیل ہے۔

منجانب

مہتمم مدرسہ فیض ہدایت رحیمی ، رائے پور ضلع سہارنپور ، یوپی

مدرسہ ابی بن کعب تحفیظ القرآن

گھاسیڑہ تحصیل، ضلع میوات، ہریانہ



اغراض ومقاصد: مدرسہ ہذا کے اغراض ومقاصد میں دینی واسلامی وعصری تعلیم کے ساتھ سب سے زیادہ اہمیت ملکی محبت، قومی ایکتا اور گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانا ہے اور پڑھنے والے بچوں میں قوم ووطن سے بے پناہ وفاداری، فرقہ وارانہ اتحاد کے فروغ اور قومی سلامتی کے جذبات کو بیدار کرنا ہے۔ چنانچہ مدرسہ ہذا میں قومی پروگرام جشن آزادی ۱۵ر اگست اور یوم جمہوریہ ۲۶ر جنوری کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور ملک کے سبھی طبقات وملت کے لوگوں کو اس میں مدعو کرکے آپسی بھائی چارہ کے ماحول کو پروان چڑھاجاتا ہے۔

تعلیم کامعیار ❋ حفظ قرآن کریم بالتجوید ❋ تجوید وقرأت بروایت حفصؒ ❋ درجات عربی تا سال چہارم ❋ دینیات پنجم ❋ عصری علوم آٹھویں کلاس تک

شعبہ جات ● شعبۂ تجوید وقرأت ● شعبۂ تحفیظ القرآن الکریم ● شعبۂ درجات عربی وفارسی ● شعبۂ ناظرہ ● شعبۂ دینیات اردو ● شعبۂ کلیۃ المومنات (مدرسۃ البنات) ● شعبۂ علوم عصریہ ● شعبۂ کمپیوٹر ● شعبۂ تصنیف وتالیف ● شعبۂ دعوت وارشاد ● شعبۂ تعلیمات ● اہتمام ● شعبۂ تعمیرات ● لجنۃ القراء ● انجمن اصلاح اللسان ● شعبۂ خدمت الحجاج ● محکمہ شرعیہ

ضروریات: دارالاقامہ کی توسیع، دارالقرآن، کتب خانہ، دارالمدرسین، مہمان خانہ، ٹیکنیکل سینٹر، درسگاہیں، مسجد کی میناریں، لائبریری کے لئے کتب، تعمیر مدرسۃ البنات، پرائمری اسکول کا قیام

اپیل: مدرسہ کی ہمہ جہت خدمات کو دیکھتے ہوئے ملک کے مشاہیر علمائے کرام اور ارباب فضل ودانش نے اپنے اچھے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے اور ملت کے اصحاب خیر سے اس مدرسے کی اعانت کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل بھی کی ہے۔

مہتمم مولانا شیر محمد امینی

MADRASA UBAI BIN KAAB TAHFEEZ-UL-QURAN

At & Post. Ghasaera Distt Mewat (NUH), 122103 (Haryana)

Ph:01267-276545 Mob:09416071367-09813386033



مدرسة الشیخ محمد زکریا سہارنپور

مسلم تہذیب وتمدن کا پاسبان۔ عظمت قرآن کے پیغام کا علمبردار

سنہ قیام۔ ۲۹؍ شوال المکرم ۱۴۲۵ھ، ۱۳؍ دسمبر ۲۰۰۴ء، دوشنبہ • تعلیم۔ حفظ قرآن مجید مع تجوید وقرات

- مدرسہ کا تعلیمی نظام۔ نماز فجر کے فوراً بعد اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم کا آغاز اور کچھ وقفے کے بعد تمام طلباء کو من جانب مدرسہ چائے ناشتہ
- تعلیمی اوقات یہ ہیں: چار گھنٹے صبح، دو گھنٹے شام، دو گھنٹے بعد مغرب
- ہر جمعہ میں بعد نماز مغرب تمام طلباء کا اجتماعی طور پر وظیفہ، درود پاک وصلی اللہ علی النبی الامی اس کے بعد ملک وملت کے مسائل اور حل مشکلات کے لئے طلباء کی اجتماعی دعا۔
- روزانہ بعد نماز مغرب کچھ دیر کے لئے فضائل اعمال کی تعلیم
- فی الحال مدرسہ میں درجہ حفظ اور دینیات میں سات اساتذہ تمام طلباء کو قرآن مجید ودینیات کی تعلیم دینے میں مصروف ومشغول ہیں۔
- مدرسہ کے سات سالہ مدت قیام میں ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) جید حفاظ تیار ہو کر پورے ملک میں پھیل چکے ہیں۔
- وسط شوال سے تعلیم کا آغاز ہو کر وسط شعبان میں امتحان سالانہ ہو کر مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔
- ہر سال بڑے اہتمام سے سالانہ جلسہ منعقد کیا جاتا ہے، جس میں علماء اور خواص اور دور ونزدیک کے عوام واہل تعلق بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ طلباء کو ان کے کامیاب درجات کے اعتبار سے کتابیں اور ہزاروں روپے نقد بطور انعام دیے جاتے ہیں۔
- اس مدرسہ میں تمام طلبہ کو صبح کا چائے ناشتہ، دو وقت طعام، ہر طالب علم کے لئے ایک تخت اور اس کے ساتھ ایک گدا، تکیہ اور چادر دی جاتی ہے، نیز علاج ومعالجہ من جانب مدرسہ کیا جاتا ہے۔

داخلہ کے قواعد وضوابط

• داخلہ صرف شعبہ حفظ میں ہوگا جس میں نئے طلباء کے لئے کم از کم دو پارے پہلے سے حفظ ہونا ضروری ہے۔ • اخلاق واعمال، لباس اور وضع قطع میں اسلامی شباہت کا لحاظ اور صلحائے امت کا اتباع ضروری ہوگا۔ • بوقت داخلہ سابقہ تعلیم کا امتحان ہوگا اور اسی کے نتیجہ پر آگے تعلیم موقوف ہوگی۔ • طلباء کے لئے ان کا کوئی سرپرست ضروری ہوگا تاکہ بوقت ضرورت ان سے مراجعت کی جاسکے۔

نوٹ: مدرسہ کا سالانہ بجٹ علاوہ ضروری تعمیرات وغیرہ کے پندرہ لاکھ روپئے سالانہ ہے

الداعی الی الخیر

سید محمد شاہد سہارنپوری ناظم مدرسة الشیخ محمد زکریا (محلہ مبارک شاہ) سہارنپور

دہلی میں حفظ و تجوید اور اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک قدیم مرکز

مدرسہ تجوید القرآن

دہلی کا دامن علم و عمل کی خوشبو سے ہمیشہ مہکتا رہا ہے۔ ہر گلی کوچے میں ایسی درسگاہیں اور علمی مراکز ملیں گے جہاں اساطین فیض حاصل کرتے تھے؛ لیکن دہلی اپنی تمام تاریخی رفعتوں کے باوجود تجوید و قرآت کے میدان میں غفلت شعاری کا مرتکب رہی ہے۔ اللہ جزاء خیر دے کہ حضرت قاری محمد سلیمانؒ نے اپنے خون جگر سے اس سوکھی ہوئی کھیتی کو سیراب کیا، ایک چھوٹی مسجد میں حفظ کلام اللہ اور علم و تجوید و قرآت کی محفل سجائی جو مدرسہ تجوید القرآن کے نام سے تجوید و قرآت کا ایک بڑا مرکز بن کر سامنے آیا آج اس مدرسہ میں قرآت سبعہ عشرہ کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور یہ مدرسہ قرآنی علوم کی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ بانی محترم کے انتقال کے بعد اپنے نام ور والد کی صحیح معانوں میں جانشینی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مولانا محمود صاحب نے مدرسہ کی علمی اور تعمیری ترقی کے لیے جو بے مثال خدمت انجام دی ہے، وہ دراصل بانی مرحوم کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے اور اپنے والد کے محاسن و فضائل اور تعلیمی و تنظیمی خطوط کی روشنی میں جو علمی کارنامہ انجام دیا ہے وہ تجوید و قرآت کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

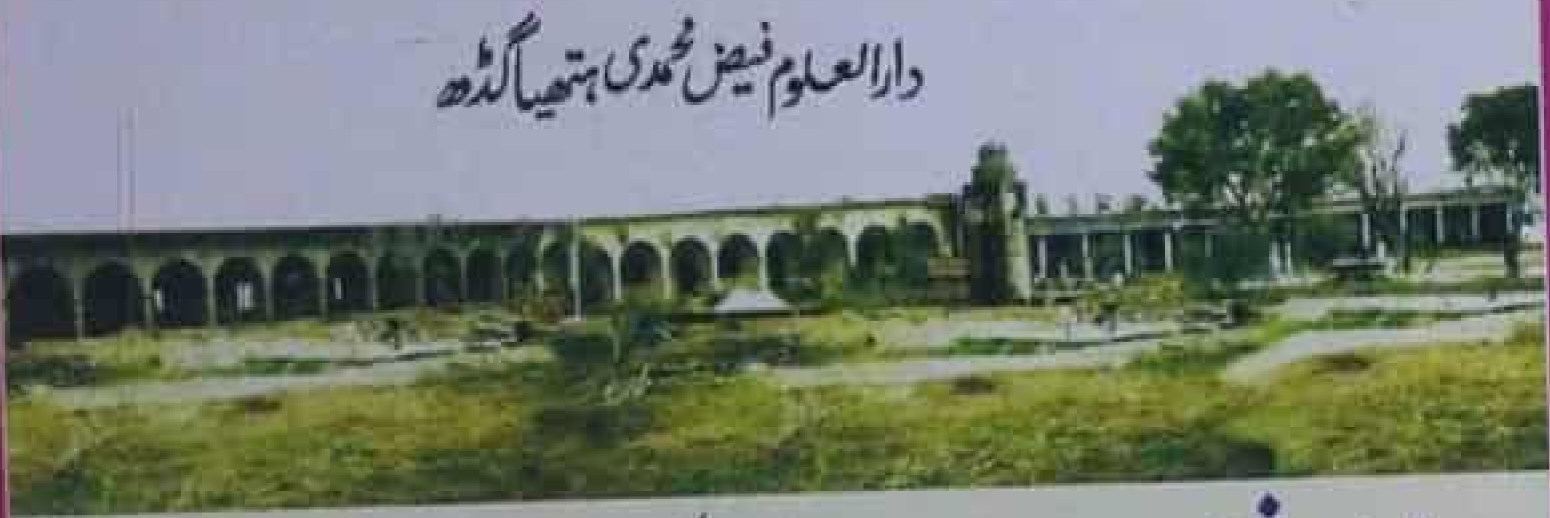
اس مدرسہ کا کا مستقبل اس کے ماضی سے زیادہ روشن اور حال سے زیادہ تابناک ہے مدرسہ کا معیار تعلیم اور حسن تنظیم کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم کے شعبۂ

قرآت ے صدر اور عالمی شہرت یافتہ قاری ابوالحسن عاظمی صاحب مسلسل 22 سالوں سے اس مدرسہ میں بغرض امتحان تشریف لاتے رہے ہیں اور ہر بار انہوں نے مدرسہ کی حسن کارکردگی پر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اطمینان اور قلبی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تاثرات میں ان جملوں میں موجودہ ناظم کی کارکردگی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ: ناظم صاحب کی زیر نگرانی تمام کارکنوں میں وہی ذوق ولگن وہی جدوجہد وہی شبانہ روز کامل شغف وانہماک اور طلبائے عزیز کی محنت سعی وپیہم کے عمدہ اور بہترین نتائج نظر آئے طلباء سے سوالات پر وہی برجستہ جوابات ملتے رہے جو اس مدرسہ طرۂ امتیاز ہے۔

مدرسہ ہذا کے حوصلہ مند ناظم مولانا قاری محمود حسن صاحب حفظ کلام اللہ کے مبارک ومسعود کام کو بڑے پیمانہ پر انجام دینے کے لیے مستقبل کے تعلیمی منصوبوں پر غور کررہے ہیں: تاکہ قرآن کریم کی عمدہ تعلیم وتربیت کے میدان میں جو وسیع خلا اور مجرمانہ لاپرواہی کا رونا رویا جاتا ہے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ قاری محمود حسن صاحب کے عزائم جواں ہیں، ان کے دل میں قومی وملی خدمت کا چراغ روشن ہے، ان کے افکار وخیالات بلند ہیں، ان کے ارادوں میں تحرک وتموج ہے اور وہ اس میدان کا طویل تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ تجوید وقرآت کی دنیا میں نئی جہات کا اضافہ کریں گے اور اس مدرسہ کے وقیع پلیٹ فارم سے قرآن کریم کی وہ خدمت انجام دیں گے، کہ تاریخ ان کی قرآنی خدمات کو سنہرے حرفوں میں لکھنے پر مجبور ہوگی۔

مولانا محمود حسن، ناظم مدرسہ تجویدالقرآن

مسجد تکیہ والی شیواجی روڈ آزاد مارکٹ، دہلی


دارالعلوم فیض محمدی ہتھیا گڑھ

رامپور کے دامن میں قرآن وسنت اور تعلیمی بیداری کا ایک بے مثال سرچشمہ

مدرسہ اسلامیہ عربیہ فیض العلوم



یہ مدرسہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالبان علوم نبوت کا ایک عظیم ادارہ ہے جہاں حفظ و تجوید ،عربی وفارسی اور عصری علوم کی تعلیم ہوتی ہے جہاں طلباء کی ایک کثیر تعداد کی تعلیم وتربیت کے علاوہ ان کی رہائش ،خوراک اور دوسری انسانی ضرورتوں کا کفیل بھی مدرسہ ہی ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ آج یہ مدرسہ حضرت مولانا اسلم جاوید قاسمی صاحب کے اہتمام میں علاقہ کا عظیم دینی، علمی، اصلاحی مرکز اور سرچشمہ علم وعرفان بنکر مسلسل شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ سینکڑوں علماء وحفاظ اور خادمان دین کی جماعت اس سے فیضیاب ہوکر ملک کے دور ودراز گوشوں تک اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

شعبہ عالمیت، شعبہ تحفیظ القرآن، شعبہ ناظرہ، شعبہ تعمیر وترقی، شعبہ دعوت وتبلیغ، شعبہ پرائمری اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مستقل مدرسۃ البنات بھی قائم ہے یہ تمام شعبے طلباء کے لئے مصروف عمل ہیں۔ دو سو بیرونی طلباء بھی زیر تعلیم ہیں جن کے قیام وطعام کا انتظام مدرسہ کی جانب سے کیا جاتا ہے، یہ سارے اخراجات قوم وملت کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں، تعلیمی اخراجات کے علاوہ تعمیری ضرورت بھی درپیش ہے

تمام برادران اسلامی سے اس مدرسہ کی پرخلوص اعانت کی درخواست ہے

منجانب

مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ فیض العلوم، تھانہ ٹین، رامپور یوپی



قوم وملت کے لئے علماء گجرات کی رفاہی خدمات کا ایک عظیم مرکز

جمیلہ ہسپتال

المحمدی مسجد کے پاس، آزادنگر، بیرل مارکیٹ، چنڈولا تلاو، دانی لمڈہ، احمد آباد



شہر کے علماء، ائمہ، مدرسین ومؤذنین کی جو معاشی واقتصادی حالت ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں، خاص طور پر بیماری کے زمانے میں ان حضرات کو جو تکالیف پیش آتی ہیں وہ انتہائی پریشان کن ہوتی ہیں، ان حالات کو دیکھتے ہوئے شہر کے ذمہ دار علماء اور سنجیدہ ساتھیوں نے باہم مشورہ کر کے ایک تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا اور ایک نمائندہ اجلاس بلا کر علماء فاؤنڈیشن کے نام سے ایک تنظیم کو منظور کر کے اسکو رجسٹرڈ کرانے کا فیصلہ کیا اور مفتی محمد ارشد قاسمی نے بھاگ دوڑ کر کے اس تنظیم کو تاریخ ۲۰-۰۸-۲۰۱۱ کو رجسٹریشن کرایا۔ اس تنظیم کا رجسٹریشن نمبر گجرات/۶۱۱۵/احمد آباد رجسٹریشن نمبر ایف/۱۵۹۱۵/احمد آباد ہے اور جمیلہ ہسپتال کے نام سے ایک ہسپتال شروع کیا، جس میں تمام علماء، ائمہ، مدرسین ومؤذنین کا مفت علاج کیا جاتا ہے اور علماء کے علاوہ دوسرے لوگوں کا صرف ۱۰ روپے کی معمولی فیس پر علاج کیا جاتا ہے۔

اپیل

جمیلہ ہسپتال ایسے علاقے میں ہے جو انتہائی غریب علاقہ ہے، علاقہ کے رہنے والے معاشی طور پر کمزور ہیں، اس لئے مریضوں سے صرف ۱۰ روپے فیس لی جاتی ہے، اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ اس ہسپتال کا دل کھول کر تعاون کریں۔ (جزاک اللہ)

شائع کردہ: مفتی محمد اسجد قاسمی Ph.No.079-29294610 (M) 9427705810

Canara Bank A/c.No.0317101028618

ہیڈ آفس: حافظ ادریس منزل، قریشی مسجد، قریشی اسٹیٹ، دانی لمڈہ، احمد آباد



قاسم العلوم نے عوام وخواص اور اکابر وعلماء کی دعاؤں اور توجہات کے سبب تعلیمی وتربیتی نیز تعمیری میدان میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ یقیناً قابل ر—— ہے۔ اس وقت ادارہ میں طلبہ طالبات کی کل تعداد ۲؍ہزار سے زائد ہے، جس میں ۶۰۰ طلبہ دارالاقامہ میں ہیں اور ۷۰؍افراد پر مشتمل عملہ اُن کی تعلیمی وتربیتی اور انتظامی امور میں سرگرم عمل ہے۔ مدرسہ کا سالانہ صرفہ ایک کروڑ روپے سے متجاوز ہے۔

ایک طرف جہاں ادارہ میں ایک خوشنما عمارت میں درجہ ناظرہ پرائمری، تحفیظ القرآن، تجوید وقرأت، فارسی وعربی تادورۂ حدیث شریف اور دارالافتاء وغیرہ کا مکمل نظام چل رہا ہے۔ وہیں قریب ۲؍کلومیٹر کے فاصلہ پر مظفر نگر بجنور روڈ پر مولانا آزاد میموریل ہائی اسکول پچھلے پانچ سالوں سے ۱۸؍بگہ زمین میں نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کررہا ہے جس میں اس وقت ۶۰۰؍طلبہ اسلامی ماحول میں محنتی اور باذوق ٹیچرس کی زیر نگرانی عصری تعلیم میں مشغول ہیں۔ اسی طرح عصر حاضر کے اہم اور حساس موضوع ''تعلیم نسواں'' کو اُمت کا ضروری مسئلہ سمجھتے ہوئے قاسم العلوم کے بالکل سامنے مدرسہ اسلامیہ عربیہ قاسم العلوم تیوڑہ کمیٹی کے تحت ''مسلم ایجوکیشن ڈیولپمنٹ گرلز ہائی اسکول'' کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ جس میں مجوزہ نقشہ (Elevation) کے مطابق تیزی کے ساتھ کام جاری ہے اور اُمید ہے کہ انشاء اللہ ماہ جولائی ۲۰۱۱ء میں باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوجائے گا۔

قاسم العلوم نے یوم تاسیس سے آج تک اپنی ۶۷؍سالہ زندگی میں جو خدمات انجام دی ہیں یہ بانیین کی دعائے نیم شبی اور حضرات مدرسین وذمہ داران کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ یقیناً قاسم العلوم کے اس مقام عروج تک پہنچنے میں آپ حضرات کا مخلصانہ تعاون اور دعائیں شامل ہیں ہم مستقبل میں بھی جملہ بہی خواہان قوم وہمدردان ملت سے اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے منصوبوں کو پورا کرنے میں اپنا ہر ممکن تعاون پیش فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

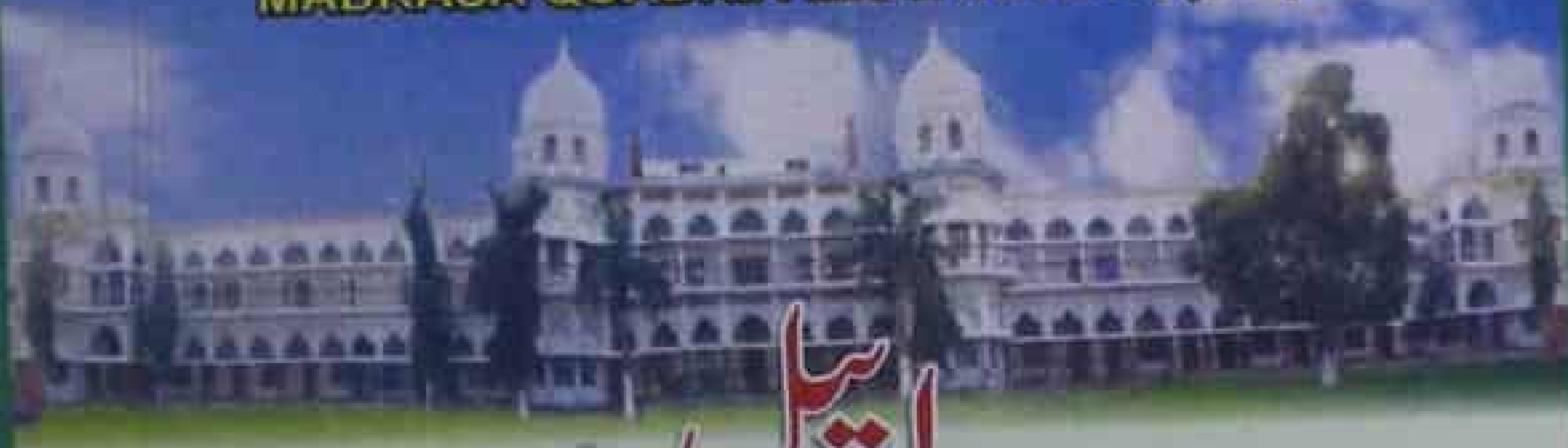
For Cheque & Draft:
Madrasa Islamia Arabia Qasimul Uloom Tewra,
Distt. Muzaffarnagar-251316(U.P)
A/c. No.: 31452890217 SBI Branch Kakrauli,
Code: 3509

ترتیب وپیشکش
مفتی بن یامین صاحب مہتمم مدرسہ ہذا



مدرسہ قادریہ مسّروالا کی دومنزلہ درسگاہوں کا ایک دلکش منظر

MADRASA QUADRIA MISSARWALA (H.P)



اپیل

"تقسیم ملک کے بعد ہماچل پردیش (مشرقی پنجاب) کا پہاڑی علاقہ جو دہرہ دون سے چین اور تبت تک پھیلا ہوا ہے، دینی تعلیمی حیثیت سے نہ صرف یتیم والا وارث ہو کر رہ گیا تھا بلکہ اس میں دینی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی مزاج واحکام سے دوری بڑھتی جارہی تھی۔ اس صورتحال کا سب سے زیادہ اثر وصدمہ قطب عالم حضرت اقدس شاہ عبد اللہ قادر رائے پوریؒ کے خاص تربیت یافتہ حضرت اقدس مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری کے قلب پر ہوا چنانچہ انہوں نے اس علاقہ کی اصلاح و رہنمائی کے لیے دو پہاڑوں کے بیچ مسروالا میں مفکر اسلام مولانا سید علی میاں ندوی کے مبارک ہاتھوں سے 16 شوال المکرم 1399ھ مطابق 9 ستمبر 1979ء کو مدرسہ قادریہ کی بنیاد رکھوائی۔ الحمدللہ اس ادارہ کے ذریعہ پہاڑی اور پچھڑے علاقہ میں درجنوں مساجد کی تعمیر اور سیکڑوں مکاتب کا قیام عمل میں آچکا ہے جو کہ تعلیم و تربیت اور اشاعت دین و تبلیغ کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دینی درد و حمیت رکھنے والے حضرات سے مدرسہ کا تعارف و تعاون کے لیے ہمدردانہ اپیل ہے۔

INTRODUCTORY APEAL

Assalamu Alaikum Wa rehmatullah wa Barkatuh

Madrasa Quadria Missarwala is a Deeni Madrasa in the State of Himachal Pradesh spread over an area of 8 acres. The campus has a very calm and pollution free environment engaged in imparting deeni education situated in the picturesque green valley of missarwlal.

Himachal Pradesh is Known an "Icy State" of India. Shimla is the capitl of the State. Being a border area most of the Muslims Population has Migrated to Pakistan during the partition and at present its strength is about 3% of the total population acattered all over the State. The condition of the Muslims in the area is very miserable that they do not know even the first rukan of Islam.

Under thse circumstances it was obligatory on the part of ULEMA to establish DEENI Madrasa to eradicate illiteracy and propagate true ISLAM. Besides giving DEENI education, vocational job oriented training enabling the poor to earn their livelihood.

Ind order to setup a feeling of neighborhood and brotherhood among the inhabitants of hismachal pradesh and its surrounding States, Madrasa has expanded its services not only in educational and spiritual fieldsbut also in social and economic fields.

Hence Madrasa require neccessary funds to meet the daily expenses of students and its staffs.

So it is decided to make a humble appeal to the generous brother to contribute towards this noble cause in the head of LILLHA, ZAKAT SADQUA & ISALE SAWAB for the above noble purposes.

مولانا کبیر الدین فاران مظاہری

ناظم

مدرسہ قادریہ مسّروالا

ضلع سرمور (ہماچل پردیش)

BY: MAULANA KABIRUDDIN FARAN MAZAHIRI

Nazim/ Principal

Madrasa Quadria Missarwala, Distt. Sirmour (H.P.)

Tel. & No.: 01704-255126 Fax. 01704-255286 E-mail: quadriahp@gmail.com

مولانا محمد اعجاز عرفی کی تالیفات

مومن کی معراج: اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب کی حالت ، روحانی انقلاب ، مذہب اسلام کی تکمیل ، نماز کی عمومیت وفرضیت ، سورۃ فاتحہ کا اعجاز وتاثیر اور اس کے علاوہ دیگر عنوانات پر قرآن واحادیث کی روشنی میں مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے ، جس کا انداز بیان نہایت دلنشیں ہے۔

رندر حمانی ، ماہنامہ رگ سنگ کانپور

ذکر حرمین: جو مسجد حرام اور مسجد نبوی کی جامع تاریخ اور مکمل خصوصیات وفضائل پر مشتمل ہے۔ جس کے متعلق ہندوستان کے ایک عالم ودانشور کا بیان پڑھئے۔

مجھے سب سے بڑی خوشی اس کی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے ایک فاضل نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ، موضوع کا انتخاب ان کی سعادتوں کا ثبوت اور مضامین کی جودت ان کی طبع ہوشمندانہ کا مظاہرہ ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ علم وفن کا ایک گلدستہ حسین اور تاریخ وسوانح عالم کا یہ وہ دیدہ زیب مرقع ہے جسے ایک شاداب اور پرشباب قلم نے تیار کیا (مولانا انظر شاہ کشمیریؒ)

اہم ترین رکن زکوٰۃ: اس کتاب میں فاضل مصنف نے نہایت ہی والہانہ طرز نگارش میں زکوٰۃ پر قلم اٹھایا ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ بے پایاں خلوص واحترام کے ساتھ انھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کی سطر سطر سے ملت کی ہمدردی ، اسلام سے حقیقی الفت اور ﷺ سے والہانہ عقیدت مترشح ہوتی ہے۔

مولانا عبدالمالک بھوجپوری

ادارہ نادی المصنفین ، شاہی محلہ ، نمبر 1 کلٹی ، ضلع بردوان ، مغربی بنگال

RNI. No.: DELURD/2012/43842

Fortnightly **FIKR-E-INQLAB** Delhi

VOL: 01 ISSUE : 18 February-2013

قومی، ملی، دینی اور تعلیمی اصلاح وفلاح کی کل ہند تحریک

آل انڈیا تنظیم علماءِ حق کا

دستور العمل

- قرآن کریم کی ترتیل وتجوید کے ساتھ تعلیم اور احادیث نبوی کی ترویج واشاعت
- اہل سنت والجماعت کے فکر کی بنیاد پر صحیح اسلامی عقائد کا فروغ
- جدید تقاضوں کے پیش نظر دینی مدارس، علمی مراکز اور عصری مکاتب کا قیام
- مسلمانوں میں اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی تعلیم وتربیت
- اور غیر اسلامی رسومات وخرافات کی اصلاح کیلئے جدوجہد
- باطل تحریکات کے افکار وخیالات کی واضح تردید
- اکابر اہل حق کے فکر وعمل کی ترویج واشاعت
- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علوم معارف کو عام کرنا
- دینی مدارس اور ملی جامعات پر آنے والی آفتوں کا دفاع اور ان کا تحفظ
- یتیموں، بیواؤں اور مختلف آفات سے متاثر لوگوں کی اخلاقی ومالی مدد
- منصف مزاج برادران وطن سے رابطہ اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اتفاق ویک جہتی کی کوشش

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ
E-mail: aitulemaehaq@gmail.com, E-mail: fikreinqlab@gmail.com
web: www.aitulamaehaq.org A/C No. 004601053825, ICICI Bank

Editor, Printer and Publisher Abasa Mehtab Printed at Neeta Press, Shed No. 19,
D.S.I.D.C. Industrial Complex, Dakhshinpuri, New Delhi-62.
Published from Q-35, Al-Samad Road, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-25